دوم
رشید حسن خاں
تحریروں کے آئینے میں
(رشید حسن خاں کے ادبی کارناموں پر لکھی گئی تحریروں کا دستاویز)
مرتب: ابراہیم افسر

رشید حسن خاں

تحریروں کے آئینے میں

(رشید حسن خاں کے ادبی کارناموں پر لکھی گئی تحریروں کا دستاویز)

(جلد دوم)

مرتب

ابراہیم افسر

RASHEED HASAN KHAN TEHREERON KE AAIENE MEIN

(Vol.II)

Edited by:

IBRAHEEM AFSAR

Ward No.1, Mehpa Chauraha, Nagar Panchayat Siwal khas, Distt. Meerut.(U.P)250501

Mob: 9897012528/8077319637/E.mai : ibraheem.siwal@gmail.com

Year of Edition:2019

ISBN:9789384271206

Price Rs:351/=

''یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔ شائع شدہ مواد سے اُردو کونسل کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔''

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

-----◈◈◈◈◈◈◈◈◈◈◈-----

نام کتاب : رشید حسن خاں تحریروں کے آئینے میں (جلد دوم)
(رشید حسن خاں کے ادبی کارناموں پر لکھی گئی تحریروں کا دستاویز)
مرتب وناشر : ابراہیم افسر
سن اشاعت : ۲۱۰۹ء
قیمت : ۳۵۱ روپے
صفحات : ٦۰٦
تعداد : ۵۰۰
کمپوزنگ : بک ورلڈ کمپیوٹر پوائنٹ دہلی۔٦
مطبع : ایچ۔ایس۔آفسیٹ پرنٹرس، دہلی
رابطہ/پتا : ابراہیم افسر، نگر پنچایت سِوال خاص، ضلع میرٹھ (یو. پی) ۲۵۰۵۰۱

Kitabi Duniya

1955, Gali Nawab Mirza, Mohalla Qabristan,
Opp. Anglo Arabic School, Turkman Gate, Delhi-110006 (INDIA)
Mob: 9313972589, Ph: 011-23288452
E-mail:kitabiduniya@gmail.com

انتساب

اپنے عزیز و شفیق والدین
محترم افسر علی
اور
محترمه شکیله بانو
کے نام

فہرست

○۔مقدمہ	ابراہیم افسر	7
○۔**تحقیق**		54
1۔محققِ ممتاز	فہیم بسملؔ	55
2۔کچھ اپنے بارے میں	رشید حسن خاں	56
3۔حیات نامۂ رشید حسن خاں	ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد	66
4۔رشید حسن خاں کی تحقیق اور ان کی شخصیت کے چند پہلو	خورشید حسن خاں	72
5۔میرا پہلا ادبی سفر	ابراہیم افسر	76
6۔رشید حسن خاں کی تحقیقی غلطیاں	اکبر علی خاں	91
7۔رشید حسن خاں اور اُردو تحقیق	پروفیسر شارب ردولوی	113
8۔رشید حسن خاں ایک منفرد محقق	تنویر احمد علوی	121
9۔آزاد اور بے باک محقق	پروفیسر مجاور حسین رضوی	133
10۔رشید حسن خاں تحقیق و تدوین کا مردِ میداں	پروفیسر رفیع الدین ہاشمی	138
11۔رشید حسن خاں ایک تعمیری محقق	انتظار حسین	147
12۔تاریخ نگاری کے اصول و آداب	پروفیسر حنیف نقوی	150
13۔رشید حسن خاں صاحب	ڈاکٹر اشفاق محمد خاں	163
14۔رشید حان خاں ایک معتبر نام	ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی	171
15۔رشید حسن خاں ایک منفرد محقق	پروفیسر ابنِ کنول	188
16۔رشید حسن خاں کے تحقیقی تصورات	ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی	194
17۔ادبی تحقیق مسائل و تجزیہ از رشید حان خاں	ڈاکٹر ظفر کمالی	200
18۔رشید حسن خاں	فخر الاسلام اعظمی	223
19۔رشید حسن خاں اور علامہ شبلی	محمد الیاس الاعظمی	226
20۔اُردو کے مایہ ناز محقق و ادیب رشید حسن خاں	سید منظور احمد	240
21۔رشید حسن خاں محقق و ادیب	اُردو بک ریویو	247
22۔اُردو تحقیق کا سالارِ زماں رخصت ہوا	رفاقت علی شاہد	248
23۔رشید حسن خاں ایک محقق	وقار ناصری	254
24۔محققِ یگانہ رشید حسن خاں	ڈاکٹر خالد حسین خاں	261
25۔رشید حسن خاں ایک دیدہ ور محقق	انوار الحسن وسطوی	266
26۔رشید حسن خاں اور ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ	ڈاکٹر قمر صدیقی	271

28۔تحقیقی استدراکات کا معتبر نام رشید حسن خاں ڈاکٹر منور حسن کمال 297
29۔رشید حسن خاں بہ حیثیت محقق صائمہ سعید 304
30۔رشید حسن خاں پر کی گئی تحقیق ابراہیم افسر 316
❍۔تدوین 327
31۔فسانۂ عجائب مرتبہ رشید حسن خاں نیّر مسعود 328
32۔فسانۂ عجائب پر ایک نظر نثار احمد فاروقی 336
33۔فسانۂ عجائب، باغ و بہار مرتبہ رشید حسن خاں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی 355
34۔باغ و بہار کا ایک قدیم مخطوطہ ڈاکٹر فیروز احمد 361
35 بہ نام رشید حسن خاں نیّر مسعود 375
36۔مثنویاتِ شوق عبدالحق 387
37۔مثنویاتِ شوق لکھنوی معاشرت کے آئینے میں لطیف صدیقی 391
38۔خدائے تدوین کا چوتھا صحیفہ مثنویاتِ شوق پروفیسر گیان چند جین 396
39۔اُردو میں اصولِ تدوین کا مجدد شان الحق حقی 405
40۔مصطلحاتِ ٹھگی نیّر مسعود 414
41۔زٹل نامہ (کلیاتِ جعفر زٹلی) اور رشید حسن خاں سید محمد عقیل 420
42۔زٹل نامہ کی ایک اور دریافت ڈاکٹر گوہر نوشاہی 424
43۔خدائے تدوین گیان چند جین 432
44۔رشید حسن خاں اور گلزارِ نسیم شمیم حنفی 446
45۔مثنویاتِ شوق مرتبہ رشید حسن خاں پروفیسر فضیل جعفری 455
46۔رشید حسن خاں کی کتاب تحقیق تدوین روایت گیان چند جین 480
47۔فسانۂ عجائب مرتبہ رشید حسن خاں ظفر احمد صدیقی 514
48۔رشید حسن خاں اور فسانۂ عجائب ڈاکٹر فوزیہ بانو 521
49۔تلاش و تعبیر اور تفہیم کا اجمالی جائزہ ڈاکٹر عادل احسان 532
50۔رشید حسن خاں (تحقیق تنقید و تدوین کے حوالے سے) ڈاکٹر ظفر عالم 556
51۔رشید حسن خاں بہ حیثیت محقق و مدوّن ڈاکٹر شمیم طارق 564
52۔باغ و بہار کے نسخۂ رشید حسن خاں کی تحقیقی اہمیت ناصحہ عثمانی 587
53۔رشید حسن خاں بہ حیثیت مدوّن محمد شہزاد اختر بیگ / ڈاکٹر محمد رمضان 591
54۔مقدماتِ باغ و بہار کا تقابلی جائزہ شازیہ پروین 600

❍❍❍

مقدمہ

رشید حسن خاں (1925:2006) کی شخصیت ایک نابغۂ روزگار کی حیثیت سے مسلّم ہے۔ معدودے چند لوگ ہی ایسی شہرت کی بلندیوں پر پہنچ پاتے ہیں جیسی شہرت رشید حسن خاں کے حصے میں آئی۔ ایسے افراد کم ہوتے ہیں جن کی نگاہیں۔

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

کو اپنا اوڑھنا بچھونا اور نصب العین بناتی ہیں۔ نیز ایسے ہی لوگوں کے قدموں میں کامیابی و کامرانی کی دیوی سرنگوں ہوتی ہے۔ رشید حسن خاں بھی اُردو ادب بالخصوص تحقیق و تدوین کے ایسے ہی شاہین اور جویا تھے جنھوں نے کبھی ایک جگہ بسیرا نہیں کیا۔ تحقیق و تدوین کے بامِ عروج پر پہنچنے کے بعد بھی ان کے اندر تلاش و جستجو کا لاوا دہکتا رہا۔ رشید حسن خاں اپنی عمر عزیز کے آخری حصے تک تحقیق و تدوین کے بہت سے کارنامے انجام دینا چاہتے تھے۔ جن میں کلیاتِ سودا، امراؤ جان ادا، کلامِ اقبال اور غرائب اللغات کی تدوین شامل تھیں، لیکن موصوف کی عمر نے وفا نہ کی۔ دل میں ان کاموں کی تمنا، تمنا ہی بنی رہی۔ ان کے ادھورے کاموں کی فہرست صرف فہرست بن کر رہ گئی۔ موجودہ دور میں کوئی ایسا محقق و مدون نظر نہیں آتا جو رشید حسن خاں کے نامکمل کارناموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دورِ حاضر میں تحقیق و تلاش کرنے والے جواں سال محققین کی تعداد اُنگلیوں پر گنی جاسکتی ہے اور جو بزرگ محققین ہمارے درمیان موجود ہیں اُن کی عمریں اب دیوار سے سایہ اُترنے کے مترادف ہیں۔

رشید حسن خاں کا علم و ادب بالخصوص تحقیق، تدوین اور تنقید کے تئیں جنون کسی سے چھپا نہیں۔ ایک ایک سطر اور ایک ایک لفظ کی کھوج بین کرنا ان کا تحقیقی شعار تھا۔ دورِ حاضر میں رشید حسن خاں کا نام حافظ محمود خاں شیرانی، قاضی عبدالودود، امتیاز علی خاں عرشی، پروفیسر گیان چند جین، پروفیسر حنیف نقوی جیسے مایہ ناز محققین و مدونین کے ساتھ ادب و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ اُردو تحقیق میں موصوف نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیے جن کا ذکر کیے کوئی بھی طالب علم (صحیح معنوں میں اساتذہ بھی) آگے نہیں بڑھ سکتا۔ رشید حسن خاں کی ادبی خدمات کے پہلو اتنے وسیع ہیں کہ ہر پہلو سے علم کے دریا بہہ نکلیں۔ ایک ایک پہلو پر کئی کئی کتابیں منظرِ عام پر آجائیں۔ ان پہلوؤں میں سب سے زیادہ کارآمد پہلو تحقیق و تدوین کا ہے۔ رشید حسن خاں نے اپنی زندگی کا بیش تر حصہ تحقیق و تدوین کے لیے صرف کیا۔ اِملا، زبان و قواعد، تبصرے اور تجزیے کے ضمن میں بھی ان کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے تحقیقی تبصروں کا ہی کمال تھا کہ اُردو میں تاریخ نگاری کے حوالے سے جو اہم کتابیں منظر عام پر آئیں انھیں یا تو بازار سے واپس منگوا لیا گیا یا ان میں اصلاح کی گنجایش پیدا کی گئیں۔ بقول پروفیسر گیان چند جین 'رشید حسن خاں نے جس کتاب پر بھی نگاہ ڈالی اسے بھسم کر ڈالا'۔ میں پروفیسر گیان چند جین کے بیان سے پوری طرح متفق نہیں ہوں۔ بے شک رشید حسن خاں نے کئی ادبی پروجیکٹوں کو اپنے بے لاگ تحقیقی تبصروں کی وجہ سے بند کرا دیا ہو لیکن اگر صاحب اقتدار وحل ان کے اشارات و اصلاحات کی جانب توجہ مبذول کر لیتے تو تصویر کا رُخ دوسرا ہی ہوتا۔ رشید حسن خاں نے اپنی تحقیق میں اصلاح کے پہلو کو ہمیشہ مقدم رکھا۔ چاہے تاریخ ادب اُردو علی گڑھ ہو یا تاریخ ادب اُردو جلد اول، جمیل جالبی ہو، یا پھر تذکرۂ معاصرین یا غالب صدی اڈیشن (مالک رام)، ان ادبی تاریخوں پر تحقیقی مضمون لکھتے وقت رشید حسن خاں کا مقصد یہ تھا کہ بڑے بڑے اداروں کی جانب سے شائع ہونے والی کتابوں میں تحقیق کی بجائے تساہلی کا پہلو نمایاں ہے۔ کسی بھی صاحبِ اقتدار نے ان ادبی تاریخوں اور صدی اڈیشنوں پر نگاہِ نقد ڈالنا مناسب نہ سمجھا۔ تساہلی کی وجہ سے ان کتابوں میں سنین و تاریخ میں فرق نمایاں ہوا۔ اگر ہم رشید حسن خاں کی تحقیق کو منفی تحقیق یا کسی ادارے کی ادبی شان کو دھچکہ دینے والی تحقیق سے تعبیر کریں گے تو یہ زیادتی ہوگی۔ ان کی تحقیق میں موجود اصلاحی پہلوؤں کو بھی ہمیں منظر عام پر لانا ہوگا۔ اس ضمن میں میرا یہ ماننا ہے کہ متذکرہ ادبی تاریخوں میں وہ غلطیاں در آگئی تھیں جن کا ذکر رشید حسن خاں نے اپنے تبصروں، تجزیوں اور مضامین میں ادبی براہین کے ساتھ کیا تھا؟ ہم ان کے پیش کیے گئے حوالوں اور دلیلوں سے نااتفاقی تو ظاہر کر سکتے ہیں لیکن چشم پوشی نہیں۔ یہاں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ رشید حسن خاں کے تاریخی و تحقیقی مضامین پر بھی تحقیقی گرفت کی گئی ہے۔ ان میں ایک بڑا نام اکبر علی خاں کا ہے۔ رشید حسن خاں نے جب 'تاریخ لطیف' پر اپنا تحقیقی مضمون لکھا تو اکبر علی خاں نے اس مضمون پر سخت اعتراض کیا۔ اکبر علی خاں نے رشید حسن خاں کی تحقیقی صلاحیتوں پر سوالیہ نشان لگائے۔ اکبر علی خاں نے ''رشید حسن خاں کی تحقیقی غلطیاں'' نامی مضمون میں تاریخ لطیف پر خاں صاحب کی تحقیقی غلطیوں کی جانب ادبی قارئین کی توجہ مبذول کرائی۔ میری نظر میں اکبر علی خاں نے اپنے مضمون یا ردعمل میں رشید حسن خاں کی شخصیت کے ساتھ ان کی تحریروں کے خلاف بھی سخت باتیں قلم بند کیں۔ اکبر علی خاں نے اپنے مضمون میں یہ سوال بھی قائم کیا کہ دہلی یونی ورسٹی میں جہاں رشید حسن خاں ملازم ہیں، میں کوئی ایسی کتاب شائع نہیں ہوئی جس میں تحقیقی غلطیاں سرزد نہ ہوئیں ہوں؟ یا وہ جان بوجھ کر صرف دوسری دانش گاہوں کے تحقیقی کاموں کو اپنی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں؟ ان سوالات کے درمیان اکبر علی خاں کا مضمون خاصا دل چسپ ہے۔ پورا مضمون اس کتاب میں شامل ہے۔ اس مضمون سے صرف میں چند باتوں کو قارئین کے سامنے پیش کرتا ہوں تاکہ اندازہ لگایا جاسکے کہ بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں رشید حسن خاں کے خلاف لکھنے والوں میں ایک بڑا نام اکبر علی خاں کا بھی ہے اور انھوں نے اپنے مضمون میں رشید حسن خاں کے مضمون کے خلاف جو شواہد، دلائل اور باتیں تحریر کی ہیں ان میں کہاں تک صداقت ہے، ان سب سے محظوظ ہوئیے:

''اِدھر کچھ عرصے سے رشید حسن خاں صاحب کا نام اُن مضامین کی وجہ سے ادبی حلقوں میں زیر بحث آتا رہتا ہے جن کے ذریعے اُنھوں نے ایک دوسرے سے مختلف لکھنے والوں کو سہل پسندوں اور بے پرواہیوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ان مضامین کو بہت سے رسالوں نے ایک دوسرے سے نقل کیا ہے اور اس طرح رشید حسن خاں صاحب کی اُس محنت کی داد ہے جو موصوف نے لکھنے والوں کی سہل پسندی اور موضوع سے بے توجہی ثابت کرنے میں صرف کی ہے۔

بلا شبہ ہمیں احتساب سے کام لینا چاہیے اور یہ کوشش کرنا چاہیے کہ ہمارے کام کرنے والے زیادہ سے زیادہ محتاط ہو کر قلم اُٹھائیں، خصوصیت سے تحقیق کے میدان میں احتیاط برتنا بھی ضروری ہے تاکہ کسی ایک کی غلطی آیندہ کی اور بہت سی غلطیوں کا دروازہ نہ کھول دے۔ لیکن اگر نقاد کا مطمعِ نظر صرف عیب جوئی بن جائے تو یہ امر نہ صرف تحقیقی کام کرنے والوں کی ہمت شکنی کا سبب بن جائے گا بلکہ معترض کی خود اپنی صلاحیتوں کا بھی کوئی اچھا مصرف نہ ہوگا۔

ابتدا میں رشید حسن خاں کے پیشِ نظر یہی بات رہی ہوگی کہ اُن کے احتساب کے بعد لکھنے والے اپنے کام کو شائع کرنے سے پہلے اچھی طرح پرکھ لیں اور اس طرح کاموں کو معیار بلند ہو جائے۔ لیکن یہ احتساب چند وجوہ کی بنا پر خود اُن کے لیے کسی طرح صحت مند ثابت نہیں ہوا چہ جائے کہ دوسروں کے لیے۔

ہوا یہ کہ اِدھر اُنھوں نے جو مضامین لکھے ہیں اُن میں پڑھنے والوں کو وہ بے لوثی نظر نہیں آئی جس کی توقع اُن سے کی جاتی تھی۔ اس لیے کہ انھوں نے اکثر و بیش تر ان مضامین میں طنز و تمسخر کے تیر و نشتر چلائے ہیں جس کا ردِعمل خوش گوار ہو ہی نہیں سکتا اور اُنھوں نے بعض مواقع پر اپنے اعتراضات میں اُن معذرتوں کو بھی نظر انداز کر دیا جو لکھنے والوں نے اپنی

مجبوریوں کے تحت کی تھیں۔ یہ بالکل ایسا ہی ہوا جیسے ہم کسی کتاب کے غلط نامے کو نظر انداز کر کے ساری غلطیاں ایک بار پھر لکھنے والے کے حساب میں لگا دیں۔ چوں کہ یہ رویہ خلوص کے سراسر منافی ہے۔ اس لیے اُن مضامین سے کسی صالح اثر کا مرتب ہونا قطعاً ناممکن ہو گیا اور کچھ کاموں میں جن کی ضرورت اور اہمیت کا ہم سب کو اعتراف ہے بے جا رکاوٹیں پیدا ہو گئیں۔''

رشید حسن خاں کی ابتدائی زندگی بڑی مشکلوں میں گزری۔ رشید حسن خاں کو براہِ راست مغربی علوم کی تعلیم کا موقع نہیں ملا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ان کے والد امیر حسن انگریزی تعلیم کے سخت خلاف تھے۔ انگریز اور انگریزی دشمنی کی انتہا یہاں تک تھی کہ انھوں نے پولس کی نوکری سے قبل از وقت استعفیٰ دے دیا اور رشید حسن خاں کو کبھی انگریزی میڈیم یا جہاں پر انگریزی زبان کی تعلیم دی جاتی تھی، اُس اسکول میں داخل نہیں کرایا گیا۔ خاں صاحب کے والد صحیح معنوں میں ایک کٹر قوم پرست تھے۔ وہ علمائے دیو بند کے بھی سخت مخالف تھے۔ بہر حال، رشید حسن خاں نے اپنے والدِ محترم کے مشورے سے محلے کے ہی مدرسہ 'بحر العلوم' میں (1939-1934) ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ گھریلو معاشی حالات اچھے نہ ہونے کی وجہ سے مدرسہ بحر العلوم سے درسِ نظامی مکمل نہ کر سکے۔ شاہ جہاں پور کی آرڈیننس کلودنگ فیکٹری (درزی خانہ) ان کا اور ان کے اہلِ خانہ کی کفالت کا واحد ذریعہ تھی۔ رشید حسن خاں کو صرف 14 برس کی عمر میں یعنی 1939 میں آرڈیننس کلودنگ فیکٹری، شاہ جہاں پور میں مزدوری کرنا پڑی۔ فیکٹری میں ملازمت کے دوران ہی ان کی شادی 1945 میں صرف 20 برس کی عمر میں نفیس بیگم دخترِ منظور علی خاں سے ہوئی۔ دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے کے بعد رشید حسن خاں کو 1946 میں فیکٹری سے 33 دن ہڑتال کرنے کی پاداش میں باہر نکال دیا گیا۔ نوکری سے نکالے جانے کے بعد رشید حسن خاں مایوس نہیں ہوئے۔ انھوں نے معمولی سے معمولی اور متفرق ملازمتیں کر اپنی زندگی کی گاڑی کو آگے بڑھایا۔ کبھی جاگیردار کے کارندے کے طور پر کام کیا تو کبھی آٹا چکی پر منشی گیری کی۔ 1949 میں انھوں نے بریلی سے نکلنے والے ہفتہ وار رسالے 'ندرت' میں بھی کام کیا۔ آرڈیننس کلودنگ فیکٹری کی ملازمت سے نکالے جانے کے بعد رشید حسن خاں نے عربی فارسی بورڈ الہ آباد سے مولوی اور لکھنؤ یونی ورسٹی سے دبیر کامل کے امتحانات پاس کیے۔ یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ رشید حسن خاں فیکٹری میں انٹرول کے دوران طلسم ہوش ربا اور آب حیات جیسی کتابیں پڑھتے تھے۔ فیکٹری میں کام تین شفٹوں میں ہوتا تھا۔ ان کے پڑھنے کے شوق نے انھیں اُردو ادب میں وہ مقام عطا کیا جو بہت سے ادیبوں کے حصے میں نہ آیا۔ کلاسکی متون کی تدوین میں ان کی ابتدائی محنتِ شاقہ بہت کام آئی۔ اپنے ابتدائی دور سے ہی انھوں نے تحقیق اور تنقید کی جانب رُخ موڑ لیا تھا۔ نیاز فتح پوری اور پروفیسر کلیم الدین احمد کی تحریروں نے انھیں بہت متاثر کیا۔ بالخصوص نیاز فتح پوری کے رسالے 'نگار' کے شماروں کا انھیں بے صبری سے انتظار رہتا اور شوقین بک ڈپو شاہ جہاں پور سے وہ ادبی رسائل وجرائد کرائے پر لا کر پڑھتے تھے۔ رسالہ 'نگار' کے مضامین نے ان کے ذہن کے نہاں خانوں میں ہلچل پیدا کی۔ یہیں سے ان کے تحقیقی اور تنقیدی رویے میں تبدیلی آنا شروع ہوئی۔ ان متذکرہ باتوں کے بارے میں رشید حسن خاں نے ایم.اے کی طالبہ مسرت انیس، لاہو کے سوال نامے کے جواب میں لکھے سوانحی مضمون ''کچھ اپنے بارے میں'' میں یوں بیان کیا ہے:

''تقریباً 1944 میں 'رسالہ نگار' سے متعارف ہوا اور نیاز فتح پوری کی تحریروں نے اثر ڈالا۔ (اُس زمانے میں نوجوانوں کی بڑی تعداد کی ذہنی تربیت نیاز کی تحریروں سے ہوئی تھی)۔ تشکیک، دلیل کاری سے، شہادت کا تصور اور روایت کے سچے جھوٹے متعلقات کا ابتدائی سطح پر شعور نیاز کی تحریروں سے ہوا۔ یہ بہت دل چسپ بات ہے کہ جب باضابطہ تحقیق کے دائرے میں آیا تو معلوم ہوا کہ نیاز کے ذہن کو تحقیق سے بہت کم مناسبت تھی اور شناسائی بھی دور کی تھی اور مصلحت پسندی سے وہ غافل نہیں ہوتے تھے اس کے باوجود وہ محقق نہیں تھے۔ اُن کی تحریروں نے ذہنوں میں جو تحقیق سے اُنسیت پیدا کی۔ میں علی الاعلان اِس کی شہادت دیتا ہوں کہ اُس زمانے میں نیاز کی تحریروں نے میرے ذہن میں بہت سے سوالیہ نشان پیدا کیے تھے؟ جو بالآخر تحقیق کے عمل میں میرے کام آئے۔''

1950 کے بعد رسالہ 'شاعر' (آگرہ) 'الحمراء' اور 'المنصور' (لاہور)، نگار و نقوش، ادیب وغیرہ میں ان کے مضامین کے ساتھ خطوط بھی شائع ہونے لگے۔ رسالوں میں جب ان کی تحریریں شائع ہونے لگیں تو سے ان کے اندر لکھنے کا ذوق و شوق پیدا ہوا۔ دراصل 1953 میں اسلامیہ ہائر سکنڈری اسکول، شاہ جہاں پور میں فارسی اور اُردو کی معلّمی مل جانے کے بعد ان کی زندگی میں خاطر خواہ تبدیلیاں آنا شروع ہوئیں۔ یہاں رہ کر رشید حسن خاں نے اپنے علمی شعور میں پختگی حاصل کی۔ اسکول کی لائبریری سے استفادہ کرنا ان کا شوق بن گیا۔ اسکول کی ملازمت کے دوران ہی ان کے مضامین ہندوستان اور پاکستان کے ادبی رسائل وجرائد میں شائع ہونے شروع ہوئے۔ املا، زبان اور قواعد سے متعلق بہت سے مضامین رشید حسن خاں نے اسکول کی ملازمت کے دوران تحریر کیے۔ رشید حسن خاں کو شاعری بالخصوص شاہ جہاں پور کے شاعروں سے بھی علمی فیض حاصل کرنے کا موقع ملا۔ ان کے بہت سے دوست خود بھی شاعر تھے اور علمِ عروض کے جان کار بھی۔ رشید حسن خاں گرد و نواح میں میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں جاتے تھے۔ لیکن جلد ہی انھوں نے شاعری کی دنیا سے اپنا دامن بچا لیا۔ رشید حسن خاں شاعری کو تنہائی میں گنگنانے کی چیز تسلیم کرتے ہیں۔ اس لیے رشید حسن خاں جب دہلی یونی ورسٹی میں مستقل طور پر ملازمت کرنے لگے تو گائر ہال T-C9 میں تنہائی میں ریڈیو پر غزلیں اور موسیقی سننا ان کے مشاغل میں شامل تھا۔ تحقیق، تدوین میں ہمیشہ غرق رہنے کے بعد رشید حسن خاں کے دماغ کو سکون چاہیے ہوتا تھا، جو انھیں موسیقی اور غزلیں سننے کے بعد ملتا تھا۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ رشید حسن خاں نے اپنے شاعر دوستوں کی کلیات، شعری مجموعوں اور دیوان پر اپنی رائے کا اظہار مقدمے، ابتدائیے اور دیباچے لکھ کر کیا۔ میرے سامنے ایسے کئی مجموعے موجود ہیں جن پر خاں صاحب نے با قاعدہ خطوط یا کوئی مضمون لکھ کر شعری شعور کا برملا اظہار کیا۔ اُڑیسہ سے تعلق رکھنے والے بزرگ ادیب، شاعر، مترجم اور مدیر عبدالمتین جامیؔ کے پہلے شعری مجموعے ''نشاطِ آگہی'' (اشاعت 1996) پر رشید حسن خاں نے اپنی رائے کا اظہار تعریفی اور تنقیدی خط میں یوں کیا:

''نشاطِ آگہی کا'' تحفہ ملا، شکر گزار ہوں، کتاب یوں ہی کھولی تھی کہ جو صفحہ سامنے آیا اس پر یہ شعر تھا جو دل میں اُتر گیا:

احباب کا ذکر کرنے والا
زخموں کا حساب لکھ رہا تھا

بہت خوب، اس کو کہتے ہیں سادگی میں پُر کاری۔ پھر یہ شعر سامنے آیا:

گھبرا کے نکل آیا تھا سنسان مکاں سے
بازار سے گھبرا کے کدھر جائے گا وہ شخص

یہاں بھی بیان کی سادگی ہے معنوی پرکاری کے ساتھ، مگر ایسے شعر:

لفظوں کے پرندوں پہ جھپٹنے کو ہے تیار
بیٹھا ہے پہاڑوں پہ مری فکر کا شاہین

متاثر نہیں کرتے۔ میری دلی تمنا ہے کہ آپ لفظوں پر زور دینے اور ان کے بل پر بیان میں جدت پیدا کرنے کی کوشش نہ کریں۔ غزل کا شعر جب تک دل میں نہ اُتر جائے معیار سے دور رہتا ہے۔''

(اوجِ ثریا، مکمل دیوانِ غزلیات، عبدالمتین جامیؔ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2019 صفحہ 171 تا 172)

عروجؔ زیدی کے شعری مجموعے (اشاعت 1978) سفینۂ غزل پر رشید حسن خاں نے سات صفحات پر مشتمل مقدمہ تحریر کیا۔ اس مقدمے میں خاں صاحب نے شاعری، شاعر، اظہار اور اس کے تجربے سے بحث کی۔ ان چاروں اجزا کو سامنے رکھ کر انھوں نے عروجؔ زیدی کے کلام پر قلم اُٹھایا۔ ساتھ ہی عروجؔ زیدی کی شاعری میں زبان و بیان کے مسائل پر عالمانہ باتیں تحریر کیں۔ اس مقدمے میں انھوں نے یہ بھی تحریر کیا کہ عروجؔ زیدی نے زبان و بیان کے سلسلے کے ڈانڈے داغؔ دہلوی سے ملتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''تعبیراتی اندازِ بیان غزل کی بڑی خوبی ہے۔ اس خوبی نے صنفِ غزل میں نُدرت اور جدّت کے بے شمار پہلو نمایاں کیے ہیں۔ بہت سے اچھے اشعار ایسے ملیں گے جن میں تہ داری حُسنِ تعبیر کی پیدا کی ہوئی ہوگی۔ غزل میں اشاریت جس وسعت کا اضافہ کرتی ہے، اکثر و بیش تر اُسی کی بنیاد حُسنِ تعبیر پر ہوتی ہے۔ اچھے شاعر اس پہلو پر خاص طور سے توجہ مبذول کرتے ہیں۔ عروجؔ صاحب کے یہاں بھی اس کی اچھی مثالیں ملتی ہیں:

جو آتی ہے تو یادِ عشرتِ رفتہ ضرور آئے
مگر پرچھائیوں کا ہم کبھی پیچھا نہیں کرتے

یادِ ماضی کو، پرچھائیوں کا پیچھا کرنے سے تعبیر کرنا، بہت پاکیزہ اندازِ بیان ہے یا مثلاً یہ شعر:

اب نہ وہ بے رُخی دوست، نہ برہم نظری
میں نے دیکھی تھی جہاں دھوپ، وہاں سایہ ہے

کس قدر لطافت ہے اس تعبیر میں اور کس قدر رَستا ہوا پیرایہ ہے یہ:

اے گردشِ زمانہ کیا مصلحت ہے آخر
لہجہ بدل کے تو نے اکثر مجھے بلایا

مصرعے میں کس قدر اچھا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ ذیل میں چند اشعار نقل کرتا ہوں، ان سے اچھی طرح اندازہ کیا جا سکے گا کہ عروجؔ صاحب کی غزلوں میں جو اچھے شعر ہیں، وہ واقعی اچھے ہیں:

خیر ہے، آپ کہاں، جادۂ پُر خار کہاں
میرے غم خانے کو یہ راہ گذار جاتی ہے

مذاقِ محسن پرستی بھی جُرم ٹھہرا ہے
مری نگاہ پہ سب کی نظر کا پہرا ہے

دوسرے مصرعے میں قافیے کو جس پہلو سے بٹھایا گیا ہے، وہ اہلِ نظر سے داد طلب ہے۔ بہت سے نئے شاعر ایسی مثالوں سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں:

کمند ڈال رہا ہوں میں چاند تاروں پر
مآل کچھ ہو، مگر خواب تو سنہرا ہے

تیز رو قافلے والو، کبھی یہ بھی سوچا
کس سے ملنے کے لیے گردِ سفر جاتی ہے!

اُن کو دیکھا تو قدم یوں رُک گئے
جیسے دامن ہو کہیں اُلجھا ہوا

پھول ہیں محروم اندازِ جنوں
اُن کا دامن چاک ہے تو کیا ہوا

جفا بخیر، تغافل بخیر، ناز بخیر
اور تم حرف و حکایت کے خریدار نہیں

غزل منتخب اشعار کا مجموعہ نہیں ہوتی، اُس میں سے اشعار منتخب کیے جاتے ہیں اور شاعری کی قدر و قیمت کا تعین اُنہی منتخب اشعار کی بنا پر ہوتا ہے۔ ہر صنف کا اپنا انداز ہوتا ہے، اُس

کے اپنے قاعدے اور آداب ہوتے ہیں۔ اُس صنف کا جائزہ لینے والا مجبور ہے کہ ان آداب کو پیش نظر رکھے۔ غزل پر کچھ لوگوں نے جو بہت سے اعتراضات کیے ہیں، اُس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ اُنھوں نے اس صنف کے جو آداب اور ضابطے ہیں، اور غزل گو جن کی پابندی کیا کرتے ہیں، اُن کو ملحوظ نہیں رکھا۔ غزل صرف اعلا درجے کے منتخب اشعار پر مشتمل ہو، یہ مطالبہ جو لوگ کرتے ہیں وہ اس صنف سے اپنی ناواقفیت کا ثبوت دیتے ہیں۔ غزل میں عام طور پر مختلف انداز کے شعر ہوتے ہیں اسی لیے سطحیں بھی مختلف ہوتی ہیں۔ آیندہ بھی ایسا ہی ہوگا۔ کسی بھی شاعر کا مجموعہ کلام پڑھتے وقت اس بات کو ضرور ملحوظ رکھا جانا چاہیے۔ غزل جس طرح کہنے والے سے ضبط وتحمل اور تامل کا مطالبہ کرتی ہے، اُسی طرح پڑھنے والے سے بھی فکر وتحمل کا مطالبہ کرتی ہے۔ جو لوگ اس کا حق نہیں ادا کر سکتے، اُنھیں اس طرف توجہ بھی نہیں کرنا چاہیے۔ تفریحِ طبع کے لیے اس دنیا میں سامانوں کی کمی نہیں۔ قافیے کا کوئی اچھا پہلو، محاورے اور روزمرہ کا کوئی اچھا رُخ، تعبیر کی کوئی جدت، محض انداز بیان کی کوئی خوبی، احساس کی کوئی خلش، مشاہدے کا کوئی نقش، غرض بہت سی باتیں شاعر کو اپنی طرف متوجہ کرتی رہتی ہیں اور وہ مختلف اوقات میں مختلف اثرات کے تحت، مختلف انداز سے ان کو اشعار میں محفوظ کرنے کی کوشش کیا کرتا ہے۔ اس بات کو پیشِ نظر رہنا چاہیے۔''

(سفینۂ غزل، عروؔج زیدی، نیشنل اکاڈمی، انصاری مارکیٹ، دریا گنج، دہلی، 1978 صفحہ 10 تا 11)

رسالہ الحمراء،، جلد 5، صفحہ 43، جولائی 1953 اور جلد 5 شمارہ نمبر 2، اگست 1953 سے میں رشید حسن خاں کے دو خط پیش کر رہا ہوں تاکہ ان کی علمی و ادبی ذہانت کا آپ اندازہ کر سکیں۔ رشید حسن خاں نے جولائی 1953 کے شمارے میں ڈاکٹر سلیم کے ترجمہ شدہ افسانے میں لفظوں کی بناوٹ اور اس کے اصول پر بحث کی۔ ساتھ ہی نئے غزل گو شاعروں کے کلام کے ساتھ شاعری کی زبان، حسن تغزل، شیرنی اور گداز پر بھی اپنی بے باک اور دوٹوک رائے کا اظہار کیا۔ دراصل مدیرِ رسالہ کو لکھے گئے اس خط میں رسالے میں شامل مضامین کو انھوں نے اپنی تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس کو خط کو پڑھ کر آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس وقت رشید حسن خاں کی عمر محض 28 برس کی ہے لیکن ان کا ادبی ذوق اپنی عمر سے کہیں آگے تھا۔ اس خط میں شامل ادبی نکات کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے:

''جناب ڈاکٹر سلیم نے اپنے مترجمہ افسانے کے فٹ نوٹ میں لکھا ہے کہ ''خیابان'' فارسی زبان میں باغ کو کہتے ہیں، لیکن ایران جدید میں خیابان کا لفظ سڑک کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے ''خیابان'' فارسی میں باغ کے لیے استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ مگر اس کا مفہوم دوسرا ہے ایران میں بعض راستے ایسے ہوتے ہیں جن پر پے در پے درخت اس طرح لگے ہوتے تھے کہ ان کا سایہ راستے پر پڑتا تھا جس سے ایک خنکی سی رہتی تھی۔ اسے خیابان کہا جاتا تھا۔ بعد کو وہ باغ کی روش کے معنی بھی استعمال ہونے لگا۔ ہندوستان میں بالعموم اس کے ہی دوسرے معنی معروف میں (ملاحظہ ہو بہارِ عجم) اب وہ ایران جدید میں مطلق سڑک کے معنی بھی استعمال ہوتا ہوگا لیکن باغ کے معنی میں فارسی قدیم میں حسب قول سلیم صاحب میری نظر سے کہیں نہیں گزرا اور نہ کسی لغت ہی میں اس کے یہ معنی نظر سے دیکھا ہو تو مطلع فرمائیں تاکہ میری معلومات میں ایک اضافہ ہو جائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ آج کل نئے غزل گو شعراء میں ایک عجیب رجحان بڑھ رہا ہے۔ یہ حضرات غزل اور نظم میں اسلوب وزبان کے اعتبار سے کوئی فرق محسوس نہیں کرتے نتیجہ یہ ہے کہ ان کی غزلیں حسن تغزل اور شیرنی و گداز سے معرا ہوتی ہیں۔ غزل کی زبان، نظم کی زبان سے بالکل علاحدہ ہوتی ہے لیکن یہاں ہر چیز ایک ہی میزان پر بولی جاتی ہے۔ غزل بڑی کافر صنفِ سخن ہے اس میں اُس وقت تک نکھار پیدا نہیں ہو سکتا جب تک کہ دل خون نہ ہو جائے۔ اس شمارہ میں دوسری غزلوں کے علاوہ تاجور صامری کی غزل خاص طور پر محل نظر ہے۔ انھوں نے اس کی ردیف ہی میر متغزلانہ کہی ہے، پھر اور کس چیز کو کہا جائے۔ فیاؔض صاحب اور علوی صاحب کے طنزیہ خاکے بہت دل چسپ ہیں۔ خصوصاً علوی صاحب کا مختصر سا طنزیہ خاکہ نہایت عمدہ چیز ہے۔ پڑھ کر کئی واقعے یاد آ گئے۔''

(رشید حسن خاں کے انٹرویوز، مرتب راقم الحروف، کتابی دنیا، نئی دہلی، 2019، صفحہ 91)

اسی طرح رشید حسن خاں نے اگست 1953 کے شمارے میں پروفیسر سراؔج احمد صاحب علوی کے خاکوں کی زبان و بیان اور املا پر سخت اعتراض کیا۔ اس خط میں صرف اعتراضات ہی نہیں ہیں بل کہ اس شمارے میں شامل اچھے مضامین کی ستایش بھی رشید حسن خاں نے کی ہے۔ رشید حسن خاں نے جن اہم املائی مسائل پر اپنا نقطۂ نظر اس خط میں پیش کیا ان سے ہم محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ خط ملاحظہ کیجیے:

''جولائی کے الحمراء میں ترتیبِ نو کے ضمن میں جناب پروفیسر سراؔج احمد صاحب علوی کے خاکے پڑھ کر بے حد تعجب ہوا کہ پروفیسر صاحب نے ایسی عجیب وغریب مکتبی مساحت فرمائی ہے جس کی داد نہیں دی جا سکتی۔ معلوم ہوتا ہے یا تو علوؔی صاحب نے مضمون کو غور سے نہیں پڑھا یا محض کسی کی روایت پر اعتبار کر کے اپنی رائے ظاہر کر دی۔ موصوف نے مندرجۂ ذیل الفاظ مثالاً نقل کیے ہیں:

اسرا، نخسہ، تخمہ، صقیل، قابلی چنا، چنیدہ، دوبارہ۔

علوؔی صاحب کی رائے میں میں نے قابلی چنا اور صقیل وغیرہ کو غلط العام کے تحت جائز بتایا ہے۔ حالاں کہ یہ بات قطعاً غلط اور غلط ہے۔ یہ الفاظ قسم چہارم سے ماخوذ ہیں۔ قسم چہارم میں میں نے ایسے الفاظ جمع کیے ہیں جن کو عوام الناس ناواقفیت و جہالت کے سبب سے غلط بولتے ہیں اور ان الفاظ کے مقابل صحیح الفاظ بھی لکھ دیے ہیں۔ علوؔی صاحب اگر جون کے شمارے کو غور سے پڑھیں تو ان کو معلوم ہوگا کہ میں صقیل کو غلط اور اس کے مقابل فصیل کو صحیح لکھا ہے۔ معلوم نہیں موصوف خط لکھتے وقت کس عالم میں تھے کہ سخن فہمی کے عالم بالا کا مظاہرہ فرماتے چلے گئے۔ پھر اگر وہ میرے مضمون کو شروع سے پڑھتے تو یہ شکل آسان ہو سکتی تھی۔ مضمون کی پہلی قسط میں قسم چہارم کی تعین میں میں نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ اس قسم میں صرف وہ الفاظ ہوں گے (مثالاً) جن کو عوام الناس غلط بولتے ہیں۔ میں اس عبارت کو بجنسہ نقل کرتا ہوں:

''چوتھی قسم کے الفاظ بالیقین غلط ہیں کیوں کہ وہ پڑھے لکھے افراد کے استعمال میں بہ ایں بہت نہیں آتے۔ ان کو صرف وہ لوگ استعمال کرتے ہیں جو نسخے کو نخسہ، مزاج کو مجاز اور فصیل کو صفیل بولتے ہیں اور جس کی مہملیت عیاں ہے، استعمال عام کا یہ مطلب نہیں کہ ہر دہقانی و نااہل کی بات قابلِ قبول ہو (مطبوعہ نومبر 52)''

بولتے ہیں۔ مجھ کو افسوس ہے کہ علوی صاحب نے اس مضمون کو ایک خاص زاویہ اور ایک مخصوص نگاہ سے دیکھا۔ کاش ان کو اس مضمون میں کوئی مفید بات بھی مل سکتی۔

میرا یہ خیال ہے کہ اگر صاحب نظر افراد طنز و تعریض کے بجائے سنجیدگی اور افہام و تفہیم کے جذبے کے ساتھ اس مضمون پر نظر کریں تو انسب ہے ورنہ جلی کٹی سُنانے سے سوائے اس کے کہ زبان کے ساتھ ذہن بھی بگڑ جائے اور کچھ حاصل نہیں ہوسکتا۔

اس شمارے میں مجھ کو فیاض محمود صاحب کا طنزیہ خاکہ ''درست'' بے حد پسند آیا۔ نہایت عمدہ طنز اور بڑی کامیاب عکاسی ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ طنز میں کہیں تیزی یا تلخی نہیں پیدا ہوئی نیز یہ کہ اپنے موضوع کے مناسب سے وہ مختصر بھی ہے۔ اور یہ دونوں باتیں فنی اعتبار سے بڑی اہم ہیں، اگر وہ اس خاکہ کو ذرا اور بڑھا دیتے یا کہیں بھی کوئی تیز جملہ لکھ دیتے تو اس کی ساری خوبی ختم ہو جاتی۔ کاش ہمارے نئے ادبی مجاہد ایسی چیزوں کو سمجھنے کی کوشش کریں۔''

(رشید حسن خاں کے انٹرویوز، مرتب راقم الحروف، کتابی دنیا، نئی دہلی، 2019، صفحہ 93)

رشید حسن خاں جامع کمالات شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی زندگی کے اوراق پلٹنے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ کھیلوں کو اپنی زندگی میں بہت ترجیح دیتے تھے۔ ہاکی ان کا پسندیدہ کھیل تھا۔ فٹ بال، باسکٹ بال، کرکٹ وغیرہ کھیل انھیں خوب پسند تھے۔ اس بارے میں ان کا خیال تھا کہ کھیلوں سے انسان کی زندگی اور غور و فکر کرنے میں تبدیلی آتی ہے۔ ان کی معمولاتِ زندگی پر ہم جب جب غور کرتے ہیں تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ صبح پانچ بجے اُٹھ جاتے۔ ساڑھے پانچ بجے چاہے موسم کیسا بھی ہو، نہاتے۔ اس کے بعد بغیر دودھ کی چاے پیتے۔ چاے کو خوب اُبال کر پینا انھیں پسند تھا۔ دہلی یونی ورسٹی کے کافی ہاؤس میں عمدہ چاے پینا ان کی عادت میں شمار تھا۔ وقت کو ضائع کرنا انھیں بالکل پسند نہیں تھا۔ ہر کام کے لیے ان کے پاس وقت مقرر رہتا۔ کوئی اگر ان سے ملنے کے لیے آتا تو پہلے سے ہی ملاقات کا وقت طے ہوتا۔ اپنے روٹین چارٹ کے بارے میں رشید حسن خاں یوں رقم طراز ہیں:

''میرے معمولات میں 1959 کے بعد بہت کم تبدیلی آئی ہے، یوں کہوں کہ گویا نہیں آئی۔ صبح پانچ بجے اُٹھتا ہوں۔ ہر موسم میں ساڑھے پانچ بجے کے قریب نہاتا ہوں، شدید سردی کے زمانے میں بھی اس کا ناغہ نہیں ہوتا۔ (بیماری کی بات الگ ہے)۔ پھر چھے بجے سادہ چاے پیتا ہوں لیمن ٹی۔ آٹھ بجے ناشتا۔ جی ہاں کافی ہاؤس میں پابندی کے ساتھ بیٹھا کرتا تھا جب تک دہلی میں رہا۔ مگر ہمیشہ تنہا، کسی کے ساتھ نہیں۔ اس سے وحشت ہوتی تھی۔ مجلس آرائی کا میں قائل نہیں۔ فضول باتوں کا شوق نہیں، اتنا وقت ہی نہیں ملا کہیں۔ مزاج بھی یہ۔ لیکن اب جب دہلی جاتا ہوں تو کافی ہاؤس ضرور جاتا ہوں کم سے کم دو بار۔ یونی ورسٹی کافی ہاؤس میری پسندیدہ جگہ ہے۔ یہاں کے بیرے تربیت یافتہ تھے اور مردم شناس۔ مہینے کی آخری تاریخوں میں اکثر جیب میں روپے نہیں ہوتے تھے مگر یونی ورسٹی کا کافی ہاؤس کا ناغہ نہیں ہوتا تھا۔ پُرانا بیرے تھا اس کو خوب معلوم تھا کہ جیب میں پیسے ہوں گے تو فوراً دے جائیں گے۔ نہیں ہوں گے تو نہیں۔ اُس نے کبھی پیسے نہیں مانگے، کبھی بل لا کر ٹیبل پر نہیں رکھا۔ دو دن، تین دن، چار دن جب تنخواہ ملی اُسی دن ادائگی کر دی گئی۔ نہ اُس نے حساب بتایا، نہ اُس سے پوچھا کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ کمی بیشی بھی ہے۔ ایسی ایمان داری تو بہت سے ادیبوں اور ناقدوں میں بھی نہیں ملتی۔ اساتذہ کا نام یوں نہیں لیا کہ یہ حضرات عموماً اس سلسلے میں غیر تکلف ہوتے ہیں۔ جو دوسروں کے لیے واجب اور فرض ہے۔ جو ان کے لیے فرض کفایہ ہوتا ہے۔''

(رشید حسن خاں کے انٹرویوز، مرتب راقم الحروف، کتابی دنیا، نئی دہلی، 2019، صفحہ 80)

رشید حسن خاں نے اپنے بنائے ہوئے اصولوں کی تاعمر پابندی کی۔ دہلی سے شاہ جہاں پور جانے کے بعد بھی ان کا یہی معمول تھا۔ اصولوں کے ساتھ انھیں سمجھوتا کرنا قطعی پسند نہ تھا۔ جو بات کہتے صاف اور دو ٹوک کہتے۔ کبھی بھی کسی کی شخصیت سے مرعوب نہیں ہوئے بل کہ کس نے کیا لکھا اس پر بحث و مباحثہ کرتے۔ شرک کو تحقیق کے لیے زہر قرار دیا۔ سچ کی تلاش میں انھوں نے اپنی زندگی کے سنہرے ایام کو قربان کیا۔ تدوینی کاموں کے لیے دنیا بھر کی لائبریریوں میں محفوظ نادر مخطوطوں سے استفادہ کیا۔

رشید حسن خاں کا قول ہے کہ انھوں نے حافظ محمود خاں شیرانی، قاضی عبدالودود، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی تحریروں سے تحقیق کے آداب سیکھے۔ حافظ محمود خاں شیرانی کو رشید حسن خاں نے ''تحقیق کا معلمِ اول'' قرار دیا۔ وہیں تدوین میں انھیں مولانا امتیاز علی خاں عرشی پہلی پسند تھے۔ قاضی عبدالودود کی زبان کو وہ تحقیق کے لیے صحیح نہیں مانتے تھے۔ ان کی نظر میں قاضی صاحب کی زبان مشکل زبان تھی۔ متذکرہ ادبی بزرگوں سے رشید حسن خاں کے ذاتی مراسم تھے۔ بالخصوص قاضی عبدالودود، امتیاز علی خاں عرشی اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی سے خط و کتابت بھی ہوتی تھی۔ رشید حسن خاں قاضی عبدالودود سے تحقیقی مسائل پر، امتیاز علی خاں عرشی سے تدوینی مسائل پر اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی سے املا، زبان و قواعد کے مسائل پر تحریری گفت و شنید کرتے تھے۔

رشید حسن خاں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری کی تنقید کے علاوہ افسانے کی تنقید سے بھی کیا۔ لیکن انھوں نے اپنا میدان تحقیق کو بنایا۔ ان کے علمی و ادبی کارنامے بے شک تدوین میں سب سے زیادہ ہیں۔ لیکن ادبی تحقیق ان کا خاص موضوع رہا ہے۔ 1978 میں ان کی پہلی باضابطہ تحقیقی کتاب ''ادبی تحقیق مسائل و تجزیہ'' منظرِ عام پر آئی۔ اس کتاب کے منظرِ عام پر آنے سے قبل اُردو املا، انتخابِ ناسخ، زبان و قواعد کے علاوہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی کی معیاری سیریز کے تحت باغ و بہار، انتخاب سودا جیسی اہم کتابیں منظرِ عام پر آ چکی تھیں۔ اب میں اس کتاب کے مضامین پر کچھ گفتگو کرتا ہوں تاکہ اس کتاب کا مختصر خاکہ قارئین کے سامنے پیش کیا جاسکے۔

''رشید حسن خاں تحریروں کے آئینے میں جلد دوم'' میں شامل مضامین کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں ابتدائی حالاتِ زندگی کیعلاوہ ان کی تحقیقی کاوشوں پر اربابِ قلم نے جو مضامین تحریر کیے ہیں، انھیں شامل کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا دوسرا حصہ تدوین سے متعلق ہے۔ اس حصے میں وہ مضامین شامل ہیں جو ان کی تدوینی خدمات کے سلسلے میں رقم کیے گئے ہیں۔ ان مضامین کا گہرائی اور گیرائی کے ساتھ مطالعہ کرنے کے بعد ہم رشید حسن خاں کی ادبی زندگی کا محاکمہ بالخصوص تحقیق و تدوین کے حوالے سے بہ خوبی کر سکتے ہیں۔ ان مضامین میں بعض مضامین ایسے بھی ہیں جن میں رشید حسن خاں کی تحقیقی و تدوینی خدمات پر سخت اعتراض کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی بعض مضامین میں ان کی تحقیقی و تدوینی خدمات سے اختلاف بھی کیا گیا ہے۔ میرا مقصد ان مضامین کے ذریعے (چاہے وہ اختلافی مضمون ہو یا اعتراضات پر مبنی) قارئین تک وہ باتیں پہنچانا ہے جن تک ان کی رسائی ممکن نہیں۔ کسی بھی ادیب کی زندگی اور اس کے ادبی کارناموں کا محاکمہ اور احتساب غیر جانب دارانہ طور پر اس کی وفات کے بعد آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔ آج رشید حسن خاں ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں لیکن ان کی تحریریں ہمارے سامنے موجود ہیں جن کو پڑھ کر ہم چاہیں تو اتفاق کریں یا اختلاف۔ تحقیق کا مقصد سچ کی تلاش اور بازیافت ہے۔ وہیں تنقید کا

مقصد کھرے کھوٹے کی پہچان کرنا ہے۔ رشید حسن خاں کی تحریریں ہمیں سچ کی بازیافت اور کھرے کھوٹے کی پہچان کرنے میں معاون و مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ بہت سے ادیبوں نے ان کی تحقیق، تدوین اور تنقید یہاں تک کہ املائی خدمات پر اپنی مدلل آرا سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ رشید حسن خاں کی متذکرہ خدمات میں مثبت پہلو کم منفی پہلو زیادہ تھے۔ جعفر علی خاں اثر لکھنوی، اکبر علی خاں، ڈاکٹر ابو محمد سحر، خورشید ملک، مولانا حفیظ الرحمٰن واصف اور پروفیسر نثار احمد فاروقی ایسے ہی قلم کار تھے جنھوں نے رشید حسن خاں کی تحقیق، تدوین، تنقید اور املائی خدمات کے خلاف مضامین سپر دِقلم کیے۔ ان حضرات میں سے مولانا حفیظ الرحمٰن واصف اور ڈاکٹر ابو محمد سحر نے تو رشید حسن خاں کی ادبی خدمات کے خلاف باقاعدہ کتابیں لکھیں۔ اب میں ان مضامین کی جانب رُخ کرتا ہوں جو ''رشید حسن خاں تحریروں کے آئینے میں، جلد دوم'' میں شامل ہیں۔ ان مضامین کا اختصار کے ساتھ یہاں جائزہ پیش کیا جائے گا تاکہ اندازہ کیا جاسکے کہ ان کے معاصرین اور بعد کے لکھنے والے ان کی تحریروں، ادبی کارناموں سے کس حد تک متاثر تھے۔ اس کتاب کے پہلے حصہ میں رشید حسن خاں کی تحقیقی خدمات پر ارباب قلم نے مضامین سپردِقلم کیے ہیں اور دوسرے حصے میں تدوینِ خدمات پر مشاہیر اور معاصرین نے اپنی آرا کو پیش کیا۔

ڈاکٹر تنویر احمد علوی، دہلی یونی ورسٹی میں ایک عرصے تک درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ رہے۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے رشید حسن خاں کی شخصیت اور کارناموں کو نہ صرف غور سے دیکھا بل کہ کئی تحقیقی معاملوں میں دونوں ادبی بزرگوں میں یکسانیت ملتی ہے۔ رشید حسن خاں کی کتاب 'ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ' منظرِ عام پر آئی تو ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے اس پر باقاعدہ ایک مفصل مضمون 'رشید حسن خاں: ایک منفرد محقق' تحریر کیا۔ اس مضمون میں ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے رشید حسن خاں کی اُردو املا کے ذیل میں خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ادبی تحقیق پر اپنی توجہ مرکوز کی۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے رشید حسن خاں کی کتاب ''ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ'' پر مفصل اور سیر حاصل گفتگو کی۔ میں اس مضمون کا ایک پیراگراف قارئین کے لیے پیش کر رہا ہوں تاکہ ادبی تحقیق کے میدان میں رشید حسن خاں نے جو خدمات انجام دیں اُن پر خاں صاحب کا نقطۂ نظر واضح ہو جائے:

> ''رشید حسن خاں کا خاص موضوع ''ادبی تحقیق مسائل و تجزیہ'' ہیں۔ اس میں انھوں نے اپنے مطالعہ کے فکری نتائج اور ان سے استنباط کردہ اصول و نظریات کو پیش کیا ہے۔ رشید حسن خاں کے مضامین کا مجموعہ جو کتابی شکل میں سامنے آیا ہے اُردو زبان کی تحقیق و ادبیات میں بلاشبہ ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ اسی کتاب میں وہ مضامین موجود ہیں جنھوں نے ہمیں ''چونکایا'' ہے اور اس کا بار بار احساس دلایا ہے کہ تحقیق کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔
>
> رشید حسن خاں نے اس موضوع پر اپنی گفتگو بل کہ گفتگوؤں میں بار بار اس پر زور دیا ہے کہ تحقیق تنقید سے الگ ایک دبستان ہے اور تنقیدی تعبیرات سے اس کا کوئی رشتہ نہیں یہ بات وہ غیر مبہم اور واشگاف انداز میں اس لیے کہنا چاہتے ہیں کہ آج کل دانش گاہوں میں ''ریسرچ'' کے نام پر ہر طرح کی ادبی کارگزاریوں اور علمی کاوشوں کو ''تحقیق'' کے دائرہ میں داخل کر لیا گیا ہے اور جس نوعیت کا کام اس عنوان سے کیا جا رہا ہے وہ تحقیق اور تنقید دونوں کے ساتھ ناانصافی ہے۔ اور اس سے غلط مبحث کے لیے بڑی گنجائشیں پیدا ہو گئی ہیں۔''

پروفیسر شارب ردولوی کی شخصیت اور ادبی کارہائے نمایاں سے کون واقف نہیں۔ موصوف کی تنقیدی کتابیں اور تنقیدی شعوری بالیدگی کے نکات کو پڑھ کر نئی نسل نے اس میدان میں قدم رکھا ہے۔ پروفیسر شارب ردولوی نے اپنے مضمون ''رشید حسن خاں اور اُردو تحقیق'' میں اُردو تحقیق اور اس کی روایت پر کا بھرپور محاکمہ پیش کرتے ہوئے اس بات کی جانب واضح اشارہ کیا کہ اُردو میں ادبی تحقیق کی روایت نہیں کے برابر ہے۔ اُردو تحقیق کی جانب توجہ نہ ہونے کے اسباب میں پروفیسر شارب ردولوی نے اس بات کو بانگ دہل لکھا کہ اُردو شاعری کے دونوں دبستانوں یعنی دہلی اور لکھنؤ کے لوگوں کا سارا زور توجہ 'مزاج شاعری، زبان اور محاروں کی درستی' پر رہا۔ پروفیسر شارب ردولوی نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے یہ بھی لکھا کہ اُردو میں تحقیق کو ہمیشہ کم تر درجے کی چیز سمجھا گیا۔ لوگوں نے اسے ہرن پر گھاس لادنے کے مترادف سمجھا یا اسے گورکنی قرار دیا۔ انھوں نے اُردو میں حافظ محمود خاں شیرانی کو تحقیق کا پیش رو مانا ہے۔ انھوں نے عبدالستار صدیقی قاضی عبدالودود اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی کو اُردو تحقیق میں سائنٹفک بنیاد رکھنے والے بنیاد گزاروں میں شمار کیا۔ رشید حسن خاں کے بارے میں ان کا ماننا ہے کہ خاں صاحب جب تک کسی بھی معاملے کے تمام شواہد جمع نہ کر لیں قلم نہیں اُٹھاتے۔ حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، مولانا عرشی، عبدالستار صدیقی کی تحریروں سے رشید حسن خاں نے استفادہ کیا ہے۔ پروفیسر شارب ردولوی نے رشید حسن خاں کی تدوین متن کے سلسلے میں کی گئیں کاوشوں کا اعتراف کیا۔ ان کی نظر میں یہ کاوشیں آنے والی نسلوں کے لیے تدوینِ متن کے عملی نمونے ہیں، جنھیں پڑھ کر آیندہ نسلیں فخر کریں گی۔ پروفیسر صاحب رشید حسن خاں کی ادبی تحقیق اور ان کی محنتِ شاقہ کے بارے میں مزید رقم طراز ہیں:

> ''ادبی تحقیق میں ایک بہت بڑا مسئلہ اختلافِ متن کا ہے۔ اس لیے کہ کبھی کوئی شعر یا عبارت کہیں کس طرح لکھی ہوئی ہے اور کہیں کسی نسخے، بیاض یا تذکرے میں کسی اور طرح یا کوئی لفظ بدل کر۔ اس میں کئی باتوں کا امکان ہے ممکن ہے کہ شاعر یا مصنف نے خود نظرِ ثانی کی ہو اور کسی لفظ، حصے یا ٹکڑے کو تبدیل کر دیا ہو۔ یا کاتب نے نقل میں غلطی کی ہو یا درج کرنے والے نے اپنے حافظے کی بنیاد پر لکھ دیا ہو۔ ان تینوں باتوں کی مثالیں آبِ حیات، باغ و بہار اور فسانۂ عجائب کے مختلف نسخوں میں مل جائیں گی۔ اب اس کا فیصلہ کرنا کہ صحیح کیا ہے اور منشاے مصنف کے مطابق کیا ہے، بڑا صبر آزما اور مشکل کام ہے۔ اس میں کسی ایک نسخے کی بنیاد پر یا عجلت میں کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا جب تک اس سے متعلق تمام ممکن الحصول چیزوں کو نہ دیکھ لیا جائے۔ اس سلسلے میں رشید حسن خاں نے بعض محققین کی غلطیوں کی نشان دہی کی ہے۔ ان میں قاضی عبدالودود کی بھی غلطیوں کا حوالہ دیا ہے۔ قاضی عبدالودود نے تذکرۂ شعرا (مصنفہ ابن امین اللہ طوفان) کے حواشی میں آتش کے شعر پر ناسخ کی اصلاح کے بارے میں آزاد پر اعتراض کیا ہے کہ آزاد نے ان کے دیوان دیکھے بغیر اعتراض جڑ دیا اور اسے نہایت ''غیر ذمہ دارانہ روش'' قرار دیا ہے۔ رشید حسن خاں نے قاضی صاحب کے لیے انھیں کا لہجہ تو نہیں اختیار کیا کہ سوءِ ادب تھا لیکن ان کی غلطی کو نظر بھی نہیں کیا''

پروفیسر ظفر احمد صدیقی رشید حسن خاں کی تحقیقی و تدوینی خدمات کے معترف ہیں۔ پروفیسر ظفر احمد صدیقی سے مرحوم رشید حسن خاں کے ذاتی مراسم تھے۔ دونوں کے درمیان ادبی مسائل پر تبادلۂ خیال کرنے کے لیے خط و کتابت کا سلسلہ ایک طویل عرصے سے تھا۔ رشید حسن خاں کی کتاب ''گنجینۂ معنی کا طلسم، جلد اول'' کو جب غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی نے 2017 میں شائع کیا تو اس کتاب پر پہلا مضمون پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے ہی تحریر کیا تھا۔ یہ مضمون ''سہ ماہی اُردو ادب'' نئی دہلی اور انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی کے ہفت روزہ ''ہماری زبان'' میں شائع ہوا۔ اس مضمون سے قبل پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے رشید حسن خاں کی تحقیقی و تدوینی خدمات پر کئی مضامین سپردِقلم کیے تھے۔ کتاب نما کا گوشۂ رشید حسن خاں 1990 اور کتاب نما کا خصوصی شمارہ رشید حسن خاں 2002 میں بھی پروفیسر ظفر احمد صدیقی

نے مرحوم رشید حسن خاں کی مجموعی ادبی خدمات پر مضامین تحریر کیے۔ اس کتاب میں پروفیسر ظفر احمد صدیقی کے دو مضمون شامل ہیں۔ ایک مضمون میں رشید حسن خاں کی تحقیقی خدمات کا اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے اور دوسرے میں اُردو تدوین نگاری کے تعلق سے رشید حسن خاں کی جاں فشانی اور جاں کاہی کا محاکمہ کیا گیا ہے۔ دونوں مضامین میں پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے اپنی بے باک اور بے لوث تنقیدی آرا کو پیش کیا۔ رشید حسن خاں کی تحقیقی کاوشوں کا بار اتنا زیادہ ہے کہ خود پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے دورِ حاضر کو ادبی قحط الرجال سے تعبیر کیا اور خاں صاحب کی تحقیق کو روحانی تسکین کا سامان قرار دیا۔ بات ترتیبِ متن کی ہو یا تحقیق کے جزئیات و مسائل کے استحضار کی یا مسلسل تحقیقی وسائل کی تلاش و بسیار کی ان سب میں خاں صاحب کو یدطولیٰ حاصل ہے۔ پروفیسر ظفر احمد صدیقی کی نظر میں رشید حسن خاں سب سے اچھا عمل معتبر روایتیں، حق گوئی اور بے باکی کے ساتھ مخلصانہ تحقیقی عمل ہے۔ وہ محنت سے جی نہیں چراتے بل کہ اپنے ہم عصر ساتھیوں کے لیے تحقیق کے میدان میں ایک زمانے سے نمونۂ عمل بنے ہوئے ہیں۔ ان کی محنتِ شاقہ کے آس پاس موجودہ وقت میں کوئی ہم عصر ادیب نہیں ہے۔ ان کی ادبی تحقیق پر کسی کو شبہ تک نہیں ہے۔ علمی احتسابات اور تحقیقی استدراکات ان کی تحقیق کا سرمایۂ افتخار ہے۔ پروفیسر ظفر احمد صدیقی تحقیق و تدوین کے میدان میں قدم رکھنے والوں کو یہ مشورہ بھی دیتے ہیں کہ اگر رشید حسن خاں کی تحقیق کو سمجھنا ہے تو ان کی تحریر کردہ کتابوں کا براہ راست مطالعہ کیا جائے۔ متذکرہ باتوں کو درج ذیل اقتباس سے بہ آسانی سمجھا جا سکتا ہے جس میں پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے رشید حسن خاں کی ادبی تحقیق سے متعلق بہت سی کارآمد باتوں کا تذکرہ کیا ہے:

''اُردو میں ان دنوں تحقیق کا بازار گرم ہے۔ بہ ایں معنی کہ تحقیقی مقالے اس زور و شور سے لکھے جا رہے ہیں کہ ہم سایوں کی نیند اُڑی جا رہی ہے۔ لیکن ذرا گہرائی میں اُتر کر دیکھیے تو احساس ہوگا کہ اُردو تحقیق کی حالت نازک ہے۔ سیکڑوں بل کہ ہزاروں کی بھیڑ میں معدودے چند افراد ہی ایسے ہوں گے جو تحقیقی ذہن و مزاج کے حامل اور اس کے تقاضوں پر عمل پیرا ہوں۔

قحط الرجال کے اس دور میں جناب رشید حسن خاں کی ذاتِ گرامی مغتنماتِ روزگار میں ہے۔ وہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی اور قاضی عبدالودود کی صالح روایت کے امین ہیں۔ دراصل تحقیق ان کے یہاں پیشہ ورانہ مجبوری نہیں، بل کہ روحانی تسکین اور مسرّت و بصیرت کا سامان ہے۔ اس لیے پیشہ ور اور بالجبر محققوں سے ان کا اندازِ تحقیق بھی مختلف ہے۔ اس کے ساتھ ہی قدرت نے انھیں ان صلاحیتوں سے بھی بہرۂ وافر عطا کیا ہے، جو علمی و ادبی تحقیق کے لیے از بس ضروری ہیں، یعنی وسعتِ مطالعہ، قوتِ یادداشت اور کسی خاص موضوع پر کام کرتے وقت اس سے متعلق جزئیات و مسائل کا استحضار۔

ترتیب میں ان سب کے بعد، لیکن اہمیت کے لحاظ سے ان سب سے بڑھ کر دو وصف خاص اور بھی ہیں، جن سے خاں موصوف متصف ہیں، ایک تو وہ پیہم محنت و مشقت اور مسلسل ریاض جو فنی شاہ کاروں کی اساس اور اعلا فن کاروں کی پہچان ہے۔ دوسرے معروضی نقطۂ نظر اور علمی غیر جانب داری جو اشیا کو اپنی اصل شکل میں دیکھنے پر آمادہ کرتی اور حق گوئی و باطل شکنی کی جرأت و ہمت عطا کرتی ہے۔ جناب رشید حسن خاں کی عالمانہ خصوصیات اور محققانہ کارناموں سے واقفیت بہم پہنچانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان کی علمی تحقیقی نگارشات کا براہ راست مطالعہ کیا جائے، تاکہ موصوف کی عرق ریزی اور جاں فشانی اور نکتہ رسی و ژرف بینی قاری کے سامنے بہ ذاتِ خود جلوہ گر ہو جائے۔ لیکن ہماہمی کے اس دور اور مصروف زندگی کے اس شور میں ٹھہرنے، دیکھنے اور غور کرنے کی فرصت کسے ہے؟''

(کتاب نما، رشید حسن خاں حیات اور ادبی خدمات، مرتب اطہر فاروقی، جولائی 2002، صفحہ 107)

ڈاکٹر اشفاق محمد خاں نے اپنے مضمون 'رشید حسن خاں صاحب' میں رشید حسن خاں کے تاریخ اُردو علی گڑھ پر کیے گئے تبصرے کی روداد کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ دراصل جب رشید حسن خاں کا یہ تبصرہ شائع ہوا تو ڈاکٹر اشفاق محمد خاں وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے دفتر میں کام کرتے تھے۔ اس واقعہ کے وہ چشم دید گواہ تھے کہ کس طرح وائس چانسلر نے ایک تبصرے کے شائع ہونے کے بعد تاریخ ادب اُردو علی گڑھ کی تمام کاپیاں بازار سے واپس منگوالی تھیں۔ ڈاکٹر اشفاق محمد خاں نے اس مضمون میں بتایا ہے کہ وہ کس طرح فیض کی شاعری پر کیے گئے خاں صاحب کے تبصرے سے متاثر ہوئے۔ ڈاکٹر اشفاق محمد خاں جب جے این یو میں مستقل طور پر ملازمت کرنے لگے تو ان کی ملاقات یہیں پر رشید حسن خاں سے ہوتی تھی۔ ڈاکٹر اشفاق محمد خاں کے مطابق رشید حسن خاں کا قلم تلوار سے بھی تیز اور چمک دار تھا۔ جس کے وار سہنا ہر کس و ناکس کے بس میں نہیں تھا۔ ڈاکٹر اشفاق محمد خاں نے اپنی بات کو کچھ اس انداز میں کہا:

''رشید حسن خاں صاحب جن کے اسلاف اگر تلوار کے دھنی تھے تو خود رشید حسن خاں کے حصے میں ایک ایسا علم آیا ہے جو تلوار کی دھار سے بھی زیادہ دھار دار ہے۔ فیض احمد فیض کی شاعری پر قلم اُٹھانے کی جرأت خاں صاحب سے پہلے کسی کو نہیں ہوئی انھوں نے روایتی تنقید نگاری سے ہٹ کر منفرد اسلوب اور منفرد تنقیدی نقطۂ نظر سے ''فیض کی شاعری کے چند پہلو'، پر جس حکیمانہ انداز سے تبصرہ فرمایا ہے یہ ان ہی کا حصہ ہے اور سچ یہ ہے کہ خاں صاحب سے میری دل چسپی اور قربت و یگانگت کا دوسرا پہلو یہ مضمون بھی ہے۔ چناں چہ میں نے اپنی طبیعت کے مطابق خاں صاحب کے تمام مضامین (تلاش و تعبیر) ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالے۔ عرصہ دراز کے بعد کسی کتاب کے پڑھنے میں بڑا ہی مزہ آیا، خاں صاحب کا شائستہ لہجہ شگفتہ زبان اور رواں دواں اسلوب بیان میں حقائق کا بے باکانہ بیان دماغ کی بند کھڑکیوں کو دھڑا دھڑ کھولتا چلا جاتا ہے۔''

دہلی یونی ورسٹی شعبۂ اُردو کے سابق صدر پروفیسر ابنِ کنول نے اپنے مضمون میں رشید حسن خاں کے فن، شخصیت اور تحقیقی کاوشوں پر ناقدانہ گفتگو کی ہے۔ موصوف نے اپنے مضمون میں اُن ایام کو بھی یاد کیا ہے جن میں خود پروفیسر ابنِ کنول کو براہِ راست رشید حسن خاں سے تحقیق، تدوین، تنقید، املا، لغت اور دوسرے ادبی نکات پر تبادلۂ خیال کرنے یا سیکھنے کا موقع ملا۔ پروفیسر ابنِ کنول نے اس بات کی بھی وضاحت کی کہ جب رشید حسن خاں دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو سے وابستہ تھے اور فسانۂ عجائب کی تدوین کا کام کر رہے تھے تو اختلافِ متن کی نشان دہی کے لیے علوی صاحب، نورانی صاحب، عبدالحئ صاحب اور خود راقم کے ہاتھوں میں ایک ایک نسخہ فسانۂ عجائب کا ہوتا تھا اور خود رشید حسن خاں اپنے نسخے کی قرأت کرتے جاتے، ہم تمام لوگ اختلافِ نسخ کی نشان دہی کرتے۔ اس بارے میں پروفیسر ابنِ کنول یوں رقم طراز ہیں:

''موجودہ عہد میں بعض محققین ہمارے لیے قابلِ احترام ہیں ان میں رشید حسن خاں کا نام سرِفہرست ہے۔ انھوں نے انتہائی محنت اور لگن سے صرف قدیم متون کو ترتیب دیا ہے بل کہ اُردو املا، قواعد زبان اور لغت کے بارے میں بھی بہت کچھ تحریر کیا ہے۔ یوں تو رشید حسن خاں کا تعلق شاہ جہاں پور سے ہے، لیکن یہ ہمارے لیے فخر کی بات ہے کہ ان کی زندگی کا

بیش تر حصہ شعبۂ اُردو، دہلی یونی ورسٹی میں گزرا۔ انھوں نے اپنے بیش تر تحقیقی کام اسی شعبہ سے وابستگی کے دوران کیے۔ خود راقم نے بھی ان کے تحقیقی کاموں میں شرکت کی ہے۔ فسانۂ عجائب کی ترتیب کے وقت اختلافِ نُسخ کی نشان دہی کے لیے علوی صاحب، نورانی صاحب، عبدالحئی صاحب کے علاوہ ایک نسخہ میرے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ رشید صاحب بنیادی نسخے کی قرأت کرتے تھے اور ہم لوگ اختلافات کی نشان دہی کرتے جاتے۔''

(تحقیق وتدوین، پروفیسر ابنِ کنول، کتابی دنیا، دہلی 6، اشاعت 2006، صفحہ 225)

بنارس ہندو یونی ورسٹی کے صدر شعبۂ اُردو ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی کا شمار رشید حسن خاں کے نیاز مندوں میں ہوتا ہے۔ ان کے نام رشید حسن خاں کے کئی خطوط ہیں جو منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی جب دہلی میں ملازمت کرتے تھے تو ان کا براہِ راست رابطہ رشید حسن خاں سے تھا۔ ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی رشید حسن کے تحقیقی تصورات سے بہت متاثر ہیں۔ انھوں نے اپنی تحقیقی کاوشوں میں رشید حسن خاں کے بنائے ہوئے اصولوں کو اپنایا۔ ابھی گذشتہ دنوں ان کی کتاب 'مضامین چکبست' منظرِ عام پر آئی۔ اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد قارئین کو ان کے تحقیقی کاوشوں کا معترف ہونا پڑتا ہے۔ بنارس ہندو یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو کے ششماہی مجلّہ 'دستک' میں ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی کے تحقیقی نظریات سے واقفیت حاصل کی جاسکتی ہے۔ ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی نے اپنے مضمون 'رشید حسن خاں کے تحقیقی تصورات' میں ان کی کتاب 'ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ' کا تحقیقی وتنقیدی تجزیہ پیش کیا ہے۔ مضمون کی پہلی سطر میں موصوف نے اُردو زبان کو برصغیر کی تہذیبی وثقافتی زبان قرار دیا ہے۔ علاوہ ازیں اس مضمون میں ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی نے جن محققین کے اسما اور کام کو اُردو تحقیق کے مضبوط دستخط تسلیم کیا ان میں رشید حسن خاں کے علاوہ، تنویر احمد علوی، مختار الدین احمد، نثار احمد فاروقی، حنیف احمد نقوی اور خلیق انجم کے نام قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی نے رشید حسن خاں کو حق گو اور بے باک محقق کے سبب اُردو ادب کا سب سے مشہور محقق گردانا ہے۔ اس کی وجہ بتاتے ہوئے موصوف نے لکھا کہ قاضی عبدالودود کے تحقیقی تصورات کو جس محقق نے عملاً اپنی زندگی اور تحریروں میں وسعت کے ساتھ پیش کیا وہ نام رشید حسن خاں کا ہے۔ اس مضمون کے اقتباس سے رشید حسن خاں کے بارے میں ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی کے تصورات کو بہ آسانی سمجھا جاسکتا ہے:

''یہ درست ہے کہ تحقیق کے اصول، دائرہ کار اور محقق کے اوصاف کے متعلق قاضی صاحب کے خیالات سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن رشید حسن خاں نے ان تصورات کی نہ صرف توسیع کی بل کہ اپنی تحقیقی تحریروں میں انھیں عملاً برتا بھی۔ اس کا بیّن ثبوت ان کی کتاب ''ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ'' ہے، جس میں ان کے تصورِ تحقیق، مطالعے کے فکری نتائج اور ان سے استخراج کردہ اصول ونظریات کے اطلاقی پہلو بڑی شد ومد کے ساتھ اُبھرتے نظر آتے ہیں، جو ادبی تحقیق کے طریقۂ کار اور اس کے اصولوں کے مسائل اور مشکلات کو صحیح طور پر سمجھنے میں ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ تصورات اُردو تحقیق میں اضافے کا حکم رکھتے ہیں۔ پہلو بہ پہلو غور وفکر کے ساتھ احتساب پر مجبور کرتے ہیں۔ اسی کتاب میں انھوں نے تحقیق کے مبادیات کی جہاں توضیح وتشریح کی وہیں تحقیق کیا ہے اور کیا نہیں ہے؟ جیسے مسئلے پر مدلل روشنی ڈالی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس نوع کی تحریر کا مقصد نئی نسل کی ذہنی وفکری تربیت بھی کرنا تھا، بالخصوص جامعات اور دانش گاہوں کے اساتذہ اور طلبا یکساں طور پر ان کے دائرۂ فکر میں رہے جہاں ریسرچ کے نام پر ادبی کارگزاریوں کو بھی تحقیق کے دائرے میں داخل کرلیا گیا ہے جس سے خلط مبحث کے لیے بڑی گنجایش پیدا ہوگئی ہے۔ ان شعبوں کا سب سے افسوس ناک پہلو بقول رشید حسن خاں یہ ہے کہ: عام سماجی زندگی میں جو بے ترتیبی ہے اور جاہ ومنصب کی ہوس جس طرح گھیرے میں لیے ہوئے ہے، وہی صورتِ حال علمی اداروں میں بھی رونما ہوتی جارہی ہے اور اچھے اُستاد اور اچھے دُنیادار کا فرق گویا اُٹھتا جارہا ہے۔''

لاہور سے تعلق سے رکھنے والے ناقد ومحقق رفاقت علی شاہد بھی رشید حسن خاں کے مداح اور نیاز مند ہیں۔ انھوں نے خود کو تحقیق کا طالب علم قرار دیتے ہوئے رشید حسن خاں کی تحریروں اور نظریات سے فیض حاصل کرنے کی بات کہی ہے۔ رفاقت علی شاہد نے رشید حسن خاں کو 'جامع محقق' کے علاوہ نابغۂ روزگار شخصیت قرار دیتے ہوئے ان کی اندر چھپی ہوئی خداداد صلاحیتوں کا استعمال کرنے والا شخص تسلیم کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے یہ بھی لکھا کہ خاں صاحب نے اپنے علم اور صلاحیت کے بوتے جو ادبی خزانہ ہمارے لیے چھوڑا ہے اس کے لیے تمام اُردو والوں کو ان کا احسان مند ہونا چاہیے۔ انھیں اس بات کا ہمیشہ قلق رہا کہ دہلی پانچ مرتبہ آنے کے بعد بھی رشید حسن خاں سے ملاقات نہ ہوسکی۔ ملاقات کا ذریعہ ٹیلی فون اور خطوط تھے۔ 2000 میں رفاقت علی شاہد کی کتاب 'اُردو مخطوطات کی فہرستیں، جلد اول' جب منظرِ عام پر آئی تو انھوں نے ایک کاپی رشید حسن خاں کی خدمت میں 'آپ کے استفادے کے لیے' لکھ کر ارسال کی۔ اس نامناسب جملے کا احساس رفاقت علی شاہد کو بھی تھا۔ لیکن رشید حسن خاں نے اس جملے کا جواب بھی اسی انداز میں دیا اور لکھا ''آپ نے اس کتاب کے لیے لکھا ہے کہ اسے 'آپ کے استفادے کے لیے ارسال کررہا ہوں' اس کے لیے خاص کر مشکور ہوں، ضرور استفادہ کروں گا''۔ رفاقت علی شاہد نے رشید حسن خاں کو اُردو کا سب بڑا معیاری محقق تسلیم کیا ہے۔ رفاقت علی شاہد کا یہ بھی ماننا ہے کہ اُردو کے محققین کی نگارشات پر نظر ڈالنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کوئی بھی محقق خاں صاحب کے مقدار اور معیار کو نہیں پہنچ پایا ہے۔ ان کا یہ بھی ماننا ہے کہ خاں صاحب نے نظریاتی تحقیق وتدوین کے اصول وضوابط کی مدد سے اُردو ادب میں جو منفرد کارہائے نمایاں انجام دیے وہ قابلِ رشک ہیں۔ اس مضمون کا میں ایک اقتباس یہاں پیش کررہا ہوں تاکہ آپ رفاقت علی شاہد کے نقطۂ نظر سے واقف ہوسکیں:

''میں خاں صاحب کو اُردو کا ''جامع محقق'' مانتا ہوں اور کہتا ہوں۔ مولانا شبلی سے لے کر خاں صاحب تک کے تمام محققین کی تحقیقی خدمات پر نظر دوڑائیے۔ حافظ محمود شیرانی ہوں یا قاضی عبدالودود، مولانا امتیاز علی عرشی ہوں یا مسعود حسن رضوی ادیب، عبدالقادر سروری ہوں یا مالک رام، ڈاکٹر محی الدین قادری زور ہوں یا محمد اکبرالدین صدیقی، سخاوت مرزا ہوں یا ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر شیام لال کالڑا عابد پیشاوری ہوں یا حنیف نقوی اور مرحوم مشفق خواجہ ہوں یا ڈاکٹر خلیق انجم۔ کسی محقق کا تحقیق وتدوینی کام مقدار میں (یقیناً) اور معیار میں (بڑی حد تک) خاں صاحب کے مقدار اور معیار کو نہیں پہنچتا۔ غور کیجیے تو پتا چلتا ہے کہ تقریباً تمام محققین یا تو یک رُخے تھے یا دو رُخے۔ کسی نے اطلاقی تحقیق میں خدمات انجام دیں تو کسی کو تدوین کے حوالے سے پہچان ملی اور بیش تر محققین تدوین اور اطلاقی تحقیق کے حوالے سے پہچانے گئے۔ لیکن خاں صاحب نے نظری تحقیق میں بھی اہم اور قابل قدر تحریریں چھوڑیں ہیں۔ انھوں نے نظری یا نظریاتی تحقیق سے متعلق اس قدر اور اپنے علمی تجربات کی بنیاد پر اس معیار کی تحریریں چھوڑیں ہیں، جن کی مدد سے تحقیق وتدوین کے اصول وضوابط منضبط ہوئے ہیں۔ اطلاقی تحقیق پر اُن کے مضامین قاضی عبدالودود کی یاد دلاتے ہیں اور تدوین متن میں اُن کی خدمات منفرد، بے مثال اور قابلِ تقلید ہیں۔ تدوین کے تینوں

میدانوں میں بیک وقت مقدار و معیار میں اس قدر اہم تحریریں اس سے قبل کسی محقق کو نصیب نہیں ہوسکیں۔ خاں صاحب کی یہ انفرادیت شاید عرصۂ دراز تک برقرار ہے۔''

وقار ناصری نے اپنے مضمون 'رشید حسن خاں: ایک محقق' میں رشید حسن خاں کے اُن تحقیقی تبصروں اور تجزیوں پر نظرِ ثانی کی ہے جن کی وجہ سے ان کا نام اُردو ادب میں محترم ہو گیا تھا۔ رشید حسن خاں کے ابتدائی زمانے کے مضامین جو رسالہ تحریک اور الحمرء میں شائع ہوتے تھے کو وقار ناصری نے اپنے مضمون کی اساس بنایا۔ اس مضمون میں وقار ناصری نے رشید حسن خاں کے مضامین کو لازوال مضامین گردانا ہے۔ وقار ناصری نے اپنے مضمون میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ رشید حسن خاں نے اپنے ادبی سفر کی شروعات ''شبلی کا فارسی تغزل، نگار، لکھنؤ، مئی 1950'' سے کی۔ اس کے بعد انھوں نے دیگر شعرا کے کلام، بیان اور زبان سے لے کر تشبیہ و استعارہ تک کتنے ہی اعتراضات اپنے مضامین میں پیش کیے۔ وقار ناصر نے رشید حسن خاں کے جن اہم مضامین کی نشان دہی کی ان میں 'فیض اور ان کی شاعری'، 'تنقیدی جانب داری کے اسباب اور اثرات'، 'زبان و بیان کے بعض پہلو'، 'غزل اور ترقی پسندی'، 'ثقافتِ پاکستان'، 'دیوانِ خاقانی'، 'تاریخ ادب اُردو (جمیل جالبی)'، 'اُردو شاعری کا انتخاب'، 'غالب صدی اڈیشن'، 'لغت ترقی اُردو بورڈ کراچی' وغیرہ پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ وقار ناصری نے اپنے مضمون میں رشید حسن خاں کی تحقیق کو 'عہد ساز تحقیق' قرار دیا۔

رشید حسن خاں سے پروفیسر مجاور حسین رضوی کی ملاقات ڈاکٹر سید محمد عقیل کی وساطت سے ہوئی۔ اس ملاقات کے بعد پروفیسر مجاور حسین رضوی کو رشید حسن خاں کے کارناموں بالخصوص کلاسکی متن کی تدوین میں دل چسپی پیدا ہوئی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ پروفیسر مجاور حسین کا میدان بھی اُردو ادب کی داستانیں ہے۔ 1995 میں پروفیسر مجاور حسین رضوی نے رشید حسن خاں کی مرتب کردہ کتاب 'باغ و بہار' پر تبصرہ تحریر کیا۔ اسی دوران انھیں یہ بھی معلوم ہوا کہ خاں صاحب فسانۂ عجائب کو بھی مرتب کر چکے ہیں۔ پروفیسر مجاور حسین نے خاں صاحب کی وفات کے بعد لکھے گئے اپنے مضمون '' آزاد اور بے باک محقق'' میں کئی انکشافات کیے بالخصوص اُردو اشعار کی غلط قرأت اور کتابوں میں درج غلط اشعار کی نشان دہی خاں صاحب نے اپنی محنتِ شاقہ سے کی۔ انھیں خاں صاحب کے ایک مضمون سے یہ بھی معلوم ہوا کہ میر تقی میرؔ کا ایک بہت مشہور شعر ؎

سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

جو غلط پڑھا جاتا ہے کو خاں صاحب نے اپنی تحقیق سے ثابت کیا کہ یہ شعر اس طرح ہے:

سرہانے میرؔ کے کوئی نہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

اسی طرح مرزا محمد رفیع سوداؔ کا یہ مشہور شعر ؎

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اسے خانہ بر اندازِ چمن کچھ تو اِدھر بھی

کے متن کے تعلق سے رشید حسن خاں نے اپنی تحقیق میں ثابت کیا کہ مرزا محمد رفیع سوداؔ کے شعر کا متن اس طرح ہے:

گل پھینکے ہے عالم کی طرف بل کہ ثمر بھی
اے خانہ بر اندازِ چمن کچھ اِدھر بھی

اسی طرح خواجہ معین الدین چشتی اجمیری سے منسوب رباعی جو درگاہ اجمیر شریف میں لکھی ہوئی ہے:

شاہ است حسین بادشاہ است حسین
دین است حسین دیں پناہ است حسین
سرداد نہ داد دست در دست یزید
حقّا کہ بنائے لا الٰہ است حسین

کو رشید حسن خاں نے اپنی تحقیق، تلاش و بسیار کے بعد ثابت کیا یہ رباعی خواجہ اجمیری کی نہیں۔ پروفیسر مجاور حسین کو رشید حسن خاں سے نظریاتی اختلافات ہونے کے باوجود انھوں نے ان کے صبر اور تحمل اور تحقیقی و تنقیدی زاویۂ نظر کی خوب تعریفیں کی ہیں۔

پاکستان میں رشید حسن خاں کے سب سے بڑے مداح اور عزیز دوست ماہرِ اقبالیات پروفیسر رفیع الدین ہاشمی نے اپنے مضمون میں رشید حسن خاں کو 'تحقیق و تدوین کا مردِ میداں' قرار دیا۔ رفیع الدین ہاشمی سے خاں صاحب کے دیرینہ تعلقات تھے۔ رشید حسن خاں نے جب پاکستان کا دورہ کیا تو لاہور میں ان کے اعزاز میں ایک ادبی جلسے کا انعقاد کیا گیا۔ یہاں تک کہ کئی اخبارات مثلاً 'نوائے وقت اور جسارت' میں ان کے انٹرویوز شائع ہوئے۔ ان انٹرویوز میں خاں صاحب نے تحقیق، تدوین کے علاوہ ہم عصر ادبی منظر نامے پر بے باک انداز میں اظہارِ خیال پیش کیا۔ رشید حسن خاں اور پروفیسر رفیع الدین ہاشمی دونوں مل کر کلامِ اقبال کی تدوین بھی کرنا چاہتے تھے۔ اس اہم ادبی پروجیکٹ کے منظرِ عام پر آنے سے پہلے ہی رشید حسن خاں اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ اس طرح یہ پروجیکٹ نامکمل رہ گیا۔ پروفیسر رفیع الدین ہاشمی نے ایم اے کی طالبہ مسرت انیس سے 'رشید حسن خاں احوال و آثار' کے عنوان سے ڈزرٹیشن لکھوایا۔ اس مقالے کی خاص بات یہ رہی کہ خود رشید حسن خاں نے اپنی گذشتہ زندگی کے بارے میں ایک تفصیلی مضمون 'کچھ اپنے بارے میں' لکھ کر پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کے پتے پر ارسال کیا۔ پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کے نیاز مند ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد نے خاں صاحب اور رفیع الدین ہاشمی کے مابین ہوئی خط و کتابت کو 'مکاتیبِ رشید حسن خاں بنام رفیع الدین ہاشمی' کے عنوان سے جون 2009 میں لاہور سے شائع کیا۔ رفیع الدین ہاشمی، رشید حسن خاں کی تدوینی خدمات کے دلدادہ ہیں۔ رفیع الدین ہاشمی

دھچکہ لگا۔جیسا کہ میں ماقبل تحریر کر چکا ہوں کہ یہ دونوں ادبی بزرگ' کلامِ اقبال' کا ایک معیاری تنقیدی اڈیشن تیار کرنے کا منصوبہ بنائے ہوئے تھے۔اس تعلق سے دونوں کے مابین خط و کتابت بھی ہوتی تھی۔رفیع الدین ہاشمی نے اپنے مضمون میں ان تمام نکات پر تبادلۂ خیال پیش کیا ہے۔یہاں تک رشید حسن خاں کے نامکمل ادبی کاموں کی بھی نشان دہی انھوں نے کی ہے۔رشید حسن خاں 'امراؤ جان ادا' اور 'غرائب اللغات' کی از سرِ نو تدوین کرنا چاہتے تھے۔رشید حسن خاں کے کلامِ اقبال کی تدوین کے مصمم ارادے اور دوسری ادبی سرگرمیوں کے بارے میں رفیع الدین ہاشمی مزید معلومات فراہم کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''آخری زمانے میں انھوں نے 'امراؤ جان ادا' اور 'عبدالواسع ہانسوی کی 'غرائب اللغات' مرتّب کرنے کا ''عزم کر رکھا تھا۔موخرالذکر پر تو کام شروع کر دیا تھا، 39 صفحات کا مسودہ تیار ہو گیا تھا مگر پھر یہ کام 'مستقلاً ملتوی کر دیا' (مکتوب 6 دسمبر 2005 بنام راقم)۔البتہ حیاتِ مستعار کے آخری برس (2005 میں) انھوں نے ڈاکٹر خلیق انجم کی تحریک و تجویز پر 'کلیاتِ اقبال' اُردو کی تدوین کا پختہ عزم کر لیا تھا اور معاونت کے لیے خاں صاحب نے اس ناچیز کو شریکِ تدوین کیا تھا۔ہم نے اس کام کا ایک نقشہ بنایا، طریق کار طے کیا۔میں نے انھیں ضروری کتابیں، کلامِ اقبال کی بعض بیاضیں اور متفرق لوازمہ بھیجا۔خاں صاحب کے ایک مداح اور نیاز مند جناب عبدالوہاب خاں سلیم ہر طرح سے ان کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے، مگر خرابیِ صحت کے سبب یہ کام شروع کرنے میں تاخیر ہوتی رہی۔راقم کے نام ایک خط میں عیدالاضحیٰ کے بعد یہ کام بالفعل شروع کر دینے کا عزم ظاہر کیا تھا (ممکن ہے آغاز کر بھی دیا ہو)۔وہ طویل عرصے سے متعدد عوارض کا شکار چلے آ رہے تھے۔ذیابطیس، عارضۂ قلب اور بے خوابی۔ایک زمانے میں پھیپھڑوں کی خرابی میں بھی مبتلا رہے۔6 دسمبر 2005 کے ایک خط (بنام راقم الحروف) میں لکھا: ''سردی کا موسم مجھے راس نہیں آتا۔اب پچھلے مہینے کے اواخر سے احوال یہ ہے کہ سر جھکا کر ذرا دیر بھی نہیں بیٹھ سکتا ریزش، چھینکیں اور آنکھوں سے پانی بہنے لگتا ہے لکھنا پڑھنا بند ہے''۔اس کے باوجود عزم یہ تھا کہ ''میں اقبال والے کام کو مثالی کام کے طور پر مکمل کرنا چاہتا ہوں۔اس میں دو سال تو لگ جائیں گے''۔راقم خوش تھا کہ خاں صاحب جیسے محقق اور نقاد نے اقبالیات کی جانب اعتنا کیا ہے، اسے میں نے اقبالیات کی خوش قسمتی جانا، لیکن کیا خبر تھی کہ یہ خوشی عارضی ہو گی اور وہ اقبالیات تو ایک طرف، دُنیائے فانی ہی سے منہ موڑ کر، اُردو ادب خصوصاً دُنیائے تحقیق و تدوین اور اپنے مداحوں اور قدر دانوں کو سوگوار کر جائیں گے۔خدا اُن کی مغفرت کرے اور اُن کی روح کو آسودہ رکھے، آمین۔''

اُردو ادب کے مشہور فکشن نگار اور اپنے ناولوں، افسانوں میں دیومالائی عناصر کو نئے لب و لہجے کے ساتھ پیش کرنے والے انتظار حسین نے رشید حسن خاں کو ''تعمیری محقق'' کے لقب سے نوازا ہے۔انتظار حسین کے نزدیک 'رشید حسن خاں کی تحقیق کا معاملہ غالب کی قصیدہ نگاری کا سا ہے۔'یعنی مرزا غالب نے ایک سے زیادہ جس کی مدح میں قصیدہ کہے وہ راہیِ عدم ہو گیا، ٹھیک ویسے ہی رشید حسن خاں نے جس کتاب پر تحقیقی تبصرے کیے وہ کتاب بھی قصۂ پارینہ بن گئی۔

میرٹھ کالج میرٹھ کے سابق صدر شعبۂ اُردو اور رشید حسن خاں سے کسب فیض حاصل کرنے والے ڈاکٹر خالد حسین خاں نے رشید حسن خاں کو محقق یگانہ بتایا ہے۔انھوں نے اپنے مضمون میں رشید حسن خاں کا دل کش اور بہترین خاکا بھی رقم کیا ہے۔ساتھ ہی ڈاکٹر خالد حسین خاں نے اپنے مضمون میں رشید حسن خاں کی تحقیقی کاوشوں کا تحقیقی محاکمہ پیش کیا ہے۔

انوار الحسن وسطوی نے اپنے مضمون 'رشید حسن خاں: ایک دیدہ ور محقق' میں رشید حسن خاں کی جملہ ادبی خدمات کا جائزہ پیش کیا۔ڈاکٹر ظفر کمالی نے اپنے طویل اور معلوماتی مضمون میں رشید حسن خاں کی کتاب 'ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ' پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ڈاکٹر ظفر کمالی کی رشید حسن خاں سے ملاقات پٹنہ کے سمینار میں ہو چکی ہے۔ڈاکٹر ظفر کمالی نے اپنی تحریروں میں رشید حسن خاں کو خوب سے خوب تر یاد کیا ہے۔انھوں نے رشید حسن خاں کو قاضی عبدالودود کا سچا جانشیں قرار دیا ہے۔ڈاکٹر ظفر کمالی نے اس مضمون میں یہ اعتراف بھی کیا کہ رشید حسن خاں نے اس کتاب میں جتنی توجہ تحقیق کے مسائل پر مرکوز کی اُتنی ہی توجہ جزئیات اور ذیلیات پر بھی کی۔ساتھ ہی موصوف نے یہ بھی تحریر کیا کہ تا عمر رشید حسن خاں اپنے تحقیقی اصولوں پر کاربند رہے۔اور یہ بھی لکھا کہ 'جو لوگ تحقیق کی دنیا میں قدم رکھنا چاہتے ہوں اور وہ سرخ روئی و سرفرازی کے بھی متمنی ہوں تو انھیں ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ کو وظیفے کے طور پر پڑھنا چاہیے۔'

ڈاکٹر محمد سعید (اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، جی سی یونی ورسٹی لاہور) نے رشید حسن خاں کو 'اُردو کا پہلا ترقی پسند محقق' قرار دیا ہے۔اس ضمن میں انھوں نے اپنے دعوؤں کو صحیح ثابت کرنے کے لیے دلائل پیش کیے۔رشید حسن خاں کو اُردو کا پہلا ترقی پسند محقق ماننے یا تسلیم کرنے کی خاص وجہ ان کا آرڈیننس کلودنگ فیکٹری شاہ جہاں پور میں کام کرنا ہے اور یہاں پر ان کے مراسم کمیونسٹ پارٹی کے اعلا رہنماؤں سے تھے۔فیکٹری میں ہڑتال کرنے والوں میں بھی رشید حسن خاں پیش پیش تھے۔جس وقت رشید حسن خاں اس فیکٹری میں ایک مزدور کی حیثیت سے کام کر رہے تھے اُس وقت ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کا غلغلہ ادبی فضاؤں میں تھا۔لیکن حیرانی کی بات یہ بھی ہے کہ رشید حسن خاں کبھی بھی ترقی پسند شاعروں اور افسانہ نگاروں کو خاطر میں نہیں لائے۔انھوں نے اپنے مضامین میں ترقی پسند ادیبوں پر سخت تنقید کی۔لیکن ڈاکٹر محمد سعید نے اپنے مضمون میں جو بحث کی ہے اُس کی اساس رشید حسن خاں کے ان ایام کو بنایا جو انھوں نے درزی خانے میں گزارے تھے۔یا اُن واقعات پر اپنی قوت کو موصوف نے صرف کیا ہے جب انھیں فیکٹری سے نکال دیا گیا اور متفرق ملازمتوں کے سلسلے میں ایک جگہ سے دوسری جگہ رشید حسن خاں کو جانا پڑا۔اس ضمن میں میرا ماننا یہ ہے کہ رشید حسن خاں نے جو بھی تحقیقی و تدوینی کارنامے انجام دیے وہ کسی بھی تحریک (ترقی پسند تحریک، جدیدیت، ادبِ اسلامی، مابعد جدیدیت، ساختیات، پس ساختیات وغیرہ) سے وابستہ ہو کر نہیں کیے۔البتہ ان کے ہر تحریک یا رجحان سے وابستہ ادیبوں سے ذاتی مراسم تھے اور متفرق تحریکوں سے وابستہ افراد بھی یہ خوبی جانتے تھے کہ رشید حسن خاں کو کسی بھی نظریے یا تحریک سے جڑ کر کام کرنا پسند نہیں ہے۔اس موقع پر میں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہر تحریک اور نظریے کے حامی ادیبوں نے ان کے ادبی کارہائے نمایاں کی خوب تعریفیں کی ہیں۔ویسے خود رشید حسن خاں بھی ہر تحریک اور رجحان کی تحریروں کو پڑھ کر محظوظ ہوتے تھے اور اگر انھیں یہ محسوس ہوتا تھا کہ ان کے نظریات میں کہیں خلاء پیدا ہو گیا ہے تو ان تحریکوں رجحانوں یا نظریات کے خلاف بھی وہ اکثر مضمون سپرد قلم کر دیا کرتے تھے۔ویسے غور کرنے والی بات یہ بھی ہے کہ ٹریڈ یونین میں شامل ہو جانا یا کسی فیکٹری میں کام کرنا، کسی تحریک کا حمایتی یا وفادار نہیں بن جاتا۔اگر ڈاکٹر محمد سعید اس بارے میں بھی لکھتے یا رشید حسن خاں کے اُن مضامین کے بھی حوالے پیش کرتے جس میں انھوں نے ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کے زیر اثر لکھنے والوں کو خوب لتاڑا ہے، تو زیادہ بہتر اور مناسب ہوتا۔

پروفیسر حنیف نقوی سے رشید حسن خاں کے مراسم بہت ہی گہرے تھے۔ان دونوں ادبی بزرگوں کے سامنے جب بھی کوئی ادبی مسئلہ درپیش ہوتا تو یہ صاحبان بہ ذریعہ خط ان مسائل پر تبادلۂ خیال

پیش کرتے۔ پروفیسر حنیف نقوی نے رشید حسن خاں کی تحقیقی و تدوینی خدمات کے صلے میں کئی مضامین رقم کیے ہیں۔ رشید حسن خاں کی کتاب ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ کے حوالے سے پروفیسر حنیف نقوی نے ایک مضمون تحریر کیا۔ دراصل اس مضمون میں پروفیسر حنیف نقوی نے رشید حسن خاں کی تاریخ نگاری، اصول ونظریات پر تفصیلی تنقیدی گفتگو کی ہے۔ اپنے مضمون میں پروفیسر حنیف نقوی نے اس کتاب کے دوسرے حصے میں شامل اُن چار تبصروں اور تجزیوں (دیوانِ غالب صدی اڈیشن، اُردو شاعری کا انتخاب، علی گڑھ تاریخ ادب اُردو اور تاریخ ادب اُردو کراچی) میں سے صرف آخری دو تبصروں کو موضوعِ بحث بنایا جن کے باعث رشید حسن خاں تحقیق کی دنیا میں محترم ہوگئے تھے۔ دراصل پروفیسر حنیف نے رشید حسن خاں کی تحقیقی تاریخ نگاری کے معترف ہیں۔ انھوں نے اپنے مضمون میں جگہ جگہ اس بات کی جانب واضح اشارے کیے کہ رشید حسن خاں وہ واحد محقق ہیں جنھوں نے اپنے بے لاگ اور دوٹوک انداز تحریر سے بڑے بڑے لکھنے والوں کی تاریخ وسنین کے حوالے سے گرفت کی۔ ادبی تاریخ کے حوالوں پر رشید حسن خاں کی دسترس اور التزام ایک غیر یقینی عمل ہے۔ رشید حسن خاں نے کبھی بھی ثانوی ماخذ کے حوالوں کو ادبی تحقیق کے لیے سودمند نہیں مانا۔ انھوں نے ہمیشہ اصل ماخذ سے ہی استفادہ کیا، چاہے اس کے لیے انھیں کتنے ہی برس انتظار کیوں نہ کرنا پڑا ہو۔ بقول خاں صاحب جب ہمارے اساتذہ تحقیقی حوالوں کے اعتبار سے تن آسانی اور سہل پسندی کے شکار ہو جائیں گے تو اس پُر آشوب ماحول میں طلبا کا کیا حال ہوگا؟ پروفیسر حنیف کی نظر میں رشید حسن خاں قاضی عبدالودود کے بعد وہ شخص ہیں جنھوں نے اوہام اور مفروضات کے ہر بُت کو توڑا۔

دہلی اُردو اکادمی میں اپنی خدمت انجام دے رہے ڈاکٹر منور حسن کمال نے رشید حسن خاں کی ادبی خدمات، شخصیت اور فن پر مضمون سپر دِ قلم کیا ہے۔ رشید حسن خاں اور اصولِ تحقیق کو انھوں نے اپنے مضمون کی بنیاد بنایا۔ منور حسن کمال نے خاں صاحب کی استنادی حیثیت اور ان کے تحقیقی فیصلوں میں کسی نوع کی لچک اور دورنگی پن کا نہ ہونے کو سب سے بڑی خصوصیت بتایا ہے۔ صائمہ سعید (جھنگ، پاکستان) نے اپنے مضمون 'رشید حسن خاں بہ حیثیت محقق' میں رشید حسن خاں کی تحقیقی و تدوینی کاوشوں اور محنتِ شاقہ کا اجمالی جائزہ پیش کیا ہے۔ کرناٹک سے تعلق رکھنے والے سید منظور احمد کو رشید حسن خاں سے براہِ راست استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ این سی ای آر ٹی کی جانب سے 1987 میں املا کے ورک شاپ کا انعقاد میسور میں ہوا تھا، یہیں پر ان کی ملاقات رشید حسن خاں سے ہوئی۔ اس ملاقات کے بعد سید منظور احمد کی خط وکتابت رشید حسن خاں سے رہی۔ اس مضمون میں سید منظور صاحب نے ان کے ایک انٹرویو کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ 'ایک مرتبہ برِ صغیر کے ایک بڑے روزنامے کے مدیر نے آپ سے (رشید حسن خاں سے) انٹرویو لیتے ہوئے ایک سوال کیا تھا۔ '' آپ نے کیوں اُردو ادب میں دہشت گردی پھیلا رکھی ہے؟ کیوں آپ سے بڑے بڑے اُدبا وشعرا اور اساتذہ خائف ہیں؟'' اس سوال کے جواب میں سید منظور احمد نے اپنے مضمون مین یہ شعر لکھا جو درج بالا سوال کا صحیح جواب تھا:

شبلی شناسی میں اپنا منفرد مقام رکھنے والے محمد الیاس الاعظمی نے بھی رشید حسن خاں کی شبلی شناسی کو 'رشید حسن خاں اور علامہ شبلی' مضمون کے ذریعے ادبی دنیا کے سامنے پیش کیا۔ چوں کہ رشید حسن خاں نے اپنے ادبی زندگی کے ابتدائی دور میں یعنی محض 25 برس کی عمر میں علامہ شبلی نعمانی کے فارسی تغزل پر ایک طویل مضمون رسالہ نگار، بابت مئی 1950، سپر دِ قلم کیا تھا۔ شبلی شناسی کے حوالے سے رشید حسن خاں کے اس مضمون کو بہت شہرت نصیب ہوئی۔ اس کے بعد مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی معیاری سیریز کے تحت 'انتخابِ مضامین شبلی' کو 1971 میں رشید حسن خاں نے مرتب کیا۔ 'انتخابِ مضامینِ شبلی' کا دوسرا اڈیشن 1993 میں منظرِ عام پر آیا۔ مضامینِ شبلی کے مقدمے میں رشید حسن خاں نے شبلی کی تنقیدی، تحقیقی اور بہ حیثیت مورخانہ صلاحیتوں کا اعتراف کیا۔ اس کے علاوہ رشید حسن خاں نے علامہ شبلی کی مشہور تنقیدی کتاب 'موازنہ انیس و دبیر' کو بھی مکتبہ جامعہ کے لیے ایڈٹ کیا۔ محمد الیاس الاعظمی نے اپنے مضمون میں رشید حسن خاں کے اُس نظریے سے اختلاف کیا جس میں خاں صاحب نے صاف اشارہ کیا کہ شبلی کے اندر تحقیقی مزاج موجود نہیں ہے۔ اس ضمن میں محمد الیاس الاعظمی نے اُن لوگوں کو صلاح دی ہے جن کے مطابق علامہ شبلی تحقیقی مزاج نہیں رکھتے، کہ وہ علامہ شبلی کی کتابیں المامون، الفاروق اور شعر العجم کا بغور مطالعہ کریں۔

ڈاکٹر قمر صدیقی نے رشید حسن خاں کی کتاب ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ پر اپنا مفصل مضمون تحریر کیا۔ موصوف نے اس مضمون میں خاں صاحب کی کتاب کے دونوں حصوں پر تنقیدی و تحقیقی جائزہ پیش کیا۔ کتاب کے پہلے حصے اصول ونظریات کے تحت پانچ مضامین پر بحث ومباحثہ تحقیق کی روشنی میں کیا گیا ہے۔ اور کتاب کے دوسرے حصے میں جن چار کتابوں پر تحقیقی و تنقیدی تبصرے کیے گئے ہیں، کا احاطہ پیش کیا گیا ہے۔ مضمون کے آخر میں ڈاکٹر قمر صدیقی نے بہت ہی پتے کی بات لکھی ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ یہ کتاب '' ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ'' اصول تحقیق و تدوین پر جامع کتاب ہے اور اس کا مطالعہ نہ صرف تحقیق کے طالب علموں کے لیے سودمند ہے بل کہ دانش گاہوں کے اساتذہ اور ادب کے محققوں کے لیے بھی نہایت مفید ہے۔''

اب میں اس کتاب کے دوسرے حصے یعنی تدوین کے باب میں شامل مضامین پر اختصار کے ساتھ جائزہ پیش کروں گا تاکہ قارئین صاحبِ مضمون کی آرا سے واقفیت حاصل کر لیں۔ اس ضمن میں پروفیسر نیر مسعود نے رشید حسن خاں کی کتاب فسانۂ عجائب پر لکھنؤ ٹیلی ویژن پر کاظم علی خاں کے ساتھ ادبی گفتگو کی ہے۔ یہ گفتگو 7 جون 1990 کو نشر ہوئی۔ اس گفتگو میں میں کاظم علی خاں نے پروفیسر نیّر مسعود سے فسانۂ عجائب اور اس کی ادبی اہمیت کے تعلق سے بہت سے سوالات معلوم کیے۔ ان سوالات کا جواب دیتے ہوئے پروفیسر نیّر مسعود نے رشید حسن خاں کی محنتِ شاقہ اور تدوینی خدمات کا بہ صمیم قلب شکریہ ادا کیا۔ پروفیسر نیّر مسعود نے اس گفتگو میں رشید حسن خاں کو فسانۂ عجائب کے متن کو بہ اہتمام شائع کرنے کے لیے اور اس کتاب کے مقدمے میں رجب علی بیگ سرور سے متعلق اہم معلومات مہیا کرانے کے لیے انھیں مبارک باد بھی پیش کی۔ بالخصوص اختلافِ نسخ کے حوالے سے جو کام رشید حسن خاں نے کیا وہ کوئی دوسرا مدون پیش نہیں کر سکا۔ کتاب کے آخر میں پیش کیے گئے ضمیموں اور فرہنگ کی افادیت اور اہمیت پر بھی اس مکالمے میں خاص زور دیا گیا۔

پروفیسر نیّر مسعود نے رشید حسن خاں کے مضمون ''مثنویاتِ شوق: لکھنوی معاشرت کے آئینے میں'' جو ایوانِ اُردو، اپریل 1998 میں شائع ہوا تھا کے خلاف ایک خط نما مضمون 'بنام رشید حسن خاں (بہ حوالہ مضمون مثنویاتِ شوق: لکھنوی معاشرت کے آئینے میں) مدیر ایوانِ اُردو مخمور سعیدی کے نام ارسال کیا۔ یہ مضمون ایوانِ اُردو میں جولائی 1998 میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں پروفیسر نیّر مسعود نے رشید حسن خاں کے مضمون میں شامل نکات اور اعتراضات کا سلسلے وار جواب دیا ہے۔ دراصل رشید حسن خاں جب مثنویاتِ شوق کی تدوین کر رہے تھے تب کئی اہم نکات پر ان دونوں ادبی بزرگوں کے مابین ادبی تبادلۂ خیال ہوا تھا۔ اس بات کے واضح شواہد وہ خطوط ہیں جن میں مثنویاتِ شوق کے علاوہ لکھنوی معاشرے اور تہذیب سے متعلق بہت سارے امور ومسائل پر ان دونوں ادبی بزرگوں کے درمیان

تحریری باتیں ہوتی تھیں۔لیکن مثنویاتِ شوق کے حوالے سے جب رشید حسن خاں کا مضمون ایوانِ اُردو کے اپریل 1998 کے شمارے میں شائع ہوا تو گویا لکھنؤ کے اہلِ قلم حضرات کو وہ باتیں برداشت نہیں ہوئیں جو خاں صاحب نے اپنے مضمون میں تحریر کی تھیں۔دراصل مثنویاتِ شوق میں شامل اشعار کی تشریح و تعبیر کو لکھنؤ کے کچھ ادیبوں نے اپنے معاشرے اور ادب کے لیے غیر موضوع تسلیم کیا۔پروفیسر نیّر مسعود کے خط نما مضمون سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ لکھنؤ کے کچھ ادیب ان کے پاس آئے اور کہا کہ ''آپ کے دوست'' اور ''آپ کے محققِ اعظم'' نے یہ مضمون لکھا ہے اور آپ (نیّر مسعود) کیا فرماتے ہیں؟۔پروفیسر نیّر مسعود نے لکھنؤ کے چند نام نہاد ادیبوں کے بہکانے اور اُکسانے کے بعد بھاری من سے یہ مضمون تحریر کیا تھا۔یہاں پر پروفیسر نیّر مسعود کے مضمون 'بہ نام رشید حسن خاں' کے مضمون کا ایک اقتباس پیش کیا جا رہا ہے تا کہ قارئین اندازہ لگاسکیں کہ ہم عصر ادیبوں کے درمیان کس طرح ادبی اختلاف پروان چڑھا:

''یہ مضمون اگر اپنے عنوان کی حدوں کے اندر ہی رہتا تو میں اس کے دفاع میں یہ کہہ سکتا تھا کہ خاں صاحب نے صرف یہ دکھایا ہے کہ شوق کی مثنویاں لکھنوی معاشرے کے کن پہلوؤں کا آئینہ نظر آتی ہیں اور مضمون کی بنیادی خامی یہ ہے کہ مضمون نگار نے ان مثنیوں کو سوچ سمجھ کر پڑھا اور اس ناقص مطالعہ کی وجہ سے ان آئینوں کی بعض تمثالیں انھوں نے نہیں دیکھیں (مثلاً زہرِ عشق کا دو تہائی حصہ جو ہیروئن کی خودکشی سے تعلق رکھتا ہے، اور جو اس مثنوی کی مقبولیت کا اصل سبب رہا ہے، مضمون نگار نے اس کو نظر انداز کر دیا اس بحث سے سروکار نہیں رکھا کہ وہ کون سے معاشرتی دباؤ تھے جن کی وجہ سے ایک لڑکی کو محض اپنی محبت کا راز کھل جانے پر اس شہر لکھنؤ میں خودکشی کرنا پڑ گئی جہاں مضمون نگار کی رائے میں عورتوں مردوں کے ناجائز جنسی تعلقات عام تھے) مگر آپ نے غضب یہ کیا کہ لکھنوی معاشرت کے موضوع پر اپنے برائے نام اور یک رُخے مطالعے کو کافی جان کر خود طبع آزمائی شروع کر دی۔بھائی، کسی تہذیب اور معاشرے کے تجزیاتی اور تحقیقی مطالعے کے کیا آداب اور طریق کار ہوتے ہیں اس کی ابجد سے ناواقفیت کے باوجود اگر آپ کو قلم اُٹھانا ضرور تھا تو کم از کم اس موضوع پر غیر مربوط سا مطالعہ ہی کر لیتے۔آپ کا عالم یہ ہے کہ ''گذشتہ لکھنؤ'' بھی آپ نے پوری طرح نہیں پڑھی، کمال الدین حیدر کی تاریخ تک (باوجود یہ کہ وہ انگریزوں کے لیے ان کے ایک وفادار نے لکھی تھی) آپ کی رسائی نہیں، نول کشور کی تواریخ نادر العصر، جو ایک انگریز کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے تحریر ہوئی تھی۔(اس کا نام ہی ''تحفۂ کرنل ایبٹ'' ہے) وہ بھی آپ کے لیے مجہول رہی۔لکھنؤ کی گھریلو معاشرت کا آپ کو پتا ہی نہیں اس لیے عباس حسین ہوش کی مثنوی ''تفسیر عفت''، ''فسانۂ نادر جہاں''، لکھنؤ کی عورتوں کے بارے میں خواجہ عبدالرؤف عشرت کے مجموعے (ہم جولی، قصہ اوّل و دوم) قسم کے ضروری ماخذوں سے آپ کی شناسائی نہیں۔لکھنؤ میں طوائفوں کی حیثیت پر آپ فیصلہ کُن گفتگو کرتے ہیں اور ''امراؤ جان ادا'' تک کو اُٹھا کر نہیں دیکھتے کہ وہ آپ کی تائید کر رہی ہے یا نہیں۔''قدیم ہُنر و ہُنر مندانِ اودھ''، ''وضع دارانِ لکھنؤ'' حتیٰ کہ ماہ نامہ ''نیا دور'' کے دونوں حالیہ اودھ نمبر بھی آپ کو دکھائی نہیں دے رہے ہیں۔پیشگی فیصلہ کر لینے کے بعد جذبات اور تاثرات کی تابع تحقیق کو غیر جانب داری کے انداز میں پیش کرنا اور اپنے پیشگی جذباتی فیصلے اور قلبی خواہش کے برخلاف شواہد کو دیکھنے سے کنہیا لال کپور کے ''مسٹر ڈالر'' کی طرح بالارادہ معذور ہو جانا آپ کی تحقیق کی کمزوری رہی ہے۔لیکن اس مضمون میں یہ کمزوری، ناقابلِ یقین حد تک بڑھ کر ''خواہش زدہ'' تحقیق کی مکمل مثال بن جاتی ہے۔''

پروفیسر نیّر مسعود کے اس خط نما مضمون کی اشاعت کے بعد ادبی حلقوں میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ایک طرف نیّر مسعود کے کے حامی تھے تو دوسری جانب رشید حسن خاں کے مداحین۔ایوانِ اُردو، اس ادبی محاذ آرائی کا گواہ بنا۔آخر کار مخمور سعیدی کی مداخلت کے بعد اس ادبی سرد جنگ کا خاتمہ ہوا۔رشید حسن خاں اور پروفیسر نیّر مسعود کے تعلقات بھی بحال ہوئے۔

پروفیسر نیّر مسعود کا ایک اور مضمون 'مصطلحاتِ ٹھگی' کی تدوین کے تعلق سے اس کتاب میں شامل ہے۔مصطلحاتِ ٹھگی میں رشید حسن خاں نے ہندوستانی ٹھگوں کی زبان، عادات و خصائل، تہذیب و تمدن اور رسم و رواج کا احاطہ کیا ہے۔ٹھگی کا پیشہ کس طرح وجود میں آیا اور اس جرائم کا ہندوستان سے خاتمہ کس طرح ہوا، پر خاں صاحب نے مدلل اور مفصل مقدمہ تحریر کیا ہے۔

دہلی یونی ورسٹی میں ایک عرصے تک رشید حسن خاں کے ساتھ کام کرنے والے پروفیسر نثار احمد فاروقی نے اپنے مضمون 'فسانۂ عجائب پر ایک نظر' میں رشید حسن خاں کی تدوینی خدمات پر سخت اعتراض کیا ہے۔پروفیسر نثار احمد فاروقی نے یہاں تک لکھا ہے کہ قصے کے اعتبار سے فسانۂ عجائب بہت کمزور ہے۔ایک جگہ یہ بھی تحریر کیا کہ رشید حسن خاں نے کتاب کے متعدد نسخے سامنے رکھے ہیں۔متن کو پڑھنے میں بہت محنت کی ہے اور حواشی بھی غیر ضروری طوالت کے ساتھ لکھے ہیں۔مگر وہ تصحیح متن کے اصول متعین نہیں کر سکے جہاں بہ ظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ تلفظ/املا میں کسی اصول کی پابندی کی گئی ہے، وہیں اس کی خلاف ورزی کی مثالیں بھی سامنے آتی ہیں۔پروفیسر نثار احمد فاروقی نے مضمون کے آخر میں لفظوں کا ایک گوشوارہ تیار کیا ہے جس میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ رشید حسن خاں نے فسانۂ عجائب کے مرتب کردہ متن میں کس کس مقام پر قدیم متون سے املا کے معاملے میں اختلاف کیا گیا ہے۔

پروفیسر رفیع الدین ہاشمی نے رشید حسن خاں کی تحقیقی خدمات کے علاوہ تدوینی خدمات پر اپنی رائے کا اظہار فسانۂ عجائب اور باغ و بہار مرتبہ رشید حسن خاں: ایک تعارف ایک جائزہ کے عنوان سے مضمون لکھ کر کیا۔یہ مضمون ہفت روزہ ہماری زبان، نئی دہلی میں 8 مارچ 1993 کو شائع ہوا۔اس مضمون میں پروفیسر رفیع الدین ہاشمی نے رشید حسن خاں کی تدوینی خدمات کا تعارف پیش کیا وہ قابلِ تعریف ہے۔موصوف کی نظر میں اُردو تنقید کا سارا اساسہ صحتِ متن پر منحصر ہے۔اگر متن درست نہیں تو تنقید بھی درست نہیں۔اس لیے کلاسکی متن کی تدوین کا کام ہوتے رہنا چاہیے تا کہ نئی نسل کے قاری اور نقاد صحتِ متن سے واقفیت حاصل کرتے رہیں۔پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کلاسکی ادب کی تدوینِ نو کے حمایتی اس وجہ سے بھی ہیں کہ دورِ حاضر کے نئے طلبا معروف، مجہول لفظوں کے تلفظ، اضافت، تشدید، اعراب، توقیف نگاری اور غنہ آوازوں سے نامانوس ہوتے جا رہے ہیں۔اس وجہ سے پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کی نظر میں رشید حسن خاں کی دونوں تدوینات (فسانۂ عجائب اور باغ و بہار) نئی نسل کے لیے کسی ادبی معجزے سے کم نہیں۔

ڈاکٹر فیروز احمد نے اپنے مضمون 'باغ و بہار کا ایک قدیم مخطوطہ' میں ثابت کرنے کی کوشش کی کہ جن چار نسخوں پر رشید حسن خاں نے اپنی مرتب کردہ کتاب باغ و بہار کی بنیاد رکھی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔بل کہ نسخہ جے پور جس کی دریافت خود ڈاکٹر فیروز احمد نے کی ہے، باغ و بہار کا اصل نسخہ ہے۔ڈاکٹر فیروز احمد نے باغ و بہار نسخہ جے پور 1274ھ کو ہر اعتبار سے مکمل نسخہ اور خطِ نستعلیق پر مبنی قرار دیا ہے۔اس مضمون میں ڈاکٹر فیروز احمد نے باغ و بہار مرتب رشید حسن خاں اور نسخہ جے پور کا موازنہ کرتے ہوئے اختلافِ نسخ کے طور پر لفظوں کا ایک گوشوارہ تیار کیا ہے۔انھوں نے نسخہ جے پور کے حوالے سے مزید لکھا ہے کہ رشید حسن خاں کے متعارفہ خطی نسخے (یعنی ن) سے نسخۂ جے پور کا متن مختلف صورتِ حال کی نشان دہی کرتا ہے۔

پروفیسر عبدالحق نے اپنے مضمون 'مثنویاتِ شوق' میں اُس بحث پر اظہارِ خیال پیش کیا ہے جو نیّر مسعود اور رشید حسن خاں کے حوالے سے ایوانِ اُردو میں شائع ہو چکی تھی۔ اس مضمون میں پروفیسر عبدالحق نے دونوں ادبی بزرگوں کا احترام کرتے ہوئے لکھنوی تہذیب اور معاشرے کو بدنام کرنے والوں کی خوب خبر لی ہے۔ مرزا غالب سے لے کر جانِ عالم، سردار جعفری سے لے کر محمد صادق نے اپنی تاریخوں میں لکھنوی تہذیب و تمدن، اس کی عظمت و عقیدت کے بارے میں خوب لکھا ہے۔ پروفیسر عبدالحق اس بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

''مجھے نہ خاں صاحب سے غرض ہے اور نہ نیّر مسعود صاحب سے کچھ لینا دینا ہے۔ میرے لیے دونوں محترم ہیں اور میں دونوں کی علمی خدمات کا معترف ہوں۔ مگر علمی مباحث میں پُر وقار سنجیدگی اور مہذب لہجے کی توقع کرتا ہوں۔ خاں صاحب محققِ اعظم نہ سہی محقق تو ہیں ہی اور انھیں نیّر مسعود صاحب پر بزرگی میں بھی سبقت اور فضیلت حاصل ہے، پاسِ احترام رکھنا چاہیے۔ شاید انحطاط آمادہ معاشرے میں دانشوروں کے اظہار اور اسالیب کے معیار بھی بدل جاتے ہیں۔ گذشتہ برسوں میں علی گڑھ کے بُزرگ اساتذہ کے درمیان غیر شائستہ مکالمہ زبان و دہن دونوں کے بگڑنے اور بدنمائی کا مظہر بنا رہا۔ زوال زدگی میں قومی ضمیر اور اندازِ فکر کا بدل جانا قرینِ قیاس ہے۔ ثقافت کی مجہول تعبیر اور منفی پہلوؤں پر زور (غیر شعوری طور پر) دانش و بینش کے مسلمات سمجھے جاتے ہیں۔ ان سے عام گم رہی پھیلتی ہے اور تہذیبی اقدار مذموم قرار پاتے ہیں۔ دہلی ہو کہ لکھنؤ یہ سوادِ اعظم کی عظیم اور مقتدر ثقافت ہے۔ اس وراثت کو بدنام کرنے کی شعوری کوشش برطانی عہد سے آج تک جاری ہے۔ تخلیق کاروں نے ابتدا کی۔ مورّخوں نے نقادوں نے عیب جوئی میں سبقت لی۔ فلموں کے علاوہ چند سیریل کے نام لے سکتا ہوں جن میں شراب و شاہد سے اس تہذیب کو مختص کیا گیا ہے۔ مرزا غالبؔ جانِ عالم، کہکشاں زندہ مثالیں ہیں۔ حیرت ہے کہ سردار جعفری جیسے بزرگوں کا قلم بھی اس سیاہی میں آلودہ ہے۔ ڈاکٹر محمد صادق نے اپنی تاریخ میں لکھنؤ دبستان ادب کو عقیدہ اور ناز و نخرہ سے تعبیر کیا ہے۔''

لطیف صدیقی نے بھی مثنویاتِ شوق کے حوالے سے پروفیسر نیّر مسعود اور رشید حسن خاں کے مابین پیدا ہوئیں غلط فہمیوں کو رفع کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس مضمون میں لطیف صدیقی نے انگریزی کتابوں کے حوالوں اور اقتباسات پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ لکھنوی معاشرت اور تہذیب پر رشید حسن خاں نے کوئی نیا کارنامہ انجام نہیں دیا بل کہ ان سے قبل گذشتہ لکھنؤ میں یہ تمام باتیں آ چکی ہیں جنھیں رشید حسن خاں نے اپنے مضمون میں پیش کیا۔

پروفیسر گیان چند جین نے رشید حسن خاں کو مثنویاتِ شوق کی اشاعت کے بعد ''خدائے تدوین'' کے لقب سے یاد کیا۔ گیان چند جین نے مثنویاتِ شوق کو اُردو ادب کا چوتھا صحیفہ قرار دیا۔ اس سے قبل رشید حسن خاں فسانۂ عجائب،، باغ و بہار اور گلزارِ نسیم کی تدوین کر چکے تھے۔ دراصل رشید حسن خاں نے مثنویاتِ شوق کے متن سے پہلے 142 صفحات کو محیط عالمانہ مقدمہ تحریر کیا۔ اس مقدمے میں رشید حسن خاں نے فریبِ عشق، بہارِ عشق اور زہرِ عشق کے متن پر لفظ بہ لفظ بحث کی ہے۔

شان الحق حقی (کراچی) نے اپنے مضمون 'اُردو میں اصولِ تدوین کا مجدد' میں رشید حسن خاں کے ذریعے کی گئی معیاری تدوینات کی ستایش کی ہے۔ اس مضمون میں شان الحق حقی نے اُن ایام کو یاد کیا جب وہ خود 'اُردو نامہ کراچی' کے مدیر کی حیثیت سے کام رہے تھے اور رشید حسن خاں 'اُردو نامہ' کے مضامین میں املائی غلطیوں اور املا کی معیار بندی کی جانب ان کی توجہ مبذول کراتے تھے۔ یہاں تک کہ کئی خط املا کی غلطیوں، معیار بندی اور اصلاح کی بابت شان الحق حقی کے نام رشید حسن خاں نے تحریر کیے۔ شان الحق حقی رشید حسن خاں کی اڈیٹنگ کے نہ صرف مداح ہیں بل کہ خاں صاحب کے کام کرنے کے طریقے کے بھی معترف ہیں۔ شان الحق حقی نے فسانۂ عجائب کی تدوین کے سلسلے میں ایسی کئی باتیں اس مضمون میں رقم کی ہیں جن کے ڈانڈے آ چر یہ چانکیہ سے ملتے ہیں۔ موصوف نے اس بارے میں یہاں تک لکھ دیا کہ چانکیہ معلمِ منشیاں تھا تو رشید حسن خاں مودب الادباء ہیں انھوں نے صرف فہمایش سے کام نہیں لیا جس پر کبھی کبھی سرزنش کا گمان بھی ہوسکتا ہے۔

سید محمد عقیل نے کلیاتِ جعفر زٹلی کی اشاعت کے بعد اپنے خیالات، تاثرات کا اظہار 'زٹل نامہ (کلیاتِ جعفر زٹلی) اور رشید حسن خاں' مضمون لکھ کر کیا۔ اس مضمون میں سید محمد عقیل نے کلامِ جعفر زٹلی کے فحش کلام کے چودہ نسخوں کی تلاش و تحقیق کے لیے رشید حسن خاں کو مبارک باد پیش کی ہے۔ انھوں نے مزید یہ بھی لکھا کہ رشید حسن خاں نے شمالی ہند میں اُردو غزل گوئی اور نظم نگاری کے حوالے سے اپنے مقدمے میں مفصل بحث و مباحثہ پیش کیا تا کہ جعفر زٹلی کے کلام میں مزاحمتی عناصر کی نشان دہی کر اس کے کلام سے استفادہ حاصل کیا جا سکے۔ مغل بادشاہوں اور وزرا کی شان میں گستاخانہ کلمات کہنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ لیکن سماجی ناانصافی، بے اعتدالیوں، بداخلاقیوں کے خلاف پہلی آواز بلند کرنے والے جعفر زٹلی ہی تھے۔ سید محمد عقیل نے کلامِ جعفر میں موجود مثالوں اور محاوروں کی نشان دہی بھی کی ہے۔ دراصل کھڑی بولی کی ان مثالوں کو ہم ایک زمانہ گزر جانے کے بعد بھی جوں کا توں استعمال کرتے ہیں جو عہدِ مغل میں بھی رائج تھیں۔ مثلاً 'اندھے کی جورو کا خدا رکھوالا'، 'اناڑی کے آگے...کی خواری'، 'جوں جوں مرغی موٹی ہوئے توں توں....سکڑتی جائے'، 'اونٹ کے منھ میں زیرہ' وغیرہ۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ یہ وہ مثل ہیں جو پیڑھی در پیڑھی نسل در نسل ایک دوسرے سے منتقل ہوتی ہوئی ہم تک پہنچی ہیں۔ لیکن افسوس اور حیرت کی بات یہ بھی ہے کہ ان مثالوں کے بنانے والوں کے نام اب تک ہم نہیں جان پائے ہیں۔ لیکن کلامِ جعفر کے مطالعے سے ان مثالوں کو پڑھ کر ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جعفر زٹلی کے زمانے میں بھی یہ مثالیں موجود تھیں اور ان کا استعمال موقع و محل کے مطابق ہوتا تھا۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ان مثالوں کے برمحل استعمال کی وجہ سے ہی جعفر زٹلی جیسے خوددار شاعر کو اپنی جان کی قربانی دینی پڑی۔ سید محمد عقیل نے ان تمام امور پر عالمانہ بحث کرتے ہوئے لکھا:

''یہاں پر یہ بات غور طلب ہے کہ آخری جملہ جو ایک مثل ہے، جو آج تک اُسی طرح چلی آتی ہے، یہ مثل کس نے بنائی ہوگی؟ کیوں کہ یہ خالص کھڑی بولی بل کہ خالص اُردو ہے۔ اسی طرح کی دوسری مثلیں بھی جعفر کی تحریر میں درج ہیں جیسے: 'تجھے پرائی کیا پڑی اپنی نبیر تو' (ص 68)، 'اناڑی کے آگے.....کی خواری' (عام بول چال میں آج بھی یہ لفظ اور کہاوت اسی طرح ہے۔ 'خواری' کو عامی 'کھوداری' کہتا ہے) 'جوں جوں مرغی موٹی ہوئے توں توں......سکڑتی جائے'، 'اونٹ کے منہ میں زیرہ' (یہ محاورہ آج بھی اسی طرح بولا جاتا ہے)، 'آپ ہی میاں مانگتے اور باہر کھڑے درویش' (ص 70)، 'ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا' (ص 70) [یہ محاورہ بھی بعینہٖ آج بھی بولا جاتا ہے] 'عاشق اور خالہ جی کا ڈر' (ص 73)، 'خارشی کتا اور مخمل کی جھول'، 'چار دن کا چاندنا آخر اندھیرا پاکھ'، 'ناحق چوٹ جولاہا کھائے / کرگھا چھوڑ تماشے جائے'، 'پاپی کا مال پراپت جائے / باسی رہے نہ کتا کھائے / اوکھلی میں سر دیا تو دھمکوں سے کیا ڈرنا'۔ محلِ غور ہے کہ یہ محاورے جعفر سے پہلے کے بنے ہوں گے جو کہیں کہیں خالص اُردو کے معلوم ہوتے ہیں یا ایسی بول چال کی زبان ہیں جو آج بھی رائج ہے۔ تو جس نے بھی یہ محاورے بنائے اور جب بھی بنائے اس کی زبان کو ابتدائی اُردو کیوں نہ مانا جائے؟ میر جعفر تو محض ناقل ہوا۔ جعفر کا دور عہد عالم گیری یعنی

وسط ستر ہویں صدی سے 1713 تک کا ہوا۔'زٹل نامہ' کی ترتیب کی تاریخ رشید حسن خاں نے تخمیناً عالم گیر کا انتیسواں سنہ جلوس یعنی 86-1685 بتایا ہے (ص 29-30)۔ ذرا اس اندازے کو اور بڑھائیے تو دس بیس برس اور پیچھے جانا پڑے گا کہ مثلوں کی تخلیق یقیناً اس ترتیب 'زٹل نامہ' سے پہلے کی ہوگی یعنی عہد شاہ جہانی کے قریب تک۔''

کلام جعفر کی دریافت کے سلسلے میں پاکستان کے مشہور ارباب قلم ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے دعوا کیا ہے کہ جن دس نسخوں کی بنیاد پر کلامِ جعفر زٹلی کو رشید حسن خاں نے تدوین کیا ہے اس میں اختلافِ نسخ کی بہت سی گنجایشیں موجود ہیں۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے اپنی دلیل میں ثبوت پیش کرتے ہوئے لکھا ''ایک قلمی نسخہ ممتاز محقق خلیل الرحمٰن داؤدی کی ملکیت میں تھا اور اس نسخے کو اسلام آباد کے کسی نجی کتب خانے کو فروخت کر دیا گیا تھا۔'' اس نسخے اور رشید حسن خاں کی تدوین یعنی کلامِ جعفر زٹلی میں بہت سے مقامات پر متنی ترمیمات موجود ہیں۔ اب یہ نسخہ ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے کتب خانے میں موجود ہے۔ ساتھ ہی ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے دس نسخوں کے علاوہ چار اور نسخوں کی نشان دہی کی ہے جن سے انھوں نے استفادہ کیا ہے۔

دختر پروفیسر محمود الٰہی ڈاکٹر فوزیہ بانو نے رشید حسن خاں اور فسانۂ عجائب کے حوالے سے ان کے کام کرنے کے انداز اور ان کے تحقیق و تدوین کے تئیں شوق و ذوق کو اپنی تحریروں میں پیش کیا۔ ڈاکٹر فوزیہ بانو نے فسانۂ عجائب کے متن، مقدمے، ضمیموں، اختلافِ نسخ پر خاص توجہ مبذول کی۔

پروفیسر شمیم حنفی نے 'رشید حسن خاں اور گلزارِ نسیم' کے حوالے سے رشید حسن خاں کی تدوینی خدمات کا جائزہ پیش کیا ہے۔ اس مضمون میں پروفیسر شمیم حنفی نے اُن امور کی جانب قارئین کی توجہ مبذول کرانے کی کامیاب کوشش کی کہ کن وجوہات کی بنا پر ہمیں کلاسکی ادب کو کیوں از سرِ نو تدوین کرنا چاہیے اور کلاسکی ادب کی قرأت ہمیں کس طرح کرنی چاہیے۔ پروفیسر شمیم حنفی کی نگاہ میں مثنوی گلزارِ نسیم کی اہمیت اس وجہ سے نہیں کہ یہ صرف اُردو ادب کا کلاسکی سرمایہ ہے بل کہ اس وجہ سے ہے کہ یہ مثنوی مشرقی طرزِ احساس، اسالیب روایات کے باہمی انضمام کا ایک قیمتی دستاویز ہے۔ اس مثنوی کا اصل متن صرف 86 صفحات پر مشتمل ہے جب کہ رشید حسن خاں نے اس مثنوی کی مجموعی ضخامت کو 724 صفحات تک پہنچا دیا ہے۔ یہ اس بات کی جانب واضح اشارہ ہے کہ رشید حسن خاں نے مثنوی گلزارِ نسیم کو دقتِ نظر چھان بین، پرکھ اور مباحث کے ساتھ تدوین کیا ہے۔

پروفیسر فضیل جعفری مرحوم کے رشید حسن خاں کے ساتھ دوستانہ مراسم تھے۔ رشید حسن خاں جب بھی بمبئی علاج کے لیے جاتے تو وہاں پر اپنے ادبی دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر ادبی باتیں کیا کرتے تھے۔ فضیل جعفری، رشید حسن خاں کی علمیت اور وسعتِ مطالعہ کے دلدادہ اور قدر شناس تھے۔ فضیل جعفری نے مثنویاتِ شوق کے حوالے سے ایک طویل تبصراتی مضمون تحریر کیا۔ یہ مضمون سہ ماہی ترسیل 1999 میں گوشۂ رشید حسن خاں میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں فضیل جعفری نے تقسیمِ ملک کے بعد اُردو زبان و ادب کی حالتِ زار کا منظر اور پس منظر کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ فضیل جعفری افسوس ظاہر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ 'اب سے بیس پچیس سال قبل تک مختلف یونی ورسٹیوں میں ایسے اُردو اساتذہ مل جاتے تھے جنھیں تحقیق و تدوین سے خواہ زیادہ دل چسپی نہ رہی ہو لیکن جن کا علمی و ادبی مرتبہ کافی بلند تھا۔' فضیل جعفری نے رشید حسن خاں کی تعریف کرتے ہوئے لکھا کہ خاں صاحب دشوار گزار، پیچیدہ، ناہموار اور خار دار راستوں سے گزرنے اور دور دراز منزلوں تک پہنچنے کا چسکا سا لگ گیا ہے۔ فضیل جعفری کی بات بالکل سوفی صد سچ ہے۔ اُردو ادب میں اب تک کوئی ایسا مدون نہیں گزرا جس نے اتنی جاں فشانی سے اُردو کے کلاسکی ادب کو تدوین کیا ہو۔ رشید حسن خاں اُس کام کو قطعی ہاتھ نہیں لگاتے تھے جب تک ان کے پاس متعلقہ مواد موجود نہ ہو۔ چاہے اس کے لیے انھیں برسوں برس انتظار ہی کیوں نہ کرنا پڑا ہو۔ فضیل جعفری نے اپنے مضمون میں رشید حسن خاں کے مقدمے سے لے کر اُن مدونین پر بھی بات کی جنھوں نے مثنویاتِ شوق کی تدوین کی تھی۔ ساتھ ہی لکھنوی معاشرے، تہذیب، تمدن، رسم و رواج زبان و بیان، نزاکتوں، اشاعتوں پر بھی مدلل اور عالمانہ بحث کی ہے۔

پروفیسر گیان چند جین کا ایک اور مضمون 'رشید حسن خاں کی کتاب تدوین تحقیق روایت' کے عنوان سے اس کتاب میں شامل ہے۔ انھوں نے اس مضمون کو لکھنے کی وجہ ماہرِ غالبیات کالی داس گپتا رضا کے اُس جملے کو بتایا جس میں کہا گیا کہ رشید حسن خاں اُردو کے سب سے بڑے محقق ہیں۔ اس مضمون میں پروفیسر گیان چند جین نے اس کتاب میں شامل 11 مضامین [(1) شہرت روایت اور تحقیق (2) کلام حافظ سے فال نکالنے کی روایت اور اس کی حقیقت (3) تدوین منشاے مصنف کا تعین (4) تدوین اور اعراب نگاری (5) کلامِ اقبال کی تدوین (6) تدوینِ کلام غالبؔ کے مسائل (املا کے لحاظ سے) (7) دکنی ادب کی تدوین کے مسائل شمالی ہند کے ایک طالب علم کے نقطۂ نظر سے (8) اُردو میں تدوین کے پچاس سال (9) حافظ محمود خاں شیرانی کی تاریخی اہمیت (10) تحقیق کا معلمِ ثانی (11) ایک نیا انتخاب] پر اپنی بے باک رائے کا اظہار کیا ہے۔ ان مضامین میں جہاں بھی کہیں اختلاف نظر آیا پروفیسر گیان چند جین نے رشید حسن خاں کی گرفت بھی کی۔ بالخصوص مالک رام کے تعلق سے انھیں رشید حسن خاں کی تنقید سے اختلاف ہے۔ گیان چند جین نے رشید حسن خاں کی اُس آرا سے بھی اختلاف کیا جس میں خاں صاحب نے کہا ہے کہ تدوین تحقیق سے آگے کی چیز ہے۔ جب کہ گیان چند جین کا ماننا ہے کہ تدوین، تحقیق کی ذیلی شاخ ہے۔ بہر حال دونوں ادبی بزرگوں کے اختلاف ہم جیسے نااہلوں کے لیے کسی تحفے سے کم نہیں۔

پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے بھی رشید حسن خاں کی تدوینی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے 'فسانۂ عجائب مرتبہ رشید حسن خاں' مضمون تحریر کیا۔ اس مضمون میں پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے فسانۂ عجائب کی تدوین کو مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے کلامِ غالب کے تدوینی کارنامے کے ہم پلہ قرار دیا ہے۔ موصوف نے فسانۂ عجائب کے باب در باب، متن در متن اور اختلافِ نسخ کے علاوہ مقدمہ، ضمیموں اور فرہنگ پر تنقیدی گفتگو کی ہے۔

عزیزم عادل احسان نے میرے استفسار پر رشید حسن خاں کی دو تنقیدی کتابوں کے حوالے سے ایک مضمون ''تلاش و تعبیر اور تفہیم کا اجمالی جائزہ'' تحریر کیا۔ عادل احسان دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو سے پی ایچ ڈی کا مقالہ تحریر کر رہے ہیں۔ ان کی لگن اور محنت شاقہ کو میں سلام کرتا ہوں کہ غربت میں رہ کر وہ اپنے تحقیقی کاموں میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ عادل احسان نے اپنے مضمون میں رشید حسن خاں کی تحقیقی، تدوینی اور تنقیدی کارناموں کا بغور جائزہ پیش کیا ہے۔ مضمون خاصا طویل ہے مگر اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ عادل احسان نے بڑی ہی جاں فشانی اور عرق ریزی سے اپنا مضمون تحریر کیا ہے۔ عادل احسان کے مضمون کے اس اقتباس سے ہم رشید حسن خاں کے نظریات اور لکھنے پڑھنے کے انداز بالخصوص تحقیق و تدوین کے کام کرنے کے رنگ ڈھنگ سے واقفیت حاصل کر سکتے ہیں:

''رشید حسن خاں نے دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریوں، بربادیوں اور ہولناکیوں کے پر آشوب دور کے بعد اپنی علمی زندگی کا آغاز کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جس میں ادب سے متعلق بہت زیادہ تلاش و جستجو نہیں ہوئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ادب کا سنہرا دور تھا مگر کچھ محقق اور نقاد اس راہ میں اپنی خدمات انجام دے رہے تھے۔ لیکن جس ادب کی ضرورت عوام کو تھی وہ انھیں

نہیں مل پا رہا تھا۔ اسی تلاش وجستجو کو ذہن میں رکھ کر رشید حسن خاں نے تحقیق وتدوین کے میدان میں قدم رکھا۔ اور اپنے مشاہدے سے یہ بات ثابت کر دی کہ بغیر تحقیق وتنقید کے کوئی بھی ادب اپنے اصلی روپ میں وجود میں نہیں آسکتا۔ جس کی وقت کے ساتھ لوگوں کو بے حد ضرورت ہوتی ہے۔ ان ہی سب باتوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے انھوں نے ادب کی صحیح اصطلاح کے ساتھ اس کے قواعد کو منظم کرنے پر زور دیا۔ جس سے ادب کو ایک بلند مقام حاصل ہو جائے۔ یہ کام تبھی اپنے پایۂ تکمیل تک پہنچ سکتا ہے جب تک اس میں نئی نئی تجاویز پیش نہ کی جائیں۔''

عزیزی ڈاکٹر ظفر عالم نے بھی میرے بار بار استفسار کرنے پر ایک مضمون 'رشید حسن خاں، تحقیق، تنقید اور تدوین' کے حوالے سے تحریر کیا ہے۔ میں ڈاکٹر ظفر عالم کا شکر گزار ہوں کی اسکول کی مصروف ترین اوقات میں سے چند اوقات اس تحقیقی مضمون لکھنے کے لیے وقف کیے۔ ڈاکٹر ظفر عالم نے رشید حسن خاں کی جملہ ادبی خدمات پر خامہ فرسائی کی ہے۔ دراصل ڈاکٹر ظفر عالم رشید حسن خاں کی تحقیقی کاوشوں کے مداح ہیں۔ اپنی تحریر میں ڈاکٹر ظفر عالم نے اُن مباحث کو منظرِ عام پر لانے کی کامیاب کوشش کی ہے جنھیں سرسری طور پر پڑھ کر قارئین آگے بڑھ جاتے ہیں۔

رب العالمین کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ طباعت کے مرحلے سے گزر کر قارئین کہ ہاتھوں میں ''رشید حسن خاں تحریروں کے آئینے میں'' (جلد دوم) آچکی ہے۔ اس سے قبل قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون سے ''رشید حسن خاں تحریروں کے آئینے میں جلد اول''، سال اشاعت 2019، منظرِ عام پر آچکی ہے۔ جلد اول میں رشید حسن خاں کی شخصیت کے حوالے سے 45 مضامین کو شامل کیا گیا تھا۔ جلد اول میں ایک مضمون ''اپنے بارے میں'' رشید حسن خاں کا ہے۔ ان 45 مضامین میں رشید حسن خاں کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا بھر پور احاطہ کیا گیا ہے۔ میں نے جلد اول کے مقدمے میں بہت سی باتوں کا احاطہ کیا جن میں رشید حسن خاں کی ادبی زندگی کے مختلف گوشوں پر گہرائی اور گیرائی کے ساتھ جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

''رشید حسن خاں تحریروں کے آئینے میں (جلد دوم)'' میں رشید حسن خاں کی تحقیق اور تدوین سے متعلق مضامین کو شامل کیا گیا ہے۔ ان مضامین میں خاں صاحب کی تحقیقی اور تدوینی کارناموں اور کارگزاریوں پر اصحابِ قلم نے اپنی آرا کا اظہار کیا ہے۔ ان مضامین میں بعض مضامین ایسے بھی ہیں جن میں رشید حسن خاں کی تحقیقی کاوشوں اور تدوینی خدمات پر اعتراض اور اختلاف پیش کیا گیا ہے۔ ان تمام باتوں کا مطالعہ آپ حضرات اس کتاب میں شامل مضامین کے ذریعے کر سکتے ہیں۔

آخر میں، میں اُن تمام حضرات اور اربابِ قلم کا شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی وجہ سے یہ مرتب شدہ کتاب منصۂ شہود پر آئی ہے۔ ڈاکٹر ٹی آر رینا کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جن کی ترغیب کی وجہ سے میں اس کتاب کو مرتب کر سکا۔ ساتھ ہی میں انجمن ترقی اُردو ہند، نئی دہلی کے تمام اراکین کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں بالخصوص محمد عارف، ندیم احمد، عبدالرشید اور اختر الزماں، محمد عرفان کا میں شکر گزار ہوں کہ ان حضرات نے رشید حسن خاں سے متعلق چھوٹی سے چھوٹی باتوں کو مجھ سے Share کیا۔ ان میں سے بعض حضرات نے رشید حسن خاں سے بالمشافہ ملاقات کی ہوئی ہے۔ میں نے اُردو گھر کی ''شبلی لائبریری'' سے استفادہ حاصل کیا ہے۔ انجمن کی ''شبلی لائبریری'' سے مجھے جتنی مدد حاصل ہوئی ویسی مدد کسی دوسری لائبریری سے نہ مل سکی۔ اس لائبریری کی خاص بات یہ ہے کہ یہاں پر ملکی اور غیر ملکی رسائل وجرائد کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ ان رسائل وجرائد پر جمی ہوئی دھول کو صاف کرنے کے بعد ہی گوہرِ نایاب ہاتھ آتے ہیں۔ یہی میرے ساتھ ہوا۔ یہاں پر متعلقہ مواد کی فوٹو کاپی کرانے کی سہولت موجود ہے۔ ان فوٹو کاپی کے سہارے ہی میرا تحقیقی سفر جاری وساری ہے۔

میں ڈاکٹر محمد مستمر، ڈاکٹر قسیم اختر امتیاز سرمد، ڈاکٹر قمر صدیقی، مامون عبدالعزیز، ڈاکٹر مدنی اشرف، ڈاکٹر محمد آصف، محمد طالب، ڈاکٹر رفیع الدین، ڈاکٹر آصف، ڈاکٹر فرقان سردھنوی، فہیم بسمل، خورشید حسن خاں، خالد حسن خاں، ڈاکٹر خالد حسین خاں، ڈاکٹر یونس غازی، ماسٹر سہیل، ربابؔ رشیدی، ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی، ڈاکٹر الف ناظم، توصیف بریلوی، ڈاکٹر خالد ظہیر، انیس احمد الحسینی انیس میرٹھی، عبدالمتین جامی، ڈاکٹر عمیر منظر، اویس سنبھلی، ڈاکٹر شاہنواز فیاض، ڈاکٹر سلمان فیصل، ظہیر حسن ظہیر، ریاض الدین، اختر شاہ جہاں پوری، عبدالندیم، عبدالحی، وسیم مینائی، ڈاکٹر خالد ظہیر، ڈاکٹر ارشاد سیانوی، ڈاکٹر خالد مبشر، ڈاکٹر سعود عالم وغیرہ کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے وقت وقت پر میری رہنمائی کے علاوہ حوصلہ افزائی بھی کی۔ اس موقع پر میں ڈاکٹر شمس بدایونی کا بھی بہ صمیمِ قلب شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جنھوں نے 'رشید حسن خاں تحریروں کے آئینے میں جلد اول' کا مطالعہ کرنے کے بعد میری کئی امور کی جانب توجہ مبذول کرائی اور ساتھ ہی مفید مشوروں سے بھی نوازا۔ میں پروفیسر ظفر احمد صدیقی کا بھی تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ جنھوں نے 'رشید حسن خاں تحریروں کے آئینے میں جلد اول' کے مقدمے کے حوالے سے اور املائی درستگی کی جانب میری توجہ مرکوز کی۔ میں یہاں پروفیسر عبدالستار دلوی کا بھی ممنون ہوں کہ جنھوں نے رشید حسن خاں کے تعلق سے میری ادبی سرگرمیوں اور کتابی سلسلے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے نہ صرف مدد کی بل کہ اپنی دعاؤں سے بھی مجھے نوازا۔ اس موقع پر میں مجتبیٰ حسین صاحب کا بھی شکر گزار ہوں کہ جنھوں نے بہ ذریعہ فون مجھے رشید حسن خاں سے متعلق بہت ہی اہم باتوں کو بتایا۔

غالب انسٹی ٹیوٹ کے اہل کار ڈاکٹر محمد سہیل انور کا بھی میں شکر گزار ہوں کہ جنھوں نے جواہر لال نہرو یونی ورسٹی میں ایم فل کے دوران رشید حسن خاں سے ہوئی ملاقاتوں اور باتوں سے متعلق بہت سے قصے اور یادداشتیں بتائیں کہ کس طرح رشید حسن خاں ہم طلبا کو تحقیق وتدوین کا درس دیتے تھے اور ہمارے اساتذہ پیچھے کی کرسیوں پر بیٹھ کر ان کا لیکچر سنتے تھے۔

مجھے اپنی کم علمی کا اعتراف ہے۔ اگر کسی قاری کو کتاب میں کہیں بھی کسی صفحے پر کوئی غلطی یا نظریاتی اختلاف نظر آئے تو بلا جھجک وہ میری توجہ اس جانب مبذول کرا سکتا ہے تاکہ آئندہ اڈیشن میں ان غلطیوں کو درست کیا جا سکے۔ دعاؤں کا طالب:

ابراھیم افسر

نگر پنچایت سِوال خاص، ضلع میرٹھ (یوپی)

اتوار، 8 شعبان المعظم 1440ھ

مطابق 14/ اپریل 2019

تحقیق

فہیم بسملؔ شاہ جہاں پوری

محققِ ممتاز

کچھ نہ پوچھو ہے کتنی غم انگیز
رحلتِ حضرتِ رشید حسن
ایک نکتہ شناس تھا نہ رہا
مضمحل مضمحل ہیں اہلِ سخن
تھے وہ بے شک محققِ ممتاز
طرزِ تدوین بھی مثالی ہے

خود کو ہلکان کر لیا لیکن
آبروئے ادب بچا لی ہے
کتنے ہی لوگ تھے مخالف بھی
ان کی تحقیق کے، اصولوں کے
ڈگمگائے کبھی نہ ان کے قدم
وہ سدا گرمِ جستجو ہی رہے

(ماہ نامہ نیا دور، لکھنؤ، جلد 62، نمبر 9، دسمبر 2007، صفحہ 16)

ooo

رشید حسن خاں

کچھ اپنے بارے میں

تعلیمی کاغذات میں تاریخِ ولادت 30 جنوری 1930 لکھی ہوئی ہے۔ یہ تاریخ کس نے لکھائی تھی، مجھے نہیں معلوم۔ صحیح سال ولادت 1925 ہے، دسمبر کا مہینا۔ تاریخ کا علم نہیں۔ والد کا نام: امیر حسن خاں۔ دادا کا نام: علی حسن خاں میرے والد پولس میں ملازم تھے، کشتی کے شوقین تھے۔ اس لیے پولیس کی ملازمت کو ترجیح دی؛ ورنہ ہمارے خاندان میں فوج کی ملازمت کو نشانِ امتیاز سمجھا جاتا رہا ہے۔ دادا بھی فوج میں تھے۔ آبا واجداد سے متعلق مزید تفصیلات معلوم نہیں۔ میرے والد نے تحریک عدم تعاون کے زمانے میں ملازمت سے استعفادے دیا تھا مگر ان کا ریکارڈ بہت اچھا تھا یوں ان کے سپرنٹنڈنٹ نے سمجھا بجھا کر قبل از وقت رٹائرمنٹ کی درخواست دلوادی۔ اُن کی پنشن ہوگئی تھی۔ پندرہ روپے دو آنے پنشن تھی، جو آخر تک ملتی رہی۔ وہ انگریزی ملازمت کو ناجائز سمجھنے لگے تھے اور انگریزی تعلیم کو بھی خلاف مذہب ماننے لگے تھے؟ اسی لیے اُنھوں نے مجھے کسی اسکول میں داخل کرنے کے بجائے، عربی پڑھنے کے لیے بٹھا دیا تھا اور پھر ابتدائی کتابوں کے بعد شہر کے مشہور مدرسے بحرالعلوم میں درسِ نظامی کے لیے داخل کرادیا تھا، جہاں میں 1939 کے وسط تک زیر تعلیم رہا۔

میرے اساتذہ میں قابل ذکر نام مولوی مجتبیٰ حسن خاں مرحوم کا ہے۔ وہ بہت روشن خیال عالم تھے اور کٹر پن کے سخت مخالف تھے۔ ایک قول عموماً طالب علموں کو سنایا کرتے تھے کہ جو شخص خدا کی وحدانیت کا رسول کے آخری نبی ہونے کا اور یومِ حساب کا قائل ہے میں اسے کافر کبھی نہیں کہہ سکتا۔ وہ گنہ گار ہوسکتا ہے کافر نہیں ہوسکتا۔ شروعات میں اُلجھنے سے منع کرتے تھے اور سُنی سنائی بات کو ماننے سے منع کیا کرتے تھے کہتے تھے کہ پہلے تصدیق کرلو۔ میرے ذہن میں تحقیق کے پہلے نقوش اُنھی کی تعلیم کا نتیجہ تھے۔

ابتدائی تعلیم محلے کے مولوی صاحب سے حاصل کی۔ وہ میرے والد کے بھی اُستاد تھے۔ جب میں پڑھنے بیٹھایا گیا تو ان کی عمر 75 سال کے لگ بھگ ہوگی۔ پھر 1934 میں مدرسہ بحرالعلوم بھیج دیا گیا۔ درسِ نظامی کی تکمیل نہیں کرسکا۔ متوسطات تک کی کتابیں پڑھیں تھیں کہ دوسری جنگِ عظیم شروع ہوگئی۔ گھر کے حالات اچھے نہیں تھے۔ آمدنی وہی 15 روپے دو آنے پنشن کی تھی۔ اس لیے آرڈیننس کلودنگ فیکٹری میں جب بھرتی شروع ہوئی تو میں بھی بھرتی ہوگیا۔ اس وقت میری عمر چودہ سال کے لگ بھگ تھی۔ آرمی کی اس فیکٹری میں فوجی وردیاں سلتی تھیں۔ یہ فیکٹری اب بھی ہے۔

اسکول کالج میں ایک دن نہیں پڑھا۔ جب میں فیکٹری میں مزدور کے طور پر کام کرتا تھا، اُنھی دنوں محلے کے ایک پنڈت جی سے ہندی کی پہلی کتاب پڑھی تھی۔ جس کے نتیجے میں میں اب ہندی پڑھ تو لیتا ہوں، اُس طرح لکھ نہیں پاتا، مگر ضروری باتیں ٹھہر ٹھہر کر لکھ سکتا ہوں۔ انگریزی ایک رشتے کے بھائی سے کنگ ریڈر پڑھی تھی اور بس۔ پھر رفتہ رفتہ انگریزی اخبار پڑھنے کی مشق کرنا شروع کی۔ شروع شروع میں الجھا، مگر پھر کچھ دنوں میں عبارت کو بہ آسانی پڑھنے لگا۔ باضابطہ انگریزی زبان حاصل نہیں کرسکا۔ مگر ہلکی پھلکی کتابیں بہ آسانی پڑھ سکتا ہوں اور حوالے کی کتاب سے بھی بہ خوبی استفادہ کرسکتا ہوں۔

سب سے پہلے شہر کے عربی مدرسے فیض عام میں تقرر ہوا۔ وہاں مشکل یہ پیش آئی کہ درسِ نظامی کی جو ابتدائی کتابیں مجھے پڑھانا تھیں (جنھیں میں خود اپنے زمانے میں پڑھ چکا تھا) اُن کے پڑھنے والے ذرا اُلجھنے لگے ذہنی طور پر، اور پھر چند روز کے بعد بات کھل کر سامنے آگئی کہ طلبا کے مہتم مدرسہ نے (جو میرے دوست بھی تھے اور کرم فرما بھی) یہ کہا کہ استادِ محترم تو داڑھی منڈواتے ہیں، بھلا ہم لوگ ان سے کیسے پڑھ سکتے ہیں۔ مہتم صاحب نے مجھے بلا کر کہا کہ داڑھی تو رکھنا پڑے گی، ورنہ مخالفت زیادہ ہوگی۔ بات اُن کی بجائے خود درست تھی! مگر میں نے یہ کہا کہ یہ تو رشوت کی داڑھی ہے کہ نوکری کرنا ہے تو داڑھی رکھاؤ۔ میں نے انکار کردیا میں داڑھی کی شرعی حیثیت کا معترف تھا اور ہوں لیکن اُس وقت گویا ضد کی بات آپڑی تھی۔ خیر! سمجھوتا اس پر ہوا کہ میں درسِ نظامی کے بجائے منشی، مولوی اور منشی کامل کے امتحانات کی تیاری کراؤں اور اس پر سبھی مطمئن ہوگئے۔

اسی درمیان اسلامیہ ہائرسیکنڈری اسکول میں فارسی، اُردو کے اُستاد کی ایک جگہ نکلی۔ میں نے بھی درخواست دی۔ اس جگہ کے لیے ہمارے شہر کے مولوی محمد یوسف صاحب بھی اُمیدوار تھے، جو گورنمنٹ اسکول میں اُس وقت ٹیچر تھے اور ریٹائر ہونے والے تھے۔ وہ شہر کی ایک مسجد کے امام تھے اور بہت لوگوں کے پیر بھی تھے۔ مشہور شخص تھے۔ وہ دو تین سال کے لیے اس اسکول میں ملازمت کرنا چاہتے تھے۔ میرے اُستاد مولوی مجتبیٰ حسن صاحب میرے لیے کوشاں تھے اور ان کے اثرات سے میرا کامیاب ہونا یقینی سا تھا۔ یوسف صاحب نے بعد نماز جمعہ منبر سے یہ اعلان کیا کہ یہ شخص چوں کہ کمیونسٹوں کے ساتھ ٹریڈ یونین میں کام کرتا رہا ہے اور کمیونزم کو مانتا ہے اس لیے یہ مسلمان نہیں ہوسکتا اور ایسے شخص کو اسلامیہ اسکول میں جگہ کیسے دی جاسکتی ہے۔ یہ گویا ترپ کا پتّا تھا۔ مگر افسوس انھیں کامیابی نہیں ہوئی اور اس طرح 1953 میں میں اسلامیہ اسکول میں اُردو فارسی کے اُستاد کے طور پر کام کرنے لگا۔ اُس وقت تک میں یوپی کے عربی فارسی بورڈ سے مولوی کا امتحان پاس کر چکا تھا اور لکھنؤ یونی ورسٹی کے اورینٹل ڈپارٹمنٹ سے دبیر کامل کا امتحان بھی امتیاز کے ساتھ پاس کر چکا تھا۔ ہاں اُردو فارسی ٹیچر بہ آسانی بن گیا۔ یہاں میں 1959 کے وسط تک رہا۔ 1959 میں اگست کے مہینے میں دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو میں ریسرچ اسسٹنٹ کے طور پر چلا گیا اور پھر وہیں ریسرچ ایسوسی ایٹ ہو گیا اور وہاں سے ذرا سا قبل از وقت 31 دسمبر 1989 کو ریٹائر ہو گیا۔

اسکول کی ملازمت سے پہلے اور آرڈیننس فیکٹری کی ملازمت کے بعد تین نوکریاں اور کیں۔ بہت پریشان تھا معاشی طور پر، پہلے آٹا پیسنے والی ایک چکی پر منشی رہا اور پھر ایک زمین دار کے یہاں کارندہ بنا۔ اس طرح گاؤں کی زندگی اور زمین داری کی زندگی اور دیگر احوال بھی ہوئے۔ 1946 کے آغاز سے 1949 تک یہیں رہا۔ پھر راشن کی ایک دکان پر منشی بن گیا اور 1949 میں وہاں سے مدرسہ فیض عام میں اُستاد بن گیا تھا۔

جنگِ عظیم زوروں پر تھی۔ اُس وقت تک سول کارخانہ میں یونین بنائی جاسکتی تھی۔ آرڈیننس کارخانہ میں اس کی اجازت نہیں تھی۔ کچھ لوگوں نے 1940 کے وسط میں کیرتن اور میلاد شریف کے نام سے گھروں میں چُھپ چُھپا کر یونین کا ڈول ڈالا۔ پھر کھل کر کام ہونے لگا۔ یہاں تک 1945 کے آخر میں 33 دن کی اسٹرائک ہوئی۔ جو کسی بھی آرڈیننس فیکٹری میں باضابطہ اسٹرائک تھی۔ میں اُس وقت اپنی یونین کا جوائنٹ سکریٹری تھا۔ اس کی پاداش میں 1946 کے بالکل شروع میں نکالا گیا۔ اور یہ حسن اتفاق واقع نہ ہوتا تو شاید میری زندگی کا رُخ ہی کچھ دوسرا ہوتا۔ معاشی طور پر اُس کے بعد چار پانچ سال بہت پریشان رہا۔ 45ء میں میری شادی ہو چکی تھی۔ بے حد قانع اور صابر و شاکر بیوی ملی تھی، جس بے حد استقلال اور خوش دلی کے ساتھ اُن دنوں رفاقت کا حق ادا کیا اور یہ روش آج بھی برقرار ہے۔

ہماری یونین میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے ایک تربیت یافتہ شخص تھے، بہت محنتی ایمان دار اور پڑھے لکھے۔ اُن دنوں کمیونسٹ پارٹی میں کامریڈ رندیو کے گروپ کو برتری حاصل تھی اور یہ زمانہ انتہا پسندی کا تھا سیاسی سطح پر۔ مفاہمت نام کی اُن دنوں کوئی چیز نہیں تھی۔ ٹریڈ یونین کے مزدوروں کے مسائل کو حل کرنے سے زیادہ، پارٹی کی آئیڈیالوجی کو پھیلانے کا کام لیا جاتا تھا اور ورکروں کی اسی لحاظ سے شام کی بیٹھکوں میں ذہنی تربیت کی جاتی تھی۔ یونین میں تین چار لوگ ایسے تھے جو اس پالیسی سے اتفاق نہیں کرتے تھے۔ میں بھی اُنھیں میں تھا۔ ہمارا کہنا تھا کہ دنیا کہ مزدوروں ایک ہو جاؤ، کھوکلا نعرہ ہے اور محض سیاسی ہتھ کنڈا۔ ہر فیکٹری، ہر کارخانے کے مزدوروں کے مسائل یکساں نہیں۔ پھر وہ سب ایک کیسے ہوسکتے ہیں۔ ہم یہ کہتے تھے کہ مینجمنٹ سے لڑنا ہمارا مقصود نہیں ہوسکتا۔ طریقۂ کار کا عارضی حصہ ہوسکتا ہے مگر یہ پارٹی کی پالیسی کے خلاف تھا۔

پھر شخصی جھگڑے تھے۔ اب ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ اُس وقت ورکر تو نچلے درجے سے آتے تھے جو بہت ایمان دار، سچے تھے مگر سادہ دل تھے اور سیاسی داؤ پیچ سے ناآشنا۔ جب کہ جتنے لیڈر تھے، وہ سب اپر کلاس سے آتے تھے اور اپنے طبقے کے سارے ذہنی اور علمی تضادات ساتھ لے کر آتے تھے۔ اس سے ایک سطح پر کش مکش کا پیدا ہونا لازمی تھا اور وہ ہوا۔ آخر میں دو گروہ بن گئے تھے یونین میں اسی سوال پر۔

تحقیق کے نقش مختلف وقفوں میں ذہن پر مرتسم ہوتے رہے۔ سب سے پہلے مدرسے میں اُستادِ محترم کی اس بات سے کہ ہر سُنی ہوئی بات سچ نہیں ہوتی۔ تصدیق ضروری ہے پھر گھر میں ایک دوسرے انداز میں تربیت ہوتی تھی۔ یہ بے حد دل چسپ امر ہے کہ میرے اُستاد جس قدر زرارق ذہن اور عمل کے مالک تھے، میرے والد اُسی قدر متشدد تھے۔ صلح سمجھوتے کے تو قائل ہی نہیں تھے جس بات کو اپنے نزدیک درست سمجھتے تھے اُس کو علی الاعلان کہتے تھے اور بار بار۔ مولویوں کے بہکاوے میں آ کر نوکری چھوڑنے پر تیار ہو گئے، یہ سوچے بغیر کہ اس کے اثرات کیا ہوں گے۔ مگر دل کے بہت صاف اور نرم تھے اگرچہ نرمی کا اظہار بہت کم ہو پاتا تھا۔ کھرا پن اور بے لچک شخصیت۔ یہ دواُن کی ذہانت کے اہم افراد تھے۔ ایک واقعے سے اس کا بہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ وہ کٹر دیوبند مخالف تھے اور اُن کے اُستاد (جو میرے بھی پہلے اُستاد تھے) دیوبندی تھے۔ ہمیشہ کہتے تھے کہ کیا کروں، اُستاد ہیں، کچھ کہہ نہیں سکتا؟ دیوبندی ہیں۔ خیر! میں نے قرآن پاک بہت جلد ختم کر لیا۔ خوش ہو کر میرے مرحوم اُستاد نے مجھے اُس دن اپنا نسخہ قرآن پاک دے دیا بہت سی دعاؤں کے ساتھ۔ وہ مترجم تھا۔ ترجمہ مولانا اشرف علی صاحب کا تھا اور حاشیے پر تفسیر بھی انھیں کی تھی۔ میں نے خوشی خوشی گھر آ کر اپنے والد کے سامنے اُسے رکھ دیا۔ اب جو اُسے کھول کر دیکھتے ہیں تو ترجمہ مولانا اشرف علی صاحب کا (جو معروف دیوبندی عالم تھے)۔ چہرے کا رنگ بدل گیا، بل کہ بگڑ گیا۔ انتہائے غضب میں کہنے لگے کہ ''اُس وہابڑے کا ترجمہ میرے گھر میں بھیجا گیا ہے!''۔ مگر کیا کرتے، معاملہ قرآن پاک کا۔ بے ادبی کر نہیں سکتے تھے۔ کچھ دیر بل کھاتے رہے اور بڑبڑاتے رہے پھر میری والدہ کو آواز دی: قینچی لاؤ۔ وہ لے آئیں۔ میری آنکھوں کے سامنے حاشیے کاٹ کر چولھے میں جلا دیے۔ اور اس پر بل کھاتے رہے کہ ترجمہ تو باقی رہ گیا۔ اس میں وہ کچھ کر نہیں سکتے تھے۔

چھ بجے لکھنے پڑھنے بیٹھ جاتا ہوں۔ آٹھ بجے تک۔ پھر 9 بجے سے ایک بجے تک۔ ایک بجے دوپہر کا کھانا کھاتا ہوں۔ دو گھنٹے آرام کرتا ہوں، ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق، یوں کے دل کا مریض ہوں۔ تین بجے اُٹھ کر چائے پیتا ہوں اور پھر آٹھ بجے تک کام کرتا ہوں۔ شام کی خبریں سُن کر ساڑھے نو بجے بستر پر لیٹ جاتا ہوں۔

چائے بغیر دودھ کے پیتا ہوں۔ علی الصباح لیمن ٹی، پھر سادہ چائے۔ لپچو میری پسندیدہ چائے ہے۔ کوشش کرتا ہوں کہ کہیں اور چائے نہ پیوں کیوں کہ عموماً گھروں میں اور معمولی ہوٹلوں میں جو چیز ملتی ہے اُسے چائے کہنا گناہِ کبیرہ کے ذیل میں آئے گا۔ چائے کی پتی کو دودھ اور شکر کے ساتھ اوٹا نا کاڑھا تیار کرنا ہے۔ چائے کا اس سے کیا واسطہ! اس غلیظ مشروب کو یار لوگ چائے کہتے ہیں اور شوق سے پیتے ہیں۔ دنیا میں بہت سی چیزیں عجائبات کی ہیں۔ اُنھی میں اسے بھی سمجھنا چاہیے کہ جو شاندہ جیسی اولٹی ہوئی چیز کو چائے کہا جاتا ہے۔ عمدہ پتی کو دم دیا جائے۔ اُس پتی کو مقررہ وقفے تک (جو محض بہتروں کے لیے پانچ منٹ اور بعض کے لیے آٹھ منٹ ہوتا ہے) تب کہیں وہ خوش بو پیدا ہوتی ہے۔ چائے کا حاصل ہے اور اور وہ ذائقہ جو ذوق کی تربیت میں معاون ہوتا ہے اور خوش ذوقی کی پہچان بنتا ہے۔ اب یہ میں دیکھتا ہوں کہ چائے کے کپ بنیے کے دل کی طرح تنگ تر بننے لگے ہیں۔ مجھے ایسے کپ سے وحشت ہوتی ہے۔ متوسط دست کا خون ہو۔ جب کسی کو گلاس میں چائے پیتے دیکھتا ہوں تو کچھ دیر کے لیے ساری

خوش ذوقی مرحوم ہو جاتی ہے۔ میں مغربی مشروبات کے اُس بنیادی اصول کا اس سلسلے میں اطلاق کرتا ہوں جو لفظ معنی کی بحث میں سامنے آتا ہے کہ خیال بھی اچھا ہو اور باتیں بھی۔ اسی لیے چائے بھی اچھی ہو اور کپ بھی؛ سبک، خوش رنگ اور دست دار۔ چائے دانی کا سرپوش (ٹی کوزی) سادہ ہو تو بہتر ہے۔ کراچی میں سنہری لیس لگے ہوئے چمک دار سرپوش ملتے ہیں۔ اچھے ہوتے ہیں، مگر سادگی میں جو حسن ہوتا ہے اُس میں کہاں۔ اُس میں تکلف ہے، رکھ رکھاو ہے اور بھی کچھ ہوگا، مگر امانت کی شاعری والی بات بھی ہوتی ہے لفظی مناسبتوں کے بوجھ سے شعریت سے خالی نظر آتی ہے۔ پاؤڈر زدہ چہرے حُسنِ قدرتی کے حریف کیسے ہو سکتے ہیں؟ جو تکلف سے بری ہوتا ہے۔ دہلی میں یونی ورسٹی کے ہاسٹل میں رہتا رہا۔ عمر کاٹ دی اُسی بے رنگ کمرے میں۔ کھانا ناشتا میس میں ملتا تھا۔ میں ناشتا کر لیا کرتا تھا۔ چائے نہیں پیتا تھا۔ چائے اپنے کمرے میں آکر پیتا تھا خود بنا کر۔ صبح کی چائے تو 6 بجے ہی پی لیتا تھا خود بنا کر۔ یہ معمول اب بھی ویسا ہی ہے بس اس ترمیم کے ساتھ اب چائے خود نہیں بنانا پڑتی، صبح وقت پر مل جاتی ہے۔ دو بہوئیں ہیں۔ جو اس کا بہت خیال رکھتی ہیں۔ مگر وہ خود وہی اولٹی ہوئی چائے پیتی ہیں اور اس سلسلے میں میں کچھ نہیں کر سکتا۔ اچھی باتوں کو نہ ماننے والوں کی تعداد بہت زیادہ رہی ہے۔ اس پر تعجب کیوں کیا جائے یہ اولٹی آسانی سے بن جاتی ہے اور کم وقت میں۔ آسان پسندی بدذوقی کے ساتھ مل کر جواز کا فتوا بہ آسانی تیار کر لیا کرتے ہیں اور یہاں وہ مثل یاد آتی ہے کہ: قاضی جی تو ہراتے رہے، میں ہاری نہیں۔

آج ہم آپ اس کو یوں بھی کہیں، مگر وہ لوگ اِس کو برحق سمجھتے ہیں۔ اِس کو کسی بھی شکل میں گوارا نہیں کریں گے۔ اُن کے دل اور اُن کی زبان میں فاصلہ نہیں تھا۔ میں دہلی کے ''مہذب اور شائستہ'' لوگوں کے ساتھ 36 سال رہا ہوں اور اس پوری مدت میں آخر تک یہ معلوم نہیں کر سکا کہ کس شخص کی حقیقی رائے کیا ہے۔ جب کہ اس زمانے میں میرے گھر اور محلے میں اور شہر میں ہر شخص کو خوب معلوم ہوتا تھا کہ کس کی رائے کیا ہے۔ پانچ منٹ بھی نہیں لگتے تھے صحیح رائے معلوم ہونے میں۔ وہ بے مروت لوگ تھے۔ ضدی تھے، ہٹیلے تھے، عافیت اندیش بھی تھے، مگر کھرے لوگ تھے۔ جن کے دل آئینے کی طرح روشن تھے۔ اور زبان میں تلوار کی دھار ہوتی تھی کہ کوئی لگی لپٹی رہتی ہی نہیں تھی۔ گھر کے اس ماحول نے جذبۂ عدمِ مفاہیت اور کھرے پن کو بڑھاوا ضرور دیا ہے۔ بے جھجک بات کہنے کی عادت ڈالی اور ادب تحقیق کے عمل میں اس ابتدائی تربیت سے بہت مدد ملی۔ میرے خاندان میں ایک بزرگ تھے، اُن کا قول تو یہ تھا کہ جس پٹھان میں ضد اور جہالت نہیں، اُس کے نطفے میں فرق ضروری تھا۔ اسے بجا طور پر منافقانہ مبالغہ مان لیا جائے۔ لیکن یہ تو تھا کہ پٹھان مصلحت اندیشی سے عموماً ناآشنا ہوتے تھے اور منافقت سے اور ریاکاری سے خاصے دور رہا کرتے تھے۔ اکثریت کا احوال یہی تھا۔

تقریباً 1944 میں ''رسالہ نگار'' سے متعارف ہوا اور نیاز فتح پوری کی تحریروں نے اثر ڈالا۔ (اُس زمانے میں نوجوانوں کی بڑی تعداد کی ذہنی تربیت نیاز کی تحریروں سے ہوئی تھی)۔ تشکیک، دلیل کاری سے، شہادت کا تصور اور روایت کے سچے جھوٹے متعلقات کا ابتدائی سطح پر شعور نیاز کی تحریروں سے ہوا۔ یہ بہت دل چسپ بات ہے کہ جب باضابطہ تحقیق کے دائرے میں آیا تو معلوم ہوا کہ نیاز کے ذہن کو تحقیق سے بہت کم مناسبت تھی اور شناسائی بھی دور کی تھی اور مصلحت پسندی سے وہ غافل نہیں ہوتے تھے اس کے باوجود وہ محقق نہیں تھے۔ اُن کی تحریروں نے ذہنوں میں جو تحقیق سے اُنسیت پیدا کی اور میں اخیر میں علی الاعلان اِس کی شہادت دیتا ہوں کہ اُس زمانے میں نیاز کی تحریروں نے میرے ذہن میں بہت سے سوالیہ نشان پیدا کیے تھے؟ جو بالآخر تحقیق کے عمل میں میرے کام آئے۔

میں نے حافظ محمود خاں شیرانی، قاضی عبدالودود، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی تحریروں سے تحقیق کے آداب سیکھے۔ اسی لیے ان چاروں حضرات کو میں اپنا معنوی استاد مانتا ہوں۔

شاہ جہاں پور ہاکی کا بڑا مرکز رہا ہے۔ یہاں اچھے اچھے کھلاڑی پیدا ہوئے اور چمکے۔ اس لیے اس کھیل نے مجھے شروع ہی سے دل چسپی رہی ہے۔ 1949 سے 1959 تک خود بھی ہاکی کھیلی ہے۔ کھیل میں کھلاڑی کے طور پر کوئی قابل ذکر حیثیت تو حاصل نہیں کر سکا، مگر ٹیم میں کھیلتا رہا۔ دہلی آیا تو بڑے ٹورنامنٹ دیکھنے کا موقع ملا اور وہاں میرے وقت کا خاصا حصہ اسپورٹ اسٹیڈیم کی نذر ہو جایا کرتا تھا۔ ہاکی کے بعد میرے پسندیدہ کھیل فٹ بال، والی بال اور باسکٹ بال ہیں۔ کرکٹ سے مجھے دل چسپی نہیں۔ کبڈی بھی کھیلی ہے۔ اب ٹی وی پر میچ دیکھنے پر قناعت کرنا پڑتی ہے (اتفاقات ہیں زمانے کے!)۔ مجھے ابھی سے فٹ بال کے ورلڈ کپ کے میچوں کا انتظار ہے۔ اُنھیں پابندی سے دیکھتا ہوں۔ اس انہماک سے میرے تحقیقی کاموں پر ذرا بھی اثر نہیں پڑتا (ہر ہوسنا کے نداند جام وسنداں باختن)۔

میرے معمولات میں 1959 کے بعد بہت کم تبدیلی آئی ہے، یوں کہوں کہ گویا نہیں آئی۔ صبح پانچ بجے اُٹھتا ہوں۔ ہر موسم میں ساڑھے پانچ بجے کے قریب نہاتا ہوں، شدید سردی کے زمانے میں بھی اس کا ناغہ نہیں ہوتا۔ (بیماری کی بات الگ ہے)۔ پھر چھے بجے سادہ چائے پیتا ہوں لیمن ٹی۔ آٹھ بجے ناشتا۔ جی ہاں کافی ہاؤس میں پابندی کے ساتھ بیٹھا کرتا تھا جب تک دہلی میں رہا۔ مگر ہمیشہ تنہا، کسی کے ساتھ نہیں۔ اس سے وحشت ہوتی تھی۔ مجلس آرائی کا میں قائل نہیں۔ فضول باتوں کا شوق نہیں، اتنا وقت ہی نہیں ملا کہیں۔ مزاج بھی یہ۔ لیکن اب جب دہلی جاتا ہوں تو کافی ہاؤس ضرور جاتا ہوں کم سے کم دو بار۔ یونی ورسٹی کافی ہاؤس میری پسندیدہ جگہ ہے۔ یہاں کے بیرے تربیت یافتہ تھے اور مردم شناس۔ مہینے کی آخری تاریخوں میں اکثر جیب میں روپے نہیں ہوتے تھے مگر یونی ورسٹی کا کافی ہاؤس کا ناغہ نہیں ہوتا تھا۔ پُرانا بیرے تھا اس کو خوب معلوم تھا کہ جیب میں پیسے ہوں گے تو فوراً دے جائیں گے۔ نہیں ہوں گے تو نہیں۔ اُس نے کبھی پیسے نہیں مانگے، کبھی بل لا کر ٹیبل پر نہیں رکھا۔ دو دن، تین دن، چار دن جب تنخواہ ملی اُسی دن ادائگی کر دی گئی۔ نہ اُس نے حساب بتایا، نہ اُس سے پوچھا کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ کمی بیشی بھی ہے۔ ایسی ایمان داری تو بہت سے ادیبوں اور ناقدوں میں بھی نہیں ملتی۔ اساتذہ کا نام یوں نہیں لیا کہ یہ حضرات عموماً اس سلسلے میں غیر تکلف ہوتے ہیں۔ جو دوسروں کے لیے واجب اور فرض ہے۔ جو ان کے لیے فرض کفایہ ہوتا ہے۔

آج کل کے معمولات بس لکھنے پڑھنے تک محدود ہیں۔ میں تقریبات میں عموماً شرکت نہیں کرتا۔ رشتے داریوں میں بہت کم کبھی کبھار جاتا ہوں اور وہ بھی مجبوراً۔ چاہتا ہوں کہ مجھ سے ملنے کے لیے بھی لوگ نہ آئیں۔ وقت بہت ضائع ہوتا ہے۔ اسی لیے میں نے آخر تک ٹیلی فون نہیں لگوایا کہ وقت ضائع ہوتا ہے۔ لوگ عموماً فضول باتیں کرتے ہیں۔ غیر ضروری اور دیر تک۔ ذہن سے لازمی سوچی سمجھی باتیں نکل جاتی ہیں۔ لیکن میرے بڑے صاحب زادے فون لگوانا چاہتے ہیں۔ میں نے اس شرط پر اتفاق کیا ہے کہ اُس کو میرے کمرے سے دور رکھا جائے گا اور مجھے وہاں نہیں بلایا جائے گا۔ جب تک کہ واقعی کوئی اہم بات نہ ہو، جواب کم ہوتی ہے۔

جی ہاں سحر البیان کو پچھلے دو سال سے مرتب کر رہا ہوں۔ ابھی سال ڈیڑھ سال اور لگے گا۔ مشفق خواجہ صاحب کی جانب سے پاکستان کے کئی اہم خطی نسخے مل گئے ہیں، ورنہ یہ کام شاید اس طرح نہ ہو پاتا جس طرح ہو پا رہا ہے۔ مثنویاتِ شوق لکھنوی پریس میں ہے کہ مجوزہ اصول تدوین پر ایک مجموعہ زیرِ کتابت ہے۔ آیندہ کے پروگرام میں کلام جعفر زٹلی کو مرتب کرنا اور غرائب اللغات کی تدوین شامل ہے۔

میرے اور دوسروں کے لیکچر اور سنہ کی تفصیل لکھنا مشکل ہے۔ میرے پاس یادداشتیں نہیں۔ ایسی چیزوں کو یاد رکھنا یا محفوظ رکھنا فضول کام ہے۔ اس سلسلے میں معذرت طلب ہوں۔ لکھنے پڑھنے سے

ان باتوں کا کیا تعلق۔

میری نجی زندگی میں ایسی کوئی بات نہیں جسے بیان کرنا ضروری ہو۔مری نجی زندگی گر یار ہی ہی نہیں۔جو عمر عشق کرنے کی ہوتی ہے وہ ٹریڈ یونین کے ہنگاموں میں گزری۔یا پھر تلاش معاش میں اور اگر کچھ ہے بھی، جسے سعدی نے لکھا ہے کہ درایام جوانی فنا نکہ افتد ودانی، تو وہ دوسرے لوگوں کے لیے نہیں۔ایسی چیزیں شخصی ہوتی ہیں، پنچایتی نہیں۔

سوالات کے جوابات سب ترتیب میں آگئے ہیں۔آپ کے استاد محترم ''رفیع الدین ہاشمی صاحب'' کا بھی حکم تھا۔اُنھیں میں پیر جی مانتا ہوں، اسی لیے حکم کی تعمیل تو کرنا ہی تھی۔اس کی رسید مجھے مل جائے گی تو اطمینان ہوگا کہ خط تم تک پہنچ گیا۔یہ خط ہاشمی صاحب کی خدمت یوں بھیج رہا ہوں کہ وہ اسے دیکھ لیں اور اگر کوئی ناگفتنی ہو تو اسے قلم زد کر دیں۔

رشید حسن خاں

پس نوشت۔ یہ سوال تو رہ جاتا تھا: جی نہیں پچھتاوا کبھی ہوا۔اب بھی نہیں زندگی کے راستے میرے سامنے تھے، میں نے سمجھ بوجھ کر گھاٹے والے سودے کو خریدا۔پھر پشیمانی کیوں؟ سب سے بڑی بات میری یہ ہے کہ میرا ضمیر مطمئن ہے اور یہی میرے لیے کافی ہے۔اس لیے یہ جو حرام زدگان ادب ہیں، ان سے کبھی سمجھوتا نہیں کر سکا۔اور یہ بھی اسی کا فیض ہے کہ جس بات کو، کام کو غلط سمجھا اور صحیح طور پر اُس پر گرفت کی، ہندوستان، پاکستان میں بیش تر لوگ مجھ سے خوش نہیں رہے، مگر میں نے کسی کی خوشی یا ناراضگی کو کبھی اہمیت نہیں دی۔میں قطعی طور پر خوش ہوں اور مطمئن۔

(مکاتیب رشید حسن خاں بنام رفیع الدین ہاشمی، مرتب، ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد، ادبیات، اُردو بازار لاہور، 2009، ص196 تا 202)

نوٹ۔ یہ خودنوشت نما خط رشد حسن خاں نے اورینٹل کالج لاہور (پاکستان) سے ایم۔اے اُردو کی طالبہ مسرت انیس کے مقالے ''رشید حسن خاں احوال وآثار'' کے 16 سوالات کے جوابات کے طور پر 12 مئی 1998 کو ارسال کیا تھا۔اس خط میں رشید حسن خاں نے اپنی زندگی کے تمام گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔اس سے قبل خاں صاحب مسرت انیس کو اپنے بارے میں کچھ بھی لکھنے اور بتانے سے منع کر چکے تھے۔بل کہ مسرت انیس کو یہ مشورہ دیا کہ ان کے جو طویل انٹرویوز پاکستانی اخبارات جسارت، نوائے وقت اور مشرق میں شائع ہوئے ہیں، ان سے استفادہ کیا جائے۔ساتھ ہی شاہد علی خاں (مینیجر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی سے استفسار کرنے کو بھی کہا۔کیوں کہ شاہد صاحب کے پاس بھی خاں صاحب سے متعلق غیر مطبوعہ مواد تھا۔جسے بعد میں ڈاکٹر اطہر فاروقی نے بڑی جاں فشانی لگن اور محنت سے ''رشید حسن خاں: حیات اور ادبی خدمات'' کے نام سے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، سے شائع کرایا۔مسرت انیس کے سوالات اور جوابات کی تفصیل 11 مئی 1998 میں پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کے نام تحریر کیے خط سے بھی معلوم ہوتی ہے:

> ''آپ کے خط کے بعد آپ کی شاگردہ کا خط آیا، میری طبیعت ادھر کچھ یوں ہی رہی، یوں تاخیر ہوتی رہی۔بارے اب سوال نامے کے جوابات لکھ لیے گئے اور کل یہ حوالۂ ڈاک ہوگا۔آپ کی معرفت یوں بھیج رہا ہوں کہ آپ ایک نظر ڈال لیں، غیر ضروری باتوں کو قلم زد کر دیں اور نا روا تفصیل پر خط کھینچ دیں حشو وزائد جس قدر کم ہوں، اُتنا ہی اچھا ہوگا۔''

(مکاتیب رشید حسن خاں بنام رفیع الدین ہاشمی، مرتب، ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد، ادبیات، اُردو بازار لاہور، جون 2009، صفحہ 107)

○○○

<u>ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد</u>

حیات نامۂ رشید حسن خاں

دادا کا نام: حسن علی خاں

والد کا نام : امیر حسن خاں

قبیلہ : یوسف زئی پٹھان

تاریخِ پیدایش : 25 دسمبر 1925 (تعلیمی اور ملازمتی ریکارڈ میں تاریخِ پیدایش 30 جنوری 1930 ہے۔جس کے غلط ہونے کی طرف خود خاں صاحب نے کئی جگہ اشارہ کیا ہے۔ماہ نامہ شاعر، بمبئی کے ہم عصر اُردو ادب نمبر شمارہ مئی تا دسمبر 1997 میں سوانحی لغت کے لیے خود خاں صاحب اپنا سوانحی خاکہ تحریر کیا جس میں درست تاریخِ پیدایش 25 دسمبر 1925 قرار دی ہے۔دیکھیے: شمارۂ مذکورہ ص1194)

مقام پیدایش: شاہ جہاں پور (یو.پی) بھارت

تعلیم: درسِ نظامی [تکمیل نہ ہو سکی]؛ مدرسۂ بحرالعلوم، شاہ جہاں پور۔1934۔1939

دبیر کامل؛ لکھنؤ یونی ورسٹی۔1946۔1947 [اندازاً]

مولوی؛ عربک پرسین بورڈ، الٰہ آباد۔1946۔1948 [اندازاً]

مصروفیات:

کلودنگ فیکٹری[آرڈیننس فیکٹری،شاہ جہاں پور] میں ملازمت:1939۔1946

معلم عربی وفقہ؛مدرسہ فیض عام شاہ جہاں پور۔1949

ہفتہ وار ندرت، بریلی میں ملازمت؛1950۔1952

معلمِ فارسی عربی؛اسلامیہ ہائر سیکنڈری اسکول،شاہ جہاں پور1952،1959

ریسرچ اسسٹنٹ:شعبۂ اُردو،دہلی یونی ورسٹی اگست1959۔31دسمبر1989

ملازمت سے سبک دوشی:31دسمبر1989۔

شریکِ حیات: نفیس بیگم دختر منظور علی خاں[م29مارچ2003]

اولاد:خورشید حسن خاں

خالد حسن خاں

نادرہ بیگم زوجہ مقصود حسن خاں

اعزازات:

دہلی ساہتیہ کلا پریشد اوارڈ1977

یوپی اُردو اکیڈمی انعام1978

غالب اوارڈ1979

امتیازِ میر اعزاز؛میر اکیڈمی،لکھنؤ1980

نیاز فتح پوری اوارڈ:کراچی1989

نیشنل اوارڈ؛مہاراشٹر اُردو اکیڈمی1990

محمد طفیل ادبی اوارڈ؛لاہور1990

کُل ہند بہادر شاہ ظفر اوارڈ؛اُردو اکادمی،دہلی1991

نیشنل حالی اوارڈ؛اُردو اکادمی،ہریانہ1992

یوپی اُردو اکیڈمی انعام1994 ابوالکلام آزاد اوارڈ؛اُتر پردیش اُردو اکیڈمی،لکھنؤ1998 پرویز شاہدی اوارڈ؛مغربی بنگال اُردو اکیڈمی1998

لیکچر:

مشرقی شعریات پر چھے لیکچر:شعبۂ اُردو جموں یونی ورسٹی،اپریل1983

اصولِ تحقیق پر پانچ لیکچر:شعبۂ اُردو بمبئی یونی ورسٹی،فروری1984

مشرقی شعریات پر تین لیکچر:جواہر لال نہرو یونی ورسٹی،دہلی

اصولِ تحقیق پر تین لیکچر:جواہر لال نہرو یونی ورسٹی،دہلی

اُردو تحقیق پر ایک لیکچر:شعبۂ اُردو،اورینٹل کالج،جامعہ پنجاب،لاہور1992

مشرقی شعریات پر تین لیکچر:شعبۂ اُردو بمبئی یونی ورسٹی۔ستمبر1995

کلاسیکی ادب کی تفہیم پر تین لیکچر:شعبۂ اُردو بمبئی یونی ورسٹی،ستمبر1995

قومی اور بین الاقوامی سمیناروں میں شرکت:

تین سو سالہ جشنِ یادگار شاہ سراج اورنگ آبادی،اورنگ آباد

شیرانی سمینار:خدا بخش اورینٹل لائبریری،پٹنہ

اصولِ تدوین سمینار:خدا بخش اورینٹل لائبریری،پٹنہ

چکبست سمینار:بمبئی یونی ورسٹی،بمبئی

دکنی ادب سمینار:بمبئی یونی ورسٹی،بمبئی

نصابِ تعلیم سمینار:دہلی اُردو اکادمی،دہلی

عوامی ادب سمینار:شعبۂ اُردو دہلی یونی ورسٹی،دہلی

اصنافِ ادب سمینار: دہلی اُردو اکادمی، دہلی

فانی سمینار: الٰہ آباد

نیاز سمینار: یو پی اُردو اکیڈمی، لکھنؤ

انٹرنیشنل نیاز سمینار: 1984، کراچی

سیماب سمینار: سینٹ کالج، آگرہ

جوشؔ سمینار: شیعہ کالج

جوشؔ سمینار: یو پی اُردو اکیڈمی، لکھنؤ

انٹرنیشنل غالبؔ سمینار: غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی

دکنی ادب سمینار: شعبۂ اُردو دہلی یونی ورسٹی، دہلی

انٹرنیشنل املا سمینار: بمبئی یونی ورسٹی، بمبئی

مولانا آزاد سمینار: بمبئی یونی ورسٹی، بمبئی

مولانا آزاد صدی تقریبات: یو پی اُردو اکیڈمی، لکھنؤ

تصانیف و تالیفات: (صرف اولین اشاعتوں کا ذکر کیا گیا ہے)

1۔ انتخابِ نظیر اکبرالٰہ آبادی [انتخاب و ترتیب]: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی 1970

2۔ دیوانِ درد [تدوین]: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی 1971

3۔ انتخابِ مراثیِ انیس و دبیر [انتخاب و مقدمہ]: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ندہلی 1971

4۔ انتخابِ شبلی (مضامین): مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی 1971

5۔ انتخابِ ناسخ [انتخاب و مقدمہ]: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی 1972

6۔ انتخابِ سودا [انتخاب و مقدمہ]: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی 1972

7۔ حیاتِ سعدی [تدوین]: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی 1972

8۔ دیوانِ حالیؔ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی 1972

9۔ موازنہ انیس و دبیر [تدوین]: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی 1972

10۔ گذشتہ لکھنؤ [تدوین]: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

11۔ اُردو املا: ترقی اُردو بورڈ، نئی دہلی 1974

12۔ اُردو کیسے لکھیں: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی 1975

13۔ زبان اور قواعد: ترقی اُردو بورڈ، نئی دہلی 1976

14۔ ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ؛ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، 1978

15۔ تلاش و تعبیر: انجمن ترقی اُردو ہند، نئی دہلی 1988

16۔ فسانۂ عجائب [تدوین و مقدمہ]: انجمن ترقی اُردو ہند، نئی دہلی، 1990

17۔ باغ و بہار [تدوین و مقدمہ]: انجمن ترقی اُردو ہند، نئی دہلی 1992

18۔ ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ اُن کی زبانی [تدوین مقدمہ]: انجمن ترقی اُردو ہند، نئی دہلی 1992

19۔ دہلی کی آخری شمع [تدوین و مقدمہ]: انجمن ترقی اُردو ہند، نئی دہلی 1992

20۔ تفہیم [مضامین]: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی 1993

21۔ انشا اور تلفظ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی 1994

22۔ عبارت کیسے لکھیں: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی 1994

23۔ انشائے غالب: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی 1994

24۔ مثنوی گلزار نسیم [تدوین و مقدمہ]: انجمن ترقی اُردو ہند، نئی دہلی 1995

25۔ مثنویاتِ شوق [تدوین و مقدمہ]: انجمن ترقی اُردو ہند، نئی دہلی 1998

26۔ تدوین تحقیق روایت مجموعۂ مضامین: انجمن ترقی اُردو ہند نئی دہلی 1999

27۔ سحرالبیان [تدوین و مقدمہ]: انجمن ترقی اُردو ہند، نئی دہلی 2000

28۔املاے غالب: ادارۂ یادگارِ غالب، کراچی 2000

29۔مصطلحاتِ ٹھگی [تدوین ومقدمہ]: انجمن ترقی اُردو ہند، نئی دہلی 2000

30۔کلاسکی ادب کی فرہنگ، پہلی جلد [تدوین ومقدمہ]: انجمن ترقی اُردو ہند، نئی دہلی 2003

31۔زٹل نامہ [تدوین ومقدمہ]: نئی دہلی 2003

نا تمام منصوبے:

1۔غرائب اللغات از مولوی عبدالواسع ہانسوی

2۔گنجینۂ معنی کا طلسم [لفظیاتِ غالب*]

3۔قصائدِ سودا [تدوین ومقدمہ]

وفات: 26 فروری 2006

مدفن: شاہ جہاں پور

قطعۂ تاریخِ وصال:

جامع کمالات شخصیت

-2006-

اُسے صبحِ ازل، دستِ عطا نے
عنایت کی قباے علم و تحقیق
عطا اُس صاحبِ ذہن رسا کو
ہوئی زیب و ضیاے علم و تحقیق
بلند، اِس دور میں لاریب تھا وہ
نشانِ ارتقاے علم و تحقیق
ہوا دستِ اجل سے سرنگوں، حیف!
لو اے اعتلاے علم و تحقیق
کہی تاریخ رحلت اُس کی طارق
''وہ خورشیدِ سماے علم و تحقیق''

-2006-

طارقؔ سُلطان پوری

(مکاتیب رشید حسن خاں بنام رفیع الدین ہاشمی، مرتب، ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد، ادبیات، اُردو بازار لاہور، جون 2009، صفحہ 33 تا 37)

نوٹ: *۔گنجینۂ معنی کا طلسم، جلد اول، دوم اور سوم غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی سے 2017، 2018 اور 2019 میں شائع ہو چکی ہے۔

○○○

خورشید حسن خاں
فرزند رشید حسن خاں

رشید حسن خاں کی تحقیق
اور ان کی شخصیت کے مختلف پہلو

حقائق کی بازیافت تحقیق کا موقد ہے۔ تحقیق کا مطلب کسی بھی امر کو اس کی اصل شکل میں دیکھنا ہے۔ کسی بھی امر کی اصل شکل کی دریافت اسی لیے ضروری ہوتی ہے کہ صحیح صورت حال معلوم ہو سکے۔ پچھلی ربع صدی میں ادبی تحقیق میں چند نام اُبھر کر سامنے آئے ہیں ان میں میرے والد محترم جناب رشید حسن خاں کا نام بہت نمایاں ہے۔ انھوں نے تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں لیکن ان کا خاص موضوع تحقیق ہی رہا ہے۔

تحقیق میں ان کے کچھ اصول تھے۔ وہ جو بات کہنا چاہتے تھے اور جس موضوع کا انتخاب کرتے تھے اس کے بارے میں پوری تحقیق کرتے تھے۔ معلومات کرتے تھے اور جو سچ نکل کر آتا تھا اس کو ہی سامنے رکھتے تھے۔

رشید حسن خاں کی تصانیف میں خواہ وہ درسی نوعیت کے انتخاب ہی کیوں نہ ہوں ان کی لکھی ہوئی کوئی بھی کتاب ایسی نہیں ملے گی جو ان کی محنت شاقہ اور ژرف نگاہی کی شاہد نہ ہو۔ ان کی تصانیف میں ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ کو اساسی حیثیت حاصل ہے۔ اس میں تحقیق کے نظری و عملی دونوں پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے۔

اس عہد میں کیا مسائل درپیش آتے ہیں اور ان کا حل کس طرح ہوتا ہے، اس کو بہت خوب صورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ اُردو تحقیق میں جن محققین نے اُردو تحقیق کو ایک معیار اور وقار عطا کیا ان میں حافظ محمود شیرانی اور قاضی عبدالودود کا نام نہایت معتبر اور ممتاز ہے۔ ان بزرگوں نے تحقیق میں احتیاط بندی اور مضبوط دلیلوں کی بنا پر نتائج تک پہنچنے کی بنیاد ڈالی اور محقق کے لیے احساس ذمہ داری لازم قرار دیا۔

رشید حسن خاں کا شمار ان حق گوئی اور بے باکی کے سبب ان مشاہیر میں ہوتا ہے جو ہماری قدیم روایت کے امین رہے۔ محقق کا کام حقائق کو دریافت کرنا ہے۔ والد محترم نے ادبی تحقیق کے جن موضوعات کا انتخاب کیا وہ بے حد مشکل اور پیچیدہ ہیں۔ فسانۂ عجائب، مثنویاتِ شوق، گلزارِ نسیم اور مثنوی سحر البیان کی ترتیب و تدوین میں جس دیدہ ریزی اور وسیع مطالعہ کا ثبوت دیا ہے اس کے پیش نظر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تحقیق میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ والد صاحب اپنے وطن شاہ جہاں پور کے مدرسہ بحر العلوم میں درس نظامیہ کے نظامِ تعلیم سے وابستہ ہوئے تو وہاں پر انھوں نے اپنے اساتذہ کو فقہی اصولوں کی چھان بین اور جمع و ترتیب میں مصروف دیکھا اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی تحقیق اور تدوین میں دل چسپی کی شروعات اسی مدرسہ سے ہوئی۔ رشید حسن خاں کے تحقیقی اور تدوین کے کاموں کو اہلِ نظر نے خوب پسند کیا۔

والدِ محترم مختلف یونی ورسٹیوں میں لیکچر دینے جاتے تھے اور وہاں پر بھی وہ طالب علموں سے یہی کہتے تھے کہ تحقیق کا کام بہت مشکل ہے۔ اور اگر تحقیق کرنا ہے تو طالب علموں کو اس کے اصولوں کی پابندی کرنا ہوگی تاکہ تحقیق میں سچ سامنے آئے اور تحقیق شک و شبہات سے بالاتر رہے۔ بقول رشید حسن خاں:

> ''تحقیق بے حد صبر آزما کام ہے۔ عجلت اور خفیف الحرکاتی اس کو راس نہیں آتی۔ جب بھی دوسرے مقاصد کے حصول کے لیے تحقیق کو استعمال کیا جائے گا تو اس کا معیار تباہ ہو جائے گا اور آنکھیں ایمان داری کے نور سے محروم ہو جائیں گی۔''

تحقیق کے سلسلے میں ہمارے علمائے کرام نے بہت کچھ لکھا ہے اور طرح طرح کی تعریفات اور اصلاحات سے لفظ تحقیق کے معنی اور مطالب پر روشنی ڈالی ہے۔ بقول خاں صاحب ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تحقیق کا کام تنقید سے زیادہ مشکل ہے اور اس کے عملی حق وہی محقق ادا کر سکتا ہے، جس کی فطرت میں تلاش و جستجو کا مادہ ہو۔ ان کے نزدیک محقق کی زبان دستاویزی ہونی چاہیے۔ انھیں اصولوں پر وہ تاحیات چلتے رہے۔

اُنھوں نے بہت سے دیگر کاموں کے علاوہ پانچ ایسے عظیم کارنامے انجام دیے ہیں جن کی مثال ہی نہیں ملتی۔ مثنوی گلزارِ نسیم، مثنویاتِ شوق، مثنوی سحر البیان، فسانۂ عجائب اور باغ و بہار وغیرہ کی تدوین میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔

والدِ محترم کی زندگی کے کئی پہلو ہیں جن کا اگر میں یہاں ذکر نہیں کروں گا تو بات ادھوری رہ جائے گی۔ کیوں کہ ذاتی زندگی کا علم صرف گھر والوں کو ہی ہوتا ہے۔ والدِ محترم 1996 میں دہلی سے مستقل طور پر اپنے وطن شاہ جہاں پور آ گئے اور ہم لوگوں کے ساتھ رہنے لگے۔ ان کے بارے میں لوگ مختلف رائے اور مختلف خیالات رکھتے ہیں۔ کئی لوگ کہتے ہیں کہ خاں صاحب روکھے انسان تھے، کسی سے ملتے جلتے نہیں تھے۔ یہ بات ہمارے وطن شاہ جہاں پور میں بھی مشہور ہوئی لیکن اس میں قطعی کوئی سچائی نہیں ہے۔

والدِ محترم نے ہر اس شخص پر اپنے گھر کے دروازے کھلے رکھے جو ادبی کاموں کے لیے ان سے ملنا چاہتا تھا۔ کئی طالب علم گھر پر آ کر ان سے اُردو کی تعلیم حاصل کرتے تھے جس کے لیے انھوں نے صبح کا وقت مقرر کیا تھا۔ بہت سے بچوں کو انھوں نے اُردو پڑھائی وہ ہر اس آدمی کے لیے وقت نکالتے تھے جو اُردو سے متعلق کچھ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ چھوٹے بچوں کے لیے بھی وقت نکالتے تھے کہ یہ بچے اُردو سے نابلد نہ رہ جائیں۔ لیکن فالتو لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر وقت برباد کرنے سے انھیں سخت نفرت تھی۔ اس کے علاوہ ان کا اخلاق بہت اچھا تھا۔ غصہ تب آتا تھا جب کوئی شور مچاتا یا بلند آواز میں بات کرتا تھا۔

مارچ 2003 میں میری والدہ محترمہ کا انتقال ہوگیا۔ انتقال سے ان کی زندگی میں ایک خلاء سا پیدا ہوگیا تھا کیوں کہ والدہ محترمہ نے تا زندگی ہر موڑ پر ان کا ساتھ دیا۔ طبیعت میں خودداری اس قدر تھی کہ کبھی کسی معاملہ میں کسی سے سفارش نہیں کی۔ وہ اپنی ادبی مصروفیات سے کچھ وقت نکال کر ٹی وی پر ہاکی، کرکٹ اور فٹ بال کا میچ ضرور دیکھتے۔ ڈرامہ سے بھی شوق تھا۔ متعدد ڈرامے میں نے بھی دہلی میں ان کے ساتھ دیکھے۔ اس کے علاوہ انھیں بہترین کھانوں کا بہت شوق تھا۔ خصوصاً وہ مچھلی بہت پسند کرتے تھے۔ اچھی چائے پینے کا شوق تھا۔ وہ اپنی چائے کی پتی دہلی سے لاتے تھے ان کا چائے تیار کرنے کا انداز بھی الگ تھا۔

خاندان میں ہونے والی تقریبات میں وہ ضرور شامل ہوتے تھے اور ہر فرد کا خیال رکھتے تھے۔ میرے اور میرے بھائی کے بچوں سے بہت محبت کرتے تھے بل کہ یوں کہا جائے تو بہتر ہوگا کہ بچوں سے انھیں بہت لگاؤ تھا۔ دہلی جب وہ ہاسٹل میں رہتے تھے تو وہاں کے طالب علموں کا بہت خیال رکھتے تھے اور ان کی مدد بھی کرتے تھے ڈاکٹر خلیق انجم، اسلم پرویز اور ڈاکٹر تنویر احمد علوی ان کے خاص دوستوں میں تھے۔

والدِ محترم رشید حسن خاں آج اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن ان کی یادیں ہمیشہ باقی رہیں گی۔ وہ اپنے اعلا اور معیاری ادبی کاموں کی وجہ سے ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ تحقیق و تدوین میں ان کی کمی ہمیشہ محسوس کی جائے گی۔ ان کے انتقال سے اُردو تنقید و تحقیق کی میدان میں جو خلاء پیدا ہوا ہے اس کا پُر ہونا بے حد مشکل ہے۔ ان کی کلاسیکل تصانیف انھیں اُردو ادب میں ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔

(یہ مضمون خورشید حسن خاں نے احقر کے استفسار پر بہ ذریعہ ای میل 19 مارچ 2018 کو شاہ جہاں پور سے میرٹھ کے پتے پر ارسال کیا)

○○○

ابراہیم افسر

میرا پہلا ادبی سفر

(نگر پنچایت سِوال خاص [میرٹھ] سے آگرہ، لکھنؤ اور شاہ جہاں پور)

ہندوستان کے سولہویں عام پارلیمانی انتخابات 2014 کے دوران، میں اپنے پی ایچ ڈی کے تحقیقی سلسلے کو مزید مستحکم بنانے کی غرض سے شاہ جہاں پور جانا چاہتا تھا۔ خورشید حسن خاں (فرزندِ اکبر رشید حسن خاں) سے موبائل پر شاہ جہاں پور آنے کے بارے میں کئی مرتبہ گفتگو ہوئی۔ انھوں نے میرے شاہ جہاں پور آنے کو اپنی رضامندی دے دی۔ میں نے شاہ جہاں پور جانے کے لیے اپنے ساتھ محترم [illegible]

ساتھ کہیں باہر جانے کی بات کہی اور اس طرح میرا شاہ جہاں پور کا سفر ملتوی ہوگیا۔

وقت برق رفتاری کے ساتھ گزرتا گیا۔ میں محکمہ بنیادی تعلیم اتر پردیش سے (Basic Education) 31 دسمبر 2014 کو مستعفی ہوکر دہلی چلا گیا اور وہاں پر ٹی۔ جی۔ ٹی اُردو کے عہدے پر کام کرنے لگا۔ دہلی میں درس وتدریس کی ذمہ داریوں میں اتنا مصروف رہتا کہ شاہ جہاں پور جانے کے بارے میں بھی سوچنے کی فرصت ہی نہ تھی۔ اس دوران اختر شاہ جہاں پوری، رباب رشیدی اور حنیف سید (آگرہ) سے رابطہ قائم رکھا۔ پورے ایک سال 2 ماہ بعد یعنی 23 مئی 2015 دن سنیچر دوپہر 1 بج کر 15 منٹ پر سہراب بس ڈپو، میرٹھ سے آگرہ کے لیے روانہ ہوگیا۔ اس بار عزیزم ریاض الدین میرے ہمراہ سفر کرنے والے تھے۔ عین وقت پر وہ بھی معذرت خواہ ہوگئے۔ لیکن ریاض صاحب مجھے وداع کرنے سوال خاس سے، بس ڈپو سہراب گیٹ، میرٹھ تک آئے۔

عین دوپہری میں جب میں بس میں سوار ہوا تو دل میں اس پہلے ادبی سفر کو لے کر طرح طرح کے خیالات پیدا ہو رہے تھے۔ گرمی کے مارے میرا بُرا حال تھا۔ سارا بدن پسینوں سے شرابور تھا۔ پیاس بجھنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ بجھتی بھی کیوں؟ کیوں کہ یہ علمی تشنگی کا سفر تھا۔ میں نے پہلی فرصت میں حنیف سید صاحب (آگرہ) کا فون لگایا۔ دُعا سلام کے بعد اُن سے ملنے کا وقت طے کرلیا۔ دورانِ سفر حنیف صاحب کے کئی فون یہ معلوم کرنے کے لیے آئے کہ میں کس مقام تک اور کہاں تک آ گیا ہوں اور آگرہ کتنی دیر میں ان کے دولت کدے پر پہنچ جاؤں گا۔ لیکن بس ڈرائیور نے قسم کھا رکھی تھی کہ آج میرٹھ سے آگرے خراماں خراماں چلنا ہے۔ تمام سواریاں گرمی کی وجہ سے بے حال تھیں۔ سب لوگ ڈرائیور کو اچھے اچھے القاب سے نواز رہے تھے۔ لیکن ڈرائیور پر اس کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ کفر ٹوٹا خدا خدا کرکے، پانچ گھنٹے کی طویل مسافت کے بعد آگرہ کی سرحد پر ''خوش آمدید'' کے شائن بورڈ (Signboard) نظر آنے لگے۔ میں نے حنیف سید صاحب کو اطلاع دی کہ میں آپ کے پاس جلد پہنچ جاؤں گا۔ دورانِ گفتگو انھوں نے مجھے اپنے گھر کا پتا نوٹ کرایا۔ آخر کار رات کے 9 بجے میں واٹر بکس (آگرہ) اُتر گیا اور وہیں سے بجلی گھر کے لیے آٹو رکشہ میں سوار ہوگیا۔ آگرہ میں قدم رکھتے ہی عجیب سی حالت ہوگئی۔ مجھے اس شہر میں نظیرؔ، میرؔ اور غالبؔ کے گزارے ہوئے ایام یاد آنے لگے۔ ساتھ ہی مغلیہ حکومت کی شان وشوکت، جاہ وجلال کے عکس نمایاں ہونے لگے۔ قدیم اور جدید طرز کی عمارتیں ہر طرف دکھائی دے رہی تھیں۔ دل میں طرح طرح کے خیال پیدا رہے تھے۔ رہ رہ کر دماغ اُس دور میں پہنچ جاتا جہاں جانا ممکن نہ تھا۔ اتنے میں آٹو والے نے بتایا کہ بابو جی بجلی گھر آ گیا۔ سفر کب پورا ہوا معلوم ہی نہیں ہوا۔ بجلی گھر سے میں نے فوارہ کے لیے رکشہ کیا۔ فوارہ کا علاقہ آگرہ فورٹ جامع مسجد کے نزدیک واقع ہے۔ جب میں آگرہ کی شاہی جامع مسجد کے قریب سے گزرا تو مجھے فوراً دہلی کی جامع مسجد یاد آ گئی۔ پتا کرنے کے پر معلوم ہوا کہ اس جامع مسجد کی تعمیر کسی مغل شہزادی نے کرائی تھی۔ باتوں باتوں میں فوارہ بھی آ گیا۔ میں نے حنیف سید صاحب کو فون ملایا۔ انھوں نے برگد کے نیچے والے مندر کے پاس آنے کو کہا۔ چند قدم کے فاصلے پر وہ مندر تھا۔ 5 منٹ کے انتظار کے بعد حنیف صاحب میری نظروں کے سامنے تھے۔ مصافحہ کے بعد ہم دونوں سوئی کٹرا (حنیف سید کا گھر) کی جانب پیدل ہی روانہ ہولیے۔ راستے میں ایک دکان پر اُردو کا سائن بورڈ نظر آیا تو طبیعت خوش ہوگئی۔ اسی درمیان حنیف صاحب کا مکان آ گیا۔ انھوں نے اپنی چھوٹی بیٹی نمّی کو آواز دے کر دروازہ کھلوایا۔ بیٹھک میں داخل ہوتے ہی سامنے حنیف صاحب کی ذاتی لائبریری تھی۔ لائبریری میں رشید حسن خاں کی تخلیق اور مرتب کردہ کئی کتابیں موجود تھیں۔ میری حیرانی میں اضافہ تب ہوا جب معلوم ہوا کہ رشید حسن خاں نے حنیف سید صاحب کو اپنے دستخط کردہ گلزارِ نسیم کتاب تحفتاً دی تھی۔ رات کو کھانے سے فارغ ہوکر ہم دونوں نے خاں صاحب کی علمی فتوحات اور ادبی کارناموں پر خوب باتیں کیں۔ حنیف سید باتوں میں اس قدر محو ہوئے کہ وقت کا پتا ہی نہیں چلا کہ کب رات کے 12 بج گئے۔ دورانِ گفتگو گئی چونکانے والے خلاصے ہوئے۔ حنیف سید نے بتایا کہ کیسے خاں صاحب لوگوں سے کم ملتے تھے اور آنے والوں کو تاکید کر رکھی تھی کہ اگر مجھ سے ملنا ہے تو پہلے ٹیلی فون کرلیا کرو۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ میں نے خاں صاحب کو مبارک شمیم (ڈاکٹر قمر رئیس کے بڑے بھائی) کی کتاب کا رسمِ اجرا کرنے کے لیے بہت مشکل سے تیار کیا تھا۔ لیکن میں ہی اُس تقریب میں پہنچ نہیں سکا۔ مجھ پر نیند کا غلبہ طاری ہونے لگا تھا۔ کیوں کہ میں دن بھر کے سفر سے تھک چکا تھا۔ اب مجھے آرام کی سخت ضرورت تھی۔ میں نے حنیف سید صاحب سے سونے کے لیے کہا۔ بھلا وہ اس خاص گفتگو کو ادھورا کیوں چھوڑتے۔ میں دھیرے دھیرے نیند کے آغوش میں چلا گیا۔

سویرے جب آنکھ کھلی تو دن، تاریخ اور وقت تینوں بدل گئے تھے۔ صبح کے 6:30 بج چکے تھے۔ حنیف صاحب تو مجھ سے پہلے ہی جاگ گئے تھے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ میں رات بھر خراٹے لیتا رہا اور دوسروں کی نیند بھی خراب کرتا رہا۔ خیر! تھوڑی دیر میں اندر سے ناشتہ آ گیا۔ دو روٹی اور چار پراٹھے کے ساتھ چاے۔ ناشتہ سے فارغ ہوکر میں نے تاج محل دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ حنیف سید صاحب کی بیگم نے گرمی کا حوالہ دے کر اُنھیں گھر پر ہی رہنے کی تاکید کی۔ میں نے اکیلے ہی دنیا کی اس عظیم اور خوب صورت عمارت کا دیدار کرنے کا فیصلہ کیا۔ صبح 9 بجے میں سوئی کٹرہ سے تاج محل کی جانب نکل پڑا۔ کیوں کہ یہ میرا آگرہ میں پہلا سفر تھا۔ ویسے میں تاج محل کی تصاویر کو اخبارات اور ٹیلی ویژن کے ذریعے دیکھ چکا تھا۔ لیکن بہ چشم خود نہیں دیکھا تھا۔ میرے دماغ میں شاہ جہاں اور ممتاز بیگم کے طرح طرح کے عکس اُبھرنے لگے۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے سفر کے بعد آٹو والے نے مجھے تاج محل کے ساؤتھ گیٹ پر چھوڑ دیا۔ پہلی فرصت میں، میں نے ٹکٹ خریدا اس کے بعد لائن میں لگ کر تاج محل کے اندر داخل ہوا۔ تاج محل کے صدر دروازے کے دل کش منظر نے اور سامنے دروازے سے نکلتے ہوئے تاج محل نے میرا من موہ لیا۔ اس عظیم اور عالی شان عمارت کے دیدار نے مجھے جنونی بنا دیا۔ سورج کی تمازت بھی اپنا رنگ اور تیور دکھانے لگی تھی۔ صدر دروازے کے دیدار کے بعد میں اندر چلا گیا۔ سامنے محبت کا عظیم مقبرہ دھوپ، بارش اور سردی کو برداشت کرتے ہوئے متواتر لوگوں کو بتا رہا ہے کہ دیکھو میں محبت کی ایجاد ہوں۔ میں تو پہلی نگاہ میں ہی تاج کا گرویدہ ہوگیا تھا۔ تاج محل سے نظریں ہٹانے کا سوال ہی نہ تھا۔ میں تاج کے بارے میں نئے نئے زاوئے سے غور وفکر کرنے لگا۔ خیر ایک فوٹو گرافر نے آکر مجھے پکارا، فوٹو پلیز! میں نے چار فوٹو تاج کے سامنے کے کھنچوائے۔ اس کے بعد میں اصل عمارت کے دیدار کرنے کے لئے تاج محل کے اندر داخل ہوگیا۔ میں تاج کا طواف کر رہا تھا۔ چاروں طرف کا نظارہ کتنا دل کش اور پر کشش تھا اُسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر میں مرحوم رشید حسن خاں پر تحقیق نہ کرتا تو کبھی بھی اس عظیم عمارت کے دیدار نہ کر پاتا۔ میں نے دل سے مرحوم رشید حسن خاں کا شکریہ ادا کیا۔ پھر سوچا کہ کیا کبھی رشید حسن خاں بھی آگرہ آئے تھے؟ انھوں نے اس تاریخی عمارت کا دیدار بھی کیا ہوگا یا نہیں؟ یا اپنی تحقیق میں وہ اس قدر منہمک رہے ہوں گے کہ ادھر آنے کی فرصت ہی نہ ملی ہو۔ سوچتا ہوں کہ خاں صاحب ایک تحقیقی مضامین تاج محل پر بھی تحریر کردیتے تو تمام طرح کی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جاتا۔ میں تقریباً 3 گھنٹے اس عمارت میں رہا۔ میوزیم میں مغلوں کے ہتھیار اور مخطوطات کو غور سے دیکھا۔ گرمی اپنے پورے شباب پر تھی۔ جسے برداشت کرنا میرے بس میں نہیں تھا۔ آگرے شہر جیسی گرمی میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ شاید محبت کی گرمی کو شاہ جہاں اور ممتاج دونوں مل کر پورے آگرے میں تقسیم کر رہے ہیں۔ میں اب جلدی سے سوئی کٹرہ پہنچنا چاہتا تھا۔ کیوں کہ گرمی سے میرا بُرا حال تھا۔ آٹو پکڑ کر میں حنیف سید صاحب کے مکان پر پہنچ گیا۔ میں نے خوب ٹھنڈا پانی پیا۔ حنیف صاحب مسکرائے اور کہنے لگے برخوردار! یہ پتھریلا علاقہ ہے۔ یہاں گرمی اور سردی دونوں جم کر پڑتی ہے۔ میں نے دل میں سوچا کہ بادشاہ اور بیگم دونوں گہری نیند میں سو رہے ہیں اور باہر دنیا اُن کے بنائے ہوئے محبت کے

مقبرے کے دیدار کے لیے پاگل ہو رہی ہے۔ دنیا میں ہندوستان کا نام اس عظیم تاریخی عمارت سے ممتاز ہے۔ میں آگرے کا اپنا کام جلد ختم کرنا چاہتا تھا۔ حنیف صاحب سے رشید حسن خاں کے بارے میں مزید معلومات اکھٹا کرنے لگا۔ انھوں نے خاں صاحب کے بارے میں بہت سی کارآمد اور مفید باتیں بتائیں۔ باتوں باتوں میں شام کے 4 بج گئے۔ اب میں تھوڑا آرام کرنا چاہتا تھا۔ بستر پر دراز ہوتے ہی مجھے نیند آنے لگی۔ سو کر اُٹھا شام کے 6 بج چکے تھے۔ حنیف صاحب نے کھانا تیار کرا دیا تھا۔ شاید اُنھیں میرے سفر کی اہمیت کا اندازہ تھا۔ دونوں نے ایک ساتھ کھانا کھایا۔ میں اب لکھنؤ جانے کی جلدی میں تھا۔ کیوں کہ وہاں بھی رشید حسن خاں کے عزیز دوست رباّب رشیدی میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں رکشہ سے آگرہ فورٹ اسٹیشن پہنچ گیا۔ ٹکٹ میں نے پہلے ہی خرید لیا تھا۔ ریزرویشن نہیں ہو سکا تھا۔ گاڑی ''مرودھرا ایکسپریس'' مقررہ وقت سے ایک گھنٹہ لیٹ تھی۔ میں خوش تھا۔ کیوں کہ لکھنؤ یہ گاڑی مجھے علی الصباح 2:30 بجے اسٹیشن پر اُتارنے والی تھی۔ آخر کار گاڑی آئی اور میں جنرل ڈبے میں سوار ہو گیا۔ جیسے تیسے کر کے ایک سیٹ کا انتظام کیا۔ میں نے اسٹیشن کے باہر سے ہی آگرہ کی شاہی جامع مسجد اور آگرہ قلع کے دیدار کیے۔ گاڑی نے ہارن دیا۔ سواریاں چڑھنے لگیں۔ گرمی بہت تھی۔ رات میں بھی ہوا گرم چل رہی تھی۔ شاید یہ گرم ہوا بھی ٹرین میں سوار تمام لوگوں کو عظیم محبت کا گرم احساس کرانا چاہتی تھی۔ اب میرے دماغ میں لکھنؤ کا خاکہ تیار ہونے لگا تھا۔ رات بھر مشکلات کا سامنا کرنے کے بعد آخر کار 25 مئی صبح 3 بج کر گیارہ منٹ پر چار باغ لکھنؤ اسٹیشن پر اُتر گیا۔ سوچا اتنی رات گئے رباب صاحب کو کیوں پریشان کروں؟ میں نے اسٹیشن پر ہی موبائل چارج کیا۔ فجر کی نماز کا وقت قریب تھا۔ بغل میں ہی مسجد تھی۔ مسجد گیا تو معلوم ہوا جماعت ہو گئی ہے۔ نماز ادا کی اور وہیں مسجد میں سو گیا۔

تقریباً ایک گھنٹہ کی نیند لینے کے بعد میں نے اپنا سامان اُٹھا کر مسلم مسافر خانہ لکھنؤ کی جانب رُخ کیا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ یہاں پر ڈورمیٹری یا کمرہ صبح 8 بجے ہی ملے گا۔ میں پریشان ہوا اُٹھا ابھی تو صرف 6 ہی بجے تھے۔ میں سیدھا مسافر خانے کی کینٹین میں ناشتے کے لئے چلا گیا۔ ناشتہ سے فارغ ہو کر میں نہانے کے بارے میں سوچنے لگا۔ اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد ایک غسل خانہ کھالی نظر آیا اور میں رات کی تکان سے نجات پانے کے لیے اُس میں نہانے لگا۔ چوکی دار محمد اکمل نے جب میرا سامان لاوارث حالت میں دیکھا تو دروازہ زور سے پیٹنے لگا۔ میں نے کہا بھائی! ذرا نہا نے دیجیے۔ اُس نے سختی سے کہا اجنبی آدمی کو ایسے کیسے نہانے دیں۔ میں نے نہانے کے بعد اُس سے ملنے کا وعدہ کیا۔ نہا کر جب میں باہر آیا تو وہ میرے انتظار میں وہیں کھڑا تھا۔ میں نے دس کا نوٹ اُس کی جیب میں ڈال دیا۔ میں بھی مسکرایا اور سوچا کہ اب تو نہانے کے لیے بھی رشوت دینا پڑتی ہے۔ اُس نے دس کے نوٹ کی گرمی سے میرے لکھنؤ آنے کا سبب پوچھا۔ میں نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ رباّب رشیدی ملاقات کا ارادہ ظاہر کیا۔ چوکی دار نے گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا کہ رباّب صاحب کو لکھنؤ میں کون نہیں جانتا۔ اُس نے مجھے اُن کے گھر جانے کا راستا اور پتا بتایا۔

مسلم مسافر خانہ سے نکل کر میں نے رکاب گنج کا آٹو لیا۔ رکاب گنج سے تازی خانہ چند قدم کے فاصلے پر ہی ہے۔ میں خرامہ خرامہ رباب صاحب کے گھر کی جانب چل دیا۔ رباّب صاحب سے یہ تیسری ملاقات ہونے والی تھی۔ سفید مسجد کے پاس تازی خانہ ہے۔ پتا نہیں اس محلے کا نام تازی خانہ کیوں پڑا۔ اس علاقے کی حالت بہت خستہ ہے۔ چند منٹوں میں، میں رباب صاحب کے مکان نمبر 126 تازی خانہ پر موجود تھا۔ ویسے یہ مکان رباّب رشیدی کی خالہ کا ہے۔ میں نے آواز دی۔ اندر سے ایک خاتون نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور نام پتا معلوم کر کے اندر چلی گئی۔ میں اپنی کلائی پر بندھی گھڑی میں دیکھا کہ ابھی تو صبح کے 7 بجے ہیں اور ملنے کا وقت دس بجے مقرر ہوا ہے۔ آخر غلطی میری تھی کہ میں اتنی جلدی کیوں آیا۔ اُسی خاتون نے اندر آنے کے لیے دروازہ کھولتے ہوئے بیٹھک میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہاں رباّب صاحب آرام فرما رہے تھے۔ انھوں نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ برخوردار! رات بھر سفر کیا ہے تم تھکے ہو گے۔ صوفے پر لیٹ جایئے۔ میں نے سلام عرض کیا۔ انھوں نے کہا کہ باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ تھوڑا اُستا کر ہی رشید حسن خاں سے متعلق مواد پر گفتگو کی جائے۔ صوفے پر لیٹتے ہی مجھے نیند آ گئی۔ صبح 10 بج کر 15 منٹ پر رباّب صاحب نے آواز لگائی۔ ''برخوردار اُٹھ جایئے۔ مجھے لگتا ہے کہ آپ کی نیند پوری ہو گئی ہو گی۔'' میں فوراً ہی اُٹھ گیا۔ اتنے میں ایک لڑکا پانی لے آیا اور میں نے منھ دھویا۔ وہی لڑکا ایک منٹ بعد ہی ناشتہ لے آیا۔ ناشتے میں 3 روٹیاں تھیں۔ رباّب صاحب نے ناشتہ کرنے سے انکار کر دیا۔ کیوں کہ وہ ناشتہ سے قبل پہلے اپنی دوائی کھانا چاہتے تھے۔

ناشتے کے دوران میں نے رشید حسن خاں کا ذکر چھیڑ دیا۔ کیوں کہ یہاں آنے سے قبل اپنے گھر سے میں نے یوسف ناظم کے خاکے کا تذکرہ کر دیا تھا۔ رباّب صاحب نے کسی لڑکے کو بلایا اور ہدایت کی کہ دانش محل جا کر میرا سلام عرض کرنا اور ایک فوٹو کاپی لے آنا۔ وہ لڑکا چلا گیا۔ باہر گرمی اپنا قہر برپا رہی تھی اور اندر میری علمی تشنگی مجھے بے حال کر رہی تھی۔ رباّب صاحب نے رشید حسن سے آخری بار نہ ملنے کا افسوس ظاہر کیا۔ کیوں کہ فروری 2006 میں انھیں پیر میں چوٹ لگنے کی وجہ سے لکھنؤ میں ہی رکنا پڑا۔ جب کہ خاں صاحب سے ان کی ملاقات کا وقت مقرر تھا۔ قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ رباّب صاحب نے بھرے من سے افسوس ظاہر کیا۔ اسی دوران رباّب صاحب نے ڈاکٹر نسیم اقتدار علی کی دو کتابیں میرے لیے منگوائی تھیں۔ ''دھوپ چھاؤں چہرے'' اور ''دیدہ و شنیدہ''۔ اول الذکر کتاب میں نسیم صاحبہ نے رشید حسن خاں کا دس صفحات پر مشتمل بہترین خاکہ لکھا ہے۔ اس خاکہ میں انھوں نے اپنے اور رشید حسن خاں کے دیرینہ تعلقات کے علاوہ نجی زندگی سے متعلق بہت سی باتیں تحریر کی ہیں۔ جن سے اُردو دنیا اب تک انجان تھی۔ تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد رباّب صاحب کا بھیجا ہوا لڑکا اپنے ہاتھ میں یوسف ناظم کا خاکہ لیے حاضر تھا۔ رباّب صاحب نے بتایا کہ میں یہ خاکہ پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہوں۔ رباّب صاحب نے اپنی مترنم آواز میں ''خانِ خاناں رشید حسن خاں'' خاکہ پڑھنا شروع کیا۔ خاکہ کس انداز میں لکھا گیا ہے یہ تو پڑھنے اور سننے والا ہی بتائے گا۔ رباب صاحب ہر نکات کی تشریح کرتے جاتے اور وہ یوسف ناظم کا جملہ دہراتے جاتے۔ واقعی مجھے احساس ہوا کہ یوسف ناظم نے اس خاکہ میں اپنے قلمی جوہر خوب دکھائے ہیں۔ اِملا، زبان و قواعد اور تحقیق کے منفرد لہجے کی نقل، رشید حسن خاں کے علم کی شہرت پاکستان میں، حنفی اور منفی کا جس خوب صورت انداز میں ذکر کیا ہے اُس سے قاری کے پیٹ میں بل ضرور پڑ جاتے ہیں۔ کافی دیر تک ہم دونوں کے درمیان اسی خاکہ پر گفتگو ہوتی رہی۔ میں نے رباب صاحب سے نیا دور دسمبر 2007 کا رشید حسن خاں نمبر بھی لیا۔ رباب صاحب نے یہ بھی بتایا کہ اگر آپ اُردو اکادمی لکھنؤ جائیں تو وہاں ڈاکٹر فرقان کا کوروی کے پاس خاں صاحب کا کوئی خط مل سکتا ہے کیوں کہ نسیم اقتدار علی کی ایک اور کتاب جو خطوط پر مبنی ہے کی کمپوزنگ وہی کر رہے ہیں۔ وقت بہت ہو چکا تھا۔ اب میں لکھنؤ سے شاہ جہاں پور جانا چاہتا تھا۔ جب میں نے اپنے دل کی کیفیت رباب صاحب کو بتائی تو وہ بہت خوش ہوئے۔ شاہ جہاں پور میں جا کر مجھے کن لوگوں سے ملاقات کرنی ہو گی اور کن کن مقامات پر جانا ہے، ان سب باتوں کی تفصیل رباّب صاحب نے میرے سامنے رکھی۔ انھوں نے مجھے اپنے برادرِ خورد ماسٹر سہیل احمد کا موبائل نمبر اور ان کے گھر کا پتا لکھ کر دیا۔ ساتھ میں یہ تاکید بھی کی کہ جب تم شاہ جہاں پور ریلوے اسٹیشن پہنچ جاؤ تو مجھے اطلاع ضرور کر دینا۔

رباّب رشیدی کے گھر سے وداع ہو کر میں ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی (ایڈیٹر نیا دور، لکھنؤ) سے ملنے کے لیے اُن کے دفتر پہنچ گیا۔ سفر کی گرمی سے میں پریشان تھا۔ وضاحت صاحب کے دفتر میں ان سے ملاقات ہوئی۔ میں نے یہ شکایت کی کہ نیا دور احقر کو بروقت موصول نہیں ہو رہا ہے۔ انھوں نے اپنے دفتر کے کلرک سے جنوری، فروری اور مارچ 2015 کے رسالے منگا کر میرے سپرد کیے۔ میں نے اُن

سے، اپنے لکھنؤ آنے کا مقصد بیان کیا۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ نیا دور لکھنؤ کے دفتر سے فارغ ہو کر میں اُردو اکادمی لکھنؤ کے دفتر گومتی نگر پہنچ گیا۔ اُردو اکادمی کی دیدہ زیب عمارت کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ دفتر کی تیسری منزل پر فرقان کاکوری صاحب سے میری ملاقات ہوئی۔ میں نے رباب صاحب کا سلام اُن تک پہنچایا۔ اور رشید حسن خاں کے خطوط سے متعلق ان سے دریافت کیا۔ فرقان صاحب نے مجھے بتایا کہ اکادمی میں رکھے ہوئے تمام خطوط کو میں ڈاکٹر نسیم اقتدار علی کے حوالے کر چکا ہوں۔ میں مایوس ہوا۔ اس کے بعد میں اکادمی کی لائبریری گیا تا کہ وہاں رشید حسن خاں پر کچھ مواد مل سکے۔ لائبریری میں ''مرقع معاصرین'' نامی کتاب میں رشید حسن خاں کی تصویر ''محقق'' کے صفحات پر لگی ہوئی تھی۔ اس کتاب کی سنِ اشاعت اور پبلشرز وغیرہ کا نام میں نے اپنی ڈائری میں نوٹ کیا۔ لائبریری انچارج احسن قدوائی نے اپنے اور رشید حسن خاں کے تعلقات کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ میں خوش تھا کہ رشید حسن خاں سے متعلق جو معلومات (میری جان کاری کے مطابق) کتابوں میں درج نہیں تھی وہ مجھے تگ و دو کے ذریعے حاصل ہو گئی تھیں۔ احسن قدوائی نے رشید حسن خاں کے ایک قصہ کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ خاں صاحب اکادمی کے مجلسِ مشاورت کے رکن ہونے کی وجہ سے اکثر لکھنؤ آتے تھے اور پروفیسر محمود الٰہی سے عمدہ چائے نہ ملنے کی وجہ سے ناراض ہو جاتے تھے اور کہتے تھے ''میاں آپ قاعدے کی چائے تو پلاتے نہیں ہو اور مجھے دہلی سے لکھنؤ بلا لیتے ہو۔'' محمود صاحب خاں صاحب کی اس بات پر صرف مسکرا دیتے تھے۔ کیوں کہ پروفیسر صاحب ان کے عمدہ چائے پینے کے شوق سے بہ خوبی واقف تھے۔ بات چیت میں وقت کا پتا ہی نہ چلا کہ کب دوپہر کے تین بج چکے تھے۔ مجھے شاہ جہاں پور بھی جانا تھا۔ میں نے احسن صاحب سے اجازت لی اور چار باغ ریلوے اسٹیشن لکھنؤ کے لیے آٹو میں بیٹھ گیا۔

اسٹیشن پر پہنچنے کے بعد معلوم ہوا کہ شاہ جہاں پور جانے والی 'پنجاب میل' گاڑی تھوڑی تاخیر سے چل رہی ہے۔ ٹکٹ لینے کی ہڈ بڑاہٹ میں کاؤنٹر پر ہی چالیس روپے بھول گیا۔ اسٹیشن پر جمِ غفیر اس قدر تھا کہ تل رکھنے کی جگہ نہ تھی۔ کچھ لمحوں کے بعد پنجاب میل آ گئی اور میں اس میں سوار ہو کر شاہ جہاں پور کی جانب روانہ ہو گیا۔

دورانِ سفر ربابؔ صاحب کے کئی فون اس بات کی تصدیق کے لیے آئے کہ شاہ جہاں پور کتنی دیر میں پہنچ رہا ہوں۔ کیوں کہ شاہ جہاں پور میں ''ملہار سنیما'' کے پاس ان کے برادر خورد ماسٹر سہیل احمد میرا انتظار کر رہے تھے۔ رات کے تقریباً پونے نو بجے میں شاہ جہاں پور پہنچ گیا۔ میں نے رباب صاحب کو یہ اطلاع دی کہ میں بہ خیر، علم و ادب کے شہر پہنچ گیا ہوں۔ رکشہ میں سوار ہو کر میں ملہار سنیما، سرائے ترین کی جانب چل دیا۔ اس دوران رکشے والے نے اس شہر کی خوبیوں اور خامیوں سے مجھے باور کرایا۔ جب رکشہ ملہار سنیما کی جانب سے گزرا تو ایک آواز نے مجھے چونکا دیا، ابراہیم افسر میرٹھ! وہ آواز ماسٹر سہیل احمد کی تھی۔ حیرت مجھے اس بات کی تھی کہ انھوں نے مجھے پہچانا کیسے؟ بہر کیف، میں رکشہ سے نیچے اترا اور سہیل صاحب کے ہم راہ ان کے دولت کدے کی جانب چل دیا جو محض پچاس قدم کے فاصلے پر واقع تھا۔ رباب رشیدی اور سہیل احمد کی قد و قامت میں کافی حد تک مشابہت تھی۔ گھر میں داخل ہونے کے بعد ماسٹر صاحب نے اپنی آرام گاہ کا دروازہ کھولا۔ ان کے گھر میں کوئی چہل پہل نہ ہونے کی وجہ سے میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کے بچے کہاں ہیں۔ اس پر وہ مسکرا دیے۔ انھوں نے جواب دیا ''ابراہیم میاں اللہ نے مجھے صرف ایک لڑکی سے نوازا ہے۔'' تھوڑا آرام کرنے کے بعد سہیل صاحب نے میز پر دسترخوان لگا دیا۔ اس دوران ماسٹر صاحب نے سفر کی تفصیلات اور تکلیفات کے بارے میں دریافت کرنا شروع کیا۔ دورانِ گفتگو ماسٹر صاحب نے رشید حسن خاں سے متعلق بہت سی نئی معلومات مجھے فراہم کیں۔ وہ بتانے لگے کہ کیسے پورا شاہ جہاں پور خاں صاحب کے علم و فن کی قدر اور ان کے علمی کارناموں پر فخر کرتا تھا۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہوتے رات کے دس بج چکے تھے۔ سفر کی تکان نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔ میں بستر پر دراز ہو گیا اور اگلے دن کا پروگرام میں نے ماسٹر صاحب کو بتایا۔ وہ میرے کام کرنے کے طریقے سے بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے میری آنکھوں میں نیند دیکھ لی تھی۔ وہ شب بہ خیر کہہ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔

اگلے دن یعنی 26 مئی 2015 بہ روز منگل کی صبح 6 بجے میں نیند سے بیدار ہوا۔ ناشتہ کرنے کے لیے ماسٹر سہیل صاحب مجھے اپنے بالائی کمرے پر لے گئے۔ کمرے میں ان کا ذاتی کتب خانہ تھا۔ کتابوں کی ورق گردانی کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ کتابیں ربابؔ رشیدی نے انھیں تحفتاً دی ہیں۔ رشید حسن خاں کی تحریر کردہ کتابوں کی فہرست بھی انھوں نے مجھے دکھائی۔ ساتھ ہی خاں صاحب نے جو کتابیں انھیں تحفے میں دی تھیں ان کتابوں کو ایک شیلف میں قرینے سے لگا کر رکھا گیا تھا۔ علاوہ ازیں ماسٹر صاحب نے کتابوں کا ایک رجسٹر بھی تیار کر رکھا تھا۔ اس میں اس بات کی بھی تفصیل تھی کہ خاں صاحب کی کون سی کتاب کب اور کہاں کتنی مرتبہ شائع ہو چکی ہے۔ ناشتہ سے فارغ ہونے کے بعد میں نے رشید حسن خاں کے پشتینی گھر کے دیدار کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ انھوں نے اپنے بچپن کے دوست خورشید حسن خاں سے فون پر رابطہ قائم کیا تو معلوم ہوا کہ وہ ابھی گھر سے اپنے اسکول میں طلبا کو Mid Day Meal تقسیم کرنے کے لیے جانے والے ہیں۔ سہیل صاحب نے میرے آنے کی اطلاع انھیں دی۔ انھوں نے خورشید صاحب سے ملاقات کے لیے دس منٹ گھر پر رکنے کی گزارش کی۔ خورشید حسن خاں نے اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ ہم فوراً ہی بالائی مکان سے اُتر کر اسکوٹی (Activa) پر سوار ہو کر محلّہ باڑوزئی کی جانب چل دیے۔

پانچ منٹ کی مسافت کے بعد ہم دونوں مرحوم رشید حسن خاں کے آبائی گھر کے صدر دروازے پر کھڑے تھے۔ خورشید حسن خاں نے ہم دونوں کو گلے لگا کر گرم جوشی کے ساتھ استقبال کیا۔ ہم تینوں گھر کے اندر کی جانب چل دیے۔ سامنے برف خانے پر خالد حسن خاں کی بیگم اہل کاروں کو ہدایت دے رہی تھیں۔ باہر گلی میں بھی آئس کریم کے ٹھیلے کھڑے تھے۔ جو اس بات کی تصدیق کر رہے تھے کہ اندر آئس کریم کا کارخانہ موجود ہے۔ جنریٹر کا شور اور مشینوں کی گڑگڑاہٹ کے درمیان ہم لوگ رشید حسن خاں کی بیٹھک میں داخل ہو گئے۔ بیٹھک میں داخل ہونے کے بعد میں نے عظیم سالارِ محقق اور خدائے تدوین کو سلام کیا جن کی علمی فتوحات کا دیدار کرنے کے لیے یہ سفر کیا۔ کمرے میں کتابوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ چاروں جانب کتابیں ہی کتابیں تھیں۔ اگر میں یوسف ناظم کے الفاظ میں کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ اگر کتابیں کمروں کی چھتوں پر ٹانگنے کا رواج ابھی نہیں ہے ورنہ رشید حسن خاں چھتوں پر بھی کتابیں ٹانگ دیتے۔ رشید حسن خاں کی چھوڑی ہوئی نشانیوں کو قرینے سے لگایا گیا تھا۔ کمرہ تنگ ضرور تھا۔ لیکن ادبی اعتبار سے وسیع تھا۔ کمرے میں تین شیلف کتابوں سے ٹھسا ٹھس بھرے ہوئے تھے۔ درجنوں قسم کے لغات اس بات کی ضمانت تھے کہ خاں صاحب تحقیق کے تئیں کتنے سنجیدہ تھے۔ ایک کرسی پر خاں صاحب کے ادھورے ادبی کارناموں کے گٹھر بندھے ہوئے تھے۔ میز پر ریڈیو اور شیونگ مشین کے علاوہ مرحوم رشید حسن خاں کا چشمہ اور ٹوتھ پیسٹ بھی رکھا ہوا تھا۔ دیواروں پر ان کے انعامات و اعزازات کی تصاویر سجی ہوئی تھیں۔ سہیل صاحب نے خورشید حسن خاں سے میرا تعارف کرایا اور شاہ جہاں پور آنے کا مقصد بیان کیا۔ میں رشید حسن خاں سے جڑی ہر چیز کو اپنے موبائل میں قید کرنا چاہتا تھا۔ تا کہ میں اپنے تحقیقی مقالے میں ان تمام چیزوں کو شامل کر سکوں۔ میں نے اس کارِ خیر کے لیے خورشید حسن خاں کی اجازت چاہی۔ انھوں نے بہ خوشی اس کام کی اجازت دے دی۔ میں جلدی جلدی ہر اینگل سے تمام چیزوں کی تصویر لینے لگا۔ اتنے میں خالد حسن خاں بھی کمرے میں آ گئے۔ خورشید حسن خاں نے میرا تعارف خالد حسن خاں سے کرایا اور شاہ جہاں پور آنے کا مقصد تفصیل کے ساتھ بتایا۔ خالد حسن خاں نے ہمیں بتایا کہ والدِ محترم کی

ہر کتاب اور چیزوں کی وہ ہی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ساتھ ہی سال میں ایک بار کتابوں کو دھوپ میں ضرور رکھتے ہیں۔تا کہ کتابوں کو سیلن سے بچایا جاسکے۔خالد حسن خاں نے اپنے بڑے بھائی کے ساتھ گروپنگ فوٹو بھی کرائی۔اسی دوران شاہ جہاں پور اور اُردو شاعری میں مشہور و معروف شاعر اختر شاہ جہاں پوری بھی کمرے میں داخل ہوئے۔میں نے اختر صاحب کو شاہ جہاں پور آنے کی اطلاع میرٹھ سے روانہ ہونے کے ساتھ دے دی تھی۔ہم سب اختر صاحب کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔

اختر شاہ جہاں پوری سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔بہ ذریعہ خط اور فون پر ان سے رابطہ بنا ہوا تھا۔خورشید نے اندر سے چائے منگوائی۔چائے کی چسکیوں کے درمیان اختر شاہ جہاں پوری مرحوم رشید حسن خاں کی یادوں کو تازہ کرنے لگے۔بتایا کہ خاں صاحب دہلی سے شاہ جہاں پور آنے کے بعد کچھ پریشان سے رہتے تھے۔۔شہر میں کم لوگ ہی ان سے واقف تھے۔لوگوں کو وہ اپنے پاس کم ہی بلاتے تھے۔لوگوں کے گھر پر ان سے ملاقات کا کم موقع ملتا تھا۔کیوں کہ ملنے سے پہلے فون پر اجازت لینا ضروری تھا۔لیکن اختر صاحب کو گھر پر آنے کی چھوٹ تھی۔شاہ جہاں پور میں وہی خاں صاحب کی ڈاک اور تمام ادبی خدمات کا ذمہ سنبھالتے تھے۔جیسے جیسے دن چڑھتا گیا گرمی بھی اپنے شباب پر آنے لگی۔خالد نے تھوڑی دیر بعد ٹھنڈا شربت منگوایا۔شربت پینے کے بعد میں نے شیلف میں رکھی ہوئی کتابوں کا عملی مشاہدہ کیا۔کتابوں کے عملی مشاہدے کے ساتھ میں رشید حسن خاں کی علمی افادیت اور اہمیت سے روبرو ہو رہا تھا۔ساتھ ہی یہ احساس بھی ہو رہا تھا کہ رشید حسن خاں ابھی بول اُٹھیں گے کہ میاں! پہلے کچھ پڑھ لیجیے پھر تحقیق کا دامن تھامنا۔ایک کونے میں رکھی میز پر انعامات کی اسناد کو ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا تھا کہ میری نظر سرسوتی کی تصویر پر جا ٹکی۔اسے میں نے چھو کر دیکھا۔پھر اس کرسی کو چھوا جس پر بیٹھ کر رشید حسن خاں علمی جہاں کی سیر کرتے تھے۔یہ کرسی خالص شیشم کی لکڑی کی بنی ہوئی تھی۔میز کے اوپر لگے ہوئے بلب کو دیکھا جس کی روشنی سے اُردو تحقیق و تدوین کے نئے باب روشن ہوئے۔میز پر کتابیں سلیقے سے لگی ہوئی تھیں۔میز پر بائیں جانب مسرّت انیس (لاہور) کا ایم اے کا مقالہ''رشید حسن خاں احوال و آثار''، پیپر ویٹ،لغت اور ٹوتھ پیسٹ رکھا ہوا تھا۔دائیں جانب قلم دان، قینچی کاغذ،قلم،فون،گھڑی اور ایک ریڈیو سیٹ (philips) رکھا ہوا تھا۔کمرے کی چھت پر ایک پنکھا ٹنگا ہوا تھا۔دوسری میز پر فائلوں کا ایک گٹھر بندھا ہوا تھا۔اس میں وہ تمام دستاویز تھے جنھیں خاں صاحب نے غیر ملکی لائبریریوں سے منگوائے تھے۔کمرے میں بیٹھے ہوئے تمام لوگ میری اس حرکت کو بہ غور دیکھ رہے تھے۔خالد حسن خاں اپنے کمرے سے خاں صاحب کی دوانمول ڈگریاں اُٹھا کر لائے۔یہ جامعہ اُردو علی گڑھ کی ادیب کامل 1949 اور لکھنؤ یونی ورسٹی کی دبیر کامل 1952 کی اسناد تھیں۔اس کے علاوہ میں نے اُن کتابوں کو بھی دیکھا جن پر رشید حسن خاں نے اپنے قلم سے املا کی اصلاح کی تھی۔جموں کشمیر حکومت کی اُردو کی پہلی کتاب کا حشر میں نے دیکھا۔پوری کتاب پر لال روشنائی سے اصلاح دی گئی تھی۔اسی دوران اختر شاہ جہاں پوری نے رشید حسن خاں کی بک شیلف سے کلیات یگانہ مرتب مشفق خواجہ نکالی۔وہ صرف یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ مشفق خواجہ نے اس کلیات کو ترتیب دینے میں خاں صاحب سے کتنے مشورے کیے تھے۔

وقت تیزی کے ساتھ بھاگا جا رہا تھا۔میں اور سہیل صاحب اُن مقامات پر بھی جانا چاہتے تھے جن سے رشید حسن خاں کی یادیں جڑیں ہوئی تھیں۔اِدھر اختر شاہ جہاں پوری بھی مجھے اپنے گھر لے جانا چاہتے تھے۔اب خورشید صاحب نے اسکول جانے کا پروگرام ملتوی کر دیا تھا۔تقریباً ساڑھے گیارہ بجے ہم تینوں (راقم الحروف، ماسٹر سہیل اور اختر شاہ جہاں پوری) نے خورشید اور خالد سے وداع لی۔آخری بار میں نے عقیدت بھری نظروں سے ایک بار پھر رشید حسن خاں کی بیٹھک اور ان کی کتابوں کو بہ غور دیکھا۔

اب میں رشید حسن خاں کی آخری آرام گاہ (پیشاوری قبرستان جوان کے مکان سے بہ مشکل سو قدم کے فاصلے پر واقع تھا) جانا چاہتا تھا۔ماسٹر سہیل نے اس قبرستان اور خاں صاحب کی قبر کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔میں نے قبرساتن کے صدر دروازے کی چند تصاویر اپنے کیمرے میں قید بھی کیں۔اسی دوران اختر شاہ جہاں پوری اپنی بائسکل پر سوار ہو کر ہمارے پاس آ گئے۔میں اختر صاحب کی سادگی اور نرم گفتاری کا قائل ہو گیا تھا۔اختر صاحب نے ہم دونوں سے اصرار کیا کہ آپ یہاں سے سیدھے رنگین چوپال آ جائیے۔ہم دونوں اسکوٹی پر سوار ہو کر رنگین چوپال چلے گئے۔سورج کی تپش بڑھتی جا رہی تھی۔دس منٹ کے بعد ہم دونوں اختر صاحب کے مکان کے سامنے حاضر تھے۔اختر صاحب کا گھر علم و ادب کا گہوارہ تھا۔کتابیں چاروں طرف بکھری ہوئی تھیں۔باتوں باتوں میں ہمیں بتایا کہ ان کی عمر کے چالیس برس آرڈیننس کلودنگ فیکٹری میں گزرے ہیں اور اب انھیں فیکٹری سے پنشن ملتی ہے۔اختر صاحب نے اپنی فوٹو البم سے ہمیں رشید حسن خاں کی نایاب تصویریں دکھائیں۔میں نے ان تصاویر کو اپنے کیمرے میں قید کر لیا۔اس کے بعد اختر صاحب نے رشید حسن خاں کے وہ خطوط دکھائے جو انھوں نے گاہ بہ گاہ سے ان کے نام تحریر کیے تھے۔ان میں احمد ندیم قاسمی کا وہ خط بھی شامل تھا جو انھوں نے خاں صاحب کی علالت کے دوران لکھا تھا۔میں نے پروفیسر نیّر مسعود کا وہ خط بھی دیکھا جس میں ایوانِ اُردو دہلی میں شائع رشید حسن خاں کے مضمون کی نفی کی گئی تھی۔ان نادر و نایاب خط کی فوٹو کاپی کرانے کے لیے اختر صاحب سے خواہش ظاہر کی۔اسی دوران سہیل صاحب کے گھر سے دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے فون آنے شروع ہو گئے۔ادھر اختر صاحب نے بھی اپنے یہاں کھانا بنانے کا حکم صادر کر دیا۔میں اختر صاحب کے گھر پر ہی کھانا تناوُل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔اختر صاحب نے مجھے وہ کتابیں دکھائیں جنھیں پڑھنے کے بعد رشید حسن خاں نے اپنے قلم سے حاشیہ پر تبصرہ کر رکھا تھا۔جب میں نے ان تبصروں کا مطالعہ کیا تو علم کی گہرائی اور گیرائی میں غوطے لگانے لگا۔اس کے بعد میں اختر صاحب کی لائبریری کا مشاہدہ کرنے لگا۔ان کی لائبریری میں مجھے ایک کتاب''مکاتیب رشید حسن خاں بنام رفیع الدین ہاشمی مرتب ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد'' ملی۔کتاب اُردو بازار لاہور سے شائع ہوئی تھی۔یہ کتاب اختر صاحب نے مجھے تحفتاً دی۔میں اس کتاب کو پا کر بہت خوش ہوا اور دل ہی دل میں سوچا کہ جس مقصد کے لیے میں نے یہ سفر کیا وہ پورا ہوتا نظر آ رہا ہے۔کچھ دیر بعد خطوط کی فوٹو اسٹیٹ آ گئیں۔دسترخوان پر کھانا لگایا جا چکا تھا۔ہم تینوں نے کھانا کھایا۔کھانے سے فارغ ہو کر میں نے اور سہیل صاحب نے اختر صاحب سے جانے کی اجازت لی۔کیوں کہ دوپہر کے ڈھائی بج چکے تھے اور کام ابھی بہت باقی تھے۔ادھر سورج کی گرمی میں شدت آ چکی تھی۔لیکن میں اس گرمی سے گھبرایا نہیں۔میرے ارادے اور مضبوط ہوتے گئے۔میں نے رنگین چوپال سے سیدھے شوقین بک ڈپو، مدرسہ بحر العلوم اور اسلامیہ انٹر کالج جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔سہیل صاحب سب سے پہلے مجھے مدرسہ بحر العلوم لے گئے جہاں رشید حسن خاں نے اپنی ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔مدرسہ کو بود و باس کی حالت میں دیکھ کر مجھے دھچکہ لگا۔کیوں کہ اب یہاں طلبا کی جگہ شہر کے اوباش لوگ اور آوارہ جانور جمع تھے۔مدرسے کی بلڈنگ کے رکھ رکھاؤ کا کوئی معقول انتظام نہیں تھا۔میں نے اس جگہ کی کئی تصاویر لیں۔اب ہماری منزل اسلامیہ انٹر کالج تھی جہاں رشید حسن خاں نے کچھ عرصے تک بہ حیثیت معلم کام کیا تھا۔مدرسہ بحر العلوم سے ہم پانچ منٹ میں اسلامیہ انٹر کالج کے مین گیٹ پر پہنچ گئے۔لیکن موسم گرما کی تعطیلات کی وجہ سے کالج بند تھا۔کالج کا دروازہ باہر سے بند تھا۔اس کالج کو اندر سے دیکھنے کی حسرت میرے دل میں ہی رہ گئی۔اس تاریخی کالج کی چند تصویریں میں نے اپنے موبائل میں قید کیں۔اب میری آخری منزل شوقین بک ڈپو تھی۔راستے میں سہیل صاحب نے مجھے بتایا کہ کسی زمانے میں یہ بہت بڑی دکان تھی۔اُردو کی نادر کتابیں یہاں ملتی تھیں۔شہر بھر کے تشنگان علم و ادب اس دکان پر اپنی علمی پیاس بجھانے آتے تھے۔رشید حسن خاں بھی ان میں سے ایک تھے۔کتابیں پڑھنے کے لیے وہ شوقین بک ڈپو روزانہ جاتے تھے۔بیرون اور اندرون ملک کے اُردو اخبار و رسائل (نگار

،نقوش،شمع وغیرہ) یہیں سے خریدتے تھے۔ رشید حسن خاں اسلامیہ انٹر کالج سے پڑھانے کے بعد سیدھے شوقین بک ڈپو جاتے اور اپنی پسند کی کتابیں گھر لے جاتے تھے۔ خاں صاحب بھی اپنے مطلب کی کتابیں آرڈر پر ان سے ہی منگواتے تھے۔ لیکن اب یہ دکان چار حصوں میں تقسیم ہوگئی ہے۔ چند منٹ کی مسافت کے بعد ہم دونوں شوقین بک ڈپو کے سامنے تھے۔ میں نے خود دیکھا کہ واقعی اب یہ دکان بہت چھوٹی ہوگئی ہے۔ لیکن اُردو کے اخبارات اور رسائل آج بھی یہاں رکھے ہوئے تھے۔ اُس وقت دکان پر موجود شوقین بک ڈپو کے مالک کے پوتے کو میں نے اپنے آنے کا مقصد بتایا۔ وہ بہت خوش ہوا کہ اس بہانے سے ہماری دکان لوگوں کو یاد رہے گی۔ اس تاریخی دکان کی ہر اینگل سے تصاویر اتاریں۔ یہاں سے ضروری معلومات حاصل کرنے کے بعد اب دونوں سہیل صاحب کے مکان کی جانب چل دیے۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ میں نے اپنی گھڑی کی جانب دیکھا تو تین بج کر پچاس منٹ ہو چکے تھے۔ سہیل صاحب کے گھر پر تھوڑا آرام کرنے کے بعد میں نے میرٹھ جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ وہ بہ ضد تھے کہ میں اگلے دن میرٹھ جاؤں۔ لیکن میرے گھر سے بار بار میری خیریت جاننے کے لیے فون آ رہے تھے۔ میں محلّہ سرائے ترین سے ریلوے اسٹیشن آیا جہاں پر راجیہ رانی ٹرین (لکھنؤ سے میرٹھ) آنے کا وقت ہو چلا تھا۔ تقریباً ساڑھے پانچ بجے میں شاہ جہاں پور سے میرٹھ کے لیے ٹرین میں سوار ہوگیا۔ واپسی میں، میں دورانِ سفر آگرہ، لکھنؤ اور شاہ جہاں پور کی یادوں میں کھویا رہا۔ اور شکریہ ادا کیا مرحوم رشید حسن خاں کا کہ جن کے طفیل میں، میں نے اپنا طویل علمی ادبی اور تحقیقی سفر مکمل کیا۔ راستے میں میں نے رباب رشیدی صاحب کو فون پر یہ اطلاع دی کہ میں شاہ جہاں پور سے کام مکمل کرکے میرٹھ واپس جا رہا ہوں۔ رباب صاحب نے مجھے بہت سی دعائیں دیں اور اپنا تحقیقی کام جلد از جلد مکمل کرنے کی ہدایت بھی دی۔

راجیہ رانی ایکسپریس میرٹھ ریلوے اسٹیشن پر رات کو نو بج کر تیس منٹ پر پہنچی۔ اسٹیشن پر اُترنے کے بعد میں نے عزیزم ریاض الدین کو فون کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ مظفر نگر سے میرٹھ آ رہے ہیں۔ اس وقت گھر جانے کے لیے کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ ریاض صاحب نے مجھ سے کہا کہ ہم دونوں میرٹھ میں مقیم ان کے بہنوئی کے گھر پر قیام کریں گے۔ ہم دونوں رات میں تقریباً گیارہ بجے ان کے بہنوئی کے گھر پہنچے۔ کھانے سے فارغ ہوکر میں نے ریاض صاحب کو اپنے سفر کی روداد بتائی۔ اگلے دن 27 مئی 2015 بہ روز بدھ ہم دونوں اپنے آبائی قصبہ سِوال خاص (میرٹھ، یوپی) کے لیے روانہ ہوئے۔ دورانِ سفر میں سوچ رہا تھا کہ کیسا حسنِ اتفاق ہے، ریاض صاحب میرے ساتھ 23 مئی 2015 کو بھی تھے، جب میں نے سفر کا آغاز کیا تھا اور آج بھی وہ میرے ساتھ ہے جب میں نے رشید حسن خاں کے ادبی کارناموں کی تلاش و تحقیق میں اپنا پہلا ادبی سفر مکمل کیا۔

(30 مئی 2015، بہ روز سنیچر)

ooo

اکبر علی خاں

رشید حسن خاں کی تحقیقی غلطیاں

اِدھر کچھ عرصے سے رشید حسن خاں صاحب کا نام اُن مضامین کی وجہ سے ادبی حلقوں میں زیر بحث آتا رہتا ہے جن کے ذریعے اُنھوں نے ایک دوسرے سے مختلف لکھنے والوں کو سہل پسندوں اور بے پرواہیوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ان مضامین کو بہت سے رسالوں نے ایک دوسرے سے نقل کیا ہے اور اس طرح رشید حسن خاں صاحب کی اُس محنت کی داد ہے جو موصوف نے لکھنے والوں کی سہل پسندی اور موضوع سے بے توجہی ثابت کرنے میں صرف کی ہے۔

بلاشبہ ہمیں احتساب سے کام لینا چاہیے اور یہ کوشش کرنا چاہیے کہ ہمارے کام کرنے والے زیادہ سے زیادہ محتاط ہوکر قلم اُٹھائیں، خصوصیت سے تحقیق کے میدان میں احتیاط برتنا بھی ضروری ہے تاکہ کسی ایک کی غلطی آیندہ کی اور بہت سی غلطیوں کا دروازہ نہ کھول دے۔ لیکن اگر نقاد کا مطمع نظر صرف عیب جوئی بن جائے تو یہ امر نہ صرف تحقیقی کام کرنے والوں کی ہمت شکنی کا سبب بن جائے گا بل کہ معترض کی خود اپنی صلاحیتوں کا بھی کوئی اچھا مصرف نہ ہوگا۔

ابتدا میں رشید حسن خاں کے پیشِ نظر یہی بات رہی ہوگی کہ اُن کے احتساب کے بعد لکھنے والے اپنے کام کو شائع کرنے سے پہلے اچھی طرح پرکھ لیں اور اس طرح کاموں کا معیار بلند ہو جائے۔ لیکن یہ احتساب چند وجوہ کی بنا پر خود اُن کے لیے کسی طرح صحت مند ثابت نہیں ہوا چہ جائے کہ دوسروں کے لیے۔

ہوا یہ کہ ادھر اُنھوں نے جو مضامین لکھے ہیں اُن میں پڑھنے والوں کو وہ بے لوثی نظر نہیں آئی جس کی توقع اُن سے کی جاتی تھی۔ اس لیے کہ انھوں نے اکثر و بیشتر ان مضامین میں طنز و تمسخر کے تیرو نشتر چلائے ہیں جس کا ردِعمل خوش گوار ہو ہی نہیں سکتا اور اُنھوں نے بعض مواقع پر اپنے اعتراضات میں اُن معذرتوں کو بھی نظر انداز کر دیا جو لکھنے والوں نے اپنی مجبوریوں کے تحت کی تھیں۔ یہ بالکل ایسا ہی ہوا جیسے ہم کسی کتاب کے غلط نامے کو نظر انداز کرکے ساری غلطیاں ایک بار پھر لکھنے والے کے حساب میں لگا دیں۔ چوں کہ یہ رویہ خلوص کے سراسر منافی ہے۔ اس لیے اُن مضامین سے کسی صالح اثر کا مرتب ہونا قطعاً ناممکن ہوگیا اور کچھ کاموں میں جن کی ضرورت اور اہمیت کا ہم سب کو اعتراف ہے بے جا رکاوٹیں پیدا ہوگئیں۔

یہ بات سب جانتے ہیں کہ کام کرنا مشکل ہے اور اُس پر اعتراض عاید کر دینا اُتنا سہل ہے جتنا سہل ہو سکتا ہے۔ کسی نمایش میں ایک مصور نے اپنی تصویر کے ساتھ یہ نوٹ بھی لگا دیا تھا کہ اگر کوئی صاحب نظر اس تصویر میں غلطیاں پائیں تو اس پر نشان لگا دیں۔ چناں چہ اتنے صاحب نظر پیدا ہوگئے کہ نشانات کی زد میں تصویر ہی غائب ہوگئی۔ لیکن جب اُسی مصور نے دوسری تصویر کے ساتھ یہ درخواست کی کہ غلطی کو درست کر دیا جائے تو کوئی بھی تصویر کی عصمت پر انگشت نمائی کرنے والا نہیں تھا۔ یہی حال زبان و ادب کے معاملات میں بھی ہے۔

معترض یا محتسب کو اعتراض داغنے اور احتساب کرنے سے پہلے یہ بھی سوچنا چاہیے کہ جس قسم کی اغلاط پر وہ نہ صرف یہ کہ گرفت کر رہا ہے بل کہ لہجے اور زبان میں طنز وتمسخر کے نشتر بھی چھپاتا جا رہا ہے۔ کہیں اُس جیسی غلطیاں خود اُس کے کارناموں میں تو دخیل نہیں ہیں اور کیا اُس نے کوئی بے داغ کام بھی پیش کیا ہے۔

اِس قسم کے اعتراضات کرنے والوں کو بھی یہ نقصان ہوتا ہے اور زبان وادب کو بھی کہ وہ پھر اپنے نام سے کوئی کتاب بازار میں لاتے ہوئے اس لیے ڈرتے ہیں کہ اگر اُن کی پکڑ دھکڑ شروع ہوگئی تو قامت کی درازی کا سارا بھرم کھُل جائے گا۔ اور یوں وہ ساری محنت جو تعمیری کاموں میں صرف ہونا چاہیے تھی منفی اور تخریبی کاموں میں ضائع ہوتی رہتی ہے۔

یہ کسی بھی زبان کی کم نصیبی ہے کہ اُس کے باصلاحیت افراد یہ نہ طے کر پائے کہ آخر اُن کے کرنے کا کام کیا ہے۔ رشید حسن خاں نے بھی اپنے تبصروں میں جن پر اُن کی شہرت کا دارومدار ہے، منفی صلاحیتوں کو آزمایا ہے۔ اس معاملے کا افسوس ناک پہلو یہ بھی ہے کہ اکثر حضرات جنھوں نے رشید حسن خاں کے یہ تبصرے پڑھے ہیں اُن کی نیت پر بھی شک کرتے ہیں اور یہ مسلمہ امر ہے کہ جس تحریر کا خلوص مشکوک ہو وہ چاہے سچ بھی کیوں نہ ہو محفلوں میں ذریعۂ آرایش گفتار تو کچھ مدت رہ سکتی ہے مگر اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ رشید حسن خاں کی نیت پر شک کرنے والے کہتے ہیں:

ہم نے مان لیا یہ تبصرے تحقیق وتنقید میں پھیلی ہوئی بے راہ روی اور بے توجہی کو دور کرنے کے لیے لکھے گئے ہیں لیکن،

(1) پہلی بات تو یہ سمجھ میں نہیں آتی کہ تبصرہ نگار کے لہجے میں طنزیہ انداز کیوں کارفرما رہتا ہے۔

(2) دوسرے یہ کہ اس سلسلۂ نقد ونظر میں رشید حسن خاں نے اُس ادارے سے متعلق مصنفین کی کتابوں کو کیوں شامل نہیں کیا جس ادارے سے وہ خود وابستہ ہیں یعنی شعبۂ اُردو دہلی یونی ورسٹی۔ اگر وہ اس ادارے کی مطبوعات اور اس سے متعلق حضرات کی کتابوں پر نہیں لکھتے تو اس کے وہی معنی ہو سکتے ہیں یا تو یہ کہ:

(الف) ان کے نزدیک وہ سارے کام معیاری ہیں اور وہ ان سے مطمئن ہیں اور اُن کے خیال میں ان کاموں پر لکھنے کی گنجایش نہیں نکلتی، یا پھر یہ کہ:

(ب) رشید حسن خاں کے یہاں بھی مصلحتوں کا دخل ہے۔

ان حضرات کے مطالبوں میں شاید کوئی مطالبہ بھی بے جا نہیں اس لیے کہ اگر رشید حسن خاں کے نزدیک حکومتِ ہند پر شعبۂ اُردو علی گڑھ یونی ورسٹی کو امداد دینے سے غلط بخشی کا الزام آتا ہے تو دلّی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو نے بھی تا حال حکومتِ ہند کی بڑی بڑی امدادوں کا کوئی ایسا مصرف نہیں کیا جو لائق داد ہو یا جس سے یہی ثابت ہوتا کہ اُس نے حکومت کی رقم کا ناجائز استعمال نہیں کیا۔ کیا کوئی شخص اس بات کا منکر ہوگا کہ اصلاح اور احتساب کا کام اپنے گھر سے شروع ہونا چاہیے اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو کیا ایک شخص کو محتسب اور مصلح پر شک کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔

میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ عیب جوئی میں اپنا وقت برباد کرنے سے زیادہ افسوس ناک کیفیت اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ آیندہ گفتگو میں جو مثالیں رشید حسن خاں کے صرف ایک مضمون سے پیش کرنے والا ہوں اُن کا مقصد صرف اتنا ہے کہ رشید حسن خاں جو باشعور آدمی ہیں۔ ان معروضات کی روشنی میں اپنے آپ کو مزید ''فضول خرچ'' سے بچائیں۔ اس مثال کو سامنے رکھ کر جوان کے لکھے چند صفحوں کی بنیاد پر تیار کی گئی ہے، سچے دل سے غور کر فرمائیں۔

این گناہیست کہ در شہرِ شُما نیز کنند

تاریخِ لطیف اور رشید حسن خاں

رام پور رضا لائبریری میں تاریخِ لطیف نام کا ایک مخطوطہ ہے جس میں مہدی علی نماں رام پوری، مرتب کتاب نے مشاہیر شعرا، رؤسا، امرا، علما، اولیائِ ملک کے قطعاتِ تاریخ وفات جمع کر دیے ہیں۔ یہ اس لحاظ سے قابلِ قدر کتاب ہے کہ اس میں بہت سے مشاہیر بالخصوص شعرا کے بارے میں مستند مواد مل جاتا ہے۔ دلّی کالج اُردو میگزین کے شمارہ 63 میں رشید حسن خاں نے اس کتاب کا تعارف کرایا اور اپنے نزدیک چند اہم ترین شعرا سے متعلق قطعاتِ تاریخ کے وہ شعر بھی نقل کیے جن سے مادۂ تاریخ برآمد ہوتا ہے اور اُن پر حواشی کا بھی اضافہ کیا ہے۔

کسی قلمی کتاب پر کچھ لکھنا یا اس سے کچھ اخذ کرنا بڑی ذمے داری کا کام ہے اور بڑی احتیاط اور ریزہ کا متقاضی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ کتاب عام طور لوگوں کی دسترس میں نہیں ہوتی اور پڑھنے والوں پر تمام وکمال بھروسا کرنا پڑتا ہے۔ جس نے اس قلمی کتاب سے اخذ واشاعت کا کام لیا ہے۔ اس نزاکت کے باوجود بھی رشید حسن خاں نے اپنے اس تعارفی مضمون میں بے توجہی اور سہل پسندی برتی ہے۔ میرے معروضات میں انھیں سے پیدا ہونے والی صغیر وکبیر کی نشان دہی کی گئی ہے۔ ملاحظہ ہوں:

(الف)

1۔ سب سے پہلے رشید حسن خاں صاحب نے مولفِ کتاب کا تعارف کراتے ہوئے اُن کے نام کے ساتھ ان کا تخلص ممتاز بتایا ہے۔ لیکن یہ تعارف نامکمل ہے۔ اس لیے کہ ان کا تخلص مہدی اور آرام بھی تھا۔ ان میں سے آخر الذکر تو مذکورہ کتاب ہی کے صفحہ 248 پر پایا جاتا ہے۔ محوالہ صفحے پر مہدی علی خاں کا کہا ہوا عبدالہادی خاں وفا رام پوری کا قطعۂ تاریخ وفات موجود ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ اُن کا تخلص آرام بھی تھا۔ قطعۂ تاریخ یہ ہے:

دُنیا سے گئے حکیم عبدالہادی برہم ہوئی اہل علم کی عقل آج
آرام کو دی سروش غیبی نے صدا جنت میں ہوئے جاکے وفا داخل آج

1334ھ

اس کے علاوہ کتاب خانہ رام پور میں اُن کا ایک مجموعۂ رباعیات آرام کے نام سے موجود ہے جو آرام تخلص کی تصدیق کرتا ہے۔ رشید حسن خاں تاریخِ لطیف میں یہ تخلص درج ہونے کے باوجود لاعلم ہیں۔

(ب)

2۔ آگے چل کر رشید حسن خاں صاحب نے کتاب کے صفحات کی تعداد 114 بتائی ہے۔ لیکن یہ اطلاع درست نہیں۔ اس لیے کہ کتاب کے صفحات کی تعداد 270 ہے آغاز کتاب میں اسمائے شعرا کی فہرست ہے جو بیس (20) صفحات پر مشتمل ہے اس کے بعد 250 صفحات پر مشتمل ہے اس کے بعد 250 صفحات پر قطعات تاریخ درج ہیں۔ اس طرح دونوں کی مجموعی تعداد 270 ہوتی ہے۔

قلمی کتابوں کے حوالے میں عام طور پر صفحات کے بجائے اوراق لکھے جاتے ہیں۔ رشید حسن خاں کے بیان کو دیکھ کر مجھے یہ خیال آیا کہ شاید انھوں نے اوراق کی جگہ سہواً صفحات کا لفظ لکھ دیا ہے مگر مراد اوراق ہی ہے لیکن میری یہ خوش گمانی بھی کام نہ آئی۔ اس لیے کہ 250 یا 270 کی دو سے تقسیم کا حاصل 125 اور 135 ہوگا 114 کسی طرح ممکن نہیں۔

(ج)

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ کتاب کے آغاز 20 صفحات کی فہرست مندرجات ہے۔ اس میں اسمائے متوفیاں کو تخلیق کے لحاظ سے حروف تہجی پر ترتیب دیا گیا ہے۔ رشید حسن خاں نے کتاب کے مشمولات میں اس فہرست کا کوئی تذکرہ نہیں کیا اور نہ اُس سے کوئی فائدہ اٹھایا۔ حالاں کہ اس سے بعض مفید معلومات اخذ کرنا چاہیے تھیں۔ مثال کے طور پر:

3۔ فہرست کے صفحہ 8 پر مولانا عبدالرحمٰن راسخ کے نام کے ساتھ مولف کتاب نے اُن کا رشتہ شاگردی مولوی محمد حسین فقیر سے بتایا ہے۔ جب کہ رشید حسن خاں صاحب نے خمخانۂ جاوید کے حوالے سے ذوقؔ کا شاگرد لکھا ہے۔ یا تو اُنھیں محمد حسین فقیر کا نام بھی لکھنا چاہیے تھا یا پھر اس سے اختلاف کرنا چاہیے تھا۔

(د)

(4) رشید حسن خاں نے تاریخ لطیف کے مخطوطے کو احتیاط اور توجہ سے دیکھے بغیر بھی بعض مقامات پر حتمی دعوے کیے ہیں جو محققانہ احتیاط کے منافی ہیں۔ انھوں نے دعوا کیا ہے:

''تاریخِ لطیف میں ہر جگہ ایک سنہ لکھا ہوا ہے۔ ہجری، عیسوی یا فصلی''

لیکن اُن کا یہ دعوا غلط ہے۔ وہ مخطوطے کے صفحہ 11 کی طرف رجوع کریں جس پر مظفر حسین یلمانی کا کہا ہوا محبوب علی خاں نظام حیدر آباد کا مصرعہ تاریخ وفات از روئے تقویم عیسوی درج ہے اور اُسی کے ساتھ ہجری مطابقت بھی ظاہر کر دی گئی ہے۔ ذیل میں اُسے نقل کیا جاتا ہے:

محبوب ملک داخل جناں ہوئے

1911ء مطابق 1329ھ

تاریخ گو شعرا نے کہیں قطعات میں عیسوی اور ہجری دونوں سنین سے تاریخیں بتائی ہیں۔ اس لیے بھی رشید حسن خاں کا ہر جگہ ایک سنہ لکھنا غلط ہے۔

(ہ)

(5) رشید حسن خاں نے تعارف میں فرمایا ہے کہ تاریخ لطیف میں بعض مقامات پر شمار کی غلطی سے غلط اعداد درج ہو گئے ہیں۔ مگر میں یہ عرض کروں گا کہ رشید حسن خاں نے اپنے حواشی میں جہاں کہیں ایسی غلطی کی طرف اشارہ کیا ہے وہ خود رشید حسن خاں کا سہو ہے مخطوطہ کا نہیں ہے۔ مثلاً:

تاریخِ لطیف میں مندرج نساخ کے لکھے ہوئے راسخ عظیم آبادی کے قطعۂ وفات سے شعر اما دہ کو رشید حسن خاں نے اس طرح نقل کیا ہے:

سال	فوت	راسخ	فخر	جہاں
گفت	ہاتف	راسخ	شیوہ	بیاں

1241ھ

اور پھر حاشیے میں اعتراض کیا ہے کہ:

''مخطوطے میں مادہ تاریخ کے نیچے 1238ھ درج ہے لیکن اس مادہ سے 1241ھ نکلتے ہیں، وہی درج کیے گئے لیکن اُس کا صحیح سنہ وفات 1238ھ ہے۔''

یہاں رشید حسن خاں کا بیان غلط ہے۔ مخطوطے میں مصرع کی صحیح صورت یہ ہے:

گفت ہاتف ''راسخ شیوا زباں''

اور اس مادہ سے 1238ھ نکلتی ہے۔

6۔ ضمیر کا مادۂ تاریخ مخطوطے میں مندرجہ ذیل ہے:

بود سید ضمیر محو ایام

اور اس مادے سے 1272ھ نکلتے ہیں۔ رشید حسن خاں صاحب نے اس پر حاشیے میں لکھا ہے کہ:

''مخطوطے میں 1270 لکھے ہوئے ہیں جو سہوِ قلم ہے یا شمار کی غلطی۔''

لیکن حقیقت یہ ہے کہ سہو قلم اور شمار کی غلطی رشید حسن خاں کی ہے مخطوطہ تاریخ لطیف کی نہیں۔ اس لیے کہ وہاں 1272ھ ہی درج ہیں۔

7۔ قدرت دہلوی کا مادہ تاریخ وفات جو نساخ نے لکھا تھا، تاریخ لطیف میں اس طرح نقل ہوا ہے:

''داخل گلشن نعیم بگفت

1205ھ

لیکن رشید حسن خاں نے اپنے حاشیے میں بتایا ہے کہ مخطوطے میں مادہ تاریخ کے نیچے 1250 لکھے ہوئے ہیں جو غالباً سہو قلم ہے۔ یہاں بھی رشید حسن خاں کی اطلاع خود اُن کا سہو ہے، مخطوطے کا نہیں۔ مخطوطے میں 1205 ہی درج ہے۔

(و)

8۔حواشی لکھتے ہوئے رشید حسن خاں صاحب نے غیر ضروری حوالوں کا اضافہ کیا ہے اور جو مواد پہلے سے تاریخ لطیف میں موجود تھا اس کے لیے ثانوی حوالے درج کیے ہیں۔
مفتی صدرالدین آزردہ کے مادہ تاریخ وفات ''صدر اسلام و دین امام بہشت'' پر حاشیہ لکھتے ہوئے ظہور علی شمس الشعرا کا کہا ہوا قطعۂ تاریخ تذکرۂ علمائے ہند سے نقل کیا ہے۔ یہ تلاش غیر ضروری تھی اس لیے کہ قطعۂ تاریخ لطیف صفحہ 5 پر پہلے ہی موجود تھا۔اس قطعے کے مفید مطلب اشعار یہ ہیں:

بروز پنجشنبہ کرو رحلت
کہ این عالہ نہ جائے بہاو داں بود
ربیع الاول دبست و چہارم
وداع او سوی دارالجناں بود
ظہور افسوس آن اُستاد ذی قدر
پدر وارم ہمیشہ مہر باں بود
''چراغش'' ہست تاریخ ولادت
کنوں گفتم ''چراغ دو جہان بود''

1285ھ

اس قطعے سے دن تاریخ اور مہینا اور سنۂ وفات کے ساتھ سالِ ولادت بھی معلوم ہو جاتا ہے اور یہ بھی کہ آزردہ ظہور کے اُستاد تھے۔رشید حسن خاں نے تاریخ لطیف میں اس قطعے کا موجود ہونا نہیں بتایا جس سے اس کا اعتبار بڑھ جاتا۔
9۔اسیر کے کہے امانت لکھنوی کے قطعہ تاریخ وفات سے مادہ تاریخ

''جان داد امانت بخدا بود امین''

نقل کر کے رشید حسن خاں نے حاشیے میں میر وزیر علی نور شاگرد برق کا کہا ہوا قطعہ تاریخ وفات بحوالہ دیوان نور موسومہ، مینا نور، دیوان امانت اور قاضی عبدالودود صاحب کے مقالے مشمولہ سالنامہ نقوش سنہ 62-61ء (یہاں قاضی صاحب کے مقالے کا عنوان درج نہیں کیا گیا) بھی نقل کیا ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ یہ قطعہ تاریخ لطیف (ص 31-32) میں بھی موجود ہے۔اس طرح اس قطعے کے لیے بھی تلاش فضول سے کام لیا گیا ہے جس سے سوائے حوالوں کے اضافے کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

(ذ)

حاشیہ آرائی میں رشید حسن خاں نے تفصیلات جمع کرنے کی خاطر مختلف کتابوں اور رسالوں کو سامنے رکھا ہے اور زیادہ سے زیادہ حوالے فراہم کیے ہیں لیکن اگر کسی کتاب کو سامنے نہیں رکھا تو وہ یہی تاریخِ لطیف ہے۔قطعاتِ تاریخ میں مادہ تاریخ اکثر آخری شعر میں نظم کیا جاتا ہے اور کبھی کبھی دیگر تفصیلاتِ مرضِ موت، دن، مہینا اور تاریخ وغیرہ قطعے کے پہلے اشعار میں نظم کر دی جاتی ہیں۔رشید حسن خاں نے اس قسم کی کسی اطلاع سے جو تاریخ لطیف کے قطعات میں پائی جاتی ہے۔کوئی استفادہ نہیں کیا اور اِدھر اُدھر دوسرے حوالوں کو جمع کرتے رہے۔
ہر تحقیقی کام والے کو اس بات کا احساس ہوگا کہ مرتب کو سب سے پہلے اُسی کتاب کی معلومات پیش کرنا چاہئیں، جس پر وہ کام کر رہا ہے۔اگر وہ صحیح ہیں تب غلط ہیں تب۔اس کے بعد مرتب کا یہ کام ہوتا ہے کہ وہ مزید تلاش سے اگر ممکن ہو تو کسی اطلاع کی صحت یا عدم صحت کے لیے دلائل کا اضافہ کرے لیکن اصل کتاب کی اطلاعات سے صرف نظر کرنا سہل پسندی اور بے توجہی کے علاوہ کیا ہو سکتا ہے؟ ایسی صورت میں ثانوی حوالوں سے غلطیوں کے امکانات بڑھ جاتے ہیں اور بہت سی ضروری معلومات پردے میں چھپی رہ جاتی ہیں۔
رشید حسن خاں نے تاریخِ لطیف پر اپنے مضمون میں اس انداز کار کی ایک مثال پیش کی ہے اور کتاب کے مندرجات کی قریب قریب ساری ہی اطلاعات سے چشم پوشی کی ہے۔اس کے لیے مندرجہ ذیل معروضات کو سامنے رکھیے:
10۔امیر مینائی کے قطعۂ تاریخ وفات از نواب مرزا داغ (تاریخ لطیف صفحہ 38) کا آخری شعر رشید حسن خاں صاحب نے اپنے مضمون میں نقل کیا ہے۔لیکن امراضِ موت کی جو تفصیل داغ نے دی تھی اُس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔متعلقہ اشعار یہ ہیں:

کیا کہوں کیا کیا ہوئیں بیماریاں
کیا لکھوں تفصیل امراضِ کثیر
مبتلائے حدتِ صفر او تپ
مورد آزار اسہال و زخیر

اس قطعے کے ایک شعر میں ''مینائی'' نسبت کی طرف اور اسیر سے رشتہ شاگردی کی جانب اشارہ کیا گیا ہے:

شاہ مینا سے تھا نسلی سلسلہ
شاعری میں خاص تلمیذ اسیر

رشید حسن خاں نے اس سے پہلے بھی استفادہ نہیں کیا۔

11۔تاریخِ لطیف صفحہ 42-43 میں امیر مینائی کا قطعہ تاریخ وفات از کلیم لکھنوی بھی درج ہے۔ جس سے وقتِ انتقال معلوم ہوتا ہے اور رشید حسن خاں نے جن حوالوں سے تاریخ وفات بتائی ہے ان سے اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ مفید مطلب اشعار یہ ہیں:

چہ بلا ہفتدہم بُد ز جمادی دوم
بدو پا یک شب شنبہ کہ گشتہ تقدیر
ہمچنیں سیز دہم از مہ اکتوبر بود
نُہ صد و الف کنم سال مسیحی تحریر

رشید حسن خاں نے اس کے برخلاف 19 جمادی الآخر تاریخ انتقال بتائی ہے اور وقتِ انتقال کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

12۔میر انیس کی تاریخ وفات کے لیے رشید حسن خاں نے، اسیر کا مادۂ تاریخ انتخاب کیا ہے اور مزید معلومات کا اضافہ یادگار انیس، خمخانۂ جاوید، تاریخ ادب اُردو، آب بقا اور گل کی مدد سے کیا گیا ہے۔ لیکن تاریخ لطیف ہی کے ایک قطعہ سے وقتِ انتقال اور یومِ وفات کے ساتھ سنہ عیسوی برآمد ہوتے ہیں اور ان میں سے پہلی دو اطلاعات سے رشید حسن خاں بے خبر ہیں۔ اس قطعہ کے کہنے والے سید حسن لطافت خلف سید آغا حسن امانت ہیں۔ تاریخ لطیف کے صفحات 48-49 پر یہ قطعہ درج ہے۔ اس سے ضروری اشعار ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں:

قریب شام ہوئے آہ وہ کمال تمام
اخیر چاند تھا گزرے تھے آہ دن انتیس
سنا یہ واقعہ جانکاہ جب کہی تاریخ
کہ جس میں لفظ ہیں آئے مناسب اور سلیس
بیان مصرعہ آخر کے اب صنائع ہوں
بفکر سمجھیں لطافت جسے حساب نویس
شروع مصرعہ تاریخ جو کہ ہیں دو حروف
مہینا ایک ہے اور دوسرا ہے روز خمیس
سنین بھی ہیں عیاں اس سے عیسوی ہجری
اداس مجلس ماتم ہے سامعین دس بیس
عجب مصرعۂ تاریخ ہے ملا یکتا
''یہ پنج تن کا ہے نوحہ انیس ہائے انیس''

1291ھ

13۔اُردو کے مشہور شاعر سید ضامن علی جلال کا قطعہ تاریخ وفات اُنھیں کے بیٹے میر مہدی کمال کا نتیجہ فکر تاریخ لطیف (صفحہ 69-70) میں موجود ہے۔ رشید حسن خاں نے اسی قطعے کا آخری شعر نقل کیا ہے اور اپنے حاشیے میں آبِ بقا، خمخانۂ جاوید، تذکرہ کاملان رام پور، مقالۂ آرزو صاحب (یہاں بھی مقالے کا عنوان نہیں بتایا) بحوالہ جلال از محمد حسن اور انتخاب یادگار سے کام لیا۔
مجھے یہاں عرض کرنا ہے کہ اتنی بھاگ دوڑ کے باوجود بھی صحیح تاریخ دریافت نہیں کر سکے۔ حالاں کہ کمال کے اس قطعے کے سامنے ہوتے ہوئے کہیں طول طویل تلاش کے سفر پر جانے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ کمال کے اشعار نقل کیے جاتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں:

مہ شوال کی تاریخ چوتھی
وہ بُدھ کا روز تھا آفت کا سامان
وہ شاعر اُٹھ گیا بزمِ جہاں سے
کمال شاعری جس پر تھا نازاں
کمال آنکھوں سے پنہاں ہیں جلال آج
چھپا ہے شاعری کا مہر تاباں

لیکن رشید خاں نے اپنی تحقیقات میں مندرجہ بالا قطعے کو نظر انداز کر کے خمخانہ جاوید کی اس اطلاع کو بنیاد بنایا ہے۔

''جناب جلال نے بعمر 76 سال بتاریخ 20 اکتوبر 1909 انتقال فرمایا''

اور اس کے بعد تقویم کے حساب سے ہجری تاریخ دریافت کر کے 25 شوال 1327ھ بتائی ہے۔ ہجری سال مع تاریخ و روز پہلے ہی سامنے ہوتے ہوئے سنہ عیسوی کو بنیاد قرار دے کر ہجری تاریخ نکالنا اُلٹی منطق کے علاوہ کیا کہی جاسکتی ہے۔ جب کہ اس ساری کاوش کے باوجود نتیجہ غلط ہی رہا یہ صرف اس وجہ سے ہوا کہ رشید حسن خاں نے منقولہ بالا قطعہ تاریخ سے بے توجہی برتی وراں حال یہ کہ اسی قطعہ کا آخری شعر خود نقل بھی کیا۔ حیرت ہوتی ہے کہ رشید حسن خاں نے بیٹے کی بتائی تاریخ پر نہ صرف یہ کہ دوسرے حوالوں کو ترجیح دی بل کہ اس کا ذکر تک نہیں کیا۔ معلوم نہیں تحقیق کے وہ کون سے اصول ہیں جن کی بنیاد پر

بیٹے کا بیان دوسرے بیانات کے مقابلے میں غیر معتبر اور نا قابل ذکر قرار دیا گیا۔

بہر حال! جلال کی صحیح تاریخ 25 شوال نہیں جو رشید حسن خاں نے تحقیق کی ہے بل کہ 4 شوال روز چہارشنبہ 1327ھ ہے جو جلال کے بیٹے کمال نے اپنے قطعہ میں نظم کردی ہے۔

14۔ داغ دہلوی کا مادۂ سال وفات جو احسن مارہروی نے نکالا تھا رشید حسن خاں نے نقل کیا ہے اور مہینا اور اس کی تاریخ خمخانۂ جاوید کے حوالے سے۔ لیکن تاریخ لطیف کے کئی قطعات سے کوئی استفسار نہیں کیا جن میں سے ایک حفیظ جونپوری کا کہا ہوا ہے۔ اس میں مہینا اس کی تاریخ اور مرض موت کا تذکرہ موجود ہے۔ اس قطعے کے مفید مطلب اشعار یہ ہیں:

ہائے فالج نے کیا ستم ڈھایا
کیسی برپا ہوئی قیامت آہ
ماہ ذی حجہ کی نویں تاریخ
یا ہے عاشور کا یہ روزِ سیاہ
مر کے چُپ ہو گیا فصیح الملک
یہ خبر منتشر ہوئی ناگاہ
ہائے وہ خوشنوائی بلبل ہند
ہائے اُستاد شاہ آصف جاہ
نہ مٹا تھا حفیظ، امیر کا غم
کہ ہوا داغ کا غمِ جانکاہ
سالِ غم پڑھ کے خونِ ناب بہا
''شاعری داغ کے گئی ہمراہ''

1905 (ص96)

اس کے علاوہ ایک اور قطعہ میں جو آزاد شیخ پوری شاگرد امیر مینائی کا کمال ہوا ہے اور تاریخ لطیف ص 82 پر درج ہے، مرضِ موت کا ذکر آیا ہے۔ متعلقہ شعر یہ ہے:

ہائے فالج کا تھا وہ اک جھونکا
جِس ہوا سے یہ گل چراغ ہوا

مرض موت کا ذکر اور بھی مختلف قطعات میں ہے لیکن رشید حسن خاں لاعلم ہیں۔

15۔ داغ سے متعلق کئی اور قطعات بھی ہیں جن میں سے ایک قطعہ مصنفہ قاضی مقصود حسین حیرت شاہ جہاں پوری سر رشتہ دار عدالت ججی خفیفہ گوالیار شاگرد داغ میں یہ اشعار بھی ہیں۔ ان سے داغ کے ساٹھ شاگردوں کے نام محفوظ ہوتے ہیں۔

اے مرے استاد کیا کہنا ترا
کر دیا استاد و شاگردوں کو بھی
اللہ اللہ! بیخود و بیباک و جھد
حیرت و مطلب جلال واصفی
برق تمکیں شوق و بیتاب و شرر
آفریں جادو کلیم انجم غنی
اختر و امید شیدا شوق و شاد
فوق و مظہر سیدا حسن لکھنوی
شمس و افسوں و شریف مخمور عشق
دل طلب محمود جلاب دہلوی
گوہر و وارث ضیا سائل خیال
طیش ناداں عیش نوح ناروی
اشک و بسمل طالب و مفتوں فصیح
نجم ثاقب احسن مارہروی
مہر و باغ و رمز و توقیر و حسن

شاعر و رسوا نسیم عسکری
جس کے ایسے سیکڑوں شاگرد ہیں
ایسی اُستادی مسلم کس کی

ص93-92

سائل دہلوی کے قطعہ کے مندرجہ ذیل شعر بھی نوٹ کیے جانے کے لائق ہے:

شدہ وفاتش بشام یوم الحج   دفن شد روز عید سامی ہند

(ص100)

رشید حسن خاں صاحب نے ان میں سے کسی ایک اطلاع سے بھی استفادہ نہیں کیا۔

16۔ دبیر کا مادہ سال وفات از اسیر نقل کر کے تاریخ کی تفصیل کے لیے اشعار دبیر، خمخانۂ جاوید، آبِ حیات کو پیشِ نظر رکھا ہے۔لیکن رشید حسن خاں لطافت کے قطعے کے مندرجہ ذیل شعروں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔

روز سہ شنبہ تھا اور سُلخ محرم وقت صبح
ماتم شہ میں ہوئے یہ ماپ و غم کے ساتھ اخیر

ان اشعار سے معلومات میں دن اور وقت کا اضافہ ہوتا ہے اور تاریخ کی تصدیق ہوتی ہے (دیکھیے تاریخ لطیف صفحہ 126) رشید حسن خاں نے ان سے کام نہیں لیا۔

17۔ مولوی عبدالرحمٰن راسخ دہلوی کا مادہ تاریخ وفات از آغا شاعر قزلباش نقل کر کے راسخ کی تاریخ وفات خمخانۂ جاوید کے حوالے سے 29 ستمبر 1907 درج بتائی ہے۔ تاریخ لطیف میں اس قطعہ کے خاتمے پر حاشیے میں یہ عبارت بھی مولف کتاب ہی کے قلم سے درج ہے:

''16 شعبان روز چہار شنبہ قبل از نصف النہار''

رشید حسن خاں نے اس حاشیے کا کوئی حوالہ نہیں دیا نہ اس سے استفادہ کیا۔ نہ یہ بتایا کہ عیسوی اور ہجری تاریخوں میں کوئی فرق ہے یا نہیں۔ راسخ دہلوی ہی سے متعلق ایک اور واقعہ تاریخ منیر الدین منیر دہلوی کا زائیدہ فکر بھی تاریخ لطیف میں موجود ہے اور اس کے مصرعہ تاریخ سے مہینے اور سنہ دونوں کا علم ہوتا ہے۔ قطعے کا آخری شعر ملاحظہ ہو:

منیر اب اُن کا سال فوت لکھیے
''ہوئی شعبان میں بس اُن کی رحلت''
5 2 3 1ھ (تاریخ لطیف ص 5 3 1)

رشید حسن خاں نے اس مادے سے بھی استفادہ نہیں کیا۔

18۔ پیارے صاحب رشید کا مادۂ تاریخ از محشر لکھنوی نقل کر کے گلزار زیر طبع 1951 کے حوالے سے مزید معلومات فراہم کی ہیں۔لیکن اس قطعے کے مندرجہ ذیل شعروں کو محروم توجہ رکھا ہے:

محال صنعت سے فالج کے گو کہ جنبش تھی
مگر گئے سوئے اجداد جب کہ آئی قضا
سحر کا وقت تھا ذی قعدہ کی تھی بست و ششم
کہ آفتابِ کمالات زیر خاک چھپا
وہیں یہ قبر بنی جس جگہ پہ سوتے تھے
قدم نہ گوشۂ عزلت سے مر کے بھی نکلا

ص142

رشید حسن خاں نے اس قطعے سے وقت انتقال تو دیا ہی نہیں۔لیکن ایک اور اہم اطلاع سے بھی محروم رکھا اور وہ یہ کہ پیارے صاحب رشید اپنی خواب گاہ ہی میں دفن ہوئے۔اس کے برخلاف انھوں نے گلزار رشید کے حوالے سے باغ میر عشق محلّہ رکاب گنج لکھنو مدفن بتایا ہے۔

19۔ محمد جان شاد کے قطعہ تاریخ گفتہ تجمل حسین کو نقل کیا ہے مگر اسی قطعے کے مندرجہ ذیل اشعار سے صرف نظر کر کے آب بقا سے کام لیا۔

من از تخمین گفتن می توانم
کہ عمرش زائد از ہشتاد و شد وی
بہ فالج چون بہ فرش مرگ اُفتاد
مرض ہم فی المثل افتاد شد وای
ربیع الآخر و یکشنبہ ششم

به مغرب دیدرا بنیاد و شد وای
ہمیں دو چار ساعت ماند بر خود
زقید زندگی آزاد شد وای
مکان ویران شدہ تاریخ ہفتم
لحد از مقد مشی آباد شد وای

اس طرح مرض موت اور تاریخ دفن کی اطلاع رشید حسن خاں نے نہیں دی۔(دیکھیے تاریخ لطیف ص 151)

20۔رشید حسن خاں نے غلام امام شہید کے مادہ تاریخ کے لیے مرزا سالک دہلوی کا یہ شعر نقل کیا ہے جس سے 1296ھ برآمد ہوتے ہیں:

آہ ارباب درد پر ملاری پھر ہوا ماتم امام شہید

اور اس پہ یہ نوٹ لکھا ہے کہ:

''کلیات سالک نے فی الوقت میری دسترس سے باہر ہے کہ تطبیق کر سکوں،موجودہ صورت میں،اس شعر سے مطلوبہ تاریخ نہیں نکلتی ہے۔''

لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ انھیں الفاظ سے تاریخ نکلتی ہے۔رشید حسن خاں شعر کو سمجھنے میں ناکام رہے ہیں۔اس شعر کو سمجھنے میں ناکام رہے ہیں۔اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ ارباب درد پر ماتم امام شہید کو طاری ہوا۔یعنی ارباب درداور ماتم امام شہید کے اعداد جمع کر دیے جائیں۔ارباب درد کے اعداد 414اور ماتم 882 ہوتے ہیں۔ان دونوں کا حاصل جمع 1296 ہے۔تعجب ہے رشید حسن خاں اتنے سیدھے سادھے الفاظ کو سمجھنے سے قاصر رہے۔پُر لطف بات یہ ہے کہ رشید حسن خاں اپنی دسترس سے باہر کتابوں سے استفادے کی قوی آرزو کرتے ہیں۔لیکن تاریخ لطیف جو اُن کے زیر مطالعہ ہے۔اُس سے کوئی کام نہیں لیتے۔

21۔رشید حسن خاں نے شاہزادہ قادر بخش صابر کا مادہ تاریخ وفات محمد ناصر الہامؔ

''شہ شاعرانِ زمان مُر دہے ہے''

1299ھ

نقل کر کے مقالہ قاضی عبدالودود نقوش سالنامہ 62-61 کے حوالے سے مقام وفات کا اضافہ کیا ہے۔لیکن اسی قطعے کے مندرجہ ذیل شعر سے استفادہ نہیں کیا جس میں تاریخ،مہینا اور دن بتائے گئے ہیں۔

زشعبان سوم بود روزِ دو شنبہ
باین شان و نام و نشان مُرد ہے ہے

22۔میر غلام علی عشرت بریلوی کے مادہ تاریخ وفات کے لیے کرم رام پوری کے قطعے سے یہ شعر:

لے خامہ کرم نے اس کی تاریخ
لکھی یہی ہائے میر عشرت

1299ھ

نقل کیا ہے اور مزید اطلاعات کے لیے تذکرہ کاملان رام پور کا سہارا لیا ہے۔لیکن کوئی اضافہ نہیں کر سکے۔اسی قطعے کے مندرجہ ذیل اشعار سے عبرت کے ناتمام منظوم ترجمہ پدماوت کی تکمیل رقصہ شہدائے کربلا اور ایک دوسری نثری کہانی کی تصنیف انتقال کے مہینے اور تاریخ کا علم بھی ہو جاتا ہے۔ان میں سے کسی بات کا رشید حسن خاں نے اپنے حاشیے میں بیان نہیں کیا۔اشعار یہ ہیں:

پدماوت نا تمام کی ختم جس سے شاد ہوئی روح عبرت
قصہ شُہدای کربلا کا کھا خونِ جگر کہا بہ محنت
مطبوع و عجیب اک کہانی کی نثر بخوبی و فصاحت
شوال کی بست و شہتیں کو وا اُس پہ ہوا ہے بابِ جنت

(ص181)

23۔مندرجہ بالا قطعے کے کہنے والے کرم خاں رام پوری پر بھی انتخاب یادگار کے حوالے سے یہ حاشیہ لکھا ہے:

''مرزا مکھوا اور عرف کرم خاں شاگرد قدرت اللہ شوق 6 برس کی عمر پائی وفات 7 ذی حجہ 1253 بروز دوشنبہ''

لیکن تاریخ لطیف ہی میں منقول کرم خاں کا قطعہ تاریخ وفات جو کرم خاں کے بھانجے احمد خاں غفلت اخوان زادہ کا کہا ہوا صفحات 193،194،پر درج ہے۔رشید حسن خاں کے نزدیک قابلِ قبول نہیں ٹھہرا۔جب کہ اس قطعے سے کرم خاں صحیح نام،مدت مرض موت،وقت انتقال اور صحیح دن کا بھی پتا چلتا ہے۔ضروری اشعار درج ذیل کیے جاتے ہیں:

شاعر کامل و ذی حوصلہ ماموں صاحب
جن کو استاد کرم خاں کہے اعلیٰ و ادنا
متخلص بہ کرم نام کریم اللہ خاں

مجمع خوبی و اہل طہر و شرم و حیا
مرض ضیق کی تکلیف اٹھائی دو سال
شصت و یک سال تلک کھائی ہوا ہے دنیا
ظہر و یکشنبہ و ہفتم مہ ذی حجہ کی تھی
کہتے پھاگن تھے اسے ہندی میں پیر و برنا
طلب اس خسر و ثانی کے کیا سالِ وصال
آئی ہاتف کی یہ آواز کہ ''خوش فکر موا''

1253ھ

24۔مادہ تاریخ فدا علی عیش لکھنوی کے لیے شاد لکھنوی کے قطعہ کا یہ شعر نقل کیا گیا ہے:

شاد بزو چین پای قضا شُد سال و فاتش مضاف
نخل طوبی، حلیہ جنت، حور بہشتی، عیش خیال

اور محمد علی خاں اثر رام پوری کے ایک مضمون سے یہ جملہ بحوالہ اخبار دبدبہ سکندری رام پوری ذی قعدہ 1316ھ نقل کیا ہے:

''منشی فدا علی عیش لکھنوی بعمر 72 سال بہ ہفتہ گزشتہ''

لیکن اسی تاریخ لطیف سے قطعے کا پہلا شعر نقل نہیں کیا جس سے دن کا علم ہوتا ہے اور اس کی مدد سے صحیح تاریخ بھی دریافت ہو سکتی ہے۔وہ شعر یہ ہے:

عیش سخنور روز دو شنبہ چوں لمبہ ذی قعد بمرد
بُلبل رو حش گشت پریدہ سوئے ارم زین وار جہاں

(تاریخ لطیف 182)

میں عرض کروں گا کہ 14 ذی قعدہ کو یک شنبہ تھا۔اس رعایت سے ہفتہ گزشتہ میں دوشنبہ 8 ذی قعدہ کو اور اس طرح عیش کا انتقال دوشنبہ 8 ذی قعدہ 1316ھ کو ہا۔رشید حسن خاں مطلع کے پہلے شعر کو استعمال کرنے کی وجہ سے تاریخ بتانے میں ناکام رہے۔

25۔قدر بلگرامی پر حاشیے میں دیباچۂ کلیات قدر سے کام لیا ہے لیکن تاریخ لطیف ص 188 پر درج شدہ تاریخ گفتہ غلام حیدر ارشد گرامی شاگرد قدر کے ان شعروں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جو ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں:

روز یک شنبہ و بست و سوم ذی قعدہ
فوت کرد آں اقلیم واہ ویلا
سنہ رحلت او ارشد مغموم نوشت
شُد رواں قدر بسوئے ارم اناللہ

1301ھ

26۔خود قدر ہی کے ایک شعر سے نکالا گیا مادہ تاریخ لطیف ص 189 پر درج رشید حسن خاں نے اس کی اہمیت کو بھی لائق توجہ نہیں جانا وہ شعر یہ ہے:

بہار آئی ہوئی ہے قدر کی تربت پہ میلا ہے
یہاں بیڑی بڑھانے کو ہر اک دیوانہ آتا ہے

27۔باقر علی خاں کامل کا قطعہ تاریخ از سالک تاریخ لطیف ص 191 پر درج ہے۔مادے کا شعر جو رشید حسن خاں نے بھی نقل کیا ہے یہ ہے:

یہ ہی نوحہ ہے یہی تاریخ سن
نو جواں باقر علی خاں حیف ہے

مخطوطے میں اعداد 133ھ درج ہیں جو اس مادے سے برآمد نہیں ہوتے۔اس غلطی کی طرف عرشی صاحب نے مخطوطے کے صفحہ 191 پر جہاں یہ قطع درج ہے ایک حاشیہ لکھ کر اشارہ کیا ہے۔وہ تحریر فرماتے ہیں:

''یہ اعداد سہواً غلط درج ہوئے ہیں۔مصرع سے 1293ھ نکلتے ہیں اور یہی صحیح تاریخ وفات ہے۔عرشی۔''

رشید حسن خاں نے اس غلطی اور تصحیح کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔جب کہ وہ تین بار صحیح اعداد کو غلط سمجھ کر نوٹ لکھ چکے ہیں۔ان مثالوں کے لیے رجوع کیجیے زیر نظر مضمون کا نمبر 5،6،7۔

28۔حکیم سید مہدی کمال کا دن اور مہینا دریافت کرنے کے لیے رشید حسن خاں نے تذکرہ کاملان رام پور سے کام لیا ہے اور تاریخ لطیف (195) کے درج ذیل قطعے سے اغماض نظر کیا ہے جو جعفر علی خاں رئیس شمس آبادنے کہا ہے:

کرد تخلص کمال شاعر نازک خیال
سید مہدی علی جائے نشین جلال
رفت چو زیر زمیں گفت مورخ چنیں
ماہ صفدر با دوم گشتہ زوال کمال

1329ھ

29۔میر مونس لکھنوی کا مادہ تاریخ از منیر نقل کر کے حاشیے میں آب بقا کے حوالے سے لکھا ہے:

''میر محمد نواب مونس خلف میر خلیق برادر انیس۔''

لیکن تاریخ لطیف (ص219) پر نقل شدہ قطعہ تاریخ از لطافت کو کام میں نہیں لائے۔ جب کہ اس قطعے سے مرض موت دن اور تاریخ سب کچھ معلوم ہوتا ہے۔ضروری اشعار یہ ہیں:

در مہ شوال کرد از در و دل فوراً وفات
در شب جمعہ دل احباب گشتہ درد مند
آہ قبل از نصف شب ثانی عشر از ماہ بود
کاں زبان دان جہاں راشُد زباں یک بارہ بند
بہر سال اعداد مونس را بسفرِ صفر گیر
واو کُن مقلوب میم و نوں بہم سیں را دو چند

1292ھ

30۔ڈپٹی نذیر احمد صاحب کا مادہ تاریخ از قمر سندیلوی یوں نقل کیا ہے:

بے سرو پا ہیں علم وفضل وہُنر

اور اعداد 1330 بتائے ہیں۔لیکن ان الفاظ سے یہ اعداد بر آمد نہیں ہوتے۔دراصل یہاں رشید حسن خاں کا سہو ہے اور صحیح مادہ تاریخ کے الفاظ اس طرح ہیں:

بے سرو پا ہیں علم وفضل واثر

31۔نواب کلب علی خاں والی رام پور کا قطعہ تاریخ جو امیر مینائی استاد دربار رام پور نے کہا تھا تاریخ لطیف ص 239-236 میں نقل ہوا ہے۔اُس سے مادہ تاریخ رشید حسن خاں نے انتخاب کامل اور کلب علی خاں پر حاشیہ لکھتے وقت اس قطعے کے مندرجہ ذیل اشعار کی طرف رجوع نہیں کیا:

مشاغل ذکر کرو نماز و عامل و زکاۃ
پیر و شرع حبیب خاص رب العالمین
زانکہ اندر عہد او شدر رام پور آرام پور
مصطفےٰ آباد شد ور دور اوایں سر زمیں
دو ہزار و دو صدو پنجاہ پیدا گشت شُد
در ہزار و دو صد و ہشتاد و یک مسند نشیں
در ہزار و سہ صد و چار از جما دی الآخرہ
بست و ہفتم چار شنبہ بود ساعت چار میں
نا گہاں زد کوس رحلت سوئے دار الآخرہ
ذوق دیں می داشت از دنیا بر افشا نذر آستیں
نقش کمن از خانۂ حسرت سر لوح مزار
خواب گاہ حامی اسلام امیر المومنین

اس صرف نظر کی وجہ سے رشید حسن خاں کا وقت، دن اور تاریخ نہیں بتا سکتے۔نہ پابندی صوم وصلوٰۃ اور حج وزکاۃ کا ذکر کر سکے۔

مندرجہ بالا مثالوں کے ذریعے رشید حسن خاں کی سہل پسندی اور موضوع سے بے توجہی پر گفتگو کرنے کا ناخوش گوار کام مجھے انجام دینا پڑا۔ یہ امر میرے لیے ناپسندیدہ تھا مگر میں نے اس کو اس لیے کیا کہ یہ ایسی تنقید کے خلاف جمہوری احتجاج کے طور پر ہے جو علاج کے نام پر بیمار اور مضرت رساں نتائج پیدا کرتی ہے۔

میری درخواست بھی ہے اور مجھے اُمید بھی ہے کہ رشید حسن خاں میرے اس اقدام پر صحت مند ذہن فکر کے ساتھ یہ غور فرمالیں گے کہ اگر وہ اپنے ایک مضمون میں جو مختصر سے موضوع پر لکھا گیا ہو اتنی فاش غلطیاں کر سکتے ہیں تو انھیں دوسرے لکھنے والوں سے احتیاط اور توجہ کا کس حد تک مطالبہ کرنا چاہیے اور یہ بھی کہ ایسی صورت میں جب کہ وہ خود بے توجہی سے کام کرتے ہیں اُنھیں کسی مطالبے کا حق پہنچتا

بھی ہے یا نہیں۔

(ہماری زبان، علی گڑھ، 15 اگست 1965، صفحہ 3 تا 12 اور 22 اگست 1965، صفحہ 3 تا 9)

(رسالہ نقوش، ادارہ فروغ اُردو، لاہور، مدیر محمد طفیل، شمارہ 104، جنوری 1966، صفحہ 239 تا 254)

○○○

پروفیسر شارب ردولوی

رشید حسن خاں اور اُردو تحقیق

اُردو تحقیق کی روایت بہت قدیم نہیں ہے۔ اس کی طرف توجہ نہ دیے جانے کا ایک سبب یہ ہوسکتا ہے کہ دہلی و لکھنؤ کے بیش تر شاعروں، ادیبوں اور عالموں نے اپنا سارا زور شاعری، زبان و محاورے کی دوستی، عروض و قوافی کی صحت اور بدیع و بیان پر صرف کیا۔ ادبی تاریخ اور تحقیق سے کسی کو دلچسپی نہیں رہی۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک نہ مستند ادبی تاریخ لکھی جاسکی اور نہ بہت سے قدیم شعرا کے حالاتِ زندگی اور ان کی حالاتِ زندگی اور ان کی تاریخِ ولادت و وفات کا صحیح علم ہوسکا۔ اُردو شاعری اور شعرا کی مقبولیت کے باوجود ان کے کلام کے صحیح متن کے حصول میں انگنت دشواریاں حائل ہیں۔ ترتیب زمانی کے اعتبار سے ان کے کلام کی بازیافت کا تو کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ سوائے اس کے کہ اشعار میں جہاں کہیں کسی واقعے کا اشارہ مل جائے اس سے اس زمانے کا تعین کرلیا جائے۔ کم سواد ناقلوں، غلط نویس کاتبوں اور غیر ذمہ دار ناشروں نے کئی کئی شاعروں کا کلام خلط ملط کر کے الحاقی کلام کا ایک نیا مسئلہ پیدا کردیا جو شاید اُردو کے علاوہ کسی دوسری زبان میں نہیں ہوگا۔ تذکرے معلومات کے اعتبار سے ناقص سہی لیکن ہماری آج کی بہت سی معلومات تذکروں کی ہی رہینِ منت ہے۔ دوسری طرف تذکروں نے ہی تحقیقی جستجو کے جذبے کو بیدار کیا۔ آزاد کی تحقیق کتنی ہی غلطیوں کا مجموعہ اور ذاتی معلومات پر مبنی کیوں نہ ہو لیکن اس نے پہلی بار ادبی تاریخ اور تحقیق کی طرف متوجہ کیا۔ اس کے بعد سرسید نے آثار الصنادید، آئینِ اکبری اور تزکِ جہاں گیری مرتب کر کے تحقیق کی اہمیت کا احساس دلایا۔ سرسید اُردو تحقیق کے پیش رو تھے۔ انھوں نے ماضی کے اثاثے اور اسلاف کی علمی اور تہذیبی وراثت سے واقفیت پر زور دیا۔ ان کی کوشش سے ماضی کے سرمائے کی بازیافت کی طرف بھی توجہ ہوئی اور تحقیق کے نئے سائنٹفک معیاروں کی تلاش بھی ہوئی۔

اُردو میں تحقیق کو ہمیشہ کم تر درجے کی چیز سمجھا گیا۔ لوگوں نے اسے ہرن پر گھاس لادنے کے مترادف سمجھا یا گورکنی قرار دیا۔ حافظ محمود شیرانی سے اُردو تحقیق میں ایک عہد کا آغاز ہوا اور عبدالستار صدیقی، قاضی عبدالودود اور مولانا عرشی نے اس کی سائنٹفک بنیادوں کو استوار کیا۔

اُردو کے جدید محققین میں ایک بہت اہم اور معتبر نام رشید حسن خاں کا ہے۔ رشید حسن خاں نے قدیم متون کی ترتیب و تحقیق کا ہی کام نہیں کیا بل کہ جدید تحقیق کے آداب و معیار کو بھی متعین کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے املا، عروض، قواعدِ زبان، لغت، تدوینِ متن اور ادبی تحقیق کے بارے میں بہت لکھا ہے۔ انھوں نے پہلی بار اصلاحِ زبان کے سلسلہ میں ناسخ سے وابستہ روایتوں پر سوالہ نشان بنایا اور اپنی تحقیق سے ثابت کیا کہ ناسخ سے ان کا انتساب صحیح نہیں ہے۔

رشید حسن خاں تحقیق کے معاملہ میں قاضی عبدالودود کی طرح کسی مروت یا رعایت کے قائل نہیں ہیں اور کسی بھی سلسلے میں جب تک سارے شواہد جمع نہ کرلیں قلم نہیں اُٹھاتے۔ وہ تدوینِ متن کے سلسلے میں مولانا عرشی کو اپنا اُستادِ معنوی مانتے ہیں۔ انھوں نے مولانا عرشی کے علاوہ قاضی عبدالودود، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور حافظ محمود شیرانی سے بھی استفادہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میں نے تحقیق کے اصول اور آداب سیکھے حافظ محمود خاں شیرانی کی تحریروں سے۔ اس کے بعد قاضی عبدالودود اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی سے استفادہ کیا اور سب سے آخر میں مولانا عرشی مرحوم سے فیض پایا لیکن سب سے پہلے تحقیق کی طرف متوجہ کیا نیاز فتح پوری کی تحریروں نے۔ ان تحریروں نے تحقیق کی ضرورت کا احساس دلایا اور اس کی اہمیت سے آشنا کیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُس ذہنی کشمکش سے دوچار کیا جو مکمل تسکین اور کامل یقین کا مطالبہ کرتی ہے اور اُس تشکیک سے ذہن کو آشنا کیا جو تحقیق کی بنیاد بنتی ہے۔''

(تفہیم، رشید حسن خاں، صفحہ 108)

تحقیق بڑا مشکل اور ضبط و تحمل کا کام ہے۔ جذبات، تاثرات اور ذاتی پسند و ناپسند کی اس میں کوئی گنجایش نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یہ گہرے مطالعے اور علمی بصیرت کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس میں ذرا صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹا اور عجلت میں کوئی فیصلہ کیا گیا وہیں غلطی سرزد ہوئی۔ رشید حسن خاں نے اپنے مختلف مضامین میں تحقیق کے اصولوں سے بحث کی ہے اور اُردو تحقیق کو سائنٹفک بنیاد فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ ادبی تحقیق کے مسئلے میں انھوں نے لکھا ہے:

''تحقیق ایک مسلسل عمل ہے۔ نئے واقعات کا علم ہوتا رہے گا، کیوں کہ ذرائع معلومات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ یہی نہیں کہا جاسکتا کہ کون سی حقیقت کتنے پردوں میں چھپی ہوئی ہے۔ اکثر صورتوں میں ہوتا یہ ہے کہ حجابات بالتدریج اُٹھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تحقیق میں اصلیت کا تعین اُس وقت تک حاصل شدہ معلومات پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ واضح ہونا چاہیے کہ اس نے نئی معلومات کے امکانات کی نفی نہیں ہوسکتی لیکن یہ بات بھی اسی قدر وضاحت کے ساتھ سمجھ لینا چاہیے کہ محض آیندہ کے امکانات کی بنا پر ان باتوں کو بہ طور واقعہ نہیں مانا جاسکتا جو اس وقت تک محض قیاس آرائی کا کرشمہ ہوں۔''

(ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ، رشید حسن خاں، صفحہ 9)

ظاہر ہے کہ ادبی تحقیق کے دروازے ہمیشہ نئی معلومات اور نئے انکشافات کے لیے کھلے رہنا چاہئیں۔ اس لیے کہ جو بھی فیصلہ کیا جاتا ہے وہ 'معلوم' اور 'موجود' کی ہی روشنی میں ہوتا ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ اس سلسلے کے سارے امکانات ختم ہوگئے ہوں۔ کسی ذریعے سے کوئی نئی بات سامنے آسکتی ہے جو صورتِ حال میں اضافہ کرسکتی ہے یا اس کو بالکل تبدیل کرسکتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ حاصل شدہ چیز قابلِ اعتبار ہو اور اسے ہر طرح پرکھ لیا گیا ہو ورنہ غالبؔ کی بھوپال والی غزل کا سا واقعہ پھر ہوسکتا ہے۔ اس لیے رشید حسن خاں نے لکھا ہے:

''تحقیق میں دعوے سند کے بغیر قابلِ قبول نہیں ہوتے اور سند کے لیے ضروری ہے کہ قابلِ اعتماد ہو.... بظاہر حالات، حوالہ، مشکوک نہ معلوم ہوتا ہو اور دلیل، تحقیق کے خلاف نہ ہو۔'' (ادبی تحقیق، صفحہ 10)

تحقیق کا سارا دارومدار اسناد و حوالے پر ہے۔ اگر ان کی اچھی طرح چھان پھٹک نہیں کی گئی ہے اور مشکوک حوالوں پر بھروسا کرکے کوئی فیصلہ کیا گیا ہے تو اس غلطی کا اندیشہ رہے گا۔ اُردو تحقیق میں اکثر ایسے حوالوں پر اعتماد کرلیا گیا جو قابلِ اعتماد نہیں تھے جن سے بہت سی غلطیاں راہ پاگئیں۔ اس لیے کہ بعد کے لوگوں نے اصل ماخذ کی طرف رجوع کرنے کی بجائے محققین کے ان حوالوں کو تصدیق کے بغیر صحیح مان لیا اور پھر وہ غلطی سلسلۂ جاریہ کی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ سند کے طور پر نقل ہوتی گئی۔ رشید حسن خاں نے جو حافظ محمود شیرانی کو استاد الاساتذہ کا درجہ دیتے ہیں، ان کی اس طرح کی بعض غلطیوں کی بھی نشان دہی کی ہے جہاں انھوں نے بیاضوں کے مشکوک حوالوں کو سند کے طور پر مان لیا ہے۔ رشید حسن خاں بیاضوں کے حوالوں کو مشکوک اور ناقابلِ قبول قرار دیتے ہیں:

''بعض اور لوگوں کی طرح شیرانی مرحوم نے بھی اپنی کتاب پنجاب میں اُردو میں بیاضوں کے حوالوں دیے ہیں۔ ان کی تحریروں کو پڑھ کر ہم لوگوں نے تحقیق کے آداب سیکھے ہیں اور اس لحاظ سے ان کو استاد بل کہ استاد الاساتذہ کہنا چاہیے مگر مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ کسی وجہ سے انھوں نے یہ طے کرلیا تھا کہ پنجاب کو اُردو کا حوالہ ثابت کرنا ہے اور پھر اس طے شدہ نقطۂ نظر کے تحت انھوں نے ہر طرح کے حوالوں کو بلاتکلف قبول کرلیا۔''

(ادبی تحقیق........صفحہ 21)

رشید حسن خاں تحقیق کے ان اصولوں کے معاملہ میں بے حد سخت ہیں۔ وہ تدوینِ متن کے سلسلے میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے بے حد مداح ہیں اور ان سے استفادہ پر فخر کرتے ہیں لیکن ان اصولوں کے معاملے میں وہ ان کی بھی گرفت کرتے ہیں۔ مولانا عرشی نے دیوانِ غالبؔ کی تدوین کے موقع پر کچھ ایسی غزلیں بھی شامل کرلیں جو کسی بیاض میں مولانا آسی مرحوم کو ملی تھیں اور جنھیں انھوں نے مکمل شرح غالبؔ میں شامل کرلیا تھا۔ حالاں کہ عرشی صاحب نے ایک نوٹ کے ذریعے اپنے شک کا اظہار کردیا تھا کہ جب تک اس کی مستند شہادت نہ مل جائے اسے یقینی طور پر کلامِ غالبؔ کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ رشید حسن خاں عرشی صاحب کے مرتبہ دیوانِ غالبؔ میں ان غزلوں کی شمولیت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''ان غزلوں کو محض اُن مجہول بیاضوں میں اندراج کی بنا پر شامل دیوان ہونا ہی نہیں چاہیے تھا۔''

(ادبی تحقیق.......صفحہ 24)

ادبی تحقیق میں ایک بہت بڑا مسئلہ اختلافِ متن کا ہے۔ اس لیے کہ کبھی کوئی شعر یا عبارت کہیں کس طرح لکھی ہوئی ہے اور کہیں کسی نسخے، بیاض یا تذکرے میں کسی اور طرح یا کوئی لفظ بدل کر۔ اس میں کئی باتوں کا امکان ہے ممکن ہے کہ شاعر یا مصنف نے خود نظرِ ثانی کی ہو اور کسی لفظ، حصے یا ٹکڑے کو تبدیل کردیا ہو۔ یا کاتب نے نقل میں غلطی کی ہو یا درج کرنے والے نے اپنے حافظے کی بنیاد پر لکھ دیا ہو۔ ان تینوں باتوں کی مثالیں آبِ حیات، باغ و بہار اور فسانۂ عجائب کے مختلف نسخوں میں مل جائیں گی۔ اب اس کا فیصلہ کرنا کہ صحیح کیا ہے اور منشاے مصنف کے مطابق کیا ہے بڑا صبر آزما اور مشکل کام ہے۔ اس میں کسی ایک نسخے کی بنیاد پر یا عجلت میں کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا جب تک اس سے متعلق تمام ممکن الحصول چیزوں کو نہ دیکھ لیا جائے۔ اس سلسلے میں رشید حسن خاں نے بعض محققین کی غلطیوں کی نشان دہی کی ہے۔ ان میں قاضی عبدالودود کی بھی غلطیوں کا حوالہ دیا ہے۔ قاضی عبدالودود نے تذکرۂ شعرا (مصنفہ ابنِ امین اللہ طوفان) کے حواشی میں آتشؔ کے شعر پر ناسخؔ کی اصلاح کے بارے میں آزاد پر اعتراض کیا ہے کہ آزاد نے ان کے دیوان دیکھے بغیر اعتراض جڑ دیا اور اسے نہایت ''غیر ذمہ دارانہ روش'' قرار دیا ہے۔ رشید حسن خاں نے قاضی صاحب کے لیے انھیں کا لہجہ تو نہیں اختیار کیا کہ سوءِ ادب تھا لیکن ان کی غلطی کو نظر بھی نہیں کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

’’قاضی صاحب کا ماخذ آبِ حیات کا نسخہ مطبوعہ 1917 ہے جو مفیدِ عام پریس لاہور کا چھپا ہوا ہے۔اس میں یہ عبارت جس طرح ہے اس سے آزاد پر وہ اعتراض وارد ہی نہیں ہوتا جو قاضی صاحب نے کیا ہے۔‘‘

(ادبی تحقیق......صفحہ 120)

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اختلافِ متن کا معاملہ کیسا دشوار ہے کہ قاضی صاحب جیسے ممتاز محقق سے بھی غلطی ہو گئی۔

رشید حسن خاں تحقیق اور تنقید کو بنیادی طور پر دو مختلف موضوع مانتے ہیں۔ مجھے یہاں پر اپنی طالب علمی کے زمانے کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔1956 یا 1957 کی بات ہے کہ قاضی عبدالودود صاحب لکھنؤ یونی ورسٹی میں تشریف لائے اور شعبۂ اُردو میں ایک لکچر ہوا۔انھوں نے بھی تنقید اور تحقیق کو ایک دوسرے سے الگ قرار دیا۔دورانِ تقریر انھوں نے کہا کہ ایک محقق کا کام ہے کہ ’’وہ ایک وکیل کی طرح شواہد جمع کرے اور ایک جج کی طرح فیصلہ کرے‘‘ تقریر کے بعد سوالات کے وقفے میں میں نے عرض کیا کہ جب وکیل کی طرح شواہد جمع کیے جائیں اور جج کی طرح فیصلہ کیا جائے تو تحقیق اور تنقید ایک ہو جائے گی۔اس پر قاضی صاحب نے خفگی کے ساتھ بعض اساتذہ کی غلطیوں کی طرف اشارہ کیا کہ کس طرح انھوں نے بغیر کسی تحقیق کے ثانوی ماخذات سے حوالے لے کر انھیں اصل کتاب کے حوالے کے طور پر استعمال کیا اور تحقیق میں گمراہی پھیلانے کے مرتکب ہوئے اور آج ان کی کتابوں سے وہی غلط حوالے اصل حوالوں کی طرح نقل کیے جا رہے ہیں۔میں اس وقت قاضی صاحب کی بہت سی باتوں کو سمجھنے کی نہ صلاحیت رکھتا تھا اور نہ مزید سوال کرنے کی جرأت۔لیکن آج بھی میں تنقید و تحقیق کو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم سمجھتا ہوں۔اس لیے کہ تحقیق بغیر تنقید کے بہت سی غلطیوں کا شکار ہو سکتی ہے اور تنقید بغیر تحقیق کے بعض معاملات میں بالکل غلط نتیجے پر پہنچ سکتی ہے۔یہ ضرور ہے کہ تنقید تعبیرات و تاثرات آ جائیں تو تنقید و تحقیق میں ضرور فاصلہ ہو جائے گا اس لیے کہ تحقیق کا تعلق حقائق سے ہے تاثرات سے نہیں۔یہی وجہ ہے کہ تحقیق کی زبان صاف اور واضح ہوتی ہے۔اس میں کسی ابہام اور صنعت کی گنجایش نہیں ہوتی۔تحقیق میں جو کہا جا رہا ہے اور جن معنوں میں کہا جا رہا ہے اس کے وہی معنی ہیں اس میں اسلوبیات اور ساختیات کی موشگافیوں کی گنجایش نہیں ہے۔زبان کے معاملے میں سوسیر کی ساری منطق تحقیق میں بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔رشید حسن خاں نے تحقیق کی زبان کے بارے میں صحیح لکھا ہے کہ:

’’تحقیق کی زبان کو امکان کی حد تک آرایش اور مبالغے سے پاک ہونا چاہیے اور صفاتی الفاظ کے استعمال میں بہت زیادہ احتیاط کرنا چاہیے۔اُردو میں تنقید جس طرح انشا پردازی کا آرایش کدہ بن کر رہ گئی ہے وہ عبرت حاصل کرنے کے لیے کافی ہے اور تحقیق کو اس حادثے کا نشانہ بننے دینا چاہیے۔‘‘

(ادبی تحقیق......صفحہ 14)

تحقیق ایک سائنٹفک ضابطۂ عمل ہے۔اگر اس عمل میں کہیں کوئی غلطی ہوئی یا آدابِ تحقیق پر پوری طرح عمل نہ کیا گیا ہو تو صحیح نتیجے پر پہنچنا مشکل ہو گا اور اس بات پر رشید حسن خاں نے اپنی تحریروں میں بہت زور دیا ہے اور اسی لیے اخذِ نتائج میں تنقیدی تعبیر کی مخالفت کی ہے یا ایسی تحقیق کو غلط قرار دیا ہے جس میں کسی چیز کو تمام اسناد اور حوالوں کی روشنی میں پرکھے بغیر پیش کر دیا گیا ہو جس طرح کی کوتاہیاں اکثر محققین کے یہاں مل جاتی ہے۔یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کسی تحقیق یا بازیافت کو کیا صرف اس لیے پیش نہ کیا جائے کہ اس کہ تمام ماخذات اور متعلقات تک کسی کی رسائی نہیں ہو سکی۔یہ صحیح ہے کہ تحقیق ’’کا تا اور لے دوڑی‘‘ کا کام نہیں ہے لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ:’’قطعیت (Perfection) کام کی دشمن ہے‘‘ اس لیے کہ اس طرح شاید ہی کوئی کسی کام کو پورا کر سکے۔کلیم الدین احمد کو تذکرۂ شورش کا نسخہ ملا جسے انھوں نے شائع کر دیا۔اس کے بعد ڈاکٹر محمود الٰہی کو اس کا ایک اور نسخہ دستیاب ہوا۔ان دونوں نسخوں میں اختلاف ہے۔ظاہر ہے کہ اگر کلیم الدین احمد تذکرۂ شورش شائع نہ کرتے تو ان اختلاف کا علم ممکن نہیں تھا۔اس لیے تحقیق کا دائرہ اتنا تنگ نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی ایسی سخت گیری ہو جو کام کو ہی روک دے۔رشید حسن خاں بھی اس بات کو جانتے ہیں کہ نئے انکشافات کے لیے تحقیق کے دروازے ہمیشہ کھلے رہنے چاہئیں لیکن انھیں آج کی تحقیق پر یہ اعتراض ہے کہ ہر کام عجلت میں کیا جاتا ہے۔یہاں تک کہ تحقیق کے بنیادی اصولوں اور مطالبات کو بھی نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ:

’’حالات کے تقاضے کم معیاری کے اسباب تو ہو سکتے ہیں لیکن کم معیاری کے لیے وجہ جواز نہیں بن سکتے۔‘‘

(تفہیم،صفحہ 127)

اُردو تحقیق میں ایک مسئلہ قدیم زبان کے املا کا بھی ہے رشید حسن خاں اُردو میں املا کی معیار بندی کے بہت بڑے وکیل ہیں اور انھوں نے اس سلسلے میں بہت کام کیا ہے لیکن یہاں پر تحقیق کے نقطۂ نظر سے یہ سوال بہت اہم ہے کہ کیا قدیم متون کی تدوین کے وقت انھیں جدید املا میں لکھا جا سکتا ہے؟ رشید حسن خاں نے اس کی سخت مخالفت کی ہے۔یعنی جس عہد میں جو املا رائج تھا اُس عہد کے متون کو اُسی املا میں درج کیا جانا چاہیے۔یہ بات درست ہے،اس لیے کہ زبان اور اس کا املا اپنے عہد کی شناخت ہوتا ہے۔دوسرے اگر اسے تبدیل کر دیا جائے تو پھر آج اور سو سال پُرانی تحریر میں کوئی فرق نہیں رہ جائے گا۔رشید حسن خاں نے اسے ’’تحریف‘‘ قرار دیا ہے جس کا کسی مرتب کو حق نہیں ہے۔انگریزی اور دوسری زبانوں میں بھی یہی طریقہ رائج ہے۔’چاسر‘ اور ’شیکسپیر‘ کی تحریروں میں الفاظ اور ان کے املا کو اسی طرح درج کیا جاتا ہے جس طرح اُن کے زمانے میں لکھا جاتا تھا۔اُردو میں اکثر دکنی متون کی تدوین اور تحقیق کا ایک اعلا معیار پیش کر دیا ہے جو اُردو تحقیقِ متن کی بہترین مثال ہے اور تدوینِ متن کے سلسلہ میں کیے جانے والے بیش تر سوالوں کا جواب ہے۔

ہمارے عہد کے کئی اہم ناقدوں نے اُردو تحقیق کی گراں بہا خدمت انجام دی ہے لیکن جدید ناقدین میں رشید حسن خاں کی امتیازی اہمیت یہ ہے کہ انھوں نے صرف عملی تحقیق ہی نہیں کی بل کہ اُردو تحقیق،تدوینِ متن،لغت نویسی اور املا کے اصول متعین کرنے کا کام بھی کیا اور خود اپنے کاموں سے اُردو تحقیق کا ایک اعلا معیار قائم کیا۔

(تنقیدی عمل،از پروفیسر شارب ردولوی،صفحہ 291 تا 297،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،نئی دہلی،اشاعت 2015)

نوٹ:اس مضمون کا عکس ڈاکٹر ٹی.آر.رینا نے یکم جنوری 2017 کو احقر کے لیے روانہ کیا۔

نوٹ۔یہ مضمون ’’تنقیدی عمل‘‘ کی فہرست میں ’’رشید حسن خاں اور اُردو تنقید‘‘ کے نام سے شامل ہے جب کہ کتاب کے اندر کے صفحات میں ’’رشید حسن خاں اور اُردو تحقیق‘‘ کے نام سے شامل ہے۔

☆۔یہ مضمون کتاب نما کے خصوصی شمارے ’’رشید حسن خاں حیات وادبی خدمات،مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،نئی دہلی،مرتب اطہر فاروقی،اشاعت جولائی 2002 کے صفحہ 118 تا 123 پر شائع ہوا۔

تنویر احمد علوی

رشید حسن خاں: ایک منفرد محقق

پچھلی ربع صدی کے دوران ادبی تحقیق انتقادیات کے سلسلے میں جو چند اہم نام اُبھر کر سامنے آئے ہیں ان میں رشید حسن خاں کا نام بہ وجوہ بہت نمایاں اور ممتاز ہے۔

رشید حسن خاں نے اگر بعض اہم تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں لیکن بیش تر انھوں نے اپنے مختص علمی میلانات کے زیرِ اثر قلم اُٹھایا ہے اور اپنے تحقیقی مطالعہ کے لیے کچھ مخصوص موضوعات کو منتخب کر لیا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی علمی نقطۂ نظر اور طریق عیارگی کے مطابق کبھی دوسرے درجے پر آ کر لکھنا نہیں چاہتے اس کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ انھوں نے کم لکھا ہے۔

اُردو املا رشید حسن خاں کے یہاں تحقیق و تجسس کا خاص موضوع رہا ہے۔ ان کا زاویۂ نگاہ بہت وقیع ہے۔ جو مسائل و مباحث گذشتہ ایک صدی بل کہ اس سے بھی زیادہ مدت میں سامنے آئے ہیں رشید حسن خاں نے ان کا مطالعہ گہری نظر اور غیر معمولی دل چسپی کے ساتھ کیا ہے۔ اس مطالعہ کے جزئیات اور تفصیلات سے جہاں استفادہ کرنے والوں کی بڑی تعداد ہے وہاں بعض اہلِ علم نے ان سے اختلاف بھی کیا ہے، اور اس کی گنجایش ہمیشہ رہے گی۔

رشید حسن خاں املائی تعینات میں بعض مختص صورتوں میں رواج عام کے قائل نہیں۔ ان کے یہاں ''بلکہ اعلیٰ'' اور ''عش عش'' کا املا اس کی بہت واضح مثالیں ہیں جنھیں وہ ''بلکہ ''، ''اعلا'' اور ''اش اش'' کی صورت میں قبول کرنے کو تیار ہیں۔ ایسی مثالوں میں رشید حسن خاں کے نقطۂ نظر سے تو اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر ان مسائل و مباحث پر ان کی علمی و تحقیقی کاوشوں سے ہرگز نہیں۔

اُردو املا کی طرح زبان و قواعد کے مسائل بھی رشید حسن خاں کے لیے خصوصی توجہ اور علمی تحقیق و تجسس کے مستحق رہے ہیں۔ اُردو کی صفوں میں ایسے قابل استناد افراد اب کم ہوتے جا رہے ہیں جو ان مسائل سے پوری واقفیت اور کما حقہ دل چسپی رکھتے ہوں اور ان پر اظہارِ خیال کے بجا طور پر اہل ہوں۔ رشید حسن خاں نے اپنی پیچیدہ اور سلسلہ در سلسلہ مسائل پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں اور خلاصۂ بحث کے طور پر اس اصول کو تسلیم کیا ہے کہ اُردو زبان میں لفظوں کی تراش خراش اور صورت گری کے عمل کی کسوٹی ''رواج عام'' ہے اور اسی کو مستند و برہان ماننا چاہیے۔

اس ضمن میں ان کے یہاں جو اہتمام تلاش جزئیات ملتا ہے وہ زبان و قواعد کے مطالعہ میں ان کے غیر معمولی تحقیق و تجسس کی نشان دہی کے لیے کافی ہے۔

رشید حسن خاں کا خاص موضوع ''ادبی تحقیق مسائل و تجزیہ'' ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے مطالعہ کے فکری نتائج اور ان سے استنباط کردہ اصول و نظریات کو پیش کیا ہے۔ رشید حسن خاں کے مضامین کا مجموعہ جو کتابی شکل میں سامنے آیا ہے اُردو زبان کی تحقیق و ادبیات میں بلاشبہ ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ اسی کتاب میں وہ مضامین موجود ہیں جنھوں نے ہمیں ''چونکایا'' ہے اور اس کا بار بار احساس دلایا ہے کہ تحقیق کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔

رشید حسن خاں نے اس موضوع پر اپنی گفتگو بل کہ گفتگوؤں میں بار بار اس پر زور دیا ہے کہ تحقیق تنقید سے الگ ایک دبستان ہے اور تنقیدی تعبیرات سے اس کا کوئی رشتہ نہیں یہ بات وہ غیر مبہم اور واشگاف انداز میں اس لیے کہنا چاہتے ہیں کہ آج کل دانش گاہوں میں ''ریسرچ'' کے نام پر ہر طرح کی ادبی کارگزاریوں اور علمی کاوشوں کو ''تحقیق'' کے دائرہ میں داخل کر لیا گیا ہے اور جس نوعیت کا کام اس عنوان سے کیا جا رہا ہے وہ تحقیق اور تنقید دونوں کے ساتھ ناانصافی ہے۔ اور اس سے غلط مبحث کے لیے بڑی گنجایشیں پیدا ہو گئی ہیں۔ تحقیق کی تعریف کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:

''ادبی تحقیق میں کسی امر کا وجود بہ طور واقعہ اس صورت میں متعین ہوگا جب اصول تحقیق کے مطابق اس کے متعلق معلومات ہوں۔ واقعہ کا چھوٹا یا بڑا ہونا، اہم یا غیر اہم ہونا ادبی تحقیق میں کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتا۔ یہ صفاتی الفاظ صرف اس صورت حال کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس میں اس واقعہ سے کام لیا جا رہا ہے۔

تحقیق ایک مسلسل عمل ہے۔ نئے واقعات کا علم ہوتا رہا ہے گا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کون سی حقیقت کتنے پردوں میں چھپی ہوئی ہے۔ اکثر صورتوں میں ہوتا یہ ہے کہ حجابات بتدریج اُٹھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تحقیق میں اصلیت کا تعین اس وقت تک حاصل شدہ معلومات پر مبنی ہوتا ہے۔ اس سے آیندہ کے امکانات کی نفی نہیں ہوتی لیکن محقق کے آیندہ امکانات پر ان باتوں کو بطور واقعہ نہیں مانا جا سکتا جو اس وقت تک محض قیاس آرائی کا کرشمہ ہوں۔''

(ادبی تحقیق مسائل و تجزیہ:9)

اس ایک گونہ تفصیلی اظہار رائے کے ساتھ آخری جملہ تک پہنچتے پہنچتے یہ بحث ایک نئے موضوع فکر و نظر سے جا ملتی ہے اور وہ یہ کہ تحقیق کو صرف واضح شہادت اور استخراجی نتائج تک محدود سمجھنا چاہیے۔ استقرائی سطح پر اخذ نتائج اور استنباط اس سے الگ ''دید و دریافت'' کا ایک عمل ہے جس کے دائرہ میں تنقیدی فکر و فہم اور تعبیرات کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ چناں چہ رشید حسن خاں نے اس پہلو سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

''تعبیرات کو واقعات نہیں کہا جا سکتا اور تحقیق کا مقصود حقائق کی بازیافت ہے۔ اس لیے ایسے موضوعات جن میں تنقیدی تعبیرات کا عمل دخل ہو تحقیق کے دائرے میں نہیں آتے۔ تنقیدی صداقت تنقیدی تعبیرات کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی مسئلہ پر دو مختلف افراد رائیں رکھتے ہیں۔ جب کہ تحقیق میں اس طرح کے اختلاف کی گنجایش نہیں۔'' (ادبی تحقیق مسائل و تجزیہ)

رشید حسن خاں کے نقطۂ نظر میں جو قطعیت ہے اس کا تعلق تحقیق کی اس تعریف سے ہے، جس میں واقعہ اور واقعیت کا تعین ان بدیہی شواہد اور استخراجی نتائج کے تحت کیا جاتا ہے جن کے بارے میں اختلاف رائے کی گنجایش نہیں ہوتی۔ اس سے آگے اور الگ جو طریق رسائی موجود ہے اور جن وسائل تفہیم کا سہارا لیا جاتا ہے ان کو غیر علمی تو نہیں کہا جا سکتا لیکن ان پر تحقیق اور تحقیقی طریق رسائی کا اطلاق بھی ممکن نہیں۔

اپنے نقطۂ نظر کی منطقی حدود میں زور دینے کے باوصف رشید حسن خاں کی نظر سے یہ نکتہ چھپا نہیں ہے کہ سادہ تحقیق کو خواہ اس کی بنیاد کتنے ہی منجمد اور ٹھوس حقائق پر ہو اس وقت تک پُر معنی اور نتیجہ خیز نہیں کہا جا سکتا جب تک کہ دوسرے حقائق اور مضمر سچائیوں سے اس کی معنویت کا رشتہ نہ قائم ہو جائے۔ ادبی صداقتوں کے ضمن میں اس کی اہمیت اور بھی زیادہ ہے۔ رشید حسن جہاں اس کو ضروری سمجھتے ہیں کہ حقائق اور شواہد کا تعین تحقیق ہی کو کرنا چاہیے۔ وہاں انھوں نے اس سچائی کو بھی بغیر کسی تذبذب فی الرائے کے پیش کر دیا ہے کہ:

''تحقیق میں اعداد و شمار اور مطلق حقائق کا تعین بنیادی چیز ہے۔ لیکن یہی سب کچھ نہیں۔ یہ اس کا ابتدائی حصہ ہے۔ بے حد اہم بے حد ضروری۔ لیکن اہم کام یہ بھی ہے کہ جن حقائق کا تعین کیا گیا ہے دیکھا جائے کہ ان سے کیا نتائج نکلتے ہیں اور ان سے علم و آگہی میں کس نوعیت کا اضافہ ہوتا ہے۔''

(ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ:103)

ظاہر ہے کہ علمی حقائق کے ''استنادی تعین'' اور بازیافت کے ''معنی بر حقائق'' عمل کے بغیر اگر معنی آفرینی اور قیاس آرائی کی جائے گی تو وہ تعبیرات کا آرٹ تو ضرور ہوگا لیکن اس نوع کی رسائی فکر اور ذہنی اختراع کو ''سند اعتبار'' سے محروم تصور کیا جائے گا۔ اس لیے رشید حسن خاں کا یہ خیال بڑی اہمیت رکھتا ہے:

''اب سے پہلے اس بات کا یقین دلانا مشکل تھا کہ تحقیق کے فراہم کیے ہوئے مواد، اس سے نکالے ہوئے نتائج اور اس سے متعین کیے ہوئے حقائق کو سامنے رکھنا تنقید نگار کے لیے لازم ہوگا اور اس کے بغیر کچھ کہا جائے گا تو وہ قابل قبول نہیں ہوگا۔ حقائق اور شواہد کا تعین تحقیق ہی کرے گی اور ناقد کے لیے لازم ہوگا کہ وہ ان کو ملحوظ رکھے۔''

(ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ:100)

تنقیدی فکر و فہم اگر علمی طریق رسائی اور حقائق و شواہد کے صحیح تعین سے دور نہ جا پڑے تو وہ بھی نکتہ رسی، حقیقت شناسی و معنی بینی کا ایک بڑا وسیلہ ہے مگر اس کے وہی فیصلے درخورِ اعتنا اور قابل اعتبار ہوں گے جو استخراجی نتائج پر مبنی ہو۔ محض استقرائی معروضات کا کرشمہ نہ ہو۔

رشید حسن اپنے فیصلوں میں کسی نوع کی لچک یا دورنگی خارج از بحث خیال کرتے ہیں وہ صرف اس رائے کو مانتے ہیں اور منوانا چاہتے ہیں جس کی استنادی حیثیت مسلم ہو سکے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ''ریسرچ'' اپنی حدود کا تعین کرے اور اس سے آگے نہ جائے۔ چناں چہ انھوں نے لکھا ہے:

''یہاں پر یہ صراحت بھی ضروری ہے کہ اگر کوئی شخص کچھ معروضی حقائق یا شواہد تعین کر دیتا ہے اور اس سے آگے کچھ نہیں کرتا تو یہ بھی بجائے خود اہم ہے چوں کہ ایک دوسرا شخص جو استخراج نتائج کی زیادہ اچھی صلاحیت رکھتا ہے وہ اس سے فائدہ اٹھا کر دوسرے رُخ کی تکمیل کرے گا۔ کبھی کبھی صلاحیتوں کی کمی بیشی کا فرق بھی بعض ناتمامیوں کا باعث ہوا کرتا ہے۔''

اس روشنی اور شفاف انداز نظر کی مزید صراحت اس بیان میں سامنے آئی ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ خود رشید حسن خاں کے یہاں تنقید اور تحقیق میں کوئی تضاد کا رشتہ نہیں بل کہ سچ پوچھیے تو تامل اور تکمیل کا رشتہ ہے۔ انھوں نے اس بحث میں آگے یہ کہا ہے:

''استخراج نتائج کی طرف زیادہ مبذول ہونے کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ سماجی اور سیاسی واقعات کے اثرات کی نشان دہی کی طرف بھی توجہ کی گئی اور سمجھا گیا کہ کسی مصنف کے ساتھ تنقیدی سطح پر انصاف کرنے کے لیے صرف ان کے ذاتی حالات سے واقفیت کافی نہیں۔ وہ جس زمانے میں تھا اور اس کے گرد و پیش جو حالات چھائے ہوئے تھے اور وہ حالات جن خاص اسباب کا نتیجہ تھے ان کا بھی جائزہ لیا جائے۔ اس کے لیے سب سے پہلے خالص تحقیقی انداز سے سارے واقعات کا بالکل صحیح صحیح تعین کیا جائے۔ پھر تحقیق کی روشنی میں خالص منطقی انداز سے نتائج نکالے جائیں۔''

تحقیقی اندازِ نظر کے ساتھ واقعات کا تعین جتنا ضروری ہے اتنا مشکل بھی ہے۔ اُردو میں تحقیقی وسائل کا فقدان تو نہیں ہے لیکن دشواری یہ ہے کہ ایسے بہت سے وسائل منتشر ہیں اور ان کی وضاحتی

فہرستیں بھی بیش تر صورتوں میں دستیاب ہیں۔ نئے ماخذ اور نو دریافت وسائل تک رسائی بہت سے افراد کے لیے یوں بھی ایک کار مشکل ہے۔ خاص طور پر ان کے لیے جو راہِ تحقیق میں اوّل اوّل قدم رکھتے ہیں۔ تن آسانی، محنت سے اعراض اور ذہنی کاہلی کی بات الگ رہی، تحقیقی تربیت کے لیے رہنما کتابوں کی کمی بھی ایک مسئلہ ہے۔

علاوہ بریں عام حالات میں جن مصادر تک پہنچنا ممکن ہے صدق روایت اور صحت متن کے لحاظ سے ان پر بھی اعتماد مشکل ہے۔ جن ماخذ میں ادبی تحقیق میں بھروسا کیا جاسکتا ہے اور جنھیں بالعموم درجہ استناد دیا جاتا رہا ہے وہ متنوع قلمی ماخذ بالخصوص تذکرے اور بیاضیں ہیں لیکن اس کا کیا جائے کہ وہ بھی بہت سی صورتوں میں سند برہان کے کام نہیں آسکتیں۔ اور یہ مسئلہ خود رشید حسن خاں نے اٹھایا ہے۔

اصولیات تحقیق کے سلسلے میں رشید حسن خاں کا ایک اہم کارنامہ، (جسے فی الجملہ ان کی اولیت میں شمار کیا جانا چاہیے) تذکروں اور بیاضوں پر ان کی تحقیقی گفتگو ہے جس میں انھوں نے ان ماخذ کی استنادی حیثیت پر ''شک'' کا اظہار کیا۔ اور مسئلہ کو پہلی بار اہل علم اور ارباب تحقیق کے سامنے رکھا ہے۔ اپنے مقالہ تحقیق سے متعلق بعض مسائل میں انھوں نے اس طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھا ہے:

> ''بیش تر مطبوعہ تذکروں کے متن پر پوری طرح اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ اکثر مطبوعہ تذکرے اس قدر غلط چھپے ہیں یا ان میں ایسی غلطیاں راہ پا گئی ہیں کہ ان کا ازسرنو درست کیا جانا ضروری ہے۔ ان میں وہ تذکرے بھی شامل ہیں جن کو ایک زمانہ میں انجمن ترقی اُردو نے شائع کیا تھا اور وہ بھی جو اس زمانے میں بعض معروف حضرات کے مقدموں کے ساتھ شائع ہوئے ہیں۔ ایسی صورت میں احتیاط کا تقاضہ یہ ہوگا کہ امکان کی حد تک تذکروں کے اہم خطی نسخوں سے بھی استفادہ کیا جائے۔ بعض مطبوعہ تذکروں کے جو خطی نسخوں سے بھی استفادہ کیا جائے۔ بعض مطبوعہ تذکرے خالی ہیں۔''
>
> (ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ:45)

تذکروں پر یہ گفتگو ان اعتراضات سے یہ مراتب مختلف ہے جو گارساں دتاسی سے لے کر تا زیانہ حال کیے جاتے رہے ہیں۔ یہاں تذکروں کی روایتی خامیوں کا ذکر نہیں۔ ان کی استنادی حیثیت کے تعین کا سوال ہے جو ذہن کو ایک نئی سمت سفر دیتا ہے۔ انھوں نے بیاضوں کے حوالوں کو بھی مشکوک حوالوں کے ذیل میں رکھا ہے اور ان پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''پُرانی کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ مختلف کتب خانوں اور ذاتی ذخیروں میں محفوظ ہے۔ بیاض مرتب کرنے کا کوئی مقرر طریقہ نہیں تھا۔ کسی مجموعے یا کسی دوسری بیاض سے بھی کلام نقل کیا جاسکتا تھا اور مختلف لوگوں کی زبان سے سن کر شامل بیاض کیا جاسکتا تھا اس میں صحت انتساب کی حیثیت کی مشیت ثانوی ہوا کرتی تھی۔ اصل چیز ہوتی ذاتی پسندیدگی۔ ایسے مجموعوں کی اہمیت سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن ان کے مندرجات عمومی طور پر صحت متن اور صحت انتساب کے لحاظ سے تصدیق کے محتاج رہیں گے......ایسی مجہول الاحوال بیاضوں سے استفادہ خاص طور پر احتیاط کا طلب گار رہے گا۔''
>
> (ادبی تحقیق مسائل وتجزیہ)

بات بالکل صحیح ہے، صحت روایت، صحتِ انتساب اور صحت متن کا مسئلہ تحقیقی نقطۂ نظر سے کلیدی حیثیت رکھتا ہے لیکن اس بحث کو اگر پھیلا دیا جائے تو بیش تر قلمی ماخذ اس کے دائرہ میں آ جائیں گے اور زیادہ صحیح طریق رسائی وہی ہوگا کہ معتبر اور غیر معتبر اور مشکوک کا فیصلہ کرنے میں احتیاط برتی جائے۔ جس کے لیے رشید حسن خاں نے کہا ہے:

> ''روزنامچوں اور بیاضوں کے اندراجات ہوں یا اس قسم کے دوسرے ذرائع ان کا مطالعہ تو ضرور کرنا چاہیے مگر بہ طور حوالہ ان کو قبول کرنے میں احتیاط اور زیادہ احتیاط کرنا چاہیے۔''

ایک اور اہم مسئلہ پر رشید حسن خاں نے توجہ دلائی ہے وہ اساسی ماخذ کے تراجم ہیں جو بدرجہ مجبوری اساسی ماخذ کے ذیل میں آتے ہیں اور جن سے متعدد مواقع پر استفادہ ایک ناگزیر صورت ہوتا ہے۔

> ''اُردو میں تحقیقی کام کرنے والوں کو جن ماخذ سے استفادہ کرنا پڑتا ہے ان میں سے بیش تر فارسی میں ہیں۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایسی کتابوں خاص طور پر تذکروں کا اُردو میں ترجمہ ہونا چاہیے۔ اس کا جواب بہت صاف اور واضح ہے کہ ترجمہ کو اصل ماخذ کی حیثیت سے نہ پیش کیا جاسکتا ہے نہ کیا جانا چاہیے۔''

ظاہر ہے کہ اس معاملہ میں اصولی حیثیت سے دو رائیں نہیں ہوسکتی۔ لیکن اس سلسلہ کی عملی دشواریاں ایسی بھی نہیں جنھیں ناقابل التفات قرار دیا جائے۔ رشید حسن خاں نے اس بحث میں جو مثالیں پیش کی ہیں وہ بہت ناقص ترجموں کی ہیں۔ حوالہ کے لیے جن کا انتخاب ترجمہ پر تحقیقی گفتگو میں ایک طرح کی ناانصافی ہے۔

رشید حسن خاں کے یہاں جو تحقیقی اندازِ نظر ملتا ہے وہ کافی دنوں سے احتساب کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ یوں بھی اُردو میں تحقیقی روایت نمایاں حیثیت سے ''دو اہم مکاتب فکر'' میں منقسم نظر آتی ہے۔ ایک وہ روایت ہے جس کے تحقیقی کارناموں کی امتیازی شکل میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی، ڈاکٹر نذیر احمد، نثار احمد فاروقی، مشفق خواجہ اور ڈاکٹر گیان چند جیسے محققین کے ممتاز کارناموں میں ملتی ہے۔ یہ حضرات کسی دوسرے کام میں اعتراض یا احتساب کو اس وقت تک ضروری نہیں سمجھتے جب تک مقطع سخن گسترانہ بات نہ آپڑے۔ ان کا مطمع نظر اپنے ذاتی کاموں میں خوب سے خوب تر کی تلاش ہے اور بس۔

دوسری روایت جو اس کے مقابلے میں آئی ہے تحقیقی انتقاد کی وہ صورت ہے جس میں عملی کاموں کے تحقیقی جائزے اور ''احتساب'' کو ضروری خیال کیا جاتا ہے تاکہ غلطیوں کو فروغ پانے کا موقع نہ ملے اور تحقیقی کام کرنے والے اپنی علمی ذمہ داریوں کو فراموش نہ کریں۔ پروفیسر شیرانی اور قاضی عبدالودود جیسے اکابرین اس دوسری روایت سے تعلق رکھتے ہیں۔ رشید حسن خاں کا تعلق بھی اسی روایت سے ہے۔ وہ بھی علمی احتساب اور تحقیقی عیارگیری کو ایک ناگزیر تقاضہ خیال کرتے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے:

> ''ایک قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ اس زمانے میں پہلے کے مقابلہ میں زیادہ صفائی (کذا) اور زیادہ شدت کے ساتھ احتساب کی ضرورت کو محسوس کیا گیا اور اس پر عمل بھی.....اس لحاظ سے گویا تحقیق نے شیرانی صاحب کی روایت کو پھر سے زندہ کیا جنھوں نے سب سے پہلے تحقیق کی سچائی کو ساری وضع داریوں، مروتوں، مصلحتوں اور سخن گسترانہ اسالیب سے الگ رکھنے کی کوشش پر زور دیا تھا۔ اس زمانہ میں قاضی عبدالودود نے اس کو پھر سے اور زیادہ اہتمام کے ساتھ زندگی کو بخشا۔''
>
> (ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ:107-106)

اس سے رشید حسن خاں کا تحقیقی مسلک واضح ہوجاتا ہے۔ انھوں نے اس کو اپناتے ہوئے ساری وضع داریوں مروتوں اور مصلحتوں سے اپنے ناقدانہ رویے کو الگ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی

سب سے بہتر مثالیں ان تحقیقی تبصروں میں سامنے آتی ہیں جو ''علی گڑھ تاریخ ادب اُردو''، ''دیوانِ غالب'' مرتب مالک رام اور ''تاریخ ادب اُردو'' مولف جمیل جالبی پر کیے گئے ہیں۔ان تبصروں نے پڑھنے والوں کو متوجہ کیا اور لکھنے والوں کو متنبہ کیا ہے اور تحقیقی نگارشوں میں احتیاط کے کیا معنی ہیں اس کی طرف بہت سے لوگوں کی نظر گئی ہے۔

تحقیق میں غلط فہمیوں اور غلط نگاریوں کی روک تھام ضروری ہے، اگر ہر طرح کے جذباتی رویوں اور غیر علمی فیصلوں کو برداشت کر لیا جائے تو راہِ علم رفتہ رفتہ کانٹوں سے بھر جائے گی اور سہل نگاری عشق وعقیدت اور تنافر وتعصب کے تحت روایتی معلومات اور موضوعات کا انبار بڑھتا چلا جائے گا۔جس طرح تنقید اچھے بُرے کی پرکھ اور ادب کی اقدار شناسی کے لیے ضروری ہے اسی طرح حقائق کی چھان بین کے لیے تحقیقی تجزیہ ایک ناگزیر صورت ہے جس کے بغیر معروضی سچائیوں کا تعین ممکن نہیں۔

لیکن جس طرح تنقید میں جانب داری اور سوگیری سے بچنا ایک بے حد ضروری بات ہے اسی طرح تحقیق میں واشگاف گوئی اور حق پژدہی کے جذبے کو ''علمی ادعا'' اور ''تحقیق انا'' سے بچانا بھی لازمی ہے جس کا خطرہ سب سے زیادہ ایک محقق کے قلم کو لاحق رہتا ہے۔اور گاہ گاہ نفسیات تحقیق ایک واردہ بن جاتا ہے۔جس کی وجہ سے تحقیقی انتقاد میں ''ایک رُخا پن'' آ جاتا ہے۔

ایک تحقیقی مبصر، کسی مصنف کی علمی نارسائیوں یا تحقیقی بے ضابطگیوں کا جو تذکرہ کرتا ہے وہ خود تو اپنے دائرہ میں ایک بڑی علمی خدمت ہے لیکن کسی تحقیقی تجزیہ میں اگر صرف خامیاں ہی ظاہر کی جائیں اور خوبیوں کی طرف واضح اشارات بھی نہ ہوں گو اس سے یہ اندیشہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ عام قاری جو نگاہ دیدۂ تحقیق کے حضور خود کم نظری کا شکار ہو گیا ہے۔اسی حالت میں مصنف کی مجموعی محنت اور علمی خدمت کو ناورشتہ طور سے فراموش کر دیتا ہے اور بہت لوگوں کی نگاہ میں کتاب کی قدر و قیمت گر جاتی ہے۔اصل تحقیقی اور اس کے مصنف کے بجائے تحقیقی نقاد کی شخصیت کچھ زیادہ اہم ہو جاتی ہے۔اس معاملے میں حقیقی تناظر اور صحیح توازن کو باقی رکھنے کی ذمہ داری ایک تحقیقی تجزیہ کرنے والے نقاد کو قبول کرنی چاہیے۔

ایک محقق کی زبان اور زبان قلم کی واشگاف گوئی اور حقیقت نگاری کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔لیکن اس سلسلے میں بات کبھی کبھی خود رشید حسن خاں کے یہاں جائز حدوں سے آگے بڑھتی ہوئی نظر آتی ہے۔انھوں نے ایک موقع پر مولانا شبلی کے تحقیقی رویے پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

''تحقیق جس کم نصیبی غیر جذباتی اندازِ فکر واندازِ اظہار اور صحیح معنی میں ''سنگ دلی'' کی طلب گار ہے وہ مولانا کا حصہ نہیں ہے۔''

یہاں ''صحیح معنی میں'' سنگ دلی کیوں، معروضی طریق رسائی کیوں نہیں۔لفظ سنگ دل ایک طرح کے منفی رویہ کی طرف ذہن کو مائل کرتا ہے۔بعض دوسرے موقعوں کی طرح دراصل یہاں جذباتی رویہ ایک جذباتی لفظی ترکیب کے سانچے میں ڈھل گیا ہے۔جس کی متنوع مثالیں ان کے یہاں ملتی ہیں اور ان کے ایک سنجیدہ قاری کی نظر میں کھٹکتی ہیں۔گمراہ کن رجحانات اور علمی جرائم کی حوصلہ شکنی جتنی ضروری ہے اتنا ہی تحقیقی طریق رسائی لب ولہجہ کی تندی اور طعن وتعریض کی نشتر زنی سے بچانا بھی احتساب کی ایک مستحسن صورت ہے۔

یہ ایک دل چسپ حقیقت کہ ''زبان وقواعد'' اور ''اُردو املا'' جیسی کتابوں میں (جو یقیناً رشید حسن خاں کے وقیع علمی کارناموں میں سے ہے) جو اندازِ نگارش ملتا ہے اس کے مختارات بحث وتحریر میں شروع سے آخر تک وہی سنجیدہ اسلوب کارفرما ہے جس کی توقع وہ ایک محقق سے کرتے ہیں۔اس کے مقابلے میں ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ میں ان کا رویہ نمایاں طور پر بدلا ہوا نظر آتا ہے۔اس کا آغاز بہ گمان غالب علی گڑھ تاریخ ادب پر ان کے تاریخی تبصرے سے ہوتا ہے۔

تحقیق اور اخلاقیات تحقیق کے ضمن میں جو مضامین انھوں نے لکھے ہیں۔ان کی افادیت واہمیت میں کلام کی گنجایش نہیں۔ان مضامین کا اثر تحقیق انداز پر مرتب کی جانے والی کتابوں سے بھی کچھ زیادہ ہوا ہے۔لیکن جگہ جگہ ان کی زبان تحقیقی اندازِ بیان کے سادہ سنجیدہ دائرہ سے باہر آ گئی ہے۔اس سے گفتگو کا لطف بڑھ گیا ہے۔چبھتے ہوئے فقرے یوں بھی زیادہ اس کے سنجیدہ مقصد کی نمایندگی نہیں کرتے۔

یہاں ایسے بعض فقرے نقل کیے جاتے ہیں جو قوس وقزح کے نیم دائرے کی طرح زبان وبیان کے کچھ شوخ رنگوں کو تو واضح کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ وہ ایک محقق کی زبان کی سطح سے الگ بھی ہیں۔

''حالات کے زیرِ اثر تحقیق کو دانش گاہوں میں پناہ گزیں ہونا پڑا ہے۔جب کہیں پناہ گزینوں کا سیلاب آتا ہے تو شہری زندگی میں بہت سے پریشان کن مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔''

''یہ ایسے عوامل ہیں کہ ان کا پھیلا ہوا غبار زندگی میں ابہام کا دھندلکا پھیلائے رکھتا ہے۔''

''ایسے اداروں کا جو پنچائتی کام اب تک سامنے آیا ہے وہ معیار کے اعتبار سے مایوس کُن ہے۔''

''اکثر سینئر اساتذہ کمیٹیوں کے ممبر بننے اور ترقی کے جتے کرنے میں اس قدر مصروف رہتے ہیں کہ لکھنے پڑھنے کے فالتو کاموں کے لیے ان کے پاس وقت نہیں ہوتا۔(ان کا) طالب علم حیران وپریشان اِدھر اُدھر مدد کی بھیک مانگتا پھرتا ہے۔''

''ممتحنین کی طرف سے مقالے کے رد کیے جانے کا خطرہ یوں نہیں کہ دریا میں رہ کر مگر مچھوں سے بیر کون رکھ سکتا ہے۔''

''مشکل یہ ہوئی ہے کہ وہ تصنیف وتالیف سے قطع تعلق بھی نہیں کر سکتا چوں کہ انہیں ''اوراق جمشیدی'' کی مدد سے تو وہ اپنا ''طلسم ہوش ربا'' سجائے ہوئے ہیں۔''(76)

''علمی اور تحقیقی کارنامے اس طرح وجود میں نہیں آتے کہ کاتا اور لے دوڑی۔''(77)

''بس مقصد پورا ہو گیا اب اسے ہاتھ کی صفائی کہ لیجیے یا استادی کا کرشمہ۔''(27)

یہ دل چسپ فقرے اور چبھتے ہوئے جملے تحقیقی طنزیات ومضحکات کا حصہ تو بن سکتے ہیں۔کچھ دیر ان کے چٹخارے کا لطف بھی اُٹھایا جا سکتا ہے۔لیکن انھیں تحقیق کی زبان اور انداز بیان کا حصہ ماننے میں تامل ہوتا ہے۔

رشید حسن خاں کے یہاں اس نوع کے فقروں اور جملوں کی اہمیت اساسی نہیں ہے۔ہو بھی نہیں سکتی۔اس لیے کہ ان کی زبان مجلسی اور صحافتی نہیں۔وہ ایک محقق ہیں اور ایک محقق کی طرح انداز بیان کی قطعیت کے قائل ہیں۔وہ جس طرح مطالعہ میں ''ارتکاز'' کو ضروری خیال کرتے اسی طرح اپنی تحریروں میں بھی وہ ارتکاز پر پرزور دیتے ہیں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ اپنی نگارشات میں نظریاتی تنوع سے بھی

اجتناب برتتے ہیں اور تنقیدی خیال آرائیوں سے بھی اب تقریباً دست کش ہو چکے ہیں۔

اُردو زبان 47ء کے بعد پچھلی ایک ثلث صدی میں جس ابتدائی دور سے گزری ہے اب وہ اس کی تاریخ کا ایک حصہ بن چکا ہے اور اس کے اثرات کو مختلف شعبہ ہائے زندگی میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔

بایں ہمہ اس دور میں اُردو تحقیق نے نمایاں حیثیت سے قدم آگے بڑھایا ہے۔ تحقیقی تجزیوں کے علاوہ ایسی تصانیف بھی سامنے آئی ہیں، جس میں تحقیق کے آداب اور اعلا معیار پیش نظر رہے ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ خود تنقید میں تحقیق کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا۔ اس ضمن میں بہت سے کام یونی ورسٹیوں میں ہوئے۔

قاضی عبدالودود، ڈاکٹر نذیر احمد، عبدالرزاق قریشی، اور ڈاکٹر خلیق انجم وغیرہ نے اصولیات تحقیق کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے نئے لکھنے والوں کے لیے تحقیقی کارکردگی کی نئی اساس اور علمی بنیاد قائم ہوئی۔ رشید حسن خاں نے تحقیق کے آداب اور اس کے ضابطوں کے بارے میں جو متعدد مضامین سُپرد قلم کیے ان میں معتبر غیر معتبر اور مشکوک جوابوں کی بحث اُٹھا کر اُردو تحقیق کے اصولیاتی ادب میں ایک نئے فکر خیز باب کا اضافہ کیا ہے۔

(اظہار ر 5 (پانچوی کتاب جنوری 1984، ممبئی) ناشرین باقر مہدی اور یعقوب راہی، صفحہ 64 تا 77)

☆۔ کتاب نما، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، اگست 1990، صفحہ 65 تا 72)

☆۔ یہ مضمون کتاب نما کے خصوصی شمارے ''رشید حسن خاں حیات وادبی خدمات'' اشاعت 2002، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، مرتب اطہر فاروقی، صفحہ 85 تا 91 تک شائع ہوا۔

☆۔ یہ مضمون قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان کے ماہ نامہ رسالہ ''اُردو دنیا'' اپریل 2006 کے صفحہ 31 تا 34 تک شائع ہوا۔

☆۔ یہ مضمون ''رشید حسن خاں کچھ یادیں کچھ باتیں'' اشاعت 2008، مرتبین ڈاکٹر محمد آفتاب اشرف، جاوید رحمانی میں صفحہ 154 تا 163 تک شائع ہوا۔

○○○

پروفیسر مجاور حسین رضوی

آزاد اور بے باک محقق

(لکھتا تھا وہی بات سمجھتا تھا جسے حق)

رشید حسن خاں مرحوم سے اُستادی ڈاکٹر سیّد محمد عقیل نے تعارف کرایا۔ اسی تعارف میں انھوں نے مجھ سے شفقت آمیز برہمی کے انداز میں فرمایا۔ ''یہ داستان پر اتھارٹی ہیں اور آپ طلسم ہوشربا کو کیوں نہیں مرتب کر کے انھیں دیتے۔''

میں نے نیاز مندانہ سر جھکا یا۔ یہ تو معلوم ہی ہو چکا تھا کہ خاں صاحب داستانوں سے دل چسپی رکھتے ہیں۔ اس لیے مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ حیدر آباد میں پروفیسر گیان چند نے ان کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ خصوصیت سے مالک رام کے سلسلے میں رشید حسن خاں کے استدراک کا ذکر کیا اور یہ بتایا کہ وہ بے لاگ محقق ہیں اور ان کے تبصرے کی وجہ سے ''علی گڑھ تاریخ ادب اُردو'' اشاعت کے بعد واپس لے لی گئی۔ گیان چند کو ''مالک رام بہ حیثیت ماہر غالبیات'' جیسا مضمون لکھنا پڑا، جو ان کے مجموعہ ذکر و فکر میں داخل ہے۔

1995 میں جب لکھنؤ آیا تو باغ و بہار، پر تبصرہ لکھنا پڑا۔ باغ و بہار کا یہ اڈیشن رشید حسن خاں صاحب نے مرتب کیا تھا۔ تبھی یہ معلوم ہوا کہ وہ فسانۂ عجائب بھی مرتب کر چکے ہیں۔ متون کی تحقیق کے سلسلے میں ان کی بہت سی کتابیں پہلے بھی نظر سے گزر چکی تھیں اور انھیں کے ایک مضمون سے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ میرؔ صاحب کا یہ شعر نہ صرف یہ کہ لوگ غلط پڑھتے تھے بل کہ محمد حسین آزاد اور مولوی عبدالحق نے بھی غلط لکھا ہے۔ شعر پڑھا جاتا تھا۔

سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

خاں صاحب نے لکھا تھا شعر کا صحیح متن یوں ہے۔

سرہانے میرؔ کے کوئی نہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

یہ سوداؔ کا شعر ہے۔

گُل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اسے خانہ بر اندازِ چمن کچھ تو اِدھر بھی

اس کا حقیقی متن خاں صاحب نے بتایا:

گُل پھینکے ہے عالم کی طرف بل کہ ثمر بھی

اے خانہ بر اندازِ چمن کچھ تو اِدھر بھی

اس طرح بہت سارے اشعار کے متون کی تصحیح ان کی وجہ سے ہوئی اور جب دیوان یا کلیات دیکھا گیا تو اپنے جہل کے اعتراف کے ساتھ خاں صاحب کی ''اصلاحِ عوام'' سے بے نیازی کا بھی معترف ہونا پڑا۔ کہیں کہیں ان سے اختلاف کی بھی گنجایش پیدا ہوئی۔ مثلاً انھوں نے پوری بحث کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ ۔

شاہ است حسین بادشاہ است حسین
دین است حسین دیں پناہ است حسین
سر داد نہ داد دست در دست یزید
حقّا کہ بنائے لا الٰہ است حسین

یہ خواجہ اجمیر کی رُباعی نہیں ہے۔ اس لیے کہ ان کا کوئی مجموعۂ کلام نہیں ہے۔ معین واعظ صاحب شاعر ضرور تھے مگر یہ چار مصرعے اُن کے بھی نہیں ہیں۔ انھوں نے کہا کہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ رُباعی درگاہ شریف میں لکھی ہوئی ہے اس لیے حضرت خواجہ کی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ استدلال بے معنی ہے۔ مزار پر جو چیز لکھی ہوئی ہے وہ حضرت خواجہ کے وصال کے بعد لکھی گئی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ تین پہلو اور ہیں ان پر غور کریں:

1۔ یہ ممکن ہے کہ کسی مجموعہ کلام نہ ہو اور اس نے از راہِ عقیدت واردات صرف ایک شعر کہا ہو، سُنایا ہو، یا رُباعی کہی ہو۔

2۔ یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت خواجہ نے اس طرح کی کوئی وصیت کی ہو کہ یہ مصرعے درگاہ شریف پر درج کیے جائیں۔

3۔ جب تک یہ تحقیق نہ ہو جائے کہ یہ مصرعے کسی دوسرے شاعر کے ہیں، روایات کے تواتر اور تسلسل کی بنا پر اسے حضرت خواجہ کا ہی تسلیم کرنا چاہیے۔

وہ میری دلیل سے متفق نہیں ہوئے۔ لیکن ان کا سب سے بڑا وصف یہ تھا کہ وہ ادبی مسائل میں اختلاف رائے کو بڑی خندہ پیشانی سے سنتے ضرور تھے اور تحقیق میں یہ بہت ضروری ہے۔ ان کے پاس وہ صبر و تحمل تھا جو ادبی اختلاف کو صرف زاویہ نظر سمجھتا تھا، نبرد آزمائی نہیں۔

انھوں نے مضامین بھی لکھے ہیں، اُردو املا پر بھی بڑی ضخیم کتاب لکھی ہے (جس سے راقم الحروف کو بعض جگہوں پر شدید اختلاف ہے) ادبی معرکہ آرائیاں بھی کیں ہیں۔ جن کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے۔ لیکن ادبی تاریخ انھیں بہ حیثیت مرتب متن یاد رکھے گی۔ انھوں نے تدوین متن کے اعلاترین نمونے پیش کیے ہیں۔ ان میں باغ و بہار، فسانۂ عجائب اور گلزارِ نسیم مثالی حیثیت رکھتی ہیں۔ مثنویاتِ شوق بھی انھوں نے مرتب کی ہے۔ 'لکھنؤ کی تہذیب کے بارے میں ان کی معلومات بہت وسیع نہ تھیں اس کے باوجود انھوں نے ایک کتاب نیّر مسعود کے نام معنون کی تھی اور ان کی فکر کا محور 'لکھنؤ کی تہذیب کی عیاشیاں'' تھیں۔ یہ درست نہ تھا لکھنؤ کے شعری کارناموں میں مرزا شوقؔ اور قلقؔ کی مثنویاں ہی نہ تھیں، ضمیرؔ اور انیسؔ و دبیرؔ کے مراثی بھی تھے اور امراؤ جان اداؔ ہی نہ تھی بل کہ خاندان اجتہاد اور علما فرنگی محل کی علمی نگارشات بھی تھیں، اس لیے ان سے اختلاف کیا گیا اور نیّر مسعود ہی نے بے حد علمی مضمون لکھا۔ رشید حسن خاں صاحب نے اپنی تحریر پر اپنی غلطی تو نہیں تسلیم کی لیکن نجی گفتگو میں یہ ضرور فرمایا کہ بہت سارے گوشوں پر ان کی نظر نہ تھی۔ اور یہیں سے ان کی عظمت کا احساس ہوتا ہے۔ اس لیے کہ جب علم کی دستار میں شہرت کے موتی ٹانک دیے جاتے ہیں تو پیشانی سے غرور کا پسینہ ٹپکنے لگتا ہے اور اس وقت سب ممکن ہوتا ہے لیکن وسعت قلب ممکن نہیں ہوتی۔ مگر رشید حسن خاں میں وسعتِ قلب تھا، انکسار بھی تھا اور وہ علمی خاکساری بھی جو اہلِ علم کا لازمہ ہوتی ہے۔ چناں چہ مجھے اپنی کتابیں بھیجتے تھے۔ ایک پر لکھا تھا:

''یہی بساط میں ہم خاکسار رکھتے ہیں''

اس وسعتِ قلب کا مظاہرہ اس وقت ہوتا تھا جب وہ کسی معمولی سے نکتہ کو بھی اپنے سے بہت کم عمر افراد سے دریافت کرنے میں کوئی عار نہیں محسوس کرتے تھے اور دریافت کرنے کے ساتھ وہ اس کا اعلان و اعتراف کرتے تھے۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ عزیزی امجد حسین سلمہ کی صحافتی شخصیت سے بہت متاثر تھے اور بڑا خیال و لحاظ رکھتے تھے چناں چہ عربی کے بعض مقولات کے سلسلے میں انھوں نے عزیزی (اب پروفیسر) ظفر احمد صدیقی سے دریافت بھی کیا اور ان کی رائے کے استناد کو تسلیم بھی کیا اور اس کا اعلان بھی کیا۔

ان میں حسِ مزاح بدرجۂ اتم تھی۔ جب ان کو مولانا آزاد ادبی ایوارڈ ملا تو میں نے عزیز محترم رباب رشیدی کی معرفت دعوت کا مطالبہ کیا، کچھ دنوں تک جواب نہیں ملا۔ میں نے خط لکھا کہ اگر اندر معیاد پندرہ دن دعوت کی منظوری نہ آئی تو عدالت مجاز میں کارروائی کی جائے گی، اور آپ مفت میں زیر بار ہرجہ و خرچہ ہوں گے۔ فوراً جواب ملا: دعوت میں آپ کیا کھانا پسند کریں گے۔ میں نے برجستہ شہزادی بصرہ کے یہاں دعوت میں کھانے کے نام گنا دیئے۔ یہ اہتمام کیا کہ ڈونگے کہ بجائے مشقاب کا لفظ استعمال کیا۔ شب دیگ اور دم پخت پر زیادہ زور دیا۔ خوب ہنسے، کہنے لگے'' آپ کو شاہ جہاں پور آنا ہوگا۔ باورچی بھی ساتھ لیتے آیئے گا'' ساری گفتگو فون پر ہو رہی تھی۔

ان کے مزاج میں شریفانہ بانک پن تھا۔ وہ کسی سے نہ دبتے تھے، نہ مرعوب ہوتے تھے۔ لیکن اگر کبھی کسی نے ان کے ساتھ ذرا سا حُسنِ سلوک کیا ہوگا وہ نہ صرف اس کو یاد رکھتے تھے بل کہ اس کا تذکرہ بھی کرتے رہتے تھے۔ ایک بار اچانک بیمار ہو گئے۔ عزیز محترم پروفیسر جعفر رضا نے ان کی خبر گیری کی اور تیمارداری کی اور ہر طرح خیال رکھا۔ علی گڑھ میں کچھ لوگوں کے درمیان جعفر رضا کی بُرائی بیان کی جا رہی تھی۔ خاں صاحب نے فوراً ٹوک دیا۔ پہلے تو انھوں نے غیبت کے سلسلے میں سخت کلمات کہے، پھر جعفر رضا کے حُسنِ اخلاق کی تعریف کرتے ہوئے ان کی تیمارداری کا واقعہ سُنایا۔

وہ دلّی یونی ورسٹی سے وابستہ رہے۔ ان کی کتابیں پڑھ کر نہ جانے کتنے ایم.اے، پی.ایچ.ڈی ہوئے، لکچرر پروفیسر ہوئے مگر خاں صاحب نے زندگی کے کسی مرحلے پر نہ عہدے کی خواہش کی نہ منصب کی تمنا۔ ان کی دنیا تحقیق تھی۔ حالاں کہ وہ بڑی خوب صورت نثر لکھنے پر قادر تھے اور لکھتے بھی تھے مگر تحقیق کے لیے وہ قاضی عبدالودود کی ریاضی نما زبان کے قائل تھے۔ لیکن وہ مولانا امتیاز علی عرشی کو تحقیق کا پیشوا سمجھتے تھے اور خود کو انھیں کا مقلد بتاتے تھے، قاضی صاحب کا نہیں۔

میں نے ان سے بہت سارے دکنی متون کی تدوین کی گزارش کی تھی۔ کچھ دکنی محققین کے سلسلے میں اپنے معروضات بھی رکھے تھے۔ لیکن وقت اور حالات نے انھیں موقع نہیں دیا ان کا خیال تھا کہ دکنی متون کی تدوین کے لیے جتنا دکنی کے بارے میں علم درکار ہے وہ ان کے پاس نہیں ہے۔ میں نے تحقیق کے سلسلے میں اکثر کئی محققین کا نام لیا۔ لیکن انھوں نے بڑی صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے ان پر

استدراک کیا اور ان کے تسامحات کی نشان دہی کی۔ وہ کہتے تھے کہ سیّد صاحب آپ مذہبی آدمی ہیں۔ سچ سب سے بڑی طاقت ہے۔ مصلحت اندیشی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ آپ سچ بولیں یا نہ بولیں، لیکن ہمیشہ سچ لکھیں۔ اس لیے کہ سچ سے دل کا خوف جاتا رہتا ہے۔

اور اس میں شک نہیں کہ ان سے اختلاف کیا جا سکتا تھا اور اختلاف کیا گیا مگر اُن کی ادبی نیت پر کبھی شک نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اپنی دانست میں جن حقائق تک پہنچتے تھے انھیں بلا کم و کاست پیش کرتے تھے۔ وہ حقیقی معنوں میں مردِ حق آگاہ تھے۔ مذہبی رسوم کے پابند نہ تھے۔ اپنے مزاج کی وجہ سے میں نے کبھی ان کے عقائد کے بارے میں گفتگو نہیں کی۔ لیکن ان کا ایک عقیدہ مجھے معلوم تھا، پوری ادبی دنیا کو معلوم تھا اور وہ عقیدہ تھا:

''سچ لکھو''

(ماہ نامہ، نیا دور، لکھنؤ، جلد 62، نمبر 9، دسمبر 2007، صفحہ 5 تا 7)

○○○

پروفیسر رفیع الدین ہاشمی

رشید حسن خاں: تحقیق و تدوین کا مردِ میداں

کیسا اندھیرا ہے۔ا

ایک برس کے وقفے سے دُنیائے تحقیق و تدوین کے آفتاب و ماہتاب دونوں ہی غروب ہو گئے۔ مشفق خواجہ (م:21 فروری 2005) اور رشید حسن خاں (م:26 فروری 2006) آگے پیچھے دونوں ہی چل بسے اور اُردو دُنیا کو سوگوار کر گئے۔ خاں صاحب اپنی بے باکی، سخت گیری اور کڑے مزاج کی وجہ سے جلال کا ایک نمونہ تھے تو خواجہ صاحب اپنی دل نواز شخصیت کے سبب پیکرِ جمال تھے۔

آفتاب و ماہتاب دونوں غروب ہو گئے۔ جہانِ اُردو اور جہانِ تحقیق میں اُن سے اُجالا تھا، روشنی تھی۔ اب دونوں جہانِ تاریکی میں ڈوب گئے۔..

کیسا اندھیرا ہے۔

ایسے بے دل محقق و مدون، ماہر لغت و تاریخ ادب، ادیب، نقاد اور اُردو زبان کے ایسے مخلص خادم اب کہاں سے آئیں گے، ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملیں گے:

ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں
ملنے کے نہیں، نایاب ہیں ہم

مشفق خواجہ اور رشید حسن خاں ایسے یگانۂ روزگار چل بسے، جب اس محرومی کا خیال آتا ہے تو بقول حالؔی:

غم سے بھرتا نہیں دلِ ناشاد
کس سے خالی ہوا جہان آباد

جناب رشید حسن خاں شاہ جہان آباد کو تو بہت پہلے خالی کر گئے تھے اور 1996 سے اپنے وطن شاہ جہاں پور میں مقیم تھے، اب 26 فروری 2006 کو انھوں نے یہاں سے بھی رختِ سفر باندھ لیا۔ سو، کیا شاہ جہان آباد کیا شاہ جہاں پور دونوں ہی خالی ہو گئے۔ رہے نام اللہ کا۔

(2)

رشید حسن خاں کی تاریخِ ولادت 30 جنوری 1930 بتائی جاتی ہے، مگر جیسا کہ انھوں نے مسرت انیس کے نام ایک قلمی یادداشت میں وضاحت کی ہے: ''صحیح سالِ ولادت 1925 ہے، دسمبر کا مہینا تھا، تاریخ کا علم نہیں'' (''کچھ اپنے بارے میں'' شعبۂ اُردو کا تحقیقی مجلّہ 'بازیافت' شمارہ: ایک، 2002)۔ ان کے والد امیر حسن خاں پولس کی ملازمت میں تھے، مگر کٹّر قوم پرست تھے۔ تحریک عدم تعاون

آثار، مسرت انیس۔ص 4)۔

امیرحسن خاں طبیعت کے بہت سخت تھے۔''دل کے بہت صاف اور سخی تھے مگر نرمی کا اظہار کم ہوتا تھا.....وہ کٹر دیو بند کے مخالف تھے''۔جب رشید حسن خاں نے قرآن پاک ختم کیا تو ان کے استاد نے اپنا باترجمہ ذاتی نسخہ بطورِ انعام انھیں دیا۔ یہ مولانا اشرف علی تھانوی کا ترجمۂ قرآن تھا خوشی خوشی گھر آ کر بتایا کہ مولوی صاحب نے یہ قرآن شریف انعام میں دیا ہے۔امیر حسن خاں نے جو کھول کر دیکھا تو بقول رشید حسن خاں:

''چہرے کا رنگ بدل گیا، بل کہ بگڑ گیا۔انتہائے غضب میں کہنے لگے کہ اس وہابڑے کا ترجمہ میرے گھر میں بھیجا گیا ہے''۔مگر کیا کرتے ،قرآن شریف کی بے ادبی تو کر نہیں سکتے تھے'' کچھ دیر بل کھاتے اور بڑبڑاتے رہے، پھر والدہ کو آواز دی: قینچی لاؤ۔وہ لے آئیں۔میری آنکھوں کے سامنے سارے حاشیے کاٹ کر چولھے میں جلا دیے اور اس پر بل کھاتے رہے کہ ترجمہ تو باقی رہ گیا، اس میں کچھ کر نہیں سکتے تھے۔''

(مجلّہ مذکورہ،ص 3)

امیر حسن خاں سرکاری اسکولوں کی تعلیم کے خلاف تھے کیوں کہ وہاں انگریزی پڑھائی جاتی تھی اس لیے رشید حسن خاں کو دینی تعلیم کے لیے شاہ جہاں پور کے مدرسہ بحرالعلوم میں داخل کرا دیا گیا۔وہ پانچ سال تک (1934 تا 1939) یہاں زیرِ تعلیم رہے، درسِ نظامی کی تکمیل نہ کر سکے کیوں کہ گھر کے مالی حالات اچھے نہیں تھے۔مجبوراً ایک مزدور کی حیثیت سے آرڈیننس کلوذنگ فیکٹری میں بھرتی ہو گئے۔فیکٹری کے مزدور، صاحبانِ اختیار کے ظلم و زیادتی اور استحصال کا شکار تھے۔خاں صاحب اور اُن کے چند ساتھیوں نے مل کر چھپ چھپا کر ٹریڈ یونین قائم کی۔آرڈیننس فیکٹری میں ایسی سرگرمیوں کی قطعی ممانعت ہوتی ہے، اس لیے یہ بڑی جرأت کی بات تھی۔اسی اثنا میں یوپی کے بعض کمیونسٹ لیڈر وہاں آنے لگے۔خاں صاحب کہتے ہیں: میں نے دیکھا کہ ان لیڈروں میں دوغلا پن ہے۔ان کا نعرہ یہ تھا کہ ''دُنیا کے مزدوروں ایک ہو جاؤ'' مجھے یہ کھوکھلا نعرہ اور محض ایک سیاسی ہتھکنڈہ محسوس ہوتا تھا۔کیوں کہ ہر ملک بل کہ ہر کارخانے کے مزدوروں کے مسائل یکساں نہیں، پھر وہ سب ایک کیسے ہو سکتے ہیں؟ بہر حال ان لڈروں کے طرزِ عمل سے خاں صاحب بہت بد دل ہوئے۔شاید اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ یہ سب بقول خاں صاحب: اَپر کلاس سے آئے تھے۔ان کی توجہ مزدوروں کے مسائل حل کرنے سے زیادہ پارٹی کی آئیڈیالوجی پھیلانے پر ہوتی تھی۔رشید حسن خاں یونین کے جوائنٹ سکریٹری تھے۔یونین نے 1945 کے آخر میں فیکٹری میں ہڑتال کرائی جو''کسی بھی آرڈیننس فیکٹری میں پہلی باضابطہ اسٹرائک تھی''۔یہ ہڑتال مسلسل 33 روز چلی۔رشید حسن خاں ہڑتال کرانے والوں میں پیش پیش تھے، اس لیے انھیں اس پاداش میں ملازمت سے نکال دیا گیا۔یہ 1946 کی بات ہے۔

تین چار برس متفرق ملازمتوں میں گزرے۔ایک چکّی پر منشی رہے، پھر ایک زمین دار کے کارندے کے طور پر دیہی زندگی کا مشاہدہ کرنے کا موقع ملا۔راشن کی ایک دکان پر منشی گیری کی (بہ حوالہ مسرت انیس،ص 7)۔اسی زمانے میں انھوں نے 'مولوی' اور 'دبیر کامل' کے امتحانات پاس کیے۔1949 میں مدرسہ فیضِ عام مدرس ہو گئے مگر یہ سلسلہ زیادہ دنوں نہیں چل سکا کیوں کہ مہتمم نے کہا: آپ کو ڈاڑھی رکھنی پڑے گی۔خاں صاحب نے 'رشوت کی ڈاڑھی' رکھنے سے انکار کر دیا۔اسی اثنا میں انھیں اسلامیہ ہائر سکنڈری اسکول میں اُردو اور فارسی ٹیچر کی ملازمت مل گئی۔1959 میں وہ دہلی چلے گئے۔جناب رفعت سروش کا بیان ہے کہ ابتدا میں وہ دہلی یونی ورسٹی کی لائبریری میں ملازم ہوئے (اُردو بک ریویو، جنوری، فروری 2006)۔بعد ازاں کسی وقت یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو سے وابستہ ہو گئے۔تیس برس بعد 31 دسمبر 1989 کو یہاں سے سبک دوش ہوئے۔

(3)

رشید حسن خاں ایک خوش گفتار اور نفیس انسان تھے۔اصول پرست، صاف گو، اپنے مقاصد اور اہدافِ علمی میں یکسو، ہر طرح کی مصلحتوں، بے ڈھنگ پن اور کج روی سے بے زار۔ان کی باتیں ہمیشہ کھری کھری اور تحریر واضح اور دوٹوک ہوتی۔خشک سے خشک موضوع اور مسئلے کو بھی ایسے سادہ مگر علمی انداز و انہماک سے واضح کرتے کہ زیرِ بحث نکتہ سامعین کے ذہن نشیں ہو جاتا، طلبا و طالبات تو خصوصاً ان کے شگفتہ لہجے سے گرویدہ ہو جاتے۔وہ دو تین بار پاکستان آئے تھے۔یہاں ادیبوں، شاعروں، اساتذہ، طلبا اور صحافیوں سے ان کی ملاقاتیں ہوئیں، بعض اخبارات میں ان کے مصاحبے (انٹرویو) چھپے۔شعبۂ اُردو اورینٹل کالج نے ان کے لکچر کا اہتمام کیا۔وہ جو اُن کی سخت گیری، خشک مزاجی اور 'پٹھانیت' کا شہرہ تھا، غلط ثابت ہوا اور خاں صاحب لاہور کے علمی، تعلیمی اور ادبی حلقوں میں بہت اچھا مثبت اور خوش گوار تاثر چھوڑ کر گئے۔ہر ایک کو اُن کا مداح پایا۔

خاں صاحب ایک کامیاب اُستاد اور مقرر بھی تھے۔باقاعدہ درس و تدریس تو انھوں نے صرف اسکول کے زمانۂ مدرسی میں کی مگر بعد ازاں انھیں بیسیوں سمیناروں میں لکچر دینے اور ادبی جلسوں میں تقریر کرنے کا موقع ملا، اسّی کی دہائی میں وہ بمبئی یونی ورسٹی میں لکچر دینے گئے۔موضوع گفتگو املا اور تدوین کے مسائل سے متعلق تھا، بہت خشک اور ادق موضوع ہے لیکن خاں صاحب مدتوں سے ان مسائل کا مطالعہ کرتے اور ان پر چلے آ رہے تھے۔وہ ان موضوعات پر گفتگو کی ایسی دسترس رکھتے تھے کہ سامعین کو اُن کا پہلا لکچر ہی بہت شگفتہ، دل چسپ اور دل کش محسوس ہوا۔نتیجہ یہ کہ باقی لکچروں میں بھی ہال طلبا و طالبات سے بھرا ہوا تھا۔

ان کی شخصیت کا ایک دل چسپ پہلو یہ ہے کہ کھیلوں سے بہت رغبت رکھتے تھے خصوصاً ہاکی سے۔دہلی میں جب کبھی ہاکی کا کوئی اہم میچ ہوتا تو وہ بالالتزام اسٹیڈیم جا کر میچ دیکھتے اور اگر نہ جا سکتے تو ٹیلی ویژن پر دیکھتے۔فٹ بال، والی بال اور باسکٹ بال بھی ان کے پسندیدہ کھیل تھے۔کہتے تھے کہ کھیل بہت انہماک سے دیکھتا ہوں مگر اس سے ''میرے تحقیقی کاموں میں ذرا بھی اثر نہیں پڑتا''۔ان کی طبیعت کا یہ رُخ غالباً علمی اشغال میں غیر معمولی انہماک، دیدہ ریزی اور ادق لغوی و لسانی مباحث میں مصروف رہنے کا نتیجہ تھا۔اور طبیعت کو یک رُخے پن سے بچانے کی ایک کوشش بھی، جو بہر حال مستحسن ہے۔

رشید حسن خاں کسی بڑے عالم کی طرح جاہ طلبی، نام و نمود اور شہرت پسندی سے ہمیشہ گریزاں رہے۔آٹھ، نو سال پہلے میں نے ایم۔اے اُردو کی طالبہ مسرت انیس سے مقالہ لکھوانے کا ڈول ڈالا۔اس ضرورت سے شخصی زندگی کے بارے میں چند سوالات لکھ کر خاں صاحب کو بھیجے گئے۔پہلے تو انھوں نے ان کے جوابات دینے سے انکار کر دیا، پھر میرے کہنے سننے اور عرض معروض کرنے سے کچھ پسیجے اور سوالات کے مطابق اپنے حالات پر مشتمل چند صفحات لکھ بھیجے جنھیں میں نے ''کچھ اپنے بارے میں'' کے عنوان سے ایک مضمون کی شکل دے کر شعبۂ اُردو، اورینٹل کالج کے مجلّے 'بازیافت' (شمارۂ

اوّل:2002)میں شائع کرادیا تھا۔ یہ ایک طرح سے رشید حسن خاں کی مختصر آپ بیتی اور ان کی شخصیت کی تفہیم کے لیے ایک کلیدی تحریر ہے۔

بلاشبہ رشید حسن خاں ایک یگانۂ روزگار شخصیت کے مالک تھے۔ بقول خلیق انجم: حق گوئی اور بے باکی جسے 'آئینِ جواں مرداں کہا گیا ہے، وہ مرحوم کی فطرت کا جزو تھی۔ اور یہ ان کی شخصیت کا سب سے تابناک وصف تھا۔ بددیانتی ٹریڈ یونین میں ہو یا ادب میں، اُن کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ وہ ایک کھرے اور صاف گو انسان تھے۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے: ''ہم میں سے کوئی بھوکوں نہیں مرتا ہوتا، زندگی گزارنے کے لیے مناسب آمدنی موجود ہے لیکن ہوس نے آنکھوں کو خیرہ کر رکھا ہے'' (تلاش و تعبیر، ص10)۔ انھوں نے کسی بھی طرح کی ہوس اور شہرت سے اپنا دامن بچائے رکھا اور اپنے قلم اور عملی رویوں کے ذریعے ان فتنوں کے خلاف جہاد بھی کیا۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ:

''آدمی اگر ایمان داری کے ساتھ پڑھنے لکھنے میں مصروف رہے تو اس کے پاس اتنا وقت ہی نہیں بچ سکتا کہ وہ ہوس کا کاروبار چلا سکے'' (تلاش و تعبیر۔ص17)۔

رشید حسن خاں کے بارے میں پروفیسر شمیم حنفی نے کہا ہے کہ انھیں سچ، اپنی عافیت سے زیادہ عزیز تھا، ایک بار کسی مذاکرے میں تدریس کے مسائل زیرِ بحث تھے۔ متعدد نامور اور جلیل القدر اساتذہ موجود اور بحث میں شریک تھے۔ دو تین مقرروں کے بعد خاں صاحب نے مائک سنبھالا۔ متن کی قرأت کے سوال پر انھوں نے دوٹوک انداز میں کہا ''ابھی جو تقریریں ہوئی اور مقالے پڑھے گئے، ان میں تلفظ کی کم سے کم بیس غلطیاں میں نے نوٹ کی ہیں، جب حال یہ ہے تو ہم کیا پڑھائیں گے اور طلبا کیا سکھائیں گے''۔ ایک اور موقع پر انھوں نے لکھا: ''آسان پسندی، علم و تحقیق کی سب سے بڑی دشمن ہے، چناں چہ گذشتہ دس پندرہ سال کے دوران یونی ورسٹیوں میں جو مقالے شائع ہوئے ہیں، اگر وہ پچاس ہیں تو شاید ایک دو اس قابل ہوں کہ تحقیق کی تعریف ان پر درست آتی ہو''۔ شاید خاں صاحب کی یہی صاف گوئی تھی کہ بھارت میں، جہاں تیسرے درجے کے شاعروں اور نقادوں پر بہ کثرت ایم فل اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے لکھے لکھوائے گئے، کسی یونی ورسٹی میں رشید حسن خاں پر ایک مقالہ بھی نہیں لکھا گیا۔ شاید انھیں حق گوئی کی سزا دی گئی تھی، مگر انھیں اِن باتوں کی پروا کب تھی۔

(4)

ان کے علمی اشغال اور تحقیق و تصنیف کا اصل زمانہ دہلی یونی ورسٹی کا ہے۔ ''یہاں ان کی شہرت اس مضمون سے ہوئی جو انھوں نے فیض احمد فیضؔ کی شاعری پر لکھا تھا اور اس مشہور زمانہ شاعر کی زبان و بیان کی غلطیوں پر گرفت کی تھی۔ یہ مضمون انھوں نے انجمن تعمیر اُردو کے جلسے میں پڑھا تھا اور اس کا بہت چرچا ہوا۔ فیض ٹھہرے ترقی پسندوں کے مثالی شاعر۔ ان کی غلطیوں کو دوٹوک انداز میں طشت از بام کرنا بڑے دل گُردے کا کام تھا''۔ یہ مضمون ان کے مجموعۂ مضامین 'تلاش و تعبیر' میں شامل ہے۔

ان کا بیش تر تحقیقی و تصنیفی اور تدوینی کام قیامِ دہلی ہی کے زمانے کا ہے۔ 'فسانۂ عجائب'، 'باغ و بہار'، 'مثنوی گلزارِ نسیم'، 'سحر البیان'، 'مثنویاتِ شوق' اور 'زٹل نامہ' ان کے مخصوص اسلوبِ تدوین کے مثالی نمونے ہیں۔ اسی طرح 'کلاسیکی ادب کی فرہنگ'، 'مصطلحاتِ ٹھگی' اور زیرِ طبع 'گنجینۂ معنی کا طلسم' لغت اور زبان پر ان کی ماہرانہ دسترس کا شاہکار ہیں۔ 'اُردو املا' اپنے موضوع پر ایک سیر حاصل اور بے مثل تحقیق ہے۔ 'زبان اور قواعد' میں صحتِ زبان سے بحث کی گئی ہے۔ انھوں نے طلبا و طالبات کی رہ نمائی کے لیے بھی تین مختصر کتابیں تیار کی تھیں۔ (اُردو کیسے لکھیں'، 'انشا اور تلفظ' اور 'عبارت کیسے لکھیں')۔ ایک زمانے میں مکتبہ جامعہ نے حکومتِ جموں و کشمیر کے تعاون سے قدیم اور کلاسیکی کتابوں کو صحتِ متن کے ساتھ مدون کرا کے شائع کرنے کا ڈول ڈالا۔ اس سلسلے کو 'معیاری ادب' کا نام دیا گیا۔ اس کی مجلسِ ادارت میں رشید حسن خاں بھی شامل تھے۔ سب سے پہلے انھوں نے خود 'باغ و بہار' مرتب کی (1964) جو بقول شخصے ''خاں صاحب کے وفرِ شوق کی پہلی انگڑائی تھی'' (رشید حسن خاں: شخصیت اور ادبی خدمات مرتب اطہر فاروقی، ص134)۔ بعدہ انھوں نے اس سلسلے کی مزید بارہ کلاسیکی کتابیں مدون کر کے شائع کیں اگرچہ یہ طلبا کے لیے تھیں، اس کے باوجود انھوں نے بعض کتابیں (سوداؔ اور ناسخؔ کا منتخب کلام) صحتِ متن اور تدوین کے اونچے معیار اور اعلا اصولوں کے مطابق مرتّب کیں۔

دراصل خاں صاحب معیار اور اصولوں کے سلسلے میں کسی رو رعایت یا سمجھوتے کے قائل نہ تھے۔ علی گڑھ یونی ورسٹی کی تاریخِ ادبِ اُردو (اوّل) پر ان کے تبصرے کے نتیجے میں یونی ورسٹی نے مذکورہ جلد واپس لے لی اور پھر اس منصوبے کی بساط ہی لپیٹ دی گئی۔ دراصل ان کی علمی گرفت نے محققین کو محتاط بنا دیا تھا۔ اس تنبیہی رویے کے سبب ہی انتظار حسین نے انھیں 'تعمیری محقق' قرار دیا ہے۔ یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ رشید حسن خاں کے تنبیہی رویوں نے اُردو تحقیق و تدوین پر مثبت اثرات مرتب کیے اور اس سے ہمارا علمی معیار بلند ہوا ہے۔

رشید حسن خاں ایک بے بدل عالم اور محقق تھے، ان کی علمیت، ان کی ژرف نگہی اور اجتہادی بصیرت ان کی برسوں کی محنت و ریاضت، یکسوئی اور علمی انہماک و شغف کا نتیجہ تھا۔ تحقیق میں انھوں نے حافظ محمود شیرانی کو 'معلمِ اوّل' قرار دیا ہے تدوین میں وہ خود کو عرشی صاحب کا 'تلمیذ معنوی' سمجھتے تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ 'طبع حسرت نے اُٹھایا ہے ہر استاد سے فیض''۔ چناں چہ خاں صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے میں نے حافظ محمود خاں شیرانی، قاضی عبدالودود، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی تحریروں سے تحقیق کے آداب سیکھے، اسی لیے ان چاروں حضرات کو میں اپنا معنوی استاد مانتا ہوں ('بازیافت' شمارۂ مذکورہ، ص62)۔ رشید حسن خاں نے مذکورہ اساتذۂ تحقیق و تدوین کی روایات میں نہایت مفید اور وقیع اضافے کیے ہیں جو اُن کے عالمانہ اجتہاد کی مثال ہیں۔

خاں صاحب کی مرتبہ 'باغ و بہار' اور 'فسانۂ عجائب' کے بارے میں ڈاکٹر گیان چند جین نے لکھا ہے کہ: ''یہ ایسے مکمل و مثالی کام ہیں جن کی نظیر نہ ماضی میں ملتی ہے، نہ عرصے تک مستقبل میں ملنے کی اُمید ہے۔ یہ کتابیں تدوین کا ایسا بیش بہا خزینہ ہیں جن میں لامتناہی دولت چھپی ہوئی ہے۔ میرے نزدیک ایسی کتاب تیار کرنے کرنے کے لیے پندرہ بیس سال کا عرصہ درکار ہوگا۔ ان میں ہر کتاب کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے لیے ایک ایک سال کی مدت چاہیے ('کتاب نما'، شمارۂ مذکورہ، ص73) گیان چند جین نے خاں صاحب کو 'خدائے تدوین' کا لقب دیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے نزدیک رشید حسن خاں کی تدوینات ''آنے والی نسلوں کے لیے ایک نمونے کی حیثیت رکھتی ہیں'' ('ادبی تحقیق'، مجلس ترقی ادب لاہور، 1994 ص321)۔ میرا خیال ہے کہ تحقیقی تدوین کے کام آیندہ بھی ہوں گے، مگر اس معیار کی توقع کم ہی کی جاسکتی ہے۔ اس اعتبار سے ممکن ہے خاں صاحب ہی 'خاتم المدونین' ثابت ہوں۔

رشید حسن خاں نے تحقیق و تدوین کی عملی مثالوں کے ساتھ ان کے اصول و قواعد اور ضابطوں پر بھی قلم اُٹھایا ہے ('ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ')۔ ان کا کام نظری و عملی تحقیق میں تطابق کی ایک عمدہ مثال ہے۔ اس کے ساتھ وہ ایک شگفتہ قلم نقاد بھی تھے۔ 'تلاش و تعبیر' اور 'تفہیم' ان کی اعلا درجے کی تنقیدی بصیرت کی یادگار نمونے ہیں۔ ان مجموعوں میں یوں تو سارے ہی مضامین لائقِ مطالعہ ہیں لیکن 'دُہرا کردار' میں خاں صاحب نے بڑی سچے کی بات کہی ہے کہ ہمارا المیہ ہے کہ دُہرا کردار ہمارا رفیقِ مستقل ہے، لیکن مشکل یہ ہے کہ محقق ہو، نقاد ہو یا استاد؛ دُہرا کردار کسی کو بھی راس نہیں آسکتا۔ (تلاش و تعبیر،

ص10۔18)۔ایک بار اطہر فاروقی صاحب نے ان سے پوچھا کہ ہمارے ہاں علمی کام، اجتماعی سطح پر اور منصوبہ بندی کے ساتھ کیوں نہیں انجام پاتے؟ خاں صاحب کا جواب تھا: سب سے بڑی کمی اخلاقیاتِ تحقیق کی ہے جس کی ہر بڑے اور اچھے کام کے لیے بنیادی حیثیت ہوتی ہے۔ اوّل تو ہمارے پاس ایسے کام کرنے والے کم ہیں اور جو ہیں وہ دنیا کے دوسرے دھندوں میں اس قدر اُلجھے ہوئے ہیں ،ایسے لگے ہوئے ہیں کہ علمی کام جس یکسوئی، جس ڈوب جانے والے انداز کا مطالبہ کرتے ہیں، اس کی نوبت نہیں آپاتی۔ ہر آدمی بہت سی کمیٹیوں کا رُکن ہوتا ہے اور ممبر بننے اور ترقی کرنے میں لگا رہتا ہے ۔بہت سے سیمینار، بہت سی سلیکشن کمیٹیاں، بہت سے منصوبے بنانا ہوتے ہیں، اپنا گروپ تیار کرنا ہوتا ہے، اس کی ٹانگ کھینچنا ہوتا ہے، اُس کو آگے بڑھانا ہے۔ تو جب ذہن میں ہر وقت ایسے غیر علمی وغیر ایماندارانہ باتیں رہیں گی تو وہ کام کیسے عمل میں آسکتا ہے جس کے لیے ایمان داری اور یکسوئی شرطِ اوّل ہے۔'' خیال رہے کہ خاں صاحب کی باتیں ہوائی نہیں ہیں۔ انھوں نے ایمان داری اور یکسوئی کی شرائط سب سے پہلے خود اپنے اوپر عائد کیں۔ اچھی پُرسکون اور راحت بھری زندگی کسے عزیز نہیں، کون چاہتا ہے کہ وہ اپنے بچوں سے دور رہ کر ان ساری مسرتوں اور خوشیوں سے محروم رہے، جو ان کے درمیان رہتے ہوئے حاصل ہوتی ہیں، مگر رشید حسن خاں نے کم وبیش سینتیس (37) سال تک بن باس کاٹا اور دہلی میں اکیلے رہے۔ ایک بڑے مقصد کے لیے دُنیا سے کنارہ کشی اور ایثار و قربانی کا ایسا مظاہرہ کم ہی لوگوں نے کیا ہوگا۔

(5)

آخری زمانے میں انھوں نے 'امراؤ جان ادا' اور 'عبدالواسع ہانسوی کی 'غرائب اللغات' مرتّب کرنے کا عزم کر رکھا تھا۔ موخرالذکر پر تو کام شروع کر دیا تھا، 39 صفحات کا مسودہ تیار ہو گیا تھا مگر پھر یہ کام 'مستقلاً ملتوی کر دیا' (مکتوب 6 دسمبر 2005 بنام راقم)۔ البتہ حیاتِ مستعار کے آخری برس (2005 میں) انھوں نے ڈاکٹر خلیق انجم کی تحریک وتجویز پر 'کلیاتِ اقبال' اُردو کی تدوین کا پختہ عزم کر لیا تھا اور معاونت کے لیے خاں صاحب نے اس ناچیز کو شریکِ تدوین کیا تھا۔ ہم نے اس کام کا ایک نقشہ بنایا، طریق کار طے کیا۔ میں نے انھیں ضروری کتابیں، کلامِ اقبال کی بعض بیاضیں اور متفرق لوازمہ بھیجا۔ خاں صاحب کے ایک مداح اور نیاز مند جناب عبدالوہاب خاں سلیم ہر طرح سے ان کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے، مگر خرابیِ صحت کے سبب یہ کام شروع کرنے میں تاخیر ہوتی رہی۔ راقم کے نام ایک خط میں عیدالاضحیٰ کے بعد یہ کام بالفعل شروع کر دینے کا عزم ظاہر کیا تھا (ممکن ہے آغاز کر بھی دیا ہو)۔ وہ طویل عرصے سے متعدد عوارض کا شکار چلے آرہے تھے۔ ذیابطیس، عارضۂ قلب اور بے خوابی۔ ایک زمانے میں پھیپھڑوں کی خرابی میں بھی مبتلا رہے۔ 6 دسمبر 2005 کے ایک خط (بنام راقم الحروف) میں لکھا: ''سردی کا موسم مجھے راس نہیں آتا۔ اب پچھلے مہینے کے اواخر سے احوال یہ ہے کہ سر جھکا کر ذرا اوپر بھی نہیں بیٹھ سکتا، ریزش، چھینکیں اور آنکھوں سے پانی بہنے لگتا ہے لکھنا پڑھنا بند ہے''۔ اس کے باوجود عزم یہ تھا کہ ''میں اقبال والے کام کو مثالی کام کے طور پر مکمل کرنا چاہتا ہوں۔ اس میں دو سال تو لگ جائیں گے''۔ راقم خوش تھا کہ خاں صاحب جیسے محقق اور نقاد نے اقبالیات کی جانب اعتنا کیا ہے، اسے میں نے اقبالیات کی خوش قسمتی جانا، لیکن کیا خبر تھی کہ یہ خوشی عارضی ہوگی اور وہ اقبالیات تو ایک طرف، دُنیائے فانی ہی سے منہ موڑ کر، اُردو ادب خصوصاً دُنیائے تحقیق وتدوین اور اپنے مداحوں اور قدر دانوں کو سوگوار کر جائیں گے۔ خدا اُن کی مغفرت کرے اور اُن کی روح کو آسودہ رکھے، آمین۔

(ہفت روزہ ہماری زبان، انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، جلد: 65، شمارہ 33، 34، 35، 36، یکم تا 28 ستمبر 2006، صفحہ 36 اور 34)

(ماہ نامہ اخبارِ اُردو، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، پاکستان، جلد 22، شمارہ 5، مئی 2006، صفحہ 28 تا 31)

☆۔ ماہ نامہ اخبارِ اُردو میں یہ مضمون حذف واضافوں کے ساتھ ''رشید حسن خاں اُردو تحقیق کا رجُلِ رشید'' کے عنوان سے شائع ہوا۔

(ماہ نامہ کتاب نما، جلد 46، شمارہ 8، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، اگست 2006، صفحہ 47 تا 52)

☆، ماہ نامہ کتاب نما میں یہ مضمون ''رشید حسن خاں: اُردو تحقیق کا رجلِ رشید'' کے عنوان سے شائع ہوا۔

OOO

انتظار حسین

رشید حسن خاں: ایک تعمیری محقق

رشید حسن خاں کی تحقیق کا معاملہ کچھ غالبؔ کے قصیدے کا سا ہے۔ غالبؔ نے اپنے ایک خط میں اپنے قصیدے کی کیفیت یوں بیان کی ہے کہ جس کی شان میں قصیدہ کہہ دیا وہ نہ جیا۔ جس کی مدح میں ایک سے زیادہ قصیدے کہہ دیے وہ عدم سے بھی پرے پہنچا۔ رشید حسن خاں کی تحقیق کی شہرت بھی کچھ اسی قسم کی ہے، جس علمی تحقیقی منصوبے پر تبصرہ کرتے ہیں، ان کا بستر لپٹ جاتا ہے۔ علی گڑھ یونی ورسٹی کے زیرِ اہتمام پروفیسر آل احمد سرور کی نگرانی میں اُردو ادب کی تاریخ مرتب کرنے کا منصوبہ بنا جب پہلی جلد شائع ہوئی تو رشید حسن خاں نے اس پر تبصرہ کر ڈالا اور اپنے زورِ تحقیق سے اس میں اتنی غلطیاں دریافت کیں کہ وہ پورا کام ہی اہلِ علم کی نظروں سے گر گیا۔ یونی ورسٹی نے وہ جلدیں واپس لے لیں۔ بس پھر وہ منصوبہ ہی لپیٹ دیا گیا۔

ویسے تو انھوں نے جمیل جالبی کی 'تاریخِ ادبِ اُردو' کی پہلی جلد پر بھی زبردست تحقیقی حملہ کیا تھا مگر جمیل جالبی وار سہہ گئے البتہ ڈاکٹر ابواللیث کی نگرانی میں ترقی اُردو بورڈ کراچی کے زیرِ اہتمام لغت کی جو جلدیں شائع ہوئیں ان پر رشید حسن خاں کی تحقیق بھاری پڑی۔ سنا ہے کہ ان کے تبصرے کی روشنی میں بورڈ کے طریق کار کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔

کراچی میں یارانِ طریقت ان کے اس طریقۂ واردات پر تبصرہ کر رہے تھے، میں نے خاں صاحب سے کہا کہ آپ ایسا تحقیقی وار کیوں کرتے ہیں کہ اُس پر تخریبی تحقیق کا گمان ہونے لگتا ہے۔ خاں صاحب کہنے لگے کہ میرے خیال میں تو آج کل ہونے والے تحقیقی کاموں کی ایسی جانچ پرکھ بہت ضروری ہے۔

میں نے فوراً ان سے اتفاق کرلیا اور ٹکڑا لگایا کہ گرانٹ لینے والے ادارے جس طرح سے علمی منصوبے چلاتے ہیں ان پر ایسی تحقیق تعمیری تحقیق کی حیثیت رکھتی ہے۔

رشید حسن خاں کا کہنا یہ تھا کہ ان سے پہلے افراد ایسے کام انجام دیا کرتے تھے پچھلی لغات دیکھیے، ہر لغت اور تاریخ ادب ایک فردِ واحد کا کارنامہ ہے مگر اب ایسے کاموں کا دائرہ اتنا وسیع ہو گیا ہے کہ ہر کسی فرد کے لیے تنِ تنہا ایسا کام انجام دینا ممکن نہیں رہا۔ اب ایسے کاموں کے لیے بورڈ بنائے جاتے ہیں مگر ہمارے یہاں مل کر کام کرنے کا تجربہ ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکا ہے۔ ہمارے یہاں اہلِ علم مل کر کسی علمی منصوبے پر کام کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں کر سکے ہیں۔

پُرانی اُردو نثر کا ذکر آیا تو کہنے لگے کہ محمد حسن عسکری نے 'طلسم ہوش ربا' کا انتخاب کر کے بہت زیادتی کی ہے۔ میں نے پوچھا زیادتی کیسے ہو گئی۔ کہنے لگے 'طلسم ہوش ربا' کو تو کوئی پڑھتا نہیں۔ اس انتخاب کو پڑھ کر یار لوگ سمجھ لیتے ہیں کہ انھوں نے 'طلسم ہوش ربا' پڑھ لی اور پھر اس کتاب پر محاکمے کرتے ہیں۔

میں نے کہا کہ فکشن کے اس دھنوندل کاٹ کارنامے کو نہ پڑھنے کی ایک وجہ یہ بھی تو ہے کہ وہ دستیاب ہی نہیں ہے۔ ہمارے یہاں تو کوئی ناشر کوئی گرانٹ پانے والا ادارہ اس کارِ خیر کو انجام دینے کے لیے تیار نہیں ہے، آپ کے یہاں کیا صورت ہے؟

رشید حسن خاں نے بتایا کہ اس کتاب کو شائع کرنے کا ایک منصوبہ تو بنایا گیا ہے۔ میں نے کہا کہ دیکھیے رشید حسن خاں صاحب، تحقیق برحق، مگر کرنے والا کافر۔ وہ اس طرح سے کہ محقق حضرات تو ازن اور مدارج کے تو قائل ہی نہیں ہوتے۔ کوئی مخطوطہ ان کے ہاتھ پڑ جائے تو تحریر ادبی اعتبار سے وقیع نہ ہو مگر محقق اس پر اس شان سے بحث کرتا ہے کہ مجموعۂ کلام ہو تو دیوانِ غالب کے ہم پلّہ نظر آتا ہے۔ نثر ہو تو 'باغ و بہار' سے ٹکر لیتی دکھائی دیتی ہے۔

رشید حسن خاں گرم ہو کر بولے کہ آپ نے کسی تھرڈ کلاس محقق کی تحقیق پڑھی ہو گی۔ اچھا محقق کبھی یہ طور اختیار نہیں کرتا۔

لیجیے بات ہی ختم ہو گئی، میں نے اپنے طور پر طے کر لیا ہے کہ جو محقق ایسا طور اختیار کرتا ہے اس کا نام کتنا ہی بڑا ہوا سے تھرڈ کلاس محقق سمجھوں گا۔

رشید حسن خاں ناسخ کے بہت بڑے وکیل ہیں، میں نے کہا کہ دیکھیے مجھے ناسخ کی شاعری سے تو کچھ لینا نہیں۔ مجھے تو اس بزرگ پر یہ غصہ ہے کہ اس نے زبان کی صفائی کے نام پر اُردو کو بہت سے لہجوں اور لفظوں سے محروم کر دیا ہے۔

رشید حسن خاں کہتے ہیں کہ ناسخ کو بلاوجہ بدنام کیا گیا ہے۔ انھوں نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی۔ اُن کے بعض شاگردوں نے ان کا نام لے کر یہ تحریک چلائی تھی۔ خاص طور پر اس کے ایک شاگرد نے جس کا نام اوسط علی تھا۔

رشید حسن خاں سے باتیں تو اور بھی کرنی تھیں لیکن وہ تو ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے۔ لاہور کو بس چھوا اور گزر گئے۔ بھاگتے دوڑتے ان سے ایک ڈیڑھ بات ہوئی۔

(کتاب نما، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، اگست 1990، جلد 30 شمارہ 8، صفحہ 73 تا 74)

○○○

پروفیسر حنیف نقوی

تاریخ نگاری کے اصول وآداب
رشید حسن خاں کا نقطۂ نظر

اُردو میں ادبی تحقیق کو جن لوگوں کی بدولت آبرومندانہ مقام حاصل ہوا ہے، ان میں رشید حسن خاں کا نام ایک روشن چراغ کی حیثیت رکھتا ہے۔ قاضی عبدالودود کے بعد وہ دوسرے شخص ہیں جنھوں نے اوہام ومفروضات کے ہر بُت کو توڑنے اور حقیقت کو واشگاف انداز میں بیان کرنے کا فریضہ کسی تامل اور تکلف کے بغیر پوری جرأت مندی اور راست بازی کے ساتھ انجام دیا ہے۔ اپنی اسی شناخت کو برقرار رکھتے ہوئے انھوں نے پچھلی چند دہائیوں میں مختلف موضوعات پر جس قدر اور جس پائے کا کام کر کے عملی کارکردگی کی جو قابلِ رشک مثال قائم کی ہے، وہ ایک منفرد اور لائقِ تحسین امتیاز ہے۔ اگر اس نکتے کو ملحوظ رکھ کر گفتگو کی جائے کہ کسی انسان یا اس کے کسی کارنامے کا نقائص سے کلیتاً مبرّا ہونا ناممکنات سے ہے تو یہ دعوا غلط نہ ہوگا کہ تحقیق اور بالخصوص تدوینِ متن میں فی الوقت کوئی ان کا حریف نہیں۔

خاں صاحب کی تصانیف میں خواہ وہ درسی نوعیت کے انتخابات ہی کیوں نہ ہوں، کوئی کتاب ایسی نہ ملے گی جو ان کی محنتِ شاقہ اور ژرف نگاہی ونکتہ رسی کی شاہد نہ ہو، لیکن تحقیق کی نظری وعملی دونوں پہلوؤں کی جامع تفہیم کے نقطۂ نظر سے ''ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ'' کو ان کتابوں میں اساسی حیثیت حاصل ہے۔ یہ کتاب مختلف مضامین اور تبصروں کا مجموعہ ہے جو پہلی بار سنہ 1978 میں ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ سے شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد سنہ 1990 میں اُتر پردیش اُردو اکاڈمی، لکھنؤ نے اس کا دوسرا اڈیشن شائع کیا جو علمی حلقوں میں اس کتاب کی مقبولیت اور پذیرائی کا بیّن ثبوت ہے۔ ترتیبِ مضامین کے اعتبار سے یہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں مندرجہ ذیل پانچ مضامین شامل ہیں:

(1) کچھ اصولِ تحقیق کے بارے میں

(2) غیر معتبر حوالے

(3) تحقیق سے متعلق کچھ مسائل

(4) تدوین اور تحقیق کے رجحانات

(5) حوالہ اور صحتِ متن

دوسرا حصہ بہ تفصیل ذیل چار تبصروں پر مشتمل ہے:

(1) دیوانِ غالب صدی اڈیشن

(2) اُردو شاعری کا انتخاب

(3) علی گڑھ تاریخِ ادب اُردو

(4) تاریخِ ادب اُردو

ہماری موجودہ گفتگو اسی دوسرے حصے کے آخری دو مضامین سے متعلق ہے۔ ان میں سے پہلا مضمون ''علی گڑھ تاریخِ ادب اُردو'' خاں صاحب کی وہ معرکہ آرا تحریر ہے جس کی اشاعت کے ساتھ علمی حلقوں میں ان کے تبحرِ علم، وسعتِ نظر اور جرأتِ گفتار کی دھاک اس طرح قائم ہوئی کہ تن آسان مصنفوں اور سہل پسند محققوں کے لیے ان کا نام ضربِ کلیمی کی علامت بن گیا۔ اس مضمون سے جہاں ایک طرف اس کتاب کی خامیاں نمایاں ہو کر سامنے آتیں، وہیں ان اصول وآداب کا تعین بھی ہوا جنھیں ملحوظ رکھے بغیر ادبی تاریخ نگاری کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلے کے دوسرے مضمون میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی ''تاریخِ ادب اُردو'' جلد اوّل کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس تبصرے میں بھی موضوع کو دونوں پہلوؤں یعنی کتاب کے مشتملات اور تاریخ نویسی کے مقتضیات پوری شرح وبسط کے ساتھ زیرِ بحث آئے ہیں۔ ''علی گڑھ تاریخ ادب اُردو'' ماہرین کی ایک بورڈ کی اجتماعی کوششوں کا ثمرہ تھی، جب کہ موخر الذکر کتاب شخصِ واحد کی انفرادی سعی وکوشش کا نتیجہ ہے۔ اس اعتبار ان دونوں تبصروں کی روشنی میں بہ آسانی ان رموز نکات کا احاطہ کیا جا سکتا ہے، جو انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر تاریخ نویسی کے بنیادی لوازم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

تاریخ نویسی کے سلسلے میں خاں صاحب کا بنیادی موقف یہ ہے کہ 'تاریخ ادب کی ہو یا زبان کی، جدید معیار وانداز کے باعث اس کی ترتیب سے کما حقہ، عہدہ برآ ہونا بہ ظاہر کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں۔'' (طبع اوّل ص 258) اپنی موضوعی وسعت اور بوقلمونی کی بنا پر یہ کام تقسیمِ کار کے اصول کے تحت اجتماعی طور سے زیادہ بہتر طریقے پر انجام دیا جا سکتا ہے، کیوں کہ اس طرح مختلف ماہرینِ ادبیات کو اپنے اختصاص کے پیشِ نظر کسی خاص موضوع یا مخصوص دور کے ساتھ انصاف کے پورے مواقع حاصل ہوتے ہیں، لیکن خاں صاحب کے بقول ''یہ کام تو یورپ میں کیا جا سکتا ہے کیوں کہ وہاں اچھے علمی کام کرنے والے بد دیانتی کو جائز نہیں سمجھتے، شاگردوں سے اور اپنے مجبور ماتحتوں سے بے گار نہیں لیتے اور وہاں اڈیٹر کی بہت بڑی حیثیت ہوتی ہے۔'' (ص 259) اس کے برخلاف ہمارے یہاں ذمہ داریوں کی تقسیم کے معاملے میں اہلیت ولیاقت سے زیادہ مراتب ومناصب کا لحاظ رکھا جاتا ہے اور دوسروں سے کام کرا کے اسے اپنے نام سے شائع کرانے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کی جاتی، اس لیے اجتماعی سطح پر پورے احساسِ ذمہ داری کے ساتھ کام کرنے کی کوئی روایت قائم نہیں ہو پائی ہے۔

اجتماعی نوعیت کے کام کے سلسلے میں سب سے اہم ذمہ داری مرتب، اڈیٹر کی ہوتی ہے، جسے کتاب کے مختلف ابواب کے درمیان تناسب اور ربط وہم آہنگی برقرار رکھنے کا فریضہ انجام دینا پڑتا ہے اور یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ ایک ہی واقعے سے متعلق دو مقالہ نگاروں کے بیانات میں کوئی تضاد یا اختلاف نہ ہو۔ ''علی گڑھ تاریخِ ادب اُردو'' کی نمایاں ترین خامی یہ ہے کہ اس میں ان پہلوؤں پر مطلقاً توجہ نہیں دی

پر ان حالات کا کیا اثر پڑا'' جواس کے تحت بیان کیے گئے ہیں۔(ص 260)

دو مقالہ نگاروں کے بیانات میں تضاد واختلاف کو دور کرنے کی طرف بھی کسی توجہ کا دور دور تک سراغ نہیں ملتا۔ فاضل تبصرہ نگار کے الفاظ میں ''اگر اس میں دو مقالہ نگاروں نے کسی واقعے کا ذکر کیا ہے یا کوئی سنہ لکھا ہے تو اکثر مقامات پر دونوں نے مختلف سنہ لکھے ہیں اور متضاد باتیں کہی ہیں اور اگر اتفاق سے تیسرے مضمون نگار نے بھی وہی بات لکھی تو اس نے ان دونوں سے مختلف سنہ درج کیا ہے۔ یہی نہیں، ایک ہی مضمون نگار نے ایک ہی واقعے کو دو مختلف سنہ بھی لکھے ہیں۔'' (ص 261) اس سلسلے میں تضادِ بیان کی جو مثالیں پیش کی گئی ہیں، ان میں سے ایک مثال امیر خسرو کی بھی ہے، جن کے متعلق ایک مقالہ نگار کا قول ہے کہ ان سے پہلے شمالی ہند میں کوئی شاعر ایسا نظر نہیں آتا جسے ہم اُردو شاعر کہہ سکیں جب کہ ایک دوسرے مقالہ نگار کے مطابق ''ان کے ہندی کلام کی کوئی سند اب تک دستیاب نہیں ہو سکی ہے۔'' (ص 281)

تاریخ نویسی کے مبادیات میں سے ایک بنیادی نکتہ یہ بھی ہے تاریخ زبان اور تاریخ ادب دونوں کو باہم مخلوط نہیں کرنا چاہیے۔ یہ دونوں اور مستقل بالذات موضوع ہیں۔ اس سلسلے میں خاں صاحب نے اپنا موقف واضح فرماتے ہوئے لکھا ہے کہ ''زبان اور ادب کا باہمی تعلق ہے لیکن تاریخ نگاری کے لیے زبان و ادب بجائے خود دو مستقل موضوع ہیں اور دونوں کے تقاضے مختلف ہیں۔ زبان کی تاریخ لکھنے والے کے لیے یہ از بس ضروری ہے کہ وہ لسانیات سے کماحقہ واقف ہو۔ اُردو زبان کی تاریخ لکھنے والے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ان اہم مقامی زبانوں سے بھی ضروری واقفیت کے بغیر زبان کی بحث قیاسات کا مجموعہ اور مفروضات کا جذبات کدہ بن کر رہ جائے گی۔'' (ص 293)

زبان وادب کی طرح تاریخ وتنقید بھی دو علاحدہ علاحدہ موضوعات ہیں جن کے حدود کا لحاظ رکھنا بے حد ضروری ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ''محاسن کلام کو سمجھنے اور بیان کرنے'' کا جو ملکہ رکھتے ہیں وہ خاں صاحب کے نزدیک قابلِ تحسین ہے۔ بہ طور مثال انھوں نے ''ولی اور سراج کی خصوصیات کو جس طرح بیان کیا ہے، اس سے ان کی تنقیدی بصیرت کے جوہر کھلتے ہیں۔'' لیکن یہ ایک دوسرا میدان ہے، چناں چہ خاں صاحب کے الفاظ میں ان کے اس قسم کے ''تنقیدی بیانات بعض جگہ تاریخ نگاری کے پیمانے سے نکل گئے ہیں اور اس طویل بیانی نے تاریخ نگاری کے دائرے کو نقصان پہنچایا ہے۔'' (ص 292) اسی بنا پر ان کی یہ طے شدہ رائے ہے کہ ''تاریخ ادب اور تنقید ادب دو مستقل موضوعات ہیں، لامحالہ ان کے دائرے بھی الگ الگ ہوں گے اور طریق کار بھی مختلف ہوگا۔'' (ص 292)

تاریخ ادب میں سب سے زیادہ اہمیت واقعات کے بیان کی ہوتی ہے۔ یہ بیان جس قدر معتبر و مستند ہوگا، تاریخ اپنے مقصد میں اسی قدر کامیاب ہوگی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ کوئی اہم بات ماخذ کے حوالے کے بغیر نہ کہی جائے۔ خاں صاحب کے مطابق ''تحقیق کے نقطۂ نظر سے ایسے کسی دعوے کو قبول نہیں کیا جا سکتا جو اس التزام سے عاری ہو۔ مثلاً امیر خسرو کے بارے میں ''علی گڑھ تاریخ ادب اُردو'' کے ایک مقالہ نگار کا قول ہے کہ انھوں نے ''موسیقی میں ہندی اور ایرانی سروں کے میل سے طرح طرح کے راگ ایجاد کیے۔'' یہ دعوا اس اعتبار سے مہمل ہے کہ ''موسیقی میں خسرو کی ایجادات ہنوز بحث طلب اور محتاج ثبوت ہیں۔'' (ص 280) اسی طرح ڈاکٹر جمیل جالبی نے اورنگ زیب کے دورِ حکومت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''اس دور میں اُردو زبان مدرسوں اور مکتبوں میں عام طور پر ذریعۂ تعلیم بن جاتی ہے۔'' خاں صاحب کو بجا طور پر اعتراض ہے کہ ''مولف نے یہ نہیں بتایا کہ اہم اطلاع انھیں کہاں سے ملی... حوالے کے بغیر اس دعوے (بل کہ ادّعا) کو قبول نہیں کیا جا سکتا۔'' (ص 300)

ادبی مورخ پر یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ ثانوی یا موخر اور غیر معتبر مآخذ سے کام نہ لے اور ایسے حوالوں پر استناد اور استدلال کی بنیاد نہ رکھے جو کمزور اور مشکوک ہوں۔ پروفیسر محمود شیرانی نے ''پنجاب میں اُردو'' میں اور ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی تاریخ ادب میں بڑی کثرت کے ساتھ مجہول الاحوال بیاضوں کے حوالے دیے ہیں۔ خاں صاحب کے نزدیک ان حضرات کا یہ عمل تحقیق سے کوئی نسبت نہیں رکھتا، کیوں کہ جب تک کسی بیاض کے بارے میں پورے وثوق سے یہ نہ معلوم ہو کہ اس کا مرتب کون ہے، وہ کس زمانے میں مرتب ہے اور اس کے مندرجات کس حد تک معتبر ہیں، اس کے حوالے سے کوئی بات کہنا اصولی طور پر درست نہیں۔ (ص 304) ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے اس دعوے کی تائید میں کہ صوفیائے کرام نے اپنا پیغام، عوام تک پہنچانے کے لیے یہاں کی مقامی زبانوں سے کام لیا ''فرہنگِ آصفیہ'' جلد اوّل کے مقدمے کے حوالے سے شیخ شرف الدین بوعلی شاہ قلندر پانی پتی کا ایک دوہا پیش کیا ہے اور ناتھ پنتھیوں کی تصانیف میں مستعمل زبان کے نمونے کے طور پر ''ہندی ادب کی تاریخ'' مولفہ ڈاکٹر محمد حسن کے حوالے سے دو شعر نقل کیے ہیں۔ اس کتاب سے انھوں نے اپ بھرنش کا ایک دوہا بھی نقل کیا ہے۔ چوں کہ بوعلی شاہ قلندر کی وفات اور ''فرہنگِ آصفیہ'' کی تالیف میں چھے سو سال سے زیادہ فرق ہے اور ڈاکٹر محمد حسن اُردو کے اہلِ قلم ہیں، اس لیے یہ دونوں حوالے موخر یا ثانوی حوالوں کے ذیل میں آتے ہیں، جنھیں بنائے استدلال نہیں بنایا جا سکتا۔ خاں صاحب کے بقول اگر ''مولف بطورِ خود ہندی اور اپ بھرنش سے استفادہ نہیں کر سکتے... تو پھر ان کو اس پھیر میں پڑنا ہی نہیں چاہیے تھا اور اگر وہ ان زبانوں سے مناسب طور پر واقف ہیں تو پھر ان کو ثانوی مآخذ سے کام نہیں لینا چاہیے تھا۔

بہت سے راویوں کے بارے میں یہ بات ایک امرِ مسلمہ ہے کی حیثیت رکھتی ہے کہ وہ نقلِ روایت میں محتاط نہیں اور زیب داستان کی خاطر صحتِ بیان وصداقتِ واقعہ کو نظر انداز کر دینے میں تامل نہیں کرتے۔ ادبی مورخ کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس قسم کے غیر معتبر راویوں کی تصانیف یا اقوال سے استناد کے معاملے میں حد درجہ احتیاط اور تنقیح وتفحص سے کام لے اور جب تک دوسرے ذرائع سے ان کے کسی بیان کی تائید نہ ہو، اس پر کسی دعوے کی بنیاد نہ رکھے۔ فاضل محقق نے اس سلسلے میں حکیم شمس اللہ قادری، نواب نصیر حسین خیال اور صفیر بلگرامی کی مثالیں دے کر یہ وضاحت کی ہے کہ ''ان لوگوں نے اپنی کتابوں میں ہر طرح کی روایتیں جمع کر دی ہیں'' جن میں حوالے اور سند کا کوئی جھگڑا ہی نہیں۔'' تاریخِ ادب کے مولف کا اس قسم کی کسی روایت کو قبول کر کے اس سے کوئی نتیجہ اخذ کرنا بناء الفاسد علی الفاسد کے مصداق ہوگا (ص 322-323)

واقعات کے بیان میں سنین کا التزام ایک لازمی جز کی حیثیت رکھتا ہے۔ تحقیق کے نقطۂ نظر سے یہ التزام اسی صورت میں مفید ہو سکتا ہے جب کہ ہر سنہ کے ساتھ اس کے مآخذ کا حوالہ بھی موجود ہو۔ بہ صورت دیگر ''ایسے تمام مندرجات لازماً قابلِ قبول نہ ہوں گے۔'' بقول'' لکھنے والا مجبور ہوتا ہے کہ معتبر ترین مآخذ سے کام لے اور اگر کسی سنہ میں کسی طرح کا اختلاف ہے تو پہلے اس کی وضاحت کرے کہ اس نے اس سنہ کو کس بنا پر مرجح سمجھا ہے۔'' (ص 296-297)

سنین کے اندراج کے سلسلے میں سنہ ہجری اور سنہ عیسوی کی مطابقت کا مسئلہ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس معاملے میں بھی خاصی احتیاط اور باریک بینی کی ضرورت ہوتی ہے لیکن عام طور مصنفین اس کا لحاظ نہیں رکھتے۔ ''علی گڑھ تاریخِ ادب اُردو'' میں اس سلسلے میں عام طور پر ''بے اعتنائی'' اور کم احتیاطی کا جو انداز کار فرما نظر آتا ہے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے خاں صاحب نے لکھا ہے:

''کتاب میں بیش تر مقامات پر سنہ ہجری وعیسوی دونوں کو درج کیا گیا ہے لیکن اس سلسلے میں ایک نہایت اہم بات کو نظر انداز کر دیا گیا ہے جس کے سبب سے اس کی افادیت ختم ہونے کے ساتھ ساتھ غلط فہمی کی بڑی گنجایش نکل آتی ہے۔ یہ مسلمات میں سے ہے کہ جب تک تاریخ اور مہینے کا تعین نہ ہو، اس وقت تک یہ قطعیت کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ فلاں سنہ ہجری مطابق ہے فلاں سنہ عیسوی کے یا اس کے برعکس تاریخ و ماہ نہ معلوم ہونے کی صورت میں اس کا لحاظ رکھا جاتا ہے کہ اگر اس سنہ ہجری کے کسی بھی مہینے سے کوئی دوسرا سنہ عیسوی شروع ہو جاتا ہے تو وہ دونوں سنہ عیسوی درج کیے جائیں، اس کے بغیر کبھی صحیح تعین نہیں ہو سکتا۔ مقالہ نگاروں نے اس کی پابندی ضروری نہیں سمجھی ہے۔ اس بے پروائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً ایسے سارے مقامات پر تعین کو صحیح نہیں کہا جا سکتا۔'' (ص268)

سنین کے سلسلے میں تیسری اہم ضرورت خاں صاحب کے بقول ''یکسانیت اور صراحت'' ہے۔ علی گڑھ تاریخ ادب اُردو'' کا ایک نمایاں نقص یہ بھی ہے کہ اس میں ان لوازم کو بہت کم ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس کتاب میں ''ناموں کے آگے قوسین میں سنین درج نہیں ہیں۔ اس سلسلے میں کسی ایک قاعدے کی پابندی نہیں کی گئی ہے۔ کہیں یہ سنین سنہ ولادت و وفات کو ظاہر کرتے ہیں، کہیں زمانہ حکومت کو، صراحت نہ یہاں ہے نہ وہاں۔'' (ص278) گویا اس سلسلے میں بھی مولف یا مرتب کو ایک اصول وضع کرنا چاہیے، مثلاً افراد کے ناموں کے آگے صرف ان کی ولادت اور وفات کے سنہ اور کتابوں کے آگے ان کی طباعت کے سنہ درج کیے جائیں۔ ان کے علاوہ دوسرے اہم واقعات مثلاً سالِ جلوس، زمانہ حکومت اور صرف پیدایش یا صرف وفات کے سنوں کے اندراج کی صورت میں ان کے لیے مخصوص علامات مقرر کر دی جائیں تا کہ پڑھنے والے کسی شک اور تذبذب میں مبتلا نہ ہوں۔

ادب کی تاریخیں طالب علموں کے استفادے اور عام شائقینِ ادب کے مطالعے کے لیے لکھی جاتی ہیں، اس لیے ان میں ایسے واقعات و بیانات کے شمول سے احتراز کرنا چاہیے جن سے ناپختہ ذہنوں کے مسموم ہونے یا عام لوگوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچنے کا امکان ہو۔ اختلافی مسائل اور متنازعہ فیہ امور سے بحث یا ایسے کسی نقطۂ نظر کی ترجمانی جو ایک مخصوص حلقے تک محدود، تاریخ نگاری کے منصب کے ساتھ میل نہیں کھاتی۔ خاں صاحب کے الفاظ میں ''ایسی کتاب...... جو کسی ایک نقطۂ نظر کے ماننے والوں کے لیے نہیں، سب کے لیے مرتب کی گئی ہو، اس میں ان باتوں کا ذکر نہ ہونا چاہیے جو آج تک مختلف فیہ ہیں یا جن کی تعبیر کسی خاص اندازِ فکر کی روشنی میں کی گئی ہو۔'' (ص260) ''علی گڑھ تاریخ ادب اُردو'' کے ایک مقالہ نگار نے اس اصول کے برخلاف صوفیائے کرام کو ''خیرات خوار''، اورنگ زیب کو دنیا کا بد ترین حکمراں'' اور اکبر کے دینِ الٰہی کو ''منشورِ انسانیت'' قرار دے کر گویا اپنے حدود سے تجاوز کیا ہے، کیوں کہ اولاً تو ان باتوں کا اصل موضوع یعنی اُردو زبان و ادب کے ارتقا سے کوئی تعلق نہیں، ثانیاً یہ ایک مخصوص گروہ کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتی ہیں اور ادب کے عام طلبا اور قارئین کے لیے قابلِ قبول نہیں ہو سکتیں۔

ایک ادبی مورخ کو بیانِ واقعات کے ضمن میں غیر ضروری طور پر کلیّے قائم کرنے سے بھی احتراز کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں خاں صاحب نے ''علی گڑھ تاریخ ادب اُردو'' سے جو مثالیں پیش کیں ہیں، ان میں ایک مقالہ نگار کا یہ بیان بھی شامل ہے کہ ''تعجب انگیز بات یہ ہے کہ بابر ماہرِ جنگ ہونے کے باوجود ایک بلند سیرت اور تربیت یافتہ ذہن رکھتا تھا۔'' اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ''جو شخص ماہرِ جنگ ہوگا، وہ نہ بلند سیرت ہوگا اور نہ اس کا ذہن تربیت یافتہ ہوگا۔'' (ص273) ظاہر ہے کہ یہ کلیّہ کسی درجے میں بھی قابلِ قبول نہیں۔

خاں صاحب نے اس بات پر بھی بجا طور پر زور دیا ہے کہ تاریخِ ادب میں مصنفین و شعرا کے حالات کے تحت بہ غرضِ استدلال یا بہ طور نمونہ ان کی تحریروں کے جو اقتباسات یا کلام کے جو نمونے نقل کیے جائیں، وہ ہر اعتبار سے مستند و معتبر ہونا چاہئیں۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ ضرورت یہ دیکھنے کی ہوتی ہے کہ جو تحریر یا جو کلام بہ طور نمونہ پیش کیا جا رہا ہے، اس کا انتساب ہر اعتبار سے درست اور غیر مشکوک ہے۔ ''علی گڑھ تاریخ ادب اُردو'' اور ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ دونوں ہی کتابوں میں امیر خسرو، بابا فرید گنج شکر، امیر حسن حسن دہلوی اور پنڈت چندر بھان برہمن اور اسی قبیل کے بعض اور قدیم شاعروں کی اُردو میں طبع آزمائی کے ثبوت میں جو غزلیں یا اشعار نقل کیے گئے ہیں، ان کا ان شعرا سے انتساب حد درجہ مشکوک ہے، اس لیے انھیں بنائے استدلال بنا کر اخذ کیے ہوئے تمام نتائج خاں صاحب کے الفاظ میں ''محض مفروضات اور صرف قیاس آرائی'' کی حیثیت رکھتے ہیں۔'' (ص307)

ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ پر خاں صاحب کا ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ اس کتاب میں ''نثر اور نظم کے جو اقتباسات پیش کیے گئے ہیں، ان کے ذیل میں یہ صراحت نہیں ملتی کہ صحتِ متن کے لحاظ سے کیا وہ واقعتاً قابلِ اعتماد ہیں، یعنی وہ متن در حقیقت ایسا ہے کہ اس سے قطعی طور پر استدلال کیا جا سکے؟ اکثر قدیم مخطوطات کے ایک سے زیادہ نسخے پائے جاتے ہیں اور صحتِ متن کے لحاظ سے وہ سب یکساں حیثیت نہیں رکھتے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مولف نے جس نسخے سے کام لیا ہے، اس کو کس بنا پر قابلِ اعتماد سمجھا ہے۔'' (ص291-292)

اس اعتراض میں یہ نکتہ پنہاں ہے کہ صحتِ انتساب کے تیقّن کے بعد صحتِ متن کا تعین بھی تاریخ نگار کے بنیادی فرائض میں شامل ہے۔ چناں چہ اگر کسی کتاب کے متعدد قلمی نسخے یا مطبوعہ اڈیشن دستیاب ہیں تو بلا تخصیص ان میں سے کسی ایک سے استفادہ بعض اوقات کسی غلط فیصلے یا اختلافِ رائے کا سبب بن سکتا ہے۔ اس لیے ایسی صورتوں میں مولف پر لازم ہوگا کہ وہ تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد اس قلمی نسخے یا مطبوعہ اڈیشن کا انتخاب کرے جو ان میں سب سے زیادہ معتبر اور منشائے مصنف سے قریب تر ہو، اگر کسی تاریخ کے مختلف ابواب علاحدہ علاحدہ مصنفین نے لکھے ہوں اور ایک ہی کتاب کا کوئی اقتباس یا ایک ہی شعر ان میں سے دو یا دو سے زیادہ مصنفین نے نقل کیا ہو تو مرتب کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ اختلافِ متن کی صورت میں وہ ان میں سے مرجح صورت کو برقرار رکھے اور باقی مقامات پر مختلف فیہ متن کو اس کے مطابق درست کر دے۔ ''علی گڑھ تاریخ ادب اُردو'' میں اس قسم کے اختلافِ متن کی مثالیں جا بجا موجود ہیں۔ انھیں پڑھ کر خاں صاحب کے بقول ''یہ نہیں کہا جا سکتا کہ صحیح صورت کیا ہے (اور چوں کہ) یہ مسلم ہے کہ ہر شخص کی رسائی اصل ماخذ تک نہیں ہو سکتی، اس لیے نتیجہ معلوم۔'' (ص267)

بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ وقتی ضرورت کے تحت کسی سہل الحصول ماخذ سے کوئی شعر یا اقتباس نقل کر لیا جاتا ہے اور معاملے کی ثانوی یا سرسری نوعیت کی بنا پر اصل کی طرف رجوع کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ خاں صاحب کے نزدیک یہ طریقہ بھی احتیاط کے خلاف اور آدابِ تحقیق کے منافی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ناصر علی سرہندی کے ذکر میں ان کے متعلق ولی کا ایک شعر نقل کیا ہے اور حوالہ دیا ہے آبِ حیات کا۔ اس سلسلے میں خاں صاحب کا ارشاد ہے ''اگر یہ شعر ولی کا ہے تو اسے دیوانِ ولی میں موجود ہونا چاہیے۔ اگر وہاں موجود ہے تو پھر حوالہ بھی اسی کا ہونا چاہیے۔ (بہ حالتِ موجودہ) یہ کیسے معلوم ہو (سکتا ہے) کہ یہ شعر واقعتاً ولی کا ہے اور ان کے دیوان میں موجود ہے اور اسی طرح ہے؟''

''علی گڑھ تاریخ ادب اُردو'' میں ایسے اشعار بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں جن کی صورت ''مضمون نگاروں کی بے احتیاطی'' اور ''پریس والوں کی کرم فرمائی'' کے سبب مسخ ہو کر کچھ سے کچھ ہو گئی

ہے جب کہ ''بہت سے مصرعے صریحاً ساقط الوزن ہیں۔'' مثلاً نصرتی کے حالات میں ان کی تاریخ وفات سے متعلق جو قطعہ منقول ہے اس کے چار مصرعوں میں سے دوسرا مصرع ناموزوں اور چوتھا مصرع محترف ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس آخری مصرعے سے مطلوبہ تاریخ برآمد نہیں ہوتی۔ اس قسم کی غلطیاں کسی بھی کتاب کے علمی معیار اور استنادی حیثیت کو مجروح کرنے کے لیے کافی سمجھی جاتی ہیں۔ لیکن تاریخ ادب میں جو بنیادی طور پر حوالے کی کتاب کا کام دیتی ہے اور جس کا اولین مقصد عام قارئین اور طالب علموں کی رہنمائی ہوتا ہے، ان کی موجودگی پڑھنے والوں کے لیے ''گم راہی کا خاصا سروسامان'' فراہم کر دیتی ہے۔ (ص 276) اس لیے تاریخ نگاری کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی کتاب کو حتی الوسع اس قسم کی لغزشوں اور کوتاہیوں سے پاک رکھے۔

خاں صاحب نے مآخذ کے قابلِ اعتماد ہونے پر بار بار زور دیا ہے۔ یہ اصرار اس لحاظ سے بالکل درست ہے کہ اگر مآخذ کی استنادی حیثیت کمزور ہوگی تو تاریخ اور داستان کے درمیان کوئی امتیاز باقی نہ رہے گا۔ اس معاملے میں وہ صرف تاریخ نگار کے ذاتی اطمینان کو کافی نہیں سمجھتے بل کہ یہ بھی ضروری خیال کرتے ہیں کہ وہ ''اپنے مآخذ کی تفصیلات اور ان سے متعلق اعتبار واستناد کے مختلف مسائل کو ایک ضمیمے کے طور پر مرتب کر کے آخر میں شاملِ کتاب'' کرے تاکہ قارئین کو بھی اس کے طریق کار کا علم ہو سکے اور وہ اس کے مآخذ کے متعلق صحیح معلومات حاصل کر کے ذاتی طور پر کوئی رائے قائم کر سکیں۔ (ص 346) ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی کتاب میں ''پاکستان میں اُردو'' کے عنوان سے ایک سو بائیس صفحات کا ایک طویل ضمیمہ شامل کیا ہے۔ خاں صاحب کے نزدیک یہ ضمیمہ نہ صرف یہ کہ غیر ضروری ہے بل کہ اس نے ''اس کتاب کو بالکل آخر میں آ کر منتشر خیالی اور حشو وزوائد کا مجموعہ بنا دیا ہے۔'' (ص 346) ان کے مطابق ''اس غیر متعلق اور نقصان رسا ضمیمے کے بجائے، اگر وہ اتنے ہی صفحات پر مشتمل ایک ایسا ضمیمہ مرتب کرتے جس میں مآخذ کے متعلق ضروری تفصیلات درج ہوتیں اور ضروری امور پر مفصل یا مختصر بحثیں بھی ہوتیں، تو اس سے حقیقی فائدہ حاصل ہوتا اور کتاب کے اعتبار واستناد کی شکل بنتی۔ موجودہ صورت میں ان کے مآخذ کے متعلق جگہ جگہ یہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کی اصل حیثیت کیا ہے اور یہ کہ مولف نے کسی خاص نسخے کو کس بنا پر قابل حالہ قرار دیا ہے اور یہ کہ اس کے مندرجات کس حد تک قابلِ اعتماد ہیں۔'' (ص 346)

مجوزہ ضمیمے کی اہمیت وافادیت کو واضح کرتے ہوئے اس کتاب پر تبصرے کے آخر میں ایک بار پھر لکھتے ہیں:

> ''اُردو میں سنین کا مسئلہ بڑی حد تک غیر طے شدہ ہے۔ بہت سے اہم واقعات بھی بحث طلب ہیں۔ صحتِ متن کا بہت بڑا سوالیہ نشان موجود ہے اور انتسابِ کلام کے سلسلے میں بہت سی باتیں بحث طلب ہیں۔ ان حالات میں ضروری ہے کہ ہر جلد میں ایک مفصل ضمیمہ شامل کیا جائے جس میں ان سب مصادر سے مفصل بحث کی جائے جو اس جلد میں مذکور ہوئے ہیں۔'' (ص 350)

ایک اہم مسئلہ تاریخِ ادب کی زبان کا بھی ہے۔ خاں صاحب کے بقول ہر ادبی کتاب کی طرح اس موضوع سے متعلق کتابوں میں بھی ''صحیح بل کہ فصیح زبان کا وجود'' بے حد ضروری ہے۔ (ص 285) ''علی گڑھ تاریخِ ادب اُردو'' سے قواعد اور روزمرہ کے اعتبار سے ''غلط جملوں'' اور ''غیر مناسب اندازِ بیان'' کی مثالیں پیش کر کے انھوں نے بجا طور پر اس خدشے کا اظہار کیا ہے کہ ''طلبا جب ایسی اہم کتاب میں.... ایسے جملے پڑھیں گے تو یہ غلط نگاری ان کے لیے سند کا کام دے گی۔'' اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خاں صاحب کے نزدیک تاریخ نگاری کے لیے زبان کے معاملے میں بھی کس قدر محتاط رہنے اور پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت ہے۔

صحتِ زبان کے پہلو بہ پہلو اس نکتے کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے کہ تاریخی وتحقیقی بیانات کسی درجے میں بھی رنگیں نگاری وانشا پردازی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ خاں صاحب کے الفاظ میں ''تاریخ اور تحقیق کی زبان کو مبالغے سے پاک اور عبارت آرائی سے محفوظ رہنا چاہیے۔'' (ص 342) ''یہاں نہ جوشؔ صاحب کی لفاظی کی گنجایش ہے اور نہ آزاد کی عبارت آرائی کی۔'' ''تاریخ وتحقیق کو یہ ''پیرایۂ گفتار'' نہ صرف یہ کہ راس نہیں آتا بل کہ بسا اوقات ''اصل مفہوم کو بگاڑنے'' اور ''کم اعتمادی پھیلانے'' کا سبب بن جاتا ہے۔ (ص 345)

تاریخ سے متعلق کتابوں کا ایک آخری لیکن نہایت اہم جز ان کا اشاریہ ہوتا ہے۔ اشاریے کے بغیر اس قسم کی کتابوں سے استفادے میں جتنی دشواریاں پیش آتی ہیں اور جس قدر وقت صرف ہوتا ہے، اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں، لیکن کسی اشاریے سے مطلوبہ فوائد اسی صورت میں حاصل کیے جا سکتے ہیں جب کہ اس کی ترتیب میں پوری احتیاط اور دقتِ نظر سے کام لیا گیا ہو، ورنہ اس کا وجود بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ ''علی گڑھ تاریخِ ادب اُردو'' کا اشاریہ مرتبین کی سہل پسندی اور بے احتیاطی کی وجہ سے جس ''مضحکہ خیز'' بے ضابطگی و بے ترتیبی کا شکار ہوا ہے، اس کا اندازہ خاں صاحب کے ان مشاہدات سے کیا جا سکتا ہے:

(1) ''معلوم ہوتا ہے کہ اشاریہ مرتب کرنے والے بزرگ نے کسی قاعدے کا لحاظ رکھنا اپنے لیے حرام سمجھا تھا۔ جس لفظ کو جہاں چاہا ہے، لکھا ہے مثلاً...... غیاث الدین تغلق کو تو حرف غ کے ذیل میں لکھا گیا ہے اور غیاث الدین بلبن کو حرفِ ب کے ذیل میں۔'' (ص 283)

(2) ''اشاریے میں ترتیبِ حروف کا لحاظ رکھا جاتا ہے، خصوصاً حروفِ اوّل وثانی میں۔ اس کتاب کے اشاریہ ساز نے مہمل سمجھ کر ساری پابندیوں کو اُڑا دیا ہے۔ جس لفظ کو جہاں چاہا ہے، لکھا ہے، مثلاً ع کے ذیل میں سب سے پہلا نام علی ہے، دوسرا اعلاء الدین، اس کے بعد عثمان ہے پھر عبدالواسع، عبدالحکیم، عبدی ہیں۔ اچانک عمر، عصامی، عزیز سامنے آتے ہیں۔ پھر عنبر اور اس کے معاً بعد عباس اور اس کے بعد عادل (جس کو سب سے پہلے آنا چاہیے تھا)''۔ (ص 284)

(3) ''اس کی بھی کوئی ضرورت نہیں سمجھی گئی کہ اصل کتاب اور اشاریے میں مطابقت بھی ہو۔ کتاب کے ایک صفحے پر ایک نام موجود ہے، اشاریہ اس سے خالی ہے۔ اشاریے میں لکھا ہوا ہے کہ یہ نام فلاں صفحے پر ہے۔ لیکن وہ صفحہ اس سے خالی ہے۔'' (ص 284)

(4) ''ایک ہی شخص یا کتاب کو دو مختلف ناموں سے دو جگہ درج کیا گیا ہے مثلاً حضرت نصیرالدین چراغ دہلی کا نام حرف ر کے ذیل میں ''روشن چراغ دہلی'' کی رعایت سے ملے گا اور حرفِ ن کے ذیل میں بھی ملے گا۔ غالباً پریس کی غلطی سے مشہور لغت ''موید الفضلا'' کا نام ص 19 پر ''مرید الفضلا'' لکھا ہوا ہے۔ اشاریے میں بھی ان کو دو کتابیں فرض کر کے دو جگہ لکھا گیا ہے۔'' (ص 285)

ان تفصیلات کا ماحصل یہ ہے کہ:

(1) اشاریے میں ناموں کا اندراج ایک طے شدہ اصول کے تحت ہونا چاہیے، خواہ اس کے لیے اصل نام کو بنیاد بنایا جائے، خواہ خاندانی نام کو۔ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ بعض اندراج اصل نام سے اور بعض خاندانی

نام سے کیے جائیں۔ بعض شاعروں کا حوالہ ان کے تخلص سے اور بعض کا ان کے اصل نام سے دیا جائے۔

(2) ہر ردیف کے تحت ناموں کے اندراج میں لغت کے اندراج پر حروف کی سلسلہ وار ترتیب کا لحاظ رکھا جائے، یہ نہ ہو کہ صرف حرف اول کی رعایت کو کافی سمجھ کر جو نام جہاں چاہا درج کر دیا۔

(3) اشاریے اور اصل کتاب کے اندراجات میں مکمل مطابقت ہونا چاہیے۔ یہ نہ ہونا چاہیے کہ کسی شخص یا کسی کتاب کا نام بہ طور مثال اصل کتاب میں دس جگہ آیا ہو اور اشاریے میں صرف آٹھ مقامات کے حوالے دستیاب ہوں، یا جس صفحے پر وہ نام مذکور ہو، اس کی بجائے کسی اور صفحے کا نمبر درج کر دیا جائے۔

(4) بعض اشخاص اور بعض کتابیں بھی دو مختلف ناموں سے معروف ہوتی ہیں۔ اشاریے میں ان کا اندراج پہلے سے طے شدہ اصول کے مطابق کسی ایک ہی نام کے تحت ہونا چاہیے۔ دوسرے نام کے تحت صرف پہلے اندراج کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہوگا۔

تاریخ نگاری سے متعلق اپنے ان مشاہدات میں خاں صاحب نے جن جزئیات کا احاطہ کیا ہے، ہمارے یہاں ان کی طرف مناسب توجہ کی کوئی مستقل اور مستحکم روایت موجود نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اُردو میں اب تک کوئی ایسی تاریخِ ادب نہیں لکھی جا سکی ہے جسے پورے وثوق اور اعتماد کے ساتھ حوالے کی ایک کتاب کے طور پر استعمال کیا جا سکے۔ اسی کمی کو محسوس کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی کی کتاب پر تبصرے کے آخر میں خاں صاحب نے اس خیال کا اظہار فرمایا تھا کہ ''ایک بار اور سب امور سے قطع تعلق کر کے ادب کی تاریخ اس طرح لکھ دی جائے کہ دوسرے کام کرنے والے اس سے استفادہ کر کے اور اس کے مندرجات پر اعتماد کر کے نتائج نکال سکیں تو یہ بڑی خدمت ہوگی۔ ادب کی تاریخ کا مطلب یہ ہونا چاہیے کہ اس کے مندرجات (سنین، واقعات، متن وغیرہ) مستند ہوں تا کہ دوسرے ان سے بلا تکلف کام لے سکیں اور تب تنقید اپنے وسیع الذیل کام کی تکمیل کرنے کے قابل ہو سکے گی۔''

(جون سنہ 1995)

(سہ ماہی ترسیل، گوشہ رشید حسن خاں، مشترکہ شمارہ، 21-22، جنوری تا جون 1999، مدیر یونس اگاسکر، صفحہ 19 تا 28)

(تحقیق و تدوین مسائل اور مباحث، پروفیسر حنیف نقوی، صفحہ 190-203، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2016)

ooo

ڈاکٹر اشفاق محمد خاں

رشید حسن خاں صاحب

1963 کا واقعہ ہے کہ ایک دن مجھے ڈاکٹر عبدالعلیم [1] (سابق وائس چانسلر) نے بُلا کر دریافت کیا کہ ''علی گڑھ تاریخ ادب اُردو کی کتنی جلدیں فروخت ہو چکی ہیں؟ میں نے موصوف کو فوراً تعداد (غالباً دس بارہ) بتا دی علیم صاحب نے فرمایا کہ اس کتاب کی فروخت بند کر دیجیے۔ میں حیران ہوا کہ آخر ماجرا کیا ہے کہ اس قدر اہم تاریخ کی کتاب پر پابندی لگا دی گئی۔

میں نے دوسرے دن آفس جا کر علیم صاحب سے ڈرتے ڈرتے دریافت کیا کہ اس کتاب کی فروخت پر پابندی لگائی جانے کی آخر وجہ؟

(علیم صاحب کو جن حضرات نے قریب سے دیکھا ہے شاید وہی میری درج ذیل گفتگو کی تصویر کشی سے محظوظ ہو سکیں)

میرے سوال پر محترم کے سرخ چہرے سرخی دُگنی ہو گئی اور حسبِ عادت غصے والی کیفیت کے ساتھ ایک لمحے کے لیے سر اُٹھاتے ہوئے بولے ''آپ کو نہیں معلوم''؟

میں۔ جی نہیں

علیم صاحب۔ وہ بے شمار اغلاط کا مجموعہ ہے۔

میں۔ کس طرح کی اغلاط ہیں صاحب؟

علیم صاحب۔ (جھنجھلا کر) یہ آل احمد سرور صاحب سے جا کر پوچھیے۔

بس اتنا سن کر میں کرسی سے اُٹھا اور اپنے کمرے کی طرف دو قدم ہی چلا تھا کہ علیم صاحب (حسبِ معمول) ذرا سنیے۔

میں۔ جی فرمائیے۔

علیم صاحب۔ ابھی اس بات کا کسی سے ذکر نہ کیجیے گا۔

میں۔ بہتر ہے۔

(جیسے ہی مُڑا تھا کہ پھر حسبِ عادت)

میں۔ جی فرمائیے۔
علیم صاحب۔ ایک جلد اس تاریخ ادب اُردو کی کل چپراسی کے ہاتھ میرے گھر بھجوا دیجیے۔
میں۔ کیا آپ نے ابھی تک اس کو نہیں دیکھا ہے؟
علیم صاحب۔ جی نہیں۔ اس پر جو تبصرہ رسالہ ''تحریک'' میں رشید حسن خاں کا شائع ہوا ہے۔ بس وہ پڑھا ہے آپ بھی پڑھ لیجیے۔
راقم الحروف کا رشید حسن خاں صاحب سے غائبانہ تعارف پہلی بار علیم صاحب کے مزید اس جملے سے ہوا:
''ارے بھائی! رشید حسن خاں کے تبصرے نے اس تاریخ کی کتاب کی فروخت پر پابندی لگوادی۔''
تیسرے دن علیم صاحب نے چپراسی کی زبان مجھے یہ کہلا بھیجا کہ جن جن بک سیلرز کے پاس یہ کتاب پہنچ چکی ہے اگر ممکن ہو تو واپس منگوا لیجیے۔
مختصر یہ کہ رشید حسن خاں کے تبصرے نے پوری یونی ورسٹی اور یونی ورسٹی کے باہر اُردو کی باقی دُنیا میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔
''صدق جدید'' لکھنؤ کی 8 نومبر 1963 کی اشاعت میں درج ذیل عنوان سے ایک بیان شائع ہوا ملاحظہ فرمائیں:
نئی مسلم آزادی: (ایک ذمہ دار تبصرہ نگار رشید حسن خاں صاحب دہلی یونی ورسٹی کے قلم سے ماہنامہ تحریک دہلی میں)

''کتاب (تاریخ ادب اُردو) کا سب سے زیادہ قابلِ اعتراض حصہ اس کا پہلا باب ہے۔ جس کا عنوان ہے ''سیاسی اور تمدنی پس منظر'' اس باب کی تین خصوصیتیں قابلِ ذکر ہیں۔ ایک تو یہ کہ مجموعی طور پر کتاب سے اس کا کم سے کم تعلق ہے۔ بیش تر غیر متعلق باتوں پر مشتمل ہے۔ دوسری یہ کہ مقالہ نگار نے جگہ جگہ ایسا انداز بیان اختیار کیا ہے جو بہت سے لوگوں کی دل آزاری کا سبب بن گیا ہے۔ مقالہ نگار کو اس کا حق ہے کہ عظیم المرتبہ صوفیہ کو خیرات خور سمجھیں، اورنگ زیب کو دُنیا کا بدترین حکمراں مانیں، اکبر کے دینِ الٰہی کو منشورِ انسانیت قرار دیں۔ ان کو یہ بھی حق ہے کہ وہ مسلمان بادشاہوں کے خاص حکومتی اقدامات کو ''مسلم آئین'' حکمرانی کے مسلمہ اصول قرار دے کر طنز و تعریض کے تیروں سے اپنا ترکش خالی کریں اور اسی طرح اپنی وسیع الخیالی یا قوم پرستی کی صفت میں کچھ اور اضافہ کر لیں لیکن ان کو اس کا کوئی حق نہیں ہے کہ وہ تاریخ ادب کی کسی ایسی کتاب میں جو محض ان کے اندازِ فکر کی ترجمانی کے لیے مرتب نہیں کی گئی ہے ان مفروضات کو پیش کر کے نارسیدہ طلبا کو اپنے مخصوص خیالات کی تلقین کا نشانہ بنائیں۔ تاریخِ ادب کی کتابیں اس لیے مرتب نہیں کی جاتیں ان سے کوئی شخص اپنے ذاتی خیالات کی نشر و اشاعت کا کام لے جب کہ ایک قابلِ ذکر گروہ ان کو غلط سمجھتا ہو۔''

ذکر علی گڑھ کی تاریخِ ادب اُردو کا ہے جس کی تیاری کا غلغلہ مدت سے بلند تھا اور جس کی تحریر و ترتیب کے لیے شہرہ یہ تھا کہ یہ جدید مغربی اصولوں پر ہوگی۔ بہترین اہلِ قلم، اہلِ تحقیق کی اس میں شرکت ہوگی اور اس کے اڈیٹر سرور صاحب ہوں گے۔ کتاب میں علمی و تاریخی اور تحقیقی حیثیتوں سے جو عیب بکثرت موجود ہیں ان کی افسوس ناک تفصیل تو رشید حسن خاں صاحب کے اصل مقالے میں ملے گی یہاں ذکر صرف اس کے مذہبی و ملّی پہلو کا ہے۔ کون فرض کر سکتا تھا کہ مسلم آزادی کا یہ ریکارڈ ایک مسلم ادارہ (یعنی مسلم یونی ورسٹی کا ایک شعبہ) قائم کرے گا:

''سلطان اورنگ زیب عالم گیر کی ہجو تو بہتوں کا شعار رہ چکا ہے۔ مسلم آئین حکومت کی بدگوئی کرنے والے بھی دُنیا میں کم نہیں ہیں۔ صوفیائے کرام کی تحقیر و توہین سے بھی آلودہ بہت سے قلم رہ چکے ہیں۔ لیکن یہ خیال نہ تھا کہ ان مباحث عالیہ کے لیے گنجایش تاریخِ ادب اُردو کے ذہین و طباع اڈیٹر صاحب ان ہی لوگوں کے سُر میں سُر ملانا قرین مصلحت تصور فرمائیں گے۔''

مولانا عبدالماجد صاحب کی اس تحریر کا کتنا زبردست اثر پڑا ہوگا اس سے اہلِ نظر بے خبر نہیں ہوں گے۔ جب یہ کتاب باضابطہ واپس لے لی گئی تو اس وقت مولانا نے پھر ''صدق جدید'' کی اشاعت 15 فروری 1964 میں اس طرح اپنی مسرت کا اظہار کیا:

''اُردو ادب اور علی گڑھ یونی ورسٹی کے بہی خواہوں کو یہ سُن کر مسرت ہوگی کہ علی گڑھ تاریخِ ادب اُردو کی فروخت روک دی گئی ہے۔ تحریک میں اس کتاب پر جو تبصرے شائع ہوئے ہیں ان کی اُردو کے مشہور ترین اخباروں، جریدوں اور ارباب ادب نے تائید کی تھی۔ ہمیں خوشی ہے کہ اربابِ اقتدار نے رائے عامہ کا احترام کیا اور اس کتاب کی فروخت کو بند کر دیا جو ایک ایسے تعلیمی ادارے کی پیشانی پر داغ تھی جو درخشاں روایات کا حامل ہے اس سے (فلاں اور فلاں صاحب) کی رسوائی میں تو ضرور اضافہ ہوگا۔ لیکن مسلم یونی ورسٹی کی پیشانی سے داغ رسوائی دُھل جائے گا۔ ہم اس صحیح فیصلے کے لیے اربابِ بست و کشاد کو ہدیہ تبرک پیش کرتے ہیں۔ بے شک یہ فیصلہ قابلِ مبارک باد ہے اور ملت کا صحیح احتجاج کامیاب رہا لیکن اس کی داد رشید حسن خاں صاحب کو ملنا چاہیے جس کا تبصرہ واقعی بصیرت افروز تھا۔ کیا اچھا ہو کہ اب کتاب نظر ثانی و ترمیم کے لیے جن صاحبوں کے سپرد کی جائے اس جماعت کے ایک رُکن خود رشید حسن خاں صاحب ضرور رہوں۔''

اس کے بعد ہوا یہ کہ لوگ اس تاریخ کا نام تو بھول گئے مگر اس کے حوالے سے رشید حسن خاں صاحب کے نام ان کی ادبی، تحقیقی، کارناموں اور تنقیدی صلاحیتوں کی جستجو میں لگ گئے۔ خاں صاحب اس وقت دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو سے منسلک ہو چکے تھے اور راقم الحروف روزگار کے چکر میں علی گڑھ یونی ورسٹی میں بھلے بُرے دن گزار رہا تھا۔ فارغ التحصیل ہو کر جب روزگار کی تلاش میں دہلی پہنچا تو وہاں پر اپنے احباب پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی اور ڈاکٹر اسلم پرویز سے ملاقات ہوئی اور اتفاق سے مجھے بھی یہاں (جے این یو) روزگار نصیب ہو گیا۔ ان دونوں احباب کی وساطت سے ایک ایسی مبارک گھڑی بھی آئی کہ میری رشید حسن خاں صاحب سے ملاقات بھی ہوئی۔ چند ملاقاتوں میں ہی خاں صاحب کی دل کش، دل چسپ اور عالمانہ شخصیت نے مجھے ان سے بہت قریب کر دیا اور کچھ ایسا محسوس ہوا گویا مجھے کوئی کھوئی ہوئی قیمتی شے مل گئی۔

بہرحال اس قربت سے فائدہ اُٹھا کر رفتہ رفتہ میں نے اپنے ایم فل کے طلبا کو تحقیق و تدوین سے متعلق کورس کی تیاری کے سلسلے میں خاں صاحب کو لکچر دینے کے لیے زحمت دینا شروع کر دی۔ خاں صاحب نے ہمیشہ میری دعوت قبول کی اور جواہر لعل یونی ورسٹی میں تشریف لائے۔ میں بھی ان کے بیش قیمت لیکچرز سے مستفید ہوتا تھا۔ جب تک میں اور خاں صاحب دہلی میں رہے یہ رشتہ اور سلسلہ جاری

رہا۔

مخدومی رشید حسن خاں صاحب میرے بزرگ ہیں۔ذاتی طور پر''بزرگی بعقل است نہ بسال'' کا قائل ہونے کی بنا پر خاں صاحب کی بزرگی اور برتری تسلیم کرتا ہوں۔میرے نزدیک کسی شخص کی بزرگی اور برتری اور اس کی شخصیت جن جن عناصر سے تعمیر وتشکیل پاتی ہے ان عناصر میں اول اس کی عقل و دانش والی صفت ہے دوم اس کا مرتبہ علم وفضل اور کمال فن ہے اور سوم جسے عام طور پر عظمت کردار کہتے ہیں ان تین عناصر سے مرکب شخصیت کو بزرگ اور برتر ہونے کا اہل قرار دیا جاسکتا ہے۔سردست اس طرح کی بزرگ و برتر شخصیت کا نام میرے نزدیک رشید حسن خاں ہیں جن کی شخصیت سرتا پا آدمیت سے عبارت ہے۔

رشید حسن خاں صاحب جن کے اسلاف اگر تلوار کے دھنی تھے تو خود رشید حسن خاں کے حصے میں ایک ایسا علم آیا ہے جو تلوار کی دھار سے بھی زیادہ دھاردار ہے۔فیض احمد فیض کی شاعری پر قلم اُٹھانے کی جرأت خاں صاحب سے پہلے کسی کو نہیں ہوئی انھوں نے روایتی تنقید نگاری سے ہٹ کر منفرد اسلوب اور منفرد تنقیدی نقطۂ نظر سے''فیض کی شاعری کے چند پہلو'' پر جس حکیمانہ انداز سے تبصرہ فرمایا ہے یہ ان ہی کا حصہ ہے اور سچ یہ ہے کہ خاں صاحب سے میری دل چسپی اور قربت و یگانگت کا دوسرا پہلو یہ مضمون بھی ہے۔چناں چہ میں نے اپنی طبیعت کے مطابق خاں صاحب کے تمام مضامین (تلاش و تعبیر) ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالے۔عرصہ دراز کے بعد کسی کتاب کے پڑھنے میں بڑا ہی مزہ آیا خاں صاحب کا شائستہ لہجہ شگفتہ زبان اور رواں دواں اسلوب بیان میں حقائق کا بے باکانہ بیان دماغ کی بند کھڑکیوں کو دھڑا دھڑ کھولتا ہے چلا جاتا ہے۔درج ذیل بیان آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

> ''فیض کی اکثر غزلیں سپاٹ اور سرسری اشعار کا مجموعہ ہیں۔اس کے علاوہ زبان و بیان کے ایسے معائب ان میں موجود ہیں کہ خوش مذاقی آنکھیں بند کر لیتی ہیں۔کہیں بندشیں سست ہیں۔کہیں تعبیر ناقص اور کہیں یہ صورت ہے کہ مصرع تر شا ہوا ہے اور دوسرا مصرع اس کے برابر کا نہیں۔ردیفیں جگہ جگہ اکھڑی اکھڑی سی ہیں اور بہت سے قافیوں کو جن پہلوؤں سے بٹھایا گیا ہے وہ زبان حال سے فریاد کناں ہیں۔بہت سے اشعار میں مفرد لفظوں اور ترکیبوں کے استعمال میں بے طرح بے پروائی سے کام لیا ہے جس کی وجہ سے زبان کے بڑے بڑے عیب اور بیان کے واضح اسقام نمایاں ہوگئے ہیں۔''
>
> (تلاش و تعبیر،صفحہ 197)

یہ تبصرہ پڑھ کر میری حیرت کی انتہا نہیں رہی۔شاید اس لیے کہ اس سے قبل فیض کی شاعری پر اس طرح کے بے باکانہ تبصرے یا تنقید میری نظر سے نہیں گزرے تھے۔ہم سب ترقی پسند احباب فیض کی ذات اور تخلیقات سے اندھی عقیدت رکھتے تھے اور ان کو نہایت منکسر المزاج،علم دوست بے نیاز اور بے غرض انسان سمجھتے تھے۔مگر اب محسوس ہوتا ہے کہ ایسا کچھ نہ تھا۔اور غالباً رشید حسن خاں صاحب کی اس طرح کی کلام فیض پر تنقید کا نتیجہ ہی یہ ہوا کہ لندن کے فیض کے سمینار میں شرکت کرنے والے مندوبین اور مقالہ نگاروں کی فہرست جب آخری منظوری کے لیے فیض صاحب کے سامنے پیش کی گئی تو اس فہرست میں سے کئی نام فیض صاحب نے نکال دیے۔ان نکالے گئے ناموں میں سے ایک نام رشید حسن خاں صاحب کا بھی تھا (ایک معتبر راوی سے)

میں رشید حسن خاں صاحب کو گروہ بندی یا نظریہ ساز قسم کے ناقدین سے بالاتر،ادب کا ایک منفرد اور غیر جانب دار ناقد تسلیم کرتا ہوں اور ان کی ذات میں وہ تمام اعلا،عالمانہ،ناقدانہ اور مردم شناسی کے اوصاف پاتا ہوں جن بنا پر غالب نے کہا تھا:

تھی نگہ میری نہاں خانۂ دل کی نقاب
بے خطر جیتے ہیں اربابِ ریا میرے بعد

بلاشبہ ایسی نکتہ سنج،پاکیزہ طبیعت،اخلاق پسندیدہ اور روح بالیدہ صفات کے حامل انسانوں کو شاید ہمیشہ زندگی کے بے پناہ تلخ و ترش حقائق کا ذائقہ شناس ہونا پڑتا ہے اور طرح طرح کے نشیب و فراز سے گزرنا پڑتا ہے۔خاں صاحب نے بھی بڑی ریاضت،شفقت،شرافت و دیانت اور نفاست کے ساتھ زندگی کے حقائق کا مطالعہ اور مقابلہ مردانہ وار کیا ہے خوشامد اور بے جا انانیت اُن کا مزاج نہیں،وہ خودداری،اعلا ظرفی اور کچھ کچھ قلندری جیسی صفات و اقدار کا ایک حسین گل دستہ ہیں جن کے پاس گھنٹوں بیٹھیے کچھ سنیے،کچھ سنائیے کچھ سیکھیے اور خوش خوش اُٹھیے۔

علاوہ ازیں،رشید حسن خاں صاحب کی عالمانہ صلاحیتوں کا دوسرا اہم پہلو (جن کی طرف اشارتاً کہا جا چکا ہے) موصوف کی بے پناہ مخلصانہ اور بے باکانہ تحقیقی مشق و مہارت ہے۔علمی اور ادبی تحقیق کے سلسلے میں ہمارے علمائے کرام نے اپنے اپنے طور پر بہت کچھ لکھا ہے اور طرح طرح کی تعریفات اور اصطلاحات سے لفظ تحقیق کے معنی اور مطالب پر روشنی ڈالی ہے۔میرا ذاتی خیال ہے کہ تحقیق کا کام تنقید سے زیادہ جان لیوا ہے اور اس کا علمی حق وہی محقق ادا کرسکتا ہے جس کی فطرت میں تلاش و جستجو کا مادہ ہو اور اشیا کو دو دو چار کے حساب سے دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو نیز خود محقق کی شخصیت اور کردار حق گوئی اور بے باکی کی صفات سے بھی مزئین ہو۔بہ صورت دیگر کوئی بھی محقق کسی طرح کے علمی اور ادبی کارناموں کے تحقیقی اور تنقیدی رشتوں،موضوع اور ہیئت کی نسبتوں،زبان و بیان کی لطافتوں اور کشافتوں نزاکتوں اور پیچیدگیوں کو سمجھنے اور سمجھانے سے قاصر رہے گا اور اس کی تحقیق تنقید کی طرح لفظوں کے کھیل سے زیادہ قدر و قیمت کی حامل نہیں ہوسکے گی۔ہمارے بعض صاحب بصیرت و بصارت نقاد اس راز کو دانستہ طور پر نہ صرف نظر انداز کرتے ہیں بل کہ اپنی کمزوریوں اور ناقص فکر اور اقداریات کی پردہ پوشی کی خاطر طرح طرح کی اصطلاحیں گڑھتے رہتے ہیں۔مثلاً تحقیق اور منفی تحقیقی کی اصطلاحیں،جو راقم الحروف کی سمجھ سے کم از کم بالاتر ہیں۔تحقیق کا معاملہ حق و صداقت سے مشتق ہے،اس لیے تحقیق صرف تحقیق ہے نہ کہ مثبت اور منفی۔

بلاشبہ رشید حسن خاں صاحب کے تحقیقی کارناموں اور مشاغل کو ہم حق و صداقت کے اعلا معیار پر پرکھ سکتے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ عصر حاضر میں ان کی تحقیقی سرگرمیاں اُردو زبان و ادب کے سرمائے میں ایک بیش بہا اور مثالی اضافہ ثابت ہوں گی۔

1۔میں نے 56 میں 63 تک،پروفیسر عبدالعلیم کی ڈائریکٹرشپ میں یونی ورسٹی مطبوعات میں خدمات انجام دیں۔

(کتاب نما،مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،نئی دہلی،جلد 34،شمارہ 12،دسمبر 1994 صفحہ 35 تا 41)

(سہ ماہی ترسیل،رشید حسن خاں نمبر مشترک شمارہ 21-22 جنوری تا جون 1999،مدیر یونس اگاسکر،صفحہ 14 تا 18)

(تفکّرات، ڈاکٹر اشفاق محمد خاں، صفحہ 17 تا 24، ناشر ڈاکٹر اشفاق محمد خاں، بی۔1152۔اندرانگر لکھنؤ، سن اشاعت 2000)

☆۔یہ مضمون 'کتاب نما' مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی 2002 کے خصوصی شمارے 'رشید حسن خاں: حیات وادبی خدمات مرتب ڈاکٹر اطہر فاروقی، میں بھی شامل ہے۔اس کے بعد ڈاکٹر محمد آفتاب اشرف اور جاوید رحمانی نے اسے اپنی کتاب 'رشید حسن خاں کچھ یادیں کچھ جائزے (2008) میں بھی شامل کیا۔

☆۔خاکسار کو یہ مضمون ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینانے بہ ذریعہ ڈاک یکم جنوری 2017 کو روانہ کیا۔ریناصاحب کو یہ مضمون علی گڑھ سے ڈاکٹر عطا خورشید صاحب نے بھیجا تھا۔

○○○

ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی

رشید حسن خاں: ایک معتبر نام

اُردو میں ان دنوں تحقیق کا بازار گرم ہے۔ بہ ایں معنی کہ تحقیقی مقالے اس زوروشور سے لکھے جارہے ہیں کہ ہم سایوں کی نینداُڑی جارہی ہے۔لیکن ذرا گہرائی میں اُتر کر دیکھیے تو احساس ہوگا کہ اُردو تحقیق کی حالت نازک ہے۔سیکڑوں بل کہ ہزاروں کی بھیڑ میں معدودے چند افراد ہی ایسے ہوں گے جو تحقیقی ذہن ومزاج کے حامل اور اس کے تقاضوں پر عمل پیرا ہوں۔

قحط الرجال کے اس دور میں جناب رشید حسن خاں کی ذاتِ گرامی مغتنماتِ روزگار میں ہے۔ وہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی اور قاضی عبدالودود کی صالح روایت کے امین ہیں۔ دراصل تحقیق ان کے یہاں پیشہ ورانہ مجبوری نہیں، بل کہ روحانی تسکین اور مسرّت وبصیرت کا سامان ہے۔اس لیے پیشہ ور اور بالجبر محققوں سے ان کا اندازِ تحقیق بھی مختلف ہے۔اس کے ساتھ ہی قدرت نے انھیں ان صلاحیتوں سے بھی بہرۂ وافر عطا کیا ہے، جو علمی وادبی تحقیق کے لیے از بس ضروری ہیں، یعنی وسعتِ مطالعہ، قوتِ یادداشت اور کسی خاص موضوع پر کام کرتے وقت اس سے متعلق جزئیات ومسائل کا استحضار۔

ترتیب میں ان سب کے بعد، لیکن اہمیت کے لحاظ سے ان سب سے بڑھ کر دو وصف خاص اور بھی ہیں، جن سے خاں موصوف متصف ہیں، ایک تو وہ پیہم محنت ومشقت اور مسلسل ریاض جو فنی شاہ کاروں کی اساس اور اعلا فن کاروں کی پہچان ہے۔ دوسرے معروضی نقطۂ نظر اور علمی غیر جانب داری جو اشیا کو اپنی اصل شکل میں دیکھنے پر آمادہ کرتی اور حق گوئی و باطل شکنی کی جرأت وہمت عطا کرتی ہے۔

جناب رشید حسن خاں کی عالمانہ خصوصیات اور محققانہ کارناموں سے واقفیت بہم پہنچانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان کی علمی تحقیقی نگارشات کا براہ راست مطالعہ کیا جائے، تاکہ موصوف کی عرق ریزی اور جاں فشانی اور نکتہ رسی وژرف بینی قاری کے سامنے بہ ذاتِ خود جلوہ گر ہوجائے۔لیکن ہماہمی کے اس دور اور مصروف زندگی کے اس شور میں ٹھہرنے، دیکھنے اور غور کرنے کی فرصت کسے ہے؟

ع

فرصت کہاں تیری تمنا کرے کوئی؟

لیکن وہ جو کہا گیا ہے: ''مالا یدرک کلہ لایترک کلہ'' (جو تمام تر ہاتھ نہ آئے، اسے یک سر چھوڑ دینا بھی مناسب نہیں) اس کا تقاضہ ہے کہ اس موضوع پر اجمالاً ہی سہی کچھ نہ کچھ روشنی ضرور ڈالی جائے۔

اُردو میں ادبی تحقیق کی روایت بہت قدیم نہیں رہی ہے۔ ہمارے پہلے باقاعدہ محقق حافظ محمود شیرانی ہیں۔ ان سے پہلے کے بزرگوں میں وسعتِ مطالعہ اور علم کی کمی نہ تھی، لیکن ادبی مباحث میں صحت واستناد کے اصولوں کو ملحوظ رکھنا غیر ضروری تصور کیا جاتا تھا۔ حوالوں کے التزام کی کوشش کی جاتی تھی اور نہ روایت کے استناد وعدم استناد کی طرف توجہ دی جاتی تھی۔ شعرالعجم اور آبِ حیات میں کمزور اور بے سروپا روایات، نیز گوناگوں اغلاط کی بہ کثرت موجودگی کے پس پشت یہی ذہنیت کارفرما تھی کہ یہ کوئی دین وشریعت کے مسائل تو ہیں نہیں کہ قدم پھونک پھونک کر رکھا اور قلم سنبھال سنبھال کر چلایا جائے۔ شاعروں اور ادیبوں کا تذکرہ ہے، جو کچھ اور جیسا کچھ چاہو لکھ دو، مربوط اور دل چسپ ہونا شرط ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا اس صورتِ حال کو بدلنے کی پہلی کامیاب کوشش محمود شیرانی نے کی۔ ان کے بعد اس روایت کو آگے بڑھایا قاضی عبدالودود نے۔ قاضی صاحب نے اپنے محققانہ تبصروں اور مضامین ومقالات کے ذریعے نام نہاد محققین کی قلعی کھول دی۔ ادبی تحقیق کو وزن ووقار عطا کیا۔ معتبر اور غیر معتبر، صحیح اور سقیم کے درمیان تمیز کرنا سکھایا۔ جناب رشید حسن خاں اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی ہیں۔ انھیں قاضی عبدالودود سے باقاعدہ تلمذ تو حاصل نہیں لیکن قاضی صاحب کی تحریریں ان کے لیے معنوی استاد کا درجہ رکھتی ہیں۔ چناں چہ خاں صاحب کے یہاں بھی حوالوں کی صحت اور استناد کے مسائل خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا مضمون ''غیر معتبر حوالے'' خاص طور پر مطالعے کے قابل ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے اولاً حوالوں کی قبولیت کے چند شرائط بیان کیے ہیں۔ مثلاً:

☆ روایت اور واقعے کے درمیان طویل زمانی فصل حائل نہ ہو۔

☆ راوی غیر معتبر نہ ہو۔

☆ روایت پر غلط فہمی، جانب داری یا اس نوع کے دوسرے اثرات کا عمل دخل نہ ہو۔

☆ راوی کا زمانہ اگر نہ موخر ہو تو روایت کی بنیاد اوّلین ماخذ ہو۔

اس کے بعد انھوں نے غیر معتبر راویوں، غیر راویوں، غیر معتبر روایتوں اور غیر معتبر حوالوں کی بہ کثرت مثالیں پیش کی ہیں۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس ضمن میں بعض اقتباسات ملاحظہ ہوں:

''بیاضوں کے حوالے بالعموم مشکوک حوالوں کے ذیل میں آتے ہیں..... ایسی مثالیں موجود ہیں کہ بیاضوں کے حوالے سے کلام پیش کیا گیا اور بعد کو معلوم ہوا کہ وہ غیر معتبر تھا... بعض اور لوگوں کی طرح شیرانی مرحوم نے بھی اپنی کتاب پنجاب میں اُردو میں بیاضوں کے حوالے دیے ہیں۔ شیرانی صاحب کو میں اُردو میں تحقیق کا معلّم اوّل مانتا ہوں۔ ان کی تحریروں کو پڑھ کر ہم لوگوں نے تحقیق کے آداب سیکھے ہیں اور اس لحاظ سے ان کو استاد بل کہ استاد الاساتذہ کہنا چاہیے۔ مگر مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ کسی وجہ سے انھوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ پنجاب کو اُردو کو مولد ثابت کرنا ہے، پھر اس طے شدہ نقطۂ نظر کے تحت انھوں نے ہر طرح کے حوالوں کو بلا تکلف قبول کر لیا۔''

(ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ، طبع اُردو اکادمی، لکھنؤ، 1990، ص: 67-68)

ایک جگہ اور لکھتے ہیں:

''غیر معتبر ماخذ پر بھروسا کرنے سے کیا صورتِ حال پیدا ہو سکتی ہے، اس کی وضاحت کے لیے ایک مثال پیش کی جاتی ہے اور اسی ایک مثال سے مستند حوالے کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ شیرانی صاحب نے ولؔی کی آمدِ دہلی سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے: ''میر'' حسن کا بیان ہے کہ ولؔی عہد عالم گیر میں دہلی آئے لیکن آزاد 3 رجلوس محمد شاہی اس کی آمد کا سال بتاتے ہیں۔ میں آزاد کے بیان کو ترجیح دیتا ہوں، کیوں کہ ولی کا محمد شاہ کے عہد میں دلّی میں موجود ہونا، خود ولؔی کے ایک شعر سے، جو مولانا آزاد نے آبِ حیات میں نقل کیا ہے، ثابت ہے:

دل ولؔی کا لے لیا دلّی نے چھین
جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

گویا بہ قول آزاد، ولؔی 1135ھ میں دہلی میں وارد ہوئے۔''

(پنجاب میں اُردو، طبع اوّل، ص: 258)

محمد حسین آزاد معتبر راوی نہیں، اس بات سے شیرانی صاحب بہ خوبی واقف تھے۔ ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ ولؔی کے شعر کے لیے آبِ حیات مؤخر ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے، اس کے باوجود انھوں نے آزاد کے قول پر اعتبار کیا اور نتیجتاً مبتلائے غلط فہمی ہوئے۔ آزاد نے جس شعر کو ولؔی سے منسوب کیا ہے اور جس کی بنا پر شیرانی صاحب نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ولؔی 1135ھ میں دہلی میں وارد ہوئے، اس شعر کا ولؔی سے کچھ تعلق نہیں، وہ دراصل شرف الدین مضموؔن کا ہے چھچھی نرائن شفق کے تذکرے چمنستانِ شعرا (مطبوعہ انجمن ترقی اُردو ہند) میں مضموؔن کے نمونۂ کلام میں یہ شعر اس طرح لکھا ہوا ملتا ہے:

اس گدا کا دل لیا دلّی نے چھین
کوئی جا کر کہو محمد شاہ سوں

(بہ حوالہ بالا۔ ص: 79-80)

تذکرۂ معاصرین مرتبہ مالک رام کے متعلق رقم طراز ہیں:

''اس تذکرے میں مرحوم ہونے والے معاصر شعرا وادبا کا حال لکھا گیا ہے، جو شاعر تھے، ان کا نمونۂ کلام بھی شامل کیا گیا ہے۔ مؤلف نے بیش تر مقامات پر یہ نہیں بتایا کہ یہ معلومات انھیں کہاں سے حاصل ہوئیں؟ اب اگر کوئی شخص مزید تحقیق یا تصدیق کی غرض سے یہ معلوم کرنا چاہے کہ جو بات لکھی گئی ہے، وہ کہاں سے ماخوذ ہے؟ تو اسے کچھ معلوم نہیں ہو سکتا... مثلاً شفا گوالیری کے متعلق مؤلف نے لکھا ہے: ''سید حسن یہیں گوالیر میں دوشنبہ 12 رمضان 1330ھ (26 اگست 1912) کو پیدا ہوئے۔ تاریخی نام ''مظہر علی'' تھا

جس سے 1330ھ برآمد ہوتے ہیں۔'' (تذکرۂ معاصرین، طبع اوّل، جلد اوّل، ص:72)...مگر اس نام سے بے اعتباری میں مزید اضافہ ہوجاتا ہے۔''

(بہ حوالہ بالا۔ص:85)

حوالوں کے اعتبار و عدم اعتبار کی طرح متن کے استناد و عدم استناد سے متعلق خاں صاحب کے تبصرے اور تجزیے بھی نہایت فکر انگیز ہیں۔ مثلاً:

☆۔اساتذہ کے دواوین، قدیم نثری تصانیف، تذکروں کے متن بہ صورت موجودہ بہت کم قابلِ اعتماد ہیں۔ ان کو جب تک آدابِ تدوین کی مکمل پابندی کے ساتھ مرتب نہ کیا جائے، اس وقت تک ان کے متن کو شبہات سے محفوظ نہیں قرار دیا جاسکتا۔ لہٰذا اختلافِ متن، انتساب اشعار، قواعد زبان، تذکیر و تانیث، تلفظ، املا اور تالیفِ لغات وغیرہ کے سلسلے میں جب انھیں بہ طور ماخذ استعمال کرنا اور ان کا حوالہ دینا ہو تو بہت احتیاط سے کام لینا چاہیے اور حتی الامکان دوسرے مآخذ سے بھی متن کی تصدیق کر لینی چاہیے۔

☆۔''بہت سے معروف شعر جس طرح زبان زد ہیں، دواوین کے موجودہ قابلِ ذکر نسخوں میں وہ اس طرح نہیں ملتے۔''

☆۔''لغات، تذکیر و تانیث اور قواعد سے متعلق رسائل میں ایسے اشعار بھی موجود ہیں جو بہ راہ راست اصل مآخذ سے منقول نہیں۔''

☆۔''ایسی کتابیں موجود ہیں جو یک سر جعلی ہیں یا مشکوک واقعات کا گنجینہ ہیں اور یہ بھی معلوم ہے کہ بعض مصنفین کو سخن طرازی اور واقعہ آفرینی کا شوق ہوتا ہے۔''

☆۔ان امور کی شرح و تفصیل میں جانا ہو تو خاں صاحب کے معرکہ آرا مضمون ''حوالہ اور صحتِ متن'' کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ یہاں اس کا ایک مختصر اقتباس ملاحظہ ہو:

''میؔر کا ایک شعر اس طرح زبان زد ہے:

سرھانے میؔر کے آہستہ بولو

ابھی وہ روتے روتے سو گیا ہے

آبِ حیات (مطبوعہ 1889) میں بھی اسی طرح ہے (ص:151)۔ اس کی اشاعت دوازدہم بھی پیشِ نظر ہے (مجموعہ اتحاد پریس، لاہور) اس میں بھی اسی طرح ہے (ص: 156) لیکن کلیاتِ میؔر کے نسخۂ آسی (ص:207) میں اس کی صورت یہ ہے:

سرھانے میؔر کے کوئی نہ بولو

ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

یہاں بھی نسخۂ آسؔی کا متن مرجح معلوم ہوتا ہے۔

(ادبی تحقیق۔ص:105)

ذوقِ افسانہ تراشی کی ایک دل چسپ مثال خاں صاحب نے مفتی انتظام اللہ شہابی کی پیش کی ہے۔ مفتی صاحب نے نصر اللہ خاں قمؔر خورجوی کے تذکرے ''ہمیشہ بہار'' کے حوالے سے میر امؔن کا سالِ وفات بیان کر دیا اور سلسلے میں تذکرۂ مذکور سے فارسی اقتباس بھی نقل کر دیا۔ تائید مزید کے لیے مولوی مجتبیٰ حسین گوپاموی کی کتاب مواقیت الفواتح کا حوالہ بھی دے دیا اور اس کی بھی فارسی عبارت نقل کر دی۔ جناب ممتاز حسین مرتب باغ و بہار (اُردو ٹرسٹ، کراچی 1958) نے مفتی صاحب کے شکریے کے ساتھ ان نادر اطلاعات کو قبول بھی فرمالیا۔ اس سلسلے کی تفصیلات قلم بند کرنے کے بعد خاں صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''مفتی صاحب نے جس مطبوعہ تذکرے کا حوالہ دیا تھا، بل کہ عبارت بھی نقل کی تھی.....اس تذکرے کی اشاعت اوّل کا ایک نسخہ رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے، اس کو دیکھنے پر معلوم ہوا کہ اس میں احسؔن کے ترجمے میں سرے سے وہ عبارت ہی نہیں، جسے مفتی صاحب نے نادر اطلاع بنا کر پیش کیا ہے اور جسے ممتاز حسین صاحب نے نہایت مسرّت کے ساتھ قبول کیا ہے۔ اس تذکرے میں احسؔن تخلص کے صرف ایک شاعر کا ذکر ملتا ہے، جس کا میر امن سے کچھ تعلق نہیں۔ یہ تذکرہ میر امن کے ذکر سے خالی ہے.... ہاں مفتی صاحب نے جس قلمی کتاب مواقیت الفواتح کا نام لیا ہے، اس کے وجود سے بھی لوگ باخبر نہیں۔ مفتی صاحب کا شمار غیر معتبر راویوں میں کیا جاتا ہے۔''

(بہ حوالہ بالا۔ص:112۔114)

علمی احتسابات اور تحقیقی استدراکات کسی قوم کا بیش قیمت سرمایہ ہوتے ہیں۔ ان کی موجودگی کو عالمانہ شعور و آگہی کی علامت اور فقدان کی فکری تہی مائیگی کی دلیل ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ لیکن نام نہاد محققین اس عملی جراحی سے خوش ہونے کے بجائے چیں بہ جبیں نظر آتے، بل کہ ذاتی خصومت و عناد پر اُتر آتے ہیں۔ دراصل تحقیقی اعتراضات کے لیے زیادہ وسیع علم اور زیادہ دقّت نظر کی ضرورت ہوتی ہے قاضی عبدالودود کی قائم کردہ احتساب کی اس روایت کو رشید حسن خاں نے نہ صرف برقرار رکھا، بل کہ معیار و میزان کا درجہ عطا کیا۔ اس سلسلے میں ان کے مندرجہ مضامین خاص اہمیت کے حامل ہیں:

1۔دیوانِ غالب۔صدی اڈیشن (مرتبہ مالک رام) مشمولہ ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ

2۔اُردو شاعری کا انتخاب (مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زؔور)۔ایضاً

3۔علی گڑھ تاریخ ادب اُردو (مرتبہ آل احمد سرور و مجنوں گورکھپوری)۔ایضاً

4۔تاریخ ادب اُردو (مصنفہ ڈاکٹر جمیل جالبی)۔ایضاً

5۔ترقی اُردو بورڈ کا لغت، مشمولہ تفہیم مکتبہ جامعہ 1993

ان مضامین کے مواد و مشتملات کا مختصر ترین تذکرہ بھی پیشِ نظر مضمون کو طویل تر بنادے گا، اس لیے ہم صَرفِ نظر کرتے ہوئے صرف اتنا عرض کرتے ہیں کہ ان کا مطالعہ اربابِ ذوق حضرات کے لیے سرمۂ بصیرت ثابت ہوگا۔ تدوین متون، انتخاب کلام، ادبی تاریخ نویسی اور تالیف لغات کا کام کن اصولوں کے تحت انجام دینا چاہیے اور اس سلسلے میں کن امور سے احتراز و اجتناب لازم ہے؟ اس کی پوری

رہ نمائی ان مضامین میں موجود ہے۔ بس ضرورت اس کی ہے کہ وقت نکالا جائے اور انھیں دل لگا کر پڑھا جائے:

سر سے پا تک ہوں، حرف حق کی طرح
یاد کر لو مجھے سبق کی طرح

(فضاؔ ابن فیضی)

یوں تو ادبی علوم کے متعدد شعبے ایسے ہیں جن پر خاں صاحب کو دسترس حاصل ہے مثلاً علم عروض، علم قافیہ اور صنائع و بدائع وغیرہ۔ لیکن معدودے چند سہی ان کے دوسرے ماہرین بھی ہمارے یہاں موجود ہیں۔ قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ خاں صاحب نے ادبی تحقیق کے ایسے کئی میدانوں کا بھی انتخاب کیا ہے، جن کے وہ تنہا شہ سوار ہیں، اور ان میں انھوں نے ایسا علم امتیاز بلند کیا ہے کہ کوئی دوسرا ان کے قریب بھی نہیں پہنچتا۔ مثلاً قواعد و زبان، اساتذۂ اُردو کے مختارات لکھنؤ اور دہلی کے دبستانی اختلافات، اصلاحِ سخن، معائبِ سخن، تذکیر و تانیث، تلفظ اور املا نیز لغات وغیرہ۔ ان موضوعات و مباحث سے متعلق خاں صاحب کی معلومات حیرت انگیز حد تک وسیع ہیں۔ میں یہاں مثال کے طور پر موصوف کے مضمون صحتِ الفاظ کا ایک اقتباس نقل کرتا ہوں۔ واضح رہے کہ یہ مضمون 145 صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں قاموس الاغلاط (مرتبین مولانا سید مختار احمد و مولانا ذہن صاحبان) کے بہت سے مندراجات سے عالمانہ اختلاف کیا گیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''مہوس، مرغن، مفرور: مہوس غلط ہے، ہوس سے بنالیا ہے، جیسے روغن سے مرغن۔

مفرور غلط ہے۔ عربی میں مفرور کی جگہ فرّ و فار ہے، جو فارسی و اُردو میں مستعمل نہیں ہے۔ مفرور کی جگہ ''فرار شدہ'' کہہ سکتے ہیں۔ (قاموس) غنیمت ہے کہ مؤلفین قاموس نے ''فرار شدہ'' ہی بولنے کی فرمایش کی، اگر یہ لکھ دیتے کہ مفرور کی جگہ ''فر'' یا ''فار'' ہی بولنا چاہیے تو کوئی کیا کر سکتا تھا۔ مرغّن، روغن سے اور مہوس، ہوس سے بنا لیے گئے ہیں۔ اس طرح کے الفاظ کی ایک طویل فہرست پیش کی جا سکتی ہے، جو عربی الفاظ کے قیاس پر فارسی یا اُردو میں بن گئے ہیں۔ مثلاً فلک سے فلاکت اور مفلوک فارسی میں بنا لیے گئے ہیں۔ روغن سے مرغّن اُردو میں بن گیا ہے۔ کسی تفریق کے بغیر، یہ سب لفظ اُردو کے مستعمل اور قطعاً صحیح لفظ ہیں۔

آصفیہ میں ''مفرور'' اور ''ملبّب'' کو عربی لکھا گیا ہے۔ یہ درست نہیں، ''مرغّن اس میں موجود نہیں البتہ ''مہوس'' کو کیمیا گر کے معنی میں اُردو لکھا گیا ہے اور یہ درست ہے۔ کیوں کہ کیمیا گر کے معنی میں یہ اُردو نژاد ہے۔ نور میں ''مہوس'' کو صحیح طور پر اُردو لکھا گیا ہے، البتہ ''مفرور'' کو اس میں عربی لکھا گیا ہے، جیسا کہ لکھا جا چکا ہے یہ درست نہیں۔ ''ملبّب'' کے ذیل میں مؤلف نور نے لکھا ہے: ''فصحائے متاخرین اس جگہ 'لباب' ہی فصیح سمجھتے ہیں۔'' یہ قید بھی غیر مناسب ہے۔ ''مدمغ'' اور معتوب'' اور ''مقروض'' کی طرح اسے بھی عام الفاظ میں شامل سمجھنا چاہیے۔ ''مہوس'' کی بعض اسناد پیش کی جاتی ہیں۔ نور و آصفیہ میں اسناد موجود نہیں:

اے، مہوس! جو ملی خاک در جاناں کی
ایک چٹکی میں مس قلب ہے کندن کیسا

صباؔ (دیوان۔ ص:189)

بے تابی دل کو مری سمجھے مہوس
اس نسخے سے ہم کرتے ہیں سیماب شگفتہ

انشاؔ (کلام انشا ص189)

اچھوں سے برے مل کے بنا لیتے ہیں جوڑ مکار مہوس ہیں، زمانہ ہے دغل کا

بحرؔ (ریاض البحر۔ ص:13)

اکسیر پر مہوس! اتنا نہ ناز کرنا
بہتر ہے کیمیا سے اپنا گداز کرنا

میر دردؔ (دیوان، مکتبہ جامعہ، ص:15)

سنا جائے ہے ایک مہوس کا حال
کہ رکھتا تھا نت کیمیا کا خیال

قائمؔ

قدم یار تلک پہنچوں تو پارس ہوں میں
اے مہوس! تجھے اکسیر مبارک ہووے

میر سوزؔ

''مزیّب''، ''مزلّف''، ''ملبّب'' یہ سب الفاظ استعمال کیے گئے ہیں:

وہ چھوٹے چھوٹے خود، وہ زر ہیں تنوں میں تنگ
بوٹا سا ان قدوں پہ مزیّب صلاح جنگ

شادؔ عظیم آبادی (مراثیِ شاد، اوّل۔ص:131)

سادگی سے سبزۂ رخسار انسب ہو گیا
کیا مزلّف ہوتے ہی چہرہ مزیّب ہو گیا

رشکؔ (مجموعہ دواوین رشک۔ص:73)

تنگ اسغنا ہے، ہوں منت کش ساقہ اگر
شیشۂ دل میں ملبّب بادۂ خوناب ہے

فغاںؔ (دیوان۔ص:129)

مؤلف رسالہ اصلاح نے لکھا ہے:

''متلاشی بہ معنی تلاش کنندہ، مرغن بہ معنی روغن دار یا اس قسم کے دوسرے الفاظ جن کا مادہ عربی نہیں، مگر ان کا اشتقاق بہ طور عربی ہوا ہے، اور عام طور پر بولے جاتے ہیں، ان کے استعمال میں میرے نزدیک کچھ مضائقہ نہیں۔(رسالہ اصلاح۔ص:30)۔''

(زبان اور قواعد۔طبع اوّل 1976ء،ص:144-142)

اس اقتباس سے بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ خاں صاحب نے ایک ایک لفظ کے سلسلے میں شعرا اُردو کے دواوین، اُردو فارسی کے لغات اور دیگر متعلقہ کتابیوں کو کس طرح کھنگال ڈالا ہے۔ اوپر کی گفتگو صحتِ الفاظ سے متعلق تھی، اب ایک بحث تذکیر و تانیث سے متعلق بھی ملاحظہ ہو:

ایجاد:

''اس لفظ کی داستان خاصی دل چسپ ہے۔اساتذۂ دہلی و لکھنؤ نے بالعموم (اور بالاتفاق) اس لفظ کو مذکر استعمال کیا ہے۔لیکن متعدد تصریحات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس تذکیر و تانیث کسی نہ کسی حد تک معرض بحث رہی ہے۔اگر چہ تانیث کی کوئی مثال پیش نہیں کی جاسکی ہے۔شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ (کچھ لوگوں کی) بول چال میں بہ تانیث آ جاتا ہوگا، چوں کہ جملہ اساتذہ اس کو مذکر مانتے رہے ہیں، اس لیے بہ تانیث نظم کرنے کی جرأت نہیں کی جاسکی۔پھر ہوا یہ کہ جس لفظ کو دونوں دبستانوں کے اساتذہ متفقہ طور پر مذکر مانتے آئے تھے، رفتہ رفتہ اس کی تانیث کی طرف رُجان بڑھتا گیا۔یہاں تک کہ آج کل عام طور پر اس کو مونث استعمال کیا جاتا ہے۔

مفید الشعرا، ارمغانِ احباب، امیر اللغات اور آصفیہ میں اس کو صرف مذکر لکھا گیا ہے اور اختلاف کا مطلق ذکر نہیں کیا گیا ہے۔صفیر نے بھی رشحات میں اس کو مذکر ہی لکھا ہے اور اس صراحت کے ساتھ کہ ''مولف کہتا ہے کہ 'ایجاد' جو مونث مشہور ہے، اس کی سند مجھے ابھی تک نہیں ملی'' (ص 151)۔اسی کتاب میں انھوں نے ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ: ''عوام میں ایجاد کا لفظ مونث مستعمل ہے، حالاں کہ مذکر ہے'' (ص:224)۔نور میں بھی اس کو مذکر لکھا گیا ہے، مگر اس صراحت کے ساتھ: ''بعض حضرات کی زبان پر یہ لفظ مونث ہی ہے۔'' مطلب یہ ہے کہ تانیث کا گزر محض گفتگو تک تھا، خواص اس کو مذکر ہی مانتے تھے اور نظم میں مذکر ہی لایا جاتا تھا۔یہی وجہ کہ تانیث کی کوئی سند پیش نہیں کی جاسکتی اور صفیر کو یہ لکھنا پڑا کہ: ''ایجاد جو مونث مشہور ہے، اس کی سند مجھے ابھی تک نہیں ملی۔''

مولف معین الشعرا نے ایجاد کو مذکر لکھ کر حاشیے میں یہ بھی لکھا ہے کہ امیر اللہ تسلیم نے اسے مونث بھی نظم کیا ہے اور سند میں تسلیم کا یہ شعر بھی لکھا ہے:

رشک اعدا سے کیا، تسلیم خستہ کو شہید + دیکھیے ایجاد اس ترک ستم ایجاد کی۔لیکن مولف کا خیال صحیح نہیں، مخدومی امتیاز علی خاں عرشی خط سے معلوم ہوا کہ اس غزل کی ردیف ''کی'' کے بجائے ''کا'' ہے۔یہ غزل ان کے دیوان موسوم بہ نظم دل افروز میں ص:309 پر ہے۔اس طرح یہ واضح ہوتا ہے کہ اس لفظ کی تانیث کی کوئی سند نہیں ملی تھی۔

امیرؔ مینائی نے امیر اللغات میں تو اختلاف کی طرف اشارہ نہیں کیا، البتہ ایک خط میں اس کا ذکر کیا ہے:

''ایجاد' مذکر ہے۔اس لفظ کی تذکیر و تانیث میں بحث چھڑی ہوئی ہے، سنا جاتا ہے کہ نواب مرزا خاں صاحب داغؔ کا قول ہے کہ دلّی میں مونث ہے، مگر کلام میں مونث کا پتا نہیں ملتا اگر ایک معتبر شاعر نے بھی مونث کہا ہو تو کہا جاتا کہ مختلف فیہ ہے اور بغیر کلام میں آئے ہوئے کہیں بول چال میں ہونا کافی نہیں۔'' (مکاتیبِ امیر مینائی۔طبع دوم ص:142)

امیرؔ نے جو کچھ لکھا ہے وہ سب صحیح ہے، مگر انھوں نے داغؔ سے جس قول کو منسوب کیا ہے، وہ قطعاً درست نہیں، یہ روایت بالکل غلط ہے کہ داغؔ اس لفظ کو مونث کہتے تھے۔صورتِ حال اس کے بر عکس ہے۔داغؔ کے کسی شاگرد نے اپنی غزل میں ایجاد کو مونث لکھ دیا اور وہ غزل چھپ بھی گئی، اس پر داغؔ نے برہمی کے عالم میں مولانا احسن مارہروی کو لکھا تھا:

''ایک اشتہار اس گل دستے میں آپ چھاپ دیجیے۔اکثر استاد کے شاگرد بجائے خود استاد بن کر، اپنی غزلیں بے اصلاحی چھپوا دیتے ہیں، اس میں غلطیاں رہ جاتی ہیں۔کسی شخص نے لفظ 'ایجاد' اور 'ارشاد' کو مونث باندھا، حالاں کہ اہلِ دہلی کی زبان پر دونوں لفظ مذکر ہیں۔'' (انشائے داغؔ۔ص:123)

اس سلسلے میں مولانا احسن مارہروی نے داغؔ کے ایک خط کے جواب میں لکھا تھا:

''میری غزل میں 'ایجاد' کہیں مونث نہیں ہے اور میں نے لکھا۔غالباً حضور نے ملاحظہ نہیں فرمایا۔میاں احسنؔ شاہ جہاں پوری نے مونث لکھا ہے، جس کی اگلے پرچے میں صحت ہو جائے گی۔خدا جانے کیا بات ہے کہ ایسے کہنہ مشق بھی ایسی فاش غلطیاں کرتے ہیں۔'' (انشائے داغؔ۔ص:136)

مختصر یہ کہ بعض لوگوں کے علاحدہ دہلی و لکھنؤ کے مستندین اس لفظ کو بالاتفاق مذکر مانتے رہے ہیں۔مگر رفتہ رفتہ اس لفظ کی تانیث کی طرف رجحان بڑھتا گیا۔مولانا احسنؔ مارہروی کے خط کا اقتباس اوپر پیش کیا گیا ہے، جس میں انھوں نے اس لفظ کو مونث نظم کرنے کو 'فاش غلطی' بتایا ہے، اور اپنی طرف سے استاد کو یقین دلایا ہے کہ مجھ سے یہ غلطی نہیں ہوئی۔یہی مولانا احسنؔ ایک زمانے کے بعد اپنی کتاب

تاریخ نثر اُردو میں لکھتے ہیں:

''لفظ ایجاد کہ اس کو تمام یا بہ کثرت شعرائے دہلی و لکھنؤ نے مذکر استعمال کیا ہے، لیکن اب چند شعرا کے سوا، اس کی تذکیر پر ہر شخص کو تامل ہے۔ یہی حال لفظ ''فہم'' وغیرہ کا ہے۔'' (تاریخ نثر اُردو۔ص: 358)

آج کل عام طور پر یہ لفظ بہ تانیث سننے اور دیکھنے میں آتا ہے، جیسے امریکہ کی ایک نئی ایجاد۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ امریکا کا ایک نیا ایجاد ۔1۔ یا جیسے: ''زبانوں کا سیکھنا سکھانا ،نسبتاً جدید زمانے کی ایجاد ہے۔'' مولوی عبدالحق صاحب (قواعد اُردو۔ص:3)۔ حضرت آثر لکھنوی نے میرے استفسار کے جواب میں لکھا تھا: ''ایجاد'' اور ''اپیل'' میری زبان پر مونث ہیں، مگر اس کے برخلاف بھی سنا ہے۔ تذکیر و تانیث کے لحاظ سے مختلف فیہ کہنا مناسب ہوگا''۔ (مکتوب بہ نام راقم الحروف)۔ مناسب یہ ہے کہ فی الحال اس لفظ کو مختلف فیہ مان لیا جائے۔ اس صراحت کے ساتھ کہ اب عام طور بہ تانیث استعمال میں آتا ہے۔ کثرت استعمال کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ کچھ دنوں بعد استعمال عام میں صرف مونث مانا جائے گا۔ ہاں یہ بات لکھنے سے رہ گئی کہ اس سے پہلے امیر خود امیر للغات (جلد دوم۔ص:299) میں داغ کا یہ شعر ''ایجاد'' کی تذکیر کی سند کے طور پر لکھ چکے تھے۔:

ایجاد ستم سے ہمیں برباد کریں گے
گر تمیں دن ایسے ہی وہ ایجاد کریں گے

یہ شعر گلزارِ داغ میں ہے (ص:226) اس کے بعد داغ کے متعلق امیر کو یہ بدگمانی ہونا چاہیے تھی کہ وہ ایجاد کو مونث کہتے ہوں گے۔ یا یہ کہتے ہوں گے کہ دہلی میں مونث ہے۔''

(زبان اور قواعد، ص:177-173)

مذکورہ بالا اقتباس خاصا طویل ہے۔ طوالت کے باوجود اسے یہاں بہ وجوہ نقل کیا گیا ہے۔ اوّلاً اس لیے کہ خاں صاحب کے ذوقِ تلاش و تفحص اور احاطہ و استیعاب کا اندازہ پورے اقتباس کو پڑھے بغیر نہیں لگایا جا سکتا تھا۔

ثانیاً اس طرف بھی توجہ دلانا ہے کہ الفاظ بھی انسانوں کی طرح اپنی اصل و نسل رکھتے ہیں۔ ان کے بھی مختلف احوال و کوائف ہوتے ہیں۔ ان کی بھی شکل و صورت اور حرکات و سکنات میں تبدیلی آ جاتی ہے۔ اسی طرح جنس کا معاملہ یہاں بھی کبھی کبھی مختلف فیہ بن جاتا ہے۔ لیکن ان امور پر نظر رکھنے والا اور اپنے حاصل مطالعہ کو صدہا صفحات میں محفوظ کر دینے والا ہمارے بزرگ رشید حسن خاں کے اور کون ہے؟

ثالثاً یہ بتایا ہے کہ لغات کے علاوہ، اساتذۂ اُردو کے مکاتیب پر خاں صاحب کی نظر کتنی گہری ہے اور ادبی و لغوی مباحث کے سلسلے میں انھیں کس طرح کام میں لاتے ہیں نیز یہ کہ جس شخص نے بہ نظر غائر ان خطوط کا مطالعہ نہ کیا ہو، وہ شعرائے متاخرین کے متروکات مختارات کے موضوع پر لب کشائی کی جرأت کیوں کر سکتا ہے؟ خاں صاحب کے مضامین ''مختاراتِ امیر مینائی (زبان اور قواعد) اور (امیر مینائی اور معاصر اساتذہ کے مکاتیب'' (غالب نامہ، جولائی 1994) میں اس سلسلے کی تفصیلات قابلِ دید ہیں۔

ادبی تحقیق کے ان مختلف شعبوں کے علاوہ جن کا تذکرہ گذشتہ صفحات میں اجمال و تفصیل کے ساتھ کیا گیا، کلاسیکی متون کی تدوین کے سلسلے میں بھی خاں صاحب کو خصوصی شہرت اور امتیاز حاصل ہے۔ اس سلسلے میں ان کی مرتبہ دو کتابیں فسانۂ عجائب اور باغ و بہار منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ (تیسری گلزارِ نسیم، عن قریب منصۂ شہود پر آنے والی ہے۔ 2)

مقدمۂ ابن خلدون کی شہرت چہار دانگ عالم میں ہے، لیکن کہا جاتا ہے کہ ابنِ خلدون نے تاریخ نویسی کے جو اصل مقدمہ میں قائم کیے ہیں، وہ انھیں خود اپنی تاریخ میں نبھا نہیں سکے ہیں۔ چناں چہ تاریخ ابن خلدون میں تاریخ نویسی کے وہ سارے عیوب موجود ہیں، جن پر ابنِ خلدون نے اپنے مقدمے میں سخت تنقید کی ہے۔ لیکن رشید حسن خاں پر اس قسم کا کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا کہ انھوں نے تدوین متن کے سلسلے میں خود اپنے قائم کردہ فلاں فلاں اصولوں کی خلاف ورزی کی ہے، بل کہ ان کی مرتبہ کتابوں کے مطالعے کے بعد یہی تاثر قائم ہوتا ہے کہ موصوف نے اپنی تمام تر وہبی و اکتسابی صلاحیتیں یہاں صرف کر دی ہیں اور ساری عمر کے مطالعے اور معلومات کا عطر ان کتابوں کے حواشی میں کشید کر کے رکھ دیا ہے۔ اس میں کوئی شک شبہ نہیں کہ ان کی مرتبہ کتابیں تدوینِ متن کا معیاری اور مثالی نمونہ ہیں۔

محقق رشید حسن خاں کہ یہ خصوصیت بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان کا تحقیقی ذوق و مزاج، ان کے ناقدانہ شعور و آگہی کے لیے حائل اور حجاب نہیں بنا۔ چناں چہ موصوف کے تنقیدی مضامین ان کی شعر فہمی و سخن سنجی اور اسالیب زبان و بیان سے مکمل واقفیت پر شاہد عدل ہیں۔ بل کہ یوں کہیے کہ وہ ادب کے حسن و لطافت کی تہہ بہ تہہ لہروں کے ارتعاش کو بھی محسوس کر لیتے ہیں۔ نیز الفاظ کی جو ہر توانائی کے اسرار و رموز پر بھی کماحقہ نظر رکھتے ہیں۔ اسی طرح زبان و بیان کے اسقام سے ان کی واقفیت بھی عالمانہ ہے۔ اس سلسلے میں ان کی کتاب تلاش و تعبیر (طبع 1988) کے بیش تر مضامین عموماً اور مضامین ذیل خصوصاً لائقِ توجہ ہیں:

1۔ جوش کی شاعری میں لفظ اور معنی کا تناسب

2۔ فیض کی شاعری کے چند پہلو

3۔ زبان و بیان کے چند پہلو

موصوف کی دوسری کتاب ''تفہیم'' میں شامل یہ دو مضامین بھی ان کی صلاحیتوں کے آئینہ دار ہیں:

1۔ مولانا آزاد کا اسلوب

2۔ مشرقی شعریات اور نیاز فتح پوری

ناقد رشید حسن خاں کے تعلق سے میں یہاں جوش ملیح آبادی سے متعلق ان کے مضمون کا ایک مختصر اقتباس نقل کر دینا مناسب تصور کرتا ہوں۔ موصوف جوش کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ قدرت نے شعر گوئی کی صلاحیت ان کی فطرت میں شامل کی تھی، اور قوتِ تخئیل کو بال و پر بھی عطا کیے تھے۔ مناظر و مظاہر کے ذیل میں جزئیات نگاری

کی قابلِ رشک صلاحیت سے بھی نوازا تھا اور طنزیہ شاعری کا بھی اہل بنایا تھا، مگر بڑی شاعری جس علم، تامل اور تفکر کا مطالبہ کرتی ہے، اس سے ان کی طبیعت کو علاقہ نہیں تھا، اور اچھی شاعری جس ضبط و نظم، خود ضبطی اور ریاض کی طلب گار ہوتی ہے، اس سے ان کی طبیعت علاقہ پیدا نہیں کر سکی۔ وہ بہت سے لفظوں کے بے محابا صَرف کو اصل شاعری سمجھتے رہے، تشبیہوں اور استعاروں کے جا و بے جا استعمال کو فن کاری کا کمال فرض کرتے رہے اور اس غلط اندیشی کا شکار رہے کہ لہجہ جس قدر پُر شور ہوگا، کلام میں اسی نسبت سے تاثیر پیدا ہوگی۔ نیز ان کی غیر متوازن شخصیت نے طنز کو استہزا کا ہم معنی قرار دیا اور یوں یہ جوہر بھی ضائع ہوتا رہا۔''

(تلاش و تعبیر۔ ص:48)

ایک بات اور، جیسا کہ لکھا جا چکا، خاں صاحب موصوف قاضی عبدالودود صاحب سے بہت متاثر ہیں لیکن جہاں تک ان کے اسلوب نگارش کا تعلق ہے، اس میں قاضی صاحب کی نثر جیسی خشکی اور الجبرائیت نہیں پائی جاتی، بل کہ شوخی و شگفتگی اور ایک خاص طرح کی دل کشی محسوس ہوتی ہے۔ اندازِ بیان بھی فلسفیانہ یا متکلمانہ نہیں، بل کہ خطاب اور مکالمے کا ہے۔ غالباً اس کا سبب ان کا پختہ شعری و ادبی مذاق ہے۔

اب یہ مضمون ختم ہا چاہتا ہے، اسلیے تتمۂ کلام کے طور پر عرض کیا جاتا ہے کہ خاں صاحب بہر حال فرشتہ نہیں انسان ہیں۔ اس لیے یہ ضروری نہیں کہ انھوں نے جہاں جہاں اور جو کچھ لکھا ہو، سب حق اور صواب ہو۔ ان سے اختلاف کیے گئے ہیں اور کیے جاتے رہیں گے، اور ایسا ہونا فطری بھی ہے، کیوں کہ خود انھی کے بہ قول:

''تحقیق میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اب تک جو کچھ معلوم ہو چکا ہے، اس پر اضافہ نہیں ہوگا یا تردید نہیں ہو سکے گی۔'' (ادبی تحقیق ص 65)

اس کی ایک مثال کلام سوداؔ کے نسخۂ جانسن کے استناد کا مسئلہ ہے۔ شیخ چاند، قاضی عبدالودود بعض دیگر محققین کی طرح خاں صاحب بھی اسے کلامِ سوداؔ کا ''اہم ترین اور معتبر ترین خطی نسخہ'' تصور کرتے ہیں۔ لیکن اس نسخے سے متعلق ڈاکٹر نسیم احمد کے پُر مغز اور تحقیقی مضمون (سوداؔ کا ایک قلمی دیوان'' نقوش، لاہور شمارہ 139) کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس نسخے کا استناد پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتا اور اس کے بارے میں عام طور پر جو کچھ کہا یا لکھا گیا ہے، اس میں حسن ظن اور خوش اعتقادی کا دخل زیادہ ہے۔ اس لیے اس مسئلے پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے۔

یہ بہر حال ایک ضمنی بات تھی، ورنہ بہ حیثیت مجموعی نام نہاد محققین کے نرغے میں خاں صاحب غریب شہر کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان پر سعدی کا شیرازی کا یہ قطعہ صادق آتا ہے:

عالم اندر میانہ جہّال
مثلے گفتہ اند صدیقاں
شاہدے درمیان کو ران است
مصحفے در کنشت زندیقاں

حاشیہ:

1۔ اگر چہ اب سے پہلے اسی طرح لکھا جاتا تھا جیسے ''چوں کہ پہلا ایجاد تھا، اس لیے تعریف کی آوازیں دور تک پہنچیں'' محمد حسین آزاد۔ (آبِ حیات، ترجمہ میر خلیق)

2۔ ان سطور کی تحریر کے بعد گلزار نسیم کے علاوہ ''مثنویاتِ شوقؔ'' بھی شائع ہوگئی ہے۔ مزید برآں سحر البیان کی ترتیب و تدوین و تحشیے کا کام بھی مکمل ہو چکا ہے۔ (1994)''

(نقشِ معنی، ظفر احمد صدیقی، 1999، صفحہ 202 تا 218)

(کتاب نما، رشید حسن خاں حیات اور ادبی خدمات، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 2002 مرتب اطہر فاروقی، صفحہ 107۔123)

نوٹ: اس مضمون کو عزیزی عادل احسان نے بہ ذریعہ واٹس اپ، مورخہ 30 اگست 2019 کی شب 10 بج کر 12 منٹ پر، ارسال کیا۔ عزیزی عادل احسان دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو میں ریسرچ اسکالر ہیں۔ اس مضمون سے قبل بھی موصوف نے کئی مضامین، جن کا تعلق رشید حسن خاں سے ہے، کو خاکسار کی خدمت میں روانہ کیا ہے۔ میں عادل احسان کے ادب نوازی اور ادب دوستی اور ادبی شغف کا بہ صمیم قلب شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مرتب

○○○

پروفیسر ابن کنول

رشید حسن خاں: ایک منفرد محقق

اُردو میں تحقیق کی روایت، بہت قدیم نہیں ہے۔ تذکروں میں تحقیق نا کے برابر ہے اور انھیں قابلِ اعتبار بھی نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ تذکروں کی تالیف کے وقت تحقیق کے کوئی سائنٹفک اصول پیشِ نظر نہیں تھے۔ اس کے باوجود تذکرے تحقیق کے وقت معاون ثابت ہوتے ہیں۔ دراصل تحقیق اتنا پُر پیچ اور مشکل عمل ہے کہ اس کی جانب شاذ و نادر ہی کوئی متوجہ ہوتا ہے۔ پوری صدی میں اگر محققین کا شمار کیا

جائے تو حیرت انگیز طور پر کمی کا احساس ہوگا۔ یوں ہر سال برِ صغیر کی مختلف یونی ورسٹیوں میں سیکڑوں کی تعداد میں تحقیقی مقالے تیار ہوتے ہیں لیکن ان مقالوں کی نوعیت اور معیار مختلف ہیں۔ تحقیق کے عمل میں جو عرق ریزی، صبر آزمائی، جدوجہدِ مسلسل کے ساتھ ساتھ ایمان داری اور حق گوئی لازمی ہے، ہر ادیب ریسرچ اسکالر اس کا پابند نہیں ہو پاتا۔ اس لیے اس میدان میں بہت کم لوگ قدم رکھتے ہیں۔ سر سید احمد خاں نے آئینِ اکبری اور آثار الصنادید ترتیب دے کر اُردو میں تحقیق کی با قاعدہ بنیاد رکھی۔ بیسویں صدی میں حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، قاضی عبدالودود اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے تحقیق کے سائنٹفک اصولوں کو ملحوظ رکھ کر جو تحقیقی کارہائے نمایاں انجام دیے وہ اُردو تحقیق کے اہم حصہ ہیں۔

موجودہ عہد میں بعض محققین ہمارے لیے قابلِ احترام ہیں ان میں رشید حسن خاں کا نام سرِ فہرست ہے۔ انھوں نے انتہائی محنت اور لگن سے صرف قدیم متون کو ترتیب دیا ہے بل کہ اُردو املا، قواعد زبان اور لغت کے بارے میں بھی بہت کچھ تحریر کیا ہے۔ یوں تو رشید حسن خاں کا تعلق شاہ جہاں پور سے ہے، لیکن یہ ہمارے لیے فخر کی بات ہے کہ ان کی زندگی کا بیش تر حصہ شعبۂ اُردو، دہلی یونی ورسٹی میں گزرا۔ انھوں نے اپنے بیش تر تحقیقی کام اسی شعبہ سے وابستگی کے دوران کیے۔ خود راقم نے بھی ان کے تحقیقی کاموں میں شرکت کی ہے۔ فسانۂ عجائب کی ترتیب کے وقت اختلافِ نسخ کی نشان دہی کے لیے علوی صاحب، نورانی صاحب، عبدالحیٔ صاحب کے علاوہ ایک نسخہ میرے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ رشید صاحب بنیادی نسخے کی قرأت کرتے تھے اور ہم لوگ اختلافات کی نشان دہی کرتے جاتے۔ تحقیق رشید حسن خاں کا محبوب ترین مشغلہ ہے فرماتے ہیں:

> ''تحقیق کو سچ کی تلاش رہتی ہے جھوٹ کس نے بولا، یہ بھی ایک بات ہے، لیکن اصلی بات یہ ہے کہ جھوٹ کیوں بولا گیا اور کیسے بولا گیا، اس ''کیوں'' اور ''کیسے'' کی تلاش اور وضاحت بھی تحقیق کا ایک مقصد ہے اور یہ میرا محبوب موضوعِ سخن ہے اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ تحقیق کا بڑا مقصد ہے حقائق کی تلاش اور ان سے اخذ نتائج اور یہ میرا محبوب ترین مشغلہ ہے۔''

(اظہار: شمارہ 5 جنوری 1984)

ابتدا میں رشید حسن خاں نے اُردو املا اور زبان و قواعد پر خاص توجہ دی ان کی کافی ضخیم کتاب ''اُردو اِملا'' 1974 میں ترقی اُردو بورڈ سے شائع ہوئی۔ اس میں بڑے عالمانہ انداز میں اُردو املا کے مسائل پر بحث کی ہے۔ مثلاً اُردو میں اگر کہیں اضافت کا زیر آتا ہے تو اسے ضرور لگانا چاہیے عبارت کی صحیح قرأت اسی وقت ہو سکے گی۔ اس کتاب میں رشید صاحب نے فارسی اور عربی کے بہت سے اُردو میں مستعمل الفاظ کے صحیح اِملا کی نشان دہی کی ہے۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ:

> ''ہر زبان کے لیے ضروری ہے کہ اس کے املا کے قاعدے منضبط ہوں اور ان قاعدوں کی بنیاد، صحیح اصول پر ہو، اگر قاعدے متعین نہ ہوں تو زبان کی یک رنگی اور یکسانی کو سخت صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہوگا۔''

(اُردو املا، ص:9)

ڈاکٹر صدیقی کے مضامین کے مطالعے کے بعد ہی انہیں اُردو اِملا کی صحت اور اصلاح کی ضرورت محسوس ہوئی انھوں نے اپنی ضخیم کتاب ''اُردو اِملا'' میں حتی الامکان کوشش کی کہ غلطیوں کی تصحیح ہو جائے خود فرماتے ہیں:

> ''میں نے یہ کوشش کی ہے کہ جہاں تک اور معلومات ساتھ دے، اِملا کے مسائل کا احاطہ کیا جائے، اصلاحات کو صحیح طور پر شامل کیا جائے عدمِ تعین کے پھیلائے ہوئے انتشار اور دو رنگی کو ختم کیا جائے۔''

(اُردو اِملا ص 38)

رشید حسن خاں نے اپنی کتاب میں ایسے الفاظ کا املا متعین کیا ہے، جو فارسی یا عربی کے نہیں ہیں۔ تدوین کے اِملا کے معاملے پر اور لغت کی اہمیت پر اس کتاب میں بحث کی گئی ہے۔ بلا شبہ رشید حسن خاں کی اُردو اِملا کی تصحیح کے سلسلے میں اہم ترین کوشش کی ہے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی ان کی کتاب ''املائے غالبؔ'' ہے، جس میں غالب کے استعمال کیے ہوئے الفاظ کے صحیح املا کا تعین کیا گیا ہے تا کہ بقول رشید حسن خاں:

> ''مرزا صاحب کے اُردو، فارسی کلام کی تدوین میں مرتب یا مرتبین املا کے جن مسائل و مشکلات سے دوچار ہو سکتے ہیں ان کی نشان دہی کی جائے۔ یہ واضح کیا جائے کہ خود مرزا صاحب نے اپنے قلم سے کس لفظ کو کس طرح لکھا ہے۔ یا کس طرح لکھنے کی ہدایت کی ہے۔ اس طرح کلام غالبؔ میں منشائے مصنف کے خلاف املائی صورتیں جگہ نہ پا سکیں۔''

(املائے غالبؔ ص 10)

''اُردو کیسے لکھیں'' یا ''عبارت کیسے لکھیں'' نام کی کتابیں بھی اس سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ لغت، تلفظ اور قواعد شاعری کے موضوع پر انھوں نے اپنی کتاب ''زبان اور قواعد'' میں بحث کی ہے۔ وہ فارسی اور عربی کے الفاظ کے تلفظ ہو بہو اختیار کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ فرماتے ہیں:

> ''اگر کوئی شخص یہ کہے کہ عربی اور فارسی الفاظ کا تلفظ بس اسی طرح صحیح ہے کہ جس طرح ان زبانوں کے لغت میں محفوظ ہے، تو یہ سمجھا جائے گا یا سمجھا جانا چاہیے کہ یہ شخص اُردو کو کوئی مستقل زبان نہیں سمجھتا، اسی طرح اگر کوئی شخص یہ کہے کہ تلفظ کے وہ سارے تغیرات لازماً قابلِ قبول ہیں، جو کسی بھی شخص کی گفتگو میں نمایاں ہوئے ہیں، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس شخص کو زبان کے اعتبار اور لغت کے استناد کے مسائل سے دل چسپی نہیں۔''

(زبان اور قواعد ص 10)

رشید صاحب کا ماننا ہے کہ عربی فارسی کے جو الفاظ اُردو میں جس طرح رائج ہیں وہی صحیح اور فصیح ہیں ہمیں اصل تلفظ کی تلاش کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔

تحقیق کے اصول و ضوابط سے متعلق رشید حسن خاں کی کتاب ''ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ'' کافی اہم ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے تحقیق اور تدوین کے سلسلے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ تحقیق انتہائی

خشک اور بے مزہ عمل ہے۔ دیانت دار محقق وہی ہو سکتا ہے جس کے یہاں مروت اور رعایت کا کوئی خانہ نہ ہو۔ وہ تحقیق کو کلاسیکی موسیقی کی طرح سمجھتے ہیں جس میں بہت زیادہ ریاضت کی ضرورت ہے۔ فرماتے ہیں:

''تحقیق کا حال کلاسیکی موسیقی جیسا ہے جس میں عجلت، آسان پسندی، بوالہوسی اور خفیف الحرکاتی کو مطلق دخل نہیں ہوتا۔ اس میں کچھ حاصل کرنے کے لیے، بہت ریاضت کرنی پڑتی ہے اور اس ریاضت کی نہ مدت مقرر ہوتی ہے اور نہ معاوضہ طے شدہ ہوتا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ آدمی بس اسی کا ہو کے رہ جاتا ہے۔ ایک ہی دھن ایک ہی لگن، ایک ہی تمنا یہاں شرک کی گنجایش ہی نہیں۔''

(ادبی تحقیق، ص70)

مذکورہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے ایک حصہ میں ادبی تحقیق کے اصول و مسائل پر بحث کی گئی ہے اور دوسرے حصے میں عملی تحقیق کے چار مثالی مضمون شامل ہیں۔ رشید حسن خاں کے تحقیقی تبصرے اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ ان کے یہاں رعایت، مروت یا مصلحت پسندی کا دخل نہیں ہے۔ ان کی بے باکی اور صاف گوئی ان کے ہر جملے سے عیاں ہوتی ہے۔ اسی لیے وہ اس بات کے اعتراف میں بھی فخر محسوس کرتے ہیں کہ انھوں نے تحقیق کے اصول اور آداب حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی سے سیکھے۔ اور نیاز فتح پوری کی تحریروں سے بھی استفادہ کیا۔ رشید حسن خاں کو پروفیسر گیان چند جین نے خدائے تدوین کہا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ رشید صاحب نے ''فسانۂ عجائب''، ''باغ و بہار'' اور ''گلزارِ نسیم'' کی تدوین کے علاوہ مراثی انیس و دبیر اور انتخاب خواجہ میر درد ترتیب دے کر بے مثال کام انجام دیا ہے۔ اسی لیے گیان چند جین نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

''میں انھیں پیغمبر تدوین کہنے پر قانع نہیں ہوں، انھیں خدائے تدوین کہوں گا اس پر کتنے زعما چیں ہوں۔''

(کتاب نما رشید حسن خاں نمبر، ص74)

یہ سچ ہے کہ رشید حسن خاں نے فسانۂ عجائب، باغ و بہار اور گلزارِ نسیم کی تدوین کر کے اُردو ادب کو نہ صرف تدوین کی ناقابلِ تسخیر مثالیں پیش کیں ہیں بل کہ اُردو کے مصنف کا اصل متن پیش کر دیا ہے جو تدوین کا اصل مقصد ہے۔ رشید صاحب اس بات پر حیرت ظاہر کرتے ہیں کہ آج تک نصاب میں یہ کتابیں کیسے پڑھائی گئیں، جب کہ ان کا متن اغلاط سے پاک نہیں تھا۔ انھوں نے ''فسانۂ عجائب'' اور ''باغ و بہار'' کی تدوین میں برسوں لگا دیے۔ اس کا متن اپنے ہاتھ سے نقل کیا تا کہ کتاب کا اصل متن سامنے آ جائے۔

صاف گوئی اور مزاج کی سختی رشید حسن خاں کے تنقیدی مضامین میں بھی نظر آتی ہے۔ یوں تو انھوں نے تنقیدی مضامین کم لکھے ہیں لیکن جو لکھے ہیں ان میں مروت اور مصلحت شامل نہیں ہے۔ دو ٹوک بات کہنے کی روش یہاں بھی برقرار ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''تلاش و تعبیر'' کے نام سے 1988 میں شائع ہوا تھا۔ جس میں بعض شعرا کے کلام پر تبصرے کیے گئے ہیں۔ فیضؔ پر لکھے گئے اپنے مضمون میں انھوں نے نہ صرف فیضؔ کی زبان و بیان کی غلطیوں کی نشان دہی کی بل کہ انھیں بنیادی طور پر رومانی شاعر قرار دیا۔ لکھتے ہیں:

''رومانیت فیض کے مزاج کا جُز ہے جیسے شعلے میں گرمی اور روشنی۔ ان کی شاعری کا سفر رومانیت ہی کے زیرِ سایہ شروع ہوا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ استراکیت سے اور اس کے نتیجے میں ذہنی سطح پر سیاسی ہنگاموں سے قریب ہوتے گئے اور اسی نسبت سے ان کی شاعری میں ناہمواری نمایاں ہونا شروع ہوئی۔ سیاسی تصورات خواہ ان کے خیالات کا حصہ بن گئے ہوں ان کی طبیعت کا تقاضا نہیں بن سکے۔''

(تلاش و تعبیر، ص55)

مذکورہ تنقیدی کتاب میں رشید حسن خاں نے جوشؔ، فانیؔ، سیمابؔ، جعفر زٹلیؔ، مومنؔ اور حالیؔ وغیرہ کی شاعری پر اپنی ناقدانہ رائے کا اظہار کیا ہے۔ رشید حسن خاں نے اگر چہ تنقیدی مضامین لکھے ہیں لیکن تحقیق ان کا اصل موضوع ہے۔ بلاشبہ اُردو کے چند ممتاز محققین میں ان کا شمار ہوتا ہے اور اس کی وجہ ان کی حق گوئی ہے فرماتے ہیں:

''میں صاف، سادہ واضح اور دوٹوک انداز میں بات کہنا چاہتا ہوں اور اس سے مجھے مطلق دل چسپی نہیں کہ لوگ اسے مثبت سمجھیں یا منفی۔ ایسی فضول اصطلاحوں سے میں بہت دور رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے سچ کی تلاش ہے۔ مجھے شخص سے دل چسپی نہیں، اس نے جو کچھ کہا یا لکھا ہے اس سے دل چسپی ہے، جھوٹ کوئی بھی بولے وہ جھوٹ ہے، میں صلح سمجھوتے کا قائل نہیں۔''

(اظہار، شمارہ5، جنوری1984)

یہ ہمارے لیے باعثِ فخر ہے کہ رشید حسن خاں نہ صرف ہمارے ہم عصر ہیں بل کہ ہمارے قریب بھی ہیں۔ وہ تحقیق اور تنقید میں سخت مزاج سہی لیکن گفتگو میں شیریں بیاں شگفتہ مزاج ہیں۔

(تحقیق و تدوین، مرتب پروفیسر ابنِ کنول، کتابی دُنیا، دہلی، اشاعت 2006، صفحہ 224 تا 229)

○○○

ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی

رشید حسن خاں کے تحقیقی تصورات

اُردو زبان برصغیر کی ایک تہذیبی و ثقافتی زبان ہے۔ اسے بولی، زبان اور ادب کے ارتقائی منزلوں سے گزر کر اس اعلا منصب پر پہنچنے میں تین صدیوں سے زیادہ عرصے تک جدو جہد کرنی پڑی ہے۔ تاریخِ ادب میں بیسویں صدی عیسوی ان معنوں میں اہم ہے کہ اسی صدی میں اُردو اس منزل میں داخل ہوئی کہ جو کسی قوم کے ثقافتی مظاہر کی اعلا اور اہم ترین منزل ہوتی ہے اور یہ منزل ہے ''تحقیق''۔ یہ درست ہے کہ تذکرہ نویسی کی روایت بہت پُرانی ہے۔ لیکن انفرادی رائے اور تاثر کے عمل نے اس کے دائرے کو محدود کر دیا ہے، تاہم تحقیق کی روایت کے سراغ لگانے میں ان کی حیثیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس نقطۂ نظر سے متذکرہ صدی کو گذشتہ عہد پر ان معنوں میں تفوق حاصل ہے کہ اُردو زبان و ادب کے اہلِ قلم میں تحقیق و تنقید کا اعلا اور سائنٹفک شعور اور مذاق پیدا ہوا۔ اظہارِ خیال اور فن پاروں کے تجزیے کے قدیم رویوں اور طریقۂ کار میں تبدیلیاں رونما ہوئیں، جانچ پرکھ کے اصول و ضوابط متعین کیے گئے، نتیجتاً تذکرہ نویسی کی جگہ تاریخ اور قیاس کی جگہ تحقیق نے لے لی۔

بیسویں صدی کے جن محققین نے اُردو تحقیق کو ایک معیار اور وقار عطا کیا ان میں حافظ محمود شیرانی اور قاضی عبدالودود کا نام نہایت معتبر اور ممتاز ہے۔ ان بزرگوں نے اُردو تحقیق میں احتیاط پسندی اور مضبوط دلیلوں اور دعوں کی بنا پر نتائج تک پہنچنے کی طرح ڈالی، علاوہ ازیں تحقیق کو ترتیب مقدمات اور فکری تنظیم سے بھی آشنا کیا، نیز محقق کے لیے احساسِ ذمہ داری لازم قرار دیا۔

معاصر اُردو تحقیق کے منظرنامے پر جن محققین کے دستخط ہیں ان میں رشید حسن خاں، تنویر احمد علوی، مختار الدین احمد، نثار احمد فاروقی، حنیف احمد نقوی اور خلیق انجم وغیرہ کے نام قبلِ ذکر ہیں۔ بلاشبہ ان محققین کی تلاش و جستجو نے اُردو شعر و ادب کے کئی نامعلوم اور پوشیدہ گوشوں کو منظرِ عام پر لاکر جو بیش بہا اضافے کیے ہیں وہ ہمارے لیے قیمتی اثاثہ ہیں۔

متذکرہ محققین میں رشید حسن خاں کا شمار ان کی حق گوئی اور بے باکی کے سبب ان مشاہیر میں ہوتا ہے اور جن کی پاس داری قاضی عبدالودود سے باقاعدہ تلمذ تو حاصل نہیں، تاہم ان کی تحریریں رشید حسن خاں کے لیے معنوی اُستاد کا درجہ رکھتی ہیں جب کہ تدوینِ متن میں اُن پر مولانا عرشی کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ ابتدائی دور میں ''اُردو املا'' اور ''زبان اور قواعد'' رشید حسن خاں کے تحقیق و تجسس کے خاص موضوع رہے لیکن اسی مرحلے میں ان کی ژرف نگاہی، حق پسندی، بے باکی اور سخت گیری نے انھیں ایک ممتاز محقق اور ادیب بنا دیا۔ رشید حسن خاں ان معنوں میں بھی منفرد رہے ہیں کہ ادبی تحقیق کے جن موضوعات کا انھوں نے انتخاب کیا وہ بے حد اچھوتے، مشکل اور پیچیدہ ہیں، مثلاً قواعد و زبان، اساتذۂ اُردو کے مختارات، لکھنؤ اور دہلی کے اختلافات، اصلاحِ سخن، معائبِ سخن، تذکیر و تانیث اور لغت ان موضوعات و مباحث سے متعلق موصوف کی معلومات حیرت انگیز حد تک وسیع ہیں، جب کہ 'باغ و بہار'، فسانۂ عجائب'، 'مثنویاتِ شوق'، 'گلزارِ نسیم' اور 'مثنوی سحر البیان' کی ترتیب و تدوین میں جس عرق ریزی اور وسیع مطالعے کا ثبوت دیا ہے اس بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ موجودہ اُردو تحقیق میں ان کا کوئی بدل نہیں ہے۔

یہ درست ہے کہ تحقیق کے اصول، دائرہ کار اور محقق کے اوصاف کے متعلق قاضی صاحب کے خیالات سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن رشید حسن خاں نے ان تصورات کی نہ صرف توسیع کی بل کہ اپنی تحقیقی تحریروں میں انھیں عملاً برتا بھی۔ اس کا بیّن ثبوت ان کی کتاب ''ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ'' ہے، جس میں ان کے تصورِ تحقیقی، مطالعے کے فکری نتائج اور ان سے استخراج کردہ اصول و نظریات کے اطلاقی پہلو بڑی شدومد کے ساتھ اُبھرتے نظر آتے ہیں، جو ادبی تحقیق کے طریقۂ کار اور اس کے اصولوں کے مسائل اور مشکلات کو صحیح طور پر سمجھنے میں ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ تصورات اُردو تحقیق میں اضافے کا حکم رکھتے ہیں۔ پہلو بہ پہلو غور و فکر کے ساتھ احتساب پر مجبور کرتے ہیں۔ اسی کتاب میں انھوں نے تحقیق کے مبادیات کی جہاں توضیح و تشریح کی وہیں تحقیق کیا ہے اور کیا نہیں ہے؟ جیسے مسئلے پر مدلل روشنی ڈالی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس نوع کی تحریر کا مقصد نئی نسل کی ذہنی و فکری ترتیب بھی کرنا تھا، بالخصوص جامعات اور دانش گاہوں کے اساتذہ اور طلبا یکساں طور پر ان کے دائرۂ فکر میں رہے جہاں ریسرچ کے نام پر ادبی کارگزاریوں کو بھی تحقیق کے دائرے میں داخل کر لیا گیا ہے جس سے خلط مبحث کے لیے بڑی گنجایش پیدا ہوگئی ہے۔ ان شعبوں کا سب سے افسوس ناک پہلو بقول رشید حسن خاں یہ ہے کہ: عام سماجی زندگی میں جو بے ترتیبی ہے اور جاہ و منصب کی ہوس جس طرح گھیرے میں لیے ہوئے ہے، وہی صورتِ حال علمی اداروں میں بھی رونما ہوتی جا رہی ہے اور اچھے اُستاد اور اچھے دُنیادار کا فرق گویا اُٹھتا جا رہا ہے۔

لغات میں تحقیق کے معنی حقیقت دریافت کرنا، کسی بات کی اصلیت کا پتا لگانا یا تلاش و جستجو درج ہے۔ یعنی یہ کسی حقیقت کے انکشاف کا عمل ہے۔ قاضی عبدالودود کے نزدیک ''تحقیق کسی امر کو اس کی اصلی شکل میں دیکھنے کی کوشش ہے۔'' رشید حسن خاں نے قاضی صاحب کی تعریف سے اتفاق کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''حقائق کی بازیافت، صداقت کی تلاش، حقائق کا تعین اور ان سے نتائج کا استخراج، ادبی تحقیق کا مقصود ہے یا ہونا چاہیے۔'' بہ الفاظ دیگر حقیقت واقعہ (یا اصلی شکل) بہ ذاتِ خود موجود ہوتی ہے، خواہ معلوم نہ ہو۔ ان حقائق کی تلاش کے ضمن میں خاں صاحب کی یہ بار بار تاکید رہی ہے کہ تعبیرات، تاویلات یا قیاسات پر حقائق کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح وہ تحقیق کو تنقید سے الگ اور تنقیدی تعبیرات سے علاحدہ تصور کرتے ہیں، اس سلسلے میں ان کی یہ توضیح توجہ طلب ہے:

> ''تحقیق کا مقصود حقائق کی دریافت ہے، اس لیے ایسے موضوعات جن میں تنقیدی تعبیرات کا عمل دخل ہو، تحقیق کے دائرے میں نہیں آتے۔ تنقیدی صداقت، تنقیدی تعبیرات کا نتیجہ ہوا کرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ایک ہی مسئلے پر مختلف لوگ مختلف رائیں رکھتے ہیں۔ جب کہ تحقیق میں اختلافِ رائے کی اس طرح گنجایش نہیں۔ تنقید کے مقابلے میں تحقیق کا دائرہ کار

جہاں سے تعبیرات کی کارفرمائی شروع ہوگی اور ان پر مبنی اظہارِ رائے کا پھیلاؤ شروع ہوگا۔ وہاں تحقیق کی کارفرمائی ختم ہوجائے گی۔''

(ادبی تحقیق، ص 17)

حقائق تک رسائی مشکل اور پُر خار راہوں سے گزر کر ہوتی ہے۔ یہ سخت کوش مرحلہ معتبر شہادتوں اور معلومات کے سہارے طے کیا جاتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ یہ شہادتیں براہِ راست کسی نتیجے تک پہنچا دیتی ہیں بل کہ اس تک پہنچنے میں استدلال کے کام آتی ہیں، اس لیے یہ ضروری ہے کہ جن امور پر استدلال کی بنیاد رکھی جائے وہ اس وقت تک کی معلومات کے مطابق بہ ظاہر شک سے بری ہوں اور جن مآخذ سے کام لیا جائے وہ قابلِ اعتماد ہوں۔ غیر متعین، مشکوک اور قیاس پر مبنی خیالات کا مصرف جو بھی ہو، ان کی بنیاد پر تحقیق کے نقطۂ نظر سے قابلِ قبول نتائج نہیں نکالے جاسکتے ہیں۔ 1

اس سلسلے میں رشید حسن خاں نے امیر خسرو کے ہندوی کلام اور ان سے منسوب دوہے، پہیلیاں اور کہہ مکرنیاں وغیرہ کی مثال پیش کی ہے جن سے متعلق آج تک معتبر سند دستیاب نہیں۔ دراصل متذکرہ خیالات اصولی ہیں اور دورانِ تحقیق ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ اسی طرح انھوں نے دعووں کی بنیاد سند پر قائم کی ہے اور سند کے لیے قابلِ اعتماد ہونا شرطِ اولین بتایا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں بنیادی بات یہ ہے کہ بہ ظاہر حالات حوالہ مشکوک نہ معلوم ہوتا ہو اور دلیل منطق کے خلاف نہ ہو۔ روایت کے سلسلے میں اس کی بڑی اہمیت کہ راوی کون ہے؟ بس کے ساتھ اکثر صورتوں میں یہ معلوم ہونا بھی ضروری ہوتا ہے کہ جن حالات میں روایت کی گئی تھی۔'' 2

رشید حسن خاں نے راوی کی شخصیت کو بھی اہمیت دی ہے علم نفسیات کی رو سے شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں خاندان اور ماحول کا بے حد اثر ہوتا ہے۔ اسی طرح اس کی عادات واطوار، رفتار و گفتار سے بھی اس کے ذہنی اور فطری رویوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ خاں صاحب کے نزدیک ایسا راوی جو واقعہ تراشی اور داستان سرائی سے کام لیتا ہو یا پھر جذباتی یا متعصب ہو ایسے مولفین اور راویوں کے فرمودات اور مختارات کو اس وقت قابلِ قبول نہیں بنایا جاسکتا جب تک کہ معتبر ذرائع سے اس کی تصدیق نہ ہوجائے۔ اس طرح بالواسطہ روایت پر انحصار کے لیے احتیاط ضروری سمجھا ہے بل کہ انھوں نے یہاں تک لکھا ہے کہ ''اگر مآخذ قابلِ حصول ہو تو براہِ راست استفادہ کرنا چاہیے۔'' رشید حسن خاں کے ان خیالات سے اختلاف کی گنجایش نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ بالواسطہ استفادے سے جو غلط فہمی پیدا ہوتی ہے وہ تحقیق کے لیے بے حد نقصان دہ ہے۔

موضوعِ تحقیق سے متعلق رشید حسن خاں کے خیالات کی معنویت عہدِ رواں میں بڑی سائنٹفک ہے۔ ان کے نزدیک زندہ لوگوں کو تحقیق کا موضوع بنانا غیر مناسب ہے اس لیے کہ مختلف اثرات حقائق تک پہنچنے میں رُکاوٹ ہوسکتے ہیں۔ ذاتی تعلقات، سیاسی اور سماجی حیثیت، نفرت یا عقیدت کے علاوہ زندگی کے نامکمل کارنامے تحقیق کا حق ادا نہیں کرسکتے۔ اس سلسلے میں رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

> ''ذاتی اثرات، غیر معتبر روایتیں، گروہ بندی اور مذہبی یا سیاسی وابستگیوں کی پیدا کی ہوئی مصنوعی عقیدت؛ یہ ایسے عوامل ہیں ان کا پھیلایا ہوا غبار زندگی میں ابہام کا دھندلکا پھیلائے رکھا ہے۔ اس کے سوا زندگی مجموعی طور پر ایک اکائی ہے اور یہ عمل وردِ عمل کا طویل اور پیچیدہ سلسلہ ہے جو زندگی میں کسی ایک جگہ ختم نہیں ہوتا۔ آدمی جب تک زندہ رہے گا، اس کا امکان ہے کہ وہ فکر و عمل کی تبدیلیوں سے دوچار ہوتا رہے گا۔ اسی لیے زندہ آدمی کے اعمال وافکار کا مکمل تجزیہ ممکن نہیں اور مکمل تجزیے کے بغیر کسی شخص کے ساتھ انصاف کیا ہی نہیں جا سکتا۔'' 3

واقعہ یہ ہے کہ زندہ لوگوں کو موضوعِ تحقیق بنانے کے پس پردہ دُنیاداری یا مصلحت کو کلیدی حیثیت حاصل ہے یہی وجہ ہے کہ ایسی بیش تر تحقیقی تعصب یا عقیدت کا شکار ہو کر رہ جاتی ہے۔ اصولِ تحقیق کے ضمن میں محققین نے زبانِ تحقیق پر خاطر خواہ توجہ دی ہے۔ قاضی عبدالودود نے خطابت کی زبان سے احتراز واجب قرار دیا ہے جب کہ گیان چند جین نے خشک و روکھی پھیکی زبان سے گریز کی بات کہی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ تحقیق کا عمل بڑی حد تک سائنس کا عمل ہے جس میں زبان و بیان کی پیچیدگی اور انشاپردازی کی گنجایش کم ہے۔ سادہ اور سلیس زبان قاری کو مقصد تک پہنچنے میں موثر و معاون ہوتی ہے۔ استعارہ و کنایہ آمیز زبان جہاں ابہام پیدا کرتے ہیں وہیں اصطلاحات پیچیدگی کو جنم دیتے ہیں، اس کی مثال موجودہ تنقید کی زبان ہے جو قاری سے اپنا رشتہ تقریباً ختم کرچکی ہے اس ضمن میں رشید حسن خاں کی توضیح توجہ طلب ہے:

> ''تحقیق کی زبان کو امکان کی حد تک آرایش اور مبالغہ سے پاک ہونا چاہیے اور صفائیِ الفاظ کے استعمال میں بہت زیادہ احتیاط کرنا چاہیے۔ اُردو میں تنقید جس طرح انشاپردازی کا آرایش کدہ بن کر رہ گئی ہے، وہ عبرت حاصل کرنے کے لیے کافی ہے اور تحقیق کو اس حادثے کا نشانہ نہیں بننے دینا چاہیے۔'' 4

بہر حال رشید حسن خاں کے تحقیقی تصورات سائنسی ہیں اور ان کے نظری و عملی کارنامے اُردو ادب کا قیمتی سرمایہ۔ موصوف کی علمی و ادبی خدمات جہاں نئی نسلوں کی ذہنی و فکری تربیت کرتی ہیں وہیں تحقیقی راہوں کو بھی روشنی عطا کرتی ہیں۔ اس اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مستقبل میں تحقیق و تدوین کی کوئی بھی تاریخ رشید حسن خاں کے حوالے کے بغیر ادھوری ہوگی۔

حواشی

1۔ ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ، ص 12

2۔ ایضاً، ص 14

3۔ ایضاً، ص 18

4۔ ایضاً، ص 19

(ہفت روزہ ہماری زبان، انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، یکم تا 28 ستمبر 2006، صفحہ 25-24)

ooo

ڈاکٹر ظفر کمالی

ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ از رشید حسن خاں

تحقیق دراصل پتھّر نچوڑ کر پانی نکالنے کا نام ہے۔اس کے لیے جس جگر کاوی کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب کے بس کا روگ نہیں۔ یہاں سہل پسندی اور عقیدت مندی کا بھی گزر نہیں۔ دقّت پسند طبیعتیں ہی اس میدان میں سرخ رو ہوتی ہیں۔ اُردو تحقیق میں اس معیار پر کھری اُترنے والی جو چند شخصیتیں ہیں ان میں ایک نام رشید حسن خاں کا بھی ہے۔انھوں نے تدوین اور املا کے متعلق گراں قدر کام کیے۔''فسانۂ عجائب'' کی تدوین کو ان کا تحقیقی شاہ کار کہا جاسکتا ہے۔خاں صاحب نے اصولِ تحقیق اور ان سے متعلق دیگر مسائل پر بھی کافی شرح بسیط کے ساتھ لکھا اور اس طرح لکھا کہ ہر گوشے کو آئینہ کر دیا۔اس سلسلے کی ان کی پہلی کتاب ''ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ'' جس کا پہلا اڈیشن ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ سے 1978 میں چھپا تھا۔اُتر پردیش اُردو اکادمی لکھنؤ نے 1990 میں اس کا دوسرا نظرِ ثانی شدہ اڈیشن شائع کیا اور یہی اڈیشن اس وقت پیشِ نظر ہے۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں ادبی تحقیق کے اصول وضوابط سے بحث کی گئی ہے اور دوسرے حصے میں چار کتابوں پر تفصیلی تبصرے ہیں۔ ذیل کی سطور میں مذکورہ کتاب کے پہلے حصے کے مندرجات اور اس کے مباحث کا تفصیلی خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

''ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ'' کا پہلا باب اصولِ تحقیق کے بارے میں ہے۔اس میں تحقیق کی تعریف صرف ایک جملے میں جامع ترین انداز میں بیان کی گئی ہے کہ حقائق کی بازیافت تحقیق کا مقصد ہے۔رشید حسن خاں نے قاضی عبدالودود کے اس قول کو اپنی بات کی تائید میں پیش کیا ہے کہ ''تحقیق کسی امر کو اس کی اصلی شکل میں دیکھنے کی کوشش ہے۔'' انھوں نے اس قول کی باریکیوں کی بھی وضاحت کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ ادبی تحقیق میں کسی امر کی اصلی شکل کا تعین اصولِ تحقیق کی روشنی میں ہی کیا جائے گا۔ یہاں کوئی بھی حتمی رائے صرف تاویل، تعبیر اور قیاسات کی روشنی میں نہیں قائم کی جاسکتی۔انھوں نے یہ نکتہ بھی پیش کیا ہے کہ تحقیق میں واقعے کا چھوٹا یا بڑا ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا، یہاں ہر واقعے کی بذاتِ خود اہمیت ہوتی ہے۔کوئی چھوٹا واقعہ یا معمولی بات اپنے موقع ومحل کے اعتبار سے خصوصی اہمیت کے حامل ہو سکتے ہیں۔خاں صاحب نے اس اہم نکتے پر بھی زور دیا ہے کہ درست معلومات کے حصول کے لیے جو شہادتیں اکھٹی کی جائیں وہ ہر طرح کے شکوک وشبہات سے پاک اور اتنی مضبوط ہونی چاہئیں کہ ان پر استدلال کی بنیاد رکھی جاسکے۔ غیر متعین اور مشکوک خیالات اور قیاسات کے سہارے تحقیقی نتائج نہیں اخذ کیے جاسکتے۔ بقول خاں صاحب تحقیق ایک مسلسل عمل ہے۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ کوئی حقیقت ایک مرتبہ ہی اپنی مکمل صورت میں سامنے آجائے۔بعض حقیقتوں پر مختلف پردے پڑے ہوتے ہیں جو ایک ایک کر کے بالتدریج اٹھتے ہیں۔اس لیے تحقیق میں اصلیت کا تعین اس وقت تک حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں ہی طے ہوتا ہے۔اس طرح دریافت کا عمل جاری رہنے کی ضرورت میں ردّ وقبول کی صورتوں میں بھی تبدیلی ہوتی رہے گی۔ تحقیق میں دعوے کی قبولیت کے لیے قابل اعتماد سند کا ہونا ضروری ہے۔روایت کے سلسلے میں راوی کیسا ہے اس کی چھان پھٹک بھی لازمی ہے۔اگر راوی صادق القول نہ ہو تو اس کی روایتوں پر بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔محتاط راوی کبھی کبھی اپنے اور اپنے متعلقین کے متعلق کذب بیانی یا مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہیں۔ وہ کسی ایسے موضوع سے بھی جن سے ان کو جذباتی تعلق ہوتا ہے احتیاط کے تقاضوں کو مکمل طور پر پورا نہیں کر پاتے لہٰذا محقق کا یہاں بھی محتاط رہنا چاہیے۔رشید حسن خاں نے قابل قبول مآخذ سے براہ راست استفادے پر بھی زور دیا ہے اور بالواسطہ روایت پر انحصار سے حتی الامکان بچنے کی تلقین کی ہے۔انھوں نے حافظے کے دھوکے کی جانب بھی اشارے کیے ہیں اور آخر میں تحقیق کی زبان کو آرایش اور مبالغے سے پاک رکھنے کی بات کہی ہے۔تقریباً نو صفحات پر مشتمل اس مختصر باب میں خاں صاحب نے اصول تحقیق کا ایک جامع خاکہ پیش کر دیا ہے۔انھوں نے اپنی باتوں کی وضاحت کے لیے مختلف مثالیں بھی پیش کی ہیں جن سے کہیں بھی انکار کی گنجایش نظر نہیں آتی۔اسی باب میں انھوں نے اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ زندہ لوگوں کو تحقیق کا موضوع بنانا مناسب نہیں ہے۔ان کے خیال میں مختلف اثرات کے تحت حقائق کا صحیح علم نہیں ہوسکتا اور اگر ہو بھی جائے تو ان حقائق کی تفصیلات کو بے کم وکاست پیش کرنا ممکن نہیں۔ان کے الفاظ میں:

> ''آدمی جب تک زندہ رہے گا، اس کا امکان ہے کہ وہ فکر وعمل کی تبدیلیوں سے دوچار ہوتا رہے گا، اس کا امکان ہے کہ وہ فکر وعمل کی تبدیلیوں سے دوچار ہوتا رہے اور ایسی تبدیلیوں کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔اس لیے زندہ آدمی کے اعمال وافکار کا مکمل تجزیہ ممکن نہیں اور مکمل تجزیے کے بغیر کسی شخص کے ساتھ انصاف کیا ہی نہیں جاسکتا۔'' (ص 18)

خاں صاحب نے اپنے ایک انٹرویو میں بھی زندہ شخصیات پر تحقیق کی مخالفت کی ہے۔مشفق خواجہ اور ہمارے کچھ دوسرے معتبر محققین بھی ان کے ہم نوا ہیں۔ یہاں دوسروں کے خیالوں سے بحث

میں میں کوئی قباحت نہیں۔ مثلاً آج کوئی چاہے تو انصار اللہ نظر، حنیف نقوی، تنویر احمد علوی، نیّر مسعود، قاضی عبدالستار، کمال احمد صدیقی، شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ، سیدہ جعفر، شمیم حنفی، شفیع جاوید، عابد سہیل، اقبال مجید، رتن سنگھ، ظفر گورکھپوری، مجتبیٰ حسین، کلیم عاجز، لطف الرحمٰن، سلطان اختر وغیرہ جیسی شخصیات پر تحقیقی مقالہ لکھ سکتا ہے اور ان میں کئی کئی لوگوں پر مقالے لکھے بھی جا چکے ہیں۔ قاضی عبدالودود پر ان کی زندگی میں ڈاکٹر تحریرا نجم نے بہترین مقالہ لکھا۔ خود رشید حسن خاں پر بھی پاکستان میں تحقیق ہوئی۔ البتہ لکھنے والوے میں اتنی جرأت ضرور ہونی چاہیے کہ وہ منفی حقائق کو بھی غیر جذباتی انداز میں پیش کر سکے۔ جس میں اس جرأت کی کمی ہو اسے ایسے موضوع سے گریز بہتر ہے۔

جہاں تک فکر و عمل کی تبدیلیوں کا تعلق ہے ایسا ہو سکتا ہے جیسا ظ۔ انصاری کے ساتھ ہوا کہ مرنے سے کچھ پہلے انھوں نے ترقی پسندی سے اپنی برأت کا اظہار کیا لیکن اس اعلان سے ترقی پسند ادب سے متعلق لکھی گئیں ان کی تحریریں منسوخ نہیں ہو جائیں گی۔ ان تحریروں کا جائزہ بھی اسی طرح لیا جائے گا جو اس اعلان کے نہیں ہونے کی صورت میں لیا جاتا۔ یہ ضرور ہے کہ آخر میں اس تحریک سے ان کی بے زاری کے اسباب بھی بیان کیے جائیں گے۔ اگر کسی شخص پر تحقیقی مقالہ چھپ جانے کے بعد ایسی تبدیلی رونما ہوتی ہے تو اس تحقیقی مقالے پر بھی نظر ثانی کر لی جائے گی یا کوئی دوسرا شخص آیندہ اس پر روشنی ڈالے گا۔ یہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ ایک کتاب میں ہی کسی شخص کے ساتھ مکمل انصاف کیا جا سکے۔ اگر ایسا ہوتا تو غالب اور اقبال پر اتنی تحقیقی کتابیں لکھنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

بزرگوں پر ان کی زندگی میں کام نہ ہونے کی صورت میں بعض اوقات چھوٹی چھوٹی حقیقتوں کا علم بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر قاضی صاحب ہی کو لیجیے، یہ بات معلوم ہے کہ ان کی دو شادیاں ہوئی تھیں۔ پہلی اہلیہ کا وصال رخصتی سے قبل ہی ہو گیا۔ قاضی صاحب پر ان کی زندگی میں تحقیق ہوئی، کلیم الدین احمد نے ''معاصر'' کا خاص نمبر نکالا لیکن کسی نے ان سے پہلی اہلیہ کا نام دریافت نہیں کیا۔ قاضی صاحب پر کئی کتابیں چھپیں مگر کسی نے بھی یہ نام نہیں لکھا۔ قاضی صاحب کے وصال کے بعد راقم الحروف نے ان کے کئی قریبی عزیزوں سے یہ بات دریافت کی لیکن سب نے اس سے لاعلمی کا اظہار کیا اور ہنوز یہ بات تشنۂ تحقیق ہے۔ قاضی صاحب سے ان کی زندگی میں یہ بات پوچھ لی گئی ہوتی تو یہ مسئلہ ایک منٹ میں حل ہو جاتا لہٰذا میرا خیال یہ ہے کہ سینیر لکھنے والوں پر ان کی زندگی میں ریسرچ کرنے میں کوئی حرج نہیں لیکن آج کل جو یہ بدعت چلی ہوئی ہے کہ جس کی دو تین کتابیں چھپ گئیں ان پر کوئی نہ کوئی ریسرچ کے لیے آمادہ ہے یا آمادہ کیا جا رہا ہے اس کی ہمت افزائی کی نہیں بل کہ حوصلہ شکنی کی ضرورت ہے۔

''ادبی تحقیق.....'' کا دوسرا باب تحقیق سے متعلق بعض مسائل پر مبنی ہے جسے چار فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلی فصل میں تحقیق کے ان بنیادی مآخذ خصوصاً تذکروں سے بحث کی گئی ہے جو فارسی میں ہیں۔ بعض حضرات نے ان تذکروں کے اُردو ترجمے کی وکالت کی ہے۔ خاں صاحب کا موقف یہ ہے کہ ترجمے کو اصل مآخذ کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ چوں کہ انیسویں صدی کے اواخر تک ہندوستان میں فارسی کے اثرات نمایاں رہے ہیں۔ لہٰذا اس عہد پر تحقیق کرنے کے لیے فارسی سے اچھی طرح واقف ہونا لازمی ہے۔ اس لیے وہ فارسی تذکروں کے اُردو تراجم کے سخت مخالف ہیں۔ ان کے بقول:

> ''تذکرے، عام لوگوں کی دل چسپی کی چیز نہیں اور خواص جو ایسے مصادر و مآخذ سے سروکار رکھتے ہیں، ان کے لیے یوں بے کار ہیں کہ وہ بہر صورت اصل مآخذ کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہوں گے.....در حقیقت یہ ایسا فضول کام ہے جو فضول ہونے کے ساتھ ساتھ گمراہ کن بھی ہے۔'' (ص 22)

خاں صاحب نے تذکروں کے تراجم کی گمراہی ثابت کرنے کے لیے شیفتہ کے تذکرے ''گلشن بے خار'' کے دو پاکستانی ترجمے اور میر کے ترجمے ''نکات الشعرا'' کے ہندوستانی ترجمے پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے اور ان کے نقائص کو اُجاگر کیا ہے۔ انھوں نے تذکروں کے شائع شدہ فارسی متن سے بھی اپنی بے اطمینانی کا اظہار کیا ہے اور حتی الامکان تذکروں کے اہم خطی نسخوں سے بھی استفادے کی وکالت کی ہے۔ ایک ضمنی بات کے طور پر انھوں نے لکھا ہے کہ بعض مجبوریاں ایسی ہوتی ہیں جن کا کوئی علاج نہیں اور حدود درجہ مجبوری کے طور پر اسے استثنا کے ذیل میں رکھنا پڑتا ہے۔ مثلاً انھوں نے گارساں دتاسی کی تصانیف کی دی ہے جو فرانسیسی زبان میں ہے۔ چوں کہ اُردو والے انگریزی کی طرح فرانسیسی سے واقف نہیں ہو سکتے اس لیے اس کی کتابوں کے تراجم سے ہی استفادہ کرنا پڑے گا۔ تذکروں سے قطع نظر کچھ ایسی فارسی کتابوں کے متعلق خاں صاحب کا موقف یہ ہے کہ ان کا ترجمہ ہونا چاہیے لیکن ترجمے کے ساتھ اصل متن کو بھی شامل کرنا ضروری ہوگا۔

خاں صاحب محترم کا یہ خیال کہ تذکروں کے تراجم کو اصل مآخذ کے طور پر استعمال نہیں کیا جا سکتا، حقیقت پر مبنی ہے۔ انھوں نے تذکروں کے خطی نسخوں سے استفادے کی جو بات کہی وہ بھی اپنی جگہ درست ہے۔ حالاں کہ اس سے دقتیں بڑھیں گی لیکن معیاری تحقیق کے لیے انھیں برداشت کرنا پڑے گا لیکن انھوں نے تذکروں کے اُردو تراجم کو فضول کام کہا ہے اور اسی عام لوگوں کی دل چسپی کی چیز نہیں مانا ہے اس سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ پروفیسر عطا کاکوی نے تو یہ ''فضول کام'' خوب خوب کیا ہے۔ اگر ''عام دل چسپی'' کے اصول پر عمل کیا جائے تو فلسفے کی کتابوں کا ترجمہ بھی نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ یہ عام دل چسپی کی چیزیں نہیں۔ یہی بات عروض و بلاغت کی فارسی کتابوں کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔ تذکرے صرف عام لوگوں نے نہیں لکھے۔ محمد تقی میر، میر حسن اور مصحفی جیسی نابغۂ روزگار ہستیوں نے بھی یہ کام کیے ہیں۔ فارسی ناواقف یا کم واقف باذوق قاری کی اس میں دل چسپی ہو سکتی ہے کہ میر اور میر حسن نے دیگر ادبی ہستیوں کے متعلق کیا لکھا ہے لہٰذا ان تذکروں کے تراجم کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ غلط ترجمے کی وجہ سے یہ کام نہیں ہونا چاہیے تو بھی اسے قبول نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات گویا فرض کر لی گئی ہے کہ اُردو میں صحیح ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ایسے لوگ کم ہیں جو فارسی اور اُردو دونوں پر یکساں عبور رکھتے ہوں لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ یہ کام سرے سے ممکن ہی نہیں۔ اگر تراجم میں غلطیاں ہیں تو دوسرے ذہین حضرات تفصیل سے ان خامیوں کو اُجاگر کریں اور ان کی روشنی میں خامیوں کو درست کر لیا جائے۔ جہاں تک گارساں دتاسی کی تصانیف کا سوال ہے تو اسے بھی قبول کرنے میں تامل ہوتا ہے۔ خاں صاحب کی تحریروں سے ظاہر ہے کہ تحقیق نہایت دقّت طلب کام ہے اس لیے اگر عام محققین سے نہیں تو کم از کم خواص سے مطالبہ کیا ہی جا سکتا کہ وہ فرانسیسی سے بھی واقف ہوں۔ قاضی عبدالودود نے گارساں دتاسی کو غلط فہمیوں کا بادشاہ کہا ہے (شعرا کے تذکرے، خدا بخش لائبریری 1995 ص 236،) ظاہر ہے کہ جو مصنف خود غلط فہمیوں کا بادشاہ ہو، اس کی تصانیف کے تراجم کی صورت میں (جیسا کہ ترجموں کے متعلق خاں صاحب فرماتے ہیں) کیا کیا گل افشانیاں ممکن ہو سکتی ہیں، ایسے حالات میں ان تراجم پر مجبوری کی حالت میں بھی کیسے بھروسا کیا جا سکتا ہے اور اگر ان پر بھروسا کیا جائے گا تو فارسی تراجم کے ساتھ بھی اتنی سختی مناسب نہیں۔

دوسری فصل میں یونی ورسٹیوں میں اُردو تحقیق کے مسائل کا بے لاگ تجزیہ ہے۔ خاں صاحب نے ابتدا میں ہی یونی ورسٹیوں کے تحقیقی مقالوں کے کارخانے کی حیثیت اختیار کرنے اور اس کے سبب معیار کی پستی کے عام ہونے کی بات کہی ہے۔ ان کے خیال میں بہت سے طلبا تحقیق سے دل چسپی کے تحت نہیں بل کہ ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد محض وقت گزاری کے طور پر ریسرچ میں داخلہ لیتے ہیں بقول خاں صاحب:

''طالب علم تو محض طالب علم ہوتا ہے، وہ اس وقت تحقیق کے مسائل سے واقف ہوتا ہے نہ اس کی شرائط سے باخبر ہوتا، ہاں پریشاں خاطر ضرور ہوتا ہے۔ اس لیے اگر وہ اس وادیِ پُر خار میں چلنے کے لیے آمادہ ہوجاتا ہے تو یہ چنداں قابلِ تعجب نہیں؛ وہ اساتذہ جن کے مشورے اور مرضی سے یہ سب کچھ ہوتا ہے، ذمّے داری ان کی ہے۔ ان حضرات کے طرزِ عمل سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ یونی ورسٹیوں میں ایم.اے اور پی.ایچ.ڈی میں جس قدر زیادہ طالب علم ہوں گے، اسی قدر اُردو کی بقا کا سروسامان زیادہ مہیا ہوگا؛ مگر یہ بڑا مغالطہ ہے۔ وجہ جو بھی ہو، صورتِ حال یہ ہے کہ اربابِ حل وعقد اس سلسلے میں اس ناروا فیاضی کے خوگر ہو گئے ہیں جو کم معیاری کی ضمانت ہوا کرتا ہے۔ اس کا اندوہ ناک پہلو یہ ہے کہ اس طرح تحقیق کی اولین تربیت گاہ، آسان پسندی کا دبستان بن کر رہ جاتی ہے۔'' (ص 34)

خاں صاحب جب دہلی یونی ورسٹی سے تعلق رکھتے تھے ممکن ہے انھوں نے وہاں کی صورت حال اور کچھ اور مرکزی یونی ورسٹیوں کی اس وقت کی صورتِ حال کو سامنے رکھ کر یہ بات کہی ہو لیکن آج کی تعلیم گاہوں میں تحقیق کا بھرم کسی حد تک قائم ہے لیکن ملک کے طول وعرض میں پھیلی یونی ورسٹیوں کی حالت اس معاملے میں آخری حد تک تشویش ناک ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نوّے فی صد سے زیادہ لڑکے تحقیق میں داخلہ لینے کے گناہ گار ضرور ہوتے ہیں لیکن وہ تحقیق کے نام پر چار سطریں لکھنے کے اہل نہیں ہوتے۔ ایسے سبھی لڑکے یا تو درمیان میں ہی اپنا کام چھوڑ دیتے ہیں یا کسی شناسا سے معاملہ طے کرتے ہیں اور اس میں خود بھی کمیشن لیتے ہیں۔ نگراں حضرات کی اکثریت بھی کچھ نہیں جانتی۔ چوں کہ یہ کام بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے اس لیے جو چند اصحاب لکھنا جانتے ہیں انھی کے سر پر سارا بوجھ پڑتا ہے۔ وہ پیسے لے کر بھی بے گار ٹالتے ہیں۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ متعلقہ موضوع پر کوئی دوسری کتاب موجود جو عموماً ہوتی ہے تو اس کے بیش تر حصے جوں کے توں اور کبھی الفاظ کے معمولی تغیر کے ساتھ نقل کر دیے جاتے ہیں۔ کبھی اس موضوع پر کوئی اور کام ہوا تو اسے حاصل کر کے صرف اس کا ٹائٹل بدل دیا جاتا ہے اور ڈگری مل جاتی ہے۔ اس حمام میں بڑے بڑے ننگے ہیں۔ یہ صرف اُردو کا ہی نہیں بل کہ دیگر زبانوں اور آرٹس اور سائنس کے سبجیکٹس کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔ اگر اس کی سی بی آئی جانچ کرا دی جائے تو بڑے بڑے عبرت ناک مناظر اس کے سامنے پیچ نظر آئیں۔ ایسے ایسے نگراں حضرات موجود ہیں جن کی نگرانی میں سیکڑوں مقالے لکھے گئے ہیں لیکن ان میں کوئی منظر عام پر نہیں آیا۔ وہ منظر عام پر لانا چاہیں بھی تو نہیں لا سکتے۔ تحقیقی اصول وضوابط تو اس کے لیے ہیں جو تحقیق کرتا ہو لیکن جہاں تحقیق کے نام پر ہر بے اصولی اصول بن گئی ہو وہاں سوائے سر پیٹنے کے اور کیا کیا جاسکتا ہے لہٰذا ناروا فیاضی اور آسان پسندی کی باتوں سے معاملہ کوسوں آگے بڑھ چکا ہے۔

لیکن اس اندھیرے میں بھی بعض یونی ورسٹیوں میں ابھی تحقیق کے چراغ جھلملا رہے ہیں اور بعض محنتی نگراں حضرات اپنے پیشے کی لاج بچائے ہوئے ہیں، خاں صاحب کی باتیں ایسے لوگوں کے لیے ہی کارگر ثابت ہوسکتی ہیں۔ انھوں نے تدوین اور تحقیق کے لیے طبعی مناسبت کی اہمیت پر زور دیا ہے اور ظاہر ہے کہ اس کے بغیر یہ بیل منڈھے چڑھ ہی نہیں سکتی۔ خاں صاحب کا یہ شکوہ بھی درست ہے کہ آج طلبا اور اساتذہ اصول تو بہت پڑھ لیتے ہیں لیکن ادب کو صحیح پڑھنے اور سمجھنے کی توفیق بہت کم کو نصیب ہوتی ہے۔ ان کی تجویز یہ ہے کہ:

''ایم.اے پاس طلبا میں صرف انھی کو تحقیق میں داخلہ دیا جائے جو واقعتاً اس کے اہل ہوں اور یہ میرا تجربہ ہے کہ ایک دو طالب علم ہر سال ایسے مل سکتے ہیں جو صحیح تربیت پانے کے بعد تحقیق یا تدوین کا کام مناسب طور پر انجام دے سکتے ہیں۔'' (ص 36)

تجویز تو معقول ہے لیکن موجودہ صورتِ حال کے پیشِ نظر اس پر عمل درآمد کا دور دور تک امکان نظر نہیں آتا۔ خاں صاحب نے ایم.اے کے بعد سال دو سال کے خاص نصاب (ایم.فل) کا مسئلہ بھی اُٹھایا ہے اور اسے ضروری قرار دیا ہے لیکن ان کا مشورہ یہ ہے کہ اسے وہی حضرات پڑھائیں جو فارسی سے آشنا ہوں اور خود ان کے مزاج کو تحقیق سے لگاؤ ہو۔ انھوں نے اساتذہ کے دواوین کو بھی مرتب کرنے کی جانب توجہ دلائی ہے لیکن ان کا کہنا ہے کہ اس کام میں وہی لگے جو اصولِ تدوین سے واقف ہو اور اچھی فارسی جاننے والا ہو۔ وہ قواعدِ زبان وبیان، لسانی مباحث، تذکیر وتانیث کے مسائل، متروکات کی بحثوں، تلفظ و املا کے مسائل، عروض وقوافی کی مشکلات اور اسی طرح کے دیگر متعلقات کو اچھی طرح جانتا ہو۔ ظاہر ہے کہ تحقیق کے موجودہ منظر نامے کو دیکھتے ہوئے ایسے طلبا کا ملنا تقریباً ناممکن ہے۔ اس کام کو تجربہ کار اساتذہ اور پختہ کار محقق ہی انجام دے سکتے ہیں۔ ایسے کام نئے طلبا کے حوالے کرنا متن کا خون کرنے کے مترادف ہے۔

خاں صاحب نے ایک اور اہم نکتے کی جانب بھی اشارہ کیا ہے جو ریسرچ کے ذمے دار حضرات کے لیے، بہت مفید ہے۔ ہر شخص ہر موضوع پر نہ خود تحقیق کرسکتا ہے اور نہ اس کی نگرانی کا فریضہ انجام دے سکتا ہے اس لیے نگراں حضرات کو بھی اسی موضوع کی نگرانی قبول کرنی چاہیے جس سے ان کی طبعی مناسبت ہو اور وہ خود بھی اس موضوع پر دست رس رکھتے ہوں۔ افسوس یہ ہے کہ ایمان داری کے فقدان کے سبب سب کچھ جانتے ہوئے بھی عام طور پر ایسا ہوتا نہیں ہے۔ یہ بھی کہ نگراں اس موضوع سے متعلق جانتا تو ہے لیکن وہ دوسرے غیر ادبی کاموں میں اتنا مصروف رہتا ہے کہ طلبا کو کبھی وقت ہی نہیں دے پاتا اور اس کی نگرانی میں ان جیسے ایک نہیں کئی کئی طلبا ہوتے ہیں۔ خاں صاحب نے ایک بات ایسی بھی لکھی ہے کہ ایسے جہاں دیدہ انسان کی سادگی پر تعجب ہوتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ تحقیقی مقالوں کے ممتحنین کے انتخاب میں بھی بے امتیازی برتی جاتی ہے اور یہ انتخاب موضوع سے مناسبت کی بنا پر نہیں ہوتا لہٰذا ایسے مقالوں پر اسناد عطا ہو چکی ہیں یا کر دی جاتی ہیں جن کے مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ممتحن نے یا تو خود اسے دیکھا نہیں یا وہ اس کے متعلقات سے باخبر نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ نگراں حضرات کا اپنا اپنا حلقہ اور ایک دوسرے سے خاموش معاہدہ ہے کہ تم میرے پاس مقالے بھجواؤ میں تمھارے پاس بھجواؤں گا۔ ریسرچ اسکالر کو ڈگری دلوانے کا معاہدہ پہلے طے ہو چکا ہوتا ہے۔ لہٰذا بہت آسانی سے سبھی مراحل بہ خیر وخوبی طے پا جاتے ہیں۔ معاملہ جو بھی ہو خاں صاحب کی اس تمنا کی ان دیکھی نہیں کی جاسکتی کہ:

''یہ مسائل اساتذہ کی توجہ کے طلب گار ہیں، کیوں کہ وہی طالب علم کے راہ نما ہوتے ہیں، وہی ممتحن بنتے ہیں اور وہی طالبِ علم کے لیے مثال ومعیار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر اس طرف توجہ نہ کی گئی تو تحقیق کا معیار گرتا ہی چلا جائے گا۔'' (ص 44)

تیسری فصل میں رشید حسن خاں نے تحقیق وتدوین کے لیے ایک بنیادی شرط کا ذکر کیا ہے کہ یہ کام مالی منفعت کے جذبے سے بلند ہو کر کیا جانا چاہیے۔ مالی منفعت بذاتِ خود کوئی بُری چیز نہیں لیکن اسے حصولِ مدّ کا ذریعہ سمجھ لیا جائے تو تحقیق وتدوین کا بنیادی مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ وہ دنیاداری اور جاہ ومنصب کے حصول کی تمنا سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں کہ اس کے لیے جس خاص مزاج کی ضرورت اور جن آداب کی پابندی لازمی ہے اس سے سب سے پہلے صداقت پر ضرب پڑتی ہے اور یہ چیز تحقیقی مزاج کے منافی ہے۔ وہ محققوں کے لیے دولتِ قناعت اور بے نیازی ضروری قرار دیتے ہیں انھوں نے تحقیق کے فن کا کلاسیکی موسیقی سے تشبیہ دی ہے جسے حاصل کرنے کے لیے عجلت، آسان پسندی بل ہوسی اور خفیف الحرکاتی سے بچنا پڑتا ہے۔ جو لوگ عشق اور ہوس کا فرق نہیں سمجھتے وہ راہِ تحقیق کے مسافر نہیں ہو

سکتے۔ظاہر ہے کہ محض مادّی فائدے کے لیے تحقیق کی جائے تو محقق کا مزاج بدلے گا اور جب مزاج بدل جائے گا تو معیار کی توقع ہی فضول ٹھہرے گی۔

رشید حسن خاں نے طلبا کے علاوہ تحقیق کرنے والوں کو تین زمروں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے زمرے میں وہ لوگ ہیں جو تحقیق کو ایک مقدس فریضہ سمجھ کر انجام دے رہے ہیں،ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے۔دوسرے زمرے میں وہ اصحاب آتے ہیں جو مختلف اداروں میں بعض منصوبوں کے تحت کام کرتے ہیں،خاں صاحب ان کے پنچایتی کاموں سے مطمئن نہیں۔تیسرا گروہ ایسے لوگوں پر مشتمل ہے،جن کا تعلق اعلا دانش گاہوں سے ہے اور یہی لوگ تحقیقی خلفشار کے سب سے بڑے ذمے دار ہیں۔یہاں رشید حسن خاں نے اپنے عہد کے تحقیقی منظر نامے کو سامنے رکھتے ہوئے سب کچھ لکھا ہے اور جو کچھ لکھا ہے اس کا ایک ایک حرف صداقت پر مبنی ہے۔مثلاً ایسے حضرات جو صرف تحقیقی اسناد رکھنے کے گناہ گار اور دنیاداری میں ماہر ہیں وہ بھی محقق اور تحقیقی مقالوں کے نگراں بن بیٹھے ہیں۔کچھ لوگ ادب کے کسی دوسرے شعبے میں شہرت رکھتے ہوئے اس پر قناعت نہیں کرتے اور وہ بھی تذکروں کی تدوین کا کام سنبھال لیتے ہیں حالاں کہ وہ سرے سے اس کے اہل نہیں ہوتے صرف ذاتی اغراض کی تکمیل کے لیے تحقیق کا بیڑا اغرق کرتے ہیں۔بعض حضرات اُستادی کا منصب سنبھالتے ہی فن سے واقف ہوئے بغیر کتابیں لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔کچھ لوگ کسی موضوع پر کتابوں کی عدمِ دست یابی کو دیکھتے ہوئے اس موضوع پر کتابیں لکھنے بیٹھ جاتے ہیں حالاں کہ وہ اس کام کے لائق نہیں ہوتے۔کچھ لوگ انٹرویو میں شریک ہونے کے لیے تحقیق و تدوین کو آسان کام سمجھ کر جلدی جلدی کتابیں لکھتے ہیں یا مرتب کرتے ہیں،اس لیے عموماً ذاتی فائدہ تو حاصل ہو جاتا ہے لیکن نقصان صرف تحقیق کا ہوتا ہے۔خاں صاحب نے ہندستانی نظامِ تعلیم کی عکاسی کرتے ہوئے جو شکوہ کیا ہے وہ بالکل درست ہے کہ:

> ''ہمارے نظامِ تعلیم کا یہ کرشمہ ہے کہ اُستاد قدر سینیر ہوتا ہو جائے گا اور بلندی کے زینوں پر چڑھتا جائے گا،اسی قدر دنیا کے دوسرے دھندوں میں زیادہ پھنستا جائے گا۔اس سفر میں ایک منزل وہ بھی آتی ہے کہ جب اس کے پاس واقعتاً اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ لکھنے پڑھنے کا حق بھی ادا کر سکے،لیکن مشکل یہ ہوتی ہے کہ وہ تصنیف و تالیف سے قطعِ تعلق بھی نہیں کر سکتا کیوں کہ انھی اوراقِ جمشیدی کی مدد سے تو وہ اپنا طلسمِ ہوش ربا سجائے ہوئے ہے۔اس صورت میں تحقیق کا حق کیسے ادا ہو سکتا ہے،مجبوراً کم معیار پر قناعت کرنا ہوگی اور مالِ غنیمت پر نظریں لگی رہیں گی۔'' (ص 51)

یہ صورت حال آج بھی برقرار ہے اور اس میں تبدیلی کے کچھ آثار نظر نہیں آتے۔اساتذہ تحقیق و تدوین کے نام پر ایسی کتابیں لکھ رہے ہیں جن کا معیار سے کوئی سروکار نہیں۔جب اُستاد ہی اپنی ذمہ داریوں کا لحاظ نہیں رکھے گا تو اس کے شاگرد جیسے ہوں گے اس کا اندازہ بہ آسانی کیا جا سکتا ہے۔

میدان تحقیق میں بہت سے ایسے کام ہیں مثلاً لغت،تاریخ ادب اُردو،زبان اور قاموس الکتب وغیرہ،انھیں انفرادی طور پر سر انجام دینا بہت دشوار ہے۔رشید حسن خاں نے ''تحقیق سے متعلق بعض مسائل'' کے چوتھے اور آخری حصے میں اسی موضوع کو چھیڑا ہے۔انھیں شکوہ ہے کہ اُردو میں کسی منصوبے پر مل جل کر کام کرنے کی صالح روایت نہیں بن سکی اور اسی لیے اخلاقیاتِ تحقیق کا ضابطہ بھی مرتب نہیں ہو سکا۔اس سے بے نیازی کے سبب ہی اجتماعی تحقیقی کام میں معیار کی پستی عام ہے۔خاں صاحب نے کم معیاری کی جو وجوہات بیان کی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں اجتماعی تحقیقی کاموں کی منصوبہ سازی خالص علمی مقاصد کے تحت نہیں ہوتی،علمی اداروں میں باصلاحیت افراد سے بھی شخصی وفاداری کی توقع کی جا سکتی ہے اور بعض اوقات اس وفاداری کو حقیقی صلاحیت پر فوقیت دی جاتی ہے۔لوگوں کے شخصی وقار،عزتِ نفس اور احساسِ خودداری کا لحاظ کم سے کم رکھا جاتا ہے۔احساسِ انا اور احساسِ وقار کا درجۂ حرارت کم ہوئے بغیر اسے کام کا آدمی ہی نہیں سمجھا جاتا۔یہاں کام دوسرے کرتے ہیں اور نگرانِ اعلا یا صاحب مرتب کے نام سے چھپتا ہے۔جب یہ بات تسلیم شدہ ہو کہ کتاب دوسرے کے نام سے چھپے گی تو دوسرے کام کرنے والے محنت سے جی چراتے ہیں اور ایسا ہونا فطری ہے۔اس طریقۂ کار نے اجتماعی تحقیق کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔

کسی منصوبے پر کام کرنے کے لیے صرف اہلِ نظر کا ہی انتخاب نہیں ہوتا ان پر شہرت اور منصب کا لحاظ رکھنے کی وجہ سے غیر مستحق لوگ بھی شامل ہو جاتے ہیں اس طرح وہ کام جو بہتر طور پر انجام پا سکتا تھا وہ غارت ہو جاتا ہے۔بعض اساتذہ کسی ادارے کا کام قبول کر لیتے ہیں لیکن اپنی غیر علمی مصروفیت کے سبب صلاحیت رکھتے ہوئے بھی اسے خود سے نہیں کرتے بل کہ اپنے شاگردوں کو سونپ دیتے ہیں اور شاگرد اسے بے گار سمجھ کر جیسے تیسے بھگتا دیتے ہیں۔اس انداز کا جو کام ہوگا اس میں معیار کی تلاش فضول ہے۔خاں صاحب اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے اس کے قائل ہیں کہ اجتماعی ادبی منصوبوں کا خاکہ خاص علمی سطح پر مرتب کرنے کے بعد محنت سے کام کرنے والوں کو ایک مرکز پر جمع کیا جائے۔انھوں نے ایک معنی خیز بات یہ کہی ہے کہ:

> ''نئے کام کرنے والے احتیاط کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنے میں زیادہ ساعی ہوں گے،کیوں کہ ان کی پُشت پر شہرت و منصب کا پُشتارہ نہیں ہوگا،جس کی وجہ سے مطمئن اور بے نیاز ہوں۔یک سوئی،لگن اور اچھی رہ نمائی،یہ ایسی چیزیں ہیں جو بہت سی کمیوں کو پورا کر سکتی ہیں۔'' (ص 60)

اجتماعی کام کے لیے سازگار فضا سے محرومی کی وجہ سے خاں صاحب دل شکستہ نظر آتے ہیں۔انھوں نے تحقیق کی اس بوجھل اور ناسازگار فضا میں چبھتے ہوئے سوالات کے پتھر اُچھالے ہیں اور اپنے دل کا درد اِس شعر کے حوالے سے یوں اُجاگر کیا ہے۔

در بدر ٹھوکر یں کھاتے ہوئے پھرتے ہیں سوال
اور مجرم کی طرح اُن سے گریزاں ہے جواب

تحقیق سے شغف رکھنے والے حضرات اچھی طرح واقف ہیں کہ اس میدان میں قدم قدم پر حوالوں کی ضرورت پڑتی ہے۔اس کے بغیر محقق ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتا۔تحقیق میں جب کوئی حوالہ پیش کیا جائے گا تو اس کا معتبر ہونا بھی ضروری ہے۔رشید حسن خاں نے ''ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ'' کے باب ''غیر معتبر حوالے'' میں اس پہلو پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔انھوں نے حوالوں کو تین درجوں (مستند،غیر مستند اور مشکوک) میں تقسیم کیا ہے اور ان تینوں کی تعریف بھی بیان کی ہے۔وہ یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ مشکوک حوالہ وہ ہے جس کے متعلق کوئی بات قطعیت کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی لیکن استدلال کی حد تک وہ مشکوک اور غیر مستند حوالوں کو ایک ہی درجے میں رکھتے ہیں۔احقر کے خیال میں بے شک مشکوک حوالے پر استدلال کی عمارت کھڑی نہیں کی جا سکتی لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ اسے ہم غیر معتبر کے درجے میں رکھ دیں۔مشکوک حوالے قبول کرنے کے لیے یہ لازمی ہے کہ کسی دوسرے ذرائع سے اس کی تصدیق ہو جائے۔تصدیق نہیں ہونے کی صورت میں بھی اسے سرے سے مسترد نہیں کیا جا سکتا اور جب مسترد نہیں کیا جا سکتا تو اسے غیر مستند کے درجے میں بھی نہیں رکھا جانا چاہیے۔یقین اور عدم یقین کی درمیانی صورت قیاس کی ہے،قیاس کی بنیاد معقول ہو تو اس پر بہت حد تک بھروسا کیا جا سکتا ہے۔

رشید حسن خاں حوالے کے قابلِ قبول ہونے کی ایک شرط یہ بیان کرتے ہیں کہ واقعے اور روایت کے درمیان اتنا زمانی فصل نہ ہو کہ روایت کا تسلسل ٹوٹ جائے۔ وہ راوی کی ذاتی معلومات پر مبنی روایات کو بھی ٹھوک بجا کر دیکھ لینے کے قائل ہیں جیسے کہ اس روایت میں غلط فہمی اور جانب داری کی کارفرمائی تو نہیں ہے۔ انھوں نے راوی کی حیثیت پر بھی سوال اُٹھایا ہے۔ جو لوگ ہر طرح کی روایتوں کو بلا تحقیق تسلیم کر لیتے ہیں یا جن لوگوں کو افسانہ تراشی کا شوق ہوتا ہے ان کی باتیں جرح و تعدل کے بغیر قبول نہیں کی جاسکتیں۔ روایت کے سلسلے میں خاں صاحب نے ملّا وجہی کی ''سب رس'' میں امیر خسرو کے نام سے منسوب ایک دوہے کی مثال پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ امیر خسرو کی وفات اور ''سب رس'' کی تصنیف میں تین سو سال کا فرق ہے۔ اس زمانی فصل کے دیکھتے ہوئے اسے خسرو کا دوہا تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ روایت کے تعلق سے کئی لوگوں نے اس خیال سے اختلاف کیا ہے۔ مثلاً پروفیسر گیان چند جین، پروفیسر ممتاز حسین، پروفیسر گوپی چند نارنگ اور پروفیسر طلحہ رضوی برق وغیرہ۔ یہاں تفصیل کا موقع نہیں لیکن مجھے خاں صاحب کا موقف درست معلوم ہوتا ہے کیوں کہ زمانی روایتوں کو اگر استناد کا درجہ دے دیا جائے تو ''قصۂ چہار درویش'' کے مصنف امیر خسرو ٹھہریں گے اور دیوان خواجہ معین الدین کے شاعر مولانا معین الدین نہیں بل کہ خواجہ اجمیری قرار پائیں گے۔ اس سے تحقیق میں انتشار کی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔

اسی مضمون میں خاں صاحب نے کلیاتِ سوؔدا کے اس خطی نسخے کو جو انڈیا آفس لندن کے کتب خانے میں محفوظ ہے اور جو ''نسخۂ جانسن'' کے نام سے مشہور ہے اسے الحاقی کلام سے پاک اور کلامِ سوؔدا کے لیے معتبر قرار دیا ہے۔ یہ بات انھوں نے مذکورہ کتاب ''متعلقاتِ سودا'' کے دیباچے میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ ''نسخۂ جانسن'' میں دیدہ و دانستہ تحریفیں بھی کی گئیں ہیں اور اس میں الحاقی کلام بھی موجود ہے۔ (متعلقاتِ سودا ص 32۔40)

رشید حسن خاں نے تاریخِ ادب کی کتابوں، لغات، انتخابات اور نصابی کتب میں محفوظ ادب پاروں کو صحتِ انتساب اور صحتِ متن کے اعتبار سے معتبر تسلیم نہیں کیا کیوں کہ ایسے کاموں میں عام طور پر بے احتیاطی برتی جاتی ہے۔ اسی طرح وہ محیر العقول حکایتوں، معاملاتِ تصوف اور مذہبی معتقدات کو بھی اسی زمرے میں رکھتے ہیں۔ بیاضوں کے حوالوں پر بھی انھیں پورا یقین نہیں اور اس عدم یقین کا سبب بیان کرتے ہوئے انھوں نے حافظ محمود شیرانی کی کتاب ''پنجاب میں اُردو'' صفیر بلگرامی کے تذکرے ''جلوۂ خضر (جلد اول)'' نصیر حسین خیال کی ''مغل اور اُردو'' ڈاکٹر جمیل جالبی کی ''تاریخِ ادب اُردو'' اور عبدالباری آسی کی ''مکمل شرح کلامِ غالب'' سے متعدد مثالیں پیش کی ہیں۔ ''پنجاب میں اُردو'' کے مشکوک اور غلط انتساب کا خصوصی جائزہ لیا گیا ہے اس لیے وہ سفارش کرتے ہیں کہ:

''روزنامچوں اور بیاضوں کے اندراجات ہو یا زبانی روایتوں یا اس قسم کے دوسرے ذرائع، ان کا مطالعہ تو ضرور کرنا چاہیے مگر بہ طورِ حوالہ ان کو قبول کرنے میں احتیاط اور بہت زیادہ احتیاط کرنا چاہیے، کیوں کہ غیر معتبر روایتوں کی کمی نہیں۔ جب تک صحتِ انتساب کا یقین نہ کر لیا جائے اس وقت تک بہ طورِ سند ایسے حوالوں کو نہ قبول کرنا چاہیے اور نہ پیش کرنا چاہیے۔ بیاضوں وغیرہ کے پُرانے اندراجات تو الگ رہے، شاعر کی زندگی میں اس کے کلام میں تحریف کی مثالیں مل سکتی ہیں اور غلط انتساب کی بھی۔'' (ص 74۔75)

خاں صاحب نے بیاضوں کے علاوہ انیسویں صدی کے اواخر سے لے کر اب تک جو تذکرے لکھے گئے ہیں ان پر تحقیقی نظر ڈالی ہے۔ انھوں نے ''آبِ حیات'' کو بہت سے غیر معتبر بیانات کا مخزن، صفیر بلگرامی وغیرہ کے تذکروں کو غیر معتبر واقعات کا مال خانہ اور بے سروپا روایتوں کا گنجینہ قرار دیا ہے۔ انھوں نے مالک رام کے ''تذکرۂ معاصرین'' سے بھی بیانِ واقعات اور سنین کی غلطیاں دکھائی ہیں اور بیش تر جگہوں پر ماٰخذ کا اندراج نہیں ہونے کی بنا پر اس پر تنقید کی ہے۔ وہ مضامین کے مجموعوں کی معلومات اور ان کے مندرجات کو جانچے پرکھے بغیر تسلیم کرنے پر خبردار کرتے ہیں۔ وہ اولین ماٰخذ کے ہوتے ہوئے ثانوی ماٰخذ پر بھروسا کرنے کے قائل نہیں۔ رشید حسن خاں کا کوئی دعوا بغیر شافی دلیل کا نہیں اس لیے اس پر یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

حوالے کے معتبر ہونے تک شرائط میں ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس کا متن اسقام سے پاک اور قابلِ اعتماد ہو۔ غیر درست متن کی موجودگی میں محقق بہت ٹھوکریں کھاتا ہے اور اس کے اخذ کردہ نتائج قابلِ وثوق نہیں ہوتے۔ رشید حسن خاں نے زیرِ بحث تصنیف کے باب ''حوالہ اور صحتِ متن'' میں کافی تفصیل سے اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے اپنی پریشانیوں کا اظہار کیا ہے۔ ان کی نگاہ میں اُردو میں ایسے متون بہت کم ہیں جن پر بھروسا کیا جاسکے۔ اساتذہ کے دواوین، قدیم نثری تصانیف اور تذکروں کے صحیح معنوں میں تحقیقی اڈیشن نہیں کے برابر تیار ہو سکے ہیں۔ تحقیق کے طلبا کے لیے یہ صورتِ حال کسی مصیبت سے کم نہیں۔ موجودہ صورت میں ایسے متون سے حوالہ دیتے وقت بہت احتیاط کی ضرورت ہے ورنہ غلط فہمیوں اور غلط نتائج سے بچنا ناممکن ہو جائے گا۔ ایک ہی کتاب کی مختلف اشاعتوں میں متن میں تبدیلیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ یہ کبھی مصنف کی طرف سے ہوتی ہیں، کبھی کاتب کی ستم ظریفی کا نتیجہ ہوتی ہیں اور کبھی کوئی مصحح اپنا کمال دکھاتا ہے۔ ایسے اختلافات پر محقق کی گہری نظر ہونی چاہیے۔

اُردو ہو یا فارسی، مشہور شاعروں کے کلام میں خاصا الحاقی کلام موجود ہے۔ اس میں عمر خیام کی رباعیات حتّیٰ کہ فردوسی کا شاہ نامہ بھی شامل ہے۔ رشید حسن خاں نے ایران کے بزرگ محقق محمد قزوینی کے حوالے سے تحریر کیا ہے کہ دیوانِ حافظ کے جو نسخے نویں صدی ہجری تک لکھے ہوئے ملتے ہیں ان میں غزلوں کی تعداد پانچ سو سے زیادہ نہیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تعداد بارھویں صدی کے اوائل تک چھے سو اور موجودہ صدی میں آٹھ سو تک پہنچ گئی ہے۔ اب یہ تین سو غزلیں حافظ کی ہیں یا نہیں اس کا جب تک کوئی ٹھوس ثبوت موجود نہیں ہو ان پر کیسے اعتبار کیا جاسکتا ہے اور ثبوت نہیں ہونے کی صورت میں ان سے جو نتائج اخذ کیے جائیں گے وہ کیسے قابلِ اعتنا قرار پائیں گے؟ کلیاتِ سوؔدا کے مطبوعہ اڈیشنوں میں میر سوؔز کی غزلیں شامل ہیں۔ محمد حسین آزاد کے مرتبہ دیوانِ ذوقؔ میں آزاد کی ترمیمیں موجود ہیں، ناسخ کے کلام میں ان کے شاگرد میر اوسط علی رشکؔ نے تبدیلیاں کیں ہیں، اسیؔر اور امیؔر مینائی نے مل کر مصحفؔی کے کلام کا جو انتخاب کیا ان میں ان کی تصحیحات موجود ہیں۔ ایسی حالت میں ادب کے سنجیدہ طلبا اور محققین کی ذمّے داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں۔ رشید حسن خاں نے پرانی کتابوں کے اچھے خطی نسخوں اور مطبوعہ کتابوں کے متن کے اختلافات کا بھی ذکر کیا ہے اور مختلف مثالیں پیش کی ہیں۔ معروف اشعار کے متن میں بھی اکثر اختلافات پائے جاتے ہیں لہٰذا خاں صاحب کا یہ مشورہ بہت صائب ہے کہ اشعار نقل کرتے وقت اصل مجموعوں سے حتی الامکان پرہیز بہتر ہے۔ یہی حال لغات، تذکیر و تانیث اور قواعد سے تعلق رکھنے والے رسائل میں موجود اشعار کا ہے۔ کم سواد کاتبوں کے کتابت شدہ نسخوں پر بھی بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔ خاں صاحب کربل کتھا کے واحد خطی نسخے کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کے کاتب کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس کی تحریر میں فاش غلطیاں موجود ہیں۔ اس نے ڈھارس کو ''ڈھارث''، ''سات'' کو ''ثات'' اور فرات'' کو ''فراط'' لکھا ہے۔ اب اگر کوئی اس نسخے کی بنیاد پر اس کتاب کا لسانی تجزیہ کرنے بیٹھ جائے تو یہ تجزیہ کبھی درست نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے یہ بات بھی بہت صحیح کہی ہے کہ کتابوں کی اولین اشاعتیں یا اس کے معتبر نسخے اکثر لوگوں کی دسترس سے باہر ہوتے ہیں۔ مجبوری کے عالم میں دیگر نسخوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ لیکن اس مجبوری اور اس کے اثرات کا صحیح اندازہ ہو تو اس سے احتیاط کے تقاضوں کو جلا ملتی ہے اور لکھنے والا بہت سی غلطیوں سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

''ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ'' کے پہلے حصے کا آخری مضمون ''تدوین اور تحقیق کے رجحانات'' ہے جس میں 1947 کے بعد تحقیق اور تدوین میں جو رجحانات نمایاں ہوئے ہیں اس کا ایک اجمالی

خا کہ پیش کیا گیا ہے۔ رشید حسن خاں نے پہلے تدوین اور تحقیق کے فرق کی وضاحت کی ہے۔ وہ تحقیق و تدوین کو ایک نہیں بل کہ دو علاحدہ مستقل موضوع سمجھتے ہیں البتہ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ ان کی حدیں کہیں کہیں مل جاتی ہیں۔ فرماتے ہیں:

> ''اگر ایک شخص صحیح طریقے سے حقائق کا کھوج، مناسب انداز سے واقعات کو ترتیب دینے اور خالص منطقی ڈھنگ سے نتائج نکالنے کی صلاحیت رکھتا ہے؛ تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ متن کو بھی پورے آداب کے ساتھ مرتب کر سکتا ہے، اس سے اس کی تحقیقی صلاحیت پر حرف بھی نہیں آتا۔ تحقیقی کام کرنے والے کے لیے یہ لازم نہیں کہ وہ ترتیبِ متن پر بھی اسی طرح دسترس رکھتا ہو، البتہ تدوین کا کام کرنے والے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کو آدابِ تحقیق سے بھی اسی قدر واقفیت ہو اور لگاؤ بھی ہو۔ اس کے بغیر تدوین کے تقاضوں کو پورا نہیں کیا جا سکتا۔'' (ص 22۔121)

پروفیسر گیان چند جین کو اس سے اختلاف ہے کہ تحقیق اور تدوین دو علاحدہ فن ہیں۔ وہ خاں صاحب کے اس قول پر کہ تحقیق کرنے والے کے لیے لازم نہیں کہ وہ اچھا مدوّنِ متن بھی ہو، اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''لیکن ایک موضوع پر تحقیق کرنے والے کے لیے یہ کہاں لازم ہے کہ وہ ہر موضوع یا ادب کے ہر شعبے کا اچھا محقق ہو۔ تدوینِ متن کا کام محقق کرتے آئے ہیں۔ متن کی تشکیل و تعبیر کے علاوہ مصنف اور متن کے بارے میں تحقیقی مقدمہ اور حواشی لکھنا تحقیق نہیں تو اور کیا ہے۔ اُردو میں سب سے اچھے متن محمود شیرانی، مولانا عرشی، مالک رام، مسعود حسین خاں، نور الحسن ہاشمی، اکبر حیدری وغیرہ نے تیار کیے ہیں۔ یہ سب محقق ہیں، تنقید میں ان کا اہم مقام نہیں۔ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر زور، پروفیسر سروری، سید محمد وغیرہ نے بہت سے متون ترتیب دیے۔ یہ کام تدوینِ متن کے جدید تقاضوں کو پورا نہیں کرتے لیکن ان لوگوں نے کام تو بہت کیا۔ خود رشید حسن خاں کچھ معرکے کے متون تیار کر رہے ہیں۔ ان سب مدونوں میں سے ہر شخص محقق ہے جس نے تدوینِ متن کے علاوہ تحقیق کا دوسرا کام بھی معتد بہ مقدار میں کیا ہے۔ دوسری طرف جن مشہور نقادوں نے متن ترتیب دیے ہیں ان میں سے کسی نے تدوین کا حق ادا نہیں کیا۔ اس سے تحقیق اور تدوین کی ہم آہنگی بل کہ یک جائی ثابت ہے۔''

(تحقیق کا فن، گیان چند جین، اتر پردیش اُردو اکادمی لکھنؤ، 1990 ص 101)

اسی کتاب کے ص 29۔428 پر وہ انھی خیالات کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''رشید حسن خاں کے خیال کے علی الرغم تدوین تحقیق سے جدا فن نہیں۔ یہ تحقیق ہی کی ایک شاخ ہے۔ اس کے لیے انھیں صلاحیتوں اور ذہنی رجحان کی ضرورت ہوتی ہے جو تحقیق کے لیے درکار ہیں۔ اچھے مدون محققوں کے سوا کوئی دوسرے نہیں۔ اُردو میں عموماً ہر بڑا محقق تدوینِ متن کے بھی کچھ کچھ کام کرتا ہے مثلاً محمود شیرانی، قاضی عبدالودود......سبھی نے تدوینِ متن کے کام کیے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ تدوین تحقیق کا ہی ایک حصہ ہے۔''

یہاں یہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ گیان چند جین نے رشید حسن خاں کی باتوں پر ٹھیک سے غور ہی نہیں کیا۔ خاں صاحب نے ابتدا میں ہی وضاحت کر دی ہے کہ حقائق کی بازیافت، صداقت کی تلاش، حقائق کا تعین اور ان سے نتائج کا استخراج ادبی تحقیق کا مقصد ہے۔ انھوں نے اپنے مضمون میں آگے چل کر مرتبِ متن کے لیے جو شرائط پیش کی ہیں وہ یہ ہیں کہ مرتبِ متن کے لیے لازم ہے کہ وہ صحتِ متن کا مفہوم اور اختلافِ نسخ کا مطلب سمجھتا ہو، قواعدِ زبان، قواعدِ بیان، قواعدِ شاعری اور اچھی فارسی سے واقف ہو، جس عہد کا متن ہے اس عہد کی زبان کی بھی اسے اچھی جان کاری ہو اور اس عہد کے مصنفین کا اس نے مفصل مطالعہ کیا ہو اور ان کے یہاں زبان و بیان کی پائی جانے والی خصوصیات مثلاً لفظوں کے استعمال، جملوں کی تراکیب، تذکیر و تانیث اور متروکات کی بحثوں سے آشنا ہو، وہ مصنفِ متن کے ہم عصروں کے یہاں خاص خاص الفاظ کے متعلق ان کے طرزِ عمل سے بھی باخبر ہو اس کے ساتھ املا کے مسائل سے باخبری اور اصلاحِ زبان کی مختلف تحریکوں سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ ان تمام پہلوؤں سے آشنائی کے بغیر کوئی متن صحیح طریقے سے مرتب ہو ہی نہیں سکتا۔ واضح طور پر لکھتے ہیں اور بالکل درست لکھتے ہیں کہ محقق کے لیے لازم نہیں ہے کہ وہ مرتب متن بھی ہو لیکن مرتب متن کے لیے لازم ہے کہ وہ محقق ضرور ہو۔ یعنی کوئی مرتبِ متن ہوئے بغیر محقق تو ہو سکتا ہے لیکن وہ محقق ہوئے بغیر مدوّن نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے تدوین تحقیق سے آگے کی منزل ہے۔ گیان چند جین کا یہ کہنا کہ اچھے مدون محققوں کے سوا کوئی دوسرے نہیں، یہ دراصل رشید حسن خاں کے ہی قول کی تائید ہے۔ وہ حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، مسعود حسن رضوی ادیب، مولانا امتیاز علی خاں عرشی اور مشفق خواجہ وغیرہ کا نام اچھے مرتبین متن کی حیثیت سے لیتے ہیں یہ بالکل ٹھیک ہے۔ رشید حسن خاں کی باتوں کی تردید اس وقت ہوتی ہے جب وہ ایسے معیاری مرتب شدہ متون کا تذکرہ کرتے جنھیں کسی محقق نے ترتیب نہیں دیا ہو۔ ''من چہ می سرایم وطنبورۂ من چہ می سراید'' شاید اسی کو کہتے ہیں۔ اس بات کو اس مثال سے بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ قاضی عبدالودود ابن امین اللہ طوفان کا ''تذکرۂ شعرا'' دلدار بیگ کے ''قطعاتِ دلدار''، ''قاطع برہان و رسائلِ متعلقہ'' کو مرتب کیے بغیر بھی اپنی دیگر تحقیقی تصانیف کی بدولت بہترین محقق ہیں لیکن وہ محقق نہ ہوتے تو مذکورہ کتابوں کی تدوین اپنی خواہش کے باوجود بھی نہیں کر سکتے تھے۔ جین صاحب کا یہ کہنا ہے کہ ایک موضوع پر تحقیق کرنے والے کے لیے یہ کہاں لازم ہے کہ وہ ہر موضوع یا ادب کے ہر شعبے کا اچھا محقق ہو، یہ انمل بے جوڑ والی بات ہے۔ رشید حسن خاں نے جب ایسا دعوا ہی نہیں کیا اور کوئی کر بھی نہیں سکتا تو یہاں اس بات کا تذکرہ ہی فضول ہے۔ واقعہ یہی ہے کہ تحقیق اور تدوین میں باہمی رشتہ ہوتے ہوئے بھی یہ دونوں دو مستقل موضوع ہیں۔

رشید حسن خاں اس سے متفق ہیں کہ 1947 کے بعد اُردو دنیا نے تدوین کی ضرورت اور اس کی اہمیت کو محسوس کیا اور اس چیز کو بھی سمجھا کہ تحقیق کی طرح اس کے بھی اپنے مسائل اور ضابطے ہیں۔ لوگوں نے متن کی ترتیب میں کی گئی جگر کاوی کا بھی اعتراف کرنا شروع کیا۔ اگر پرانے متون کو پورے آداب کے ساتھ مرتب نہ کیا جائے تو صحیح لسانی جائزہ بھی ممکن نہیں اور نہ کوئی معیاری لغت ترتیب پا سکتا ہے۔ درست متن کے بغیر اس سے اخذ کردہ نتائج گمراہ کن بھی ہو سکتے ہیں۔ 47 کے بعد تحقیق کے فروغ کے نتیجے میں احتیاط کے تقاضے عام ہوئے اور لوگوں نے معتبر ماخذ کی تلاش شروع کی لیکن ان باتوں کے ساتھ خاں صاحب کا یہ شکوہ بھی ہے کہ اس زمانے میں کتابیں مرتب تو ہو رہی ہیں لیکن زیادہ تر کام اصولِ تدوین کے لحاظ سے معیاری نہیں۔ کچھ لوگوں نے تحقیق کی طرح تدوین کو بھی مادی فوائد کے حصول کا ذریعہ بنا لیا ہے۔ سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کی مالی مدد کی خاطر لوگ تحقیق و تدوین کے بے حرمتی پر آمادہ ہیں۔ مدون حضرات میں سے بہت کم ایسے ہیں جو کسی متن کے تمام اہم نسخوں کے حصول کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ کام نہایت صبر آزما ہے۔ جو عجلت پسندی اور آسان طلبی کی صورت میں انجام نہیں پا سکتا۔ خاں صاحب نے اس کی بھی وضاحت کی ہے کہ اچھے محقق اور مدون کے لیے یہ خوبی ضروری نہیں کہ وہ

اچھا نقاد اور اچھا ماہر لسانیات بھی ہو لہٰذا اسے اپنی حدود سمجھنا چاہیے۔ جن لوگوں نے اس حد سے تجاوز کیا ہے وہ عدم توازن کا شکار ہو گئے ہیں۔

رشید حسن خاں نے تحقیق کی اہمیت کے اس بڑھتے احساس پر بھی روشنی ڈالی ہے جو 47 کے بعد نمایاں ہوا۔ تنقید نگار بھی سمجھنے لگے کہ انھیں محققین کے ذریعے پیش کیے گئے حقائق اور شواہد کے تعین کو ہر حال میں نظر میں رکھنا ہوگا اس سے وہ مفروضہ نتائج نکالنے کی بدعت سے محفوظ رہیں گے۔ اسی عہد میں علاقائی ادب کو اُجاگر کرنے کی بھی ضرورت محسوس کی گئی۔ مختلف شہروں اور قصبوں میں جو ادبی سرگرمیاں رہی ہیں انھیں عرصے تک غلط طور پر نظر انداز کیا جاتا رہا۔ لیکن اب رفتہ رفتہ برف پگھلنے لگی ہے اور علاقائی ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات پر بھی لوگوں کی نظر پڑی ہے۔ خاص طور سے دکنی ادب پر بہت کام کیا گیا۔ اسی عہد میں احتساب کی روایت پھر سے زندہ ہوئی اور قاضی عبدالودود نے اپنے احتسابی جائزے اس روایت کو سب سے زیادہ توانائی بخشی۔ یہاں یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ تحقیق کے اس احتسابی عمل کو قاضی صاحب کے بعد خود رشید حسن خاں نے مضبوطی سے آگے بڑھایا۔ ان کے علاوہ پروفیسر عطا کاکوی، پروفیسر حنیف نقوی، عابد پشاوری اور کسی حد تک پروفیسر ظفر احمد صدیقی بھی اس راہ پر ثابت قدمی کے ساتھ چلے۔ خاں صاحب کا یہ کہنا بھی بجا ہے کہ احتساب سے خفیف الحرکاتیاں ختم نہیں ہو سکتیں لیکن اسی وجہ سے لوگوں نے برے کام کو برا سمجھا ہے اور وہ احتیاط کے معنوں سے واقف ہوئے۔

آزادی کے بعد جب احتساب کا سلسلہ پروان چڑھا تو اس کی زد میں آنے والے حضرات نے مثبت اور منفی تحقیق کی اصلاح وضع کی۔ رشید حسن خاں اس روش پر سخت رویہ اپناتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''جن لوگوں کے گھٹیا کام اور غیر ایماندارانہ روش کا احتساب کیا جاتا ہے ان لوگوں نے ایک اصطلاح وضع کی ہے ''منفی اندازِ نظر''۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ غلط کام کو غلط کہتے ہیں وہ ادب کو نقصان پہنچاتے ہیں اور معقول لوگوں کے کام میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔ یعنی جھوٹ بولنا اور تحقیق و تدوین کے نام پر تجارت تو تعمیری کام ہے، پرانے دواوین کو تدوین کے نام پر مسخ کرنا بھی تعمیری کام ہے؛ اور یہ کہنا کہ باتیں غلط ہیں تخریبی انداز ہے۔ لوگ غلط کام اور گھٹیا کام اس سے پہلے بھی کرتے تھے لیکن اس پر ڈھٹائی سے اس طرح فخر کر نہیں کر پاتے تھے۔ یہ انداز خاص اسی زمانے کی پیداوار ہے کہ ادب و تحقیق کے نام پر ہر قسم کی بے عنوانی کی جائے گی اور اس پر ٹوکا جائے گا تو اس کو منفی اندازِ نظر اور تخریبی عمل کہا جائے گا۔'' (ص 139)

رشید حسن خاں نے 1947 کے بعد کے تحقیقی رجحانات کا خاکہ کھینچتے ہوئے یہ بات بتائی ہے کہ اُردو میں ادبی تحقیق کا آغاز بیسویں صدی کے آغاز میں ہوا جس کے سبب سے اہم نمایندے حافظ محمود شیرانی ہیں۔ ان کے کام کی عظمت اور اہمیت کو تسلیم کرنے کے باوجود ان کے اثرات عام نہیں ہو سکے۔ لوگ حالی شبلی اور مولوی عبدالحق کے طرزِ تحقیق کے زیادہ اسیر ہیں۔ خاں صاحب نے شبلی، حالی اور مولوی عبدالحق کی ادبی خدمات کی خوبیوں کا اجمالی جائزہ پیش کرتے ہوئے ان تینوں میں مولوی عبدالحق کی ادبی خدمات کا زیادہ سراہا ہے۔ وہ انھیں اپنے عہد کا گل کرسٹ کہتے ہیں لیکن یہ کہے بغیر نہیں رہتے انھوں نے نہ تحقیق کا صحیح حق ادا کیا اور نہ ان کے مرتب شدہ متون میں آدابِ تدوین کی مکمل پابندی نظر آتی ہے۔ آزادی کے بعد تحقیق کی دنیا میں لوگوں نے شک کرنا سیکھا، ان میں انکار کی جرأت، روایت پرستی کا اثر کم ہونا شروع ہوا اور لوگ دعوے کی دلیل طلب کرنے لگے۔ رشید حسن خاں کی نظروں میں قاضی عبدالودود کی تحریروں سے اس رجحان کو تقویت ملی۔ ان کے تبصروں کو پڑھ کر لوگ تحقیق کے اصول و آداب سے واقف ہوئے لیکن اب بھی یہ تبدیلی ادھوری ہے۔ روایت کا اثر مکمل طور پر زائل نہیں ہوا۔ خاں صاحب کو یہ اُمید ہے کہ ملک میں صنعتی ترقی کے ساتھ صنعتی کلچر فروغ پائے گا جس میں روایتوں کا رنگ دھیما پڑ جاتا ہے۔ ایسی صورت میں انھی کے لفظوں میں ''تحقیق کے منطقی انداز کو فروغ پانے کے لیے قومی سطح پر بھی مناسب ماحول مل جائے گا۔'' (ص 146)

''ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ'' کے اس جائزے میں اس کے اسلوب کا ذکر بھی ناگزیر ہے۔ رشید حسن خاں کا تحقیقی اسلوب بڑا دلکش، توانا اور جان دار ہے۔ تحقیق کے نام پر ہونے والی خفیف الحرکاتیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے بیان میں ذرا کھردرا پن ضرور پیدا ہو جاتا ہے لیکن عام طور پر ان کے اسلوب میں نہایت شایستگی اور شگفتگی ہے اور اس شگفتگی سے معنی کی قطعیت میں کہیں فرق نہیں پڑتا۔ خاں صاحب جب یونی ورسٹیوں میں ہونے والی تحقیق اور اس کے اساتذہ کا ذکر کرتے ہیں یا وہ مختلف سرکاری و نیم سرکاری اداروں کی مدد سے ہونے والے کاموں پر اظہارِ خیال فرماتے ہیں تو ان کے لہجے میں بہ ظاہر شدّت نظر آنے لگتی ہے۔ خاں صاحب کے لب و لہجے کی اس تندی کی جانب مختلف اصحاب نے اشارے کیے ہیں۔ میں بہ طور مثال صرف ڈاکٹر تنویر احمد علوی کا ذکر کروں گا۔ وہ اپنے ایک مقالے ''رشید حسن خاں ایک منفرد محقق''، مشمولہ ''اظہار'' ممبئی جنوری 1984 میں فرماتے ہیں:

> ''ایک محقق کی زبان اور زبانِ قلم کی واشگاف گوئی اور حقیقت نگاری کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں لیکن اس سلسلے میں بات کبھی کبھی خود رشید حسن خاں کے یہاں جائز حدوں سے آگے بڑھتی ہوئی نظر آتی ہے..... گمراہ کن رجحانات اور علمی جرائم کی حوصلہ شکنی جتنی ضروری ہے اتنا ہی تحقیقی طریق رسائی میں لب ولہجہ کی تندی اور طعن و تعریض کی نشتر زنی سے بچنا بھی احتساب کی ایک مستحسن صورت ہے..... جگہ جگہ ان کی زبان تحقیقی اندازِ بیان کے سادہ سنجیدہ دائرہ سے باہر آ گئی ہے۔ اس سے گفتگو کا لطف بڑھ گیا ہے۔ چھبتے ہوئے فقرے یوں بھی زیادہ یاد رہ جاتے ہیں اور گرمیِ محفل کے کام آتے ہیں لیکن ایک محقق کے صحیح علمی مزاج اور اس کے سنجیدہ مقصد کی نمایندگی نہیں کرتے۔'' (ص 75-74)

تنویر احمد علوی آٹھ مختصر اقتباسات درج کرنے کے بعد رقم طراز ہیں کہ ''دلچسپ فقرے اور چبھتے ہوئے جملے تحقیقی طنزیات ومضحکات کا حصہ تو بن سکتے ہیں، کچھ دیر ان کے چٹخارے کا لطف بھی اٹھایا جا سکتا ہے لیکن انھیں تحقیق کی زبان اور اندازِ بیان کا حصہ ماننے میں تامل ہوتا ہے۔''

محقق کو بے شک لہجے کی تندی اور طعن و تعریض کی نشتر زنی سے بچنا چاہیے لیکن کم معیاری جب عام رجحان بن جائے، لوگ مادی فوائد کی خاطر جان بوجھ کر تحقیق کا خون کرنے پر آمادہ ہوں، محنت سے جی چرانا، عجلت پسندی سے کام لینا، تحقیقی بل ہوسی کا شکار ہو جانا، علمی جواب دہی کے احساس سے بے نیاز ہو جانا جیسے رویے فروغ پانے لگیں تو ضرورت سخت تبصروں کی ہی ہوتی ہے۔ جب چور گھر میں گھس آئے یا گھر میں آگ لگ جائے تو شور مچانا ضروری ہوتا ہے۔ رشید حسن خاں اگر تحقیق کی دنیا میں ایسا خلفشار دیکھتے ہیں تو ان کے لہجے کا تند ہونا بے جا نہیں ہے۔ کوئی ایمان دار شخص اگر ''گمراہ رجحانات اور علمی جرائم'' پر قلم اٹھائے گا تو فطری طور پر اس کے فقرے چبھتے ہوئے ہی ہوں گے۔ طنز و تعریض بھی برائیوں اور کمزوریوں کے خلاف لڑنے کا ایک موثر ہتھیار ہے۔ اس کا استعمال اعتدال کے ساتھ کہیں بھی کیا جا سکتا ہے اور اچھے اچھے تنقید نگاروں اور محققوں نے اس سے کام لیا ہے۔ قاضی عبدالودود نے بھی جن کے لہجے کی خشکی کی عام طور پر شکایت کی جاتی ہے اس حربے کا خوب استعمال کیا ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ کسی کی غلطیوں کو لاکھ نرمی کے ساتھ بیان کیجیے اسے اچھا محسوس نہیں ہوگا۔ ہمارے یہاں عام طور پر لوگوں کا ظرف ایسا نہیں ہے کہ غلطیوں پر متنبہ کیے جانے پر وہ ٹوکنے والوں کے تئیں شکر گزاری کا جذبہ رکھیں۔ رشید

حسن خاں جن مسائل پر لکھتے ہوئے چبھتے فقروں کا استعمال کرتے ہیں ذرا معترضین بھی انھیں مسائل پر دل سوزی کے ساتھ تفصیل سے لکھ کر دیکھیں۔ انھیں اقبالؔ کے الفاظ میں پتا چل جائے گا کہ جب روح کے اندر خیالات متلاطم ہوں تو گفتار کے اسلوب پر قابو رکھنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ رشید حسن خاں کے یہاں طنز وتعریض کا جو انداز ہے وہ اس سچّے اور کھرے جذبے کی دین ہے جو تحقیق کو ہر طرح کی آلائشوں سے پاک دیکھنا چاہتا ہے اور یہ جذبہ سچّے خلوص کی کوکھ سے ہی پیدا ہوسکتا ہے۔

مختصر یہ کہ ''ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ'' کا پہلا حصہ صرف کتابی علم پر مبنی نہیں بل کہ اس میں خاں صاحب کے ذاتی مشاہدے اور تجربات کا بہت زیادہ عمل دخل ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں تحقیق کی تعریف، اس کے اجزاے ترکیبی، محقق کے ذاتی اوصاف، تحقیق کے تئیں طبعی مناسبت، خوش عقیدگی کے نقصانات، کسی موضوع سے جذباتی تعلق محتاط محققین کی کسی خاص موقعے پر بے احتیاطی، غیر معتبر اور بالواسطہ حوالے سے بچنا اور اصل آخذ سے استفادے کی کوشش، حافظے کی کرشمہ سازیاں، اہم اور غراہم کی پہچان اور اس جیسے دیگر نکات کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے اور مختلف مثالوں سے اپنی باتیں ثابت کی ہیں۔ انھوں نے جتنی توجہ تحقیق کے مسائل پر مرکوز رکھی ہے، جزئیات اور ذیلیات پر بھی وہی توجہ صرف کی ہے۔ کن وجوہات سے تحقیق کی حرمت پر حرف آتا ہے اور محققین کو اپنے ہوش وگوش کا دائرہ کتنا وسیع رکھنا چاہیے ان باتوں کا بیان بھی انھوں نے بہت ہنرمندی کے ساتھ کیا ہے۔ مصالحت آمیز رویہ ان کے مزاج کو راس نہیں آتا اور نہ اچھے محقق کو آنا چاہیے۔ انھوں نے سچ کو سچ کہنے میں تامل سے کام نہیں لیا، وہ بڑے بڑوں کی غلطیوں کی نشان دہی میں کبھی نہیں جھجکے۔ مذکورہ کتاب میں بھی انھوں نے صداقت کا علم بلند رکھا ہے۔ انھوں نے جو تحقیقی اصول وضع کیے ان پر خود بھی سختی سے کاربند رہے۔ رشید حسن خاں صحیح معنوں میں قاضی عبدالودود کے سچّے جانشین کہلانے کے مستحق ہیں۔ جو لوگ تحقیق کی دنیا میں قدم رکھنا چاہتے ہوں اور وہ سرخ روئی وسرفرازی کے بھی متمنی ہوں تو انھیں ''ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ'' کو وظیفے کی طرح پڑھنا چاہیے۔

(مطبوعہ سہ ماہی ''آمد'' پٹنہ، جولائی۔ستمبر 2012، صفحہ 52 تا 69)

(تحقیقی تبصرے، ظفر کمالی، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، دوسری اشاعت 2017، صفحہ 30 تا 54)

○○○

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی

رشید حسن خاں

رشید حسن خاں موجودہ زمانے کے معروف محقق ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا کہ آج کل تحقیق کا بھرم انھیں کے دم سے قائم ہے علمی وادبی تحقیق کے لیے جس وسعتِ مطالعہ، فنی بصیرت، قوتِ یادداشت، موضوعات کی جزئیات کا احاطہ کرنے کی صلاحیت، معروضی نقطۂ نظر اور عرق ریزی کی ضرورت ہوا کرتی ہے وہ تمام خصوصیات رشید حسن خاں کے اندر بہ درجۂ اتم موجود ہیں۔ وہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی اور قاضی عبدالودود کی روایتوں کو اپنی تحقیقی کاوشوں سے زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ ان کی علمی وتحقیقی تحریروں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ذہن ومزاج کے مالک ہیں اور فنِ تحقیق کے مزاج شناس ہیں۔

رشید حسن خاں نے تحقیق کے مختلف پہلوؤں سے اپنی دل چسپی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ انھوں نے تحقیق کے مروجہ اصول ونظریات کی توضیح کی اور اپنی نکتہ رسی ودقیقہ سنجی سے اس میں قابل قدر اضافے کیے پھر اپنی تخلیقی تصانیف کے ذریعے عملی نمونے پیش کیے۔ ان کی تحقیقی خدمات کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اس کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ مختصراً بعض پہلوؤں کی طرف اجمالی طور سے اشارہ کیا جارہا ہے۔

علمی تحقیق کے لیے حوالہ واستناد کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ان کے بغیر کوئی تحقیقی کاوش پایۂ اعتبار کو نہیں پہنچا سکتی۔ انھیں کی بنیاد پر ادبی وعلمی تخلیقات کے صحت وعدم صحت کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔ اور انھیں کی روشنی میں معتبر اور غیر معتبر کے درمیان تمیز کی جاسکتی ہے۔ رشید حسن خاں نے اپنے پیش رو محققین کے نقش قدم پر چلتے ہوئے حوالہ استناد کے سلسلے میں سخت احتیاط سے کام لیا، ان کے اصول اور معیار قائم کیے اور اپنی تحقیقی تصانیف میں ہمیشہ ان کی پابندی کی اور ان کی بنیاد پر علمی دُنیا میں کتنی ہی مروجہ غلطیوں کی نشان دہی کی اور نام نہاد محققین کی قلعی کھولی۔ اس سلسلے میں ان کا مضمون ''غیر معتبر

حوالے' خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ اس مضمون میں رشید حسن خاں نے حوالوں سے متعلق کچھ اصول وضوابط پیش کیے ہیں اور حوالوں کے معیاری ہونے کی شرائط بیان کی ہیں۔ پھر ان اصولوں کی روشنی میں بہت سی تحقیقی تصانیف کا جائزہ لے کر یہ ثابت کیا ہے کہ غیر معتبر روایتوں اور حوالوں پر اعتبار کرنے کے نتیجے میں تحقیقی کاموں میں کیسی کیسی غلطیاں راہ پا گئی ہیں۔ نامور محققین کی تصانیف بھی ایسی خامیوں سے محفوظ نہیں۔ چناں چہ انھوں نے محمود شیرانی، مالک رام وغیرہ کی تحقیقی کاوشوں میں حوالہ واسناد کی عدم صحت کی وجہ سے کیے گئے غلط فیصلوں پر گرفت کی ہے۔

خاں صاحب نے حوالہ واستناد کے معتبر وغیر معتبر ہونے کے موضوع کے ساتھ ساتھ قدیم کتابوں کے متون کے مستند وغیر مستند ہونے کے مسئلہ کو بھی اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے اور اس سلسلے میں بڑے فکر انگیز نکات پیش کیے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں تحقیق کے اصولوں کی روشنی میں بہت سی قدیم کتابوں کے متن کی غلطیوں کی نشان دہی کرتے ہوئے انھیں غیر معتبر قرار دیا ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ ان قدیم تصانیف اور تذکروں کو جب تک آدابِ تدوین کی پابندی کرتے ہوئے مرتب نہ کیا جائے اس وقت متن کی غلطیوں کا امکان باقی رہتا ہے۔ ایسی صورت میں قواعد زبان، تذکیر وتانیث، استناد شعر وغیرہ میں انھیں بطور حوالہ پیش کرنے کی صورت میں غلطیوں کی گنجایش باقی رہتی ہے۔ دوسرے ماخذ سے ان کی تصدیق ہو جانے پر ہی ان کی صحت پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ رشید حسن خاں نے صحت متن کی طرف خصوصی توجہ دی ہے۔ بہت سے زبان زد اشعار اور تذکیر وتانیث کی تائید میں پیش کیے جانے والے اقوال واشعار کو تحقیق متن کے اصول پر پرکھ کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ اقوال واشعار براہ راست اصل ماخذ سے منقول نہیں۔ اسی طرح بہت سی جعلی کتابیں موجود ہیں اور بعض مصنفین نے سخن آفرینی کے شوق میں بہت سے ایسے واقعات گڑھ کر پیش کیے ہیں جن کی کوئی اصل بنیاد اور کوئی مستند ماخذ نہیں۔ اس سلسلے میں ان کا فکر انگیز مضمون حوالہ اور صحت کے مطالعے سے ان کی تحقیقی صلاحیت وعظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مذکورہ بالا تحقیقی پہلوؤں کے علاوہ رشید حسن خاں نے قواعد زبان، دبستانی اختلافات، تلفظ واملا اور لغات کی طرف خصوصی توجہ دی ہے۔ ان موضوعات ومباحث سے خاں صاحب کی وسعت مطالعہ تبحر علمی اور ژرف نگاہی کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے بہت سے محققین کے علمی وتحقیقی کارناموں کا جائزہ لے کر ان میں پائی جانے والی غلطیوں کی نشان دہی کی ہے۔ انھوں نے ایک ایک لفظ کی تحقیق، تذکیر وتانیث کے تعین اور صحت تلفظ واملا کے سلسلے میں اُردو شعرا کے دواوین اور اُردو فارسی لغات کو کھنگال ڈالا ہے۔ اُردو رسم خط اور املا پر ان کی کتاب کو پایۂ استناد حاصل ہے۔ اسی طرح کلاسیکی متون کے سلسلے میں انھوں نے جہاں اصول ومعیار قائم کیے ہیں وہیں فسانۂ عجائب، باغ وبہار، گلزارِ نسیم اور مثنویات شوق وغیرہ کو مدون کر کے عملی نمونہ بھی پیش کیا ہے۔

رشید حسن خاں نے اپنی تحقیقی نگارشات کو پیش کرنے کے لیے شگفتہ اسلوب اپنایا ہے عام طور سے تحقیقی تصانیف میں جس خشکی کی شکایت کی جاتی ہے، رشید صاحب کی تصانیف اس سے پاک ہیں۔ انھوں نے اپنے خیالات ونظریات بڑے شگفتہ اور دل کش انداز میں پیش کیے ہیں جس سے ان کی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہوئے ذرا بھی اُکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا۔ رشید حسن خاں کے کارنامے تنقید وتحقیق کے میدان میں کام کرنے والوں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوں گے۔

(شعور فن، مرتبین، ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی، شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ، دوسرا اڈیشن 2002، صفحہ 430 تا 432)

○○○

محمد الیاس الاعظمی

رشید حسن خاں اور علامہ شبلی

رشید حسن خاں (1925-2006) ہمارے عہد کے ممتاز ترین محقق ونقاد تھے۔ تحقیق اور خاص طور پر متنی تحقیق کے میدان میں انھوں نے جو کاوشیں کی ہیں وہ اپنی

مثال آپ ہیں اور جو تاریخِ ادبِ اُردو میں سنہرے حرفوں میں لکھی جائیں گی۔ حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود اور امتیاز علی عرشی کو وہ اپنا معنوی استاد تسلیم کرتے تھے اور انہی کے نہج پر وہ تحقیقات کا آغاز کرتے ہیں، مگر سچ یہ ہے کہ متنی تحقیق میں رشید حسن خاں صاحب اس بلند مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں ان کے معنوی اساتذہ نہ پہنچ سکے تھے۔

رشید حسن خاں نے علامہ شبلی کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ ادبی زندگی کے آغاز اور پچیس سال کی عمر میں انھوں نے شبلی کی فارسی شاعری کا بڑی گہرائی اور باریک بینی سے جائزہ لیا تھا جو مئی 1950 کے 'نگار' میں ''شبلی کا فارسی تغزل'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس میں انھوں نے قدرے تفصیل سے شبلی کے جذبات اور احساسات کا تجزیہ کیا ہے اور کئی اور نقادوں کی طرح ان کی شاعری کو حافظ و سعدی سے جا ملایا ہے۔ ان کے شاعرانہ جذبات کے مطالعے میں وہ بھی بمبئی پہنچے ہیں لیکن دادِ سخن دی ہے اوروں کی طرح بات سے بات پیدا نہیں کی ہے، اپنے وسیع و عمیق مطالعے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ:

> ''شبلی اپنے رنگ کے بے مثل فنکار ہیں، انھوں نے اپنے اشعار میں احساسات و جذبات کی بے لاگ تصویریں پیش کی ہیں۔ ایسی تصویریں جو حسین ترین رنگوں سے مزین ہیں اور جن کے امتزاج میں انھوں نے اس مذاقِ سلیم کا ثبوت دیا ہے جو کم دیکھنے میں آتا ہے۔ آپ پورا مجموعہ فارسی غزلیات کا پڑھ جایئے ایک شعر میں بھی اس حدیث شوق کے علاوہ کسی دوسری بات کا بیان نہیں ہوگا۔ یہی بات ان کے مذاقِ سلیم کی سب سے بڑی خوبی ہے''۔

(مقالاتِ رشید حسن خاں، جلد اول، ص 67)

یہ مضمون بیسویں صدی کی پانچویں دہائی کے آغاز میں شائع ہوا پھر خاں صاحب نے بیس سال بعد شبلی کے مضامین کا انتخاب اس وقت کیا جب وہ ایک ممتاز متنی محقق کی حیثیت سے تسلیم کیے جا چکے تھے، انتخاب مضامینِ شبلی 1971 میں مکتبہ جامعہ دہلی نے شائع کیا، یہیں سے 1993 میں اس کا دوسرا اڈیشن طبع ہوا، جو راقم کے پیشِ نظر ہے۔ اب اس کا تیسرا اڈیشن بھی شائع ہو گیا ہے۔

موازنہ کے متعدد محقق اڈیشن شائع ہو چکے ہیں، رشید حسن خاں نے بھی اسے مرتب کیا ہے، جس کا ذکر راقم کی کتاب ''آثارِ شبلی'' میں شامل ہے۔ یہاں اس کے تعارف و تجزیے کی تفصیلات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے محض رشید حسن خاں کے دیباچے کے مشمولات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ خان صاحب علامہ شبلی کی جامعیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''مولانا شبلی کے متعلق یہ بات عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ وہ مختلف موضوعات پر یکساں دسترس رکھتے تھے، مستقل تصنیفات کے علاوہ ان کے مختلف مضامین کے مجموعے بھی اس پر گواہ ہیں۔ سیرت، سوانح، تنقید اور معقولات پر ان کی تصنیفات معروف ہیں، لیکن مضامین کے مجموعوں میں ان کے موضوعات کا دائرہ وسیع تر نظر آتا ہے، مذہبیات اور اُردو ہندی کی بحث، عربی کے نصاب کے مسائل، اسلامی تہذیب کے اہم عنوانات، قرآن پاک کے متعلق فکر انگیز مقالے، قدیم کتابوں پر مختصر اور مفصل تبصرے، ادبی مباحث، مستشرقین کی غلط کاریوں کی تردید، سیاسی افکار، غرض بیسیوں اہم موضوعات پر بحث کی گئی ہے، اور ہر جگہ ان کے مخصوص اندازِ تحریر کی روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ ان مضامین کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا مطالعہ کس قدر وسیع تھا، ذہن کس درجہ پر نکتہ رس تھا، نظر کیسی باریک تھی اور قلم میں کس قیامت کی توانائی تھی''۔ (تعارف، موازنۂ انیس و دبیر ص 5)

علامہ شبلی کی شخصیت کا ایک اہم پہلو قدیم صالح اور جدید نافع کا امتزاج ہے۔ وہ اپنے عہد میں اس کے سب سے بڑے علمبردار تھے، اور ابتدا سے تھے، علی گڑھ پہنچنے کے بعد ہی ان کی تحریروں میں اس کی بازگشت سنائی دیتی ہے، علی گڑھ سے انھوں نے بہت کچھ سیکھا لیکن علی گڑھ تحریک نے بھی ان سے بہت کچھ حاصل کیا جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، تاہم ان کا یہی ارتقائی نظریہ ان کی علی گڑھ تحریک سے سولہ سالہ وابستگی کے باوجود انحراف کا باعث ہوا اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے تحریکِ ندوہ میں شمولیت اختیار کی اور یہی وجہ ہے کہ اخیر تک ان کا رشتہ علی گڑھ سے بھی استوار رہا اور اسی وجہ سے قدامت پرستوں نے ان پر کفر کے فتوے لگائے۔ رشید حسن خاں اس امتزاج کو شبلی کا بڑا کارنامہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''شبلی کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے قدیم و جدید کے قصے کو اپنے ذہن پر حاوی ہونے نہیں دیا۔ وہ قدیم کی عظمت کے قائل تھے لیکن اس کی کمزوریوں سے بھی باخبر تھے اور معترف بھی۔ وہ جدید کی اہمیت کو پوری طرح مانتے تھے لیکن اس سے مرعوب نہیں تھے۔ آج شاید اس بات کی اہمیت کا اندازہ نہیں کیا جا سکے گا، لیکن شبلی کے زمانے میں اس توازن کی بڑی ضرورت تھی''۔ (ایضاً ص 6-5)

اس کے بعد خاں صاحب نے عہدِ شبلی پر روشنی ڈالی ہے، قدامت پرستوں کی کمزوریوں اور جدید ذہن اور مغربیت کے سیلاب کا ذکر کیا ہے اور تفصیل سے بتایا ہے کہ ہمارے علما کا کیا معیار تھا؟ معاشرے کا کیا حال تھا؟ مشنریاں کیا کر رہی تھیں؟ ایسے غیر معتدل ماحول میں شبلی نے توازن پیدا کرنے کی کوشش کی، وہ لکھتے ہیں:

> ''ایسے زمانے میں جب کہ یا تو مسائل سے بے تعلقی تھی یا تعلق تھا تو توازن کا پہلو دب گیا تھا، شبلی نے مذہبی مسائل اور سیاسی امور دونوں میں وہ انداز اختیار کیا جس میں توازن کا پہلو نمایاں تھا۔ وہ سرسید سے بہت متاثر تھے، ان سے بہت کچھ سیکھا بھی تھا، اس کے معترف بھی تھے، لیکن بہت سے سیاسی اور مذہبی مسائل میں ان سے سخت اختلاف رکھتے تھے، وہ مستشرقین کے اعتراضات کا جواب دیتے جاتے ہیں، لیکن یورپ کی علمی فیض بخشیوں اور اس کے

اس حد تک اصلاح کرنے کے درپے تھے جس کو پرانے خیال کے علما برداشت نہیں کر سکے''۔

(ایضاً ص 7)

اس کی اور بھی تفصیل انھوں نے لکھی ہے، شبلی کی وسعتِ ذہنی اور وسعتِ قلبی کا بھی ذکر کیا ہے اور قدیم وجدید کے سلسلے میں ان کے نقطے کی بھی وضاحت ہے، اس تجزیے کے بعد وہ لکھتے ہیں:

''اصلاح کا یہ جذبہ اور صاف گوئی کا یہ انداز شبلی کا قابلِ قدر عطیہ ہے جو انھوں نے اس زمانے میں نئی نسل کو بخشا، ان کے مضامین میں یہ سارے مباحث ومسائل محفوظ ہیں اور اسی لیے ان کے مضامین کی بڑی اہمیت ہے''۔ (ص 8)

اور اسی اہمیت کے پیشِ نظر انھوں نے ''انتخاب مضامینِ شبلی'' کو مرتب کیا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے شبلی کی انشا پردازی کا ذکر کیا ہے اور اسے ایک مسلمہ اور متفق علیہ مسئلہ بتایا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ وہ صاحبِ طرز انشا پرداز تھے، پھر انھوں نے معاصرینِ شبلی کے اسالیبِ بیان کی توضیح کے ساتھ اس میں شبلی کی انفرادیت کا ذکر کیا ہے، پھر یہ نکتہ اٹھایا ہے کہ اسلوب شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے، اس نقطۂ نظر سے شبلی کے اسلوب اور ان کی شخصیت کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''ان کی شخصیت کثیر الجہات تھی، سیاست، ادب، مذہب، تاریخ، فلسفہ وغیرہ بہت سے اطراف وموضوعات ان کی جولان گاہ تھے۔ وہ مولوی تھے، استاذ تھے، سیاسی مسائل سے بھی تعلق رکھتے تھے اور شاعر بھی تھے۔ ان کی سوانح کا سرسری مطالعہ بھی اس بات کی تعیین کے لیے کافی ہوگا کہ پُر جوش جذباتیت ان کے مزاج کا غالب عنصر تھا اور اس کے اثرات بھی نمایاں ہوتے رہتے تھے۔ ادب میں ہی نہیں عام زندگی میں بھی، مثلاً وہ سردیوں میں بھی بہت تیز برف کا پانی پینا پسند کرتے تھے اور شیرینی اس قدر زیادہ مرغوب تھی کہ میٹھی سے میٹھی چیز بھی کچھ کم میٹھی معلوم ہوتی تھی۔ (ایضاً ص 9)

اس تجزیے سے انھوں نے شبلی کی انتہا پسندی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور حیاتِ جاوید کا پرانا قصہ بیان کیا ہے، حالاں کہ اس وقت آلِ احمد سرور تجزیہ کرکے لکھ چکے تھے کہ شبلی کو مصور پسند تھا اس کی بنائی ہوئی ایک تصویر پسند نہ تھی۔ لیکن رشید حسن خاں کی اس بات میں وزن ہے کہ حیاتِ جاوید کی ہیرو پرستی سے نالاں شبلی خود بھی تو شخصیت بلکہ عظمت وسطوت کے خوگر ہیں، لیکن پھر وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

''شبلی کی شخصیت اس لحاظ سے بہت دل چسپ ہے کہ وہ قدیم وجدید دونوں کی انتہا پسندیوں سے بیزار ہیں، تنگ نظری کے دشمن ہیں اور منطقیت کو تحریر وتقریر دونوں کے لیے ضروری سمجھتے ہیں''۔ (ایضاً ص 10)

شبلی کی رومانیت کو سمجھنے کی صحیح کوشش اب تک نہیں کی گئی تھی اور جن لوگوں نے اس پر قلم اٹھایا انھوں نے اسے بمبئی کے دلفریب مناظر میں اسے تلاش کیا ہے یہی وجہ ہے کہ شبلی کے رومان کو صحیح طور پر سمجھا نہیں جا سکا، رشید حسن خاں نے اس کی تشریح اس طرح کی ہے:

''رومانیت شبلی کے مزاج کا بنیادی عنصر تھی، اس سے شگفتگی کے پھول کھلتے ہیں اور مشتعل طبیعت کی آنچ بھی حرارت کو بکھیرتی ہے، اس عالم میں ان کا قلم تحریر کے ایسے پھول کھلاتا ہے جن میں شراروں کی نہیں شعلوں کی گرمی اور چمک ہوتی ہے، یہ کیفیت ان پر اس وقت خاص طور پر طاری ہوتی ہے جب وہ کسی ایسے معترض کے اعتراضات کا جواب دے رہے ہوں جس نے اسلامیات سے متعلق کسی مسئلے پر یا تاریخِ اسلام کے کسی دور یا فرد پر نکتہ چینی کی ہو، وہ حوالوں سے اپنی بات کو مستند کرتے جاتے ہیں اور ادبیت میں ڈوبے ہوئے اور ترشے ہوئے جملوں سے جلالی کیفیت کا اظہار کرتے جاتے ہیں، جوشِ بیان اور حسنِ انشا پردازی کے لحاظ سے ایسے مقامات لائقِ ذکر بھی ہیں اور قابلِ رشک بھی''۔

(ایضاً ص 11)

پھر خاں صاحب نے اس کی مثالیں درج کی ہیں اور ایسی عمدہ مثالیں دی ہیں کہ ذوق ووجدان کو متاثر کر دیتی ہیں۔ بعد ازاں انھوں نے شبلی کی عظمت اور ان کی بالغ نظری کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

''شبلی کے یہاں اپنے طبقے کی روایت کے برخلاف وسعتِ فکر ونظر کی جو طاقت پائی جاتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عربی کی جدید ترین مطبوعات سے برابر استفادہ کرتے رہتے تھے، وہ کوشش کرتے تھے کہ یورپ کی اہم کتابوں سے بھی کسی واسطے سے استفادہ کیا جائے، ان کو سیاسی مسائل سے بھی لگاؤ تھا، ملک میں سیاسی تحریکیں چل رہی تھیں وہ ان میں بھی کچھ نہ کچھ حصہ لیتے رہتے تھے، انھوں نے اسلامی تاریخ کا بڑی توجہ سے مطالعہ کیا تھا اور فلسفے سے ان کو ربطِ خاص تھا جس نے ان کے اندر تنگ نظری کو شروع ہی سے پیدا ہونے نہیں دیا''۔ (ایضاً ص 13-12)

رشید حسن خاں شبلی کی عظمت وجامعیت اور بالغ نظری کے تو مداح ہیں ہی ان کے حسنِ انشا کے بھی بڑے مداح ہیں، ان کی خوش مذاقی اور شاعرانہ کمالات کا اعتراف بھی بڑے ادبی انداز میں کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

غزلوں کو دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ آخر دورِ اکبری کا طوطی خوش نوا بول رہا ہے۔ یا نظیری وعرفی کے قبیلے یا جماعت کا کوئی فرد، اسی کا اثر تھا کہ ان کی تحریروں میں بلا کا حسن ہے۔ انشا پردازی جس چیز کا نام ہے وہ واقعتاً شبلی کا حصہ ہے۔ ایسے شگفتہ اور ترشے ہوئے جملے لکھتے ہیں جن میں شاعری کا سارا حسن سمٹ آتا ہے۔

یہی وہ اندازِ فکر اور اندازِ نگارش ہے جس نے شبلی کو ان کے طبقے سے نکال کر اس جماعت کی صفِ اول میں بیٹھا دیا ہے جہاں کے بیٹھنے والے خوش مذاق، احساسِ جمالیات اور حسن سے وہ جہاں بھی ہوں اور جس عالم میں بھی ہوں ربط خاص رکھتے ہیں''۔(ایضاً،ص 14-13)

پھر خاں صاحب شبلی کی جذباتیت اور رومانیت کو ان کی کمزوری بھی بتاتے ہیں اور یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ کبھی کبھی خوش بیانی میں وہ منطق کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں، وہ یہ بھی کہتے ہیں شعر العجم اسی کمزوری کا شکار ہوئی، وہ یہ بھی مثال میں پیش کرتے ہیں کہ ایک جگہ کہتے ہیں کہ بنوامیہ نے آزادی کا گلا گھونٹ دیا مگر جرجی زیدان کی تنقیدوں کا جب جواب دیتے ہیں تو بنوامیہ کی حمایت کرتے ہیں۔(ص 14)

ان کا یہ بھی خیال ہے کہ وہ دعوا بہت کرتے ہیں، اس کی مثالیں بھی رشید حسن خاں نے دی ہیں، اسی بنا پر وہ شبلی کو محقق سے زیادہ انشا پرداز قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تحقیق خارا شگافی اور کافر طبیعتی کی طلب گار ہے اور زود یقینی اور رنگینی کی دشمن جو شبلی کی طبیعت سے میل نہیں کھاتی، (ص 15) اس لیے ان کی تحریروں کو پڑھتے ہوئے مذکورہ باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔

1980 میں پٹنہ کے ایک سمینار منعقدہ بہار اُردو اکیڈمی میں انھوں نے حافظ محمود خاں شیرانی پر مقالہ پیش کیا، عنوان تھا ''شیرانی کی تاریخی اہمیت'' اس میں انھوں نے شیرانی کو تحقیق کا معلّمِ اول قرار دیا ہے۔(مقالاتِ رشید حسن خاں، ص 532) پھر ان سے پہلے کے عہدِ سرسید کا تجزیہ پیش کیا ہے، ان کا خیال ہے کہ سرسید تحریک کا اثر تیس برس رہا، اس دور میں سرسید اور ڈپٹی نذیر احمد کی غیر جذباتی نثر کے مقابلے شبلی وآزاد کی نثر کو زیادہ مقبولیت ملی، اندازِ فکر میں بھی اور پیرایۂ بیان میں بھی، وہ لکھتے ہیں:

''شعریت اور جذباتیت کے مارے ذہنوں کو سادگی اور متانت غیر مانوس معلوم ہوتی تھی۔ حالی کی سادہ وصاف نثر ابالی کھچڑی کی طرح بے مزہ لگتی تھی۔ شہرہ تھا شبلی وآزاد کی نثر کا، جس میں ذہنوں کو متاثر کرنے کی ایسی صلاحیت تھی اور ہے کہ آدمی کچھ دیر کے لیے ساری منطق بھول جاتا ہے... شبلی کا مشتعل اور خطیبانہ لہجہ اور پُر زور جذباتی اندازِ استدلال ذہنوں کو زیادہ متاثر کرتا ہے۔''(ایضاً،ص 533)

رشید حسن خاں کا خیال ہے کہ حالی، شبلی وآزاد کا دور جذباتیت کا دور تھا، یہی وجہ ہے کہ اس دور میں انشا پردازوں کو محققین کے مقابلے میں زیادہ مقبولیت ملی، شیرانی کی تنقید شعر العجم کے خلاف جو آوازیں بلند ہوئیں اس کو وہ اس دور کی فضا کا ردِ عمل قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے اس مضمون میں یہ بات پھر دہرائی ہے کہ شبلی حالی اور آزاد میں کسی میں وہ مزاج نہیں پایا جاتا جس کو تحقیق کہتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''حالی کی سلامت روی، وضع داری اور عفو و درگذر کی پاکیزہ خصلت تحقیق کی کافر طبیعتی اور بے رحمی کی حریف نہیں ہوسکتی۔ شبلی کی بے کراں اور بے اماں جذباتی طبیعت، ہیرو پرستی اور ان کا خطیبانہ اور مجاہدانہ انداز بیان، منطقی استدلال تحقیق پسندی سے میل نہیں کھاتا۔ شبلی عالم تھے، بہت ذہین، بڑے سخن فہم اور بہت بڑے انشا پرداز تھے۔ ان کی بے مثال خوبیوں کا انکار مقصود نہیں لیکن وہ بھی حالی کی طرح محقق نہیں تھے۔ ان کے مزاج کو تحقیق کے غیر جذباتی عمل سے مناسبت نہیں تھی۔ جذباتیت منطق کی دشمن ہے اور انشا پردازی حقیقتِ بیانی کی حریف ہے۔''(ایضاً،ص 535)

یہ تجزیہ اور یہ پس منظر دراصل حافظ محمود شیرانی کی تحقیقات کی اہمیت واضح کرنے کے لیے پیش کیا گیا ہے، اس تجزیے میں کئی باتوں میں خاں صاحب سے اختلاف کیا جاسکتا ہے، خاں صاحب جب حافظ محمود شیرانی کے مزاج کی تحقیق اور ان کے اسلوب کا ذکر کرتے ہیں یا پھر ان کی تحقیقات کی داد دیتے ہیں تو انھیں یاد آجاتا ہے کہ شیرانی صاحب نے بھی اپنی تحقیقات میں کہیں کہیں انشا پردازی کی ہے، وہ دیانت دار تجزیہ نگار کی طرح اس کمی کا اعتراف کر لیتے ہیں، بلا شبہ یہ ان کی دیانت دارانہ عظمت ہے مگر انصاف نہیں، ان کا یہ بھی خیال ہے کہ شیرانی اپنی تحقیق کے اصولوں کا ذکر نہیں کرتے، اس کے باوجود ان کی تحقیقات پر حروف نہیں آتا۔ یہاں یہ بات کہنے کو جی چاہتا ہے کہ شبلی کی محققانہ حیثیت سے غالباً خاں صاحب پوری طرح واقف نہیں تھے مثلاً انھوں نے المامون میں، الفاروق میں، الغزالی میں، سوانح مولانا روم میں جس محققانہ انداز کو اختیار کیا ہے اور جو تحقیقات پیش کی ہیں خاص طور پر تحقیق منسوبات میں وہ اپنے عہد کے ممتاز محقق ہیں۔ پھر خاں صاحب ذہن و مزاج کی بات اٹھاتے ہیں۔ شبلی نے روایت و درایت، اصول استنباطِ نتائج اور حوالہ وغیرہ کا جس طرح اہتمام کیا ہے اور ان تحقیقی اصولوں کی پاسداری کی ہے کم از کم ان کے عہد میں تو اس کی مثال نہیں ملتی، دراصل خاں صاحب کے پیشِ نظر محض شعر العجم کے وہ مباحث تھے جو شیرانی صاحب نے 'تنقید شعر العجم' میں پیش کیے تھے۔ بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو شبلی کے یہاں تحقیق کے ابتدائی اور بنیادی عناصر موجود ہیں، ہمارے نقادوں کی نظر 'شعر العجم' اور 'موازنہ' پر جا کر رُک جاتی ہے اور المامون، الفاروق اور سوانح مولانا روم کی تحقیقات بلکہ کتب خانہ اسکندریہ اور اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر، کو مذہبی اور تاریخی تحقیقات کہہ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ان کا یہی صرفِ نظر انھیں حقیقت سے آشکارا ہونے میں سدِ راہ رہا۔

''تنقید شعر العجم کے عنوان سے اکتوبر 1922 سے جنوری 1927 تک جو سلسلۂ مضامین شائع ہوا، دراصل اس نے ذہنوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور علمی دنیا میں شدید ردِّعمل کا آغاز ہوا۔ ردِّعمل کی شدت اس پر گواہ تھی کہ عقیدت مندی اور شخصیت پرستی کے جذبے کو ٹھیس لگی ہے۔ روایت درست ذہن نے جس کی اس زمانے میں حکومت تھی یہ محسوس کیا کہ یہ منفی اندازِ نظر ہے اور حدِ ادب کی خلاف ورزی ہے۔ جذباتی روایت پرستی نے یہ بات ذہن نشیں نہیں ہونے دی کہ یہ صداقت کی تلاش اور کھرے کھوٹے کی پرکھ ہے۔'' (ایضاً، ص538)

بلاشبہ صداقت کی تلاش اور کھرے کھوٹے کی پرکھ پر قدغن نہیں لگائی جاسکتی مگر کسی تنقید سے کوئی شخصیت زد میں آئے تو گویا اس پر نقد نہیں کہا جاسکتا، اگر چہ جو نقد کیا گیا ہے وہ صحیح ہی کیوں نہ ہو، شخصیت پرستی کے ضمن میں آجائے گا جس کی خاں صاحب کے یہاں اجازت نہیں گویا کسی شخص پر اگر کسی نے قلم اٹھایا تو بہر حال خاموش رہنا ہوگا۔ تحقیق و تنقید کے میدان میں یہ اصول ہی کسی طور جائز نہیں قرار دیا جاسکتا۔ 'تنقید شعر العجم' کے خلاف بلاشبہ شدید ردِّعمل ہوا، وجہ صاف ظاہر ہے کہ شیرانی صاحب نے ایک دو برس نہیں پورے پانچ برس شعر العجم اور شبلی کو تختۂ مشق بنائے رکھا، پھر اسے تنقید کا نام کیوں دیا گیا۔ اسے تصحیحاتِ شعر العجم کا نام بھی دیا جاسکتا تھا، یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ 'تنقید شعر العجم' سے پہلے کئی تنقیدیں شائع ہو چکی تھیں۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے بھی اس پر تنقید لکھی تھی البتہ ان کا لہجہ انتہائی متانت آمیز ہے اور استاذ کے ساتھ یہی اسلوب ہونا بھی چاہیے۔ حافظ اسلم جیراج پوری نے حافظ محمود شیرانی سے دس سال پہلے 'شعر العجم' پر سخت تنقیدی مضمون لکھا بلکہ شبلی کی زندگی میں لکھا، وہ عربی کے ساتھ فارسی شعر و ادب اور تحقیق و تنقید کے مردِ میداں تھے، ان کی تحقیقات سے اہلِ علم واقف ہیں، انھیں تحقیق کا معلّمِ اوّل کا درجہ کیوں نہ دیا جائے اور ان کی 'تنقید شعر العجم' کو اتنی اہمیت کیوں نہیں دی گئی۔ ایسا سوچا بھی نہیں جاسکتا کہ رشید حسن خاں جیسے دیدہ ور محقق اسلم جیراج پوری اور ان کی تنقیدات سے ناواقف رہے ہوں گے۔ دراصل ردِّعمل کی اصل وجہ شیرانی صاحب کی پشت پناہی کر رہے بابائے اُردو مولوی عبدالحق کی وجہ سے تھی جنھوں نے شبلی کے ہر کام میں کیڑا نکالا جو اگر چہ ان کے شانِ متانت اور مرتبے کے خلاف تھا تاہم اسے انھوں نے اپنا وتیرہ بنالیا تھا۔

آخر میں انھوں نے شیرانی صاحب کی کتاب ''پنجاب میں اُردو'' پر تبصرہ کیا ہے اور ان میں تقریباً انہی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے جو ان سے پہلے کے محققین سے سرزد ہوئی تھی۔ اس میں خاص طور پر انھوں نے طے شدہ نظریہ کی بات کہی ہے اور درحقیقت تحقیق کوئی طے شدہ بات نہیں ہوتی، رشید حسن خاں نے تو یہ بات نہیں لکھی مگر حقیقت یہی ہے کہ 'تنقید شعر العجم' میں اسی کمزوری کی وجہ سے شدید ردِّعمل ہوا تھا۔ آخر میں خاں صاحب نے بڑی سچی بات کہی ہے کہ:

''قابلِ اعتراض ناقابلِ قبول بات جو بھی کہے وہ مولانا شبلی ہوں یا حافظ محمود شیرانی اس کو واضح طور پر رد کرنا اور افادیت کو برقرار نہیں رکھ پائے گا۔'' (ایضاً ص541)

1982 میں رشید حسن خان نے 'موازنۂ انیس و دبیر' کو مرتب کیا جسے مکتبہ جامعہ دہلی نے شائع کیا۔ یہ شبلی کے حوالے سے ان کا دوسرا ادبی کام تھا، رشید حسن خاں صاحب ہمارے عہد کے سب سے بڑے محقق و مدون تھے۔ انھوں نے خاص طور پر متنی تحقیق میں جو کاوشیں کی ہیں امید نہیں کہ برسوں کوئی ان کا ہم سر پیدا ہوگا۔ لیکن موازنہ انیس و دبیر میں انھوں نے اپنا حق ادا نہیں کیا، وہ موازنہ کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''موازنۂ انیس و دبیر پہلی بار 1907 میں مطبع مفیدِ عام آگرہ سے شائع ہوا تھا، نسخہ جامعہ کی بنیاد اسی اڈیشن پر رکھی گئی ہے، اصل نسخے میں اشعار کا متن متعدد جگہ مشکوک معلوم ہوتا ہے لیکن اس میں کوئی تصرف نہیں کیا گیا ہے۔

اشاعتِ اول کے سرورق پر کتاب اور مؤلف کا نام اور کتاب سے متعلق جو عبارت چھپی ہوئی ہے اس نسخے کے اندرونی سرورق پر اس کو بہ لفظہٖ نقل کر دیا گیا ہے''۔ (تعارف موازنۂ انیس و دبیر ص8)

متنی تحقیق سے اس قدر بے اعتنائی تو شاید ہی انھوں نے اپنی کسی اور مدونہ کتاب میں کی ہوگی، بہر حال ان کی بدولت مکتبہ جامعہ کا اڈیشن شائع ہوا اور اب تک اس کے تین اڈیشن طبع ہو چکے ہیں، تاہم انھوں نے موازنہ پر اظہارِ خیال ضرور کیا ہے۔ چند صفحے کے تعارف میں موازنہ اور اس کے مصنف کا ذکر بڑے مؤثر طریقے سے کیا گیا ہے۔ شبلی کی عظمت و جامعیت اور ادب و انشا کے بارے میں جن خیالات کا انتخاب ''مضامینِ شبلی'' کے تعارف میں کیا گیا تھا اس میں بھی اس کی بازگشت صاف سنائی دیتی ہے۔ البتہ اس ضمن میں شبلی کی بعض انفرادیت جس کا ذکر انتخاب میں نہ آسکا تھا اس میں بیان کر دیا ہے، مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''شبلی کے مزاج میں احساس تناسب بلا کا تھا اور ان کا اسلوبِ تحریر اس کا آئینہ ہے۔ علمیت، وقار، بلند آہنگی اور جوشِ بیان کے اجزا، زبان کی صفائی، سلامت اور شستگی میں اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ خالص علمی اندازِ بیان کے باوجود ان کی زبان علمیت کے بوجھ سے دہری نہیں ہوتی۔ ان کی تنقید میں بھی اسی شائستگی کی جلوہ گری نظر آتی ہے''۔ (تعارف ص5)

شبلی نے 'موازنہ' میں اپنے موقف کی تائید میں کثرت سے اشعار نقل کیے ہیں، یہ انتخاب بھی دراصل ذوقی معاملہ ہے، شبلی کے بلند ادبی ذوق کا کون معترف نہ ہوگا۔ لکھتے ہیں:

ان کی نگاہِ انتخاب ایسے اشعار اور ایسے اجزا کو منتخب کر لیتی ہے جو کسی شاعر کا حقیقی سرمایۂ کمال ہوتے ہیں اور ان کی خصوصیات کو اس خوش سلیقگی کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والا اس شاعر کے ساتھ ساتھ خود شاعری سے اپنے آپ کو قریب تر محسوس کرتا ہے''۔ (ایضاً، ص 6)

خاں صاحب نے شبلی کے نہ صرف ذوقِ انتخاب کی داد دی ہے بلکہ ہماری ادبی زندگی پر اس کے جو اثرات مرتب ہوئے، ان کی بھی نشاندہی کی ہے، یہی نہیں ان کے نزدیک میر انیس کی مقبولیت کا راز بھی اسی کتاب سے وابستہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہ واقعہ ہے کہ شبلی کے حسنِ انتخاب اور ان کے بے مثال اندازِ تشریح نے بے شمار لوگوں کے ذوقِ سخن اور ذوقِ انتخاب کی تربیت کی ہے، شعر العجم اور موازنہ انیس و دبیر کو جن لوگوں نے دل لگا کر اور نظر جما کر پڑھا ہے وہ اس کی گواہی دیں گے۔ موازنہ میں انیس کے محاسنِ شاعری کے ذیل میں انھوں نے جو طویل اور مختصر مثالیں درج کی ہیں بعد کے اکثر لکھنے والے ان پر بہت کم اضافہ کر سکے ہیں۔ اور بہتوں نے تو انہی کی تکرار کی ہے۔ اب تک انصاف کے ساتھ اس کا اعتراف نہیں کیا گیا کہ خالص شاعرانہ حیثیت سے انیس کے کلام و کمال کی جو شہرت ہے اس میں شبلی کی تصنیف 'موازنۂ انیس و دبیر' کا کتنا حصہ ہے۔ میر انیس کے کمالِ شاعری کے قائل سب ہیں، لیکن بہت کم لوگوں نے مراثیِ انیس کی جلدیں پڑھی ہوں گی، اگر یہ کہا جائے کہ اس قبولِ عام میں شبلی کی اس تصنیف کا بہت بڑا حصہ ہے تو اس میں مبالغہ نہیں ہوگا''۔ (ایضا ص 6)

اس اعترافِ کمال کے بعد رشید حسن خاں نے شبلی کی زندگی کا مرقع پیش کیا ہے، انتہائی اختصار کے ساتھ نام، بچپن کا نام اور تاریخ پیدائش مئی 1857۔ وفات 1914، تحصیلِ علم، علی گڑھ کی ملازمت، سرسید سے استفادہ، جدید تحقیقات سے آگاہی، وغیرہ حالات و واقعات اور بعض افکار مثلاً وہ جدید کی اہمیت کے قائل تھے مگر سرسید کی مذہبی اور سیاسی فکر سے اختلاف رکھتے تھے۔ اور آخری بات بڑے پتے کی لکھی ہے کہ ان کی قدیم و جدید کی آویزش سے قدیم و جدید دونوں طبقے خوش نہیں رہے اور ان کی زندگی کا ایک بڑا حصہ اسی آویزش کی کہانی ہے۔

شبلی کی زندگی کے اس حصے کو بیان کرنے میں رشید حسن خاں نے بڑے اختصار سے کام لیا ہے، سبب جو بھی رہا ہو مگر یہاں وہ اپنے بلند معیارِ تحقیق سے فروتر ہو کر گزر گئے ہیں، یہاں تک کہ شبلی کی تاریخِ پیدائش جو 'حیاتِ شبلی' میں لکھی ہے اسی کو نقل کر دیا ہے حالاں کہ اس پر اس سے پہلے بحث و تحقیق ہو کر یہ طے ہو چکا تھا کہ شبلی کی تاریخ پیدائش مئی 1857 نہیں بلکہ 3 جون 1857 ہے اور اب یہ تحقیق بھی پروفیسر اشتیاق احمد ظلی کی تحقیق سے کالعدم ہو کر 4 جون 1857 ثابت ہو چکی ہے، خاں صاحب ذرا توجہ دیتے تو شاید کوئی تحقیق سامنے آتی۔

'انتخاب مضامینِ شبلی' میں وہ شبلی کی انشا پردازی کی داد دے چکے ہیں مگر اس میں ایک قدم اور آگے بڑھ کر ان کے ہم عصروں سے موازنہ بھی کرتے ہیں اور ان پر شبلی کی برتری ثابت کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''انشا پرداز کی حیثیت سے شبلی کا مرتبہ اپنے معاصرین میں نہایت ممتاز ہے، ان کے یہاں نہ تو وہ سادگی ہے جس پر ''ابالی کھچڑی'' کی پھبتی کسی جا سکی اور نہ وہ رنگینی ہے جو تاریخ کو افسانہ بنا دیا کرتی ہے۔ ان کی عبارت میں ان کی شخصیت کی طرح پر شکوہ، بلند آہنگی اور پُر وقار دل کشی ہے۔ یہ زبان علمی زبان ہے لیکن شگفتگی آمیز ہے''۔ (ایضاً، ص 7)

رشید حسن خاں 'موازنہ' کے بڑے مداح ہیں، خاص طور پر اس کے تنقیدی مباحث کے، اسے وہ ایک منفرد کتاب بتاتے ہیں اور اس کی کئی تنقیدی بحثوں کو تنقید کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ شبلی انتہائی صفائی کے ساتھ یہ اقرار کرتے ہیں کہ میر انیس کے مقابلے میں مرزا دبیر کا نام لینا گویا بد مذاقی ہے، پھر وہ لکھتے ہیں:

''اس کتاب کا بڑا حصہ موازنے کے بجائے میر انیس کے کمالِ شاعری کا مرقع ہے جس زمانے میں یہ کتاب شائع ہوئی تھی اس زمانے میں اس کی مخالفت کا خاصا زور و شور رہا تھا اور الزام یہی تھا کہ شبلی نے انصاف سے کام نہیں لیا ہے، اس کی رد میں کئی کتابیں لکھی گئیں، آج وہ کتابیں خاص خاص کتاب خانوں کے سوا اور کہیں نہیں دکھائی دیتیں۔ زمانہ سب سے بڑا منصف ہے''۔ (ایضا ص 8-7)

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف شبلی کے ہم نوا ہیں بلکہ ان کے پرستار بھی ہیں، مخالفت میں لکھی جانے والی کتابوں کا ذکر بھی وہ بڑے سرسری انداز میں کرتے ہیں، یہاں تک کہ وہ اس سلسلے میں شبلی پر عائد اعتراضات سے بھی بحث کرتے ہیں اور پھر مدلل مداحی کرتے ہیں، لکھتے ہیں:

''یہ صحیح ہے کہ اس کتاب میں دبیر کا تذکرہ انیس کے مقابلے میں کم، بہت کم ہے، لیکن ایسا نہیں ہے کہ دبیر کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہو، یا دونوں کی شاعری کا موازنہ نہ کیا گیا ہو یا دبیر کے کمال کا مطلق اعتراف نہ کیا گیا ہو۔ شبلی نے کئی جگہ دبیر کی علمیت، قوتِ تخیل اور مضمون آفرینی کا ذکر کیا ہے۔ تشبیہات واستعارات کی جدت کا بھی تذکرہ کیا ہے، مثالیں بھی دی ہیں''۔ (ایضا ص 8)

''ظاہر یہ ذرا سخت رویہ معلوم ہوتا ہے لیکن اگر دبیر کے مراثی کا تفصیل کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تب شبلی کی اس رائے کی صداقت کا صحیح اندازہ ہوگا۔ عام

کلامِ دبیر کا مطالعہ ذرا کم ہی کیا ہوتا ہے، دبیر کے مرثیے پڑھنے کے بعد شبلی کی سخن فہمی و سخن سنجی پر ایمان لانا پڑے گا''۔(ایضاً، ص 8)

عظمتِ شبلی کے یہ اعترافات اگر ایک عام نقاد کے قلم سے ہوتے تو شاید اس قدر دل چسپی نہ پیدا کرتے چوں کہ یہ اپنے عہد کے سب سے بڑے محقق اور صاحبِ نظر نقاد کے قلم سے ہیں، اس لیے قابلِ ذکر ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ واقعی 'موازنۂ انیس و دبیر' ہمارے کلاسیکل ادب کا بہترین سرمایہ ہے۔

(ہفت روزہ ہماری زبان، انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، 22 تا 28 دسمبر، 2018 شمارہ 48، جلد 77 صفحہ 1، 2 اور 7)

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

شائستہ منزل، 641، غلامی کا پورہ

عقب آواس وکاس، اعظم گڑھ-276001

E-mail: azmi408@gmail.com

ooo

سیّد منظور احمد

اُردو کے مایۂ ناز محقق و ادیب رشید حسن خاں

ہماری دانش گاہوں میں بہت سی ایسی مثالیں موجود ہیں جہاں بہت سے قابل، لائق اور محترم اساتذہ محض سند نہ ہونے کی وجہ سے جہاں تھے وہیں رہ گئے، ان سے کمتر اور جونیر اساتذہ آگے بڑھ گئے۔ مالی نقطۂ نظر سے بھی خوب خوب فائدہ اٹھایا اور عہدے کے لحاظ سے بھی کافی ترقیاں حاصل کرلیں۔ یہ بات اُردو کے اساتذہ پر ہی صادق نہیں آتی بلکہ دوسری زبانوں میں بھی ایسا ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ اس نوعیت کی ایک بہترین مثال محترم رشید حسن خاں صاحب کی ہے۔

چوں کہ آپ کا تعلق دلّی یونی ورسٹی سے رہا، تو میں ایک طویل عرصے تک سمجھتا رہا کہ آپ ڈاکٹر بھی ہوں گے اور پروفیسر بھی، لیکن جب یہ غلط فہمی دور ہوئی تو حیرت سے زیادہ مسرت ہوئی۔ اب خاں صاحب کی عظمت، ادب واحترام اور زیادہ ہوگیا، ساتھ ہی ساتھ ملنے کا اشتیاق بھی۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ مجھے خاں صاحب سے شرفِ نیاز حاصل کرنے کے لیے دلّی جانے کی ضرورت پیش نہ آئی بلکہ خاں صاحب ہم سے ملنے میسور آئے:

چمن کے صحن میں تقریب ان کے آنے کی
کلی کو ہے تعلیم مسکرانے کی

ہوا یوں کہ آپ مارچ 1987 میں این سی ای آر ٹی کی ایک نصابی کارگاہ میں شرکت کے لیے میسور تشریف لائے۔ جب مجھے اس کی خبر ملی کہ آپ قدم رنجہ فرما رہے ہیں تو میں پھولے نہ سمایا۔ مجھ سے زیادہ سلیم تمنائی صاحب، جن کا شوقِ اشتیاق بھی دوآتشہ ہوگیا۔ وہ موصوف سے بہت پہلے سے متاثر تھے اور اُردو املا کے تعلق سے باقاعدہ رشتۂ مراسلت میں بندھے ہوئے تھے۔ طے پایا کہ جلد از جلد خاں صاحب سے ملاقات کی جائے۔ خاں صاحب کے قیام کا پتا لگایا اور سلیم صاحب کو لے کر دونوں کی دیرینہ آرزو کو پوری کرنے نکل پڑا:

جلائیں انتظارِ دید میں شمعیں دل و جان کی

کریں تکریم اب آنکھیں بچھاکر اپنے مہماں کی

خاں صاحب اپنا کام ختم کر کے پروفیسر غیاث اقبال مرحوم اور جناب مشتاق مومن کو ساتھ لے کر شہر کی طرف روانہ ہونے کی تیاری کر رہے تھے۔ پروفیسر نارنگ صاحب کہہ رہے تھے کہ ''خاں صاحب کو اچھا کھانا کھلایئے ورنہ ہمارا کام تیزی سے نہیں ہوگا''۔ جوں ہی خاں صاحب کو اطلاع ہوئی کہ ہم ملنا چاہتے ہیں تو رُک گئے اور دیر تک باتیں کرتے رہے اور پھر اجازت چاہی۔ خاں صاحب کے علم و دانش، فکر و فن، فہم و فراست سے میں متاثر تھا ہی، اب آپ کی پُر وقار شخصیت سے میں پہلی ملاقات ہی میں فریفتہ ہوگیا۔ سڈول جسم، کشیدہ قامت، سر کے بال خفیف سے خمیدگی لیے ہوئے ذرا گھنگھرالے، چہرے پر آہنی عزم کی جھلک، کشادہ پیشانی، لمبی ناک، کلین شیو، چشمے کے اندر پُر جلال آنکھیں، جوں ہی چشمہ اتارتے تو آنکھیں مسحور کن انداز میں کھلنے بند ہونے لگتی ہیں، متانت و سنجیدگی کا پیکر، بش شرٹ اور پینٹ میں ملبوس، صاف ستھرے اور صحت مند ذہن کے مالک، مولویوں لیکن مولویانہ خشک پن اور مذہبی شے سے دور، کافی وضع دار، خاموش طبیعت مگر غضب کے حاضر جواب اور حاضر دماغ نکتہ آفریں و نکتہ سنج، جس کی شخصیت پر شاہ جہان پور کی سرزمین کو ناز تھا، ہے اور رہے گا۔

دوسرے دن پھر خاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ انجمن ترقی اُردو (ہند) شاخ میسور کے زیرِ اہتمام ایک اعزازی نشست منعقد ہوگی، آپ کو اس میں شرکت کرنی ہوگی اور اظہارِ خیال بھی۔ خاں صاحب نے پہلے انکار کیا، پھر راضی ہو گئے۔ آپ پروفیسر نارنگ، پروفیسر حامدی کشمیری، پروفیسر عبدالقوی دسنوی، ڈاکٹر محمد صابرین، پروفیسر مغنی تبسم وغیرہ کے ساتھ تشریف لائے۔ مختصر مگر جامع تقریر کی۔

اُسی سال این سی ای آر ٹی کی ایک اور کارگاہ تاریخی شہر اُودے پور میں ہوئی۔ راقم الحروف بھی اس میں مدعو تھا۔ خاں صاحب کی شرکت بھی یقینی تھی، لیکن علالت کی وجہ سے تشریف نہ لا سکے۔ کارگاہ میں شرکت کے بعد واپسی میں دلّی گیا تاکہ خاں صاحب سے ملاقات کر سکوں اور عیادت بھی۔ میرے دلّی پہنچنے کی اطلاع برادرم غیاث اقبال نے کر دی تھی۔ جوں ہی دلّی پہنچا تو دلّی کی فضا مکدر اور ہر جگہ کشیدگی ہی کشیدگی تھی۔ دل برداشتہ ہو کر وطن واپس ہوا۔ جلد ہی ایک اور کارگاہ سرزمینِ کیرالا میں پہلی بار تروینڈرم میں منعقد ہوئی۔ یہاں خاں صاحب سے ملنے اور جی بھر کر باتیں کرنے اور علم و ادب پر تبادلۂ خیال کا موقع ملا۔ کرناٹک اُردو اکادمی نے پہلی بار شہر کاروار میں اُردو املا پر ایک پنج روزہ کارگاہ کا انعقاد کیا تھا۔ راقم اس کارگاہ کا کنویز تھا۔ ناسازیِ طبع کے باوجود آپ کاروار جیسے دور افتادہ مقام پر تشریف لائے۔ بڑے پُر مغز اور فکر انگیز لکچر دیے۔ ان دونوں کارگاہوں کی بدولت خاں صاحب کو نہ صرف قریب سے دیکھنے بلکہ علمی، ادبی و تحقیقی کام میں مگن و منہمک دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ یہ شب و روز میرے لیے بڑے ہی انمول اور ناقابلِ فراموش ثابت ہوئے۔ ان دونوں کارگاہوں میں قیام و طعام کے انتظامات اطمینان بخش اور آپ کے شایانِ شان نہیں تھے، لیکن خاں صاحب سے کوئی شکایت نہیں سنی۔ بس خاموش شب و روز اپنے کام میں ہمہ تن مصروف رہتے تھے۔ آپ کی قناعت پسندی کو دیکھ کر مسرت بھی ہوئی اور حیرت بھی۔

خاں صاحب ہر کام بڑے سلیقے اور صفائی کے ساتھ کرنے کے قائل تھے۔ وقت کے بڑے پابند، رات میں چاہے جتنی دیر سے سوئیں، صبح مقررہ وقت پر بیدار ہو جاتے، کسی کو جگانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ سفر میں ہوں یا حضر میں، یہی آپ کا معمول رہا ہے۔ آپ کے علمی و ادبی کام کو دیکھ کر خوشی بھی ہوتی ہے اور رشک بھی ہوتا ہے۔ مقررہ وقت سے پہلے کام کا آغاز کرتے ہیں اور وقت ختم ہونے سے قبل اٹھنے کا نام نہیں لیتے، درمیان میں ایک آدھ مرتبہ اچھی چائے یا کافی طلب کرتے تھے۔ سگریٹ کے عادی تو نہیں، کبھی کبھار کسی سگریٹ نوش دوست کے ساتھ سگریٹ نوشی کر لیتے۔ کارگاہ کے کام میں ایسے مصروف و مشغول نظر آتے ہیں جیسے کوئی بڑا عابد پورے خشوع و خضوع کے ساتھ عبادت کر رہا ہو۔ کوئی کسی ادبی یا لغوی مسئلے میں الجھا ہوا ہو اور خاں صاحب سے رجوع کرے تو آپ پورے ثبوت اور دلائل کے ساتھ اس کا جواب دیتے۔ علمی بحث کرنے میں خاں صاحب سے بڑی مسرت و طمانیت ہوتی تھی۔ ایک بار کسی نے آپ کے سامنے غیاث صاحب کا نام غلط کہہ دیا، آپ نے فوراً ٹوکا اور کہا کہ ''غیاث'' صحیح تلفظ ہے اور فر فر مثالیں دیں، جیسے غیاث الدولہ، غیاث الدین، غیاث اللغات وغیرہ۔ الفاظ کو ادا کرنے کا انداز کوئی خاں صاحب سے سیکھے۔ اگر یوں کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ الفاظ آپ کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

موجودہ تعلیمی و تحقیقی معیار سے آپ بڑے نالاں نظر آتے تھے۔ ایک بار دورانِ گفتگو کہا کہ آج کی سب سے بڑی بدعت یہ ہے کہ طالبِ علم نہیں پڑھتا، بلکہ استاد پڑھتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہماری نئی نسل الفاظ کے معنی اور صحیح تلفظ سے بے بہرہ ہے۔ آج علوم و فنون کا میدان اتنا وسیع اور پیچیدہ ہوگیا ہے کہ سب باتیں سب لوگ نہیں جان سکتے۔ آپ نے شعبۂ اُردو دلّی یونی ورسٹی کا ایک واقعہ بیان کیا۔ تقریباً 30 سال قبل اُردو کی داستانوں پر ایک سمینار ہونے والا تھا۔ ایک طالبِ علم پیپر پڑھنے والا تھا، میں نے ایک سوال تفریحاً طلبا سے نہیں اساتذہ سے کیا۔ چناں چہ وہ سمینار ملتوی ہوگیا اور آج تک نہیں ہوا۔

ایک مرتبہ برِّصغیر کے ایک بڑے اُردو روزنامے کے مدیر نے آپ سے انٹرویو لیتے ہوئے ایک سوال کیا تھا۔ آپ نے کیوں اُردو ادب میں دہشت گردی پھیلا رکھی ہے؟ کیوں آپ سے بڑے بڑے اُدبا و شعرا اور اساتذہ خائف ہیں؟ فکری و نظری اختلاف کے باوجود بڑے بڑے دانشور، محقق اور پروفیسر حضرات خاں صاحب کے علمی و ادبی مقام کو تسلیم کرتے ہیں اور آپ کی خدمات کا اعتراف بھی:

جس وقت سے ساقی کی نظر ہم پہ پڑی ہے
محفل میں ہے وہ کون جو حیران نہیں ہے

خاں صاحب کا شمار دورِ حاضر کے مشہور، مایۂ ناز اور محتاط محققوں میں ہوتا ہے۔ اُردو ادب کے علاوہ فارسی پر بھی آپ کی گہری نظر تھی۔ آپ کی کئی گراں قدر تصانیف شائع ہو کر مقبول ہوئیں اور ملک بھر میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھی گئیں، مگر میرے نزدیک آپ کی سب سے اہم تخلیق ''اُردو املا'' ہے جس کی اہمیت و افادیت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ اُردو رسمِ خط پر اپنے موضوع کے اعتبار سے جو پہلی مفصل، مفید، معتبر اور مستند کتاب ہے جس کو اُردو املا کی بائبل کہنا بے جا نہ ہوگا۔ آپ نے یہ کتاب بڑی عرق ریزی اور دیدہ ریزی کے بعد لکھی جو آپ کی ایک طویل عرصے کی محنت و مطالعہ اور گہری لگن کا نتیجہ ہے۔

1986 میں کرناٹک پری یونی ورسٹی بورڈ آف ایجوکیشنل کے زیرِ اہتمام پہلی بار تمام زبانوں کی نصابی کتابیں بورڈ ہی کی نگرانی میں تیار کی گئیں۔ کتابت و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا۔ اُردو کتابوں کا املا خاں صاحب کے املا کے اصول و قوانین پر کیا گیا۔ میں نے مجلسِ ادارت کے رکن کی حیثیت سے اس کی اطلاع خاں صاحب کو دی کہ ہماری ریاست میں پہلی بار نصابی کتب میں آپ کے املا سے استفادہ کیا گیا ہے۔ موصوف بہت خوش ہوئے اور خواہش کی کہ کتابوں کا ایک سٹ روانہ کروں۔

خاں صاحب کا حافظہ علم وادب کے تعلق سے غیر معمولی تھا۔ سیکڑوں اُردو، فارسی اشعار انھیں از بر تھے۔ شعروادب، تخلیقی وتحقیقی رموز ونکات بر جستہ کہتے تھے۔ لیکن دنیوی معاملات میں آپ کا حافظہ اس کے برعکس تھا، جس کا اعتراف کرتے ہوئے انھوں نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ ''جو مضامین میں ایک بار پڑھ لیتا ہوں 20-15 سال تک بھی یاد رکھتا ہوں۔ لیکن ایک بار دیکھا ہوا چہرہ یا راستہ یاد نہیں رہتا۔ کئی لوگوں کو میں پہچان نہ سکا جن سے دو دو تین تین مرتبہ مل چکا ہوں، اس وجہ سے مجھے شرمندگی بھی اٹھانی پڑتی ہے''۔ مگر میرا کہنا ہے کہ آپ کو کسی کا چہرہ نہ پہچان کر شرمندہ ہونے کی قطعی ضرورت نہیں، اس لیے کہ آپ نے اُردو املا کے پیچیدہ اور الجھے ہوئے مسائل کو اچھی طرح پہچانا اور اس صبر آزما کام کو آسان اور سائنٹفک انداز میں پیش کیا۔ ''اُردو املا'' جیسی ضخیم اور مستند تصنیف پیش کی اور اُردو والوں کے دیرینہ خواب کو شرمندۂ تعبیر کیا اور وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا جس کے لیے اُردو دنیا آپ کی احسان مند ہے اور رہے گی۔

آخر میں مَیں خاں صاحب کے صرف دو معرکۃ الآرا تبصروں پر مضمون کا اختتام کرتا ہوں، جنھوں نے ہندو پاک میں تہلکہ مچا یا تھا، جس کی مثال آج تک اُردو دنیا میں نظر نہیں آئی۔ ترقی اُردو بورڈ پاکستان نے لاکھوں کی لاگت سے ایک لُغت شائع کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اُدھر لغت کی پہلی جلد شائع ہو کر منظرِ عام پر آئی، اِدھر خاں صاحب نے ایک بڑا بے لاگ اور جاندار تبصرہ کیا، تو بورڈ کا ڈائرکٹر ڈائرکٹر نہ رہا، یونی ورسٹی گرانٹ کمیشن نئی دلّی نے اُردو کے دو نامور اور سینئر اساتذہ کی نگرانی میں تاریخِ ادبِ اُردو کا پروجیکٹ ترتیب دیا۔ ہزاروں نہیں لاکھوں کی رقم منظور ہوئی، اس تاریخِ ادبِ اُردو پر خاں صاحب نے ایک اور شاندار تبصرہ سپردِ قلم کیا، تو پروجیکٹ ہمیشہ کے لیے ملتوی ہو گیا اور کتاب بازار سے واپس لے لی گئی۔

میں اس مضمون کو رشید حسن خاں کے ایک انٹرویو کے ایک اہم اقتباس پر ختم کرتا ہوں جو ہمارے شعرا کے لیے دعوتِ فکر دیتا ہے، جو اپنے کلیات شائع کرنے پر اصرار کرتے ہیں:

شبنم رومانی: آج کل کلّیات چھپوانے کی لہر آئی ہوئی ہے۔ ہمارے ہاں بہت سے مشہور شاعر ہیں اور ان کی شہرت کے بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں تو ان کے کلام کو ''کلیات'' کی حیثیت دینا کہاں تک مناسب ہے؟

رشید حسن خاں: اگر آپ کو دشمنی کرنا ہے اس بیسویں صدی کے کسی ایسے شاعر کے ساتھ جو مرحوم ہو چکا ہے یا جو زندہ ہے ابھی، تو آپ اُس کا کلیات چھاپ دیجیے، پھر وہ واقعی مرحوم ہو جائے گا۔ اِس کی ایک مثال: مائل دہلوی اپنے زمانے کے خوش گو شاعر تھے، زبان کے شعر کہا کرتے تھے، جے پور میں رہتے تھے۔ ان دو شعروں سے آپ کو ان کے رنگِ سخن کا اندازہ ہو گا:

گھبرا دیا ہے آمدِ فصلِ بہار نے
مشکل ہوئے ہیں طاق سے شیشے اُتارنے
یہ کہہ کے چھیڑتے ہیں جوانانِ بادہ خوار
مائل! تمھیں سلام کہا ہے بہار نے

انتقال ہو گیا اُن کا۔ اُن کے شاگردوں نے استاد کی یاد کو زندہ رکھنے کے لیے ان کا نہایت ضخیم کلّیات رجستھان اُردو اکادمی کی طرف سے چھاپا اور اس کے بعد وہ واقعی مرحوم ہو گئے کیوں کہ کسی نے نہ اس کلیات کو خریدا اور نہ کوئی اتنا ضخیم کلیات پڑھ سکتا تھا۔ اگر سو دو سو ڈھائی سو منتخب اشعار کا مجموعہ ہوتا تو آج مائل کو بہت سے لوگ جانتے ہوتے۔ یہ تو ہے اُن لوگوں کا احوال جن کا انتقال ہو چکا ہے۔

شبنم رومانی: غالبؔ کا انتخاب نہ کیا گیا ہوتا تو آج غالبؔ، غالبؔ نہ ہوتا؟

رشید حسن خاں: یہ اپنے اوپر اعتماد کا مسئلہ ہے۔ اصغرؔ گونڈوی کے دو مجموعے ملا کر کتنے شعر ہیں، یعنی کیا حیثیت ہے ان کی؟ اور میرؔ کا کلیات کتنا ضخیم ہے، اگر مولوی عبدالحق کا انتخاب نہ ہوتا تو ''میر شناسی'' کی روایت توسیع پا سکتی تھی؟ کون ہے جو آج میرؔ کا کلیات پورا پڑھ سکے؟ وہ سارے اچھے شعر اس کے اندر دب جاتے، وہ لوگ جو ابھی زندہ ہیں اور ان کے تین تین چار چار مجموعے چھپ چکے ہیں۔

'فسانۂ عجائب' (1990) اور 'باغ و بہار' (1992) تدوین اور ترتیب کر کے خاں صاحب نے اُردو دنیا میں ایک نیا معیار اور بے مثل کارنامہ انجام دیا، اس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ یہ کام خان صاحب اور صرف خان صاحب ہی کر سکتے تھے، اس لیے کہ املا، لغت اور لسانیات کے رموز اور ترتیب اور تدوینِ متن کے شرائط پر ان کی بڑی گہری نظر تھی۔

انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی کی تاریخ میں رشید حسن خاں غالباً واحد محقق تھے جن کے بارے میں انجمن کی ادبی کمیٹی نے طے کیا تھا کہ وہ جو بھی کتاب مرتّب کریں فوراً شائع کر دی جائے۔

اُردو کے نامور محقق اور مایۂ ناز ادیب گیان چند جین 'گلزارِ نسیم' پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کو 'خدائے تدوین' کہا تھا۔ ('ہماری زبان' 15 دسمبر 1995)

پاکستان کے مشہور دانشور ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی مرحوم نے موصوف کو تدوین کے معلمِ آخر کہا تھا۔ یہ کام ان کی چار دہائیوں کی محنت، عرق ریزی، باریک بینی اور دقتِ نظر کا نتیجہ تھا۔ ان دونوں کتابوں کو نہ صرف ایڈٹ کیا بلکہ طویل، فکر انگیز اور معلوماتی مقدموں سے ان کی شان کو دوبالا کیا۔

○○○

ادارہ، اُردو بُک ریویو

رشید حسن خاں (محقق، ادیب)

اُردو کے ممتاز و منفرد، محقق وادیب اور ماہر لسانیات رشید حسن خاں (76 سالہ) 26 فروری 2006 کی رات پونے تین بجے شاہ جہاں پور میں انتقال کر گئے۔ پسماندگان میں ایک بیٹی اور دو بیٹے ہیں۔ رشید حسن خاں 10 جنوری 1930 کو پیدا ہوئے تھے۔ وہ شاہ جہاں پور کے مدرسہ بحر العلوم سے فارغ التحصیل تھے۔ درسِ نظامی کے طالب علم رشید حسن خاں نے اپنی ذاتی دل چسپی اور طالب علمی کے سبب علم وادب کے وہ مدارج طے کیے جو کم لوگوں کے نصیب میں ہوتا ہے۔ انھوں نے 11 سال تک اسلامیہ ہائر سکینڈری اسکول (شاہ جہاں پور) میں اُردو فارسی کی تدریسی خدمات انجام دیں جب کہ وہ دہلی یونی ورسٹی میں ریسرچ افسر کے عہدے پر 1989 تک کام کیا۔ ابتدا میں وہ ایک مقامی ٹریڈ یونین سے بہ حیثیت فیلڈ ورکر وابستہ ہوئے تھے مگر ان کے علمی تجسس اور تحقیقی مزاج نے انھیں علم وادب کے میدان کا وہ شہ سوار بنا دیا کہ جس کی مثال اس دور میں نایاب ہے۔

قاضی عبدالودود، امتیاز علی عرشی، عبدالستار صدیقی، مسعود حسین رضوی، محمود الرحمٰن شیروانی جیسے محققین کی روایات کے امین کہلانے والے رشید حسن خاں نے اُردو زبان وادب میں جو خدمات انجام دیں وہ مثالی ہیں۔ دور دور تک اب ان کا کوئی وارث بھی دکھائی نہیں دیتا۔ اُردو املا، اُردو کیسے لکھیں، زبان اور قواعد ان کی وہ کتابیں ہیں جو انہیں زندہ جاوید رکھیں گی۔ فسانۂ عجائب، باغ و بہار، مُصطلحاتِ ٹھگی، زٹل نامہ، مثنوی سحر البیان اور مثنویاتِ شوق کے متن کی تدوین بھی ان ہی کی یادگار ہیں۔ فرہنگ غالباً طباعت کے مرحلے میں ہے وہ کلاسیکی ادب کی لغات بھی تیار کر رہے تھے جس کے 800 صفحات کی کمپوزنگ ہو چکی ہے۔ اقبال اکیڈمی (لاہور) کی ایما پر وہ علامہ اقبال کے جملہ کلام کی تدوین کا خاکہ بھی تیار کر چکے تھے۔

(اُردو بُک ریویو، دریا گنج نئی دہلی، مدیر عارف اقبال، صفحہ 89، جنوری، فروری 2006)

○○○

رفاقت علی شاہد (لاہور)

اُردو تحقیق کا سالارِ زماں رُخصت ہوا

26 فروری 2006 مطابق 27 صفر 1427 ھ کی تاریخ اور اتوار کا دن تھا۔ میں حسبِ معمول مطالعے میں مصروف تھا کہ محبِّ مکرم ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی فون کال موصول ہوئی۔ انھوں نے اطلاع دیتے ہوئے کہا کہ بھئی! ایک افسوس ناک خبر ہے، رشید حسن خاں فوت ہو گئے ہیں۔ آج صبح شاہ جہاں پور (یو پی، بھارت) میں ان کا انتقال حرکتِ قلب بند ہو جانے سے ہوا۔ آج شام تک تدفین ہو گی۔ پھر ہم کچھ دیر رشید حسن خاں صاحب اور ان کی بے مثال خدماتِ ادب سے متعلق تبادلۂ خیالات کرتے رہے۔

کسی انسان کی موت کی خبر سُن کر دوسرے انسانوں کا غمگین اور افسردہ ہونا ایک فطری عمل ہے۔ لیکن خاں صاحب کے انتقال کی خبر کم سے کم ہاشمی صاحب اور میرے لیے (اور ہم جیسے دیگر رہ نوردانِ تحقیقِ ادب کے لیے بھی) معمول سے زیادہ دُکھ کا باعث تھی۔ رشید حسن خاں مرحوم محققِ اعظم تھے، ہاشمی صاحب بھی معروف محقق ہیں اور میں تحقیق کا طالب علم۔ ''تحقیق'' کی اسی قدرِ مشترک کے باعث

(کم سے کم) ہاشمی صاحب اور میں؛ خاں صاحب کے کام اور مقام سے بہ خوبی واقف اور اُن کی تحقیقی ادبی خدمات کے معترف ہیں۔ہمیں پوری طرح احساس ہے کہ خاں صاحب نہایت اہم ادبی تحقیقی خدمات کی انجام دہی میں مصروف تھے اور اُن کے پائے کا دیانت دار محقق اُردو ادب کو شاید مشکل ہی سے مل سکے، اسی لیے ہاشمی صاحب کو اور مجھے خاں صاحب کی وفات سے پہنچنے والے دُکھ کی شدت نسبتاً زیادہ محسوس ہوئی۔

خاں صاحب کی وفات کی خبر سُن کر کافی دیر تک یہ باور کرنے کو دل نہ چاہا کہ اُردو تحقیق کے سالارِ زماں اب ہمارے درمیان موجود نہیں رہے۔ بعینہ ایسی صورتِ حال میرے ساتھ تب پیش آئی تھی، جب تقریباً پورے ایک سال قبل 21 فروری 2005 کو مشفق خواجہ مرحوم کی رحلت کی خبر ملی تھی۔ مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ مختلف اوقات میں تقریباً سات آٹھ ماہ میں نے خواجہ صاحب کی رفاقت میں گزارے (اُن سنہرے دنوں کی یادداشتیں قلم بند کر رہا ہوں، جن سے خواجہ صاحب مرحوم کی شخصیت اور معلومات کی بعض تفصیلات کا علم ہوگا) یہ ہوسکتا ہے کہ خواجہ صاحب کی بے وقت وفات پر میرے دُکھ کی شدت میں اس قربت کے باعث قائم ہونے والے تعلق خاطر کا بھی حصہ ہو، لیکن میں خود کو ٹٹولتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ اس دُکھ میں "تحقیق" کی قدرِ مشترک کے باعث ایک طالبِ تحقیق کے دُکھ کا حصہ غالب تھا۔ یہی وجہ ہے کہ خاں صاحب کی وفات پر افسردگی اور رنج کی شدت خواجہ صاحب کی وفات کے دُکھ سے کم محسوس نہ ہوئی۔

میں "تحقیق" کا طالبِ علم ہوں۔ رشید حسن خاں صاحب کے تحقیقی و تدوینی کام مجھ سمیت تمام طالبانِ تحقیق کے لیے مشعلِ راہ اور درسی نصابات کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس رشتے سے رشید حسن خاں مرحوم مجھ سمیت ہر طالب تحقیق کے استاد بل کہ استاد الاساتذہ تھے اور ہمیشہ رہیں گے۔ استاد اور طالب علم کے اس رشتے میں اپنائیت کا ایک لطیف احساس واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اسی احساس کے باعث مجھے خاں صاحب کے تعلق سے کبھی اجنبیت محسوس نہیں ہوئی۔ جب بھی اُن کی تحقیقی تحریر پڑھتا، یہی محسوس ہوتا کہ خاں صاحب سامنے بیٹھے درس دے رہے ہیں۔ تحقیق کے نکتے، تدوین کی نزاکتیں اور اُردو زبان و ادب کی باریکیاں مجھے سمجھا رہے ہیں۔ خاں صاحب کے اس درس سے جتنا کچھ میں حاصل کرتا گیا، جتنا استفادہ کرتا گیا، خاں صاحب اُتنے ہی میرے اور قریب ہوتے گئے، یہاں تک کہ میں نے اپنے تصور میں ان کی شبیہ اور اندازِ گفتگو کی ایک تصویری سی ترتیب دے لی اور:

جب ذرا نظر جھکائی، دیکھ لی

کے مصداق جب خاں صاحب کی کوئی تحریر پڑھی یا ذکر کیا یا سُنا، خاں صاحب کی شبیہ نظروں کے سامنے پھر گئی۔ خاں صاحب کا یہ فیضان ان کی زندگی میں بھی مجھ جیسے طالبانِ تحقیق کے لیے جاری تھا اور اب اُن کے بعد بھی (انشاءاللہ) جاری و ساری رہے گا، بل کہ خاں صاحب کی غیر موجودگی کے باعث اس فیضان کی طلب میں شدت آجائے تو بعید نہیں۔ مجھے بہت افسوس ہے اور ہمیشہ رہے گا کہ خاں صاحب سے میری کوئی بالمشافہ ملاقات نہیں ہوسکی۔ اساتذہ اور علما کی چند لمحوں کی رفاقت بھی کئی کتابیں پڑھنے سے زیادہ فائدے مند ہوتی ہے۔ اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے (انیسویں صدی میں اُردو گل دستے۔ تاریخ و تحقیق، تکمیل شدہ اپریل 2005) کی تکمیل کے دوران مواد کے حصول کی خاطر میرا پانچ بار دہلی جانا ہوا۔ پہلی بار فروری 1996 میں، دوسری بار اگست 1996 میں، پھر فروری 1998 اگست و ستمبر 2004 اور آخری بار جنوری و فروری 2005 میں۔ شومیِ قسمت کہ میری آرزو اور کوشش کے باوجود خاں صاحب سے بالمشافہ ملاقات نہ ہوسکی۔ دہلی یونی ورسٹی سے اپنے فرائض منصبی سے سبک دوش ہونے کے بعد خاں صاحب اپنے وطن مالوف شاہ جہاں پور چلے گئے تھے اور وہیں اپنے تمام علمی و تحقیقی کام انجام دے رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ کبھی کبھار شاہ جہاں پور سے باہر نکلتے ہیں۔ میری کم نصیبی کہ میری دہلی میں موجودگی کے دوران خاں صاحب کا کبھی دہلی میں آنا نہیں ہوا اور مجھے کبھی دہلی کے علاوہ دیگر کسی شہر کا ویزہ نہیں ملا۔ (ایک بار کلکتہ کا ویزہ ضرور ملا، لیکن دہلی سے کلکتے آنے جانے ہی میں بذریعہ ریل چار دن صرف ہوتے ہیں، اسی وجہ سے کلکتہ نہیں جاسکا)

2000 میں میری مرتبہ کتاب "اُردو مخطوطات کی فہرستیں (رسائل میں) جلد اوّل" ناشر مغربی پاکستان اُردو اکادمی، لاہور، شائع ہوئی تو ستمبر 2000 میں اس کتاب کا ایک نسخہ میں نے خاں صاحب کو ارسال کیا اور ناسمجھی میں کتاب پر یا خط میں لکھ دیا کہ میں یہ نسخہ آپ کے استفادے کے لیے ارسال کر رہا ہوں۔ ایک عالمِ وقت کے لیے ایک طالبِ علم کی جانب سے ایسا گستاخانہ جملہ کس طرح مناسب نہ تھا۔ ظاہر ہے خاں صاحب نے بھی اس جملے کو محسوس کیا، لیکن ان کی بڑائی یہ ہے کہ انھوں نے اس کا اظہار واضح طور پر نہیں کیا بل کہ غیر محسوس طریقے پر مجھے جملے کی نامناسبت کا احساس دلانے کی کوشش کی۔ خاں صاحب نے لکھا:

"آپ نے اس کتاب کے لیے لکھا ہے کہ اسے 'آپ کے استفادے کے لیے ارسال کر رہا ہوں' اس کے لیے خاص کر مشکور ہوں، ضرور استفادہ کروں گا۔"

(خط رشید حسن خاں بنام راقم الحروف، مورخہ 4 فروری 2001)

2003 کے وسط میں میری ایک اور مرتبہ کتاب "تحقیق شناسی"، ناشر القمر انٹر پرائزز، لاہور، شائع ہوئی تو 2004 کے اوائل میں اس کا ایک نسخہ بھی میں نے دہلی میں ایک کرم فرما کے توسط سے خاں صاحب کو ارسال کیا۔ اس کتاب میں خاں صاحب کا ایک مضمون بھی شامل تھا۔ اس حوالے سے خاں صاحب کو معذرت کا ایک خط بھی کتاب کے ساتھ بھجوایا کہ کتاب میں اُن کے مضمون کی شمولیت کے لیے ان سے اجازت حاصل نہ کر سکا۔ قسمت کی خرابی دیکھیے کہ نہ کتاب خاں صاحب تک پہنچ سکی، نہ خط۔ میں نے "تحقیق شناسی" کے چند نسخے دہلی میں ایک کرم فرما کو ارسال کر دیے تھے کہ متعلقہ اہل علم تک پہنچا دیں۔ اوروں کی تو خبر نہیں، لیکن 2004 کے اواخر میں دہلی جانا ہوا تو ان کرم فرما کے ہاں خاں صاحب کے نام کا نسخہ رکھا دیکھ کر معلوم ہوا کہ کتاب اور خط ابھی تک خاں صاحب تک نہیں پہنچ سکے۔ اُن کرم فرما نے وضاحت فرمائی کہ کسی سبب خاں صاحب کو یہ نسخہ ابھی تک نہ جاسکا۔ لیکن اب بھیج دیا جائے گا۔ میں مطمئن واپس آگیا اور خاں صاحب کی جانب سے کتاب کی رسید موصول ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ لیکن رسید نہ آنی تھی نہ آئی۔

آخری بار 2005 کے اوائل میں اتفاق سے میرا پھر دہلی جانا ہوا۔ اب کے میں نے کسی کرم فرما سے رشید حسن خاں صاحب کے گھر کا فون نمبر حاصل کیا اور دہلی میں نے اُن سے ٹیلی فون کے ذریعے رابطہ قائم کیا۔ یہ خاں صاحب سے میری پہلی اور آخری براہِ راست گفتگو تھی۔ میں نے فون کیا تو خوش قسمتی سے ریسیور خاں صاحب نے اُٹھایا۔ میں نے اپنا نام بتا کر کہا کہ میں لاہور سے آیا ہوں۔ خاں صاحب نے خوش دلی سے خوش آمدید کہا۔ میں نے ان کی صحت کے بارے میں دریافت کیا۔ تو انھوں نے جواب دیا کہ صحت ٹھیک نہیں رہتی، آپ میرے لیے دُعا کریں۔ میں نے انھیں بتایا کہ پاکستان کے تقریباً تمام اہلِ علم و ادب اُن کے کام سے متاثر ہیں، اور اُن کے تحقیقی، خصوصاً تدوینی کاموں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اُن کی صحت یابی اور مزید کامیابیوں کے لیے دُعا گو ہیں۔ اس پر انھوں نے اُن تمام

اہلِ علم وادب کاشکریہ ادا کیا۔ میرے دریافت کرنے پر کہ آج کل وہ کس علمی منصوبے پر کام کررہے ہیں، انھوں نے قاموسِ غالبؔ کے بارے میں بتایا۔ پھر میں نے ''تحقیق شناسی'' کی وصول یابی سے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے واضح کیا کہ کتاب ابھی انھیں نہیں ملی۔ میں نے لاہور واپس آکر خاں صاحب کو کتاب کا نسخہ ارسال کرنے کا وعدہ کیا۔ میں نے اُردو ادب اور اُردو تحقیق کے لیے ان کی بے مثال خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے چند توصیفی کلمات کہے اور صحت وتندرستی کے ساتھ ان کی درازیِ عمر کے لیے دُعا کی تو انھوں نے اپنے قابلِ فخر کارناموں کا کسی قسم کا فخر یہ اظہار کرنے کے بجائے انکساری اور سادگی کا اظہار کرتے ہوئے محض ''شکریہ'' کہا۔ یہ خاں صاحب سے میری واحد بات چیت یا ملاقات تھی، جس کی یاد ہمیشہ میرے دل اور حواس پر تازہ رہے گی۔

لاہور آکر میں نے ڈاکٹریٹ کے مقالے کی تسوید اور پھر دیگر ملتوی شدہ کاموں کی تکمیل میں مصروف ہوگیا۔ خاں صاحب کو براہِ راست ڈاک کے ذریعے کتاب نہ بھجوائی کہ چند کرم فرماؤں کا اس طرح کا تجربہ خوش گوار نہیں تھا۔ کتاب ڈاک میں گُم ہو جاتی تھی، چناں چہ اسی انتظار میں رہا کہ خود دہلی جانا ہوا تو لے جا کر خاں صاحب کے لیے ڈاکٹر خلیق انجم کے حوالے کروں گا، جن کی ذمے داری آزمودہ ہے یا پھر کسی قابلِ اعتبار شخص کے ذریعے خلیق صاحب تک کتاب پہنچاؤں گا۔ افسوس کہ اس سب کے باوجود کتاب خاں صاحب تک نہ پہنچا سکا۔ معلوم نہیں دہلی کے کرم فرمانے اپنا وعدہ ایفا کرتے ہوئے خاں صاحب کا نسخہ انھیں ارسال کر دیا یا نہیں۔

رشید حسن خاں مرحوم صحیح معنوں میں نابغۂ روزگار تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں بے مثال اور بے پناہ صلاحیتیں عطا کی تھیں اور انھوں نے بھی ان کے استعمال میں کنجوسی نہیں برتی۔ احسان شناسی کا تقاضہ ہے کہ انسان، خدا کی ودیعت کردہ صلاحیتوں کا شکرانہ، ان صلاحیتوں کے بہترین استعمال کے ذریعے ادا کرے۔ میرے خیال میں خاں صاحب نے اپنی صلاحیتوں کے استعمال سے ان صلاحیتوں کا جو شکرانہ ادا کیا ہے، اس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ خاں صاحب نے اپنی محنت، علم اور صلاحیتوں کی بدولت علم و تحقیق کا وہ خزانہ ہمارے لیے چھوڑ گئے ہیں، جس سے استفادہ کر کے ہماری کئی نسلیں علوم تحقیق میں راہ نمائی حاصل کرتی رہیں گی اور اساتذہ علم وتدریس اپنے علم میں اضافہ کرتے رہیں گے۔ خاں صاحب صحیح معنوں میں معلمِ تحقیق تھے۔ اُن کی تحریریں معروف معنی میں طالبانِ تحقیق کی رہبری کا فریضہ انجام دیتی ہیں۔

میں خاں صاحب کو اُردو کا ''جامع محقق'' مانتا ہوں اور کہتا ہوں۔ مولانا شبلی سے لے کر خاں صاحب تک کے تمام محققین کی تحقیقی خدمات پر نظر دوڑائیے۔ حافظ محمود شیرانی ہوں یا قاضی عبدالودود، مولانا امتیاز علی عرشی ہوں یا مسعود حسن رضوی ادیب، عبدالقادر سروری ہوں یا مالک رام، ڈاکٹر محی الدین قادری زور ہوں یا محمد اکبرالدین صدیقی، سخاوت مرزا ہوں یا ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر شیام لال کالڑا عابد پیشاوری ہوں یا حنیف نقوی اور مرحوم مشفق خواجہ ہوں یا ڈاکٹر خلیق انجم۔ کسی محقق کا تحقیق وتدوینی کام مقدار میں (یقیناً) اور معیار میں (بڑی حد تک) خاں صاحب کے مقدار اور معیار کو نہیں پہنچتا۔ غور کیجیے تو پتا چلتا ہے کہ تقریباً تمام محققین یا تو یک رُخے تھے یا دو رُخے۔ کسی نے اطلاقی تحقیق میں خدمات انجام دیں تو کسی کو تدوین کے حوالے سے پہچان ملی اور بیش تر محققین تدوین اور اطلاقی تحقیق کے حوالے سے پہچانے گئے۔ لیکن خان صاحب نے نظری تحقیق میں بھی اہم اور قابل قدر تحریریں چھوڑیں ہیں۔ انھوں نے نظری یا نظریاتی تحقیق سے متعلق اس قدر اور اپنے علمی تجربات کی بنیاد پر اس معیار کی تحریریں چھوڑیں ہیں، جن کی مدد سے تحقیق وتدوین کے اصول وضوابط منضبط ہوئے ہیں۔ اطلاقی تحقیق پر اُن کے مضامین قاضی عبدالودود کی یاد دلاتے ہیں اور تدوین متن میں اُن کی خدمات منفرد، بے مثال اور قابل تقلید ہیں۔ تدوین کے تینوں میدانوں میں بیک وقت مقدار و معیار میں اس قدر اہم تحریریں اس سے قبل کسی محقق کو نصیب نہیں ہوسکیں۔ خاں صاحب کی یہ انفرادیت شاید عرصۂ دراز تک برقرار رہے۔

(ماہ نامہ تخلیق، لاہور جون، 2006)

(ہفت روزہ ہماری زبان، انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، یکم تا 28 ستمبر 2006، شمارہ نمبر 33,34,35,36 جلد نمبر: 65)

(عالمی اُردو ادب، جلد 25، مدیر نند کشور وکرم، صفحہ 237 تا 241، نئی دہلی، 2007 میں یہ مضمون 'اُردو تحقیق کا سالارِ اعظم' کے نام سے شائع ہوا ہے)

○○○

وقار ناصری

تحقیق کے وہ اولیں نقوش جنھیں آزاد، شبلی، سرسید اور حالی نے معیار اور اعتبار دینے کی کوشش کی، اس میں حقائق کی معروضی جانچ پرکھ، منطقی استدلال اور سائنسی تجزیے کی کمی کا احساس بعد کے محققین کے لیے بھی کم دشوار نہیں رہا ہے۔ گمشدہ حقائق کی جستجو میں مشرق کے اصولِ تحقیق کے ساتھ ساتھ مغرب کے اصولِ تحقیقی نے ان کے لیے ہر چند آسانیاں فراہم کر دیں مگر چند ایک کو چھوڑ کر زیادہ تر محققین سہل نگاری کے باعث کوئی بہتر نمونہ و مثال نہیں پیش کر سکے۔ حافظ محمود شیرانی، مولوی عبدالحق، قاضی عبدالودود، مولانا امتیاز علی عرشی، سید مسعود حسن رضوی ادیب پروفیسر محی الدین قادری زور، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، پروفیسر گیان چند جین، پروفیسر نور الحسن ہاشمی، نثار احمد فاروقی، مشفق خواجہ اور نیّر مسعود جیسے محققین کے پہلو بہ پہلو جن محققین نے تحقیق اور اصولِ تحقیق کو بطور فن نمونہ اور مثال بنایا ان میں ممتاز محقق رشید حسن خاں کا نام بھی سرِفہرست ہے۔ ان کے تحقیقی سرمائے میں ایسے لازوال کارنامے موجود ہیں جن کا تذکرہ کیے بغیر اُردو تحقیق کی کوئی تاریخ مرتب نہیں ہو سکتی۔ اس خارزار وادی میں سفر کرتے ہوئے وہ کن آزمائشوں اور تجربوں سے گزرے اور منزلِ مُراد تک پہنچنے میں اُنھیں کن کن دُشواریوں کا سامنا رہا یہ تو وہی سمجھ سکتا ہے جس کو اس شوقِ بے پایاں نے در در بھٹکنے پر مجبور کیا ہو۔ مولانا غلام رسول مہر نے تحقیق کے ان مراحل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''کسی بھی تحقیقی کام کی مشکلات کا صحیح اندازہ آسان نہیں، خصوصاً جن اصحاب کو ان مراحل سے کبھی سابقہ نہ پڑا ہو وہ پوری تشریحات کے بعد بھی سمجھ نہیں سکتے کہ ایک ایک معاملے میں صاحبِ تحقیق کے لیے کن کن دشوار گھاٹیوں میں گام فرسائی ناگزیر ہو جاتی ہے۔''

رشید حسن خاں نے تحقیق کے اصولوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ:

''تحقیق کو سچ کی تلاش رہتی ہے۔ جھوٹ کس نے بولا، یہ بھی ایک بات ہے، لیکن اصل بات یہ ہے کہ جھوٹ کیوں بولا گیا۔ اس ''کیوں'' اور ''کیسے'' کی تلاش اور وضاحت تحقیق کا اصل مقصد ہے اور یہی میرا مشغلہ ہے۔''

''شبلی کا فارسی تغزل'' (نگار لکھنؤ، مئی 1950) سے اپنا ادبی سفر شروع کرنے والے رشید حسن خاں نے لوگوں کو اس وقت متوجہ کیا جب فیض احمد فیض کے مجموعے ''دستِ صبا'' پر ان کا ایک مضمون ''دستِ صبا پر ایک نظر''، ماہنامہ ''تحریک''، دہلی (مئی 1954) میں شائع ہوا اور ایک معترض نقاد کی حیثیت سے فیض کی شاعری کا تنقیدی جائزہ لے کر زبان و بیان سے لے کر تشبیہ و استعارے تک کتنے ہی اعتراض کر ڈالے۔ اس تبصرے کے بعد فیض سے متعلق ان کا ایک اور مضمون ''فیض اور ان کی شاعری'' (بحران، جودھ پور 1977) میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں زیادہ تفصیل سے فیض کی شاعری کے علاوہ فیض کی ادبی شہرت و مقبولیت کے دوررس نتائج کا تجزیہ کرتے ہوئے رشید حسن خاں نے لکھا ہے:

''ان کو یہ ہمہ گیر شہرت ملی ہے 1951 کے بعد یعنی اس واقعہ اسیری کے بعد جس سے بہت سے لوگ واقف ہوں گے اس سے پہلے وہ شاعر تھے اور ایک محدود لیکن باذوق حلقے میں ان کی بعض نظموں کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا لیکن اس کے بعد وہ ''مجاہد شاعر'' بن گئے اور اسی زمانے سے سیاسی حلقوں نے (ملک کے اندر اور ملک کے باہر ہر جگہ) مختلف سطحوں پر اپنے انداز سے ان کی ''مجاہدانہ شہرت'' کے لیے راہیں ہموار کیں۔ ان کے کلام کو ان ہی اثرات کی روشنی میں دیکھا گیا اور اس کی فرمائش کی گئی۔ اس کے نتیجے میں یہ ہونا ہی تھا کہ شاعری کی بحث میں اضافی خوبیوں کا ضرورت سے زیادہ دخل رہے۔ شاعر کو اگر مجاہد کی حیثیت سے دیکھا جائے تو پھر اس کی ہر تحریر کے متعلق یہ کہا جائے گا کہ:

لگا دی ہے خونِ دل کی کشید

چوں کہ ان کو مجاہد کا منصب بخش دیا گیا اس لیے ان کی ہر بات آیت و حدیث ہو کر رہ گئی..... ان کی کمزور سے کمزور نظم کو اُردو کی اعلا تخلیق بتایا گیا اور اس آوازہ گری میں معقول اور غیر معقول سبھی لوگ ہم آواز ہو گئے۔ اگر کبھی کسی نے زبان و بیان کے کسی بھی پہلو کی طرف توجہ دلائی تو اس کو لفظ پرست، روایت پرست اور رجعت پسند کہا گیا۔ یہ فرض کر لیا گیا کہ اگر کوئی شخص فیض (یا کسی اور ترقی پسند شاعر پر کوئی اعتراض کرتا ہے) تو وہ ترقی پسندی کا مخالف ہے۔ مخالف ہے تو رجعت پرست ہوا اور رجعت پرستوں کی بات کیوں سنی جائے اس صورتِ حال کا ایک نتیجہ بھی ہوا کہ زبان و بیان پر گفتگو کرنا گھٹیا درجے کا کام قرار پایا۔ اس غلط اندیشی کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ ان شاعروں کو جن کو ضرورت تھی صحیح مشوروں کی۔ اس محرومی نے غلط گوئی کو بڑھاوا دیا اور شاعری معائب سے بوجھل ہو کر اپنے ظاہری حُسن کو کھو بیٹھی۔''

ان مضامین کے علاوہ رشید حسن خاں نے کئی اور مضمون لکھے، جن میں ترقی پسندوں کے نظریۂ ادب، فنی اسقام اور ترقی پسند تنقید سے سخت اختلاف کیا۔ ''تنقیدی جانب داری کے اسباب اور اثرات'' (نقوش، لاہور) ''زبان و بیان کے بعض پہلو'' (نقوش، لاہور، جولائی 1962) ''غزل اور ترقی پسندی'' (نیا دور لکھنؤ، 1955) وغیرہ ایسے ہی مضامین ہیں جن میں ترقی پسند ادب پر کوئی اثر پڑا ہو یا نہ پڑا ہو مگر ان کی وجہ سے رشید حسن خاں کی ادبی حیثیت ضرور مستحکم ہوتی چلی گئی۔

ادبی تحقیق میں بھی رشید حسن خاں کا معترض نقاد کسی نہ کسی طور سے ہمیشہ نمایاں رہا۔ ان کی تحریر کے چبھتے ہوئے فقروں نے دوسروں کو چاہے جتنا پریشان کیا ہو لیکن وہ دوٹوک انداز میں یہی کہتے رہے:

''میں صاف، سادہ، واضح اور دوٹوک انداز میں بات کہنا چاہتا ہوں اور اس سے مجھے مطلق دل چسپی نہیں کہ لوگ اسے مثبت سمجھیں گے یا منفی۔ ایسی فضول اصطلاحوں سے میں بہت دور رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے سچ کی تلاش ہے، مجھے شخص سے دل چسپی نہیں، اس لیے جو کچھ کہا یا لکھا ہے اس سے دل چسپی ہے۔ جھوٹ کوئی بھی بولے وہ جھوٹ ہے۔ میں صلح سمجھوتے کا قائل نہیں۔''

ثقافت پاکستان (شیخ محمد اکرام)، دیوانِ خاقانی (مرتب عبدالرسول) تاریخ ادب اُردو (جمیل جالبی)، اُردو شاعری کا انتخاب، (ڈاکٹر محی الدین قادری زور)، دیوانِ غالب صدی اڈیشن (مالک رام) علی گڑھ تاریخِ ادب اُردو (آل احمد سرور، مجنوں گورکھپوری)، لغت ترقی اُردو بورڈ، کراچی جیسی اہم کتابوں پر اعتراضات کر کے رشید حسن خاں نے ثابت کر دیا کہ وہ سچ کی تلاش میں کتنے جوکھم اُٹھا سکتے ہیں۔ ان کے صحیح اعتراضات کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے ''دانش ور محققین'' کو ان سے شکایت پیدا ہو گئیں ہیں۔ ان کے خیال میں یہی کام اگر وہ کسی اور طریقے سے انجام دیتے تو بہتر تھا۔ لیکن رشید حسن خاں ''عبرت کدۂ تدوین'' کو کسی قسم کی جھوٹ دینے پر راضی نہ تھے۔ ان کے خیال میں حقائق کی ''بازیافت تحقیق'' کا مقصد ہے اور جب مقصد ہے اور جب مقصد ہی کچھ سے کچھ ہو جائے تو انھیں یہ لکھنے میں کیوں تامل ہوتا:

''شہرت سے غلط فائدہ اٹھانا آج کل شیوۂ عام بن گیا ہے۔ بہت سے متعارف اہلِ قلم نے یہ فرض کرلیا ہے کہ ان کا نام ہی صحت ومعیار کی ضمانت ہے۔ نہ محنت کی ضرورت ہے، نا پابندیٔ آدابِ تحقیق کی۔ جو کچھ قلم سے نکل جائے مستند ہے۔ ایسی تحریروں کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُردو میں ابھی ابتدائی تحقیق کا بھی رواج نہیں ہوا ہے۔ یہ صورتِ حال پریشان کن ہے خصوصاً اس وجہ سے کہ اس طرح آسان پسندی کی روایت قائم ہوتی جارہی ہے۔ لوگ مرتب یا مقالہ نگاروں کا نام دیکھ کر اس اعتماد کے ساتھ کتاب خریدتے ہیں کہ ان کی معلومات میں اضافہ ہوگا لیکن ہوتا ہے کہ ہمیشہ کے لیے غلط معلومات حاصل کرنے کا ایک وسیلہ ہاتھ آجاتا ہے۔''

(تنقید ثقافتِ پاکستان)

رشید حسن خاں کے بقول تحقیق کا مقصود حقائق کی دریافت ہے لہٰذا وہ دوسرے محققین سے بھی یہی توقع کرتے رہے۔ تحقیق اور اصولِ تحقیق کے ضمن میں جو مضامین انھوں نے لکھے ہیں ان میں تحقیق کی تعریف کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے:

''ادبی تحقیق میں کسی امر کا وجود بطور واقعہ اس صورت میں متعین ہوگا جب اصول تحقیق کے مطابق اس کے معلومات ہوں۔ واقعہ کا چھوٹا یا بڑا ہونا، اہم یا غیر اہم ہونا ادبی تحقیق میں کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتا۔ یہ صفاتی الفاظ صرف اس صورت حال کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس میں اس واقعہ سے کام لیا جارہا ہے۔

تحقیق ایک مسلسل عمل ہے۔ نئے واقعات کا علم ہوتا رہے گا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کون سی حقیقت کتنے پردوں میں چھپی ہوئی ہے اکثر صورتوں میں ہوتا ہے۔ نئے واقعات کا علم ہوتا رہے گا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کون سی حقیقت کتنے پردوں میں چھپی ہوئی ہے۔ اکثر صورتوں میں ہوتا یہ ہے کہ حجابات بہ تدریج اُٹھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تحقیق میں اصلیت کا تعین اس وقت تک حاصل شدہ معلومات پر مبنی ہوتا ہے۔ اس سے آیندہ کے امکانات کی نفی نہیں ہوتی۔ لیکن محقق کے آیندہ امکانات پر ان باتوں کو بہ طور واقعہ نہیں مانا جاسکتا جو اس وقت تک محض قیاس آرائی کا ممکن نہیں۔''

(ادبی تحقیق مسائل وتجزیہ)

کاروبارِ تحقیق کے یہی مسائل تھے جن کی وجہ سے ایک حلقے میں وہ ناپسندیدہ رہے۔ ایک صاحب نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ انگریزی تعلیم کی محرومی نے انھیں احساسِ کمتری میں مبتلا کردیا تھا۔ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ مدرسہ بحرالعلوم شاہ جہاں پور کے اس طالب علم نے ان سب کو احساسِ کمتری میں مبتلا کردیا تھا جو مستند ہے میرا فرمایا ہوا، کے زعم میں پشتارۂ اغلاط لیے کتابوں کے ڈھیر لگاتے چلے جارہے تھے۔ دیوانِ غالب صدی اڈیشن کا یہ تبصرہ ایسے تمام محققین ودانش وروں پر صادق آتا ہے جس میں رشید حسن خاں نے اس قسم کے محققین پر حرف گیری کرتے ہوئے لکھا ہے:

''متعارف حضرات کی تالیفات نو واردانِ بساطِ تحقیق وتدوین کے لیے مثال ومعیار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر انھیں حضرات کی تالیفات کا یہ حال ہے کہ کوئی صفحہ کسی نہ کسی طرح کی غلطی خامی یا ناتمامی سے خالی نہ ہو تدوین کے اصولوں کا فقدان نظر آئے، معمولی معمولی مسائل میں الجھاوے موجود ہیں اور اہم امور بے نیازی کے بوجھ تلے دب کر رہ گئے ہیں، اس صورت میں ایسی تالیفات کے جو اثرات ہوں گے ان کا اندازہ کرنا کچھ مشکل کام نہیں۔ کم فرصتی ہمارے اکثر اساتذہ کا ضمیمہ بن کر رہ گئی ہے اور اس کی وجہ اکثر خرابیاں ضرور آتی ہیں۔ ستم یہ کہ یہ حضرات بیک وقت کئی کام اور کئی طرح کے کام انجام دینا چاہتے ہیں مگر مجبوری یہ ہے کہ تحقیق میں شرک کی گنجایش نہیں اور ''ہزار شیوگی'' اس کو راس نہیں آتی۔''

رشید حسن خاں کو جو بات دوسرے محققین سے زیادہ اعتبار بخشتی ہے وہ ان کی انتھک محنت اور خوب سے خوب تر کی تلاش ہے۔ فسانۂ عجائب کی تدوین ہو یا کلیاتِ جعفر زٹلی کی ترتیب، انھوں نے ہمیشہ اسی معیار کو مدِّنظر رکھا جو تحقیق اور اصولِ تحقیق کے مطابق ہو۔ آٹھ دس برس فسانۂ عجائب پر محنت کرنے کے بعد جب انھیں ایک اور نسخے کا پتا چلا تو انھوں نے نئے سرے سے فسانۂ عجائب کی تدوین کا آغاز کیا۔ اپنی آٹھ برس کی محنت کو رد کرکے انھوں نے یہ ثابت کردیا کہ تحقیق کے لیے جو کھم اُٹھانا ہی معیارِ تحقیق ہے۔ ان کے بقول:

''علمی کارنامے اس طرح وجود میں نہیں آتے کہ کاتا اور لے دوڑی۔''

ان کی نظر میں ہر وہ محقق جو تسامحات کو نظرانداز کرتا ہے دراصل وہ اصولِ تحقیق سے پہلو بچاتا ہے۔ کیوں کہ آگے چل کر یہی تسامحات مسلمات کی حیثیت اختیار کرلیتے ہیں اور پھر ساری تحقیق انہی کی بنیاد پر تحقیقی معیار کا درجہ حاصل کرلیتی ہے۔ تحقیق کے طریقِ کار پر بحث کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے۔

''حقائق کی بازیافت تحقیق کا مقصد ہے۔ اس کو یوں بھی کہا گیا ہے کہ ''تحقیق کسی امر کو اس کی اصلی شکل میں دیکھنے کی کوشش ہے۔'' (قاضی عبدالودود) اس کے لیے یہ ماننا ہوگا کہ حقیقت واقعہ (یا اصل مشکل) بہ ذاتِ خود موجود ہوتی ہے، خواہ معلوم نہ ہو۔ اسی بنا پر یہ بات بھی ماننا ہوگی کہ ایسی رائیں جو تاویل وتعبیر پر مبنی ہوں، واقعات کی مرادف نہیں ہو سکتیں۔ کیوں کہ وہ فی نفسہ کسی امر کی اصلی شکل نہیں ہوتیں۔ تعبیرات پر حقائق کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا۔ یہی صورت قیاسات کی ہے۔ کسی امر کی اصلی شکل کا تعین اس وقت ہوگا جب اس کا علم ہو۔ یہ صحیح ہے کہ کسی چیز کا معلوم نا ہونا، اس کے نا ہونے کی دلیل نہیں ہوسکتا لیکن ادبی تحقیق میں کسی امر کا وجود بہ طور واقعہ اسی صورت میں متعین ہوگا جب اصولِ تحقیق کے مطابق اس کے متعلق معلومات ہوں۔''

وہ محققین کو بار بار توجہ دلاتے رہے کہ حقائق کی بازیافت تحقیق کا اصل مقصد ہے۔ ان کے اس ''سچ'' سے محققین کی ایک جماعت ہمیشہ ان سے ناراض رہی لیکن کسی نے یہ نہ سوچا کہ ان کی تنقید صرف اس لیے ہے کہ:

''آج کل علم وادب میں جس طرح اسیری کے جال بچھائے گئے ہیں، گروپ بندی نے جس طرح دائرے بنائے ہیں اور دانش گاہوں میں جس انداز میں تحقیقی مقالوں کے نام پر کم سوادی کے اعلاترین نمونے تیار کیے جارہے ہیں اس کا تقاضا ہے کہ تحقیق اپنی صاف بیانی کے دائرے کو وسیع کرے۔ سچ واقعتاً کڑوا ہوتا ہے اور تحقیق مقصد سچ کی تلاش ہے۔ اس صورت میں اگر تحقیق نگارشات میں سچ کی تلخی شامل ہو تو اس کی شکایت نہیں کرنی چاہیے۔''

انتخابِ ناسخ میں انھوں نے لکھا ہے۔ ''یہ ایک ایسے شخص کا کلام ہے جس نے پورے عہد کو متاثر کیا۔'' میری نظر میں ان کی تحقیق بھی اسی حقیقت کی ترجمان ہے۔ ایک عہد ساز محقق ہونا رشید حسن خاں کا

طرۂ امتیاز ہے۔اس میں کوئی ان کا شریک نہیں۔ایک محقق کے طور پر جب تک رشید حسن خاں کا نام باقی ہے ان کا یہ دعوا بھی باقی رہے گا ؎

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

(شیفتہ)

(ماہ نامہ، نیا دور لکھنؤ، جلد 62، نمبر 9، دسمبر 2007، صفحہ 13 تا 16)

○○○

ڈاکٹر خالد حسین خاں

محققِ یگانہ رشید حسن خاں

چمپئی رنگ جو عالم شباب میں سُرخ وسفید رہی ہوگی، بھرا بھرا جسم، کشیدہ قامت، چوڑا چکلا سینہ، اونچی ستواں ناک، (جو پورے شاہ جہاں پور کی ناک ہے) کشیدہ جبیں، سر پر سلیقے سے سنورے بال، جن پر بیتے موسموں کی برف نمایاں ہے۔ دبیز شیشوں والے چشمے کے پیچھے غور وفکر اور خلوص سے مزین عقابی آنکھیں، پُر وقار متبسم کتابی چہرہ، صحت تلفظ کا وہ عالم گویا لفظوں کو ہمہ وقت پرکھتے رہتے ہوں ۔زبان وبیان کی کلاسیکی روایات کے امین، تحقیق وتدوین کے مردِ میدان تہذیب وشائستگی اور شاہ جہاں پور کے افغانی جلال و جمال کی جو شخصیت ہمارے روبرو آتی ہے وہ ہیں جناب رشید حسن خاں۔

ارضِ شاہ جہاں پور عہد قدیم سے علما، فقہا اور شعرا کی سرزمین رہی ہے۔ ہر زمانے میں یہاں ایسے باکمال لوگ پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے اپنی گراں مایہ علمی وادبی کاوشوں سے شاہ جہاں پور اور اہلِ شاہ جہاں پور کا نام ادبی دنیا میں خوب روشن کیا۔

جب جب شاہ جہاں پور کی ادبی روایات اور تحقیق وتنقید کے معیار ومیزان کا ذکر آئے گا تو جو نام زیادہ روشن تاب ناک اور سرِ فہرست دکھائی دے گا، وہ نام بلاخوف تردید، رشید حسن خاں کا ہے۔ یہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ گذشتہ نصف صدی سے ادبی تحقیق وتنقید کے میدان میں جو آواز زیادہ بلند، جو لہجہ زیادہ منفرد اور جو نام زیادہ نمایاں ہے وہ جناب رشید حسن خاں کا ہے۔ رشید حسن خاں نے برِ صغیر کی پوری ایک نسل کی ذہنی تربیت میں میر کارواں کا فریضہ انجام دیا ہے۔ یہ اپنے مخصوص طرزِ فکر، اپنے تحقیقی مطالعے اور ان سے استنباط شدہ نتائج کو اپنے دل نشیں اسلوب میں یوں پیش کرتے ہیں کہ قارئین ان کے ہم نوا ہو جاتے ہیں۔ بایں ہمہ ان کی سیرت کا ایک دوسرا پہلو بھی قابل ذکر ہے کہ اپنی کھردری صاف گوئی اور بے لچک رویے کے باوصف رشید حسن خاں کی شخصیت میں اعتدال وموزونیت کی خوبی بھی قابل رشک ہے۔ ان کے شب وروز کے نظام الاوقات ہوں یا ان کی تحریر وتقریر کی ادبی سرگرمیاں ان میں کہیں بھی بے ترتیبی یا غیر موزونی کا عمل دخل نہیں۔

رشید حسن خاں نے تحقیق وتنقید کے میدان میں اپنی بے پناہ تخلیقی ذہانت اور غیر معمولی مطالعہ سے اخذ کردہ نتائج کو اپنے شگفتہ اسلوب میں جس طرح پیش کیا ہے اور میدانِ تحقیق کے جتنے مفروضوں اور بتوں کو توڑا ہے، یہ کارنامہ بہ ذاتِ خود اپنی جگہ ایک داستان ''طلسم ہوشربا'' ہے۔ اسی سبب دُنیائے اُردو کی بیش تر قد آور ہستیوں نے ان کو بجا طور پر خراجِ تحسین اور کلماتِ آفرین پیش کرنے میں کسی بخل سے کام نہیں لیا۔ موصوف کا یہ حوصلۂ بُت شکنی یوں ہی منصۂ شہود پر نہیں آیا۔ اس کے پیچھے برسہا برس کی ژرف نگاہی، جگر کاوی اور روز وشب کا عمیق مطالعہ شامل رہا ہے اُردو املا کا معاملہ ہو یا زبان وقواعد کے پیچیدہ مسائل یا ادبی تحقیق کے اصول ونظریات، رشید حسن خاں کی شخصیت ہر جگہ ممتاز نظر آتی ہے۔ ان کے مضامینِ تحقیق وتنقید کا عمیق مطالعہ ہمارے ذہن کو نہ صرف متاثر کرتا ہے بل کہ اکثر چونکاتا بھی ہے اور ہمیں یہ بصیرت افروز آگہی بھی دیتا ہے کہ تحقیق کس چیز کا نام ہے اور تنقید وتدوین کسے کہتے ہیں۔ انھوں نے ہر جگہ اور ہر موقع پر تحقیق کی جداگانہ حیثیت پر بہت زور دیا ہے اور دونوں کو علاحدہ حیثیت سے جانچنے، پرکھنے اور برتنے پر واضح اور واشگاف انداز میں زور دیا ہے۔ تحقیق کے ذیل میں وہ یوں رقم طراز ہیں:

> ''ادبی تحقیق میں کسی امر کا وجود بطورِ واقعہ اس صورت میں متعین ہوگا جب اصولِ تحقیق کے مطابق اس کے متعلق معلومات حاصل ہوں۔ تحقیق ایک مسلسل عمل ہے۔ نئے واقعات کا علم ہوتا رہے گا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کون سی حقیقت کتنے پردوں میں چھپی ہوئی ہے۔ اکثر صورتوں میں یہ ہوتا ہے کہ حجابات بتدریج اٹھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ تحقیق میں اصلیت کا تعین اس وقت تک کی حاصل شدہ معلومات پر مبنی ہوتا ہے۔''

(ادبی تحقیق مسائل وتجزیہ، رشید حسن خاں، ص:9)

رشید حسن خاں کا مزاج اور ضمیر دورنگی کو قطعاً پسند نہیں کرتا۔ وہ اپنی ادبی تنقید یا تحقیقی مضامین میں واضح، دوٹوک اور بے لچک فیصلہ کرنے میں کسی طرح کی رورعایت روا نہیں رکھتے۔ ان کا یہ تحقیقی اندازِ فکر ایک پختہ کار محتسب جیسا ہے۔ یہ زہر ہلاہل کو بھی قند نہیں کہہ سکتے۔ یہ احتساب، یہ بے لچک رویہ، یہ دوٹوک اندازِ نظر پروفیسر محمود شیرانی، قاضی عبدالودود اور امتیاز علی خاں عرشی جیسے اکابر محققین سے بتدریج منتقل ہوتا ہوا رشید حسن خاں تک پہنچا ہے۔ رشید حسن خاں اس معاملہ میں مذکورہ بزرگوں کی روایت کے سچے امین نظر آتے ہیں۔ یہ اپنے علمی احتساب اور تحقیقی صاف گوئی کے عمل کو ایک ناگزیر تقاضہ تصور کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا یہ بیان حقیقت حال کی بہ خوبی عکاسی کرتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

''اس زمانے میں پہلے کے مقابلے میں زیادہ صفائی اور زیادہ شدت کے ساتھ احتساب کی ضرورت کو محسوس کیا گیا اور اس پر عمل بھی کیا گیا ہے۔''

(ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ، رشید حسن خاں، ص:106)

رشید حسن خاں کے قول وفعل میں تضاد کی بالکل گنجایش نہیں، انھوں نے بے لچک رویے کو اپناتے ہوئے وضع داریوں، مصلحتوں اور مروتوں کو اپنے قریب نہیں آنے دیا۔ ان کے تحقیقی مضامین ہوں، ادبی تنقیدیں ہوں یا ان کے تحقیقی تبصرے، یہ روش ہر جگہ یکساں اپنائی گئی ہے۔ ان کے عالمانہ مضامین اور محققانہ تبصروں نے اہلِ نظر کو نہ صرف متوجہ کیا بل کہ سہل نگار تنقید نگاروں کو متنبہ بھی کیا ہے کہ وہ تحقیق و تنقید میں غلط فہمیوں یا خوش فہمیوں کے جال میں نہ پھنسیں اور تنقیص نگاری یا عقیدت کے جوش میں ہوش نہ کھو بیٹھیں۔

رشید حسن خاں کی بُت شکنی کے بہت سے واقعات راقم الحروف کو یاد آرہے ہیں۔ مثلاً 1954 میں جب فیضؔ کی مقبولیت وشہرت بامِ عروج پر تھی، اس وقت رشید حسن خاں نے ''فیضؔ کی شاعری کے چند پہلو'' میں زبان وبیان کی غلطیوں کی جانب عوام وخواص کی توجہ مبذول کرائی تھی۔ بعد 1963 میں علی سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، مخدوم محی الدین، خورشید الاسلام اور مجروح سلطان پوری کے کلام میں زبان وبیان کی غلطیوں کی دوٹوک، مدلل اور واضح اسلوب میں یوں نشان دہی کی کہ حسن وبیان اور فصاحت کلام کی جملہ خصوصیات بھی بہ درجۂ اتم قائم رہیں۔ گرچہ ان مضامین کا ردِ عمل بھی شدید ہوا اور رشید حسن کاں کو Anti Critic یا منفی نقاد جیسے خطابات سے نوازا گیا۔ لیکن آج ایک عرصہ گزر جانے کے بعد عوام وخواص دونوں میں ان کی مقبولیت، شہرت کے باوجود رشید حسن خاں میں ریاکارانہ دبدبہ اور مصنوعی وقار بالکل نہیں۔ وہ عموماً مشتعل نہیں ہوتے کسی غیر معقول سوال یا بے جا تنقید بل کہ شخصی تنقید پر چیں بہ جبیں نہیں ہوتے بل کہ وہ ایسی طفلانہ خفیف الحرکاتی پر ایسے شگفتہ لب ولہجے میں اور اتنی نرمی سے جواب دیتے ہیں کہ سادہ لوح مخاطب اور پوری محفل زعفران زار ہو جاتی ہے۔ رشید حسن خاں کی سیرت وکردار کا یہ وصفِ خاص ان کی عالمانہ شانِ بے نیازی کا عطیہ ہے۔

بہ حیثیت محقق رشید حسن خاں کا ایک اور مہتم بالشان کارنامہ ان کی ایڈٹ کی ہوئی کتاب ''فسانۂ عجائب'' ہے۔ جو حال ہی ہندو پاک سے بیک وقت شائع ہو کر منظرِ عام پر آئی ہے۔ اس گراں قدر کتاب کی اہمیت وافادیت کا اندازہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ موصوف نے اس کی تدوین میں عمرِ عزیز کے آٹھ بیش بہا سال صرف کیے ہیں۔ ''دیوانِ غالبؔ'' مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی کے بعد یہ دوسرا وقیع کارنامہ ہے جسے بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس کتاب کی مقبولیت میں رشید حسن خاں کی دیدہ وری اور عرق ریزی کے ساتھ ہی ان کے خونِ جگر کی کشید بھی شامل ہے۔ گذشتہ تین دہائیوں سے وہ جس پائے کی اُردو تنقید وتحقیق کے طالب رہے ہیں اس کا معیاری نمونہ وہ ''فسانۂ عجائب'' میں پیش کر کے یہ ثابت کر چکے ہیں کہ متنی تدوین نقطۂ عروج کیا ہے؟ ''فسانۂ عجائب'' جیسے وقیع کام کے بعد ادبی دُنیا کو ان کے دوسرے زبردست کارنامے میر امنؔ کی ''باغ وبہار'' کی اشاعت کا شدت سے انتظار ہے، جس کو انھوں نے تقریباً بارہ سال کی محنت شاقہ اور دیدہ ریزی کے بعد پایۂ تکمیل کو پہنچایا ہے۔

گذشتہ سال رشید حسن خاں کی علمی، ادبی، تنقیدی اور تحقیقی خدمات بالخصوص ان کے عظیم الشان کارنامے ''فسانۂ عجائب'' کی مہتم بالشان تحقیق وتدوین پر مہاراشٹر اُردو اکادمی نے تیس ہزار روپیہ کے گراں قدر ''نیشنل ایوارڈ'' سے نوازا۔ انعام کی منعقدہ تقریب سے دو یوم پیش تر رشید حسن خاں کو شدید قلبی دورے سے دوچار ہونا پڑا جس کو فضل ربی سے انھوں نے نہایت پامردی سے برداشت کیا۔ ڈاکٹروں نے انھیں 6/ماہ تک مکمل آرام کا مشورہ دیا۔

آخر میں مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ رشید حسن خاں کی ذات والاصفات نہ صرف اُردو ادب کے لیے بل کہ میرے وطن عزیز کے لیے بھی باعث فخر ومباہات ہے۔ یہ ہماری خوش بختی ہے کہ ہمارے درمیان ایسی نادرہ کار اور یگانۂ روزگار شخصیت موجود ہے جس پر نہ صرف ہمیں بل کہ اور تنقید وتحقیق دونوں کو ناز ہے۔ بقول محمورؔ سعیدی:

سب سروں میں ہم ممتاز سے تو
مختلف سب سے کائنات تری

نوٹ: نام ور محقق اور تدوین نگار، رشید حسن کاں مرحوم کو ''نیشنل ایوارڈ'' سے نوازے جانے کے اعزاز میں ''بزمِ سحرؔ شاہ جہاں پور'' کی جانب سے 27 جون 1991 تقریباً بیس برس پہلے، جشنِ تہنیت منعقد کیا گیا تھا، جس میں شہر اور بیرونِ شہر کے اُردو کے اکابرین کی ایک کثیر تعداد نے شرکت کی تھی، اسی یادگار تقریب میں راقم السطور نے یہ مضمون پڑھا تھا۔

اس مضمون کی اشاعت کے بعد رشید حسن خاں مرحوم کی جعفر زٹلی، مثنویاتِ شوقؔ، ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی، دہلی کی آخری شمع، مصطلحاتِ ٹھگی، کلاسیکی ادب کی فرہنگ وغیرہ متنی تنقید کا ایسا گنج ہائے گراں مایہ ادبی سرمایہ اور لازوال کارنامہ ہے جو رشید حسن خاں مرحوم کے نام، کام اور مقام کو سدا زندہ رکھے گا۔

(ادبی تحریریں، ڈاکٹر خالد حسین خاں، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2011، صفحہ 57 تا 61)

○○○

انوارالحسن وسطوی

رشید حسن خاں: ایک دیدہ ور محقق

اُردو کے بے باک ناقد، نامور محقق اور منفرد ماہر لسانیات رشید حسن خاں مرحوم میدانِ علم وادب کے ایسے نابغۂ روزگار تھے جن کی مثال اس دور میں کم یاب ہی نہیں نایاب بھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان سے موازنہ کے لیے فی الحال اُردو دُنیا میں کوئی دوسرا نام موجود نہیں ہے۔ موصوف نے اپنی ذاتی دل چسپی، لگن جستجوئے علم اور ذوقِ مطالعہ کے بل پر علم وادب کے وہ مدارج طے کیے جو کم ہی لوگوں کو نصیب ہوتے ہیں۔ بہ حیثیت محقق، رشید حسن خاں کا نام حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، امتیاز علی خاں عرشی جیسے مایہ ناز محققین کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ ایک تنقید نگار کی حیثیت سے بھی ان کا مقام بہت بلند ہے۔ ان کی دو کتابیں ''تلاش وتعبیر'' اور ''تفہیم'' ان کی تنقیدی بصیرت کی آئینہ دار ہیں۔ ایک بے لاگ، حق گو اور غیر جانب دار نقاد کی حیثیت سے وہ اپنے معاصرین میں نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔ بہ حیثیت ماہرِ لسانیات، ان کی خدمات وقیع اور ناقابلِ فراموش ہیں۔ صحتِ زبان کے مسائل پر جس عرق ریزی سے کام کیا ہے، اس کا اعتراف ان کے مخالفین بھی کرتے ہیں۔ حالیہ پچاس برسوں میں تلفظ، املا اور محاورے کی صحت کا جو اہتمام والتزام کیا جانے لگا ہے، اس میں رشید حسن خاں کی کوششوں کا بڑا ہاتھ ہے۔

تقریباً بیس (20) کتابوں کے مصنف اور مرتب جناب رشید حسن خاں کی تاریخ ولادت تعلیمی اسناد کے مطابق 10 جنوری 1930 ہے لیکن ان کی مختصر خودنوشت کے مطابق ان کی سنہ پیدائش 1925 ہے۔ رشید حسن خاں نے درسِ نظامی کی تعلیم مدرسہ بحرالعلوم شاہ جہاں پور میں حاصل کی۔ کچھ دنوں اسلامیہ ہائر سکینڈری اسکول شاہ جہاں پور میں اُردو فارسی کے استاد کی حیثیت سے کام کیا۔ 1959 میں دہلی آگئے اور دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو سے وابستہ ہوگئے۔ انھوں نے یہیں سے ملازمت سے سبک دوشی حاصل کی۔ خاں صاحب کے علمی تجسس اور تحقیقی مزاج نے انھیں علم وادب کے میدان کا وہ شہسوار بنادیا جس کی مثال اس دور میں نہیں ملتی۔ حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود اور امتاز علی خاں عرشی جیسے محققین کی روایت کے امین کہلانے والے رشید حسن خاں نے اُردو زبان وادب کی جو خدمات انجام دیں انھیں تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ ''اُردو املا''، ''اُردو کیسے لکھیں''، ''زبان اور قواعد''، ''عبارت کیسے لکھیں''، اور ''املاے غالب'' ان کی وہ کتابیں ہیں جو ان کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔ ''فسانۂ عجائب''، ''باغ وبہار''، ''مثنویاتِ شوق''، ''مثنوی سحرالبیان''، ''مثنوی گلزارِ نسیم''، ''زٹل نامہ'' اور ''مصطلحاتِ ٹھگی'' کے متن کی سائنٹفک انداز میں تدوین بھی ان کا بڑا کارنامہ ہے۔ آخری دنوں میں خاں صاحب کلاسیکی ادب کا لغت تیار کر رہے تھے اور اس کے تقریباً آٹھ سو (800) صفحات کمپوز بھی ہوگئے تھے لیکن 26 فروری 2006 کی صبح ساڑھے تین بجے ان کی اچانک وفات ہوجانے کے سبب ان کا یہ پروجیکٹ نامکمل رہ گیا۔

رشید حسن خاں کا خاص موضوع ادبی تحقیق ہے۔ یہ امر مسلم ہے کہ تحقیق بڑا مشکل اور ضبط وتحمل کا کام ہے۔ جذبات، تاثرات اور ذاتی پسند اور ناپسند کی اس میں کوئی گنجایش نہیں۔ اس کے علاوہ یہ گہرے مطالعے اور علمی بصیرت کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس میں صبر کا دامن ذرا ہاتھ سے چھوٹا اور عجلت میں کوئی فیصلہ ہوا تو وہیں غلطی سرزد ہوجاتی ہے۔ رشید حسن خاں تحقیق کے معاملے میں قاضی عبدالودود کی طرح کسی مروّت یا رعایت کے قائل نہیں۔ وہ کسی بھی سلسلے میں جب تک سارے شواہد جمع نہ کرلیں، قلم نہیں اُٹھاتے۔ وہ تدوین متن کے سلسلے میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی کو اپنا استادِ معنوی مانتے ہیں۔ انھوں نے مولانا عرشی کے علاوہ قاضی عبدالودود، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور حافظ محمود شیرانی سے بھی استفادہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''میں نے تحقیق کے اصول اور آداب سیکھے حافظ محمود شیرانی کی تحریروں سے، اس کے بعد قاضی عبدالودود اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی سے استفادہ کیا اور سب سے اخیر میں مولانا عرشی مرحوم سے فیض پایا۔ لیکن سب سے پہلے تحقیق کی طرف متوجہ کیا نیاز فتح پوری کی تحریروں نے۔ ان تحریروں نے تحقیق کی ضرورت کا احساس دلایا اور اس کی اہمیت سے آشنا کیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس ذہنی کش مکش سے دوچار کیا جو مکمل تسکین اور کامل یقین کا مطالبہ کرتی ہے اور اس تشکیک سے ذہن کو آشنا کیا جو تحقیق کی بنیاد ی ہے۔''
>
> (تفہیم ،ص 180)

رشید حسن خاں کے تحقیقی مضامین جو رسائل میں وقتاً فوقتاً شائع ہوئے، ان کے دو مجموعے ہیں: (1) ''ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ اور (2) ''تدوین، تحقیق، روایت''۔ ان کی شہرت ان کی تحریر کردہ اس معرکتہ الآرا تبصرہ سے ہوئی جو انھوں نے علی گڑھ تاریخ ادب اُردو کی جلد اوّل پر کیا تھا۔ ان کا یہ تبصرہ جب شائع ہوا تو اس کتاب کی تمام جلدیں بازار سے واپس منگوالی گئیں اور یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن نے اس پوری اسکیم ہی کو ختم کر دیا۔ واضح ہو کہ علی گڑھ تاریخ ادب اُردو کے مدیران میں اس وقت کے نامور ادیب و ناقد پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر مجنوں گورکھپوری جیسے لوگ تھے۔ خاں صاحب کے اس تبصرے نے ان کی شہرت کو بامِ عروج پر پہنچا دیا اور وہ ایک بڑے محقق کی حیثیت سے اُردو دنیا میں تسلیم کیے جانے لگے۔ ان کا دوسرا بڑا کارنامہ ان کا وہ تبصرہ ہے جو انھوں نے ''دیوانِ غالب'' مرتبہ مالک رام پر کیا تھا۔ مالک رام ماہرِ غالبیات میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ 1969 میں غالب صدی کمیٹی نے ان کا مرتب کردہ ''دیوانِ غالب'' شائع کیا تھا۔ رشید حسن خاں نے اس پر طویل تحقیقی تبصرہ کر کے یہ ثابت کر دیا کہ بہت سے اشعار کا متن ہی درست نہیں ہے۔ اس تبصرے کے بعد اس دیوان کی قدر و قیمت ہی ختم ہو گئی۔ خاں صاحب کا تیسرا بڑا کام ترقی اُردو بورڈ، پاکستان کا شائع کردہ اُردو لغت کی جلد اوّل پر تبصرہ ہے۔ خاں صاحب نے پاکستان کے سرکاری ادارہ سے چھپی ہوئی اس لغت کی پہلی جلد پر تبصرہ کر کے یہ بتایا کہ اس کے اکثر مندرجات غلط ہیں۔ اس تبصرہ کی شہرت و مقبولیت بہت ہوئی اور لغت کے چیف اڈیٹر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کو اپنی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا۔

رشید حسن خاں زندہ لوگوں کو موضوعِ تحقیق بنانے کے بالکل خلاف تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ جو شخص زندہ ہے، وہ صاحبِ حیثیت اور صاحبِ اقتدار ہوتا ہے یا کسی بھی حیثیت سے وشہرت رکھتا ہے۔ اس کے متعلق آپ صحیح بات معلوم کر سکیں یا معلوم ہو جائے تو اس کو کہہ بھی سکیں، یہ مشکل ہے۔ ان کا یہ بھی ماننا تھا کہ جس طالب علم نے کسی زندہ شخص کو موضوعِ تحقیق بنایا وہ ہمیشہ کے لیے آسان پسندی کا خوگر ہو جاتا ہے۔ زندہ لوگوں کو موضوعِ تحقیق بنانا ایک ایسا عمل ہے جو ایک طرف تو طالب علم کو تحقیق کے حقیقی مقاصد سے بے خبر کر کے اسے آسان پسندی کا خوگر بناتا ہے اور ہمیشہ کے لیے اس کو اعلا نقطۂ نظر سے محروم کر دیتا ہے۔ اس غیر حقیقی عمل سے خود تحقیق بے آبرو ہو کر رہ جاتی ہے اور یہ ادب میں تباہی کی نشانی ہے۔

رشید حسن خاں نے اس بات پر بھی بجا طور پر زور دیا ہے کہ تحقیق کی زبان صاف، سادہ اور دوٹوک ہونی چاہیے۔ ان کے نزدیک تحقیق، دلائل اور ثبوت کی بنیاد پر مروجہ حقائق کے ردّ و قبول اور نئے حقائق کی دریافت کا عمل ہے۔ خاں صاحب نے اپنی تقریر و تحریر دونوں میں بارہا اس بات پر زور دیا ہے کہ اگر چہ ادبی تحقیق کا تعلق براہ راست ادب سے ہے لیکن تحقیق کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ایسی ہی لچھے دار زبان میں گفتگو کرے جیسی ''سحر البیان''، ''گلزارِ نسیم''، ''فسانۂ عجائب'' اور ''باغ و بہار'' جیسی تخلیقات میں استعمال ہوئی ہے۔ تحقیق کی زبان کے متعلق رشید حسن خاں نے لکھا ہے:

''تحقیق کی زبان کو امکان کی حد تک آرایش اور مبالغے سے پاک ہونا چاہیے اور صفاتی الفاظ کے استعمال میں بہت زیادہ احتیاط کرنا چاہیے۔ اُردو میں تنقید جس طرح انشا پردازی کا آرایش کدہ بن کر رہ گئی ہے، وہ عبرت حاصل کرنے کے لیے کافی ہے اور تحقیق کو اس حادثہ کا نشانہ نہیں بننے دینا چاہیے۔''

(ادبی تحقیق، ص14)

تحقیق اور تنقید رشید حسن خاں کے دو خاص میدان ہیں۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ اعلا پایے کی تحقیق اور تنقید کے نمونے ہمارے سامنے پیش کیے بل کہ تحقیق اور متنی تنقید کے اصول و ضوابط پر کتابیں بھی لکھیں۔ اس طرح وہ تحقیق اور عملی تنقید دونوں کے مردِ میدان ہیں۔ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ بعض لوگ تھیوری کے تو بڑے ماہر ہوتے ہیں لیکن عملی طور پر جب وہ خود کچھ کرنے بیٹھتے ہیں تو کوئی مثالی کارنامہ انجام نہیں دے پاتے۔ دوسری طرح کے لوگ وہ ہیں جو خداداد صلاحیت کے بل پر اچھا کام تو سرانجام دے لیتے ہیں لیکن نئے کام کرنے والوں کی تربیت کی صلاحیت ان میں نہیں ہوتی۔ رشید حسن خاں کا امتیاز یہی ہے کہ دونوں محاذوں پر کامیاب ہیں۔ ان کی انفرادیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے ذاتی تعلقات پر اپنے تنقیدی افکار اور تحقیقی خیالات کی پرچھائیں بھی نہیں پڑنے دیتے۔ جب قلم ان کے ہاتھ میں آجاتا ہے تو وہ ذاتی تعلقات کو بھول جاتے ہیں۔ لکھتے وقت وہ کسی مصنف یا شاعری کی شہرت اور اونچے منصب سے بالکل مرعوب نہیں ہوتے۔ دنیا جانتی ہے کہ انھوں نے اُردو ادب کے کیسے کیسے بتوں کو توڑ دیا۔ ان کے اعتراضات کا جواب لکھنے کی طاقت کسی میں نہ ہو سکی۔

تحقیق و تنقید کے علاوہ رشید حسن خاں صحتِ زبان کے معلم لاثانی تھے۔ ان کا ایک یادگار کارنامہ نئی نسل کو صحیح اُردو بولنے، لکھنے اور پڑھنے کا قاعدہ اور سلیقہ سکھانا تھا۔ کسی لفظ کا صحیح املا کیا ہے یا کیا ہونا چاہیے یا کسی لفظ کا صحیح تلفظ کیا ہے، اس سلسلے میں رشید حسن خاں کی رہ نمائی قابلِ تحسین ہے۔ اسکول اور کالج کے طالب علموں کو زبان و بیان کے مسائل سکھانے کی طرف ہمارے محققین اور لسانیات کے ماہرین نے کوئی توجہ نہیں کی۔ ان کے مخاطب عموماً بڑے لوگ ہی رہے ہیں لیکن رشید حسن خاں نے ابتدائی درجات کے طلبا کی رہ نمائی کی غرض سے ''اُردو کیسے لکھیں''، ''عبارت کیسے لکھیں'' اور ''انشا اور تلفظ'' جیسی عمدہ کتابیں تصنیف کیں۔ اپنی ان کتابوں کے ذریعے انھوں نے طلبا کو اُردو بولنے، لکھنے اور پڑھنے کا قاعدہ بھی سکھایا اور ان غلطیوں کی نشان دہی بھی کی جو عام طور پر تحریر اور گفتگو میں راہ پا جاتی ہیں۔ واقعی یہ کتابیں آج کی نئی نسل کے لیے بیش بہا نعمت ہیں۔ انھوں نے ان کتابوں کے علاوہ مذکورہ مسائل پر بچوں کے ماہ نامہ ''اُمنگ'' اور ''پیامِ تعلیم'' میں بھی کثرت سے مضامین لکھے اور اس طرح انھوں نے طلبا اور نوجوانوں میں طلبِ علم اور صحتِ زبان کا ذوق پیدا کرنے کی پوری کوشش کی۔

رشید حسن خاں کو اُردو ادب سے غیر معمولی محبت تھی اور اس کے فروغ و ارتقا کے لیے انھوں نے جتنی کاوشیں کیں، وہ تاریخ کا ایک اہم حصہ ہو چکی ہیں۔ انھوں نے اپنی درازیٔ عمر کے باوجود زندگی کی آخری سانس تک اُردو ادب کی ترقی کے لیے کام کیا اور اپنے مشن کو اس منزل تک پہنچایا جو دوسروں کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ رحلت کے بعد ان کی جگہ لینے والا اب کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ جناب شمس الرحمٰن فاروقی کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ۔

''اُن جیسا عالم اور ادیب کئی دہائیوں تک پیدا نہیں ہو گا۔''

(ریڈیو نشریہ ''آل انڈیا ریڈیو، پٹنہ)

(رشحاتِ قلم، انوار الحسن وسطوی، ناشر، الہدیٰ ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ، حاجی پور (ویشالی) 2011، صفحہ 58 تا 62)

OOO

ڈاکٹر سید قمر صدیقی

رشید حسن خاں اور ’ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ‘ ایک مطالعہ

اُردو میں ادبی تحقیق کو معیار و اعتبار بخشنے والوں میں رشید حسن خان کا نام اور قد نمایاں معلوم ہوتا ہے۔ رشید صاحب کا خاص میدان تحقیق و تدوین ہے۔ انہوں نے جہاں تحقیقی مضامین اور تبصرے لکھے، قابل ذکر متون کو مدون کیا، وہیں انہوں نے اصول تحقیق اور اس کے مسائل سے بحث بھی کی ہے۔ ’’ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ‘‘ اسی نوعیت کی ایک کتاب ہے، جس میں رشید صاحب نے تحقیق کے اصول، طریقۂ کار اور اس کے مسائل پر جامع گفتگو کی ہے۔ تین سو پچاس صفحے کی یہ کتاب، ترتیب مضامین کے اعتبار سے دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ تحقیق کے اصول و نظریات نیز اس کے مسائل سے متعلق ہے۔ اس حصے میں کل پانچ مضامین شامل ہیں:

1۔ کچھ اصول تحقیق کے بارے میں

2۔ غیر معتبر حوالے

2۔ تحقیق سے متعلق بعض مسائل

4۔ تدوین اور تحقیق کے رجحانات

5۔ حوالہ اور صحت متن

دوسرے حصے میں چار مختلف تبصروں کو کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔

پہلے حصے کے پانچوں مضامین ایک دوسرے سے ربط خاص رکھتے ہیں، یعنی ہر دوسرا مضمون پہلے مضمون کی توسیع معلوم ہوتا ہے۔ رشید صاحب نے ان مضامین میں واجب تفصیلات سے اس طرح اور اس قدر کام لیا ہے کہ تحقیق کے تمام اصول و ضوابط قاری پر واضح ہو جاتے ہیں۔

یوں تو رشید صاحب کا ہر مضمون خواہ وہ کسی کتاب کا تحقیقی مطالعہ ہو یا اصول تحقیق و تدوین سے متعلق ہو، وہ تحقیق کے اصولوں کے تحت ہی اپنی بات رکھتے ہیں یا کسی کتاب پر تبصرہ کرتے ہیں، اور دوران تبصرہ یہ بھی واضح کرتے جاتے ہیں کہ تحقیق میں مآخذ، روایت، راوی اور استناد وغیرہ سے متعلق احتیاط لازمی ہے۔ انہوں نے ہمیشہ تعداد پر معیار کو ترجیح دی ہے۔ مذکورہ کتاب کا تعارف کراتے ہوئے ابتدائیہ میں وہ لکھتے ہیں:

> ’’حالات کے زیر اثر تحقیق کو دانش گاہوں میں پناہ گزیں ہونا پڑا ہے اور ایسے ہی حالات کے تحت تحقیق کرنے والوں کی تعداد میں بہت کچھ اضافہ ہوا ہے۔ جب کہیں پناہ گزینوں کا سیلاب آتا ہے تو شہری زندگی میں بہت سے پریشان کن مسائل پیدا ہو جاتے ہیں، یہاں بھی یہی ہوا۔ اس کے علاوہ، عام سماجی زندگی میں جو بے ترتیبی ہے اور جاہ و منصب کی ہوس جس طرح گھیرے میں لیے ہوئے ہے؛ وہی صورت حال علمی اداروں میں بھی رونما ہوتی جا رہی ہے اور اچھے استاد اور اچھے دنیا دار کا فرق گویا اٹھتا جا رہا ہے۔‘‘(۱)

مذکورہ اقتباس سے رشید صاحب کا تحقیقی مسلک واضح ہو جاتا ہے کہ وہ تحقیق کے لیے بے لوثی اور ایمانداری کو ضروری اور جاہ و منصب کے لالچ کو مضر سمجھتے ہیں، اس کے علاوہ موجودہ دور میں جس قدر اور جس طرح کی تحقیقی کتابیں شائع ہو رہی ہیں ان سے وہ نالاں نظر آتے ہیں۔ اپنی اس کتاب کے پہلے حصے میں انہوں نے ان ہی سب باتوں سے بحث کی ہے۔

اس کتاب کا پہلا مضمون ’’کچھ اصول تحقیق کے بارے میں‘‘ مختصر مگر جامع مضمون ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے تحقیق کی تعریف کرتے ہوئے اس کے چند رہنما اصول قائم کیے ہیں۔ تحقیق کا مقصد حقیقت کی بازیافت ہے۔ حقیقت کی بازیافت کے لیے رشید صاحب کے وضع کردہ اصول کچھ اس طرح ہیں:

* تحقیق میں دعوے سند کے بغیر قابل قبول نہیں ہو سکتے۔
* تحقیق کے لیے جن مآخذ سے کام لیا جائے وہ قابل اعتماد ہوں۔ غیر متعین مشکوک اور قیاس پر مبنی نہ ہوں۔
* حتیٰ المقدور بنیادی مآخذ سے ہی استفادہ کرنا چاہیے۔
* واقعہ کا چھوٹا بڑا ہونا اہم اور غیر اہم ہونا، ادبی تحقیق میں کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتا۔ اس لیے کہ ایک واقعہ ایک جگہ کم اہمیت رکھتا ہے مگر دوسری جگہ وہ زیادہ اہم ہو سکتا ہے۔
* روایت سے متعلق چھان پھٹک لازمی ہے کہ راوی کون ہے اور روایت میں منطقی استدلال ہے یا نہیں۔
* تعبیرات کو واقعات نہیں کہا جا سکتا — اور تنقیدی تعبیرات تحقیق کے دائرے میں نہیں آتے۔

* زندہ لوگوں کو تحقیق کا موضوع بنانا غیر مناسب ہے۔ اس لیے کہ انسان جب تک زندہ رہتا ہے، فکر و عمل کی تبدیلیوں سے دوچار ہوتا رہتا ہے۔
* تحقیق میں دنیاداری شرک ہے۔
* حافظے پر تحقیق کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔
* تحقیق کی زبان آرایش اور مبالغے سے پاک ہونی چاہیے۔

دوسرا مضمون ''غیر معتبر حوالے'' ہے۔ رشید صاحب حوالے کو تین درجوں میں تقسیم کرتے ہیں (۱) مستند حوالے (۲) غیر مستند حوالے (۳) مشکوک حوالے۔ ان تینوں طرح کے حوالوں کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''معتبر یا مستند سے مراد یہ ہے کہ وہ حوالہ، اس وقت تک کی معلومات کے مطابق، اعتبار کے اس درجے میں ہو کہ اس سے استدلال کیا جا سکے۔ غیر مستند کو مستند کی ضد سمجھا جائے۔ مشکوک اس حوالے کو کہیں گے جس کے متعلق کوئی بات قطعیت کے ساتھ نہ کہی جا سکے۔'' (۲)

رشید صاحب چوں کہ دوٹوک اور قول فیصل پر یقین رکھنے والے ہیں لہٰذا انھوں نے غیر مستند اور مشکوک حوالوں کو تحقیق کے لیے مضر بتایا ہے۔

تحقیق میں حوالے کی بڑی اہمیت ہے۔ بغیر حوالے کے کوئی بھی نتیجہ، خواہ محقق کا نام کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو قبولیت کی سند نہیں پا سکتا۔ رشید صاحب نے اپنی اس کتاب میں حوالے کی غیر معمولی اہمیت کو قاری اور طالب علموں کے ذہن نشیں کرانے کے لیے متعدد مثالیں دی ہیں۔ انھوں نے حوالے کی مقبولیت کے لیے واقعہ اور روایت کے درمیان زمانی فصل کا نہ ہونا ضروری قرار دیا ہے۔ اگر واقعہ اور روایت کے درمیان کا زمانی فصل زیادہ ہو تو واقعات میں غیر مستند اور مشکوک باتوں کا اندراج بعید از قیاس نہیں۔ دوسری بات یہ کہ راوی اگر موخر ہے تو اس بات کی تحقیق ضروری ہے کہ جو روایت نقل ہوئی ہے وہ بنیادی یا اولین مآخذ سے اخذ ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو اسے قبول کیا جائے گا ورنہ اسے رد کر دیا جائے گا۔ واقعہ اور روایت کے درمیان زمانی فصل کے ہونے سے کیا کیا خامیاں پیدا ہو سکتی ہیں رشید صاحب نے اس کو مختلف مثالوں سے واضح کیا ہے۔ یہاں محض ایک مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

امیر خسرو سے متعلق ہندی اشعار کو شہرت عام حاصل ہے اور سب سے پہلے وجہی نے ''سب رس'' میں امیر خسرو کے ہندی اشعار کو نقل کیا ہے مگر انھوں نے یہ واضح نہیں کیا ہے کہ یہ اشعار انھیں ملے کہاں سے۔ وجہی اور خسرو کے درمیان ایک طویل زمانی فصل ہے، لہٰذا وجہی نے یہ اشعار خسرو کی زبان سے تو نہیں سنے ہوں گے۔ اور اگر کوئی یہ دعوا بھی کرے کہ اس نے براہ راست اپنے کانوں سے سنا ہے، تب بھی وہ قابل قبول نہ ہوگا۔ رشید صاحب اصول تحقیق کی رو سے ایسی روایت کو مسترد کرتے ہیں۔

تیسرا مضمون ''تحقیق سے متعلق بعض مسائل''، چار ذیلی عنوان کے تحت شامل کیا گیا ہے۔ (الف) فارسی مآخذ کے اُردو ترجمے (ب) دانش گاہوں میں تحقیق کے مسائل (ج) تحقیق اور بُل ہوسی (د) علمی منصوبے اور اخلاقیات تحقیق ــــ یہ مضمون پچھلے مضمون کی توسیع ہے۔ پچھلے مضمون میں حوالوں سے متعلق بحث کی گئی ہے۔ اس مضمون میں فارسی مآخذ کے اُردو ترجمے سے پیدا ہونے والی پریشانیوں کا ذکر کیا گیا ہے اور مختلف مثالوں سے یہ بتایا گیا ہے کہ فارسی مآخذ کے اُردو ترجمے سے حتی المقدور بچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ اکثر مترجموں نے فارسی سے عدم واقفیت کی بنا پر متن کے معنی تک کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ لہٰذا تحقیق کرنے والوں کو چاہیے کہ وہ اصل متن سے رجوع کریں۔

دانش گاہوں میں جس طرح کی تحقیق کی جا رہی ہے رشید صاحب نہ صرف اس سے نالاں ہیں بل کہ خوف زدہ بھی ہیں۔ اس لیے کہ اگر صورت حال یہی رہی تو آیندہ مستند اور غیر مستند کا امتیاز ہی مٹ جائے گا۔ رشید صاحب نے یونی ورسٹیوں کو تحقیقی مقالوں کا کارخانہ کہا ہے جہاں دھڑلے سے تحقیقی مقالے لکھے جا رہے ہیں۔ اس شوق یا بل ہوسی نے معیار کو ختم کر دیا ہے۔ دانش گاہوں میں بہت سے ایسے بھی طالب علم ہیں جن کے مزاج کو تحقیق سے کسی طرح کی مناسبت نہیں پھر بھی وہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر رہے ہیں۔ رشید صاحب نے اس کے لیے اساتذہ کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ یہاں رشید صاحب نے اساتذہ، تحقیقی مقالوں کے نگراں پر کھل کر چوٹ کی ہے۔

''تحقیق اور بُل ہوسی'' کے ذیلی عنوان کے تحت رشید صاحب نے اساتذہ کو تحقیقی خلفشار کے لیے ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ عموماً دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ ایک شخص جوڈرامہ یا افسانے میں مہارت رکھتا ہے مگر ہوس نے اس کو تذکروں کے پھیر میں ڈال دیا ہے کہ وہ اس میدان میں بھی کسی سے پیچھے کیوں رہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں جو کارنامہ سامنے آئے گا وہ طومار اغلاط ہی ہوگا۔ تحقیق کے لیے ''وفاداری بہ شرط استواری'' لازم ہے۔ ہوس ہر حال میں نقصان دہ فعل ہے۔ دولت یا شہرت کی ہوس تحقیق میں کفر کی حیثیت رکھتی ہے۔

علمی منصوبے اور اخلاقیات تحقیق سے بحث کرتے ہوئے رشید صاحب نے اجتماعی طور پر کام کرنے پر زور دیا ہے۔ اس لیے کہ کسی بڑے منصوبے پر انفرادی طور پر کام کرنا قدرے مشکل ہے۔ لہٰذا انھوں نے ارباب اختیار کو (یہ جانتے ہوئے کہ اُردو میں جتنے بھی قابل فخر کارنامے سامنے آئے ہیں سب کے سب انفرادی کوششوں ہی کا نتیجہ ہیں۔ اس کے برعکس اجتماعی کوششوں کے نتائج نہایت مایوس کن رہے ہیں) یہ مشورہ دیا ہے کہ مختلف شعبوں کے ماہرین کو یکجا کر کے ایمانداری سے کام کیا جائے تو اس کے قابل قدر نتائج برآمد ہوں گے۔ رشید صاحب نے اجتماعی طور پر کام کرنے کے لیے ایمانداری پر کافی زور دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''تحقیقی کاموں کے جو منصوبے تیار کیے جائیں، وہ سراسر علمی مقاصد کے حصول کے لیے ہوں۔'' (۳)

یعنی اس میں شخصی فائدے، شہرت اور دولت کی غرض شامل نہ ہو۔ اجتماعی کاموں کے لیے یہ ضروری ہے کہ جتنے لوگ اس کام میں شریک ہیں سب کو برابر کا حق دیا جائے، ایسا نہ ہو کہ کوئی ایک شخص اس کام کو ہڑپ جائے۔

چوتھا مضمون ''تدوین اور تحقیق کے رجحانات'' دو حصوں میں منقسم ہے پہلے حصے میں تحقیق و تدوین کے امتیازات کو واضح کرتے ہوئے اس غلط فہمی کو دور کیا گیا ہے کہ تدوین دوسرے درجے کی چیز ہے۔ رشید صاحب تحقیق و تدوین کے امتیازات کو اس طرح واضح کرتے ہیں:

''حقائق کی بازیافت، صداقت کی تلاش، حقائق کا تعین اور ان سے نتائج کا استخراج؛ ادبی تحقیق کا مقصود ہے یا ہونا چاہیے۔ تدوین یعنی متن کی تصحیح و ترتیب، اس سے الگ چیز ہے، جس کے اپنے مسائل و مطالبات ہیں۔ تحقیق اور تدوین بجائے خود دو مستقل موضوع ہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کی حدیں کہیں کہیں مل جاتی ہیں۔'' (۴)

رشید صاحب نے مختلف مثالوں کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ تدوین کی اہمیت تحقیق سے کسی طور کم نہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''جب تک قدیم متنوں کو اصول تدوین کی مکمل پابندی کے ساتھ مرتب نہیں کیا جائے گا، اس وقت تک نہ تو تحقیق کی بہت سی گتھیاں سلجھیں گی اور نہ زبان و ادب کے ارتقا کا بالکل صحیح سلسلہ سامنے آسکے گا۔'' (۵)

رشید صاحب نے اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے کہ تدوین دوسرے درجے کی چیز ہے' جو مثالیں دی ہیں وہ بہت اہم ہیں۔ تدوین کسی طور بھی تحقیق سے کم تر درجے کی چیز نہیں ہے اور نہ ہی تدوین کو تحقیق پر فوقیت حاصل ہے۔ بل کہ دونوں ایک دوسرے کا تکملہ ہیں۔ اس لیے کسی کو کسی پر فوقیت حاصل نہیں ہے۔ لہٰذا ہمیں اس طرح کی فوقی درجہ بندی سے پرہیز کرنا چاہیے کہ ہر شے اپنی اپنی جگہ اہم ہے۔ لسانی جائزے کی بنیاد کسی نہ کسی قدیم متن پر ہی رکھی جائے گی اور متن کو اس کی اصل صورت میں پیش کرنے کے عمل کو تدوین کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ لغت کی ترتیب، صرف و نحو، تذکیر و تانیث اور متروکات سے بحث اس وقت تک نہیں کی جاسکتی جب تک کہ ہمارے سامنے صحیح متون نہ ہوں۔ اس لیے تدوین متن کا کام بہت اہمیت اختیار کرلیتا ہے۔

اس مضمون کے ذریعے رشید صاحب نے جہاں تحقیق و تدوین کے فرق کو واضح کیا ہے اور بعض غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے، وہیں انہوں نے تدوین کے طریقۂ کار اور اس کے اصولوں سے بھی بحث کی ہے۔ تدوین متن کے لیے جو اصول انہوں نے وضع کیے ہیں، وہ کچھ اس طرح ہیں:

*مزاج کا تحقیق آشنا ہونا۔

*صحت متن کے مفہوم سے واقف ہونا۔

*زبان، قواعد زبان، قواعد شاعری سے واقف ہونا۔

*جس عہد کی تصنیف کو مدون کیا جارہا ہے اس عہد کی زبان سے کما حقہ واقف ہونا۔

*فارسی زبان میں مہارت رکھنا۔

*املا کے مسائل سے اچھی طرح واقف ہونا۔

*سخت محنت اور ریاضت کرنا۔

* کسی ذاتی غرض سے پرے، ایمانداری برتنا۔

*تدوین سے پہلے متن کے جتنے اہم نسخے ممکن الحصول ہوں ان سب سے استفادہ کرنا

اس مضمون کے دوسرے حصے میں تحقیق اور تنقید کے رشتے سے بحث کی گئی ہے۔ مختلف مثالوں کے ذریعہ رشید صاحب نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ تنقیدی عمارت تحقیق کی مدد کے بغیر کھڑی نہیں ہوسکتی۔ تحقیق و تنقید کا دائرہ کار اگرچہ ایک دوسرے سے مختلف ہے، اس کے باوجود دونوں کو ایک دوسرے کی معاونت بہر حال حاصل رہتی ہے۔ اس مضمون میں رشید صاحب نے تحقیق و تدوین کے آغاز و ارتقا پر بھی روشنی ڈالی ہے نیز حوالہ اور صحت متن سے متعلق بعض بنیادی باتوں کا ذکر بھی کیا ہے۔

''حوالہ اور صحت متن'' مذکورہ کتاب کے پہلے حصے کا آخری مضمون ہے۔ اس مضمون میں رشید صاحب نے تذکروں سے متعلق اختلاف متن پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اسے تحقیق کے طالب علموں کے لیے بڑا مسئلہ بتایا ہے اور اساتذہ کی اس طرف توجہ مبذول کرائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اس مضمون کا مقصد یہ ہے کہ اساتذہ کی توجہ اس طرف مبذول کرائی جائے کہ اہم مآخذ، خاص طور پر اساتذہ کے دواوین اور تذکروں کو پابندی آدابِ تدوین کے ساتھ مرتب کرنے کی بہت ضرورت ہے'' (۶)

مذکورہ بیان کے بعد رشید صاحب نے مختلف تذکروں سے اختلاف متن کو پیش کیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے تحقیق کے طالب علموں کو چند مفید مشورے بھی دیے ہیں کہ تحقیق میں شک کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اور خوش اعتقادی نیز زود یقینی کی تحقیق میں گنجائش نہیں ہے۔

کتاب کا دوسرا حصہ ذیل کے چار تبصروں پر مشتمل ہے۔

(1) دیوان غالب (صدی اڈیشن)، مرتبہ: مالک رام

(2) اُردو شاعری کا انتخاب، مرتبہ: محی الدین قادری زور

(3) علی گڑھ تاریخ ادب اُردو

(4) تاریخ ادب اُردو، مرتبہ: جمیل جالبی

یہ چاروں تبصرے نہایت محققانہ اور بصیرت افروز ہیں۔

رشید صاحب نے مذکورہ کتابوں پر اس طرح تبصرہ کیا ہے کہ ان کتابوں کی تحقیقی کمیاں اور خامیاں تو منظر عام پر آ ہی گئی ہیں، تحقیق کے اصول و ضوابط بھی زیر بحث آگئے ہیں۔ بالخصوص ''علی گڑھ

''علی گڑھ تاریخ ادب اُردو'' اور ''دیوان غالب (صدی اڈیشن)'' پر تبصرہ کرتے ہوئے رشید صاحب کی زبان اوران کا انداز نہایت سخت معلوم ہوتا ہے۔کہیں کہیں رشید صاحب کے اسلوب میں جھنجھلاہٹ بھی دکھائی دیتی ہے۔مثلاً یہ اقتباس دیکھیں:

''برسوں کے انتظار کے بعد اس تاریخ کی جلد [علی گڑھ تاریخ ادب اُردو کی پہلی جلد] شائع ہوئی؛ جس کو پڑھ کر، سب سے پہلا تاثر یہ ہوتا ہے کہ غالباً غلط نگاری کے کسی مقابلے میں حصہ لینے کے لیے اس کو مرتب کیا گیا ہے۔''(۷)

اسی مضمون کا ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمائیں اور رشید حسن خان صاحب کے غصے اور جھنجھلاہٹ کو محسوس کریں:

''مقالہ نگار کو اس کا حق ہے کہ وہ عظیم المرتبہ صوفیہ کو ''خیرات خوار'' سمجھیں، اورنگ زیب کو دنیا کا بدترین حکم راں مانیں اور اکبر کے دین الٰہی کو، منشورِ انسانیت قرار دیں۔ان کو یہ بھی حق حاصل ہے کہ وہ مسلمان بادشاہوں کے خالص حکومتی اقدامات کو ''مسلم آئینِ حکم رانی کا مسلمہ اصول'' قرار دے کر طنز و تعریض کے تیروں سے اپنا ترکش خالی کرلیں اور اس طرح اپنی وسیع الخیالی یا قوم پرستی کی صفت میں کچھ اور اضافہ کرلیں۔''(۸)

بات دراصل یہ ہے کہ رشید صاحب نہایت کھرے آدمی تھے اس لیے ان کا انداز بیان بھی دوٹوک ہوتا تھا اور اسی لیے انہوں نے بے شمار دشمن بھی پیدا کر لیے تھے۔دوسری اہم بات یہ ہے کہ جب وہ کسی شخص یا کتاب کو ہدف تنقید بناتے ہیں تو پھر اس کا بخیہ ہی ادھیڑ کر رکھ دیتے ہیں اور اس کام میں وہ اتنے مشغول ہوجاتے ہیں کہ انہیں یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ خامیوں کے ساتھ ساتھ خوبیوں کا ذکر بھی کرنا چاہیے۔اسی لیے ''علی گڑھ تاریخ ادب اُردو'' اور ''دیوان غالب'' مرتبہ مالک رام پر تبصرہ کرتے ہوئے نہ صرف یہ کہ وہ صرف اور صرف خامیاں ہی گنواتے ہیں بل کہ ان کے اسلوب پر جھنجھلاہٹ غالب آجاتی ہے۔دوسری طرف جن سے وہ خوش ہوتے ہیں یا جن سے انہیں کوئی شکایت نہیں ہوتی، ان پر بات کرتے وقت ان کا اسلوب معتدل رہتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ رشید صاحب کا انداز بیان ''تاریخ ادب اُردو'' مرتبہ جمیل جالبی سے متعلق قدرے مختلف ہے۔انہوں نے جہاں اس کتاب کی کمیاں اور خامیاں گنوائی ہیں وہیں جمیل جالبی کی کوششوں کو سراہا بھی ہے۔پروفیسر گیان چند جین رشید حسن خاں کے اس رویے کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

''رشید حسن خاں، قاضی عبدالودود کے پیروکار ہیں۔حالیہ دوشاہ کار تدوینوں [فسانۂ عجائب اور باغ و بہار] سے پیش تر ان کی شہرت ایک خوردہ گیر محقق کی تھی۔اس سلسلے میں ان کے بعض مضامین ان کے مجموعے 'ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ' (علی گڑھ ۱۹۷۸) میں ملتے ہیں۔ان میں تین تبصراتی مضامین اہم ترین ہیں۔دیوان غالب صدی اڈیشن، اُردو شاعری کا انتخاب اور علی گڑھ تاریخ ادب اُردو۔تینوں تبصرے یک رخی ہیں یعنی ان میں محض اغلاط دکھائی ہیں، خوبیوں کے بارے میں ایک لفظ نہیں کہا۔''(۹)

''علی گڑھ تاریخ ادب اُردو'' کے حال سے پوری اُردو دنیا واقف ہے کہ رشید صاحب کے تبصرہ کی اشاعت کے فوراً بعد ہی اس کتاب کو واپس لے لیا گیا تھا اور منصوبے کے بقیہ کام سے بھی مرتبین نے توبہ کرلی تھی۔

رشید صاحب نے مذکورہ کتابوں پر تبصرہ ان ہی اصولوں کے تحت کیا ہے جس کی وضع انہوں نے اپنی اس کتاب ''ادبی تحقیق مسائل اور تجزیے'' کے پہلے حصے میں کی ہے۔

مذکورہ کتابوں میں اس قدر تحقیقی خامیاں ہیں کہ اس کی مثالیں یہاں پیش کرنا غیر ضروری طوالت کو بڑھاوا دینا ہوگا۔ان تبصروں میں رشید صاحب کا استدلالی انداز بیان اس طرح کا ہے کہ مرتبین بھی اپنے سر جھکا دیتے ہیں۔

غرض کہ یہ کتاب ''ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ'' اصول تحقیق و تدوین پر جامع کتاب ہے اور اس کا مطالعہ نہ صرف تحقیق کے طالب علموں کے لیے سودمند ہے بل کہ دانش گاہوں کے اساتذہ اور ادب کے محققوں کے لیے بھی نہایت مفید ہے۔

حواشی

۱۔رشید حسن خان، ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۷۸، ص:۶

۲۔ایضاً، ص:۱۵

۳۔ایضاً، ص:۷۹

۴۔ایضاً، ص:۸۸

۵۔ایضاً، ص:۹۰

۶۔ایضاً، ص:۱۱۷۔۱۸

۷۔ایضاً، ص:۲۵۸

۸۔ایضاً، ص:۲۶۰

۹۔گیان چند جین، خدائے تدوین، مشمولہ: رشید حسن خان۔کچھ یادیں کچھ جائزے، مرتبین: ڈاکٹر محمد آفتاب اشرف و جاوید رحمانی، ایچ ایس پریس، نئی دہلی، ۲۰۰۸، ص:۶۲

(ادب اور قاری، سید قمر صدیقی، مکتبہ صدف، چرچ روڈ مظفر پور، جنوری 2013، صفحہ 183 تا 194)

محمد سعید
اسسٹنٹ پروفیسر
(شعبۂ اُردو، جی سی یونی ورسٹی، لاہور)

اُردو کا پہلا ترقی پسند محقق: رشید حسن خاں

اُردو کی ادبی تحریکوں میں سے ترقی پسند تحریک سب سے زیادہ متحرک اور دوررس اثرات کی حامل رہی ہے۔ اس حوالے سے بہت سے ادیبوں اور شاعروں اور اصنافِ نظم کی ترقی پسندی کے مطالعات پیش ہو چکے ہیں لیکن ترقی پسند تحقیق یا ترقی پسند محققین کے بارے میں اب تک کوئی مطالعہ سامنے نہیں آیا۔ یہاں دو باتوں کی وضاحت ضروری ہے۔ پہلی یہ کہ تحقیقی عمل میں چوں کہ حقائق کی بنیاد پر حق گوئی سے کام لیا جاتا ہے اسی طرح اگر نیک نیتی سے یہ عمل انجام دیا جائے تو بجائے خود یہ ترقی پسندی ہی ہے۔ گویا عدم مصلحت اور عدم منافقت کے رویے کے حامل ہر نیک نیت محقق کو ترقی پسند محقق کہا جا سکتا ہے۔۔ دوسری یہ بات کہ ترقی پسند انجمن ترقی پسند مصنفین کے ممبر ہونے کی محتاج نہیں ہے۔ ایک اور وضاحت بھی ضروری ہے کہ ترقی پسند نقادوں اور ترقی پسند تنقید پر بہت کام ہوا ہے۔ ان میں سے بعض ترقی پسند نقاد ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو تحقیق کے بعد تنقید لکھتے ہوں لیکن ان کی بنیادی پہچان چوں کہ تنقید ہے اس لیے وہ یہاں زیرِ بحث نہیں ہیں۔ یوں تو ہر ایک کے تعارف میں ''معروف محقق اور نقاد'' لکھا جاتا رہا ہے لیکن جب نقادوں اور محققوں کی الگ الگ فہرست تیار کی جاتی ہے تو وہ بڑی حد تک واضح ہوتی ہے۔

رشید حسن خاں اُردو کے پہلے ترقی پسند محقق ہیں۔ ان کی زندگی اور تحقیقی مصلحت پسندیوں کا شکار کبھی نہیں ہوئی۔ تحقیق و تدوین میں وہ اپنے معاصر محققین میں سب سے زیادہ حق گو تھے۔ وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے ممبر کبھی نہیں رہے لیکن ٹریڈ یونینسٹ ضرور تھے۔ ان کے خاندانی اثرات اور ٹریڈ یونین سے وابستگی نے ان میں حق گوئی اور بلند آہنگی کے تناسب کو بہت بڑھا دیا تھا اس کے ساتھ انھوں نے اس پر استقامت اور مداومت میں بھی کبھی کمی نہیں آنے دی۔ حسب ونسب کا تقاضا تھا کہ خودداری کو قائم رکھا۔ خاندانی تربیت تھی کہ صاف گوئی سے کام لینا ہے، سو ساری زندگی اس پر قائم رہے۔ والد صاحب نے نصیحت کی کہ منافقوں کی طرح کھسر پھسر نہیں کرنی سو ساری زندگی بلند آہنگی سے گزاری۔ ان کے اُستادِ محترم مولوی مجتبیٰ حسن خاں نے کہا کہ سنی سنائی پر یقین نہ کرو تصدیق اور تحقیق کرلو سو ساری زندگی تحقیق کی نذر کردی۔ آرڈیننس کلوذنگ فیکٹری میں مزدوری کی اس کے بعد پھر ساری زندگی محنت سے کبھی جی نہیں چرایا۔ ٹریڈ یونین سے یہ سبق حاصل کیا کہ اپنے حقوق کا استحصال نہیں ہونے دینا سو رشید حسن خاں اپنے حقوق کے لیے ساری زندگی جواں مردی سے لڑے اور کبھی میدان چھوڑ کر بھاگے نہیں۔ بل کہ ادبی، مذہبی اور سیاسی منافقوں اور مصلحت پسندوں کے لیے ہمیشہ تازیانہ بنے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی حق گوئی کی تلخی، تلخ نوائی اور بلند آہنگی کو کبھی تخریبی کہا گیا اور کبھی ان کو احساس کمتری کا نتیجہ قرار دے کر اپنی تعمیریت اور احساس برتری کا ڈھنڈورا پیٹا گیا۔ رشید حسن خاں کی جس ترقی پسندی نے انھیں احساس کمتری سے بچایا اور اُن کی تحقیق و تدوین کو باثروت اور بارعب بنایا اس کو سمجھنے کے لیے اُن کی زندگی کے ان آٹھ برسوں کا مطالعہ ضروری ہے جو ٹریڈ یونین سے وابستگی میں گزرے۔

رشید حسن خاں نے اپنی زندگی کی سب سے پہلی باقاعدہ ملازمت وسط 1939 میں شاہ جہاں پور آرڈیننس فیکٹری سے شروع کی۔ اُس وقت اُن کی عمر ساڑھے تیرہ برس کے قریب تھی۔ رشید حسن خاں اپنی پہلی باقاعدہ ملازمت کے بارے میں پہلی بار 1960 میں لکھتے ہیں:

> ''بہت غریب گھر پیدا ہوا۔ شاہ جہاں پور میں ایک بہت کارخانہ، جس کو جنگ کے زمانے میں علمی شہرت حاصل ہوگئی تھی۔ پورا نام ہے ''آرمی کلوذنگ فیکٹری'' 1939ء میں جب کہ عمر کی صرف 13 منزلیں طے کی تھیں، اس کارخانے میں بہت معمولی مزدور کی حیثیت سے داخل ہوا۔ کیوں کہ گھر کے حالات پریشان کن تھے۔ 1945 تک کام کرتا رہا.... 1945 کے آخر میں جب خاتمۂ جنگ کی خوشی میں کارخانے میں کمی آگئی، تو میں بھی دوسرے ہزاروں مزدوروں کے ساتھ بے کار ہوگیا۔'' 2

محمد اسد اللہ کے نام پر رشید حسن خاں کے جس مطبوعہ خط سے یہ اقتباس لیا ہے اس میں انھوں نے اس فیکٹری میں مزدور یونین کے بننے اور خود اس یونین کا جوائنٹ سکریٹری مقرر ہونے، تاریخی ہڑتال کروانے اور اس پاداش میں نکالے جانے کا ذکر نہیں کیا بل کہ نکالے جانے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ ''خاتمۂ جنگ کی خوشی میں'' نکالے گئے۔ یہاں پہلے اُن کے دو بیانات اور دیکھ لیے جائیں۔ رشید حسن خاں 1984 میں ''کچھ اپنے بارے میں'' لکھتے ہیں:

> ''اچانک 1941 میں ٹریڈ یونین کے دائرے میں آ گیا۔ میرے شہر شاہ جہاں پور میں اس زمانے کی بہت بڑی آرڈیننس فیکٹری تھی۔ جس میں تیس ہزار سے زائد آدمی کام کرتے تھے۔ اس فیکٹری میں پہلی بار چھپ چھپا کر مزدوروں کی یونین بنالی گئی اور پھر 33 دن کی ہڑتال ہوئی۔ یہ 1945 کی بات ہے۔ میں اس یونین کا جوائنٹ سکریٹری تھا۔'' 3

اس سلسلے میں رشید حسن خاں کی 1998 کی تحریر سے ایک تیسرا اقتباس بھی ملاحظہ کیجیے:

''آرڈیننس کلودنگ فیکٹری میں جب بھرتی شروع ہوئی تو میں بھی بھرتی ہو گیا۔اس وقت میری عمر چودہ سال کے لگ بھگ تھی۔آرمی کی اس فیکٹری میں فوجی وردیاں سلتی تھیں۔یہ فیکٹری اب بھی ہے.....جنگ عظیم دوم زوروں پر تھی،اس وقت تک سول کارخانوں میں یونین بنائی جاسکتی تھی۔آرڈیننس کارخانوں میں اس کی اجازت نہیں تھی۔کچھ لوگوں نے 1940 کے وسط میں کیرتن اور میلاد شریف کے نام سے گھروں میں چھپ چھپا کر یونین کا ڈول ڈالا،پھر کھل کر کام ہونے لگا یہاں تک 1945 کے آخر میں 33 دن کی اسٹرائک ہوئی جو کسی بھی آرڈیننس فیکٹری میں پہلی باضابطہ اسٹرائک تھی،میں اس وقت اپنی یونین کا جوائنٹ سکریٹری تھا۔اسی پاداش میں 1946 کے بالکل شروع میں فیکٹری سے نکالا گیا۔اگر یہ حسن اتفاق واقع نہ ہوتا تو شاید میری زندگی کا رُخ ہی کچھ دوسرا ہوتا۔'' 4

رشید حسن خاں کے ان بیانات سے اُن کی پہلی باقاعدہ ملازمت کے بارے میں کچھ باتیں تو صاف ہو جاتی ہیں اور کچھ بحث طلب ہیں۔خصوصاً فیکٹری میں ملازمت کے آغاز اور پھر نکالے جانے کی وجہ اور زمانے کا تعین وغیرہ۔

اُنھوں نے یہ ملازمت گھر کے معاشی حالات سے پریشان ہو کر مجبوراً شروع کی اور اس کے لیے انھیں درسِ نظامی چھوڑنا پڑا۔درسِ نظامی چھوڑنے کا زمانہ اُنھوں نے خود بتایا ہے کہ وہ مدرسہ بحر العلوم میں 1939 کے وسط تک زیرِ تعلیم'' رہے۔اس طرح یہ طے ہو جاتا ہے کہ آرڈیننس فیکٹری میں رشید حسن خاں نے وسط 1939 میں تقریباً ساڑھے تیرہ 5 برس کی عمر میں ملازمت شروع کی۔اس ملازمت کے حصول کے لیے رشید حسن خاں کو کوئی بہت زیادہ تگ و دو یا جدوجہد نہیں کرنا پڑی ہوگی اور یہ بھی ہے کہ انھیں اس سلسلے میں اگر زیادہ جدوجہد کرنا ہوتی تو شاید وہ کوئی بھی ملازمت شروع ہو چکی تھی اور اُن کے اپنے شہر میں فوجیوں کی وردیوں سینے والی یہ آرڈیننس فیکٹری موجود تھی۔جہاں ہنگامی ضرورت کے تحت ملازمین کو ہزاروں کی تعداد میں بھرتی کیا جارہا ہوگا (جنگ ختم ہونے پر نکالے گئے تو بھی ہزاروں کی تعداد میں) ان کے ایک ہم وطن اور ہم دم دیرینہ شبیر عباسی لکھتے ہیں:

''شاہ جہاں پور میں ایک آرڈیننس کلودنگ فیکٹری ہے جس میں جنگ کی ہنگامی صورتِ حال کے پیشِ نظر 'بھرتی' شروع ہو گئی تھی۔رشید حسن خاں بھی 1939 میں 'اے ٹیلر' کی حیثیت سے بھرتی ہو گئے۔'' 6

رشید حسن خاں نے اس فیکٹری میں عام بھرتی کی خبر سنی ہوگی تو ابتدائی غور و فکر کے بعد اور والد صاحب کے مشورے سے اپنے معاشی حالات کے پیشِ نظر تعلیم کو ادھورا چھوڑ کر ملازم ہوئے ہوں بل کہ یہ یقینی سا ہے کہ وسط 1939 میں ساڑھے تیرہ برس کی عمر میں فیکٹری میں ملازمت مل جانے کی وجہ سے اُنھوں نے مدرسہ چھوڑ دیا۔یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جنگ کی وجہ سے اگر فوجی وردیوں کی ضرورت میں اضافہ ہوا تو وہ وردیاں پہننے والوں میں بھی ضرور اضافہ ہوا ہوگا اور فوج میں بھرتی بھی عام ہوگی۔ہوسکتا ہے اُس طرف بھی رشید حسن خاں کے والد محترم نے خود اُنھوں نے کچھ غور کیا ہو کہ آخر یہ فوجیوں کا خاندان تھا لیکن وہاں بھرتی کے لیے ابھی ان کی عمر نہیں تھی۔

شبیر عباسی کے محوالہ اقتباس کے دوسرے حصے میں بتایا گیا ہے کہ رشید حسن خاں اس فیکٹری میں بحیثیت 'اے ٹیلر' بھرتی ہوئے جب کہ رشید حسن خاں کا بیان ہے کہ وہ ''بہت معمولی مزدور کی حیثیت سے'' بھرتی ہوئے۔اے ٹیلر سے مراد چوں کہ اسسٹنٹ ٹیلر ہے اسی وجہ سے رشید حسن خاں نے خود کو معمولی مزدور کہا ہے۔رشید حسن خاں کے اس فیکٹری میں اوقات کار کیا تھے اُنھوں نے کچھ نہیں لکھا البتہ اطہر فاروقی نے اُن کا ایک بیان نقل کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''فیکٹری کی ملازمت کے زمانے کے بہت سے واقعات رشید صاحب نے مجھے سنائے تھے۔ان میں سے ایک واقعہ یہ تھا کہ اس فیکٹری میں اُس زمانے میں تین شفٹیں آٹھ آٹھ گھنٹے کی ہوتی تھیں۔چوبیس گھنٹے کام ہوتا تھا۔تیسری شفٹ میں جو صبح چھے بجے ختم ہوتی ہوتی تھی،درمیان میں آدھ گھنٹے سے کچھ زیادہ کا وقفہ ہوتا تھا۔لوگ ذرا آرام کر لیا کرتے تھے۔رشید صاحب طلسم ہوش ربا کی دسویں جلدیں (آٹھ اصل جلدیں اور بقیہ طلسم ہوش ربا) دو بار مکمل طور پر اسی زمانے میں پڑھی تھیں۔'' 7

شبیر عباسی نے بھی رشید حسن خاں کے فیکٹری میں اوقات کار یہی بیان کیے ہیں۔اُنھوں نے بھی اپنے مضمون میں ایسی معلومات رشید حسن خاں کے حوالے سے ہی درج کی ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

''فیکٹری تین شفٹ میں کام کرتی تھی۔رشید حسن خاں کو رات کی شفٹ میں کام کرنا پڑتا تھا۔'' 8

جن بڑی فیکٹریوں میں چوبیس گھنٹے کام ہوتا ہے ان میں آٹھ آٹھ گھنٹے کی تین شفٹیں ہی ہوا کرتی ہیں اور ان کی ترتیب عموماً یہ ہوتی ہے کہ پہلی شفٹ صبح 6 بجے سے دوپہر 2 بجے سے رات 10 بجے تک اور اسی طرح تیسری شفٹ رات 10 سے صبح 6 بجے تک ہوتی ہے۔ملازمین کے ایسے اوقاتِ کار کے حوالے سے عموماً یہ بھی ہوتا ہے کہ بہ ظاہر اُن کی آسانی کے لیے یا کسی اور مقصد کے لیے انتظامیہ ملازمین کی ڈیوٹیاں تبدیل کرتی رہتی ہے یعنی ایک ہفتہ پہلی شفٹ میں دوسرا ہفتہ دوسری شفٹ اور تیسرا ہفتہ تیسری شفٹ میں اسی طرح چوتھا ہفتہ پھر پہلی شفٹ میں،لیکن اس فیکٹری میں شفٹوں کی اس تبدیلی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوتا آیا جو ملازم جس شفٹ میں ہے کیا ساری سروس اسی میں گزارتا تھا کہ یہ تبدیلی ہوتی رہتی تھیں۔

رشید حسن خاں اس فیکٹری میں بنائی جانے والی ٹریڈ یونین کے جوائنٹ سکریٹری تھے اور چوں کہ وہاں کی کسی بھی آرڈیننس فیکٹری میں یہ پہلی یونین تھی۔اس لیے اس کا تذکرہ اہمیت کا حامل ہے۔اس سے وابستگی نے رشید حسن خاں کی آنے والی زندگی پر بہت اثرات مرتب کیے لیکن یہ کہنا ذرا احتیاط کا متقاضی ہے کہ اس یونین کو بنانے اور قائم کرنے میں رشید حسن خاں کی قائدانہ صلاحیتیں کام آئیں جیسا کہ ڈاکٹر خلیق انجم کے اس بیان سے تاثر ملتا ہے:

''یہاں مزدوروں کا بڑے پیمانے پر استحصال کیا جاتا تھا۔اس یونین کے جلسے میلاد شریف یا کیرتن کے بہانے فیکٹری کے ملازمین کے گھروں پر ہوتے اور پھر کچھ عرصے بعد یونین کی باقاعدہ سرگرمیاں شروع ہو گئیں۔'' 9

ڈاکٹر خلیق انجم کی ہم نوائی میں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی رقم طراز ہیں:

''فیکٹری کے مزدور،صاحبانِ اختیار کے ظلم و زیادتی اور ناانصافیوں کا شکار تھے۔خاں صاحب اور اُن کے چند ساتھیوں نے مل کر چھپ چھپا کر ٹریڈ یونین قائم کی۔'' 10

مزدور کا استحصال ہر جگہ اور ہر وقت ہوتا ہے۔صاحبانِ اختیار کے ظلم و زیادتی اور ناانصافیوں کا نشانہ بھی مزدور ہی بنتا ہے۔استحصال معمولی ہو یا غیر معمولی،مزدوروں کی زبان میں وہ استحصال ہی

کہلائے گا۔اس آرڈیننس فیکٹری میں بھی یہ صورت حال ضرور موجود ہوگی۔اس طرح کے ظلم وجبر کے حالات نہ بھی ہوں تو اتنی بڑی فیکٹری میں اس نوعیت کی کچھ نہ کچھ سرگرمیوں کا شروع ہونا انوکھی بات نہیں ہے۔ویسے بھی ہندوستان میں یہ زمانہ آزادی کی تحریکوں کے عروج کا ہے،اپنے حقوق کے لیے لڑنے کا شعور ہر خاص وعام میں پیدا ہو رہا تھا۔

دوسرا یہ کہ اس سے پہلے اگر اس فیکٹری یا کسی بھی آرڈیننس فیکٹری میں یونین نہیں بنی تو اس کا یہ مطلب قطعاً نہیں ہے کہ یہاں رشید حسن خاں نے آکر لوگوں کو جمع کی۔دوسری جنگِ عظیم کی ہنگامی ضرورت کو پیشِ نظر صورتِ حال یہ رہی ہوگی کہ وسط 1939 میں ہزاروں کی تعداد میں جن ملازمین کو بھرتی کیا گیا انھیں کنٹریکٹ پر لیا گیا ہوگا جن کی تنخواہ اور دیگر الاؤنس وغیرہ اس فیکٹری کے مستقل ملازمین سے کم ہوں گے۔لہٰذا ایک سال گزرنے پر وسط 1940 تک ان نئے ملازمین سے لیا جاتا ہے جب کہ اُن کی نسبت ہمیں مراعات کم حاصل ہیں۔اس کا امکان بھی ہے کہ اتفاقی چھٹی کر لینے پر بھی تنخواہ کاٹ لی جاتی ہوگی۔سوایسی صورتِ حال کے نتیجے میں یونین بنانے کا خیال پہلے ایسے نئے ملازمین میں سے ہی کچھ لوگوں کا ہوا ہوگا۔یہ بھی ہے کہ اس فیکٹری میں تین شفٹوں میں کام کا آغاز بھی اسی دوران ہوا ہوگا کیوں کہ نئے بھرتی ہونے والے ہزاروں مزدوروں کے لیے الگ سے فیکٹری میں فوری طور پر کوئی بلڈنگ تعمیر کرنا ممکن نہیں تھا۔اب اس صورتِ حال میں یہ قیاس کرنا کہ''خاں صاحب اوراُن کے چند ساتھیوں نے مل کر'' یہ یونین قائم کی،درست نہیں اور اس یونین کے بنانے کا کریڈٹ خاں صاحب اوراُن کے چند ساتھیوں کو نہیں دیا جاسکتا۔ایسی سرگرمیوں کی ابتدا یقیناً چند لوگوں کی کوشش کا نتیجہ ہوتی ہے لیکن رشید حسن خاں کی عمران چند لوگوں میں شامل ہونے کی متحمل نہیں کہ وہ وسط 1940 میں ابھی صرف ساڑھے چودہ برس کے نوجوان تھے۔وہ چاہے جتنے ہی سنجیدہ مزاج اور ذمہ دار کیوں نہ ہوں لیکن یہ اُن کے لڑک پن کا زمانہ ہے۔البتہ یہ ضرور ہے کہ جب مختلف لوگوں کے گھروں میں''کھل کر'' اور باقاعدہ اجلاس ہونا شروع ہوئے تو یہ اُن میں شرکت کرتے ہوں۔لیکن یہ بات پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ خود اُنھوں نے کسی ابتدائی اجلاس میں شرکت کرنے کا ذکر نہیں کیا نہ اپنے گھر میں کسی اجلاس کا اہتمام کرنے کا تذکرہ کیا۔اُنھوں نے صرف یہ لکھا کہ'' کچھ لوگوں نے 1940 کے وسط میں کیرتن اور میلاد شریف کے نام سے گھروں میں چھپ چھپا کر یونین کا ڈول ڈالا۔''یونین کے اس ابتدائی منظرنامے میں وہ خود کہیں دکھائی نہیں دیتے،ورنہ وہ اس کا ذکر ضرور کرتے۔اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اگر وہ یونین کے آغاز میں سرگرم نہیں تھے تو یونین نے انھیں جوائنٹ سکریٹری کیسے مقرر کرلیا۔اس کا جواب بھی خوداُن کے اس بیان میں موجود ہے کہ''اچانک 1941 میں ٹریڈ یونین کے دائرے میں آگیا'' یہ اپنے اچانک جوائنٹ سکریٹری بنائے جانے کی طرف اشارہ ہے۔یہ اتفاق بہت اچانک تو رونما نہ ہوا ہوگا کہ یونین کے عہدے داران نے بے شمار لوگوں میں سے صرف رشید حسن خاں کو جوائنٹ سکریٹری کے لیے چن لیا ہو۔یہ عہدہ ملنے کے پہلے یقیناً اُن کی کچھ نہ کچھ (ابتدائی سرگرمیوں کے بعد) ایسی نمایاں سرگرمیاں یا اجلاس میں شرکت اور بحث مباحثے ضرور ان سب کی نظر میں ہوں گے۔رشید حسن خاں اپنی کم عمری کے باوجود،اس سے پہلے پانچ سال تک درسِ نظامی کی تعلیم سے''شعوری بالیدگی'' حاصل کر چکے تھے۔گھر کی ذمہ داری سنبھال چکے تھے،پھر نسلی تفاخر اور حق گوئی کی خاندانی اور اساتذہ کی تربیت بھی انھیں حاصل تھی۔عربی فارسی اور اُردو ادب کے کچھ نہ کچھ مطالعے سے بلند آہنگ بات کرنے کا سلیقہ بھی دوسرے کئی غیر تعلیم یافتہ مزدوروں سے زیادہ ہوگا۔سواُن کا جوائنٹ سکریٹری مقرر ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں،لیکن اُن کے لیے چوں کہ غیر متوقع ہوگا اس لیے اُنھوں نے اسے''اچانک'' کہا ہے۔

آرڈیننس کلودنگ فیکٹری کی ملازمت ختم ہونے کے حوالے سے رشید حسن خاں نے دو مختلف باتیں لکھی ہیں۔1960 میں اُنھوں نے بتایا کہ''خاتمۂ جنگ کی خوشی میں'' ہزاروں مزدوروں کے ساتھ وہ بھی بے کار ہوگئے۔پھر 1998 میں لکھا کہ ٹریڈ یونین کا جوائنٹ سکریٹری ہونے اور فیکٹری میں ہڑتال کروانے کی''پاداش'' میں انھیں نکال دیا گیا۔یہ دونوں باتیں بہ ظاہر مختلف معلوم ہوتی ہیں۔اصل صورتِ حال کچھ یہ ہے کہ 1945 میں دوسری جنگِ عظیم ختم ہوگئی اور جس وقتی ضرورت کے تحت فیکٹری میں ملازمین کی عارضی بھرتیاں کی گئی تھیں اُن کو آہستہ آہستہ نکالنا شروع کیا ہوگا۔مزدوروں کی ٹریڈ یونین چوں کہ زیادہ تر ایسے عارضی ملازموں پر مشتمل تھی لہٰذا ردِّعمل میں یونین نے ہڑتال کردی۔رشید حسن خاں نے ہڑتال کرنے کی وجہ کہیں نہیں لکھی لیکن 33 دن کی طویل ہڑتال کا مقصد سوائے اس کے کیا ہوسکتا ہے کہ جن ملازمین کو نکالنا شروع کردیا ہے انھیں بحال کیا جائے۔فیکٹری والوں کے لیے چوں کہ اب یہ ممکن نہیں تھا کہ بغیر کام کے ہزاروں ملازمین کو رکھیں۔لہٰذا اُنھوں نے یونین کے ردِّعمل سے بچنے کے لیے اس سے وابستہ ملازمین کو بھی نکال دیا ہوگا اور ساتھ ہی ان کے خلاف قانونی کارروائی کی افواہ بھی پھیلادی ہوگی کہ ملازمین ڈر جائیں اور کوئی جوابی کارروائی نہ کریں دوسرا یہ خیال بھی کیا جاسکتا ہے جیسا کہ رشید حسن خاں نے یونین کے بعض لیڈروں کے رویے اور منافقت کا ذکر کیا ہے تو ممکن ہے فیکٹری انتظامیہ نے ان لیڈروں سے مل کر خود ہی انھیں ہڑتال پراُکسایا ہو تاکہ مزدوروں کو نکالنے کا قانونی جواز فراہم ہوسکے۔

رشید حسن خاں کے مطابق''1946 کے بالکل شروع'' میں وہ فیکٹری کی ملازمت سے نکال دیے گئے۔گویا یہ جنوری یا زیادہ سے زیادہ فروری 1946 کی بات ہوگی۔اس کے بعد رشید حسن خاں بریلی چلے گئے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر شمس بدایونی نے اپنے مضمون میں کلیم بریلوی کا ایک بیان نقل کیا ہے جو اُنھوں نے زبانی بتایا تھا۔ان کے بقول کلیم رسا بریلوی کا کہنا ہے کہ:

''رشید حسن خاں میرے بھائی سید زاہد حسن کے ساتھ آرڈیننس فیکٹری میں ملازمت کرتے تھے۔دونوں میں باہمی اتحاد وأنس تھا۔خاں صاحب عملاً بائیں بازو کے ٹریڈ یونینسٹ تھے،ملازمت سے برطرف ہوجانے کے بعد زاہد حسن کے ذریعے بریلی آکر روپوش ہوگئے.....ڈیڑھ دو برس بعد ان کی شاہ جہاں پور واپسی ہوئی۔'' 11

رشید حسن خاں نے آرڈیننس فیکٹری کے زمانۂ ملازمت کے دوران 1941 میں ٹریڈ یونین سے وابستگی اختیار کی اور 1946 کے اوائل میں فیکٹری میں ہڑتال کرنے یا خاتمۂ جنگ کے نتیجے میں یہ ملازمت چھوڑنا پڑی لیکن مقامی ٹریڈ یونین سے ان کی وابستگی 1948 تک قائم رہی۔اس کا ذکر انھوں نے خود تو کہیں نہیں کیا لیکن ان کی مرتبہ کتاب''باغ وبہار'' کے گرد پوش کے پیچھے ادارے کی طرف سے جوان کا تعارف دیا ہوا ہے اس میں درج ہے کہ''1948 تک وہ فیلڈ ورکر کی حیثیت سے مقامی ٹریڈ یونین سے منسلک رہے''۔اگر یہ بات درست ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ رشید حسن خاں نے اپنی زندگی کے آٹھ برس ٹریڈ یونین کو دیے۔اس عرصے میں ان کی جو ذہنی تربیت ہوئی یا جو سرگرمیاں رہیں اور بعض اچھے برے تجربات کی بنیاد پر فکر ونظر کے جو زاویے مقرر ہوئے اب میں ذیل میں انھیں سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔رشید حسن خاں تحقیق کی طرف اپنی رغبت کے ایک محرک کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تحقیق کے نقش مختلف وقتوں میں ذہن پر مرتسم ہوتے رہے۔سب سے پہلے مدرسے میں استادِ محترم کی اس بات سے کہ ہر سُنی ہوئی بات سچ نہیں ہوتی،تصدیق ضروری ہے۔'' 12

رشید حسن خاں علم وادب سے اپنی ابتدائی وابستگی کا ذکر کرتے ہوئے اپنے ایک یادگار خط میں لکھتے ہیں:

''ادبی ذوق شروع ہی سے دامن گیر تھا۔یہ میری خوش قسمتی تھی،کہ مجھ کو شروع سے ہی بہت اچھے اساتذہ کے زیرِ سایہ رہنے کا اتفاق ہوا۔فارسی ادب کے شاہ کاروں کو سبقاً

سبقن 13 پڑھا۔ اس کے ساتھ لغت صرف ونحو، عروض وقواعد ادب کو بھی پڑھا۔ اندھے حافظ جی کی طرح لوحِ دل پر نقش کر لیا، اسی کے ساتھ ساتھ اُردو کے کلاسیکی سرمائے کا بل استیعاب مطالعہ کیا۔ 14

رشید حسن خاں کے مطالعے کا یہ سرمایہ مدرسے کی تعلیم اور اُس کے فوراً بعد کا حاصل کہا جا سکتا ہے۔ اسی دوران میں آرڈیننس کلودنگ فیکٹری میں کام کرنے لگے لیکن کتاب کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ فیکٹری کی ملازمت کے دوران میں ٹریڈ یونین سے وابستہ ہوئے اور جوائنٹ سکریٹری مقرر کیے گئے۔ ملازمت کے ساتھ گھر کی ذمہ داری اور ان سیاسی ہنگاموں کے باوجود 1944 میں رسالہ ''نگار'' کے باقاعدہ قاری رہے۔ رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

''تقریباً 1944 میں رسالہ ''نگار'' سے متعارف ہوا اور نیاز فتح پوری کی تحریروں نے بہت اثر ڈالا۔ (اس زمانے میں نوجوانوں کی بڑی تعداد کی ذہنی تربیت نیاز کی تحریروں سے ہوتی تھی۔) تشکیک، دلیل کا مطالبہ، شہادت کا تصور اور روایت کے سچے جھوٹے متعلقات کا ابتدائی سطح پر شعور نیاز کی تحریروں سے ہوا۔ یہ بہت دل چسپ بات ہے کہ جب بہ ضابطہ تحقیق کے دائرے میں آیا تو معلوم ہوا کہ نیاز کے ذہنوں میں تحقیق سے موانست پیدا کی اور میں آج بھی علی الاعلان اس کی شہادت دیتا ہوں کہ اس زمانے میں نیاز کی تحریروں نے میرے ذہن میں بہت سے سوالیہ نشان پیدا کیے تھے جو بالآخر تحقیق کے عمل میں میرے کام آئے۔'' 15

لیکن فیکٹری کے زمانۂ ملازمت میں ٹریڈ یونین سے وابستگی بھی ان کے بہت کام آئی اور اسی نے رشید حسن خاں کی صورت میں اُردو کو پہلا ترقی پسند محقق دیا۔ چوں کہ رشید حسن خاں نے یونین کے لیڈروں اور ترقی پسند ادیبوں کے خلاف بہت لکھا اور اپنی تحریر و تقریر میں اکثر اس کا ذکر آنے پر اُن کی لیے تیز اور تیکھی ہو جاتی ہے۔ اس وجہ سے ٹریڈ یونین سے وابستگی کے، ان کی زندگی پر اثرات کی طرف دھیان نہیں دیا گیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ٹریڈ یونین سے وابستگی بھی ان محرکات میں سے ایک ہے جس کے ذریعے سے تحقیق کی طرف ان کی رغبت اور حق گوئی پر قائم رہنے کا عزم پختہ ہوا۔ اب پہلے رشید حسن خاں کے یونین سے اختلاف اور اُس کے نتائج کو دیکھتے ہیں۔ یونین سے وابستگی کے زمانے میں رشید حسن خاں کو کمیونسٹ پارٹی کے بڑے بڑے لیڈروں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو انھیں محسوس ہوا کہ یہ مزدوروں کے مسائل کے نام پر سیاست کر رہے ہیں ان کا یہ خیال درست تھا۔ وہ ذہنی طور پر اُن لیڈروں کی آئیڈیالوجی سے دور ہو گئے اور یہ محض اشخاص کے رویے سے ہوا۔ ایسے اختلافات کو بیان کرتے ہوئے رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

''جس قدر حقیقت کھلتی گئی اسی قدر ورکروں اور لیڈروں میں خلیج بڑھتی گئی اور آخر کار مجھ جیسے ناآشنائے مکرِ سیاست بالکل الگ ہو گئے۔ ان دنوں ایسے تلخ تجربے ان رہنماؤں کے ہوئے تھے کہ آج تک ان کی یاد باقی ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اگر یہ صورتِ حال رونما نہ ہوئی ہوتی تو شاید میں بھی آج ترقی پسندی کا لیبل لگائے ہوئے ہوتا۔ ترقی پسند تحریک سے بچنے کی ایک وجہ یہ بھی پیدا ہو گئی کہ میں نے تنقیدی کتابیں پڑھنے سے پہلے وہ ادب پڑھا تھا اور اسی نے مجھے محفوظ رکھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ فارسی شاعری اور کلاسکی اُردو ادب کے مطالعے نے ذہن میں ذوق اور معیار کا ایک تصور ضرور پیدا کر دیا تھا، جس نے صحافت، نعرے بازی اور ادب میں فرق کرنا سکھایا تھا۔ 16

یہ بات درست ہے کہ رشید حسن خاں اپنے تلخ تجربات کی وجہ سے ترقی پسند تحریک سے وابستہ نہیں ہوئے اور کمیونسٹوں سے بھی ذہنی طور پر دور اور الگ ہو گئے۔ نیز یہ ترقی پسند مصنفین اور ادب کے خلاف بھی انھوں نے بہت سے مضامین لکھے۔ رشید حسن خاں ترقی پسند تحریک سے تو بچ نکلے لیکن ترقی پسندی اُن میں سے نہیں نکلی۔ کیوں کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ انھوں نے ٹریڈ یونین کے جوائنٹ سکریٹری کے عہدے سے استعفیٰ نہیں دیا، محض ذہنی طور پر اُن لیڈروں کے منافقانہ رویے کی وجہ سے الگ ہوئے۔ رشید حسن خاں کی ایک دوسری تحریر سے اس کی کچھ وضاحت ملتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ہماری یونین کے سکریٹری کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے ایک تربیت یافتہ شخص، بہت محنتی ایماندار اور پڑھے لکھے... ٹریڈ یونین سے، مزدوروں کے مسائل کو حل کرنے سے زیادہ پارٹی آئیڈیالوجی کو پھیلانے کا کام لیا جاتا تھا، اور ورکروں کی اس لحاظ سے، شام کی بیٹھکوں میں ذہنی تربیت کی جاتی تھی۔ یونین میں تین چار لوگ ایسے تھے جو اس پالیسی سے اتفاق نہیں کرتے تھے۔ میں بھی انھی میں سے تھا...... اس سے ایک سطح پر کش مکش کا پیدا ہونا لازم تھا، اور وہ ہوا، آخر میں دو گروہ بن گئے تھے یونین میں اس سوال پر۔'' 17

ظاہر ہے یونین سے علاحدگی سوچ اور نظر کے اختلاف کی وجہ سے تھی نہ اس کا یہ مطلب تھا کہ انتظامیہ کے ساتھ مل جائیں اور نہ یہ مطلب تھا کہ خاموش ہو کر گھر بیٹھ رہیں بل کہ اس یونین کے مقابلے میں ایک اور ایسی یونین بنانے کا عزم تھا جو صحیح معنوں میں مزدور کے مسائل کو احسن طریقے سے حل کرنے کی کوشش کرے، یونین کے دو گروہ بن جانے کا اس کے سوا کیا مطلب ہو سکتا ہے اور پھر اس ٹریڈ یونین کے ''بہت محنتی، ایماندار اور پڑھے لکھے'' سکریٹری بھی اس دوسرے گروہ میں تھے جس سے رشید حسن خاں وابستہ اور متفق تھے۔ غرض یہ کہ عدم منافقت کے رویے کے تربیت یافتہ رشید حسن خاں، پارٹی کی نام نہاد آئیڈیالوجی سے متفق نہ ہو سکے لیکن یونین کی حقیقی روح کے مطابق استحصال کے خلاف سینہ سپر رہنے پر قائم تھے، کمیونسٹوں سے ایسے اختلافات کے ساتھ جب وہ انھی کے پروردہ اُردو کے ادیبوں کو دیکھتے ہیں اور اُن کے ادب کو پڑھتے ہیں تو وہی قول وفعل میں تضاد انھیں وہاں بھی نظر آتا ہے جس سے انھیں اتفاق نہیں۔ لہٰذا ترقی پسند ادب اور ادیب بھی اسی وجہ سے اُن کی سخت تنقید کا نشانہ بنتے ہیں۔

ترقی پسندی کو رشید حسن خاں جس قدر اپنی تحریر کا موضوع بناتے ہیں۔ اس سے ترقی پسندی سے بیزاری یا نفرت مراد نہیں بل کہ ترقی پسندی کے اعلا مقاصد کا پورا نہ ہونے کا غم وغصہ ہے۔ رشید حسن خاں ترقی پسند تحریک کے ممبر کبھی نہیں رہے ترقی پسندی محض تحریک کا ممبر ہونا نہیں بل کہ مفاہمت اور مصلحت سے بے نیاز ہو کر حق گوئی سے کام لیتے ہوئے استحصالی اور استعماری قوتوں کے خلاف آواز بلند کرنا اور اس پر قائم رہنا ہے۔ رشید حسن خاں نے نسلی اثرات اور خاندانی تربیت سے بھی یہی کچھ سیکھا تھا سو یہ قدر مشترک ہے ان کے ترقی پسند ہونے کی ایک اور وجہ۔ جب ترقی پسند ادیب ان کی اس توقع پر پورے نہیں اترتے تو وہ اُن کے خلاف بولتے اور لکھتے ہیں۔ ان کی خاندانی تربیت نے اگر انھیں حق گوئی سکھائی تو ٹریڈ یونین سے وابستگی نے انھیں اپنے حق کے لیے لڑنا سکھایا۔ یوں ان کی یونین سے وابستگی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس کے اثرات سے انکار کیا جا سکتا ہے۔

ٹریڈ یونین سے وابستگی نے نہ صرف رشید حسن خاں کی صاف گوئی اور عدم منافقت وعدم مصلحت کے رویے کو پختہ کیا بل کہ ان کی شخصیت پر کچھ اور اثرات بھی مرتب کیے۔ جس سے صحیح معنوں میں وہ آزاد خیال اور لبرل بن سکے ورنہ مدرسے کا تربیت یافتہ اور گھر کے کٹّر مذہبی ماحول کا پروردہ اس قدر لبرل نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ وہسکی کا شوق بھی رکھتا ہو اور کلین شیو بھی کرواتا ہو۔ نیز یہ کہ ٹھ ملائیت کے خلاف بھی ساری زندگی علم بغاوت بلند رکھے۔

رشید حسن خاں کی ٹریڈ یونین سے وابستگی فیکٹری کے حدود تک محدود نہیں تھی۔ مقامی لیڈروں کے گھروں میں بھی اس کے جلسے ہوتے تھے اور محفلوں میں بھی اس کا تذکرہ ضرور رہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ رشید حسن خاں جب اسلامیہ ہائر سکنڈری اسکول میں ملازمت کے اُمیدوار تھے تو مولانا یوسف نے ان کے کمیونسٹ ہونے کو بنیاد بنا کر ان کے خلاف پروپیگنڈا کرنا چاہا۔ رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

''مولانا یوسف صاحب نے بعد نمازِ جمعہ منبر سے یہ اعلان کیا کہ یہ شخص چوں کہ کمیونسٹوں کے ساتھ ٹریڈ یونین میں کام کرتا رہا ہے اور کمیونزم کو مانتا ہے اس لیے یہ مسلمان نہیں ہوسکتا اور ایسے شخص کو اسلامیہ اسکول میں جگہ کیسے دی جاسکتی ہے۔''18

کہنا یہ ہے کہ رشید حسن خاں اپنی ترقی پسندی کی وجہ سے ساری زندگی کلین شیو بھی رہے اور یہ آزادی اور آزاد خیالی بھی یونین سے وابستگی کے زمانے میں انھوں نے حاصل کر لی ہوگی۔ یہ کوئی کلیہ تو نہیں کہ جو شراب پیتا ہو اور کلین شیو ہو وہ ضرور کمیونسٹ ہی ہوگا یا جس کی داڑھی نہ ہو اور وہ شراب نہ پیتا ہو، وہ کمیونسٹ نہیں ہوسکتا۔ لیکن کمیونسٹ یا ترقی پسند چوں کہ لبرل ہوتے تھے اور ایسی علامتیں اکثر ان کی خاص شناخت رہی ہیں۔ اس کے ساتھ ایک عنصر بھی ہے یعنی کٹھ ملائیت کے خلاف ہونا۔ اس بات پر بھی رشید حسن خاں پوری زندگی قائم رہے۔ کمیونسٹوں کی طرح عرف عام میں وہ دہریے تو نہیں تھے۔ حنفی عقیدے کے سچے مسلمان تھے اور خدا کی قدرت پر کامل یقین رکھتے تھے۔ خود پابند صوم وصلاۃ نہیں تھے لیکن اسلامی شعار کی پابندی کا درس اپنے بچوں کو ضرور دیتے تھے لیکن محض برائے بیت یا یہ کہ ترقی پسندوں کی طرح فیشن کے طور پر یا کٹھ ملائیت پر طنز کے طور پر اپنے خطوں میں جب ایسے جملے لکھتے ہیں کہ ''اللہ ہم سب پر مہربانی کرے'' یا ''خدا خیر و عافیت سے رکھے'' تو اکثر لفظ ''اللہ'' اور ''خدا'' کے بعد قوسین میں ایسے جملے ضرور لکھتے ہیں ''خدا (اگر وہ کہیں ہے)''۔ اس کے علاوہ کٹھ ملائیت اور مذہبی کٹر پن کے بارے میں بھی بہت آزادی سے لکھتے ہیں۔ بل کہ اُن کے اسلوب بیان سے اکثر مرزا غالب یاد آجاتے ہیں۔ غرض یہ سارے شواہد انھیں ترقی پسند ثابت کرتے ہیں اور اس آزاد خیالی اور ترقی پسندی کی کارفرمائی اُن کی ساری زندگی میں نظر آتی ہے۔ تسلیم غوری بدایونی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''خاں صاحب کے مزاج میں کمیونزم کا اثر تھا۔ چوں کہ ابتدائی زندگی میں جب وہ شاہ جہاں پور کی آرڈیننس فیکٹری میں ملازم تھے اس وقت وہ ٹریڈ یونین سے بھی وابستہ رہ چکے تھے جس نے ان کے ذہن کو استرا کی بنا دیا تھا اور وہ کمیونزم میں یقین رکھنے لگے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی میں ان کی کسی بات پر انشاء اللہ کہتا تو وہ ٹوک دیتے کہ اللہ میاں کو بیچ میں کہاں سے لے آئے، اس کے پاس اتنا وقت کہاں ہے کہ وہ آپ کے کاموں یا آپ کو دیکھے، اسے اور کام بھی ہیں۔ لفظ ''انشاء اللہ'' کہنے پر انھوں نے مجھے کئی مرتبہ ٹوکا۔'' 19

مذہب کی تعلیم تو اُن کی گھٹی میں تھی اور ابتدائی عمر کے چند برس تو انھوں نے ضرور باقاعدہ اس علم کو حاصل کیا اور اس پر عامل بھی رہے ہوں گے۔ اس کے بعد ٹریڈ یونین کی تربیت کے زیر اثر اُن کی زیادہ توجہ مذہب کے نام پر کی جانے والی خرابیوں کی طرف ہوگئی جس وجہ سے کٹھ ملائیت اور کٹر پن سے وہ ہمیشہ دور رہے اور اکثر اس سوچ کی نفی بھی کرتے رہے۔ رشید حسن خاں، رئیس احمد نعمانی کو 12 جنوری 1989 کے خط میں لکھتے ہیں:

''خدا آپ کو مولویوں کے شر سے بچائے، اگر چہ اللہ میاں بھی آج تک کسی کو ان کے پنجۂ ستم سے بچا نہیں پائے ہیں۔ بہت بُری قوم ہے یہ۔''20

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کو 25 اپریل 1985 کے خط میں لکھتے ہیں:

''کٹھ ملائیت نے الگ اپنا جال بچھا رکھا ہے اور ذہنوں کو مفلوج اور ناکارہ بنا رکھا ہے۔''21

رشید حسن خاں کے ان جملوں سے کٹھ ملائیت اور مذہبی کٹر پن سے ان کی بیزاری اور نفور کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح آل انڈیا ریڈیو کے لیے رفعت سروش نے رشید حسن خاں کا ایک انٹرویو کیا جو جس سے انھیں پہلی بار معلوم ہوا کہ رشید حسن خاں فیکٹری کی ملازمت کے زمانے میں ٹریڈ یونین سے وابستہ تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

''وہ دہلی آنے سے قبل ایک فیکٹری میں ملازم تھے۔ بائیں بازو کی سیاست سے متعلق تھے اور فیکٹری کی ٹریڈ یونین کے لیڈر تھے۔ یہاں سے مجھے معلوم ہوا کہ آخر وہ اتنے Bold کیوں ہیں۔ ٹریڈ یونینسٹ تھے۔''22

غرض یہ کہ ٹریڈ یونین سے وابستگی کی وجہ سے ترقی پسندی کے ان کی شخصیت پر اثرات تھے اور وہ ترقی پسند نظریات کے حامل تھے۔ اُن کا موضوع چوں کہ تحقیق تھا اور اس موضوع پر لکھتے ہوئے انھوں نے ہمیشہ ترقی پسندانہ انداز اپنایا۔ اس وجہ سے انھیں اُردو کا پہلا ترقی پسند محقق کہا جاسکتا ہے۔ البتہ یہ احتیاط انھوں نے ضرور برتی کہ ترقی پسندوں کی سنجیدگی، متانت اور علمیت کو پیش نظر رکھا۔ دوسرا یہ کہ فارسی شاعری کے گہرے مطالعے اور کلاسیکی اُردو ادب کے مطالعے کے پیش نظر اور زیر اثر، ترقی پسندوں کے جدت کے چکر میں آ کر اس روایت کو بھلانے اور صحت زبان کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے رشید حسن خاں اُن کے خلاف لکھتے ہیں اور نام نہاد ترقی پسندوں کے ایسے رویوں ہی کی وجہ سے وہ خود پر ترقی پسندی کا لیبل چسپاں نہیں ہونے دیتے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اُن کی علمی شخصیت کی تعمیر میں نسلی اثرات، خاندانی تربیت اور اساتذہ کے فیض کے ساتھ ٹریڈ یونین اور ترقی پسندی کے اثرات بھی واضح ہیں اور ان کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے۔

حواشی اور حوالہ جات:

1۔ یہاں کمپوزنگ کی غلطی سے ''1929'' لکھا رہ گیا ہے۔ یہ اصل میں ''1939'' ہی ہوگا۔

2۔ رشید حسن خاں، ''رشید حسن خاں کا ایک یادگار خط'' مشمولہ: سہ ماہی، روشنائی، جلد 7، شمارہ 26، کراچی: جولائی تا ستمبر 2006، ص: 156۔157

3۔ رشید حسن خاں ''کچھ اپنے بارے میں''، مشمولہ: اظہار، شمارہ: 5 بمبئی، 1984، ص: 21

4۔ رشید حسن خاں۔ ''کچھ اپنے بارے میں''، مشمولہ: بازیافت، جنوری 2002، ص 158

5۔ ڈاکٹر تابش مہدی کا بیان درست نہیں کہ ''عمر کے دسویں برس میں داخل ہوتے ہی اُنھوں نے 1939 کے اواخر میں شاہ جہاں پور کی آرڈیننس کلودنگ فیکٹری میں مزدور کے طور پر ملازمت کر لی''۔ (ماہ نامہ نیا دور (ایک شمارہ رشید حسن خاں کے نام)، جلد، 62، نمبر: 9، لکھنؤ، دسمبر 2007، ص 32،

ان کی غلط فہمی کا سبب رشید حسن خاں کی تاریخِ ولادت 10 جنوری 1930 کو درست سمجھ لینا ہے۔

6۔ شبیر عباسی، ''حیات اور شخصیت چند پہلو''، مشمولہ: ماہ نامہ نیا دور (ایک شمارہ رشید حسن خاں کے نام)، جلد، 62، نمبر: 9، لکھنؤ، دسمبر 2007، ص 45

7۔اطہر فاروقی،''رشید حسن خاں: سوانحی خاکہ''،مشمولہ کتاب نما(خصوصی شمارہ؛رشید حسن خاں حیات اور ادبی خدمات)،مرتبہ اطہر فاروقی،دہلی،مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،پہلی بار،جولائی 2002،ص 10۔11
8۔شبیر عباسی،''حیات اور شخصیت چند پہلو''،مشمولہ؛ماہ نامہ نیا دور(ایک شمارہ رشید حسن خاں کے نام)،جلد،62،نمبر:9،لکھنؤ،دسمبر 2007،ص 45
9۔خلیق انجم،ڈاکٹر،''ممتاز محقق اور متنی نقاد؛رشید حسن خاں''مشمولہ ہفت روزہ ہماری زبان(رشید حسن خاں نمبر)شمارہ نمبر؛36،35،34،33 جلد نمبر؛65،نئی دہلی:یکم تا 28 ستمبر 2006،ص 4
10۔رشید حسن خاں۔''کچھ اپنے بارے میں''،مشمولہ؛بازیافت،جنوری 2002،ص 159
11۔عابد حسین،کلیم بریلوی،بحوالہ،ڈاکٹر شمس بدایونی،''رشید حسن خاں کی یاد میں''،مشمولہ ہفت روزہ ہماری زبان(رشید حسن خاں نمبر)ص 31
12۔رشید حسن خاں''کچھ اپنے بارے میں''،مشمولہ؛بازیافت،شمارہ 1،لاہور،شعبۂ اُردو پنجاب یونی ورسٹی،جنوری 2002،ص 160۔161
13۔ابتدا میں رشید حسن خاں املا میں بعض انقلابی تبدیلیوں کے قائل تھے۔ان الفاظ کا املا اس خط میں اُن کے اسی زمانے کی روش کے مطابق رکھا گیا ہے۔
14۔رشید حسن خاں،''رشید حسن خاں کا ایک یادگار خط''،مشمولہ؛سہ ماہی روشنائی،جلد 7،شمارہ 26،کراچی،جولائی تا ستمبر 2006،ص 157۔158
15۔رشید حسن خاں۔''کچھ اپنے بارے میں''،مشمولہ؛بازیافت،جنوری 2002،ص 162
16۔رشید حسن خاں،کچھ اپنے بارے میں،مشمولہ اظہار،1984،ص 21
17۔رشید حسن خاں۔''کچھ اپنے بارے میں''،مشمولہ؛بازیافت،جنوری 2002،ص 160
18۔رشید حسن خاں،''رشید حسن خاں کا ایک یادگار خط...''،مشمولہ؛سہ ماہی روشنائی،جلد 7،شمارہ 26،کراچی،جولائی تا ستمبر 2006،ص 157
19۔تسلیم غوری بدایونی،''رشید حسن خاں: کچھ یادیں کچھ باتیں''،مشمولہ؛ہماری زبان(رشید حسن خاں نمبر)،ص 14
20۔رشید حسن خاں رشید حسن خاں کے خطوط،مرتبہ؛ٹی آر رینا،نئی دہلی،قومی کانسل برائے فروغ اُردو،2012،ص 463
21۔رشید حسن خاں رشید حسن خاں کے خطوط،مرتبہ؛ٹی آر رینا،ص؛927
22۔رفعت سروش؛''رشید حسن خاں''،مشمولہ؛سہ ماہی روشنائی،ستمبر 2006،ص 149
(تحقیق نامہ،شعبۂ اُردو،جی سی یونی ورسٹی،لاہور،شمارہ 13،اشاعت؛جولائی تا دسمبر 2013،صفحہ 34۔47)

○○○

ڈاکٹر منور حسن کمال

تحقیقی استدراکات کا معتبر نام: رشید حسن خاں

اُردو میں ادبی تحقیق اور تدوین کا آغاز حافظ محمود شیرانی سے ہوتا ہے۔اس ضمن میں ایک دوسرا نام قاضی عبدالودود کا بھی سرِفہرست ہے۔جن کی تحریروں نے تحقیقی احتساب کی روایت کو وسعت بخشی۔

رشید حسن خاں(جنوری 1930-26 فروری 2006)نے اس روایت کو نہ صرف پروان چڑھایا،بل کہ ایک اعتبار بھی بخشا۔رشید حسن خاں اُردو،عربی اور فارسی کے معتبر عالم تھے۔(عالم کو صرف مذہبی علوم سے واقفیت رکھنے والوں کے لیے محدود نہیں کیا جاسکتا)وہ بغیر کسی لاگ لپیٹ کے حقائق کو دریافت کرنے کے فن سے بہ خوبی واقف تھے۔ان کو بغیر کسی تکلف اور تردد کے منظرِ عام پر لانے میں بھی نہیں ہچکچاتے تھے۔ان کا نام اُردو دنیا میں بے حد احترام سے لیا جاتا ہے۔

رشید حسن خاں نے مفتی مجتبیٰ حسن سے کسبِ فیض کیا۔ان کی تربیت میں بھی ان کا نمایاں حصہ رہا ہے۔اساتذہ معنوی کی حیثیت سے حافظ محمود شیرانی،قاضی عبدالودود،ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور مولانا عرشی کا نام قابلِ ذکر ہے۔انھوں نے نیاز فتح پوری سے فیض حاصل کیا۔درسِ نظامی کے طالب کی حیثیت سے ان کا شعور پختہ ہوا۔پھر وہ اچانک 1941 میں ٹریڈ یونین کے دائرے میں آ گئے،لیکن بعد میں بعض تلخ تجربات کی بنا پر ان کا سیاسی نقطۂ نظر بدل گیا۔فارسی شاعری اور کلاسیکی اُردو ادب کے مطالعے نے ان کے ذہن میں ذوق اور معیار کا ایک تصور بیدار کیا تھا،جس کی بدولت انھوں نے صحافت،نعرے بازی اور ادب میں فرق کو محسوس کیا۔اسی مناسبت نے رشید حسن خاں کو تحقیق کی جانب متوجہ کیا۔یہ میدان ان کی طبعی مناسبت کے موافق تھا۔اسی لیے وہ اسی جانب متوجہ ہو گئے۔ادبی تحقیق اور تدوین ان کے پسندیدہ موضوعات تھے۔

رشید حسن خاں کو پہلے پہل شہرت فیض احمد فیض کے حوالے سے لکھے گئے مضمون کے شائع ہونے پر ملی۔انھوں نے فیض کی شاعری میں زبان و بیان کی غلطیوں کی گرفت کی تھی۔بقول پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی یہ مضمون قومی آواز(لکھنؤ)میں شائع ہوا تھا۔اس میں فیض کی ایک مشہور نظم کے شعر:

کیسے شفاف حسیناؤں کے برفاب سے جسم
گرم ہاتھوں کی حرارت سے پگھل جاتے ہیں

پر رشید حسن خاں نے سخت اعتراض کیا تھا۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ برفاب تو خود برف کا پانی ہے، وہ کیسے پگھلے گا۔ یہاں برف ہونا چاہیے تھا۔ رشید حسن خاں گرم ہاتھوں کی حرارت سے پگھلنے والے حسیناؤں کے جسم کے پیچ وخم میں الجھے بغیر'برف' اور'برفاب' کی معنوی تہوں سے اُردو دنیا کو روشناس کرا رہے تھے۔ معروف ناقد ڈاکٹر جمیل جالبی نے لکھا ہے:

''تعلیمی، علمی و تحقیقی ادارے سیاسی اکھاڑے بن گئے ہیں اور استاد اہل علم فتح حاصل کرنے کے لیے جنگلی مرغوں کی طرح ان اکھاڑوں میں اترے ہوئے ایک دوسرے کو نئے داؤ پیچ سے شکست دینے میں لگے ہوئے ہیں۔ یہاں کلی اقتدار حاصل کرنے کی خواہش یہ سب کھیل کھلا رہی ہے اور یہ لوگ تعلیم و علم کی روشنی پھیلانے کے بجائے ایک دوسرے کو کاٹنے اور رد کرنے میں مصروف ہیں۔''

لیکن جب ہم رشید حسن خاں کی تحقیق کا جائزے لیتے ہیں تو ان کی تحقیق اس بات کی نفی کرتی ہے۔ وہ کسی کو بلاوجہ کاٹنے یا رد کرنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے ہمیشہ متنی تحقیق کی روشنی میں گفتگو کی۔ گو ان کی گفتگو اکثر سخت کھردری ہوتی تھی، لیکن وہ لہجے کی اس کاٹ سے گریز کرتے تھے، جو متن کے موجد کو گراں گزرتی ہو۔ انھوں نے اپنی دانست میں اس علم کے ذریعہ روشنی پھیلانے کی ممکنہ تحقیقی شواہد سامنے آنے پر بھی ناگواری محسوس کرتے ہیں۔

ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے متن کی تاریخ کے مسائل کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ الف: تبئیض متن، ب: کتاب متن، ج: انطباع متن یعنی کسی متن کی تبئیض یا تالیف کب ہوئی، تاریخ کتابت متن کیا ہے، اس کے قلمی، ہم عہد، قریب العہد اور بعد کے نسخوں کے متن میں کوئی فرق ہے یا نہیں۔ اسی طرح اس کی قریب العہد اور بعد کی طباعتوں میں کوئی مماثلت یا عدم مماثلت کی صورت کیا ہے۔ رشید حسن خاں نے جن کتابوں کی تدوین کی ان تینوں باتوں کو ملحوظ رکھا اور متنی تحقیق کے اصولوں کی روشنی میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا۔

تحقیق اور تدوین کا براہ راست مطالعے اور تصدیق سے تعلق ہے۔ رشید حسن خاں نے اس اصول پر پوری طرح عمل کیا ہے۔ ان کے نزدیک ادبی تحقیق میں کسی امر کا وجود بطور واقعہ اسی صورت میں متعین ہوگا، جب اصولِ تحقیق کے مطابق اس کے متعلق معلومات حاصل ہوں۔ تحقیق ایک مسلسل عمل ہے، نئے واقعات کا علم ہوتا رہے گا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کون سی حقیقت کتنے پردوں میں چھپی ہوئی ہے۔ اکثر صورتوں میں ہوتا یہ ہے کہ حجابات بہ تدریج اٹھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تحقیق میں اصلیت کا تعین اس وقت تک کی حاصل شدہ معلومات پر مبنی ہوتا ہے۔ رشید حسن خاں تحقیق میں اعداد و شمار اور مطلق حقائق کے تعین کو بنیادی چیز قرار دیتے ہیں، لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ حقائق کے تعین کے بعد یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ ان سے کیا نتائج برآمد ہوئے اور ان سے علم و آگہی میں کس نوعیت کا اضافہ ہوا۔

رشید حسن خاں اپنے فیصلوں میں کسی نوع کی لچک یا دورنگی کو خارج از بحث خیال کرتے تھے۔ وہ صرف اس رائے کو منوانا چاہتے تھے جس کی استنادی حیثیت مسلم ہو۔

واقعات کے بیان میں سنین کا اندراج التزام کے ساتھ کیا جانا چاہیے۔ تحقیق کے نقطۂ نظر سے یہ التزام کے ساتھ اس کے مآخذ کا بھی حوالہ دیا گیا ہو۔ اس سلسلے میں سن عیسوی اور ہجری میں مطابقت کا مسئلہ بھی بڑا نازک ہے۔ اس معاملے میں خصوصیت کے ساتھ احتیاط اور ژرف نگاہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ''علی گڑھ تاریخ ادبِ اُردو'' پر گفتگو کرتے ہوئے رشید حسن خاں نے لکھا ہے:

''تاریخ و ماہ نہ معلوم ہونے کی صورت میں اس کا لحاظ رکھا جاتا ہے کہ اگر سن ہجری کے مقابل سن عیسوی شروع ہو جاتا ہے تو وہ دونوں سن عیسوی درج کیے جائیں۔ اس کے بغیر صحیح تعین نہیں ہو سکتا۔''

انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس کتاب میں ناموں کے آگے سنین قوسین میں درج ہیں۔ اس سلسلے میں کسی ایک قاعدے کی پابندی نہیں کی گئی ہے۔ کہیں سنین سن ولادت و وفات ظاہر کرتے ہیں، کہیں زمانۂ حکومت کو صراحت نہ یہاں ہے نہ وہاں۔

ادب کی تاریخیں طلبا اور عام شائقین کے استفادے کے لیے لکھی جاتی ہیں، اس لیے ان میں ایسے واقعات و بیانات کے شمول سے احتراز کرنا چاہیے، جو ناپختہ ذہنوں پر اثر انداز ہوں، اس سے تاریخ نگاری اور تاریخ نگار دونوں متاثر ہوتے ہیں، بل کہ تاریخ نگار کے استصواب رائے پر حرف آتا ہے۔

تاریخ ادب اُردو سے بہت سی مثالیں پیش کر کے رشید حسن خاں نے اس خدشہ کا اظہار کیا ہے کہ طلبا جب ایسی اہم کتاب میں ایسے جملے پڑھیں گے تو یہ غلط نگاری ان کے لیے سند کا کام دے گی۔

تحقیق و صحتِ زبان سے متعلق تحریک میں شائع علی گڑھ تاریخ ادب اُردو پر ہنگامہ خیزی کے بعد یہ کتاب بک سیلروں کے یہاں سے اٹھالی گئی تھی۔ یہ شرف بھی رشید حسن خاں کو ہی حاصل ہے۔ شاید ایسا اُردو دنیا میں پہلی بار ہوا تھا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے 15 فروری 1964 کے 'صدق جدید' میں ماہنامہ تحریک کے حوالہ سے لکھا کہ اُردو ادب کے بہی خواہوں کو یہ سن کر مسرت ہوگی کہ ''علی گڑھ تاریخِ ادب اُردو'' کی فروخت روک دی گئی ہے۔ 'واضح ہو کہ یہ کتاب پروفیسر آل احمد سرور اور مجنوں گورکھپوری کی ماتحتی میں ترتیب دی گئی تھی۔ اول الذکر اس کے ڈائریکٹر اور ثانی الذکر اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھے۔

'اُردو املا' سے متعلق کتاب میں انھوں نے بڑی دقت نظر کے ساتھ صحت زبان کی جانب توجہ دلائی ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں اُردو املا کی معیار بندی پر بڑا زور دیا ہے۔ ان کی اصلاح املا کی کوششوں سے یہ فائدہ ہوا کہ بعض الفاظ کو لکھنے سے متعلق انتشار کم ہوا اور صحت کے ساتھ لکھنے والوں کے لیے کچھ اصول سامنے آگئے، بڑے پیمانے پر کوئی منضبط اصول مرتب نہ ہونے کی بنا پر سب انتشار باقی تھا۔ ایسے وقت میں رشید حسن خاں نے اپنے مطالعے اور تحقیق کے بعد چند اصول متعین کیے۔ انھوں نے پہلی بار بڑے پیمانے پر ہمارے علمی اور ادبی سرمائے کا جائزہ لیا اور بتایا کہ املا کے معاملے میں انتشار و اختلاف کی نوعیت کیا ہے اور اس صورت حال سے طلبا اور عام لکھنے والوں کو کیسی الجھنوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس سلسلے میں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی نے ان کی کتابیں 'اُردو کیسے لکھیں' اور 'عبارت کیسے لکھیں' شائع کیں۔ ان کی اشاعت کے بعد اُردو کے ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کے اندازِ نگارش پر واضح اثرات مرتب ہوئے۔ دو لفظوں کو ملانے یا کہیں کہیں اس سے زیادہ لفظوں کو ملانے کا چلن تھا، ان کتابوں کی اشاعت کے بعد یہ چلن ختم ہوا اور لفظوں کو اس طرح لکھنے کا چلن عام ہوا کہ معمولی پڑھا لکھا بھی عبارت کو درست طور پر پڑھ سکتا ہے۔ جب کہ ملے ہوئے لفظوں کو پڑھنے میں بعض اوقات اوسط پڑھے لکھے لوگ بھی غچہ کھا جاتے ہیں۔

رشید حسن خاں نے باغ و بہار، فسانۂ عجائب کی تدوین کر کے ایک اہم فریضہ انجام دیا۔ ان کے اس کام کی ہر جگہ تعریف کی گئی، ان کی خدمات کو سراہا گیا۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے لکھا ہے:

''رشید حسن خاں نے فسانۂ عجائب اور باغ و بہار کو اس انداز سے مدون کیا ہے اور یہ ایسے مکمل اور مثالی کام ہیں جن کی نظیر نہ ماضی میں ملتی ہے، نہ عرصے تک مستقبل میں ملنے کی امید ہے۔ یہ کتابیں تدوین کا ایسا بیش بہا خزینہ ہیں جن میں لامتناہی دولت چھپی وہئی ہے۔''

رشید حسن خاں نے جو تحقیق و ترتیب اور تدوین کے کام میں خدمات انجام دی ہیں، یہ بجا طور وہ اس کے مستحق ہیں کہ ان کے کارنامے سنہری حروف سے لکھیں جائیں۔ یقیناً ان کے علمی کارناموں پر اُردو دنیا ہمیشہ فخر و ناز کرتی رہے گی۔

رشید حسن خاں۔حیات اور خدمات : تاریخ کی روشنی میں؛

نام: رشید حسن خاں

پیدائش: 10 جنوری 1930

شرف تلمذ: حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، مولانا عرشی

ٹریڈ یونین میں شمولیت: 1941

ٹریڈ یونین سے علیحدگی: 1945

بحیثیت محقق خدمات کا آغاز: 1955

ملازمتیں: آرڈیننس کلودنگ فیکٹری شاہ جہاں پور، مدرسہ فیض عام شاہ جہاں پور، اسلامیہ ہائر سکنڈری اسکول، شاہ جہاں پور، شعبۂ اُردو، دہلی یونی ورسٹی

سبک دوش: 31 دسمبر 1989 کو دہلی یونی ورسٹی کی ملازمت سے

وفات: 26 فروری 2006 شاہ جہاں پور

تالیف و تصانیف:

1۔انتخاب نظیرا کبرآبادی 1970

2۔انتخاب شبلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 1971

3۔انتخاب مراثی انیس و دبیر، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 1971

4۔دیوان خواجہ میرؔ درد، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 1972

5۔انتخاب ناسخ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 1972

6۔انتخاب سودا، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 1974

7۔اُردو املا: ترقی اُردو بورڈ، نئی دہلی، 1974

8۔اُردو کیسے لکھیں: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 1975

9۔زبان اور قواعد (لفظ، تلفظ اور قواعد شاعری) ترقی اُردو بورڈ، نئی دہلی، اشاعت اول 1976، اشاعت ثانی 1983

10۔ادبی تحقیق، مسائل و تجزیہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 1978، اشاعت اول، اتر پردیش اُردو اکادمی لکھنؤ اشاعت ثانی، لاہور اشاعت ثالث

11۔تلاش و تعبیر: (تنقیدی مضامین) اُردو اکادمی دہلی کی اعانت سے 1988

12۔فسانۂ عجائب (تدوین) انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی 1990

13۔باغ و بہار: (تدوین انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، 1993

14۔تفہیم: (تنقیدی اور تحقیقی مضامین) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 1993

15۔انشا اور تلفظ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 1994

16۔عبارت کیسے لکھیں: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 1994

17۔انشائے غالب: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 1994

18۔مثنوی گلزار نسیم: انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، 1995

19۔مثنویاتِ شوق لکھنوی (تدوین): انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی

20۔غرائب اللغات (تدوین)*

انعامات و اعزازات:

دہلی ساہتیہ کلا پریشد ایوارڈ 1977

یوپی اُردو اکادمی انعام (لکھنؤ) 1978

غالب ایوارڈ 1979

امتیاز میر ایوارڈ (میر اکیڈمی، لکھنؤ) 1980

نیاز فتح پوری ایوارڈ (کراچی) 1989

نیشنل ایوارڈ مہاراشٹر اُردو اکادمی، 1990

محمد طفیل ادبی ایوارڈ (لاہور) 1990

کل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ (اُردو اکادمی دہلی) 1991

نیشنل حالی ایوارڈ (ہریانہ اُردو اکادمی) 1991

نیشنل حالی ایوارڈ (ہریانہ اُردو اکادمی) 1992

یوپی اُردو اکادمی انعام 1994

(ماہ نامہ کتاب نما، جلد 46، شمارہ 5، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، مئی 2006، صفحہ 41 تا 47)

*۔رشید حسن خاں صاحب نے غرائب اللغات کی تدوین کا مصمم ارادہ کیا ہوا تھا۔اس کے لیے انھوں نے خاطر خواہ مواد بھی جمع کر لیا تھا۔لیکن عمر عزیز نے وفا نہ کی۔یہ تدوینی کام منصۂ شہود پر نہ آ سکا۔مرتب)

○○○

صائمہ سعید
(جھنگ، پاکستان)

رشید حسن خاں بہ حیثیت محقق

رشید حسن خاں 10 جنوری 1930 کو پیدا ہوئے اور 26 فروری 2006 کو فوت ہوئے۔تاہم ان کی تاریخ پیدائش کے بارے میں اختلافِ رائے ہے۔بہت سے محققین اور نقادوں نے ان کی تاریخ پیدائش کے سلسلے میں مختلف بیانات دیے ہیں۔رشید حسن خاں کی اسناد پر ان کی تاریخِ پیدائش 10 جنوری 1930 ہی درج کی گئی ہے۔جب کہ بہت سے نقادوں نے ان کی تاریخِ پیدائش 1925 میں دسمبر 25 لکھی ہے۔ڈاکٹر خلیق انجم کہتے ہیں کہ رشید حسن خاں نے انھیں خود بتایا تھا کہ ان کی تاریخ پیدائش 1930 نہیں بل کہ 1925 ہے۔(1)

رشید حسن خاں نے باقاعدہ کوئی تعلیم حاصل نہیں کی بل کہ ان کے کہنے کے مطابق ان کی عربی فارسی کی ابتدائی تعلیم بھی مکمل نہیں تھی۔انھوں نے ادبی دنیا میں جو مقام حاصل کیا وہ ان کا ذاتی مطالعہ اور مطالعہ کا شغف تھا جس کی بدولت وہ آج دنیا میں ایک اہم مقام پر پہنچ گئے۔رفعت سروش رشید حسن خاں کے تعلیم کے بارے میں لکھتے ہیں: ''وہ شاہ جہاں پور کے مدرسے، بحر العلوم سے فارغ التحصیل تھے۔درسِ نظامی کے طالب علم رشید حسن خاں نے اپنی ذاتی دل چسپی اور طلب علمی کے سبب علم وادب کے وہ مدارج طے کیے جو کم لوگوں کے نصیب میں ہوتا ہے۔انھوں نے گیارہ سال تک اسلامیہ ہائر سکینڈری اسکول (شاہ جہاں پور) میں اُردو اور فارسی کی تدریسی خدمات انجام دیں جب کہ انھوں نے دہلی یونی ورسٹی میں ریسرچ افسر کے عہدے پر 1989 تک کام کیا۔ابتدا میں وہ مقامی ٹریڈ یونین سے بہ حیثیت فیلڈ ورکر وابستہ ہوئے تھے،مگر ان کے علمی تجسس اور تحقیقی مزاج نے انھیں علم واب کے میدان کا وہ شہ سوار بنا دیا کہ جس کی مثال اس دور میں نایاب ہے۔''(2)

رشید حسن خاں نے اپنی زندگی کا زیادہ تر حصہ دلّی میں گزارا لیکن اپنی زندگی کے آخری دس سال اپنے آبائی وطن شاہ جہاں پور میں گزارے۔ ان کے پس ماندگان میں ایک صاحب زادی اور دو صاحب زادے ہیں۔ انھوں نے فروغِ ادب میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کے ادبی کارناموں کی ایک طویل فہرست ہمیں ملتی ہے۔ انھوں نے اُردو زبان کی اصل پر تحقیق کی اور درست الفاظ بتائے اور اصول و قوانین مرتب کیے کہ اُردو زبان درحقیقت کس طرح سے لکھی جائے۔ انھیں کی کوششوں کی بدولت آج ہم درست لکھ سکتے ہیں۔ اُردو زبان کی ترقی کے لیے انھوں نے تحقیقی میدان میں جو خدمات پیش کیں ان میں ''اُردو املا''، ''اُردو کیسے لکھیں''، ''زبان و قواعد (لفظ، تلفظ اور شاعری)''، ''انشا اور تلفظ''، ''عبارت کیسے لکھیں'' شامل ہیں جو بالترتیب 1974، 1975، 1976، 1994، اور 1994 میں شائع ہوئیں۔ رشید حسن خاں نے ''فسانۂ عجائب'' کی 1990 میں، ''باغ و بہار'' کی 1993 میں، جب کہ ''غرائب اللغات'' اور ''مثنویاتِ شوق لکھنوی کی 1995 میں انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی سے تدوین کے بعد شائع کروائیں۔ اس کے علاوہ ''انتخابِ نظیر اکبرآبادی'' 1970 میں، ''انتخابِ شبلی'' اور ''انتخابِ مراثی انیس و دبیر'' 1971 میں، ''دیوانِ خواجہ میر درد'' اور ''انتخابِ ناسخ'' 1972 میں، جب کہ ''انتخابِ سودا'' 1974 میں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی سے شائع کروائیں۔ تحقیق و تنقید کے حوالے سے بھی ان کی کوششیں کسی طور پر کم نہیں ہیں۔ انھوں نے اس میدان میں بھی دوسرے کئی نامور محققین کو پیچھے چھوڑ دیا۔ ان کے کارناموں میں ''ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ'' 1978، ''تلاش و تعبیر (تنقیدی مضامین)'' 1988، ''تفہیم (تنقیدی و تحقیقی مضامین)'' 1993، اور مثنوی گلزارِ نسیم'' 1955 شامل ہیں۔ محمد یونس بلگرامی رشید حسن خاں کے بارے میں لکھتے ہیں: ''رشید حسن خاں کا شمار موجودہ دور کے ان محققین میں ہوتا ہے جن کے دم سے اُردو میں ادبی تحقیق کی آبرو آج بھی قائم ہے۔''(3)

رشید حسن خاں کو اُردو ادب سے خاص لگاؤ تھا، اسی خاص لگاؤ کی وجہ سے وہ ہر کام مکمل دل جمعی سے کرتے تھے اور ان کو اسی محنت کی وجہ سے کئی بڑے اعزازات کے ساتھ ساتھ تقریباً دس بڑے ایوارڈ دیے گئے۔ ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد، رشید حسن خاں کی محنت پسندی کے بارے میں کہتے ہیں: ''رشید حسن خاں ہمارے عہد کے یگانۂ روزگار محقق، بے بدل تدوین کار اور عبقری عالم تھے۔ انھوں نے تحقیق، تدوین، تنقید، قواعد، املا، لغات اور مسائل زبان جیسے متنوع اور دقیق موضوعات پر قلم اٹھایا۔ اور اپنی بے پناہ تحقیقی بصیرت اور علمی لیاقت سے ان موضوعات کو ثمر بار کیا۔ رشید حسن خاں نے حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر مولوی محمد شفیع، قاضی عبدالودود، مولانا امتیاز علی خاں عرشی اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی جیسے اکابرینِ تحقیق کے کمالاتِ علمی اور حالاتِ تحقیق سے کماحقہ استفادہ کیا اور ایک ایسے مبہم آفریں اور صبر آزما جادۂ تحقیق پر سفر کا آغاز کیا، جس پر چلتے ہوئے بڑے بڑے ''محقق'' دو قدموں کی مسافت پر ہانپتے دکھائی دیتے ہیں۔''(4)

رشید حسن خاں ہمیشہ اپنے کام کے لیے وہ میدان اور موضوع منتخب کرتے تھے جو محنت و مشقت طلب ہوتا سہل پسندی ان کے مزاج سے کوسوں دور تھی، اسی لیے وہ میدانِ تحقیق میں سہل پسندی کو سخت ناگوار خیال کرتے تھے۔ وہ ان محققین کے کام کو بھی غیر معتبر خیال کرتے تھے جو سہل پسندی اور عجلت سے کام لیتے ہیں۔ تحقیق کا کام بہت زیادہ محنت و مشقت کا طالب ہے۔ وہ کہتے تھے کہ تحقیقی کام کے لیے ریاضت کی ضرورت پڑتی ہے اور وہ اپنے تحقیقی رجحانات میں اس پر عمل پیرا بھی تھے۔ محمد یونس بلگرامی اس زمرے میں لکھتے ہیں: ''رشید حسن خاں سب سے زیادہ قاضی عبدالودود مرحوم سے متاثر ہیں اور اس بات کا برابر اعتراف بھی کرتے رہتے ہیں۔ قاضی صاحب نے اس میدان میں جو طریقۂ تحقیق اختیار کیا تھا، رشید صاحب نے اپنے آپ کو بڑی حد تک اس کا پابند بنائے ہوئے تھے۔ وہ تحقیق میں سرسری رویے اور سہل نگاری کے شدید مخالف ہیں اور اس بات کے شاکی بھی ہیں کہ اُردو تحقیق، علی العموم، ان دونوں وجود کی بدولت خستہ و خراب رہی ہے۔''(5)

رشید حسن خاں ان تمام کرداری و عملی خوبیوں کے مالک تھے اور تحقیق کے دوران حاصل ہونے والے نتائج کی پروا کیے بغیر کام کرتے تھے اور ہمیشہ سچ کا ساتھ دیتے تھے۔ نامی انصاری ان کی محنت اور مشقت کی ان الفاظ میں تائید کرتے ہیں: ''متنی تحقیق اتنی زیادہ مغز ماری کا کام ہے کہ اوسط درجے کے ذہن کا اسکالر اس کو بھاری پتھر سمجھ کر، چوم کر رکھ دینے کے سوا اور کچھ کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ رشید حسن خاں نے ایک ایک لفظ کو تولا، پرکھا، مختلف ذرائع سے اس کی تصدیق کی اور تب اس کو داخلِ متن کیا، آنکھوں سے تیل ٹپکانے کا اتنا بڑا کام رشید حسن خاں کے علاوہ کوئی دوسرا کر بھی نہیں سکتا تھا۔ حافظ محمود خاں شیرانی اور قاضی عبدالودود نے بھی متنی تدوین میں ایسا کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا۔ ان کی متنی تدوین کی کتابوں کے صرف حواشی اور تعلیقات پڑھ لیجیے تو حیرت سے آنکھیں پھیل جاتی ہیں۔''(6)

رشید حسن خاں سخت مزاج اور تنہائی پسند انسان تھے۔ ان کا سارا وقت تحقیقی کاموں میں یا پھر اپنے چند دوستوں کو خط لکھنے میں گزرتا تھا۔ انہی کے عہد میں ایک اور محقق ''مشفق خواجہ'' بھی اپنی تحقیقی کوششوں کی وجہ سے خاصے مقبولِ عام تھے۔ پروفیسر رفیع الدین ہاشمی، رشید حسن خاں کی زندگی کے چند حصوں کا موازنہ ان الفاظ میں کرتے ہیں: ''مشفق خواجہ اور رشید حسن خاں دونوں ہی بلند پایہ محقق اور مدون تھے۔ مگر دونوں کے مزاج میں فرق تھا۔ خواجہ صاحب طبعاً ایک مجلسی انسان تھے۔ اس کے برعکس رشید حسن خاں تنہائی پسند تھے۔ وہ دہلی میں کافی ہاؤس جاتے تو میز پر تنہا بیٹھے رہتے تھے، کبھی کبھی وہاں بیٹھے بیٹھے دوستوں کو خط لکھنے لگتے۔''(7)

رشید حسن خاں نے ایسے موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے جو ثقاہت سے معمور ہیں لیکن وہ اپنے الفاظ کے انتخاب کی وجہ سے اس کو بھی شیریں بنا دیتے ہیں۔ انھوں نے خشک اور غیر دل چسپ موضوعات کو بھی اپنی خوش رنگ تحریروں کی مدد سے رنگین اور دل چسپ بنا دیا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی تمام تحریریں مکمل جذبے و شوق سے پڑھی جاتی ہیں اور ہر خاص و عام میں مقبول رہی ہیں۔ قاری کا دھیان ان تحریروں سے اِدھر اُدھر بھٹکنے نہیں پاتا بل کہ وہ تحریر میں ہی محو ہو کر رہ جاتا ہے۔ ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد اس ضمن میں لکھتے ہیں: ''رشید حسن خاں کا اسلوبِ نگارش موضوعات کی ثقاہت کے باوجود شعریت کے ذائقے سے معمور ہے۔ انھوں نے انتہائی خشک اور بے رس موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے مگر اسلوب کی خوش رنگی کے باعث ان کی تحریریں ذوق و شوق اور جذبے و اشتیاق کے ساتھ پڑھی جاتی رہی ہیں۔ ان کے مکاتیب میں بھی اسلوب کی یہ رعنائی اپنے تمام تر رنگوں کے ساتھ عکس ریز ہے۔''(8)

رشید حسن خاں مزاجاً سخت گیر انسان تھے وہ کسی ذہنی تعلق یا مفاد کی وجہ سے کسی کے بارے میں منفی یا مثبت رویہ کے قائل نہیں تھے۔ بہت سے ناقدین ان کے اس سخت رویے کی وجہ سے ان سے نالاں تھے اور یہ قدرت کا اصول ہے کہ جو حق بات کہتا ہے اور بے ٹوک تنقید کرتا ہے یا تحقیق کا سچ جواب دیتا ہے اس سے سبھی نالاں اور کٹے رہتے ہیں۔ اس ضمن میں نامی انصاری کا کہنا ہے: ''بعض معتبر اصحاب کا خیال ہے کہ رشید حسن خاں کے اس منفی رویے سے فروغ اُردو کے ایک بڑے اور مفید منصوبے کی جڑ ہی کٹ گئی۔ غلطی ہائے مضامین کو اجاگر کرنا غلط نہ تھا، مگر ان کا جارحانہ بل کہ کسی حد تک مشتمانہ رویہ اس پورے پروجیکٹ کو خاک میں ملانے کا سبب بن گیا۔ اس کام میں ان کے معاون لکھنؤ کے انتہا پسند مولوی، عبدالماجد دریابادی بھی تھے، جنھوں نے صدقِ جدید میں ان کی پُر زور تائید کی تھی۔''(9)

رشید حسن خاں نے تعلیمی و ادبی سرمایہ کے میدان میں ایک چشمے کا سر انجام دیا۔ ان کی خدمات بحرِ بے کنار کی مانند ہیں۔ ان کے بارے میں نکہت بریلیوی لکھتے ہیں: ''رشید حسن خاں سچے، جو پائے کے عالم تھے۔ انھوں نے اپنے پیش رو بزرگوں مثلاً حافظ محمود خاں شیرانی، قاضی عبدالودود، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، مولوی عرشی، اور علامہ نیاز فتح پوری سے بھی ان کے علم و ذہانت سے استفادہ کیا۔ دراصل یہ ان

کے معنوی استاد تھے۔ انھیں تحقیق سے فطری لگاؤ تھا۔ اس کے لیے جس استقلال، مستعدی، دیدہ ریزی اور انہماک کی ضرورت ہوتی ہے، وہ خاں صاحب میں بہ درجہ اتم موجود تھی۔'' (10)

رشید حسن خاں تحقیق و تدوین کی دنیا کے مردِ میدان تھے۔ انھوں نے بہت سی کتابوں کو نئے سرے سے مدون کیا اور ان کو بہت زیادہ چھان پھٹک کے بعد سب سے مستند نسخے کو اغلاط اور سقوم سے پاک کرنے کے بعد شائع کروایا۔ انھوں نے ''فسانۂ عجائب'' کے بہت سے نسخوں کو جمع کیا اور پھر تحقیق کے بعد انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی سے 1990 میں شائع کروایا۔ میر امن دہلوی کی ''باغ و بہار'' کو بھی اغلاط اور سقوم سے پاک کر کے 1993 میں شائع کروایا۔ ''مثنویاتِ شوق لکھنوی'' بھی مدون کی۔ اس کے علاوہ ''غرائب اللغات''* کے نسخوں کو انھوں نے اکٹھا کیا اور ایک پُر اثر دیباچے کے بعد شائع کروایا۔ اور اس کے حواشی اور تعلیقات اتنے پُر اثر دیے کہ دوسرے محققین ان کے کام کو دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ ایک اور کارنامہ بہت سے شعرا کے کلام میں سے انتخاب کو شائع کروایا۔ اس کام میں بھی انھوں نے تحقیق کو مدِّ نظر رکھا۔ انھوں نے وہ کلام شامل کیا جو درحقیقت ان شعرا کا تھا اور ان کے دواوین میں جو حصہ الحاقی تھا وہ الگ کر دیا۔ اس سلسلے میں ''دیوان خواجہ میر درد'' خاص اہمیت کا حامل ہے۔ ان کے مرتب شدہ انتخابات میں (انتخابِ نظیر اکبر آبادی، شبلی، ناسخ اور انتخابِ سودا وغیرہ شامل ہیں۔ رفعت سروش ان کے تحقیقی کارناموں کے بارے میں لکھتے ہیں: ''انھوں نے ''اُردو املا'' پر وقیع کام کیا اور نہ جانے کتنی کتابوں کی تدوین کی۔ ان کی مدون کتابیں آج اُردو ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں، جن کو ترقی اُردو کونسل، مکتبہ جامعہ، انجمن ترقی اُردو نے شائع کیا اور ان کے ان ادبی اور تحقیقی کارناموں نے ان کے لیے اُردو ادب میں ایک ایسی جگہ بنائی جو صرف ان کے لیے مخصوص ہے اور اس سلسلے میں کوئی ان کا حریف نہیں۔'' (11)

رشید حسن خاں نے اُردو کے پہلے طنز و مزاح نگار شاعر جعفر زٹلی کا ''زٹل نامہ'' تحریر کیا۔ یہ متنی تحقیق پر مبنی ایک ایسی کتاب ہے جس میں انھوں نے جعفر زٹلی کی تمام کمیوں، کوتاہیوں، خوبیوں اور بے باکیوں کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ ان کی اس تحقیقی تصنیف کی مدد سے جعفر زٹلی کی شخصیت ہمارے سامنے کھل کر آ جاتی ہے۔ وہ تحقیق میں سچ کو بے باکی سے بیان کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ سچ کو جوں کا توں کھول کر بیان کر دیتے ہیں کہ اس میں کچھ بھی پوشیدہ نہیں رہتا۔ نامی انصاری کہتے ہیں: ''تحقیق میں رشید حسن خاں صرف سچ اور سچ کے انکشاف کو اپنا بنیادی مقصد قرار دیتے ہیں۔ یہ سچ چاہے کڑوا ہو یا میٹھا، ثقہ ہو یا فحش، مہذب ہو یا غیر مہذب، یہ سب رشید حسن خاں کا مسئلہ نہیں ہے۔ ان کے سچ کو آپ خانوں میں بانٹ کر نہیں دیکھ سکتے۔ شاید کچھ ثقہ حضرات اس پر چیں بہ چیں ہوں کہ ''زٹل نامہ'' میں انھوں نے ایسے اشعار بھی درج کیے ہیں جو حد درجے فحش ہیں اور بعض غریب یا بازاری زبان کے لفظوں کے معنی بھی اس قدر کھول کر لکھے ہیں کہ اس کے آگے سوچا بھی نہیں جا سکتا۔'' (12)

رشید حسن خاں بات کو دوٹوک کہنے کے قائل تھے۔ شاید اس کی وجہ ان کا پٹھان ہونا بھی تھا جس کی وجہ سے جھکنا یا ڈرنا ان کی شخصیت کے منافی تھا۔ وہ نتیجے کی پروا کیے بغیر بیان کر دیتے اور پھر دوسروں کی تنقید اور اعتراضات کو خاطر میں نہ لاتے۔ وہ ہر بات کو خالصتاً محققانہ نظر سے دیکھنے کے قائل تھے۔ وہ اُردو املا سے خصوصی دل چسپی رکھتے تھے اور ان کا پسندیدہ موضوع بھی اُردو املا تھا۔ اس ضمن میں انھوں نے بہت سی تحقیقات کیں جن میں 1972 میں ''اُردو املا''، 1974 میں ''زبان و قواعد''، 1975 میں ''اُردو کیسے لکھیں'' اور 1994 میں ''انشا اور تلفظ'' اور ''عبارت کیسے لکھیں'' شامل ہیں۔ یہ تمام وہ تصانیف ہیں جن کے لکھنے کا واحد مقصد اُردو ادب کے لیے استعمال ہونے والی زبان اور الفاظ کے لیے درست قواعد مرتب کرنا اور ان الفاظ میں رائج غلط الفاظ کا خاتمہ اور درست الفاظ کو رواج دینا تھا۔ نکہت بریلوی نے اس بارے میں اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے: ''اُردو املا سے متعلق انھوں نے خاصی توجہ سے کئی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ اُردو املا کی معیار بندی پر بڑا زور دیا ہے۔ ان کی کوششوں سے بعض الفاظ لکھنے والوں کے لیے کچھ اصول سامنے آ گئے ہیں۔'' (13) ''اُردو املا'' میں رشید صاحب نے اُردو کے لیے قواعد مرتب کرنے کے ساتھ ساتھ الفاظ کو ملا کر لکھنے کی بجائے ان کو الگ الگ لکھنے پر زور دیا۔ مثلاً وہ ''بلکہ'' کو ''بل کہ''، ''آجکل'' کو ''آج کل'' اور اسی طرح ''گاؤں'' کو ''گانو'' لکھنے پر اصرار کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ ترکیب ایسی ہونی چاہیے جو ایک زبان کے ملنے سے بنی ہو لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر قدیم اُردو میں مستعمل ہے تو اس کا لکھنا جائز ہے۔ ان کی کتاب ''اُردو املا'' کے بارے میں شہزاد احمد لکھتے ہیں: ''اُردو املا کے قواعد منضبط صورت میں اس سے پہلے شرح و بسیط کے ساتھ پیش نہیں کیے گئے۔ رشید صاحب نے اُردو املا کی معیار بندی کا احساس کر کے سب سے پہلے اس جہت میں تحقیق کا ڈول ڈالا۔ انھوں نے اُردو املا کے سلسلے میں اپنی تحقیقات کا آغاز 1963 میں کیا اور بارہ تیرہ برس کی تحقیق اور ریاضت کے بعد اپنی تحقیق و تجزیے کے نتائج اُردو املا کی صورت میں منضبط کرنے میں کامیاب ہوئے۔'' (14)

صحت املا سب سے اہم مسئلہ ہے۔ ایسے بہت سے الفاظ جنھوں نے کسی طرح سے غلط نگاری کی راہ پائی ہے۔ ان الفاظ کو واپس ان کی اصل شکل میں لانا ان کی اس کاوش کا اہم مقصد تھا۔ اس سلسلے میں ان کی کتاب ''زبان و قواعد'' خاصی اہمیت کی حامل ہے۔ نامی انصاری ''زبان و قواعد'' کی اہمیت کو یوں واضح کرتے ہیں: ''اُردو کے الفاظ و تراکیب، مہند، مفرس، اور منحرف الفاظ اُردو میں ان کے چلن کے بارے میں رشید حسن خاں کی کتاب ''زبان و قواعد'' (مطبوعہ 1972) جدید سائنٹفک اصولوں پر مرتب کی گئی ایسی کتاب ہے جو اُردو کے طالب علموں، استادوں اور ادیبوں کے لیے یکساں طور پر بڑی کارآمد کتاب ہے۔ روزمرہ بولے جانے والے اکثر الفاظ کے بارے میں ہم لوگ شک و شبے میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اُردو کی مروجہ لغات سے بھی اکثر کوئی قابلِ اطمینان حل نہیں نکل پاتا۔ زبان و قواعد بعض اختلافات کے باوجود ہماری قابلِ اطمینان رہ نمائی کر سکتی ہے۔ انشاء کی طرح رشید حسن خاں نے بھی فارسی اور عربی الفاظ کے اصل تلفظ کی بجائے ان کے چلن کو ہی درست مانا ہے۔ (15)

اُردو املا کے حوالے سے تمام محققین و مصنفین کے مابین جو انتشار پایا جاتا، اس کے خاتمے یا کسی حد تک کمی کے لیے رشید صاحب نے اس موضوع پر ایک بہت اعلا پائے کی کتاب لکھی اور اسی حوالے سے قواعد املا کے اصول مرتب کیے۔ یہ بجا ہے کہ ان کے تمام اصولوں پر اکتفا کرنا مشکل ہے لیکن ان کی اس کوشش سے کسی طور انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے بعض الفاظ کے لیے کچھ اصول وضع کر دیے اور اسی طرح کے چند دوسرے الفاظ کے لیے الگ اصول وضع کیے۔ جب کہ بعض کے لیے کوئی اصول مرتب نہیں کیا۔ اس طرح انھوں نے قواعد کو پیچیدہ اور گنجلک بنا دیا ہے۔ بہ ہر طور انھوں نے بہت سی مشکلات میں کمی کا سامان مہیا کیا ہے۔ تاریخ و تحقیق رشید حسن خاں کے پسندیدہ موضوع ہیں اور یہی موضوعات ان کی دل چسپی کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ وہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں: ''تاریخ ادب اور تنقید میرے پسندیدہ موضوع ہیں لیکن میرے اصل موضوع لغت، عروض و قواعد اور زبان و بیان اور رسم خط ہیں۔ ان موضوعات پر میں نے کافی کام کیا ہے اور بہت کچھ لکھا ہے۔ آج کل بھی رسم خط سے متعلق ایک طویل مضمون لکھ رہا ہوں، جو غالباً 100 صفحات پر مشتمل ہوگا۔ میں الفاظ کے تلفظ اور لفظوں کو لکھنے کے سلسلے میں بعض تبدیلیوں کا قائل ہوں، خود بھی ان پر پابندی کرتا ہوں۔'' (16)

رشید حسن خاں نے اپنے پن میں تن تنہا معیاری کام کرتے رہے اور اس کے ضمن میں وسائل کو خاطر میں نہ لائے۔ انھوں نے اپنے اس تدوینی و تحقیقی کام کو روزگار کا ذریعہ نہیں بنایا بل کہ ادب کی ترقی کو فروغ دینے کے لیے اس کام کو فرض سمجھ کر انجام دیتے رہے۔ ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد لکھتے ہیں: ''علمی دنیا میں ان کا ہر کارنامہ اپنی مثال آپ ہے۔ انھیں تحقیق و تدوین کی قدر و قیمت اور ضرورت و افادیت کا کامل احساس تھا، اسی احساس کے تحت انھوں نے بے سروسامانی اور نامساعد حالات کے باوجود تن تنہا ان شعبوں میں اتنا وقیع اور معیاری کام کیا جو باوسائل اداروں اور کئی افراد کے اشتراک سے بھی ممکن

نہیں۔کلاسکی ادب پاروں کی تدوینِ جدید کو وہ وقت کی اہم ضرورت خیال کرتے تھے۔انھوں نے اپنی تحریروں، تقریروں سمیناروں، لیکچروں، مکالموں اور خطبوں میں اس شعبے کو ثروت بنانے پر زور دیا۔وہ محض گفتار کے دھنی نہ تھے بل کہ عمل کے خوگر بھی تھے۔انھوں نے عملی طور پر کلاسکی سرمائے کی تدوین کر کے ایسی مثالیں قائم کی ہیں، جن کی ضیاء پاشیوں سے تحقیق و تدوین کے طلبا تادیر استفادہ کریں گے۔''(17)

رشید حسن خاں نے اپنے دوستوں کو خطوط لکھے، ان خطوط میں بھی انھوں نے املا کے اصولوں کو مدنظر رکھا اور ان اصولوں کے قواعد وضوابط بھی بیان کیے۔ان کے خطوط ان کی زندگی اور شخصیت کی تفہیم اور تحقیق و تدوین اور لغت وانشاء کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر اور طریقۂ کار جاننے کے لیے کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔تحقیق و تدوین کے درمیان انھیں کتنی مشکلات پیش آئیں، یہ تمام معلومات انھیں خطوط سے ملتی ہیں۔پروفیسر رفیع الدین ہاشمی اس ضمن میں رقم طراز ہیں:''ان خطوں میں جگہ جگہ املا، تلفظ اور الفاظ و اصطلاحات پر مختلف زاویوں سے بحث کی گئی ہے۔وہ اپنے عزیز دوستوں کو سمجھاتے ہوئے کہ ''لفظوں کا حال اشخاص جیسا ہوتا ہے۔ویسی ہی شخصیت، ویسی ہی صفات اور ویسی ہی صلاحیتیں''۔لفظ جب ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہوتے ہیں تو ان کا احوال ان مہاجرین جیسا ہوتا ہے جو نقلِ وطن کر کے کسی دوسرے ملک میں آباد ہو جاتے ہیں۔''(18)

رشید حسن خاں نے متن کی جانچ پرکھ کے بعد اس کو نئے سرے سے مدون کیا ہے۔اس میں سے تمام الحاقی حصہ خارج کر دیا ہے اور جو حصہ اس میں شامل کیا ہے وہ سارے کا سارا سند کے ساتھ ملتا ہے اور پھر ان پر اس پائے کا دیباچہ درج کیا ہے کہ تمام پیچیدہ مسائل اور ہر قسم کے گنجلک سوالات کا جواب ہمیں بہ آسانی میسر آتا ہے اور وہ سوالات جو ہمارے ذہن میں اس متن کے بارے میں جنم لیتے ہیں ،تمام تر حل ہو جاتے ہیں۔ڈاکٹر خلیق انجم اس بارے میں یوں کہتے ہیں:''رشید حسن خاں نے نہ صرف متنی تنقید کے بنیادی اصولوں پر بڑی تعداد میں مضامین لکھے ہیں بل کہ عملی متنی تنقید کے اعلا ترین نمونے بھی پیش کیے ہیں۔متنی تنقید پر میری تھوڑی بہت نظر ہے اس لیے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اُردو میں رشید حسن خاں کے پائے کا کوئی اور متنی نقاد ابھی تک پیدا نہیں ہوا۔خاں صاحب کو متنی تنقید کے سائنٹفک طریقوں پر قدرت حاصل ہے۔وہ املا اور تلفظ کے ماہر ہیں، اس لیے وہ متن کا جس طرح تنقیدی اڈیشن تیار کرتے ہیں، وہ کوئی اور نہیں کر سکتا۔''(19)

رشید حسن خاں کو گیان چند جین نے ان کی خصوصیات کی بنا پر''خدائے تدوین کا لقب دیا۔ڈاکٹر جمیل جالبی کے نزدیک ان کی تدوینات آنے والی نسلوں کے لیے ایک نمونے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ڈاکٹر نیّر مسعود کہتے ہیں کہ وہ کلاسکی متون کے بہترین تدوین کرنے والوں میں سے تھے اور یہی متن ان کے نام کو زندہ رکھیں گے۔رفیع الدین ہاشمی کہتے ہیں کہ تحقیق و تدوین کے کام آیندہ بھی ہوں گے ،مگر اس معیار کی توقع کم ہی کی جا سکتی ہے۔اس اعتبار سے ممکن ہے خاں صاحب ہی''خاتم المدونین'' ٹھہریں گے۔رشید حسن خاں کے بارے میں پروفیسر رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں:''رشید حسن خاں ایک بے بدل عالم اور محقق تھے، ان کی ژرف نگہی اور اجتہادی بصیرت ان کی برسوں کی محنت و ریاضت، یکسوئی اور علمی انہماک و شغف کا نتیجہ تھی۔تدوین میں انھوں نے حافظ محمود شیرانی کو ''معلمِ اول'' قرار دیا اور تدوین میں وہ خود کو عرشی صاحب کا ''تلمیذِ معنوی'' سمجھتے تھے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ ''طبع حسرت نے اٹھایا ہے ہر استاد سے فیض''۔''(20)

رشید حسن خاں نے بہت سے ناقدین و محققین سے متاثر ہونے کا ذکر کیا ہے لیکن درحقیقت ان کا سارا کام اور محنت و مشقت سے متاثر ہونے کی بنا پر نہیں بل کہ ان کا اپنا ایک خاص طریقۂ کار تھا کسی سے متاثر ہو کر کوئی کام کرنے سے اس میں اتنی یکسوئی، ریاضت و محنت وغیرہ نہیں آسکتی۔رشید حسن خاں نے اپنے فن میں یگانہ نہ تھے۔ان کی موجودگی میں بھی کوئی ان کے پائے کا نقاد، محقق نہ تھا اور نہ ہی ان کے جانے کے بعد ان کے پائے کا محقق و مدون آ سکتا ہے۔ہمیشہ سچ بولتے تھے اور اس کے جواب میں ملنے والی تکلیفوں کی پروا نہ کرتے تھے۔وہ انجام سے بے پروا سچ بیان کیے جاتے۔کوئی ان کے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے، اس کی فکر نہ کرتے۔ان کے کام کو سراہا جا رہا ہے یا نہیں، اس بارے میں صلے کی پروا نہ کرنا بھی ان کی شخصی خوبیوں کا خاصہ تھا۔پروفیسر رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں:''بلاشبہ رشید حسن خاں، ایک یگانۂ روزگار شخص تھے۔بقول خلیق انجم ''حق گوئی اور بے باکی جسے''آئینِ جواں مرداں'' کہا گیا ہے، وہ مرحوم کی فطرت کی بھی تھی اور یہ ان کی شخصیت کا سب سے تابناک وصف تھا''۔بددیانتی ٹریڈ یونین میں ہو یا ادب میں، ان کے لیے ناقابلِ برداشت تھی، وہ ایک کھرے اور صاف گو انسان تھے۔''(21)

رشید حسن خاں جہاں ادبی خوبیوں کے ساتھ ادبی کارنامے سرانجام دیتے ہیں وہیں وہ کرداری خوبیوں کے حامل ہیں۔نہ صلے کی پروا کرتے نہ ستایش کی تمنا رکھتے تھے۔اپنی محنت و مشقت میں کمی لائے بغیر کام کرتے رہے اور ادب کو بیش قیمت خزانہ فراہم کرتے رہے۔ان کی ساری زندگی ادب کی فلاح اور ادب کی ترقی کے کاموں میں بسر ہوئی۔رشید حسن خاں کو بھی اکثر دوسرے شعرا، ناقدین، محققین کی طرح زندگی میں زیادہ پذیرائی نہ ملی۔انڈیا میں رہایش کی وجہ سے وہاں پر دوسرے معمولی محققین پر مقالے اور تحقیقی مضامین لکھے گئے لیکن رشید حسن خاں کی گراں قدر خدمات کے باوجود ان پر کوئی مقالہ تو دور مضمون بھی نہیں لکھا گیا۔تاہم رشید حسن خاں کے علاوہ یہ محنتی کام کوئی نہیں کر سکتا اور نہ ہی کسی اور کے بس کی بات ہے۔انسان خطا کا پتلا ہے اور جہاں اتنی وسیع تحقیق کی گئی ہو، وہاں کچھ نہ کچھ سقوم تو رہ جاتے ہیں۔

حوالہ جات

1۔شاعر ہم عصر ادب نمبر، ممبئی، مطبوعہ 1997، صفحہ 114

2۔رفعت سروش، رشید حسن خاں، مشمولہ، روشنائی، کراچی، شمارہ نمبر 26 زین پبلی کیشنز، صفحہ 146

3۔محمد یونس بلگرامی، چیئرمین مجلس انتظامیہ، پیش لفظ، رشید حسن خاں، ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ، لکھنؤ اتر پردیش اُردو اکادمی، 1980، صفحہ 5

4۔ارشد محمود ناشاد، ڈاکٹر مکاتیب رشید حسن خاں بنام رفیع الدین ہاشمی، مرتبہ ارشد محمود ناشاد ڈاکٹر، عرض مرتب، ادبیات جون 2009، صفحہ 11

5۔محمد یونس بلگرامی، چیئرمین مجلس انتظامیہ، پیش لفظ، رشید حسن خاں، ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ، لکھنؤ اتر پردیش اُردو اکادمی، 1980، صفحہ 5

6۔نامی انصاری، رشید حسن خاں، مشمولہ، روشنائی، کراچی، شمارہ نمبر 26 زین پبلی کیشنز، صفحہ 151

7۔رفیع الدین ہاشمی، پروفیسر، رشید حسن خاں کے خطوط، مشمولہ ماہ نامہ 'الحمرہ' لاہور سالنامہ، جنوری 2012 صفحہ 116

8۔ارشد محمود ناشاد، ڈاکٹر مکاتیب رشید حسن خاں بنام رفیع الدین ہاشمی، مرتبہ ارشد محمود، عرض مرتب، ادبیات جون 2009، صفحہ 13-14

9۔نامی انصاری، رشید حسن خاں، مشمولہ، روشنائی، کراچی، شمارہ نمبر 26 زین پبلی کیشنز، صفحہ 151 اور 152

10۔نکہت بریلوی،رشید حسن خاں کی یاد میں،مشمولہ روشنائی،جون 2006 صفحہ 153
11۔رفعت سروش،رشید حسن خاں،مشمولہ،روشنائی،کراچی،شمارہ نمبر 26 زین پبلی کیشنز،صفحہ 153
12۔نامی انصاری،رشید حسن خاں،مشمولہ،روشنائی،کراچی،شمارہ نمبر 26 زین پبلی کیشنز،صفحہ 151
13۔نکہت بریلوی،رشید حسن خاں کی یاد میں،مشمولہ روشنائی،جون 2006 صفحہ 155
14۔شہزاد احمد،ناشر ناظم مجلس ترقی ادب،لاہور،رشید حسن خاں،اُردو املا،پیش لفظ،لاہور مجلس ترقی ادب مئی 2007،صفحہ (ندارد)
15۔نامی انصاری،رشید حسن خاں،مشمولہ،روشنائی،کراچی،شمارہ نمبر 26 زین پبلی کیشنز،صفحہ 152
16۔رشید حسن خاں،ایک یادگار خط بنام محمد اسداللہ (مقیم برلن،جرمنی) 28 نومبر 1960،مطبوعہ روشنائی،کراچی،ستمبر 2006 جلد۔7
17۔ارشد محمود ناشاد،ڈاکٹر مکاتیب رشید حسن خاں بنام رفیع الدین ہاشمی،مرتبہ ارشد محمود ناشاد،ڈاکٹر،عرض مرتب،ادبیات جون 2009،صفحہ 11
18۔رفیع الدین ہاشمی،پروفیسر،رشید حسن خاں کے خطوط،مشمولہ ماہ نامہ 'الحمرا' لاہور سالنامہ،جنوری 2012 صفحہ 117
19۔خلیق انجم،جنرل سکریٹری،انجمن ترقی اُردو (ہند) رشید حسن خاں،مثنویاتِ شوق،پیش لفظ،نئی دہلی انجمن ترقی اُردو ہند 1995
20۔ارشد محمود ناشاد،ڈاکٹر مکاتیب رشید حسن خاں بنام رفیع الدین ہاشمی،مرتبہ ارشد محمود ناشاد،ڈاکٹر،عرض مرتب،ادبیات جون 2009،صفحہ 35
21۔ایضاً صفحہ 38

(سہ ماہی فن زاد،بھیرہ،(پاکستان) شمارہ 8،جنوری تا مارچ 2016،صفحہ 102-107)

نوٹ*۔اس مضمون میں صائمہ سعید (جھنگ،پاکستان) نے ''غرائب اللغات'' کو منظر عام پر آنے اور اس نامکمل تدوین کو رشید حسن خاں سے منسوب کیا ہے۔غرائب اللغات کے منظر عام پر آنے کے سلسلے میں محترمہ کا دعوا بے بنیاد ہے۔رشید حسن خاں نے غرائب اللغات کی تدوین کا منصوبہ تو بنایا تھا لیکن ان کی عمر نے وفا نہ کی اور اس کی تدوین کا کام ادھورا ہی رہ گیا۔یہ لغت منظر عام پر نہ آسکا۔(مرتب)

❍❍❍

ابراہیم افسر

رشید حسن خاں پر کی گئی تحقیق کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ

پروفیسر گیان چند جین نے تحقیق کیا ہے؟ پر بحث کرتے ہوئے اپنی کتاب ''تحقیق کا فن'' میں لکھا ہے:

''لغات میں تحقیق کے معنی کھوج،تفتیش،دریافت،چھان بین دیے ہیں۔تحقیق کا عمل بنی نوع انسان کے بچپن سے تا حال ایک فرد کے بچپن سے حینِ حیات جاری رہتا ہے۔''

(تحقیق کا فن،گیان چند جین،قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان نئی دہلی 2008،صفحہ 17)

مذکورہ بالا تعریف کے تناظر میں یہ نتیجہ اُخذ کیا جاسکتا ہے کہ تحقیق ایک مشکل راہ ہے۔یہ راستہ بالکل سہل نہیں ہے۔از سرِ نو دریافت،تفتیش اور تلاش کسی بھی محقق کے لیے آسان نہیں بل کہ اس کام کو آنکھوں سے تیل ٹپکانے کے مترادف قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔آج جس طریقے سے اُردو ادب میں تحقیقی کاوشیں نام نہاد محققین کے ذریعے ہو رہی ہیں کیا ان سے مطمئن ہوا جاسکتا ہے؟ یہ اہم سوال اُردو قاری کے سامنے ایک بڑا مسئلہ اور چیلنج بنا ہوا ہے۔

اُردو ادب میں جن محققین و مدونین کا نام نامی اسمِ گرامی بڑے ادب و احترام سے لیا جاتا ہے ان میں حافظ محمود خاں شیرانی،قاضی عبدالودود،مولانا امتیاز علی خاں عرشی،ڈاکٹر عبدالستار صدیقی،پروفیسر حنیف نقوی پروفیسر محمود الٰہی،پروفیسر گیان چند جین،پروفیسر عبدالستار دلوی پروفیسر گوپی چند نارنگ،پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی اور رشید حسن خاں وغیرہ کا نام سرِ فہرست ہے۔ان حضرات نے اپنی محنتِ شاقہ،لگن،کاوش اور جاں فشانی سے اُردو تحقیق کو نئی سمت اور جہت عطا کی۔عہد حاضر میں اگر کوئی محقق اپنا تحقیقی سفر شروع کرنا چاہتا ہے تو اُسے متذکرہ ادبی بزرگوں کے بنائے اور اپنائے ہوئے تحقیقی

اصول وضوابط کے پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔ ان ادبی بزرگوں نے ایک ایک لفظ ومعنی کے لیے دنیا بھر کی لائبریریوں سے استفادہ کیا اور تحقیق کے اصول وضوابط اور معیار کی ایک نئی راہ نکالی۔ سہل پسندی کو انھوں نے کبھی پسند اور برداشت نہیں کیا۔ اگر ان ادبی بزرگوں کے ادبی کارناموں، کاوشوں اور تحریروں میں تحریفات ہونے لگے اور ان تحریفات کو کتابی شکل میں منظر عام پر لایا جانے لگے تو ایسے ادبی کارناموں پر محققین کے ساتھ ساتھ عام قاری کا برہم ہونا لازمی ہے۔

مذکورہ بالا محققین میں رشید حسن خاں کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ رشید حسن خاں کی شناخت اُردو ادب میں محققِ یگانہ، خدائے تدوین، متنی نقاد، ماہرِ لسانیات، تبصرہ نگار، اُردو املا زبان وقواعد کے عظیم سالار کے طور پر ہوتی ہے۔ تحقیق وتدوین میں انفرادیت کے ساتھ ساتھ ان کا مقام ومرتبہ بہت بلند ہے۔ ان کے ادبی کارنامے کتابی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ رشید حسن خاں کو اُردو مقدمہ نگاری میں بھی فوقیت حاصل ہے۔ نیز ان کی ادبی کاوشوں سے طلبا ہی نہیں بل کہ دانش گاہوں کے اساتذۂ کرام بھی خوب مستفیض ہوتے ہیں۔ لیکن افسوس وحیرت تب ہوتی ہے جب اُردو ادب کی قد آور شخصیات رشید حسن خاں کی تحریروں میں ترمیمات وتحریفات کرکے اُردو دنیا کے سامنے اسے نئی تحقیق کے طور پر پیش کرتی ہیں۔ لیکن جب ان تحریروں کا میلان رشید حسن خاں کی اصل تحریروں سے کیا جاتا ہے تو سچائی روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ ان بڑی بڑی ادبی شخصیات نے کس طرح سے تحقیق کے اصول وضوابط کے دامن کو چھوڑ کر سہل پسندی اختیار کی۔ اُردو کے عام قاری کی بات تو بہت بعد کی ہے اُردو ادب کے ناقدین نے بھی اس جانب توجہ مبذول نہ کی۔

رشید حسن خاں کا تحقیق کے تئیں جنون اور لگن کسی سے چھپی نہیں ہے۔ وہ لفظ بہ لفظ کسی بھی حوالے کو دیکھ اور پڑھ کر ہی اپنی تحریروں میں سند کے طور پر لکھتے تھے۔ اس لیے ان کی کئی تدوینی کاوشیں دس سے لے کر بیس سالوں میں منظرِ عام پر آئیں۔ رشید حسن خاں نے تحقیقی کاموں کے سلسلے میں کبھی بھی سہل پسندی اختیار نہیں کی۔ ان کی تحقیقی وتدوینی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر ملک کی مختلف دانش گاہوں نے انہیں اپنے یہاں ادبی خطبے دینے کے لیے مدعو بھی کیا۔ لیکن آج رشید حسن خاں پر تحقیق کرنے والے لوگوں نے ان کے بنائے ہوئے تحقیقی اصولوں وضوابط سے کنارہ کشی یا راہِ فرار اختیار کر لی ہے۔ آیئے اب ان تحقیقی اغلاط کی جانب رُخ کرتے ہیں جو رشید حسن خاں پر تحقیق یا ترتیب کرتے ہوئے در آ گئی ہیں۔

تمام اہلِ علم کو معلوم ہے کہ رشید حسن خاں کی تاریخِ ولادت کاغذی اسناد کے مطابق 10 جنوری 1930 ہے لیکن ڈاکٹر وسیم رضا نے رشید حسن خاں کی تاریخِ ولادت کے بارے میں جو تحقیق کی ہے وہ چونکانے والی اور حیرت انگیز ہے۔ وہ اپنی کتاب ''رشید حسن خاں ایک عبقری شخصیت'' میں لکھتے ہیں:

''سالِ پیدائش سے متعلق اطہر فاروقی نے لکھا ہے کہ تعلیمی اسناد کے مطابق 25 جنوری 1930 ہے (کتاب نما کا خصوصی شمارہ، صفحہ 9) یہی تاریخ ولادت ان کے مضمون رشید حسن خاں: سوانحی خاکہ میں بھی درج ہے، جو خاں صاحب کے پس از مرگ اُردو دنیا، اپریل 2006 میں شائع ہوا ہے۔''

(رشید حسن خاں ایک عبقری شخصیت، ڈاکٹر وسیم رضا، صفحہ 15، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، نئی دہلی، 2013)

ڈاکٹر وسیم رضا کے دعوے کی تحقیق جب کتاب نما کے خصوصی شمارے ''رشید حسن خاں حیات اور ادبی خدمات'' مرتب ڈاکٹر اطہر فاروقی سے کی گئی تو اس میں کی تاریخِ ولادت 10 جنوری 1930 درج ہے نہ کہ 25 جنوری 1930۔ رشید حسن خاں کی ملازمت کے بارے میں بھی ڈاکٹر وسیم رضا اپنی کتاب میں یوں رقم طراز ہیں۔

''اسی اثنا میں انہیں اسلامی ہائر سیکنڈری اسکول میں اُردو اور فارسی ٹیچر کی ملازمت مل گئی۔''

(رشید حسن خاں ایک عبقری شخصیت، ڈاکٹر وسیم رضا، صفحہ 18، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، نئی دہلی، 2013)

جب اس بات کی بھی تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ رشید حسن خاں نے اسلامی ہائر سیکنڈری اسکول (اب اسلامیہ انٹر کالج، شاہ جہاں پور) میں اُردو تو پڑھائی لیکن ان کی تقرری فارسی اور عربی مضامین پڑھانے کے لیے ہوئی تھی۔ اس بات کی تصدیق اور وضاحت خود رشید حسن خاں نے کی کہ ان کی تقرری فارسی معلم کے عہدے پر ہوئی تھی۔ 29 اکتوبر 1964 کو صدر اسلامیہ ہائر سیکنڈری اسکول، شاہ جہاں پور کے نام لکھے گئے خط کے آخر میں انھوں نے اپنے آپ کو پرشین ٹیچر لکھا ہے۔ اسی ضمن میں ڈاکٹر نسیم اقتدار علی (لکھنؤ) کا یہ اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

''اسی زمانے میں اسلامی ہائر سیکنڈری اسکول، شاہ جہاں پور میں فارسی عربی کے استاد کی جگہ خالی ہوئی اور ان کو وہاں ملازمت مل گئی۔''

(دھوپ چھاؤں چہرے، ڈاکٹر نسیم اقتدار علی، صفحہ 101، عالیہ اکادمی، نئی دہلی، 2014)

رشید حسن خاں کے دونوں بیٹوں (خورشید حسن خاں اور خالد حسن خاں) کی ملازمت کے بارے میں بھی تمام طرح کی قیاس آرائیاں ہیں۔ راقم الحروف کی جان کاری کے مطابق رشید حسن خاں کے فرزندِ اکبر خورشید حسن خاں بیسک ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ، یوپی میں جونیئر ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر (اب وظیفہ یاب) اور فرزندِ خورد خالد حسن خاں مدرسہ نور العلوم دلا زاک (شاہ جہاں پور) میں مدرسہ جدید کاری اسکیم کے تحت ریاضی کے استاد ہیں۔ دونوں بھائیوں کی ملازمت کے بارے میں ڈاکٹر عبدالحمید نے اپنی کتاب ''رشید حسن خاں اور ادبی تحقیق'' میں لکھا ہے:

''رشید حسن خاں کے دونوں بیٹے بروقت اتر پردیش گورنمنٹ کے محکمۂ تعلیم میں اُردو کے استاد ہیں۔''

(رشید حسن خاں اور ادبی تحقیق، ڈاکٹر عبدالحمید، صفحہ 21، کتابی دنیا، نئی دہلی، 2013)

یہی بات ڈاکٹر ٹی. آر. رینا نے بھی اپنی کتاب میں درج کی ہے۔ لکھتے ہیں۔

''خاں صاحب کے دونوں بیٹے گورنمنٹ کے محکمۂ تعلیم میں اُردو ٹیچر ہیں۔''

(رشید حسن خاں کے خطوط، مرتب ڈاکٹر ٹی۔ آر۔ رینا، صفحہ 23، اُردو بک ریویو، نئی دہلی، 2011)

پروفیسر رفیع الدین ہاشمی (لاہور) نے مکاتیبِ رشید حسن خاں بنام رفیع الدین ہاشمی مرتب ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد میں ایک کتاب کا نام ہی غلط تحریر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''ہم گائر ہال پہنچے۔ ایک چارپائی پر کتابیں بڑے سلیقے سے اس طرح چنی ہوئی تھیں کہ ان کے پشتے نظر آ رہے تھے۔ شاید کچھ کتابیں دو ایک الماریوں میں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ تھوڑی دیر باتیں ہوتی رہیں۔ مجھے ایک کتاب مالک رام، ایک مطالعہ از ایم شاہد کی تلاش تھی۔ خاں صاحب کے پاس ایک فاضل نسخہ موجود تھا۔ از راہِ لطف مجھے دے دیا۔''

(مکاتیبِ رشید حسن خاں بنام رفیع الدین ہاشمی، مرتب ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد، صفحہ 19، ادبیات اُردو بازار لاہور، جون 2009)

پروفیسر رفیع الدین ہاشمی نے جس کتاب کا حوالہ دیا ہے اس کا اصل نام ''اُردو تحقیق اور مالک رام از شاہد اعظمی، ایم۔اے'' ہے۔اسی کتاب میں آگے چل کر پروفیسر رفیع الدین ہاشمی نے رشید حسن خاں کی تاریخِ وفات کا حوالہ اس طرح دیا ہے۔لکھتے ہیں:

''مشفق خواجہ کی وفات (21 فروری 2005) کے تقریباً سال بھر بعد (26 جنوری 2006) رشید حسن خاں سانحہ ارتحال پیش آیا تھا۔''

(ایضاً صفحہ 21)

رشید حسن خاں کا انتقال 26 جنوری 2006 کو نہیں بل کہ 26 فروری 2006 کو ہوا تھا۔اس کتاب کے مرتب ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد (شاعر، محقق، نقاد، اور ادیب ساتھ ہی علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی ،اسلام آباد کے شعبہ اُردو میں بہ طور لکچرر) نے صفحہ اوّل پر وفات کی جو تاریخ درج کی ہے وہ اس طرح ہے:

''اُردو کے ممتاز محقق اور نقاد رشید حسن خاں (1925۔2002) کے تریسٹھ غیر مطبوعہ خطوط (مع حواشی و تعلیقات)''

(ایضاً صفحہ اوّل)

موصوف نے یومِ وفات میں پورے چار سال کا فرق نمایاں کر دیا ہے۔ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد نے کتاب کے آخر میں فلیف پر رشید حسن خاں کا تعارف پیش کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

''رشید حسن خاں (دسمبر 1925۔26 جنوری 2006)''

جب کہ اسی کتاب میں صفحہ 37 پر تاریخ وفات 26 فروری 2006 درج ہے۔ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد نے رشید حسن خاں کے خطوط کی تعداد کے بارے میں لکھا:

'زیرِ نظر مجموعے میں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے نام رشید حسن خاں کے پچاس مکاتیب شامل ہیں، ان کے علاوہ بارہ غیر مطبوعہ مکاتیب بہ طور ضمیمہ شامل مجموعہ ہے۔ان میں سے 9 خط عبدالوہاب خاں سلیم کے نام ہے ایک خط ڈاکٹر تحسین فراقی، ایک مشفق خواجہ اور ایک خط مدیر ترجمان القرآن کے نام ہے۔یوں اس مجموعے میں شامل مکاتیب کی مجموعی تعداد 62 ہے۔''

(ایضاً صفحہ 12)

ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد نے رشید حسن خاں کے 63 غیر مطبوعہ خطوط کا ذکر صفحہ اوّل پر کیا ہے اور صفحہ 12 پر خطوط کا تذکرہ ہے۔اس طرح ایک خط کی تعداد اور حوالہ کم کر دیا گیا ہے۔رشید حسن خاں کے دہلی سے شاہ جہاں پور منتقل ہونے پر بھی محققین میں اختلاف ہیں۔اس بارے میں ڈاکٹر عبدالحمید یوں رقم طراز ہیں:

''آخر میں 2 فروری 1994 کو مستقل طور پر شاہ جہاں پور منتقل ہو گئے۔''

(رشید حسن خاں اور ادبی تحقیق، ڈاکٹر عبدالحمید، صفحہ 21، کتابی دنیا، نئی دہلی، 2013)

ڈاکٹر ارجمند آرا (اُستانی، شعبۂ اُردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی) نے اس تعلق سے لکھا ہے:

''جب میں نے گائر ہال جانا شروع کیا، خاں صاحب اسی کے 9 نمبر کمرے میں رہتے تھے۔بعد میں غالباً 1995 میں جب وہ اپنے آبائی وطن شاہ جہاں پور چلے گئے تو ایک عرصے تک یہ سلسلہ رہا کہ وہ جب بھی دہلی آتے اسی کمرے میں ٹھہرتے رہے۔''

(رشید حسن خاں، کچھ یادیں، کچھ جائزے، مرتبین ڈاکٹر محمد آفتاب اشرف، جاوید رحمانی، صفحہ 121، مکتبۃ الحراء در بھنگا، بہار، 2008)

جب کہ رشید حسن خاں نے ڈاکٹر شمس بدایونی کو 5 فروری 1996 میں اپنی وطن واپسی کے بارے میں لکھا:

''میں 2/فروری کو یہاں پہنچ گیا۔''

(رشید حسن خاں کے خطوط، مرتب ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینا، صفحہ 654، اُردو بک ریویو، نئی دہلی، 2011)

لیکن ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینا نے اپنی دوسری کتاب ''رشید حسن خاں محقق و مدون'' میں یہ دعوا کیا:

''جنوری 1996 کے آخر میں خاں صاحب شاہ جہاں پور اپنے آبائی شہر منتقل ہو گئے۔''

(رشید حسن خاں محقق و مدون، ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینا، صفحہ 30 اُردو بک ریویو، نئی دہلی، فروری 2015)

رشید حسن خاں کی تعلیمی اسناد کے بارے میں بھی ناقدین و محققین کی آرا الگ الگ ہیں۔ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد نے رشید حسن خاں کی تعلیمی لیاقت کے بارے میں لکھا:

''دبیر کامل: لکھنؤ یونی ورسٹی 1946۔1948 (اندازاً)

مولوی: عربک پرشین بورڈ الہ آباد 1946۔1948 (اندازاً)''

(مکاتیب رشید حسن خاں بنام رفیع الدین ہاشمی، مرتب ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد، صفحہ 33، ادبیات اُردو بازار، لاہور، جون 2009)

ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینا نے اپنی کتاب ''رشید حسن خاں کے خطوط'' میں رشید حسن خاں کی دبیر کامل اور مولوی کی تعلیم کا ذکر تو کیا ہے لیکن کامیابی کا سال کہیں درج نہیں کیا ہے۔خاں صاحب کی تعلیمی لیاقت کے بارے میں راقم الحروف کی تحقیق کے مطابق رشید حسن خاں نے دبیر کامل (فارسی میں ڈپلومہ) لکھنؤ یونی ورسٹی سے اوّل درجے کے ساتھ 1952 میں پاس کیا۔دبیر کامل کی سند پر کنویز (فارسی) رجسٹرار اور وائس چانسلر کے دستخط (27/دسمبر 1952) ہیں۔اسی طرح رشید حسن خاں نے ادیب کامل جامعہ اُردو (علی گڑھ) سے اندراج 2008، رول نمبر 8، مدرسہ فیض عام شاہ جہاں پور سے نومبر 1949 میں درجہ اوّل کے ساتھ پاس کیا۔انہیں سند 30 مارچ 1950 میں تفویض کی گئی۔

رشید حسن خاں کے لکھے ہوئے خطوط میں تحقیق کے بعد یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ ان میں بھی لفظ تک بدل گئے ہیں۔ممکن ہے یہ سب سہواً بھی ہوگیا ہو۔لیکن تحقیق ایک مشکل عمل ہے۔سہل پسندی اس میں در نہیں آنی چاہیے۔آیئے اب ایسے ہی کچھ خطوط کا جائزہ لیتے ہیں۔جن میں لفظوں کی تبدیلی دیکھنے کو ملی ہے۔

ڈاکٹر ارجمند آرا نے 19 اپریل 1997 کو لکھے رشید حسن خاں کے ایک خط کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:

''اگر نہیں چاہتی ہو تو کام میں لگ جاؤ۔''

(رشید حسن خاں، کچھ یادیں کچھ جائزے، مرتبین ڈاکٹر محمد آفتاب اشرف، جاوید رحمانی، صفحہ 124، مکتبہ الحرا، دربھنگا بہار، 2008)

اسی خط کو ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینا نے اپنی کتاب میں یوں درج کیا ہے:

''اگر یہ نہیں چاہتی ہو تو پھر کام میں لگ جاؤ۔''

(رشید حسن خاں کے خطوط، مرتب ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینا، صفحہ 151، اُردو بک ریویو، نئی دہلی، 2011)

ڈاکٹر ٹی.آر.رینا کے حوالے میں لفظ ''یہ'' اور ''پھر'' کا اضافہ ہے۔اس ضمن میں جب ہم ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے نام لکھے خطوط کا ناقدانہ طور پر گہرائی اور گیرائی کے ساتھ جائزہ لیتے ہیں (مکاتیب رشید حسن خاں بنام رفیع الدین ہاشمی، مرتب ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد اور رشید حسن خاں کے خطوط مرتب ڈاکٹر ٹی.آر۔رینا) تو ہمیں خطوط کی اندرونی سطور میں کئی جگہ الفاظ بدلے ہوئے ملتے ہیں۔ایک ایسا ہی خط رشید حسن خاں نے رفیع الدین ہاشمی کے نام 20 مارچ 1984 کو تحریر کیا تھا۔ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد نے اس خط کو اپنی کتاب میں یوں درج کیا ہے:

1۔واقعہ یہ ہے ''حسینؓ اور حسینؑ میں بڑا معنوی فرق ہے۔

2۔اور تحقیق شرک کو قبول نہیں کرتی۔

3۔اور ہاں، یہ آپ ''ایڈیشن'' کیوں لکھتے ہو؟ اڈیشن لکھنا چاہئے۔E کے لیے ''اِ'' کافی ہے۔اگر ''ا'' ہوتا تب ''ای'' لکھتے ہیں''

(مکاتیب رشید حسن خاں بنام رفیع الدین ہاشمی، صفحہ 47 تا 48، ادبیات اُردو بازار لاہور، جون 2009)

اسی خط کو ڈاکٹر ٹی.آر.رینا نے اپنی کتاب میں اس طرح درج کیا ہے:

''1۔واقعہ یہ ہے کہ ''حسینؓ'' اور ''حسینؑ'' میں مخصوص فرق ہے۔

2۔اور تحقیق ترک کو قبول کرتی نہیں۔

3۔اور ہاں، یہ آپ ''اڈیشن'' کیوں لکھتے ہیں؟ اڈیشن لکھنا چاہئے۔ع کے لیے ''اِ'' کافی ہے۔اگر ز ہوتا تب ''ای'' لکھتے۔''

(رشید حسن خاں کے خطوط مرتب ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینا، صفحہ 452، اُردو بک ریویو، نئی دہلی، 2011)

3 جولائی 1989 میں رفیع الدین ہاشمی کے نام لکھے خط کو ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد نیاپنی کتاب میں اس طرح درج کیا ہے:

1۔ایک صاحب اُدھر جارہے ہیں، اپنی پریشان نگاریوں کا مجموعہ آپ کے لیے بھیج رہا ہوں۔

2۔یعنی بیک کرشمہ دو کار۔

(مکاتیب رشید حسن خاں بنام رفیع الدین ہاشمی، مرتب ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد، صفحہ 53، ادبیات اُردو بازار، لاہور، جون 2009)

ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینا نے اس خط کو اس طرح درج کیا ہے:

1۔ایک صاحب اُدھر جارہے ہیں، اپنی پریشان نقادوں یوں کا مجموعہ آپ کے لیے بھیج رہا ہوں۔

2۔یعنی بیک کرشمہ دو کاز۔

(رشید حسن خاں کے خطوط، مرتب ڈاکٹر ٹی.آر.رینا، صفحہ 415، اُردو بک ریویو، نئی دہلی، 2011)

ایک اور خط جو رشید حسن خاں نے 25 دسمبر 1999 کو رفیع الدین ہاشمی کے نام لکھا۔اس خط کو ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد نے اپنی کتاب میں اس طرح درج کیا ہے:

''آپ نے کیسی گراں اَرز کتاب کا انتساب کیسے ہیچ میرز کے نام کیا۔''

(مکاتیب رشید حسن خاں بنام رفیع الدین ہاشمی، مرتب ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد، صفحہ 114، ادبیات اُردو بازار، لاہور، جون 2009)

ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینا نے اپنی کتاب میں اس خط کو اس طرح درج کیا ہے:

''آپ نے کیسی گراں اور کتاب کا انتساب کیسے ہیچ میرزا کے نام کیا ہے۔''

(رشید حسن خاں کے خطوط، مرتب ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینا، صفحہ 417، اُردو بک ریویو، نئی دہلی، 2011)

پروفیسر رفیع الدین ہاشمی اور ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینا دونوں نے ہی خطوط کے حوالے سے اپنے اپنے دلائل پیش کیے ہیں۔ان دونوں حضرات کے خطوط میں الفاظ کی ترمیمات یا تحریفات، حذف واضافہ قارئین کو دیکھنے کو ملتے ہیں۔ایسے میں قاری کو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کس کتاب کا خط اور متن صحیح ہے۔اس مسئلہ کا واحد حل رشید حسن خاں کے خطوط کے اصل متن سے دونوں کا میلان ہے۔

رشید حسن خاں کی تدوینی کاوشوں اور صلاحیتوں سے کون واقف نہیں ہے۔ان کی تدوینی خدمات کے باعث پروفیسر گیان چند جین نے انہیں ''خدائے تدوین'' کے لقب سے یاد کیا۔رشید حسن خاں نے کلاسیکی ادب کی 7 کتابوں کو مرتب کیا اور ان پر عالمانہ وگراں قدر مقدمے بھی تحریر کیے۔یہ مقدمے آج بھی ان کتابوں میں من وعن درج ہیں۔لیکن حیرانی تب ہوتی ہے جب ان مقدمات کے صفحات کی

تعداد میں اضافہ اور کمی قاری کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ اس ضمن میں دو کتابوں کا خاص طور پر ذکر کرنا چاہوں گا۔ ایک غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ ہے اور دوسری کتاب رشید حسن خاں کچھ یادیں کچھ جائزے ہے۔

ڈاکٹر خالد مبشّر نے اپنے تحقیقی مقالے (مقدماتی ادب تحقیق وتنقید، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، 2012 غیر مطبوعہ) میں رشید حسن خاں کے مقدمات کا جائزہ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

''1۔فسانۂ عجائب کا مقدمہ 114 صفحات پر مشتمل ہے۔''

(مقدماتی ادب، تحقیق وتنقید (غیر مطبوعہ) ڈاکٹر خالد مبشّر، صفحہ 325، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، 2012)

''2۔انتخاب ناسخ کا مقدمہ 124 صفحات کا ہے۔'' (ایضاً صفحہ 328)

''3۔گلزارِنسیم کا مقدمہ ڈیڑھ سو صفحات کو محیط ہے۔'' (ایضاً صفحہ 331)

''4۔مثنویاتِ شوق کا مقدمہ 168 صفحوں میں پھیلا ہوا ہے۔'' (ایضاً صفحہ 334)

''5۔(زٹل نامہ) اس کتاب کا مقدمہ 93 صفحات کا ہے۔'' (ایضاً صفحہ 328)

اسی طرح ڈاکٹر محمد آفتاب اشرف اور جاوید رحمانی نے اپنی کتاب ''رشید حسن خاں کچھ یادیں کچھ جائزے'' میں باغ و بہار کے مقدمے کے صفحات کی تعداد 136 بتائی ہے (صفحہ 20) مثنویاتِ شوق پر بھی رشید حسن خاں نے 168 صفحات کا مقدمہ لکھا (صفحہ 22) زٹل نامہ کا مقدمہ 93 صفحات کا ہے۔ (صفحہ 31)

ان تینوں حضرات کے دعووں کے برعکس رشید حسن خاں کے مقدمات کے متعلق جب تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ فسانۂ عجائب کا مقدمہ 114 صفحات کا نہیں ہے۔ فسانۂ عجائب پر رشید حسن خاں نے صفحہ 15 سے لے کر صفحہ 114 تک گراں قدر مقدمہ تحریر کیا ہے۔ یعنی مقدمہ کل 99 صفحات پر مشتمل ہے۔ اسی طرح باغ و بہار کا مقدمہ صفحہ 13 سے لے کر 136 تک تحریر کیا گیا ہے۔ یعنی باغ و بہار کا مقدمہ 124 صفحات کا ہے نہ کہ 136 صفحات کا۔ انتخابِ ناسخ کا مقدمہ صفحہ 7 سے لے کر صفحہ 132 تک لکھا گیا ہے۔ مقدمہ کی کل صفحات کی تعداد 126 ہے نہ کہ 124۔ گلزارِنسیم کا مقدمہ صفحہ 11 صفحہ 150 تک تحریر کیا گیا ہے۔ یعنی اس مقدمے کی کل ضخامت 140 صفحات ہے نہ کہ 150 صفحات کی۔ سحرالبیان کا مقدمہ صفحہ 11 سے لے کر 142 تک لکھا گیا ہے اس کتاب پر مقدمہ 132 صفحات پر محیط ہے۔ مثنویاتِ شوق کا مقدمہ صفحہ 11 سے لے کر صفحہ 166 تک رقم کیا گیا ہے۔ مقدمہ کی کی کل ضخامت 155 صفحات پر مشتمل ہے نہ کہ 168 صفحات پر۔

ان مقدمات کی ضخامت اور کل تعداد میں واضح فرق نمایاں ہے۔ دانش گاہوں اور اُردو اداروں میں ہو رہی تحقیق طلبا اور نئی نسل کے لیے مشعل راہ ہوتی ہے۔ اگر دانش گاہوں اور ادبی اداروں میں اسی طرح سے تحقیق ہوتی رہی (جو سہل پسندی کا اعلاترین نمونہ ہے) اور محقق ونقاد بھی اس جانب غفلت برتتے رہے تو وہ دن دور نہیں جب طلبا کے ساتھ ساتھ آئندہ آنے والی نئی نسل بھی اُردو تحقیق کے اصول وضوابط سے ناواقف اور بے نیاز ہو جائے گی۔ ایسی حالت میں اُردو تحقیق کی سمت، جہت اور رفتار متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے گی۔ آج تمام اہلِ اُردو کو اس جانب اپنی توجہ مبذول کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ ان کاوشوں سے اُردو تحقیق سہل پسندی سے مبرّا ہو کر اپنے اصل مقام ومرتبہ کو حاصل کرلے گی۔ آخر میں، میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے خصوصی شمارے، علی گڑھ میگزین 2010ء، علی گڑھ میں اُردو تحقیق (ایڈیٹر محمد عمران خان) میں ضیاء الحق چودھری کے مضمون، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی جانب بھی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ اس مضمون میں ضیاء الحق چودھری صاحب نے صفحہ نمبر 74 پر رشید حسن خاں کو ''پروفیسر'' تحریر کیا ہے۔ پاکستان کی ''بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد'' کے تحقیقی مجلّے ''معیار'' میں ڈاکٹر محمد سلیمان اطہر نے اپنے مضمون 'اُردو رسم خط میں ہائے دوچشمی (ھ) کی حیثیت اور استعمال: ایک تنقیدی جائزہ' میں صفحہ 472 اور 475 پر رشید حسن خاں کے نام سے پہلے ''پروفیسر'' تحریر کیا ہے۔ حیرت اور افسوس کا مقام ہے کہ علمی اور تحقیقی اداروں کے ان گہواروں میں اس فاش غلطی کی جانب بھی توجہ مبذول نہ کی گئی۔ سہل پسندی کا اس سے بڑھ کر نمونہ اور کیا ہوگا؟؟؟

(ماہ نامہ کتاب نما، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، اگست 2015 صفحہ 27 تا 34)

(ماہ نامہ نیا دور، لکھنؤ، ستمبر 2015 صفحہ 29 تا 34)

(ماہ نامہ شاعر، بمبئی، جنوری 2016 صفحہ 21 تا 24)

○○○

تدوین

پروفیسر نیّر مسعود

’فسانۂ عجائب‘ مرتّبۂ رشید حسن خاں
(ٹیلی ویژن پر گفتگو، پروفیسر نیّر مسعود کا فسانۂ عجائب پر اظہارِ خیال)

کاظم علی خاں: ڈاکٹر نیّر مسعود صاحب، اس وقت جس کتاب پر ہم گفتگو کر رہے ہیں وہ رشید حسن خاں صاحب کی کتاب ’فسانۂ عجائب‘ ہے جو 1990 میں انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی سے ڈاکٹر خلیق انجم صاحب نے، جو انجمن کے سکریٹری ہیں، شائع کی ہے۔ اس بات پر مجھے بہت فخر بھی ہے کہ اور مسرت بھی ہے کہ اس کتاب کے بارے میں ایک ایسے شخص سے میں ہم کلام ہوں یعنی ڈاکٹر نیّر مسعود صاحب آپ، کہ آپ نے رجب علی بیگ سرور کی لائف پر اور ان کے ورکس پر اور اُن کے ادبی کارناموں پر بہت ہی اچھی اور بہت ہی Meaningful ریسرچ اور بہت سی Relevent چیزیں آپ نے بہت عرصہ قبل جب ان پر زیادہ توجہ بھی نہیں دی جاتی تھی، اس وقت پیش کیں۔ اس اعتبار سے کہ یہ ’فسانۂ عجائب‘ سرور کا شاہ کار ہے اور 1990 میں متعدد اڈیشنوں کے بعد اب یہ Latest اڈیشن ہمارے سامنے آیا ہے تو آپ اس کتاب کو، اس اڈیشن کو، اس کی تدوین کے کام کو جو رشید حسن خاں نے کیا ہے، اس کا Level آپ کی نظر میں کیا ہے۔ اس پر کچھ گفتگو نیّر مسعود صاحب آپ فرمائیں تو ہم شکر گزار ہوں گے۔

نیّر مسعود: کاظم علی خاں صاحب، متن کا جہاں تک تعلق ہے میرا خیال ہے ہم سب اس پر متفق ہیں کہ اُردو نثر کی کوئی کتاب ابھی تک اتنے اہتمام کے ساتھ اڈٹ نہیں کی گئی تھی، نظم کی حد تک تو دیوان

غالب......

کاظم علی خاں: جی ہاں، نسخۂ عرشی ہے اور پروفیسر مسعود حسن صاحب کا دیوانِ فائز.......

نیّر مسعود: جی، لیکن اُردو نثر کی کوئی کتاب اور وہ بھی 'فسانۂ عجائب' جو بہت ہی خطرناک اور مشکل کتاب ہے، مشکل اس طرح کہ سرور نے اس کتاب کو ایک بار لکھا، اس کے بعد پھر کسی پبلشر نے فرمائش کی کہ صاحب ہمارے لیے لکھ دیجیے، پھر تیسرے نے کہا کہ ہمارے لیے ایک نسخہ تیار کر دیجیے، سرور نے وہ بدل دیا، بار بار انھوں نے تبدیلیاں کیں۔

کاظم علی خاں: جی۔

نیّر مسعود: اب ان سب تبدیلیوں کا پتا لگانا اور سب سے بڑی پرابلم یہ فیصلہ کرنا کہ ہم ان میں سے کس صورت کو قبول کریں اور صحیح مانیں۔ اس کا رشید حسن خاں صاحب نے یہ طریقہ اختیار کیا جو صحیح ہے کہ جس اڈیشن میں آخری بار تبدیلیاں کی گئی ہیں، افضل المطابع کا 1280ھ والا اڈیشن، اس کو انھوں نے اساسی یا بنیادی نسخہ بنایا۔ اس نسخے کے متن کو صحیح پڑھنا اور کاتب سے صحیح لکھوانا، یہ خود بہت بڑا کام تھا۔ یہ کام تو ہو ہی گیا مگر یہاں پر رشید حسن خاں نے اپنا کام ختم نہیں کیا، بل کہ اب اس کتاب میں مقدمہ، اور سات تو ضمیمے ہیں....

کاظم علی خاں: ہاں! ڈاکٹر صاحب اس مسئلے پر بھی بات ابھی، ابتدائی منزل میں ہو جائے۔

نیّر مسعود: ہاں ہاں ضرور۔

کاظم علی خاں: اس کتاب میں ویسے دیباچہ تو ہے خلیق انجم صاحب کا، پھر مقدمہ ہے۔ مقدمہ سو صفحے سے زیادہ، ایک سو چودہ صفحے کا ہے۔ تو اس مقدمے میں انھوں نے جو متن انھوں نے Introduce کرایا ہے 'فسانۂ عجائب' کام، تو یہ مقدمہ اور کتاب کا جو متن ہے اس میں کوریلیشن شپ، کس حد تک ایک دوسرے سے دست و گریبان ہونے کی کیفیت ہے، یہ میں چاہوں گا کہ اس مقدمے کے بارے میں آپ....ویسے تو انھوں نے مختلف چیزیں، جو مختلف اڈیشن اس کے ہیں اور جو کام انھوں نے کیا ہے.....

نیّر مسعود.... ہاں! اب وہ لوازم جو ہیں اس کے، تو مقدمے میں پہلے تو یہی بتانا ہوتا ہے کہ کون سا متن ہم نے اختیار کیا اور کیوں۔ کتنی بار کتاب میں تبدیلیاں ہوئیں، اس کے اہم اڈیشن کون کون سے ہیں۔ غرض مقدمے میں پوری طرح کتاب 'فسانۂ عجائب' سے ہم کو آپ کو واقف کرایا گیا ہے۔ دوسرا حصہ مقدمے کا، وہ بھی بہت اہم ہے۔ اس میں انھوں نے بڑی احتیاط اور توازن سے کام لیا ہے، یعنی مصنف کے حالاتِ زندگی....

کاظم علی خاں: مگر مختصر ہیں، نیّر مسعود صاحب....

نیّر مسعود: ہاں مختصر ہیں۔

کاظم علی خاں: بہت مختصر ہیں۔ اس لیے کہ آپ نے بھی کام کیا ہے اور حضرات نے بھی۔ مگر یہاں بہت مختصر ہیں۔

نیّر مسعود: جی ہاں وہی میں عرض کر رہا تھا کہ مرتّب متن کا یہ کام نہیں ہے۔ متن کے مرتّب کا کام یہ ہے کہ متن کو صحیح کر کے پیش کرے۔ لکھنے والا کب پیدا ہوا، کہاں مرا، یہ بتانا اس کا کام نہیں ہے۔ آپ نے میرا نام لیا تو میرا تو موضوع ہی، 'رجب علی بیگ سرور: حیات اور کارنامے' تھا، اس لیے اسے میں نے تفصیل سے لکھا۔ اصولی بات یہ ہے کہ جب آپ کوئی متن مرتّب کر رہے ہوں اور انشاءاللہ آپ کریں گے تو اسے یاد رکھیں گے کہ مصنف کے حالاتِ زندگی صرف وہ لکھیں گے جن کا تعلق آپ کے متن سے ہو۔ مثال کے طور پر سرور کے حالاتِ زندگی میں ایک بہت اہم واقعہ ان کا کان پور....

کاظم علی خاں:...کان پور کا جانا اور......

نیّر مسعود:...اور یہ کہ انھوں نے ایک قتل کیا اور اس کے بعد خود بھاگ گئے یا سزا میں....

کاظم علی خاں: یا کیا صورت ہوئی، جلا وطنی تھی یا....

نیّر مسعود:.....اور غالبًا اسی جرم میں اُن کے استاد بھی....جیسا کہ رشید حسن خاں کا خیال ہے تو وہاں جا کر ان کا دل بہت گھبرا گیا اور ان کا دل بہلانے کے لیے حکیم اسد علی نے کہا کہ تم یہ لکھو کتاب 'فسانۂ عجائب' تو اس چیز کا، سرور کے حالاتِ زندگی کے اس حصے کا تعلق 'فسانۂ عجائب' سے بہت گہرا ہے، اس لیے اس پر رشید حسن خاں نے ذرا تفصیل سے بات کی۔ یہ انھوں نے بڑی صحیح اور اصولی......

کاظم علی خاں: اچھا، یہ 'فسانۂ عجائب' کا بنیادی متن، اس کے اوپر ابھی پروفیسر گیان چند جین صاحب کی کتاب اور وہ بہت اہم کتاب آئی ہے 'کھوج' اس میں پورا ایک مقالہ انھوں نے لکھا ہے اور رشید صاحب کا بھی ذکر تھوڑا بہت تو اس میں آ ہی گیا ہے کہ وہ کام کر رہے ہیں اور یہ بہت اچھا کام ہوگا، اس کے چھپنے سے پہلے یہ مقالہ لکھا گیا تھا۔ اگرچہ 'کھوج' بھی ایسی کتاب ہے جس پر گفتگو آیندہ کبھی ہونا چاہیے.....

نیّر مسعود: جی ہاں ضرور۔

کاظم علی خاں: تو انھوں نے بنیادی متن پر گفتگو کی ہے اور ڈاکٹر محمود الٰہی صاحب نے جو نسخہ پیش کیا ہے اور نور الحسن ہاشمی صاحب کے پاس جو.....

نیّر مسعود: جی ہاں نسخہ فضل رسول......

کاظم علی خاں: تو اس میں کس حد تک یعنی رشید حسن خاں صاحب نے اس کے متن میں....

نیّر مسعود: کام ہی نہیں لیا اس سے۔

کاظم علی خاں: کام نہیں لیا.....

نیّر مسعود: نہیں لیا اور بہت صحیح کیا۔

کاظم علی خاں: اور یہ صحیح کیا ہے کہ اس سے کام نہیں لیا ہے۔

نیّر مسعود: جی ہاں، اس لیے کہ یہ جو بنیادی متن.....

کاظم علی خاں: لیکن انھوں نے اصل جو انحصار کیا ہے، جس متن پر.....اس میں تو ایک سے زیادہ متن ہیں.....لیکن یہ مکمل اور بڑے.....یعنی.....خلاصہ شدہ تلخیص والے جو متن کہے جاتے ہیں ان پر انھوں نے توجہ نہیں دی۔

نیّر مسعود: نہیں دی۔

کاظم علی خاں: اچھا، اب اصل اڈیٹنگ کا کام جو ہے اس کے بارے میں اگر ہم آپ سے یہ دریافت کریں کہ اڈیٹنگ کی جو کیفیت اس کتاب کی ہے، یعنی مثلاً یہ کہ کتابت کس انداز سے انھوں نے کرائی ہے، اگر چہ یہ بات اپنی جگہ پر مجھے یاد آ رہی ہے کہ ابھی شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے ایک تقریر اُردو اکادمی میں کسی جلسے کے موقعے پر، شہنشاہ مرزا کے سلسلے میں داستانوں کے اوپر وہ گفتگو ہو رہی تھی، تو انھوں نے کہا کہ بھئی داستان میں یہ سب کام کرنا پنکچویشن مارکنگ، یہ ٹھیک نہیں ہے اس لیے کہ داستان کو.....

نیّر مسعود: وہ تو انھوں نے اس لیے کہا کہ داستان سنانے سننے والی چیز ہے جس کو......

کاظم علی خاں: Oral Tradition کہتے ہیں.....

نیّر مسعود: مگر یہ کتاب 'فسانۂ عجائب' تو لکھی گئی ہے۔ اگر چہ شروع میں اس کو سرور نے بطور داستان بیان کیا لیکن فوراً بعد ہی وہ اس کو لکھنے کی فکر میں لگ گئے۔ تو اب بہت اہم کام اس کے Punctuation کا تھا۔ پُرانی تحریروں میں ظاہر ہے کاما فل اسٹاپ، پیراگراف.....

کاظم علی خاں: .....ہوتا نہیں تھا۔

نیّر مسعود: یہ کچھ نہیں ہوتا، تو رشید حسن خاں نے کوشش کی اور بہت حد تک کامیاب رہے کہ یہ علاماتِ اوقاف جو ہیں، اس طرح لگائیں کہ متن تقریباً اپنی شرح آپ کرتا چلے یہ اس کا اصل معیار ہے اور اس کو انھوں نے ملحوظ بھی رکھا ہے۔ اب اس میں یہ ضرور ہوگا کہ کہیں آپ کو اختلاف بھی ہوگا کہ مثلاً آپ نے یوں لکھا ہے لیکن یہ کاما ہمارے نزدیک یہاں نہیں وہاں ہونا چاہیے تھا۔ وہ بہت ہی.....

کاظم علی خاں: جب فقرے میں تھوڑی بہت تبدیلی.....

نیّر مسعود: اچھا اب.....تو یہ کام تو ظاہر ہے بہت محنت کا ہے جس کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جس نے کام کیا ہے۔ ہمارے سامنے تو ایک کتاب رکھی ہوئی ہے کاما فل اسٹاپ کے ساتھ۔

کاظم علی خاں: جی ہاں۔

نیّر مسعود: اس کے بعد گویا اصل کام

کاظم علی خاں: تعلیقات وحواشی.....

نیّر مسعود: یوں سمجھیے کہ اصل کام ختم ہونے کے بعد اصل کام شروع ہوتا ہے کہ جب یہ کام ختم ہو گیا تو اب اس میں کتنے لفظ ہیں جن کے معنی واضح نہیں ہیں، کتنے لفظ ہیں جن کے معنی بدل گئے ہیں۔

کاظم علی خاں: بہت کوشش کی ہے انھوں نے۔

نیّر مسعود: اور اس کوشش کا تو آپ کو بھی تجربہ ہوگا، مجھ کو بھی ہے.....

کاظم علی خاں: بہت بہت.....

نیّر مسعود: اس لیے کہ انھوں نے اپنے تقریباً ہر جاننے والے کو کتنے کتنے خط لکھے ہیں.....

کاظم علی خاں: بہت خط لکھے۔

نیّر مسعود: ان معانی کے سلسلے میں انھوں نے مثلاً راجستھان کے مہاوتوں سے رابطہ قائم کیا۔

کاظم علی خاں: جی ہاں، ہاتھی......

نیّر مسعود: اس لیے کہ کتاب میں جلوس کے ہاتھیوں کا ذکر آ گیا ہے۔ شیش محل کی ڈومنیوں سے، جناب اور مفتی گنج کی بڑی بوڑھیوں سے، افیچیوں سے، جواریوں سے، غرض جن جن چیزوں سے متعلق الفاظ کتاب میں آئے ہیں جو لغات میں نہیں...

کاظم علی خاں: شطرنج اور مختلف کھیلوں اور بازیوں کے متعلق انھوں نے صباح الدین عمر صاحب سے جن کے نام یہ کتاب معنون.....یہ تو ہے۔

نیّر مسعود: یہ تو ایک تشریح الفاظ والا ضمیمہ ہو گیا۔

کاظم علی خاں: اس میں تو سات ضمیمے ہیں اور ان ضمیموں میں مختلف.....

نیّر مسعود: اچھا، اب اس میں مختلف لوگوں کے نام آئے ہیں، جگہوں کے نام آئے ہیں، مثلاً ''اندراس میں عطر کا حوض چھلکتا رہا''، تو اندراس کیا ہے، اس کا انھوں نے پتا لگایا کہ نصیر الدین حیدر کے زمانے کی عمارت تھی، اب ہے کہ نہیں ہے، مثلاً وہ غدر میں ختم ہو گئی۔ پھر تلفظ اور املا والا ضمیمہ جو ہے۔

کاظم علی خاں: وہ بھی بہت عمدہ ہے۔

نیّر مسعود: یہ ان کا خاص میدان ہے، رشید حسن خاں کا، تو اس میں بھی حیرت خیز محنت کی گئی ہے۔

کاظم علی خاں: اچھا اشاریہ، بہ کثرت اشعار اس میں، کتابت کے متن میں سرور نے کھپا دیے ہیں۔ تو ان اشعار پر بھی انھوں نے کافی تحقیق کی ہے، مختلف دواوین اور کلیات کھنگالے ہیں، اصل دیوان دیکھے ہیں۔ یا کہیں کہیں حسرتؔ موہانی کے انتخاب سے بھی، مجھے خیال ہے کہ انھوں نے کام لیا ہے۔

نیّر مسعود: اس میں بھی.....

کاظم علی خاں: شعر میں بھی بعض جگہ سرؔور کے یہاں تسامح ہے۔

نیّر مسعود: غلط مصرعے ہیں، جان کے بھی....

کاظم علی خاں: جان کر یا کسی بھی بنا پر، تو انھوں نے اس کی تصحیح کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔

نیّر مسعود: مثال کے طور پر کس کا شعر ہے، یہ سرور نے کہیں لکھا، کہیں نہیں لکھا اور کہیں غلط لکھ دیا۔ یہ سب تحقیق کر کے اس کا پتا لگانا۔ واقعہ تو یہ ہے کہ اس کا ہر ضمیمہ بھی قریب قریب ایک پی ایچ ڈی تھیسس کی اہمیت رکھتا ہے۔

کاظم علی خاں: جی بالکل۔

نیّر مسعود: ضمیموں کے بعد اب فرہنگیں آتی ہیں۔

کاظم علی خاں: فرہنگیں بھی، ایک فرہنگ، دو فرہنگ.....اچھا اس میں عربی کی بھی عبارات، مثلاً آیات ہیں اور فارسی کی، اس کی اطلاعات ہیں۔ تو یہ بھی حصہ اس کا کافی زبردست ہے۔

نیّر مسعود: کون لفظ کہاں مذکر بولا جاتا ہے، کہاں مونث بولا جاتا ہے۔

کاظم علی خاں: جی ہاں، تذکیر و تانیث کے بھی مباحث۔

نیّر مسعود: لیکن کاظم علی خاں صاحب، ایک چیز کی مجھ کو بڑی کوفت بھی ہے اور بہت ہی ناگواری کی بات بھی ہے وہ.....

کاظم علی خاں: جی۔

نیّر مسعود: کہ اتنے اہتمام اور اتنی محنت سے یہ لکھی گئی اور ایڈیٹنگ کی سب سے اہم چیزوں میں ہے وہ ہے مختلف نسخوں کے اختلاف کا درج کرنا....

کاظم علی خاں: جی ہاں۔

نیّر مسعود: اختلافِ نسخ کا کام...

کاظم علی خاں: نہیں، کیا تو ہے۔

نیّر مسعود: وہ صرف چودہ صفحے....

کاظم علی خاں: ہاں، مختصر ہے اور بڑی باریک کتابت ہے۔

نیّر مسعود: لیکن وہ حصہ صرف بیان لکھنؤ کا ہے۔ چوں کہ کتاب کے صفحات زیادہ ہوئے جا رہے تھے اس لیے اکہتر صفحے چھوڑ دیے گئے۔ پچاسی صفحے کی چیز کا ایک ٹکڑا چودہ صفحے کا، اس بنا پر کہ کچھ صفحے زیادہ ہوئے جا رہے ہیں۔

کاظم علی خاں: ہاں یہ تو پبلیشر کی Budgetry Problem تمام مجبوریاں ہیں۔

نیّر مسعود: دوسری کمی اشاریے کی رہی کہ اشاریہ بھی ان کو محدود بنانا پڑا۔ پھر وہی صفحات....

کاظم علی خاں: جی ہاں۔

کاظم علی خاں: کتاب کے سلسلے میں میرا خیال ہے ہم لوگ یہ بھی بات کرتے چلیں کہ یہ 'فسانۂ عجائب' جو لکھنؤ کا کلاسیکی ادب، نثر کا ایک شاہ کار ہے، اس کے ساتھ ساتھ رشید حسن خاں، میر امّن کی 'باغ و بہار' پر بھی کام کر رہے ہیں اور یہ دو کتابیں اس اعتبار سے بہت اہم ہیں۔ تو یہ بھی ایک کام کر رہے ہیں وہ۔

نیّر مسعود: جی ہاں۔ اچھا ایک چیز کاظم علی خاں صاحب، میں سوچتا ہوں کہ جب اس پر بات ہو رہی تو کہیں سے ایک چھوٹا سا ٹکڑا اصل کتاب کا پڑھ دیا جائے۔ اس سے ہمارے ناظرین کو اندازہ ہو کہ یہ کتاب کس قسم کی ہے۔

کاظم علی خاں: جی ہاں! ضرور۔

نیّر مسعود: اور کوئی حصہ اُن کی فرہنگ وغیرہ کے دو تین لفظوں کا کہ کس طرح....

کاظم علی خاں: جی ہاں، جی ہاں۔

نیّر مسعود: تو یہاں سے لیا جائے۔

''اب پانچ چار روز سے ہمارے طالع بیدار، جاگتے جاگتے دفعتاً سو گئے۔ ایک ساحر مکار، جھاکار، یہ زور سحر اُسے محل سے اٹھالے گیا۔ داغ فرقت دے گیا۔ ہنوز یہ جملۂ غم ناتمام تھا کہ جانِ عالم کا کام تمام ہوا۔ آہِ سرد کھینچ کر بہ حال خستہ و پریشان مثال قالب بے جان زمین پر گر کے بہ حسرت و یاس پکارا۔ شعر:

جی کی جی ہی میں رہی بات نہ ہونے پائی
حیف ہے اس سے ملاقات نہ ہونے پائی

اب یہ مشکل زبان ہے لیکن اتنی سہولت سے جو میں پڑھ رہا ہوں، اس کا خاص سبب یہ ہے کہ....

کاظم علی خاں: پنکچویشنس۔

نیّر مسعود: ہاں ان کی وجہ سے پڑھنے میں کوئی خاص دقّت نہیں ہوتی، ورنہ روانی سے...

کاظم علی خاں: ہاں اس روانی سے واقعی پڑھنا اس کتاب کا جوہر ہے.....

نیّر مسعود: اچھا اب یہ تلفظ اور املا کے سلسلے میں دریغ ہی کا لفظ موجود ہے۔ ''دریغ: فارسی لغات میں اسے بہ کسرِ اوّل و دوم 'دریغ' لکھا گیا ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں یہ لفظ موجود ہے لیکن حرکات کی صراحت نہیں کی گئی، البتہ نور اللغات میں اسے فارسی کے مطابق 'بہ کسرِ اوّل و دوم' ہی لکھا گیا ہے....''

اسی طرح فرہنگ میں جتنے بھی لوازم ہیں تقریباً سب جمع کر دیے ہیں۔

کاظم علی خاں: بڑی محنت کی بڑی محنت ہے۔

(لکھنؤ دوردرشن سے 7/جون 1990 کو نشر)

(مشمولہ'رشید حسن خاں کچھ یادیں کچھ جائزے،، ناشر، مکتبہ الحرا در بھنگہ بہار، 2008، صفحہ 277 تا 284)

○○○

نثار احمد فاروقی

فسانۂ عجائب پر ایک نظر

رجب علی بیگ سرورؔ کی تصنیف ''فسانۂ عجائب'' اُردو نثر کے کلاسیکی سرمائے میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ میر امن کی ''باغ و بہار'' اگر دبستان دہلی کی نمایندہ ہے تو فسانۂ عجائب کو لکھنؤ اسکول کی ادبی نثر کا معیاری نمونہ کہا جا سکتا ہے۔

کتاب فسانۂ عجائب متعدد بار طبع ہو چکی ہے اور دانش گاہوں کے نصاب میں بھی شامل رہی ہے۔ جب سے فارسی عربی کا مذاقِ علم ختم ہوا ہے، اس کتاب کی زبان کو عموماً بہت مشکل سمجھا جانے لگا ہے، حالاں کہ ایسا نہیں ہے۔ فسانۂ عجائب کی زبان مشکل نہیں، مقفّٰی اور مسجّع نثر ہے جس سے اب ہمارے کان مانوس نہیں رہے۔

دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو نے فسانۂ عجائب کے متن کی تصحیح و ترتیب کا کام جناب رشید حسن خاں کے سپرد کیا تھا۔ انھوں نے کئی برس تک اس پر محنت کی اور اب اس کے متن (صفحات 601) کو مقدمہ (صفحات 191) کے علاوہ تشریحات (صفحات 30) تخریج اشعار (صفحات 18) تراجم اشخاص وغیرہ (صفحات 28) تلفظ و املا کی وضاحت (صفحات 73) الفاظ اور طریق استعمال (صفحات 11) اختلافِ نسخ (صفحات 13) فرہنگ (صفحات 47) فارسی اشعار اور فقروں کا ترجمہ (صفحات 6) کے ساتھ چھاپا ہے۔ مقدمہ، متن اور ضمیموں کے صفحات کی مجموعی تعداد (718) ہوتی ہے۔ اسے ہندوستان میں انجمن ترقی (ہند) نے چھاپا ہے (1990) اور یہی کتاب پاکستان میں ادارہ ''نقوش'' لاہور نے بھی چھاپی ہے (اپریل 1990) اس میں شک نہیں کہ کتاب بہت اچھی چھپی ہے، اُردو کے ادبی متون اتنے اہتمام سے کم ہی شائع ہوتے ہیں۔

اُردو تحقیق خصوصاً تدوینِ متون کے میدان میں رشید حسن خاں ایک معتبر نام ہے۔ وہ تقریباً 45 سال سے لکھ رہے ہیں۔ ان کا خصوصی مطالعہ لغت، قواعد، املا، عروض و شعریات میں ہے اور انھوں نے ان موضوعات پر قابلِ قدر اور لائقِ تحسین کام کیا ہے۔

انھیں شدت کے ساتھ یہ احساس ہوا کہ اُردو میں کلاسیکی نظم و نثر کے متون بہت غلط چھپے ہوئے ہیں۔ اور ان کی تصحیح کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ میرؔ و سوداؔ جیسے قد آور شاعروں کے دواوین بھی اغلاط اور الحاقی کلام سے خالی نہیں ہیں۔ متون صحیح نہ ہونے کی وجہ سے طلبا کی رہ نمائی بھی صحیح نہیں ہوتی ہے۔ اس لیے خاں صاحب نے کلاسیکی اُردو نظم و نثر کے کئی متون بہت دیدہ ریزی سے ایڈٹ کیے ہیں۔ زبان کے قواعد اور املا کے مباحث پر بھی انھوں نے بہت تفصیل سے کام لیا ہے۔

رشید حسن خاں اپنی تنقید و تحقیق میں سخت احتساب اور قطعیت کے لیے جانے جاتے ہیں۔ وہ نقد و نظر میں آزادیِ اظہار اور سخت گیری کے قائل ہیں۔ اُن کے تعارف میں اس کتاب کے گردپیش پر لکھا گیا ہے:

> ''.....رشید حسن خاں نے سب سے پہلے درسِ نظامی کی تعلیم مدرسہ بحر العلوم شاہ جہاں پور میں حاصل کی.... تحقیق میں قاضی عبدالودود کی روایت کے پیرو ہیں اور تدوین میں مولانا عرشی کو اپنا معنوی استاد مانتے ہیں۔ وہ ہمارے زمانے کے سب سے زیادہ حق گو اور بے باک محقق ہیں۔ جن کے تبصروں نے احتساب کی روایت کو تسلسل بخشا ہے...'' (ہندوستانی اڈیشن)

انھوں نے تدوین کے علاوہ نقد و تحقیق کے اصول پر بھی کئی مفید مضامین لکھے ہیں۔ اُن کے کاموں کو معیاری اور مثالی سمجھا جاتا ہے، اگر ان کی ساری کاوشوں کو سامنے رکھ کر فیصلہ کیا جائے تو اُن کے کام یقیناً قدردانی کے مستحق ہیں۔

''اس مشکل متن کو.... بلاتکلف مثالی کتاب کی حیثیت سے پیش کیا جاسکتا ہے۔اس کتاب کی تکمیل میں اس طرح کم وبیش آٹھ سال صرف ہوئے ہیں۔''

جناب خلیق انجم نے ''حرفِ آغاز'' میں کہا ہے:

''ہمارے زمانے کے اکثر اساتذہ بھی کلاسیکی متن صحیح طور پر نہیں پڑھ پاتے۔فسانۂ عجائب کا زیرِ نظر اڈیشن رشید حسن خاں صاحب نے تقریباً تیس سالہ تجربے اور اُن کی سات آٹھ سالہ غیر معمولی محنت اور دیدہ ریزی کا نتیجہ ہے۔اس میں مشکل الفاظ کا صحیح تلفظ نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔انجمن ترقی اُردو (ہند) فخر کے ساتھ رشید حسن خاں صاحب کا یہ غیر معمولی اور قابلِ تقلید کارنامہ پیش کر رہی ہے۔'' (صفحہ 13)

مقدمہ کتاب میں رشید حسن خاں نے اپنے طریق کار کی وضاحت کی ہے:

''تدوین کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ کسی متن کو ممکن حد تک منشاے مصنف کے مطابق پیش کرنے کی کوشش کی جائے۔ہر لفظ کا تعین مرتب کی ذمہ داری ہے۔لفظ مجموعہ ہوتا ہے حرفوں کا ،اور یوں کہا جاسکتا ہے کہ حرف کا تعین اس ذمہ داری میں شامل ہے۔اس خیال سے یہ کتاب صحت کے ساتھ چھپے، میں نے خود ہر کتابت شدہ صفحے کو پانچ بار پڑھا ہے۔''
صفحہ 104)

اس اظہار کے بعد یہ قطعی طور پر طے ہوجاتا ہے کہ فسانۂ عجائب کے موجودہ اڈیشن میں جو کچھ جس طرح چھپا ہے وہ پانچ بار رشید حسن خاں کی نظر سے گزرا ہے اور انھوں نے اسے درست سمجھ کر ہی باقی رکھا ہے۔اس کا متن منشاے مصنف کے مطابق ہو یا نہ ہو، منشاے مرتب کے مطابق ضرور ہے۔

کسی متن کی تدوین کا معیار کیا ہو، اس کی چند صورتیں ہیں:

(الف) جو معیاری املا، اور محاورہ ہے اُس کے مطابق ہو۔

(ب) مصنف کا مقصد وقطعیت کے ساتھ معلوم ہے تو اُس کے موافق ہو۔

(ج) مرتّب یا مدوّن کے مرعومات سے مطابقت رکھتا ہو۔

(د) عوام میں، یا عام طور پر جو صورت رائج ہو چکی ہے اُس کی تقلید کی جائے۔

(ہ) علمائے سلف اور کتبِ قواعد ولغت کو معیار مانا جائے۔

کسی مدوّن کو یہ حق حاصل ہے کہ ان میں سے کسی ایک شق کو اختیار کر کے اس کی روشنی میں متن کی تدوین کرے، مگر یہ کسی طرح قابلِ تعریف نہیں ہوسکتا کہ:

(الف) کہیں لغت اور قواعد سے سند لی جائے۔

(ب) کہیں محاورہ عام کو سند مانا جائے۔

(ج) کہیں گفتگوے عوام کے مطابق ہو۔

(د) کہیں مصنف نے جس طرح لکھا ہے اُسے صحیح کہا جائے۔

(ہ) کہیں اپنے اجتہاد کو قولِ فیصل بنا دیا جائے۔

اتنے مختلف اور متضاد اصول ہوں تو متن ایک خوابِ پریشاں بن کر رہ جاتا ہے اور مقصود مصنف سے بہت دور جا پڑتا ہے۔فسانۂ عجائب کے موجوہ متن کی تدوین کو ''مقصودِ مصنف'' کے مطابق نہیں کہا جاسکتا۔ یہ خود تدوین کرنے والے کے منشا سے زیادہ قریب ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ترتیب وتدوین کا خاکہ بہت سلیقے سے بنایا گیا ہے اور تمام ضروری باتوں (بل کہ کچھ غیر ضروری بھی) کا احاطہ کر لیا گیا ہے۔مگر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اتنی محنت کر کے فسانۂ عجائب کو غیر ضروری اہمیت دے دی گئی ہے۔ یہ کتاب دبستانِ لکھنؤ کی اُردو نثر کا ایک نمونہ ہے اور اُس دور کے مذاق سے مطابقت رکھتی ہے۔نثر کا یہ اسلوب چند ہی برسوں کے بعد غیر مقبول ہو چکا تھا۔طلبا کو یہ کتاب نثر مرصّع کار کے نمونے کے طور پر پڑھائی جاتی تھی۔اس میں کسی اعتبار سے ایسا کچھ نہیں ہے جس سے طالب علم کو کچھ ذہنی خوراک مل سکے۔

قصے کے اعتبار سے بھی فسانۂ عجائب بہت کمزور ہے۔اگر افسانے یا ناول کی تکنیک کے مسلمہ اصولوں کی روشنی میں اس کا تجزیہ کیا جائے تو یہ قدیم داستان کے انداز کی ایک بے تکی کہانی سے زیادہ قرار نہیں پاتی۔ جب تک اُردو میں افسانے اور ناول کا رواج نہیں ہوا تھا اِسے ایک مختصر داستان کے طور پر وقت گزاری کے لیے پڑھا جاتا تھا۔اسی لیے بار بار چھپتی رہی اور مصنف اس میں ترمیم واضافہ بھی کرتا رہا۔اسلوب نثر کی ادبی قدر و قیمت یا داستان/افسانے کی تکنیکی اہمیت کے اعتبار سے یہ کتاب ایسی تو ہر گز نہیں ہے کہ عمر عزیز کے سات آٹھ سال اس کے زیر وزبر ٹھیک کرنے میں کھپا دیے جائیں۔

بہر حال اس متن کی تدوین میں رشید حسن خاں نے بقول خود چند بنیادی باتوں کا خیال رکھا ہے:

(الف) متن کے ہر لفظ/حرف کی صحت متعین کی جائے اور وہ منشاے مصنف کے مطابق ہو۔

(ب) ہر لفظ کا صحیح تلفّظ بتایا جائے (کہیں روزمرّہ کہیں لغت سے سند لے کر!)

(ج) الفاظ کے صحیح املا کا اہتمام کیا جائے (اکثر املا دورِ حاضر کے رواج کے مطابق ہی ہے)

(د) متن کی صحیح قرأت کے لیے رموزِ اوقاف اور عبارت میں مناسب فاصلے ظاہر کیے جائیں۔

لیکن کتاب کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان اصولوں کی پوری طرح رعایت نہیں ہوسکتی ہے۔چند مثالیں (کسی ترتیب کے بغیر) لکھتا ہوں:

(1) بعض جگہ متن واضح نہیں ہے یا بالکل مہمل ہو کر رہ گیا ہے، مثلاً

فسانۂ عجائب(طبع 1990)

مگروہ جومَثَل ہے: نیک اندر بد؛ یہ اَصَل ہے لبِ معشوق، مولویوں سے، یعنی ہم پہلو لُعبتانِ ممرو، پری شمائل، زُہرہ جبین، بَرزِن، رہ زنِ دیں، مشتری خصائل۔ ستم ناز، غضب انداز، سحرِ کرشمہ طلسم غمزہ، آفت عشوہ، قہر ادا، قیامت گات، کرامت بات کی؛ کہ ہاروت ماروت تو کیا معاذ اللہ اگر سب فرشتے عرش سے فرش خاک پر آئیں؛ اُن کی چاہ میں لکھنؤ کے کنوئیں بھر جائیں۔(ص 14)

(**فسانۂ عجائب**(طبع اوّل 1259ھ)

مگروہ جومثل ہے نیک اندر بدیہہ اصل ہی لب معشوق مولویوں وہ رنڈیاں پری شمائل زہرہ پیکر مشتری خصائل اس ناز و ادا سحر کرامت غمزہ عشوہ ادا کہات بانکی کی ہاروت ماروت تو کیا معاذ اللہ اگر سب فرشتی عرش سی فرش خاک پر آئیں اونکی چاہ میں لکھنؤ کی کنوئیں بہر جائیں (ص 10)

مرتب نے اس میں زیر زبر لگانے کو سوا کیا کیا ہے؟ عبارت بدستور مُغلق بل کہ مہمل ہے۔ اب اس عبارت میں کوئی اُستاد کیا پڑھائے اور طالب علم کیا سمجھے؟

اوپر کی عبارت میں اصل کو مَثَل کا قافیہ بنایا ہے تو گمان ہوتا ہے کہ مصنف نے اس کا عوامی تلفظ اَصَل (بفتح دوم) ذہن میں رکھا ہے۔ پھر لبِ معشوق کی رعایت سے عَسَل (شہد) کا ایہام بھی ہے۔1

لبِ معشوق مولویوں سے'' زیادہ مضحکہ خیز عبارت اور کیا ہوگی؟ یہاں طوائفوں کے بیان میں مولوی کہاں سے آ گئے؟ یہ کتابت کی غلطی شاید پہلی طباعت سے ہی چلی آتی ہے۔ چوں کہ بیان طوائفوں کا ہے۔ اس لیے گمان ہوتا ہے کہ یہ ''مولو'' (بکاؤ) تنوع سے'' (یعنی جن کے جسم خریدے جاتے ہیں) ہوسکتا ہے۔ عبارت کا مفہوم بظاہر یوں ہے کہ ''وہ جو کہاوت ہے کہ بُری چیز میں بھی کچھ اچھی چیزیں ہوتی ہیں یہ (اَصَل ہے یعنی صحیح ہے) اور یہ اِن مُولو، تن والیوں کے لبِ معشوق سے عسل (شہد) ہے۔ اس میں لفظ اَصَل کو بطور ایہام استعمال کیا ہے اور لبِ معشوق کنایہ چیدگی سے ہے۔

اس کے بعد کا فقرہ ہے: ''بَرزن رہ زنِ دیں۔'' اِس پر مرتب نے حاشیہ نہ دیا ہے:

''بہارِ عجم میں ''بروزن'' کے معنی'' کنایہ از خوار و بے اعتبار کردن'' لکھے ہیں۔ اِس سے امرِ حاضر ''برزن'' بنے گا، لیکن عام قاعدے کے مطابق اس کے ساتھ کوئی اور لفظ بھی ہونا چاہیے۔ بہ ظاہر یہی خیال ہوتا ہے کہ سرورؔ نے یہاں ''بَروزن'' طوائفوں کے صفت کے طور پر ''خوار اور بے اعتبار کرنے والیاں'' کے معنی میں لکھا ہے۔ اور کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ کہ اس کی جگہ ''ہرزن'' ہے لیکن یہ واضح طور پر غلطی کتابت ہے کیوں کہ ''ہرزن یہاں قطعاً بے محل ہے۔ بروزن کی تو کسی طرح تاویل کی جاسکتی ہے۔'' (ص 371)

اس وضاحت میں ایک تو امرِ حاضر کی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ صیغۂ امر تو ہوتا ہی حاضر کے لیے ہے۔ پھر یہاں بروزن سے امرِ حاضر کا کیا موقع ہے۔ اگر ''خوار و بے اعتبار کرنے والیاں'' مقصود ہے تو اسم فاعل کی ضرورت ہے۔ ''ہرزن'' کو مرتب قطعاً بے محل بتاتے ہیں۔ حالاں کہ وہ اہلِ سیاق ہیں بالکل برمحل ہے۔ بیان طوائفوں کا ہو رہا ہے، کسی ایک حسینہ کا نہیں، تو یہ کہنا کہ اُن میں سے ''ہرزن رہ زنِ دین'' ہے بے محل کیوں ہوگیا؟ جب ایک نسخے (مطبع محمدی کان پور) میں ''ہرزن'' ملتا بھی ہے۔ برزن کا ایک مفہوم کوچہ گلی بھی ہے جیسا کہ اکبرالہٰ آبادی نے کہا ہے:

تھا	مشہور	کوچہ	و	بَرزن
ہال	میں	ناچیں	لیڈی	کرزن

بَرزن کا ''امرِ حاضر'' ہونے سے زیادہ تو یہ قرینِ صحت ہے کہ برزن بمعنی کوچہ سمجھا جائے۔2 خاں صاحب نے سیاق وسباق پر نظر رکھے بغیر یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ ''طوائفوں کی صفت کے طور پر ''خوار اور بے اعتبار کرنے والیاں'' مقصود ہوسکتا ہے۔ حالاں کہ دو چار ہی سطروں کے بعد مصنف کہہ رہا ہے:

''اِسی کوچے کے فیض سے انسان آدمیت بہم پہچانتا ہے۔ تراش خراشِ اثرِ صحبت سے کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔'' (ص 15)

اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ طوائفوں کی صحبت سے آدمیت پیدا ہوتی ہے۔ ''اسی کوچے کے فیض سے'' کے الفاظ برزن (بمعنی کوچہ) کی طرف بھی اشارہ کر رہے ہیں۔

اسی عبارت میں آگے ''کرامت بات کی'' آیا ہے، بظاہر یہاں ''کی'' زائد ہے ''قیامت گات، کرامت بات:: کے بعد 'کی' محض غلط ہے۔ پہلی روایت میں ''گات'' یا ''بھی'' تھا ترمیم و اضافے کے وقت ''کی'' باقی رہ گیا۔ مرتب کو عبارت کے مربوط کرنے کی کوشش تو کرنی چاہیے تھی۔

(2) املا، تلفظ کی وہ شکل جو اُردو کی بولی ٹھولی میں مستعمل ہے خواہ وہ لغت و قواعد کے خلاف ہو:

خرّاد (ص 2) یہ بلا تشدید بھی مستعمل ہے۔ اس کا مادہ خ رط ہے، لکڑی (یا دھات) کی کسی شے کو چھیلنا، کوئی شکل دینا۔ پہلے زمانے میں لکڑی یا بانس کے ٹکڑے کو اندر سے چھیل کر اُس میں کاغذ وغیرہ رکھتے تھے، اور اسے خریط کہتے تھے پھر مطلق کسی ظرف کو خریط کہا گیا (جیسے تھیلی) پھر ظرف بول کر مظروف مراد لیا گیا اور یہی خارطہ ہوگیا جو آج بھی عربی میں نقشے کو کہتے ہیں، انگریزی میں یہی لفظ پہلے carta ہوا (جیسے Magna Carta میں) پھر یہی Chart ہوا اور اسی سے کارڈ بن گیا۔

اُردو میں چھیل کر شکل دینے کے اس کام کو خَراط کہا گیا۔ آخر ط دال سے بدل گئی۔ اور خراد آج بھی بولا جاتا ہے۔ مگر خرّاد (بہ تشدید دوم) کے لیے رشید حسن خاں نے لکھا ہے:

''خرّاد بہ رائے مشدد، یہاں بہ طور اِسم فاعل آیا ہے۔'' (ص 471)

اسم فاعل یہ کس مادّے اور کس قاعدے سے ہو جائے گا۔ یہ وزن تو اسمِ مبالغہ کا ہے۔ خراد اُس مشین Lathe کو کہتے ہیں جس میں کسی شے کو کس کر چھیلا جاتا ہے اور اسی مفہوم میں سرورؔ نے استعال کیا ہے:

''مردِ تماش بین کے واسطے یہ شہر خراد ہے، ہرفن کا یہاں اُستاد ہے۔'' (ص 8)

بعض نسخوں میں خواہ بہ تشدید لکھا ہو، مگر منشائے مصنف یہ نہیں ہوسکتا۔ شہر لکھنؤ کو اسم فاعل کی بجائے اسمِ آلہ بتایا گیا ہے کہ آدمی کو چھیل کر خراد مشین کی طرح سنوار دیتا ہے۔

رضا بفتح اوّل (ص 14) شُغل بفتح اوّل (ص 24) گذری بسکون دوم (ص 38) میں مرتب نے عام تلفظ کی پیروی کی ہے اور یہ صحیح ہے حالاں کہ از روئے لغت یہ الفاظ یقیناً شُغل اور گذری ہیں۔ (جیسے مصحفی: ہوتا ہے سرِ شام تماشا گذری کا)

مگر مرتب نے معزّ ز (25) بہ کسرِ سوم لکھا ہے۔ یہ مقصودِ مصنف نہیں ہوسکتا۔ بہ حالتِ مفعولی میں ہے تو لازماً بروزنِ مقدّر آئے گا۔ اسی طرح مورّخ (ص 32) کی واؤ پر زبر لگایا ہے۔ اس کا مادہ ارخ ہے۔ ہمزہ اصلی ہے، حالتِ فاعلی میں واؤ ہمزہ کو ظاہر کرنے کے لیے آرہی ہے، اور اُسی کا تلفظ ہوگا، واؤ کا نہیں۔

(3) املا رتلفظ کی وہ شکل جو مدوّنِ متن کا مقصود ہے اور یہ کسی طرح ثابت نہیں کہ رجب علی بیگ سرورؔ بھی اسی املا رتلفظ کو صحیح سمجھتے تھے؛

زعم فاسد (ص 2) مرتّب نے بضمِ اوّل لکھا ہے، صحیح بفتحِ اوّل ہے۔ یہ کیسے سمجھا جائے گا کہ یہ سرورؔ کا تلفظ ہے۔ سرور نے طبعِ اوّل میں قدّ وبالا بہ تشدیدِ دال لکھا ہے۔ مرتب نے تشدید نکال دی (ص 40)۔

سرورؔ نے طبعِ اوّل میں لال سپید لکھا تھا، نئے اڈیشن میں لعلِ سپید (ص 45) ہے۔

عزمِ باجزم (ص 51) میں عزم کی میم پر کسرہ لگا دیا ہے۔ یعنی مرتب اس کو اضافتِ توصیفی سمجھا ہے، یہ غلط محض ہے، مقصودِ مصنف نہیں ہوسکتا۔ صحیح سکونِ میم کے ساتھ ہے۔

(4) بعض الفاظ صریحاً لغت رقواعد راصولِ املا کے خلاف ہیں اُن کی کوئی تاویل نہیں کی جاسکتی؛

مرتب نے ہر جگہ خاتمت الطبع لکھا ہے (ص 35,28,26 وغیرہ) یہ خاتمہ اور الطبع کا مرکب ہے۔ اضافت میں تا ملفوظ ہوگی۔ مگر جو تائے اصلی نہ ہو وہ پوری (ت) نہیں لکھی جاتی (ۃ) لکھتے ہیں۔

جُزو کُل بنایا (ص 1) مقصودِ مصنف کیا ہے اِس سے قطع نظر، جُز کے معنی ''سوائے'' Except ہیں جیسے غالبؔ:

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروے کار

اور کل کی ضد جُز (واؤ کے ساتھ ہوگی۔ جیسے غالبؔ:

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کُل

جُز فارسی ہے اِس کی جمع نہیں آتی۔ جزو عربی ہے اس کی جمع اجزا آتی ہے۔

تحتُ الثّریٰ (ص 59) بہ ضمِ سوم لکھا ہے، بفتحِ سوم ہونا چاہیے اور مرتب کے اصول سے ثریٰ کو بھی ثرا لکھنا چاہیے۔

لہو کے گھونٹ گلا گھونٹ گھونٹ پیے (ص 61) پہلا گھونٹ (جُرعہ) واوِ معروف سے ہے (بروزنِ اونٹ) مرتب نے بعد کے دونوں گھونٹ پر بھی واوِ معروف کی علامت لگا دی ہے جب کہ یہ دونوں واوِ مجہول سے (بروزن ہونٹ ہیں)

لہو ولعب (ص 66) عین پر علامتِ سکون دی ہے۔ صحیح بکسرِ عین ہے۔ قرآن میں بھی لَھو ولَعِب (العنکبوت 64:29 آیا ہے اور یہی صحیح ہے۔

لاغر اسے کہتے ہیں تیّار اسے کہتے ہیں (66) تیار کا کوئی محل نہیں۔ یہ لفظ تیمار ہونا چاہیے۔ ''کہیں آنسو کی یہ سرایت ہے'' (ص 72) سرایت بکسرِ اوّل لکھا ہے صحیح بفتحِ اوّل ہے۔

لفظوں کے املا کی چند صورتیں ہوسکتی ہیں۔

(الف) کسی لفظ کا املا از روے اصولِ اشتقاق کیا ہے اور لُغت میں کس طرح دیا گیا ہے۔ ہم تلفظ میں تو رواجِ عام کو ترجیح دے سکتے ہیں، مگر غلط املا کا عام رواج سند نہیں ہوسکتا۔ بعض صورتوں میں اس کا استثنا ہے۔ جیسے طیار کو اب عام طور سے تیار لکھا جاتا ہے۔ عربی فارسی سے رجب علی بیگ سرورؔ کی واقفیت عالمانہ نہیں ہے۔ طبعِ اوّل کی پہلی ہی سطر میں اُنھوں نے سورۂ الفرقان کی آیت 54 یوں لکھی ہے۔

''الحمدُ لِلہِ الّذی خَلقَ مِنَ المَآءِ بَشَر اً نجَلہٗ نَسَباً و صَھراًو کانَ رَبُّکَ قَدِ یراً (متن ص 1)

اس میں الحمد للہ کا سرورؔ نے قرآنی آیت میں اپنی طرف سے اضافہ کر دیا ہے۔ آیت وَھُوالذّی ے شروع ہوتی ہے آخر میں صِہراً کو جو بالکسر ہے صَھراً بالفتح لکھا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی مرتب نے تصحیح میں ''الحمد للہ'' یعنی قرآن پر اضافے کو برقرار رکھا ہے۔

مرتب نے اِس پر بھی غور نہیں کیا کہ اس آیت کے مفہوم کا فسانۂ عجائب کے قصّے سے کوئی ربط نہیں، بالکل اَنمل بے جوڑ ہے۔ اسی طرح سرورؔ نے طبعِ اوّل میں لَحمُک لَحمِی وَ دَمَکَ دَمّی (لحمک کی میم پر زبر اور دَمَکَ ودمی کی میم مشدد نہیں ہے۔ مثلُ اھلِ بیتی کمثلِ سفینۃ نوحٍ من رَ کبہانجا من تخلّف عنہا غرِ ق وھوی میں اَھل کے لام پر زبر لگایا زیر ہونا چاہیے۔ رکِبہا میں کاف کو مفتوں رکھا مکسور ہونا چاہیے غرق میں دوسرا حرف مکسور ہے اُسے مفتوح لکھ دیا۔

یہاں مرتّب نے جو تصحیح کی ہے وہ منشاے مصنف کا حصول نہ ہوا۔ اُس کی غلطی کی اصلاح ہوئی۔

(ب) تلفظ کے مسئلے میں یہ دیکھا جائے گا کہ لفظ اگر دخیل ہے تو اصل زبان میں اس کا تلفظ کیا ہے اُردو والوں نے عام طور پر کیا تلفظ اختیار کیا ہے۔ جیسے نعش رلاش۔

کسی تلفظ کا عوامی تلفظ کیا ہے؟ جیسے فتیلہ رفلیتہ، قفلی رقلفی پہلی شکل درست ہے۔ از روے لغت وقواعد کسی لفظ کا تلفظ کیا متعین ہوتا ہے۔ جیسے تحت الثریٰ میں پہلا درست ہے۔ خود رجب علی بیگ نے کسی لفظ کا کیا تلفظ اختیار کیا ہے۔ یہ طبعِ اوّل کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے جیسے چند مثالیں اوپر درج کی گئیں۔ کچھ الفاظ اب غریب اور نامانوس ہو گئے ہیں اُن کا صحیح تلفظ کیا رہا ہے؟

سوال یہ ہے کہ املا اور تلفظ کا معیار کیا ہوا ہے وہ کیسے متعین ہو؟ اگر رجب علی بیگ سرورؔ کی تحریر کو معیار مانیں تو طبعِ اوّل میں ایسی غلطیاں ملتی ہیں جنھیں کسی صاحبِ علم سے موسوم نہیں کیا جاسکتا۔ 3 اگر عوامی چلن رروزمرّہ کو معیار بنائیں تو یہ زمانے کے ساتھ بدلتا بھی رہتا ہے اور بعض لفظوں کی تذکیر وتانیث یا زیر زبر میں دہلی ولکھنؤ کا اختلاف معلوم ہے۔

ہر دور کا املا بھی بدل جاتا ہے، اُنیسویں صدی میں اُردو کا جو املا رائج تھا اُسے آج ایسے اُردو کے بعض اوسط درجے کے طالبِ علم تو پڑھ بھی نہیں سکتے۔ یاے معروف ومجہول کا فرق نہیں تھا۔ ک اور گ دونوں کے لیے ایک ہی مرکز سے کام چل جاتا تھا وغیرہ۔

مرتب نے اس دور کے املا کی پابندی نہیں کی اور کی بھی نہیں جاسکتی تھی مگر منشاے مصنف تو وہی تھا! لامحالہ آپ نے آج کا معیاری املا اختیار کیا تو تلفظ میں بھی اسی معیار کو باقی رکھنا چاہیے تھا۔ یہ دو

عملی کیوں کہ رسمِ تحریر میں تو آج کے املا کا اتباع کیا جائے اور تلفظ میں عہدِ رجب علی بیگ کا۔ یا بالعکس۔

مقصود یہ کہ کسی کلاسیکی متن کی تدوین جدید کرتے ہوئے ہمیں لامحالہ تلفظ اور املا دونوں میں گرامر، لغت اور استقاق کے اصول کی پابندی کرنی ہوگی۔ یہی سلامتی کا راستہ ہے۔

کسی متن کی ایسی تدوین قابلِ تحسین نہیں ہوسکتی جس میں کہیں تو کہا جائے یہ منشائے مصنف ہے۔ کہیں یہ دلیل ہو کہ یہ از روئے قواعد اس طرح ہونا چاہیے۔ کہیں یہ دعوا ہو کہ روزمرّہ میں یوں بولا جاتا ہے۔ متن اس صورت میں مستند ہوسکتا ہے کہ اصول وقواعد کی بالا دستی تسلیم کی جائے۔ اگر مصنف نے اس کے خلاف لکھا ہے تو حواشی میں وضاحت کردی جائے۔

رشید حسن خاں نے کتاب کے متعدد نسخے سامنے رکھے ہیں۔ متن کو پڑھنے میں بہت محنت کی ہے اور حواشی بھی غیر ضروری طوالت کے ساتھ لکھے ہیں۔ مگر وہ تصحیح متن کے اصول متعین نہیں کرسکے جہاں بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ تلفظ/املا میں کسی اصول کی پابندی کی گئی ہے، وہیں اس کی خلاف ورزی کی مثالیں بھی سامنے آتی ہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''عربی میں قاعدہ یہ ہے کہ جن لفظوں کے آخر میں تائے غیر اصلی (یا تاے مدوّر) ہوتی ہے تو زبر کی تنوین کی صورت میں اسی ۃ پر دوز بر لگائے جاتے ہیں جیسے دفعۃً، نسبۃً اور جن الفاظ کے آخر میں تاے اصلی (یا تاے دراز) ہوتی ہے تو تنوین کی صورت میں اس کے آخر میں الف کا اضافہ کیا جاتا ہے جیسے وقت سے وقتاً۔'' (ص 475)

اس اصراف سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرتب کو اس بارے میں قواعدِ املا سے واقفیت ہے۔ انھوں نے یہ بھی اقرار کیا ہے کہ ''فسانۂ عجائب کے نسخوں میں یہی قدیم املا پایا جاتا ہے۔ مگر پھر اس سے انحراف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''اب رجحان یہ ہے کہ ایسے سبھی لفظوں میں کسی طرح کے امتیاز کے بغیر الف کا اضافہ کیا جائے تاکہ یکسانی رہے مثلاً دفعتاً، نسبتاً، مروتاً وغیرہ۔ لیکن پہلے مذکورہ قاعدے کی پابندی کی جاتی تھی اور اسی بنا پر قاعدے کے مطابق دفعۃً رکھا گیا ہے۔ آیندہ بھی ایسے الفاظ میں اسی مسلمہ قاعدے کی پابندی کی جائے گی۔ (ص 475)

یہاں بھی کچھ خلطِ مبحث ہے، مسلمہ قاعدہ تو وہ ہے جو خاں صاحب نے پہلے بیان کیا۔ اور ''اب رجحان یہ ہے'' کے بعد جو کچھ لکھا ہے وہ مسلمہ قاعدے کے تحت نہیں آتا۔ یہاں بھی منشائے مصنف ہاتھ سے نکل گیا۔ متن میں اس قاعدے کی خلاف ورزی بھی ہوئی ہے۔

اعلان نون کے بارے میں مرتب نے (ص 364) وضاحت کی ہے کہ اس کا تعلق اصلاً قواعدِ شاعری سے ہے مگر متعدد مواقع پر اس کی خلاف ورزی ہوئی ہے۔

رجب علی بیگ سرؔور کی ایک غزل در مدحِ لکھنؤ (ص 21) آئی ہے۔ اس میں گدائے لکھنؤ، معجز نمائے لکھنؤ، دعائے لکھنؤ جیسے الفاظ میں ہر جگہ یاے اضافت پر ہمزہ لگایا ہے جو قطعاً خلافِ قاعدہ ہے۔ اصول مرتب کو معلوم ہے۔ چناں چہ اگلے ہی صفحے 23 پر ''ہم پہلوے میر'' بدونِ ہمزہ لکھا ہے جو صحیح ہے۔

فسانۂ عجائب کے مقدمہ و حواشی میں جہاں ہجری اور عیسوی تاریخوں کا تطابق دکھایا گیا ہے وہ کئی مقامات پر نظرِ ثانی کا محتاج ہے۔ تلفظ اور املا کے بارے میں مصنف کے بعض موضوعات دور از کار ہیں۔ مثلاً زبان/زُبان، مقام/مُقام، کِنار/کَنار، اَسرار/اِسرار وغیرہ میں جو معنوی فرق اُنھوں نے رکھا ہے اس کی تائیدِ لُغت اور قواعد کی کتابوں سے نہیں ہوتی۔

ہمزہ سے اُردو والوں کو خدا واسطے کا بَیر ہے، ہمزہ کوئی فضول اور فالتو حرف نہیں، یہ ایک مستقل آواز ہے۔ الف پر کوئی حرکت نہیں آتی ہمزہ حرکات کو قبول کرتا ہے۔ قرأت کا وزن کتابت ہے۔ اس میں الف کے بعد ہمزہ مفتوح ہے اسی طرح ابتدا کا وزن افتعال ہے۔ اس میں الف کے بعد ہمزہ مفتوح ہے۔ اسی طرح ابتدا کا وزن افتعال ہے۔ ہمزہ لام کی جگہ آرہا ہے۔ اگر اسے بغیر ہمزہ کے لکھیں تو ایسا ہی ہے جیسے افتعال کو افتعا یا انطام کو انتظا لکھ کر چھوڑ دیں۔ ہمزہ لکھنے میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ اُردو والوں کو اس سے بدظن کرنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔

اب میں یہاں چند الفاظ کی فہرست دے رہا ہوں جو محلِ نظر ہیں۔ ان پر تبصرہ مختصر کیا گیا ہے اور یہ فسانۂ عجائب کے پورے متن کا احاطہ نہیں کرتے، صرف کچھ الفاظ بطور مثال لکھے گئے ہیں۔ یہ دعوا کرنا کہ فسانۂ عجائب کا متن صحیح ترین اور تمام عیوب واسقام سے پاک ہے صحیح نہ ہوگا۔ رجب علی بیگ سرؔور نے دیباچے میں لکھا ہے:

''کیسی ہی طبیعت عالی ہو، ممکن نہیں جو بشر خطا سے خالی ہو۔'' (ص 30)

یہ بات خود سرؔور پر بھی صادق آتی ہے اور فسانۂ عجائب کی تدوین جدید کرنے والے رشید حسن خاں پر بھی۔ بل کہ یہ تبصرہ نگار بھی اس کی زد سے نہیں بچ سکتا۔

لفظ/ترکیب	املا/تلفظ	صفحہ	کیفیت
ادنیٰ	الف مقصورہ	4	طبع اول میں ادناہے (ص 4) اس کا اظہار مرتب متن نے بھی کیا ہے (ص 446) یہاں مصنف کے مختار املا سے انحراف ہوا ہے اور دوسرے مواقع پر اس سے مختلف املا بھی ملتا ہے جیسے اعلا۔
اَسرار	بفتح اول	197-272	صحیح ہے، مگر ص 76 پر بکسر اول اور ص 447 پر اس کی تاویل کو بھوت پریت کے معنوں میں بالکسری آتا ہے مگر یہاں بھوت پریت کے مفہوم میں نہیں آیا ہے۔
اَصَل		14	یہ مُثّل کے ساتھ قافیہ ہوا ہے تو بظاہر منشائے مصنف بفتح دوم ہے اور اُردو روزمرہ میں اصَل بھی بولا جاتا ہے گو مستند نہیں۔
اِضطرار		544	اس کے معنی بے قراری وغیرہ نہیں، صحیح مفہوم، ''زِچ ہو جانا'' میں (قرآن کریم 2:173)
افغان		270	فغاں پر الف زائد آئے گا تو مصموم ہوگا، مگر کتاب میں دونوں طرح ہے۔
الرّسول اللہ		359	رسول مضاف، اللہ مضاف الیہ ہے۔ مضاف پر ال غلط محض ہے۔
الیل		342	یہ املا بھی غلط ہے، صحیح: اللیل (طبع ؤل ص 204204 میں قائم اللیل ہی لکھا ہے۔ یہ ترمیم مرتب نے کی ہے۔

المنۃ	352	تاے مدّورۃ پر دو نقطے ضروری ہیں۔
التوم اُخ	274	دیکھیے نیند
اُلموت		
اُمرا	182	امیر کی جمع قاعدے کے مطابق ہمزہ ضروری ہے اُردو والے ہمزہ کو پورا حرف ماننے سے کیوں کتراتے ہیں؟
اِنشاءاللہ	361ـ239	اِن حرف ہے اور شاء فعل ہے اِن کو کبھی فعل سے ملا کر نہیں لکھا جاتا صحیح صورت: اِن شاءاللہ (مثلاً اِن کتب کو انکتب لکھنا غلط ہے)
اِنَّما	98	اِنّما ایک ہی لفظ ہے یہ علیحدہ نہیں لکھا جائے گا۔
بارھویں	35	مرتب نے جو علامت لگائی ہے اس کی رو سے یاے معروف پڑھی جائے گی اور یہاں محل یاے مجہول کا ہے۔
بدرُچی برزَن	61	صفحہ 547 پر جو تشریح ہے وہ متن کے مفہوم سے مطابقت نہیں رکھتی۔ فرہنگ میں مرتب نے جو معنی لکھے ہیں اُن کی کوئی سند بھی درج نہیں کی۔
بگڑکر	224	ط1\126 پر جو تشریح کی ہے جس طرح بنے سوداگر سے پکڑ کر بندر ب اس کی ڈھوری پر پہنچاے۔
بِنات	23	بِنت (لڑکی) کی جمع بَنات بفتح اول ہے، بالکسر محض غلط اُردو میں بھی کوئی کسرہ کے ساتھ نہیں بولتا۔
بندر (چھڑانا)	133	ط1/84 میں یہ لفظ مغشوش سا ہے، مرتب نے ''میری بند چھڑایا لکھا ہے (ص133) اور بند کا مفہوم فرہنگ میں نہیں دیا، یہ میری پند چھڑایا، ہونا چاہیے۔ پند چھڑانا اُردو کا محاورہ ہے (پنڈ، جسم، بدن،) بکسرِ اوّل۔
پاؤں	11ـ10	صحیح املا پانو ہے۔ ط1 (ص8 سطر1) میں اسی طرح ہے اور سطر 5 میں جو ''ننگے پانو نہ نکلے'' لکھا ہے تو یہ بطور جمع آیا ہے۔
پلنگ	551	فرہنگ میں اس کے معنی ''ایک مشہور درندہ'' لکھے ہیں ص 551، یہ ایسا ہی ہے جیسے مولف غیاث نے یہ لکھا ہے ''شہرے ست در دنیا'' یہاں چیتا لکھنا چاہیے تھا۔
تپ جُدائی	158ـ152	تپ½ri½ ہندی ہے۔ یہ لفظ تنہا آئے تو درست ہے ترکیب میں تب ہی درست ہوگا۔
تپ دوری	174	
تپ فراق	45	
تحتُ الثریٰ	59	تحت میں دوسری بھی مفتوح ہونی چاہیے اور مرتب کے اصول کے مطابق ثریٰ کا املا بھی ثَرا ہو۔ یہاں قاعدے کو چھوڑ کر استعمال عام کا سہارا لیا ہے۔ (ص462)
تزئین	352	اس میں ہمزہ نہیں ہے دونوں یا ہیں (ت ز ی ی ن)
تعذیر	286ـ250	ذال سے غلطِ محض ہے۔ زا سے ہونا چاہیے۔ تعزیر۔
تمام	336	''توسنِ خامہ تھام'' ہونا چاہیے'' یہ متن کا نقص ہے یا سہو کاتب۔
تُندر نہیب	357	فرہنگ میں ندارد، ط ا ص 154/سطر 19 میں اسی طرح ہے۔ تنڈر فارسی میں گرج، کڑاکا، نہیب: غصہ (Terror) کے معنوں میں ہے۔ مگر یہاں گرج دار آواز کے معنوں میں آیا ہے۔
تیاری	99	مرتب نے اس پر (ص464) نوٹ لکھا ہے مگر یہ نہیں بتایا کہ ص99 پر یہ لفظ غیر مشدد استعمال ہوا ہے۔
ثمود، عاد	164	ثمود اور عاد دو نام ہیں درمیان میں حرف عطف چاہیے۔ مزید یہ کہ طبع اول میں ص 103 میں لفظ ثمود نہیں ہے یہ ''جھونکا ہوا سے قوم عاد کا ہے۔'' مراد یہی ہے کہ قوم عاد صرصر سے ہلاک ہوئی تھی۔
جزوکل	1	جُز + و + کُل غلط ہے۔ جزو + و + کُل ہونا چاہیے۔ جُز کے معنی ہیں سوائے: جز قیس اور کوئی نہ آیا بروے کار (غالبؔ) اور جز کے معنی ہیں ٹکڑا: قطرے میں دریا دکھائی نہ دے اور جُز میں کُل (غالبؔ) ص51 سطر 21 میں بھی جُز کا استعمال غلط ہوا ہے وہاں جزو کا محل ہے۔
جلّ علا	1	یہ جلّ وعلا ہی ہونا چاہیے۔ تشریحات میں جو کچھ لکھا ہے بے معنی ہے (ص364)
جناں	556	اِسے جَنّت کی جمع بتایا ہے۔
جوار	201ـ105	بالفتح غلط ہے، بالکسر ہونا چاہیے۔

جی جلاتے ہیں	351	مرتب نے آتش اور مطبخ کی رعایت سے جی جلاتے ہیں لکھا ہے مگر موقع ''جی جلاتے ہیں'' لکھنے کا ہے۔ جی چلانا، شوق پیدا ہونا'' جو جی چلا ہو ترا امتحانِ بلبل کر'' وغیرہ۔
چِکاں (بکسرِ اوّل)	72	چکیدن مصدر ہے تو چکاں بالفتح ہوگا۔
حَجلہ	186	صحیح حَجلہ بفتح اول و دوم، طا میں حُجلہ بالضّم
حَق سِرّ ہ	283-88	دونوں جگہ را مفتوح لکھی ہے حالاں کہ اسے مضموم ہونا چاہیے حق سِرُّ ہ
خرّ اد	471-8	بِلا تشدید ہے، خراد، اصل میں خراط ہے بمعنی چھیلنا۔ خرّ اط (فاعل) Turner کو کہتے ہیں، یہاں خراد حالت فاعلی میں نہیں ہے اور اُردو میں آتا بھی نہیں۔ مگر طا ر میں اس پر تشدید ملتی ہے۔
خزانہ	35	از روے لغت بکسر اول، روزمرّ ہ میں بالفتح
خزانے	175،89	اس میں مرتب نے استعمالِ عام کی رعایت کی ہے۔
خُلط	56،168	میل جول کے معنوں میں بفتح اول ہے۔ مرتب نے مضموم لکھا ہے۔ یہ نہ محاورات کی رعایت ہے نہ لغت کی۔ خُلط جو 168 پر آیا ہے وہ اُردو کا تصرف ہے۔
خُلع	335	بسکونِ دوم صحیح ہے مگر استعمالِ عام کی رعایت کریں تو بضم اول و فتح دوم ہونا چاہیے۔
دَوَل	159،13	دولّہ کی جمع بفتح اول و دوم نہیں، پہلا حرف مضموم ہے (دُوَل
	56،168	) اُردو میں بھی دَوَل بولتے کسی کو نہیں سنا گیا، مگر طا میں دَوَل ہی لکھا ہے مرتب کو اس پر نوٹ لکھنا چاہیے تھا۔
ذومعنی	265،86	ذومعنی تو ہر صحیح کا کلمہ ہوتا ہے، جس لفظ میں ایک سے زیادہ پہلو پوشیدہ ہوں اُسے ذومعنین یا ذومعانی کہا جاتا ہے۔
راے	284	صحیح املا رائے ہے، بدون ہمزہ غلط ہوگا۔
رعشہ	188	از روے لغت تلفظِ رعشہ بکسرِ اول ہے۔ یہاں محاورۂ اُردو کی رعایت کی ہے اور بفتح اول لکھا ہے۔
رَفاقت	197	صحیح بکسرِ اول ہے۔
زَبان	356 وغیرہ	بفتح اول لکھا ہے اور یہی درست ہے مگر اپنی مرتبہ باغ و بہار میں اکثر جگہ زُبان زے کے پیش لے ساتھ لکھا ہے۔ یہ دوسرا معیار ہوا۔
زُعم	381،8	طا اندارد مرتب نے یہاں لُغت کو چھوڑ کر محاورۂ عام کی پیروی میں بضم اول لکھا ہے۔
سِپُرد	193	اگر محاورۂ عام کی رعایت تھی تو اسے بفتح اول لکھنا چاہیے تھا۔ طا ر 191 میں حرف اول مکسور نہیں ہے۔
شمیم صفت	349	اضافت غلط ہے۔
شہاب	137	صحیح بکسر اول ہے محاورہ عام کی رعایت ہے۔
صراحتاً	371	حواشی میں کہا گیا ہے کہ قاعدے کے مطابق صراحتہً وغیرہ لکھا جائے گا (ص 475) مگر متن میں جا بجا خلاف ورزی کی گئی ہے۔ مرتب کو یہ بھی اعتراف ہے کہ فسانۂ عجائب کے قدیم نسخوں میں وہی املا پایا جاتا ہے۔
صندوق	173	صندوق بضم اول درست ہے۔ روزمرّ ہ کی رعایت کی گئی ہے۔
طبعی	260,160	طبعی ہونا چاہیے، طا میں (ص 100) طبعی ہی آیا ہے مگر مرتب کو اس کی تصحیح کرنا چاہیے تھا۔
طَرح / طرح	104،100	دونوں استعمال یکساں یکساں ہیں پھر تلفظ میں فرق کیوں؟
طرف/طرف	260،251،202	ان لفظوں کے بارے میں حواشی میں جو وضاحت ہے اس سے منشاے مصنف ظاہر نہیں ہوتا۔

طرفین/ طرفین	278	
طلاقتِ نساں	356	یہاں اعلان نون سے پرہیز کیا ہے مگر فصیح یہی ہے کہ اعلان ہو۔
عَتَبَہ	215	صحیح بفتح اول و دوم، مرتب نے بسکون دوم لکھا ہے۔ عذر استعمال عام کا ہوگا مگر منشائے مصنف کے لیے معلوم ہو۔
عزم بالجزم	51، 175	اضافت غلط۔ مرتب نے کہیں صراحت نہیں کی وہ عزم کی میم کو مکسور کیوں نہیں لکھا؟
علیہ اللعن شیطان علیہ اللعن	231	یہ شیطان کے ساتھ بطور صفت آیا ہے۔ اضافت غلط محض شیطان علیہ اللعن ہے ص 192 پر یوسف علیہ السلام آیا ہے وہاں مرتب نے یوسف علیہ السلام بالاضافت کیوں نہیں لکھا؟
عَمامہ	55	اُردو میں امامہ کی میم مشدد ہے۔ میرؔ: ایک مغبچا اُتار کے عمامہ لے گی۔
عمداً	173	از روئے قاعدہ بفتح اول درست ہے مگر اُردو میں فصیح تلفظ بسکون دوم ہے۔ میرؔ: میرؔ عمداً بھی کوئی مرتا ہے، جان ہے تو جہان ہے پیارے۔ یہاں روزمرّہ کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔
عوج بن عنق	215	مشرقی اُردن میں ایک جگہ باشان تھی۔ یہاں رفائی Rephalites آباد تھے۔ ان کا ذکر توراۃ میں بھی آیا ہے ان کا ایک بادشاہ عوج بن عوق کہا جاتا ہے جسے اسرائیلیوں نے قتل کیا کیوں کہ وہ یہودیوں کو اپنے علاقے سے گزرنے نہیں دیتا تھا، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اُسے حضرت موسیٰ نے ہلاک کیا۔ عوام اسے عوج بن عنق کہتے ہیں۔ صحیح تلفظ عوق ہے۔ (جواد علی: تاریخ العرب قبل الاسلام 6:3 اللسان 335:2)
غَضَنفَریَہ	200	قاعدے کے مطابق را مکسور اور یا مشدد ہونی چاہیے، اگر منشائے مصنف مختلف ہے تو سند دینی چاہیے۔
فتیلہ/ فلیتہ	554	مرتب نے فلیتا لکھا ہے، صحیح فلیتہ ہے، بٹی ہوئی بتی۔
فراشی سلام	189	فرشی سلام کہتے ہیں فراشی نہیں۔
فضا	175 78 86 75	ہر جگہ محاورہ عام کی رعایت کرتے ہوئے بکسر اول لکھا ہے۔ 196، 277، 325
فوارہ	87 89 107، 181، 258	مرتب نے بضم فا لکھا ہے صحیح بفتح فا ہے اور واؤ مشدد۔ ہندی لفظ پھُوٗرا سے یہ مغالطہ ہوتا ہے۔
قد و بالا	40	طا میں قد بہ تشدید جس سے منشائے مصنف ظاہر ہے مرتب نے نکال دی۔
قطع دار	149	بسکون دوم صحیح ہے مگر اُردو، روزمرہ کا تقاضا ہے کہ اسے بفتح پڑھا جائے۔
کدو کاوش	224	طا/ 224 میں کدّ و کاوش بہ تشدید دال لکھا ہے اور یہی صحیح ہے۔
کشمیر	326	منشائے مصنف نے مؤنث لکھا ہے۔
کلمہ	114، 251	اس میں روزمرہ کی رعایت کی ہے اور بسکون دوم لکھا ہے
کلمہ ہتک	14	بسکون لام اُردو ہے۔ ''سودا تھا وقت نزع کے کلمے کا منتظر'' لیکن ہتک کو بسکون دوم ہے۔ مرتب نے کلمہ میں روزمرہ کا خیال کیا ہے اور ہتک میں لغت کی پیروی کی ہے اس طرح دو معیار ہو گئے۔
کِنار/ کَنار	146	دونوں طرح موجود۔ فرق غیر واضح
کنشت	573	اسے یہود کا عبادت خانہ بتایا ہے جو غلط ہے۔
کوکلا	273	کوکلا میں دوسرا کاف ساکن نہیں مکسور ہے اور یہ کویل سے مختلف پرندہ ہے (573)

1۔ لبِ معشوق کے معنی خود مرتب نے ''مقابل، ساتھ ساتھ'' بتائے ہیں اور لبِ معشوق ہونا کے معنی لکھے ہیں: ''تیر کا نشانے کے اندر بیٹھ جانا۔'' (ص 576) معلوم نہیں یہ معنی کہاں سے اخذ کیے ہیں۔ لبِ معشوق سے مراد پیوستگی اور چپیدگی ہے تو ''یہ اَصَل (عَسل) ہے لبِ معشوق مُلوٗ تنوں سے'' اور واضح ہو جاتا ہے۔

2۔ حیرت کی بات ہے کہ فسانۂ عجائب کا اتنا گہرا اور مفصل مطالعہ کرنے کے بعد رشید حسن خاں کے سیاق اسلوبِ نگارش سے مانوس نہ ہو سکے۔ بازارِ حُسن کے سیاق میں ''ہرزن'' ہی سامنے کا لفظ تھا اور اسی کی تجنیسِ مقلوب ''رہ زن'' کی شکل میں آئی ہے۔

3۔ فسانۂ عجائب کی طباعت اولیٰ کے بارے میں رشید حسن خاں نے لکھا ہے ''اغلاط کتابت ہیں، لیکن کم'' (ص 78) حالاں کہ 1259ھ والے اڈیشن میں ایک صفحہ کا غلط نامہ شامل ہے جس میں تین کالم ہیں اور 62 غلطیوں کی نشاندہی کی گئی ہے، مگر اس سے چار گنا زیادہ وہ اغلاط ہیں جو اس فہرست سے غیر حاضر ہیں۔

(ماہ نامہ، آجکل، نئی دہلی، شمارہ 52، نمبر 4 صفحہ 3 تا 15، نومبر 1993)

نوٹ۔ یہ مضمون ڈاکٹر ٹی. آر. رینا نے بذریعہ Speed Post، 12 مئی 2016 کو احقر کے لیے روانہ کیا۔

OOO

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

(لاہور)

فسانۂ عجائب، باغ و بہار، مرتبہ رشید حسن خاں

(ایک تعارف ایک جائزہ)

تدوینِ متن ادبی تحقیق کا اہم شعبہ ہے۔ مخطوطوں یا مطبوعہ متون پر تحقیق اور ان کی تدوین، ادب میں بنیادی اہمیت کا کام ہے۔ کیوں کہ تنقیدِ ادب کا سارا دارومدار (اور کاروبار بھی) متن کی نوعیت اور صحت و عدم صحت پر ہے۔ اگر متن درست نہیں، اغلاط سے پُر ہے (اس کی وجہ کچھ بھی ہو) تو اس پر ہونے والی تنقید۔ تا ثریا می رود دیوار کج، کا نقشہ پیش کرے گی۔

کلاسیکی ادب کی تدوینِ نو تو اس لیے بھی ضروری ہے کہ بہت سی کلاسیکی کتابیں اُردو کے مختلف نصابات میں شامل ہیں اور ہمارے ہاں فارسی سے ناواقفیت روز بروز بڑھتی جارہی ہے، بہت سے لفظوں کے تلفظ، اضافت، تشدید، اعراب، اسی طرح توقیف نگاری، معروف و مجہول اور غنہ آوازوں کا صحیح تعین طلبا (بل کہ اساتذہ کی کثریت) کے لیے بہت ہی مشکل ہوتا جارہا ہے۔ بہر حال (تدوینِ متون کی ضرورت و اہمیت پر لمبے چوڑے دلائل کی ضرورت نہیں) یہ امر مسلم ہے کہ جب تک قدیم متون کو، اصولِ تدوین کی مکمل پابندی کے ساتھ، مرتب نہیں کیا جائے گا، اس وقت تک نہ تو تحقیق کی بہت سی گتھیاں سلجھیں گی اور نہ زبان و ادب کے ارتقا کا بالکل صحیح سلسلہ سامنے آسکے گا۔

اُردو کلاسیکی ادب کی بیسیوں کتابوں کی تدوینِ نو کی جاچکی ہے۔ ان میں سے بعض تو نصابی ضرورتوں کے تحت، چند ایک ڈاکٹریٹ کے تحقیقی مقالوں کی صورت اور معدودے چند آزادانہ تحقیق کے نتیجے میں مرتب ہوئی ہیں۔ بعض اوقات ایک ہی متن کو مختلف اصحاب نے تدوین کیا۔ قدرتی طور پر تدوین شدہ کتابوں میں ہر نوع ہر معیار اور ہر سطح کی کتابیں شامل ہیں۔ جناب رشید حسن خاں کی مرتبہ: ''فسانۂ عجائب'' (1990) اور ''باغ و بہار'' (1992) اسی سلسلے کی تازہ ترین کڑی ہے، مگر اُردو کے تدوین شدہ ذخیرۂ کتب میں رشید حسن خاں کا مدوّن یہ نمونہ قطعی منفرد اور بے مثال ہے اور ''چیزے دیگری'' کے ذیل میں آتا ہے۔ جو شخص متذکرہ نسخوں کا مطالعہ کرے گا وہ اس کی تصدیق پر مجبور ہوگا۔

واقعہ یہ ہے کہ تدوین و ترتیب کے یہ نمونہ (دونوں کا ماڈل ایک ہی ہے) ایک معیار بھی ہے اور مثال بھی۔ فی الحقیقت یہ خاں صاحب کا مدت العمر یاد رہ جانے والا ایک عظیم الشان کارنامہ ہے۔

رشید حسن خاں کون ہیں؟ چند سال پہلے کے برعکس، آج اُردو کی دنیائے علم و تحقیق میں خاں صاحب کا نام اجنبی نہیں رہا۔ وہ مختلف اوقات میں دو تین مرتبہ پاکستان آچکے ہیں۔ ان کی تصانیف و تالیف میں سے ''ادبی تحقیق مسائل و تجزیہ''، ''اُردو کیسے لکھیں''، اور زیرِ نظر دونوں کتابیں پاکستان میں بھی چھپ چکی ہیں۔ بنیادی طور پر وہ محقق ہیں، اور لغت، املا اور تدوین کے شعبوں میں مہارت تامّہ رکھتے ہیں۔ ابھی تین برس پہلے ان کا مجموعۂ مضامین ''تلاش و تعبیر'' تنقیدِ شعر و ادب کی ایک عمدہ اور پُر مغز کتاب کے طور پر سامنے آیا تھا۔ جناب رشید حسن خاں مزاج شناسِ تحقیق ہیں:

''عمر گزری ہے اسی دشت کی سیّاحی میں''

وہ لغت، لسانیات، املا کے رموز و غوامض اور ترتیب و تدوینِ متن کے اصول و شرائط سے نہ صرف واقف ہیں، بل کہ اس کے تقاضوں اور اس کی نزاکتوں پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ''فسانۂ عجائب'' (رجب علی بیگ سرور) اور ''باغ و بہار'' (میر امّن دہلوی) ہمارے افسانوی ادب کی دو نمایندہ کتابیں ہیں۔ ان کی متنی تحقیق اور ترتیب و تدوین کے لیے، بجا طور پر رشید حسن خاں ہی موزوں ترین شخص تھے۔ یہ دونوں کتابیں اس سے پہلے بھی بارہا مدوّن ہوئیں، مگر حسبِ وسیع کینوس پر اور جتنی گہرائی میں اور جس دقّتِ نظر، دیدہ ریزی اور باریک بینی سے انھوں نے یہ متون ایڈٹ کیے ہیں اُردو میں اس سے پہلے ایسی کوئی مثال نہیں ملتی۔ (بعد از یں بھی کوئی ان متون کو، بل کہ اُردو کے کسی اور متن کو بھی کیوں کر اس سے بہتر ایڈٹ کرے گا۔) بلاشبہ یہ ایک مثالی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔

یہ دونوں کتابیں پہلے بھارت میں چھپیں، بعد ازاں انھیں ادارہ ''نقوش'' نے شائع کیا۔ کسی ناشر کے لیے اتنی کم قیمت (''فسانۂ عجائب''۔ 150 روپے، 712 صفحات۔ ''باغ و بہار 250 روپے، 847 صفحات) پر ایسی ضخیم کتابیں چھاپنا دل گردے کا کام ہے۔ ''ادارہ نقوش'' اپنے بانی محمد طفیل کے نام کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔

''فسانۂ عجائب'' کے متن سے پہلے رشید حسن خاں نے ایک سو صفحات کا مقدمہ تحریر کیا ہے۔ شروع کے سولہ صفحوں میں کچھ باتیں ''فسانۂ عجائب'' بطور داستان، بطور کہانی، اور بطور لکھنوی ادب کی ایک نمایندہ کتاب، سے متعلق کہی ہیں۔ پھر اس کی تدوین کی نوعیت، اس کی ضرورت و اہمیت پر گفتگو کی ہے۔ لکھا ہے:

''مرتب کا اصل کام یہ کہ وہ متن کو صحیح طور پر پیش کرے اور متن سے متعلق بحثوں کو مناسب تفصیل کے ساتھ لکھے، جس میں قابلِ ذکر لسانی مباحث کا ہوگا۔ اس کے فرائض میں یہ

شامل نہیں کہ وہ تنقیدی رائے بھی دے۔ اس لیے ضروری سمجھا گیا کہ اس سلسلے کی زیر ترتیب کتابوں کے مقدمے میں تنقیدی مباحث کو شامل نہ کیا جائے۔'' (ص 23 مقدمہ)

اس کے بعد رجب علی بیگ سرور کے حالات وسوانح، فسانۂ عجائب کے مختلف نسخوں اور اس کی بعض عبارات و بیانات پر تحقیقی بحث کرتے ہوئے نتائج اخذ کیے ہیں اور بعض امور کے ضمن میں کچھ نکات متعین کیے ہیں۔ اس کا اندازہ ضمنی عنوانات سے ہوگا۔

سرور کی ولادت، وطن، وفات اور مدفن۔ تعلیم اور مختلف فنون سے واقفیت، وجہ تصنیف اور زمانۂ تصنیف، نوازش اور اصلاح، بیان لکھنؤ کے اختلافات، آسان کہنے کی فرمائش، میر امّن، باغ و بہار، ضمنی داستانیں، زبان و بیان، سرور کا خاص انداز، قافیہ مکتوبی، خطی نسخے، مطبوعہ نسخے، بنیادی متن، علامات، رموزِ اوقاف۔

اس کے بعد 346 صفحے کا متن ہے، جو ''فسانۂ عجائب'' کے آٹھ نسخوں کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا ہے۔ تصحیح متن، املا کی صحت، اعراب، علامات اور رموز اوقاف کے ضمن میں جناب مرتب نے جس قدر رد کیا اور جو کھکھیڑ اُٹھائی، اس کا اندازہ متن کو دیکھے اور پڑھے بغیر نہیں ہوسکتا۔ یہ بتانا دل چسپی سے خالی نہ ہوگا کہ متن کا پورا مسودہ، مرتب نے اپنے قلم سے لکھا (نہ صرف متن بل کہ 714 صفحات پر مشتمل کتاب کا مکمل مسودہ) پھر کتابت کو پانچ بار پڑھا اور یوں صحت کے لیے حتی المقدور کاوش سے دریغ نہیں کیا۔

متن کے بعد سات ضمیمے دیے گئے ہیں۔ پہلا ضمیمہ ان عبارتوں پر مشتمل ہے جو سرور نے مختلف اشاعتوں کے اختتام پر لکھی تھیں۔ دوسرے ضمیمے (تشریحات) میں متن کے وضاحت طلب مقامات کی تشریح کی گئی ہے۔ تیسرا ضمیمہ انتساب اشعار کا ہے۔ ''فسانۂ عجائب'' میں اچھی خاصی تعداد میں ایسے اشعار ملتے ہیں، جن کے ساتھ شاعر کا نام درج نہیں۔ ان میں سے جن جن اشعار کے انتساب کا سراغ لگ سکا، مرتب نے اس کی نشان دہی کردی ہے۔ ضمیمہ 4 میں افراد، مقامات، عمارات پر مختصر مگر جامع حواشی ہیں۔ تلفظ اور املا سے متعلق پانچویں ضمیمے میں بتایا گیا ہے کہ خاص خاص الفاظ پر جو اعراب لگائے گئے یا جو املا اختیار کیا گیا اس کی وجہ اور بنیاد کیا ہے۔ ساتواں ضمیمہ اختلافِ نسخ کا ہے۔ آٹھویں حصے میں فرہنگ دی گئی ہے۔ آخر میں متن کتاب کا اشاریہ شامل ہے۔

☆

دوسری کتاب ''باغ و بہار'' (میر امّن دہلوی) بھی اسی انداز و اسلوب پر مرتب و مدون کی گئی ہے۔ اس کا مقدمہ 123 صفحات کا ہے۔ مقدمے کے مباحث (ضمنی عنوان) حسبِ ذیل ہیں:

حدود کا تعین، میر امّن کے حالاتِ زندگی (نام، تخلص، تعلیم، جاگیر اور منصب، مذہب، اولاد اور اہلِ خانہ، دہلی سے روانگی، کلکتے میں آمد، ملازمت) گنج خوبی، باغ و بہار، آغاز و اختتام، کتاب کا نام، باغ و بہار کی تیاری میں مدد اور نثر کی درستی کا دعوا، انعام باغ و بہار، ترجمہ، تالیف یا تصنیف، امیر خسرو سے منسوب روایت، خطی نسخے، مطبوعہ نسخے، اعراب، علامات، رموز و اوقاف، قصہ چہار درویش فارسی قصے کے مآخذ اور بعض دیگر تفصیلات۔ باغ و بہار کی اہمیت، اہمیت اور اجزائے ترکیبی۔

''باغ و بہار'' کا زیر نظر متن 1804 کی اشاعتِ اول کی بنیاد پر، مزید چار نسخوں کی مدد سے مرتب کیا گیا ہے۔ اس متن کی تصحیح و تدوین میں وہی تردد، وہی اہتمام اور وہی کاوش کی گئی ہے، جس کا ذکر اوپر ''فسانۂ عجائب'' کے ضمن میں ہو چکا ہے۔ بعض از اں اختلافِ نسخ، تشریح طلب مقامات کی وضاحت اشخاص، مقامات اور عمارتوں سے متعلق ضروری تفصیلات اور انتساب، اشعار پر مبنی تین ضمیمے دیے گئے ہیں (دونوں کتابوں کے مختلف النوع ضمیمے اس قدر مختلف اور مہارت سے تیار کیے گئے ہیں کہ متعلقات متن کی حد تک، ان کی حیثیت دائرہ معارف یا انسائکلو پیڈیا کی ہے) آخر میں فرہنگ، اشاریہ اور آٹھ صفحوں کے عکس۔

''باغ و بہار'' کی ترتیب و تدوین کا پہاڑ کام، خاں صاحب نے 1964 میں شروع کیا تھا، اب آکر یہ مکمل ہوا۔ لکھتے ہیں: ''اس طویل مدّت میں اس کام کو مکمل کرنے کا جذبہ مدھم نہیں پڑا، مگر آدابِ تدوین کے احترام نے ناروا عجلت کے احساس کو کبھی کارفرما نہیں ہونے دیا۔ اصولِ تحقیق پر ایمان نے بے ایمانی کی پیدا کی ہوئی قناعت پسندی کو ذہن پر اثر ڈالنے نہیں دیا اور نشاطِ کار کا ایسا احساس کبھی ذہن پر حاوی نہیں ہوسکا۔ جس سے ہوس کے تقاضوں کو آب و رنگ ملتا ہے۔ احباب نے بے جا مشکل پسندی کے بہت طعنے دیے، لیکن ایسا کوئی جملہ بھی کارگر نہیں ہوسکا۔'' ایسا صبر وضبط اور تحمّل، ایسی اصول پرستی اور ایسی دیانت و ایمان داری فی زمانہ قریب قریب عنقا ہے اور یقیناً اسی لیے ہمیں تحقیق و تدوین کا جو معیار جناب رشید حسن خاں کے ہاں ملتا ہے وہ کہیں اور نظر نہیں آتا۔ خدا ان کی عمر دراز کرے۔ ''باغ و بہار'' کے مقدمے کے آخر میں جناب رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

> ''اس سلسلے کی پہلی کتاب ''فسانۂ عجائب'' تھی۔ جس طرح اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا، اور اہلِ نظر نے اس کی خوبیوں کا اعتراف کیا، اس سے کام کرنے کا حوصلہ بڑھا، توقع کرتا ہوں کہ یہ کتاب بھی، جو اس سلسلے کی دوسری کڑی ہے، قبولِ عام کے شرف سے محروم نہیں رہے گی اور طالب علموں، خاص کر اساتذہ کے لیے کارآمد اور مفید ثابت ہوگی۔''

اس تسلسل میں خاں صاحب مزید چار کتابوں کو ایڈٹ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ نوطرز مرصع، مثنوی سحرالبیان، مثنوی گلزارِ نسیم اور قصائد سودا کا مجموعہ''۔ اگر صحت نے ساتھ اور حالات نے موافقت کی تو یہ کتابیں بھی اسی انداز پر مرتب ہوسکیں گی اور اہم کلاسیکی متون کے پڑھنے اور پڑھانے میں وہ ضروری آسانیاں فراہم کرسکیں گی، جن کی آج بہت ضرورت ہے۔

اس پر ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ خدا انھیں اپنے ارادوں اور منصوبوں کو روبہ عمل لانے کی مہلت عطا فرمائے۔

ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

''باغ و بہار'' کے اپنے مرتبہ زیر نظر اڈیشن کو جناب رشید حسن خاں نے مولانا امتیاز علی خاں عرشی سے انتساب کرتے ہوئے انھیں ''اُردو میں تدوین کا معلمِ اوّل قرار دیا ہے۔ اگرچہ اُردو میں تدوین و تحقیق کا کام پہلے بھی بہت ہوا ہے بعد ازیں بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا، مگر ''فسانۂ عجائب'' اور 'باغ و بہار'' کے زیر نظر اڈیشنوں کے حوالے سے خاں صاحب نے ترتیب و تدوین کا وہ معیار پیش کیا ہے کہ شاید متذکرہ بالا انتساب کے حوالے سے رشید حسن خاں کو اُردو تدوین کا ''معلمِ آخر'' یا ''خاتم المدونین'' کہنے کو جی چاہتا ہے۔

(ہفت روزہ ہماری زبان، انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، 8 مارچ 1993 صفحہ 3 اور 6)

○○○

ڈاکٹر فیروز احمد

باغ و بہار کا ایک قدیم مخطوطہ

اُردو کی جن کتابوں کو غیر معمولی شہرت ملی، ان میں باغ و بہار کا نام سرفہرست ہے۔ یہ کتاب پہلی بار 1804 میں طبع ہوئی، تب سے لے کر آج تک اس کی ''سرسبزی'' قائم ہے۔ اس وجہ سے مقبولیت کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ اس کے خطی نسخے تعداد میں زیادہ نہیں اور جن دو چار نسخوں کا حوالہ ملتا بھی ہے ان تک رسائی آسان نہیں۔ اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ نامور محقق جناب رشید حسن خاں نے 1992 میں برسوں کی محنت شاقہ کے بعد جب باغ و بہار کو ازسرِ نو مرتب اور شائع کیا تو انھیں اس کے چار سے زیادہ خطی نسخوں کا علم نہیں ہو سکا۔ ان میں بھی تین نسخے ایسے ہیں جن کا ذکر صرف کتابوں تک محدود ہے۔ البتہ وہ خطی نسخہ جو لندن میں محفوظ ہے اور جس کا تفصیلی تعارف رشید حسن خاں نے اپنے مرتبہ باغ و بہار کے مقدمہ میں کرایا ہے، بعض اعتبار سے اہم ضرور ہے، مگر اس میں ان کے بقول ''ترقیمہ نہیں ہے، اور نہ ہی یہ معلوم ہے کہ یہ مخطوطہ کس نسخے کی نقل ہے۔''

رشید حسن خاں نے اپنے پیشِ نظر خطی نسخے کی قدامت ثابت کرنے کے لیے اور تو اس کا تقابل باغ و بہار کے ان 102 صفحات سے کیا جو کلکتہ سے 1802 میں طبع ہوا اور جسے عرف عام میں ''ہندی مینول'' یا باغ و بہار کی پہلی روایت سے کیا جاتا ہے، اس تقابلی مطالعے میں وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ زیرِ تعارف خطی نسخہ کا متن کسی ایسے نسخے پر مبنی ہے جو نظر ثانی (طبع اول 1804) سے پہلے کا نسخہ تھا اور یہ وہی نسخہ تھا (یا اس نسخہ کی نقل تھا) جس پر ہندی مینول کا متن مبنی تھا (1) اور چوں کہ انھیں تقابلی مطالعہ کے دوران ہندی مینول اور اس خطی نسخے کے متن میں بھی جا بہ جا اختلافات نظر آئے اس لیے ان کا خیال ہے کہ:

> ''....خطی نسخے (یعنی مخطوطۂ لندن) کے کاتب کے سامنے اس کتاب کی دو روایتیں تھیں۔ ایک تو وہ جسے پہلی روایت کہنا چاہیے اور نسخہ ''م'' (ہندی مینول) جس پر مبنی ہے اور دوسری روایت 'ج' نظر ثانی (طبع اول) کے بعد مرتب ہوئی۔ 'ن' (یعنی مخطوطۂ لندن) کے کاتب نے بنیادی طور پر تو پہلی روایت کو سامنے رکھا ہے اور بعض مقامات پر نظر ثانی روایت سے بھی کام لیا ہے اور عبارت خاتمہ کو نظر ثانی شدہ روایت سے نقل کیا ہے۔''

(باغ و بہار مرتبہ رشید حسن خاں ص 73 مطبوعہ 1992)

اس طرح ترقیمہ کی عدم موجودگی میں بھی رشید حسن خاں نے ثابت کر دیا کہ ان کے پیش نظر جو خطی نسخہ ہے وہ طبع اول کا نہیں اور یہ کہ ان کا متن پہلے درویش کی سیر کے تقریباً اختتام تک تو روایت اول سے مطابقت رکھتا ہے اور چند اختلافات کے باوجود باقی حصہ باغ و بہار کی اس روایت پر مبنی ہے جو 1804 میں فورٹ ولیم کالج سے طبع ہوا۔ یوں رشید حسن خاں کے نزدیک اس نظر ثانی شدہ طبع اول کی

نے یہ ظاہر کی ہے کہ جان گلکرسٹ کی زیرنگرانی مرتب اور شائع ہوا اور اس میں فہرست مضامین کے علاوہ ایک غلط نامہ بھی شامل تھا، یہی نہیں اس نسخۂ 'ک' میں اس 'نظام املا' کی پوری پابندی نظر آتی ہے جسے گل کرسٹ نے رائج کرنے کی سعی کی مگر چوں کہ غلط نامے کے باوجود بھی اغلاط کتابت در آئی تھیں، اس لیے ان کی تصحیح کے لیے انھوں نے ذیل کے چار نسخوں کو بھی پیش نظر رکھا ہے:

1۔ نسخۂ 'ن' (خطی نسخۂ لندن)

2۔ نسخۂ 'م' (ہندی مینول مطبوعہ 1802)

3۔ نسخۂ 'ف' (باغ و بہار مرتبہ ڈنکن فاربس 1846)

4۔ نسخۂ 'ع' (باغ و بہار مرتبہ عبدالحق 1944)

مذکورہ بالا چار مطبوعہ وغیر مطبوعہ نسخوں کی مدد سے جناب رشید حسن خاں نے تدوین متن کا جو مثالی کارنامہ انجام دیا ہے اس کا اندازہ اس طویل اور بے وقیع مقدمے کے علاوہ ان ضمیمہ جات سے بہ آسانی کیا جا سکتا ہے جو اس کتاب میں شامل ہیں۔ انھوں نے یہ دعوا تو نہیں کیا ہے کہ ان کا مرتب کردہ باغ و بہار کا متن منشائے مصنف کے عین مطابق ہے، مگر ان کی تمام تر کوشش یہی رہی ہے کہ اُردو کے اس کلاسیکی متن کو اس طور مرتب کر دیا جائے کہ اس میں کوئی نقص باقی نہ رہے، آیندہ رشید حسن خاں کے مرتبہ باغ و بہار کو نسخۂ جدید یا صرف 'ذ' سے تعبیر کیا جائے گا۔

فسانۂ عجائب کے بعد باغ و بہار کی تدوین نو کا کام رشید حسن خاں نے جس دقت نظر اور تحقیقی انداز میں انجام دیا ہے، اس کی جتنی ستایش کی جائے کم ہے مگر حواشی اور مختلف ضمیموں سے قطع نظر باغ و بہار کا موجودہ متن اب بھی بعض مقامات پر تصحیح طلب معلوم ہوتا ہے، یہی نہیں اس نسخۂ جدید کا متن اس خطی نسخے سے نہایت مطابقت رکھتا ہے جس کی تقریب کے سلسلے میں یہ سطور لکھی جا رہی ہیں اور جسے آیندہ نسخہ جے پور کہا جائے گا۔ یہ نسخۂ جے پور بنیادی طور پر تو طبع اول سے مطابقت رکھتا ہے، مگر طبع اول کی وہ اغلاط کتابت جس کی نشان دہی رشید حسن خاں نے کی ہے، ان سے یہ نسخہ مبرا ہے۔ یہی نہیں ان دونوں کے تقابل سے اندازہ ہوتا ہے کہ 'ک' کے برخلاف نسخۂ جے پور کا متن نہ صرف حسن بیان بل کہ بعض لفظوں کے استعمال کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہے اور اس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح نسخۂ جدید (جو چار مطبوعہ وغیرہ مطبوعہ نسخوں کی مدد سے ترتیب دیا گیا ہے) کے متن سے تقابل کے بعد جس نتیجہ پر بہ آسانی پہنچا جا سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ ''ذ'' کا متن اپنی تمام تر خوبیوں کے باوصف نسخۂ جے پور کے متن سے چند مستثنیات سے قطع نظر جن کی نشان دہی (ذرا آگے چل کر کی جائے گی) لفظ بہ لفظ مطابقت رکھتا ہے اور جن مقامات پر اختلافات نظر آتے ہیں ان کا سبب ''ذ'' کے مرتب کا نسخۂ ک یا پھر ف اور ع جیسے نسخوں پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کر لیتا ہے۔ ان سب کی تفصیلات بعد میں پیش کی جائیں گی۔ یہاں نسخۂ جے پور سے متعلق چند بنیادی باتیں۔

باغ و بہار کا نسخۂ جے پور 1247ھ کا مکتوبہ ہے، اس کا متن ہر اعتبار سے مکمل اور خط نستعلیق ہے۔ کاغذ نسبتاً باریک ہے مگر اس میں اب خستگی کے آثار نمایاں ہو چکے ہیں۔ پورا متن 130 اوراق (یعنی دو سو ساٹھ صفحے) پر مشتمل ہے۔ ابتدا میں ''فہرست باغ و بہار کی'' درج ہے اور آخر میں ذیل کا ترقیمہ۔

''تحت الکتاب بعون الملک الوہاب بتاریخ دہم (10) شہر شوال 1247 ہجری نبوی صلی اللہ علیہ وسلم در چھاونی ہانسی وقت ملازمی کمپنی بہادر وقت شب بپاس خاطر قرۃ العین احسان علی طال عمرہ وزاد علمہ سمت اتمام وصورت اختتام یافت۔ کاتب عاصی پر معاصی خاکسار امام علی اسدی غفر اللہ لہ والدیہ واحسن الیہما والیہ۔

ایں	نو	شتم	بر	کتاب	دلفروز
مالکش		اللہ	تحویلم	دو	روز

مخطوطے کا ہر ورق ترک سے شروع ہوتا ہے۔ کاتب کا خط اتنا صاف اور واضح ہے کہ پورے متن میں کسی لفظ کے پڑھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی، مزید برآں غلط نویسی سے احتراز کی حتی الامکان سعی کاتب کی احتیاط پسندی کا مزید ثبوت فراہم کرتی ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ لکھنے میں ذ اور ذ کے فرق کو ملحوظ خاطر رکھنے کے علاوہ کوئی لفظ یا فقرے کا کوئی ٹکڑا سہواً درج ہونے سے رہ گیا تو کاتب نے ''2'' یا 'ف' کا نشان بنا کر ازسرِ نو اسی سطر میں یا پھر حاشیے میں انھیں لکھا ہے۔ یہی صورت بعض ان الفاظ کی ہے جن کی کتابت میں کوئی نقص واقع ہو گیا۔ مخطوطے میں ایسے تمام الفاظ کو حاشیے میں پہلے سے زیادہ واضح طور پر لکھا گیا ہے۔ ذیل کی مثالوں سے اس کی مزید وضاحت ہو جائے گی۔ یہ واضح رہے کہ ایسی تمام مثالوں میں نسخۂ جے پور کے اصل املا کو پیش نظر رکھا گیا ہے:

(الف) 1۔ ''پادشاہ ظل اللہ کی بھی ملازمت حاصل ہوئی۔''

2۔ ''اور بولی پہلی ہمکو شہزادی غایب''

3۔ ''دل کو بہلانی کی لئی خاطر''

4۔ ''جو عرض کیا''

5۔ ''اپنی ساری پادشاہت مجھی دی تو اس پر بھی نہ تھوکوں اور نہ دہارن ماروں'' (حاشیے میں 'دہاڑ' پر ن کا نشان بنا کر د ہر لکھا گیا ہے) اسی طرح ایک جگہ ''از دہام'' کو ذ سے لکھنے پر غلطی کا احساس ہوا تو اسے کاٹ کر اس کے اوپر ز لکھ دیا ہے۔ غلط نویسی سے بچنے کا غالباً یہی میلان تھا جس کے سبب مخطوطے میں اعراب بھی لگائے گئے ہیں اور اس کی صورت یہ ہے کہ کہیں لفظ کے تمام حرفوں پر حرکات ملتی ہیں تو کہیں صرف ایک یا دو حرفوں پر مثلاً:

(ب) چوچگی۔ مہر۔ بہرور۔ اکابر۔ پہر۔ فرسخ۔ مصمم مودب۔ جو کچھ ہوا سو ہوا۔ نول۔ دہری۔ حد نہایت۔ ہکا بکا۔ تتر بتر۔ الماس۔ مبارک کو مناونا کر۔ جز بز۔ آپ ہوا۔ ترک۔ قوال۔ مسلط۔ امنا۔ تصدق۔ بت کہاوء۔ اصفہان۔ منت۔ تنفس۔ معین۔ گن گنا کر۔ انعام واکرام۔ خوشگوئی۔ متکلم۔ وغیرہ

(س) مخطوطے میں یائے معروف و مجہول کے امتیاز کو عام طور برقرار نہیں رکھا گیا ہے اور نہ ہی ایسی کوئی علامت پائی جاتی ہے جس سے پڑھنے والے کو صورت حال کا اندازہ ہو سکے:

''خدائی تمہیں یہ کمال دیا ہی کہ اِس مسافر پر مہربانی کرو غریب خانی تشریف لیجیو اُس کو دیکھو اگر زندگی ہوئی تو تمہیں بڑا جس ہوگا اور میں ساری عمر غلامی کرونگا''

(ج) اِس، اُس یا اِس کے الف پر عموماً زیر یا پیش موجود ہے، البتہ وہ جملۂ معترضہ جنھیں 'ک' کی مطابقت میں رشید حسن خاں نے بھی قوسین میں لکھا ہے، اس خطی نسخے میں موجود ہیں جس پر سرخ روشنائی سے ڈوئی

کا نشان بنایا گیا ہے، اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ کاتب یہاں سے نیا پیراگراف شروع کرتا ہے۔ یہ پیراگرافنگ ک سے بالکل مختلف معلوم ہوتی ہے۔

(د) ک کی طرح زیرِ نظر خطی نسخہ میں ایک ''فہرست عنوانات'' بھی ہے، مگر غلط نامہ نہیں۔ یہ غلط نامہ فاربس کے مرتبہ باغ و بہار میں بھی نہیں ہے، یہاں اس کے برعکس ایک مبسوط فرہنگ ہے۔ نسخۂ جے پور میں ایسی کوئی فرہنگ تو نہیں البتہ بعض الفاظ کے معنی حاشیے میں درج ہیں۔ مثلاً بچھری (د میں بکھرے) بمعنی ظرف آب گرم اور پیہکنا (د میں پیکھنا) بہ معنی تماشا و تقلید و نقالہائے بازیگراں وغیرہ۔

اس کے علاوہ جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے، ک کی طرح نسخۂ جے پور میں بھی مضامین کی فہرست ہے مگر ک کے برخلاف یہ آغازِ متن میں ہے۔ یہی نہیں ان دونوں کے تقابل سے پتا چلتا ہے کہ نسخۂ جے پور کے عنوانات نہ صرف تعداد بلکہ کیفیت کے اعتبار سے بھی مختلف ہیں۔ ذیل میں یہ عنوانات درج کیے جاتے ہیں۔

''**فہرست کتاب باغ و بہار**

حمد مین 1

نعت مین 2

سبب ترجمہ میں 3

احوال مترجم مین 3

اُردو کی حقیقت مین 3

شروع قصہ مین 4

پہلی درویش کی سیر مین 10

دوسری درویش کی سیر مین 36

بادشاہزادی بصرہ کے حال دولت مین 47

شہزادہ نیمروز کا دسوار کے احوال مین 53

آزاد بخت کے احوال مین 61

خواجہ سگ پرست کی حال مین 71

بارہوں لعل کی حقیقت مین 63

تیسری درویش کی سیر مین 101

نعمان سیاح کی حقیقت مین 103

بہزاد خان کی جوانمردی مین 111

چوتھے درویش کی سیر مین 113

آزاد بخت کی لڑکی کی حال مین 124

ہر ایک عاشق معشوق کی نکاح اور ختم کتابت مین 129 — کبت پہلا 42

کبت دوسرا 48

کبت تیسرا 72''

مندرجہ بالا فہرست کے مطابق عنوانات یا مضامین کی مجموعی تعداد 22 ہے، جب کہ ک میں یہ صرف آٹھ ہے۔ ان میں سبب تین عناوین یعنی سبب ترجمہ میں احوال مترجم میں اور اُردو کی حقیقت میں اصلاً متن میں شامل ہیں، جب کہ حمد اور نعت کے عنوانات جو فہرست میں ہیں مگر متن میں انھیں الگ سے درج نہیں کیا گیا ہے۔ اسی طرح آغاز قصہ کا جو عنوان نسخۂ جے پور میں ہے، اصل متن میں اس کا عنوان یہ ہے: ''شروع قصی کی، ک میں یہ عنوان اس طرح ہے: شروع قصے میں، یہی فاربس کے نسخے میں بھی ہے۔ اس سلسلے میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ پہلے درویش کی سیر کا جو عنوان نسخۂ جے پور میں ہے (یعنی'' پہلے درویش کی سیر میں'') وہ ن، ک، ف، اور ع جیسے نسخوں سے مختلف ہے، ان چاروں میں یہ عنوان اس طرح ہے: سیر پہلے درویش کی۔ ک میں دوسرے درویش کا عنوان یہ ہے: سیر دوسرے درویش کی۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی نسخۂ جے پور سے مختلف ہے۔ دوسرے اور تیسرے درویش کی داستان کے درمیان بصرہ کی شہزادی، شاہ نیمروز، آزاد بخت اور خواجہ سگ پرست کے علاوہ بارہ لعلوں کی حقیقت کا جو قصہ ہے اسے نسخۂ جے پور کی فہرست میں باقاعدہ عنوانات سے ظاہر کیا گیا ہے لیکن اصل متن میں بہ تعبیر الفاظ صرف ایک عنوان کو جگہ دی گئی ہے اور وہ عنوان یہ ہے:

حقیقت بارہ لعل کی، ظاہر ہے یہ اصل عنوانِ فہرست سے مختلف ہے۔ سب سے زیادہ دل چسپ بات یہ ہے کہ مذکورہ چاروں عناوین میں سے ایک عنوان یعنی' آزاد بخت کے احوال میں' ایسا ہے جو اختلافِ نسخ کے ساتھ ف اور ع کے متن میں تو نظر آتا ہے، مگر ک میں نہیں۔ رشید حسن خاں کی صراحت کے مطابق ک کی فہرست مضامین میں اسے یوں درج کیا گیا ہے: بادشاہ آزاد بخت کی حکایت میں، ن میں یہ عنوان اس طرح ہے: قصہ آزاد بخت بادشاہ کا، اس مقام پر رشید حسن خاں نے ف کی مطابقت اختیار کی ہے کہ وہاں یہی عنوان موجود ہے۔ نسخۂ جے پور کی فہرست میں تیسرے درویش کی سیر کے تحت نعمان سیاح اور بہزاد خاں کے قصہ کو علاحدہ عنوان دیا گیا ہے، مگر متن میں یہ عنوانات موجود نہیں۔ ک کی فہرست میں بھی یہ عنوانات نہیں اور نہ ہی کسی دوسرے نسخے کے متن میں یہ عنوانات پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ جے پور کے نسخے میں جہاں جہاں کبت آئے ہیں، وہ مذکورہ بالا عنوانات کی طرح سرخ روشنائی سے درج کیے گئے ہیں۔ مزید برآں متن میں فارسی اور اُردو کی تمام کہاوتوں اور محاوروں پر سرخ روشنائی سے ہی واضح

کشد کیا گیا ہے تاکہ پڑھنے والے کو معلوم ہو سکے کہ کوئی کہاوت (یا محاورہ) ہے،

ابتدا میں ذکر کیا گیا ہے کہ نسخۂ جدید (باغ و بہار مرتبہ رشید حسن خاں) اور جے پور کے مخطوطے میں اختلاف نسخ بھی پائے جاتے ہیں، اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ ک (جس کے متن پر نسخۂ جدید بنی ہے) اور نسخۂ جے پور کے درمیان بھی یہ اختلاف موجود ہونا چاہیے۔ دونوں کے تقابل سے اس کا جواب اثبات میں ملتا ہے۔ یہاں اس کی بعض نمایاں مثالیں ملاحظہ ہوں 'ذ' (یعنی نسخۂ جدید) کے ص 234 پر ایک جملہ اس طرح درج ہے:

''اور شولا اور غذا اپنے ہاتھ سے پکار کر کوئی نوالہ کھلاتا......''

یہاں شولا (بہ معنی کھچڑی جو اس قدر پکائی جائے کہ حریرہ کے مانند ہو جائے) کے ساتھ غذا محل نظر بل کہ یکسر غلط ہے۔

رشید حسن خاں نے ضمیمے میں صراحت کی ہے کہ ک میں ''غذا' کی جگہ پر ''اوغزا'' ہے جو طباعت کی غلطی ہے۔ ''اوغزا'' کو غلطی طباعت مان کر تھوڑی دیر کے لیے شولا کو نظر انداز کر دیجیے اور محوالہ بالا فقرہ پھر پڑھیے یعنی: غذا اپنے ہاتھ سے پکا کر کوئی نوالا کھلاتا۔ کیا غذا پکانا خلاف محاورہ اور یکسر غلط انداز بیان نہیں ہے؟ آصفیہ میں لفظ ''اوگرا'' موجود ہے اور لغات کبیرہ (حصۂ دویم) معروف بہ لغات الادویہ میں اسے 'اُگرا' اور 'اوگرہ' دونوں صورتوں میں درج کرتے ہوئے اسے ہندی الاصل قرار دیا گیا ہے، اور جو معنی لکھے گئے ہیں اُن سے پتا چلتا ہے کہ 'اُگرا' یا 'اوگرہ' مریضوں کے لیے غذائے رقیق کا نام ہے جو چاول، مونگ اور گرم مسالوں سے تیار کیجاتی ہے۔ اس معنی میں شولا اور اوگرا کا تعلق ظاہر ہے۔ باغ و بہار میں جہاں یہ دونوں الفاظ آئے ہیں، وہاں حکیم اور اُس کے نسخے کا بھی ذکر ہے۔ ک کے برخلاف نسخۂ جے پور میں اس مقام پر 'اوغرا' ہے اور یہ اصل سے قریب تر ہے، ممکن ہے کہ بول چال کی سطح پر اوغرا بھی مستعمل ہو، یوں بھی گ کا غ میں بدل جانا (بول چال میں) قرین قیاس ہے۔

لفظ نیک 'ذ' میں دو جگہوں پر اس طرح آیا ہے:

''اتنی محنت کچھ نیک نہ لگی' (ص 222)۔ 'ہماری محنت نیک لگی' (ص 236) آصفیہ اور نور دونوں میں نیک لگنا کی موجودگی کے باوجود ایسا محسوس ہوتا ہے کہ رشید حسن خاں نے اسے میر امن کے مختارات میں شمار کیا ہے۔ نسخۂ جے پور میں بھی مذکورہ دونوں فقروں میں 'نیگ' واضح تر انداز میں لکھا ہے۔ 'ذ' میں ہی ص 246 پر ایک فقرہ ہے:

''.....ایک کاغذ دستگی سے نکال کر'

رشید حسن خاں کی صراحت کے مطابق ن میں دستکی کی جگہ پر ''دستگی'' ہے یعنی ک، ف اور ع جیسے نسخوں میں اس مقام پر 'دستگی' ہی ہے۔ نسخۂ جے پور میں یہ لفظ ن سے مطابقت رکھتا ہے یعنی ''ایک کاغذ دستگی سی نکال کر''۔ ''ذ'' میں ہی ایک جملہ اس طرح لکھا ہے:

''....وہی بادل پھر آیا اور ایک پنگھولا جڑاؤ، موتیوں کی تو پڑی ہوئی لایا....'' (ص 241) نسخۂ جے پور میں پنگھولا کی جگہ پنگھوڑا ہے۔ پنگھوڑا ن، ف، م اور ع میں موجود نہیں۔ آصفیہ کے مطابق یہ لفظ پنگوڑا (ہائے ہوز کے بغیر) ہے۔ ممکن ہے کہ بول چال میں اسی کی ایک صورت پنگھوڑا بھی ہو۔ یوں بھی صوتی اعتبار سے پنگوڑا اور پنگھوڑا میں زیادہ فرق نہیں۔

تقریباً یہی صورت لفظ ''ڈھارس'' کی ہے۔ ''ذ'' میں اسے ڈھارس لکھا گیا ہے۔ رشید حسن خاں کی صراحت کے مطابق ف کے متن میں اسے ڈھاڑس (مع رائے ثقیلہ) لکھا گیا ہے، نسخۂ جے پور میں ان سب نسخوں سے مختلف اس لفظ کی صورت یہ ہے:

''باری خرد مند وزیر کی ایسی ایسی عرض معروض کرنی سی آزاد بخت کی دلکو ڈہاڑہس بندہی....''

مزید مثالوں سے قطع نظر کی جاتی ہے، لیکن یہ لکھ دینا ضروری ہے کہ ایسی مثالیں بڑی تعداد میں موجود ہیں، یہاں باغ و بہار مرتبہ رشید حسن خاں اور نسخۂ جے پور کے چند مزید اختلافات نسخ کی نشان دہی کی جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہو سکے گا کہ نسخۂ جے پور متنی اعتبار سے ک اور ف سے کتنا مختلف ہے۔

<u>باغ و بہار مرتبہ رشید حسن خاں</u>	<u>نسخۂ جے پور مکتوبہ 1247ھ</u>
1...موت تلک کی ہوگی ص 9	''...ہوگی ندارد
2...زار بہ زار رونے اور دبلا پے سے ص 13	''...دبلائی (دبلانے)
3...شاید ان مردوں کے وسیلے سے ص 18	''...مرّ وں...
4...گماشتے خرید و فروخت کے واسطے ص 20	''...'فروخت' ندارد
5...ضیافت قبول کرنی سنت رسول کی ہے ص 32	''...سنت رسول اللہ
6...سوائے خدا کے شکر کے کچھ منہ سے ص 48	''...خدا کے ندارد
7...صراحی شربت کی تکلف سے بنا کر،	''...تکلف سے بنا برف میں لگا
برف میں لگا کر لڑکے ہاتھ لوا کر آیا ص 49	لڑکے....
8...تب اچھی اچھی میٹھی باتیں کرنے لگا	''تب'' ندارد
بل کہ آہ او ہی بھی کرنے لگا ص 49	بل کہ آہ اوہی کرنی لگا
9...جیسے شام کو شفق پھولے ہے ص 55	''...شام کو'' ندارد
10...سر سے پانو تک جو گذرا تھا راست کہہ سنایا ص 72	''...راست' ندارد
11... پان سو اشرفی کے بدلے پان پان سے ص 72	''...کی بدلی پان سی

12...آدمی ہزاری اور بزاری نظر پڑے ص97 ''...'اور' ندارد

13...کیا جانے پیر پرائی ص101 ''پیڑ پرائی

14...وہاں نچا ہوتا جاتا تھا ص103 ''...ہو جاتا تھا

15...چڑھواں جوتا اڑلیا ص107 '...جوتا اڑ پایا

16...پری کو جان کی طرح بغل میں لے آیا ص111 ''...بغل میں لیا

17...جو کچھ کہ میں نے دیکھا ہے اور ہے سنا، سنو ص116 ''...میں سنا، سنو

18...آزاد بخت نے اپنا احوال شروع کیا ص112 ''...احوال کہنا شروع کیا

19...ہاتھ ٹیکے نہڑا ہوا ص141 ''...نہوڑا...

20...اوپر سے کتے نے ہمیشہ یہ احوال ص146 ''...'ہمیشہ' ندارد

21...آخر اُس کو پہاڑ ہی پر لے آیا ص147 ''... پہاڑی...

22...میں نے کہا تم جو کھاتے ہو جو مجھے بھی ٹھوڑا اسا دو ص146 ''میں نی کہا تم جو کہاتی ہو کیا ہی جو ہو سو مجھی بہی

23...سونے کے وقت گھر میں جا ص153 ''سونی کے وقت گہر مین رہتی اتفاقاً تین برس تک اُن کی خاطر داری میں گذری اور اُن سے اتفاقاً وہ بی بی بھی کوئی حرکتِ بد واقع نہ ہوئی کہ باعث رنجیدگی کا ہووے جو میں سوار ہو کر کہیں جاتا تو یہ گھر میں رہتے۔ اتفاقاً وہ بی بی...

24...کونا کھترا دیکھنے لگی ص159 ''...کونا کٹہرا...

25...جو جہاز عجم کی طرف چلے، مجھے خبر کیجو ص163 ''...مجھی'' ندارد...

26...اور سب پنڈوں کے تقسیم کرنے کی خاطر ص175 ''...'پنڈوں' ندارد

27...خلقت مبارکباد کہتی ہوئی ص187 ''...مبارکبادی...

28...عطر پان دے کر خواجہ کو رخصت کیا ص200 ''...خواجہ سرا...

29...چھاتی پر سانپ پھر گیا ص220 ''...پہرنی (پھرنے) لگا

30...میرے ذبح کرنے اور گاڑ دینے کو ص221 ''...گاڑنی کو

31...نزدیک جا کر سلام کیا۔ مہربانگی سے ص224 ''...مہربانی...

32...وہ اندر بیٹھا، میں باہر کا باہر کھڑا ص97 ''...میں باہر کہڑا رہ گیا

33...وہ نازنین، سفید رومالی اوڑھے ص36 ''.وہ نازنین..سادی خوزادیہوئے سادی خوازدی بن گہنے پاتے بنی ہوئی ص6 زیور شل سادی...

34...یہ سلطنت، اور تم نے پیدا کی،

ایک ذرا میں ہاتھ سے نکل جائے گی ص14 ''.یہ سلطنت..ایک ذری میں

35...چھلنی اور توبڑہ ہے ص181 ''...توبرہ...

36...اسے توبڑے میں بھر کر ص181 ''...توبری...

37...اُس نازنین کا حسن و جمال دیکھ کر مرجھا گیا ص197 ''...مرچھا...

38...اُس کی جانگ سے یہ تیر ص192 ''...جانگہہ...

39...مند جائے چشم عاشق تو بھی وہ منہ نہ کھولے ص197 ''...تو بہی تو منہ...

40...ایکبارگی کھڑکی نمود ہوئی ص221 ''...گہرکی.(گھر کی نمود ہوئی)

41...اُس نے ڈھیر سی تسلی دی ص237 ''...'بہت'...

42...جو میرے حق میں بھلا ہو سو کر، میری تسلی کر کے ''...میری تسلی کر کہا

43...ہنجیاں روپے سونے کی کمر میں لٹکتیں ہوئیں ص83 ''...لٹکتی ہوئیں

44...روزہ کھولنے کے وقت ایک چھہارا کھاتے

اور تین گھونٹ پانی پیتے ص11 ''...'کھاتے' ندارد

45...اسی طرح سے یے چاروں نقش دیوار ہو رہے ص18 ''...'سے' ندارد

46...شہر کے آیا، تھوڑی سی دور رہا تھا۔ ص27 ''...'سی' ندارد

49...سارا احوال مول تول کا اور مہمان کے بجد ہونے

کا کہہ سنایا ص32 ''...'تول' ندارد

50...مسندیں لگیں ہیں ص36 ''...لگی نہیں

51...یہ کیا تھا اور کیا ہوا ص39 ''...کیا ہو گیا

میرا خیال کہ اثبات مدعا کے لیے یہ مثالیں کافی ہیں، ان کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ نسخۂ جے پور کا متن پوری طبع اول سے مطابقت نہیں رکھتا، یہی بات ہندی مینول اور نسخۂ جے پور یا ان اور نسخۂ جے پور کے تقابل کے بعد کہی جا سکتی ہے۔ اوپر جو مثالیں درج ہیں ان سے بعض م اور ن کے اختلافات کو بھی ظاہر کرتی ہیں لیکن اس کی مزید تفہیم کے لیے صرف ہندی مینول اور نسخۂ لندن سے چند نمایاں فرق پر غور کرنا مناسب ہوگا۔ یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ نسخۂ جے پور میں ''میرامن کی عرضی'' نہیں ہے:

نسخۂ جے پور

1...کہ جس بات میں نہ دم مار سکی چپکا ہو رہی۔

2...جس کا ثانی اور مقابل ہی نہ ہو وےگا کبھو

3...ایسی یکتا کو

4...لیکن اتنا جانتا ہوں خالق و رزاق ہی وہ

5...درجہ رسالت کا دیا ۔

6...ہندوستانیوں سی گفت و شنود کریں اور ملکی کام کو بہ آگاہی تمام انجام دیں اس واسطے کتنی کتابیں اسی سال بموجب فرمایش کی تالیف ہوئیں جو صاحب دانا

7...یہ قصہ ہمیشہ کہتی اور بیماریوں میں حاضر رہتی

8...یہ قصہ فارسی میں مروج ہوا

9...نجیبوں کی قدردان جان گلکرسٹ صاحب نے کہ ہمیشہ اقبال کا زیادہ رہی

نسخۂ م اور ن

''...کہ جو بات عقل میں نہ آوے...GHUZUL(م)

''...جس کا ثانی اور مقابل آج تک پیدا نہیں (م) اور یہی نون میں بھی ہے

''...ایسے واحد کو (م اور ن)

''...اس زمانے میں بھی بعضے مرد ہیں جو ہر شناس (م۔ن)

''...م میں اس کے فوراً بعد UBYAT ہے اور ن میں بیت، نسخۂ جے پور میں صرف ۔ کا نشان ہے

''... باہم گفت و شنود کریں اور ملکی کام کو انجام دیں، چناں چہ یہ کتاب اسی سال بموجب فرمایش کے تالیف ہوئی جو صاحب دانا (م۔ن)

''... بیماریوں کی خدمت۔(م۔ن)

''...مروج تھا

''...نجیبوں کے قدردان غریبوں کے فیض رساں عاجزوں کے ہاتھ پکڑنے والے بیچاروں کی پرورش کرنے والے زمانے کے۔ BYT سرکار سے دے کے آب و دانا داں کو بنایا جس نے دانا یعنی جان گلکرسٹ صاحب۔''

مذکورہ بالا مثالوں سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غایبانہ ہوگا کہ (1) نسخۂ جے پور اور ہندی مینول (یعنی نسخۂ م) کے متن میں یکسانیت نہیں ہے اور ایسے تمام مقامات پر نسخۂ جے پور طبع اول سے مطابقت رکھتا ہے۔(2) رشید حسن خاں کے متعارفہ خطی نسخے (یعنی ن) سے بھی نسخۂ جے پور کا متن مختلف صورت حال کی نشان دہی کرتا ہے اور یہاں بھی طبع اول (ک) سے گہری مماثلت نظر آتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا طبعِ اول اور نسخۂ جے پور کا متن یکساں ہے؟ اس کا جواب اُن بہت سی مثالوں کے تناظر میں (جو اس سے پہلے درج کی گئیں) یقیناً نفی میں ہوگا اور باوجود اس کے کہ دونوں میں مطابقت بھی بہت ہے، لیکن اختلافاتِ نسخ کی جو مثالیں پیش کی گئی ہیں ان سے صاف پتا چلتا ہے کہ ان میں قابل لحاظ حد تک فرق بھی ہے۔ یہ مان لیا جائے کہ جے پوری نسخے کے کاتب نے ک کے غلط نامے کو بھی سامنے رکھ کر صحیح تر متن پیش کیا ہے مثلاً ''نسخۂ جدید'' کے ص52 پر ایک جملہ ہے:

''جب سہی سانجھ ہوتی، چپکے ہی وہ خواجہ سرا اس جوان کو......'' ک کے متن میں ''سہی سانجھ'' کی جگہ ''سی سانجھ'' ہے۔ ن اور م دونوں میں سہی سانجھ ہے۔ یہی نسخۂ جے پور میں بھی ہے۔ اب اگر نسخۂ جے پور کے کاتب نے ک کے غلط نامے کو بھی پیش نظر رکھا ہوتا تو اول تو رشید حسن خاں کی صراحت کے مطابق وہاں یہ موجود ہی نہیں، دوئم یہ کہ نسخۂ جے پور میں اسے لازماً ''سی سانجھ'' ہونا چاہیے۔ مگر چوں کہ صورت حال مختلف ہے اس لیے ایک بات تو واضح ہے کہ جے پوری نسخے کے کاتب نے ک کے علاوہ بعض مقامات پر م اور ن جیسے نسخوں سے بھی مدد لی ہے یا پھر اس امکان کو بھی رد نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے پیش نظر جو خطی نسخہ رہا ہوگا اس میں اس قبیل کی اغلاط نہ ہوں۔ اس صورت میں یہ بھی قرین قیاس ہوگا کہ اس خطی نسخہ کا متن م اور ن کے برخلاف ک پر مبنی ہوگا اور چوں کہ ک کے متن میں بھی اغلاط کتابت یا حسنِ بیان کے اعتبار سے بعض نقائص موجود ہیں اس لیے ان کی تصحیح کے بعد جو متن ترتیب دیا ہوگا، نسخۂ جے پور اُسی متن پر مبنی ہے۔ اس کی نسخۂ جدید کے ص206 پر ایک جملہ اس طرح ہے:

''اشتیاق میں فرنگ کے ملک کے دیکھنے کو روانہ ہوا''

یہی جملہ نسخۂ جے پور میں اس طرح ہے: ''اشتیاق میں ملک فرنگ کی دیکھنی کو روانہ ہوا'' اسی نسخہ کے ص 220 پر ایک جملہ ہے:

''مبارک نے سلام کیا اور مجھے ساتھ لیا، محل میں پہنچا دیا''

جے پور کے نسخے میں اس کی کیفیت یہ ہے: ''مبارک فی سلام کیا اور مجھی ساتہہ لے محل مین پہنچا دیا'' ۔نسخۂ جدید (ص 49) پر ایک جملہ یوں درج ہے:

''ایک صراحی اُسی شربت کی تکلف سے بنا کر، برف میں لگا کر، لڑکے کے ہاتھ لوا کر آیا'' ۔نسخۂ جے پور میں اسے یوں لکھا گیا ہے: ''ایک صراحی اُسی شربت کی تکلف میں لگا لڑکے کے ہاتہہ لوا کر آیا''

اسی سلسلے میں یہ آخری مثال بھی غور طلب ہے:

''بولا کہ میں اُس روز تمھیں اُس ظالم کے پاس لے گیا، کاش کے اگر یہ جانتا تو نہ لے جاتا۔ میں نے گھبرا کر کہا: میرے جانے میں کیا ایسی قباحت ہوئی کہو تو سہی۔''

یہ اور اس طرح کے متعدد جملے ساخت اور حسن بیان کے اعتبار سے نسخۂ جدید سے بہتر ہیں۔ یہاں اس طرف یہ اشارہ بے محل نہ ہوگا کہ آخری جملے میں جو لفظ ''صحیح آیا ہے'' وہی دیگر تمام نسخوں کے برخلاف ''سہی'' کی صورت میں صرف ''نسخۂ جے پور'' میں پایا جاتا ہے۔

اب ایک دوسرا پہلو نسخۂ جے پور 1247ھ کا مکتوبہ ہے۔ فاربس کا مرتبہ متن اس کے سولہ برس بعد وجود میں آیا۔ اس سے قبل معلومات کی حد تک، باغ و بہار کی تین روایتیں ملتی ہیں۔ یعنی ہندی مینول (نامکمل ہی سہی) طبع اول 1804 اور وہ خطی نسخہ جسے رشید حسن خاں نے متعارف کرایا ہے۔ اگر چہ آخری الذکر میں ترقیمہ نہیں ہے مگر رشید حسن خاں کے دلائل پر اعتماد کر کے اسے طبع اول اور مخطوطۂ جے پور کے درمیانی زمانے کا نسخہ تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ جے پور کا نسخہ اس سلسلے کی چوتھی روایت کے طور پر سامنے آتا ہے اور چوں کہ یہ روایت ''باغ و بہار'' (1217ھ) کے تقریباً 30 سال بعد میں مکمل ہوئی اور یہ اور ان جیسے نسخوں سے مختلف ہے اور اختلاف کی یہ صورت ک سے تقابل کے بعد بھی واضح معلوم ہوتی ہے۔ یہی نہیں باغ و بہار مرتبہ رشید حسن خاں (یعنی نسخۂ جدید یا ''د'') اور نسخۂ جے پور کا احوال بھی بعض مقامات پر یکساں نہیں ہے، اس لیے چوتھی روایت کے طور پر اس نسخۂ جے پور کی اہمیت مسلم ہے اور اسے اگر شائع کر دیا جائے تو یہ باغ و بہار کے متداول نسخوں کے برخلاف ایک معتبر نسخہ ہوگا۔

(ماہ نامہ کتاب نما، جلد 36، شمارہ 10، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، اکتوبر 1996، صفحہ 9 تا 21)

○○○

<u>نیّر مسعود</u>

بہ نام رشید حسن خاں

(بہ حوالہ مضمون ''مثنویاتِ شوق، لکھنوی معاشرت کے آئینے میں)

برادرم خاں صاحب آداب!

خدا کرے آپ کی صحت بہ حال ہو۔ یہ خط کچھ بادلِ ناخواستہ لکھ رہا ہوں۔ قصہ یہ ہے کہ اِدھر آپ کے مضمون ''مثنویاتِ شوق؛ لکھنوی معاشرت کے آئینے میں'' (ایوانِ اُردو، اپریل 1998) کے حوالے سے مجھ پر طعنے پڑ رہے ہیں کہ ''آپ کے دوست'' اور ''آپ کے محقق اعظم'' نے یہ مضمون جو لکھا ہے اس کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں۔ اتفاق سے ایوانِ اُردو کا یہ شمارہ میرے پاس نہیں آیا، لیکن ایک صاحب نے مجھے اس کی نقل بھجوا دی۔ بھائی، ''آپ نے تو حد کر دی۔ میں آپ کو اب بھی اپنے عہد کا سب سے بڑے محققوں میں شمار کرتا ہوں، لیکن یہ مضمون ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے تحقیقی اصولوں کی جملہ خلاف ورزیوں، غیر محققوں کی تحقیقی خرمستیوں اور ''ناتحقیقی'' ستم ظریفیوں کی مثال میں نمونے کے طور پر لکھا ہے۔ اب میں طعنوں کا جواب تو کیا دے پاتا، مناسب یہی معلوم ہوا کہ اس مضمون کی سب نہیں کچھ قباحتوں کو آپ کے گوش گزار کر کے دریافت کروں کہ یہ معاملہ کیا ہے اور آپ کے سے محقق کو بیٹھے بٹھائے یہ کیا ہو گیا۔

یہ مضمون اگر اپنے عنوان کی حدوں کے اندر ہی رہتا تو میں اس کے دفاع میں یہ کہہ سکتا تھا کہ خاں صاحب نے صرف یہ دکھایا ہے کہ شوق کی مثنویاں لکھنوی معاشرے کے کن پہلوؤں کا آئینہ نظر آتی ہیں اور مضمون کی بنیادی خامی یہ ہے کہ مضمون نگار نے ان مثنویوں کو سوچ سمجھ کر پڑھا اور اس ناقص مطالعہ کی وجہ سے ان آئینوں کی بعض تمثالیں انھوں نے نہیں دیکھیں (مثلاً زہر عشق کا دو تہائی حصہ جو ہیروئن کی خودکشی سے تعلق رکھتا ہے، اور جو اس مثنوی کی مقبولیت کا اصل سبب رہا ہے، مضمون نگار نے اس کو نظر انداز کر دیا اس بحث سے سروکار نہیں رکھا کہ وہ کون سے معاشرتی دباؤ تھے جن کی وجہ سے ایک لڑکی کو محض اپنی محبت کا راز کھل جانے پر اس شہر لکھنؤ میں خودکشی کرنا پڑ گئی جہاں مضمون نگار کی رائے میں عورتوں مردوں کے ناجائز جنسی تعلقات عام تھے) مگر آپ نے غضب یہ کیا کہ لکھنوی معاشرت کے موضوع پر اپنے برائے نام اور یک رُخے مطالعے کو کافی جان کر خود طبع آزمائی شروع کر دی۔ بھائی، کسی تہذیب اور معاشرے کے تجزیاتی اور تحقیقی مطالعے کے کیا آداب اور طریق کار ہوتے ہیں اس کی ابجد سے ناواقفیت کے باوجود اگر آپ کو قلم اُٹھانا ضرور تھا تو کم از کم اس موضوع پر غیر مربوط سا مطالعہ ہی کر لیتے۔ آپ کا عالم یہ ہے کہ ''گذشتہ لکھنؤ'' بھی آپ نے پوری طرح نہیں پڑھی، کمال الدین حیدر کی تاریخ تک (باوجود یہ کہ وہ انگریزوں کے لیے ان کے ایک وفادار نے لکھی تھی) آپ کی رسائی نہیں، نول کشور کی تواریخ نادر العصر، جو ایک انگریز کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے تحریر ہوئی تھی۔ (اس کا نام ہی ''تحفۂ کرنل ایبٹ'' ہے) وہ بھی آپ کے لیے مجہول رہی۔ لکھنؤ کی گھریلو معاشرت کا آپ کو پتا ہی نہیں اس لیے عباس حسین ہوش کی مثنوی ''تفسیر عفت''، ''فسانۂ نادر جہاں''، لکھنؤ کی عورتوں کے بارے میں خواجہ عبدالرؤف عشرت

کی تائید کر رہی ہے یا نہیں۔ ''قدیم ہُنر وہُنر مندانِ اودھ''، ''وضع دارانِ لکھنؤ''، حتیٰ کہ ماہ نامہ ''نیا دور'' کے دونوں حالیہ اودھ نمبر بھی آپ کو دکھائی نہیں دے رہے ہیں۔ پیشگی فیصلہ کر لینے کے بعد جذبات اور تاثرات کی تابع تحقیق کو غیر جانب داری کے انداز میں پیش کرنا اور اپنے پیشگی جذباتی فیصلے اور قلبی خواہش کے برخلاف شواہد کو دیکھنے سے کنھیا لال کپور کے ''مسٹر ڈالر'' کی طرح بالا رادہ معذور ہو جانا آپ کی تحقیق کی کمزوری رہی ہے۔ لیکن اس مضمون میں یہ کمزوری، نا قابلِ یقین حد تک بڑھ کر ''خواہش زدہ'' تحقیق کی مکمل مثال بن جاتی ہے۔

لکھنؤ کی تہذیب اور معاشرے پر کچھ لکھنے کے لیے کسی قسم کے اور کتنے ماخذوں سے استفادے کی ضرورت ہے اس کا اندازہ آپ کو نہ سہی، پھر بھی ذرا اپنے مضمون کے ماخذوں کی فہرست پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

1۔ نجم الغنی، تاریخِ اودھ (صرف منفی شواہد)

2۔ شرؔر، گذشتہ لکھنؤ (صرف منفی شواہد)

3۔ شوق، مثنویاں (صرف منفی شواہد)

4۔ پروفیسر آل احمد سرور (لکھنوی طوائفیں)

5۔ پروفیسر خورشید الاسلام (لکھنوی طوائفوں کی سوز خوانی)

یہ لکھنؤ کی پیچیدہ اور کثیر الابعاد تہذیب و معاشرت پر آپ کے ماخذوں کی کُل بساط ہے۔ اس کا دوسروں کو تو کیا، خود آپ کو بھی یقین نہ آنا چاہیے اور اس بساط پر جس تیقّن اور خود اعتمادی کے ساتھ قولِ فیصل کے انداز میں آپ نے گفتگو کی ہے اور تحقیق کے معروضی، منطقی اور غیر جذباتی انداز کو جس طرح نظر انداز کیا ہے اس کو بے علمی کی جسارت کے سوا اور کیا کہا جائے۔

آپ کا یہ قول پسند ہے کہ تحقیق کی بنیاد شک پر ہوتی ہے، لیکن آپ کے اس مضمون میں تحقیق کی بنیاد شک پر نہیں، ایمان، بل کہ ایمان بالغیب پر، اور شواہد پر نہیں، مفروضوں بل کہ افواہوں پر ہے۔ ایمان کا ایسا مظاہرہ بھی کم دیکھنے میں آتا ہے کہ لکھنوی معاشرے کا محقق پروفیسر خورشید الاسلام اور میرے شفیق محترم سرور صاحب سے استناد کرے، اور وہ محقق رشید حسن خاں کے پائے کا ہو۔ خورشید صاحب اور سرور صاحب بہر حال دیانت دار نقاد ہیں۔ وہ خود اس پر راضی نہ ہوں گے کہ انھیں اس موضوع پر سند بنا دیا جائے۔

مذکورۂ بالا پانچ اور سچ پوچھیے تو صرف تین، وہ بھی نامکمل ماخذوں کے بل بوطے پر آپ نے جو کچھ لکھا ہے اور اس لکھے ہوئے سے جو منطقی نتیجہ برآمد ہوتا ہے اس کے تھوڑے سے نمونے دیکھ لیجیے:

1۔ لکھنؤ کے علمائے فرنگی محل ہوں یا خاندانِ اجتہاد مراجع دین، یا صوفیائے کرام کے حلقے، یا انیس یا دبیر اور محسن کاکوروی اور امیر مینائی قسم کے شاعر، یا پابندیِ شرع میں حد سے بڑھ کر لطیفوں کا موضوع بن جانے والے نقات اور دوسرے اشرافیہ طبقات، عیش طلبی نے ان میں سے ''کسی کو کسی اور کام کا رکھا ہی نہیں تھا۔ عیش، تفریح اور لذت اندوزی کو زندگی کا واحد مقصد بنا دیا تھا۔ 6

(کسی کو کسی اور کام کا رکھا ہی نہیں تھا، کا مطلب یہ ہوا کہ لکھنؤ میں بلا استثنا ہر طبقے کا ہر فرد صرف عیش تفریح اور لذت اندوزی میں منہمک تھا اس لیے کہ یہی اس کی زندگی کا واحد مقصد تھا)

2۔ لکھنؤ کے مختلف افراد کی جو تصویریں کثیر تعداد میں موجود ہیں اور یہاں کے لوگوں کی وضع قطع اور لباس وغیرہ کے بارے میں جو چشم دید بیانات فراوانی کے ساتھ دستیاب ہیں وہ آپ کی نظر میں معتبر نہیں ہیں اس لیے کہ:

''لکھنؤ میں یہ عام وضع ہو گئی (تھی) کہ سر پر مانگ، اس پر مسالے کی کام دار ٹوپی..... ماتھے پر دونوں طرف پٹّیاں۔ وغیرہ وغیرہ (آپ کا ماخذ: شرر) 7

مگر ان تصویروں میں عام طور پر یہ ''عام وضع'' نظر نہیں آتی۔ مثلاً میر انیس کے سر پر سفید سوتی پیچ گوشہ ٹوپی، نواب والا جاہ کے سر پر عمامہ نظر آتا ہے اور چکن کی دو پلّی ٹوپی تو لکھنؤ میں رواج عام رکھتی تھی، لیکن آپ کا تائید یافتہ بیان ان شواہد کو جھٹلا رہا ہے۔ البتہ یہاں صرف ایک سوال کرنا ہے کہ صرف آپ کی نظر سے لکھنؤ والوں کی قلمی، عکسی تحریری تصویریں نہیں گزریں؟ یا شرر کی زبان پر آپ اپنی آنکھوں سے زیادہ ایمان رکھتے ہیں؟

3۔ لکھنؤ کی تہذیب کے بارے میں وہ سارے معاشرہ چشم دید بیان اور وہ تمام راست ماخذ جو طوائفوں کے ذکر سے خالی ہیں۔ جھوٹے اور گم راہ کُن ہیں۔ لکھنؤ کی تہذیب کا اصل مظہر طوائفیں تھیں۔ اس لیے کہ آپ کے بقول ''طوائف کو معاشرے میں تہذیبی نمائندگی کا شرف مل گیا تھا۔''

یعنی جو لوگ لکھنؤ میں کسی نہ کسی طوائف سے شرفِ ملاقات حاصل نہ کر سکے انھوں نے لکھنؤ کی تہذیب اور معاشرے کو دیکھا ہی نہیں۔

4۔ آپ لکھتے ہیں:

''اس معاشرے میں طوائف کی اہمیت اور حیثیت کا اس سے بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عزاداری جیسی مذہبی چیز بھی ان کی دسترس سے باہر نہیں رہی تھی۔ 8

لکھنؤ کے شہدوں اور فقیروں کی عزاداری بھی مشہور تھی، بل کہ عزاداری کسی کی بھی ''دسترس سے باہر نہیں رہی تھی''۔ کیا آپ ''اس معاشرے میں شہدوں، فقیروں بل کہ عزاداری کی دست گاہ رکھنے والی ہر کس و ناکس کی اہمیت کا اور حیثیت کا اس سے بہ خوبی اندازہ'' کر سکتے ہیں؟

5۔ فرنگی محل، خان دانِ اجتہاد اور دوسرے دینی مراکز کا پھر ذکر کرنا پڑ رہا ہے، حالاں کہ آپ کا مضمون اس ذکر سے خالی رکھا گیا ہے، کیا اس لیے کہ آپ حسبِ تحقیق لکھنؤ کے ''معاشرے میں تہذیبی نمایندگی کا شرف'' ان مرکزوں کو نہیں طوائفوں کو حاصل تھا۔ تہذیب کے میدان میں یہ مراکز کوئی حیثیت اور اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ لیکن مذہب بھی تہذیب اور معاشرے کا اہم جز ہوا کرتا ہے۔ آپ نے لکھنؤ میں ''مذہبیت کی طاقت و روایت'' اور تہذیب پر اس کے ''دیرپا اثرات'' کو تسلیم بھی کیا ہے (6) سوال یہ ہے کہ کیا مذہب کے میدان میں بھی یہ دینی مراکز ہیچ اور بے حیثیت تھے؟ آپ کا مضمون اس سوال کا جواب اثبات میں دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ عزاداری میں بھی:

''طوائفوں نے سوز خوانی کے کمال سے فائدہ اُٹھا کر دخل حاصل کر لیا تھا اور اس طرح دُنیا ہی نہیں، آخرت بھی ان کے ہاتھ میں چلی گئی تھی 8 (آپ کا ماخذ: خورشید الاسلام)

اس بیان کی تائید میں اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ علمائے فرنگی محل میں کسی ایسے بزرگ کا سراغ مجھے نہیں ملا جنھوں نے سوزخوانی کے فن میں طوائفوں کے برابر کمال حاصل کیا ہو، اور خان دانِ اجتہاد کے علما تو سوزخوانی کے وقت (آخرت کو طوائفوں کے ہاتھ میں چھوڑ کر؟) مجلس سے اُٹھ جاتے تھے۔ بھائی، یہ سب کیا ہے؟ ذہن کو زحمت دیے بغیر لکھنا اور لکھنے کے بعد ذہن کو زحمت نہ دینا آپ کو زیب نہیں دیتا۔ لکھنؤ میں باکمال سوزخوانوں کو آخرت پر قبضہ دے دیا جاتا تھا۔ مندرجۂ بالا انشا پردازانہ فقرے کا اگر اس کے سوا کچھ اور مطلب نکلتا ہو تو براہِ کرم مجھ کو (خود یا اپنے ماخذ سے پوچھ کر) بتائیں۔

6۔ آپ کا تائید یافتہ ایک اور انکشاف: لکھنؤ کی بیگموں میں کوئی ایسی نہیں تھی جو 'چھنال' نہ ہو۔9 (آپ کا ماخذ: شوق کی ایک خیالی داستان کا ایک خیالی نسوانی کردار)۔ آپ سے یہ پوچھنے کی ہمت نہیں پڑ رہی ہے کہ خود آپ کا کیا خیال ہے۔

7۔ ہمارے آپ کے محترم بزرگ سرور صاحب طوائف شناسی میں وہ مرتبہ رکھتے ہیں کہ آپ کا سا باعمل محقق طوائفوں کی اداؤں کی پہچان کے لیے ان کی سند پیش کرتا ہے اور شوق کی ہیروئنوں کے بارے میں سرور صاحب کے اس جملے کو ''نہایت بلیغ بات'' کہہ کر نقل کرتا ہے:

''مہہ جبیں میں کم اور مہہ لقا میں زیادہ ہمیں طوائف کی جھلک نظر آتی ہے۔'' (ص 8)

یہ عجیب بات ہے کہ ایک طرف آپ لکھنؤ میں ہر طرف طوائفوں کی تصویریں دکھا کر اپنی تحقیقی کمائی بڑھانے میں سرگرم ہیں دوسری طرف طوائفوں کی گویا اتنی بھی پہچان نہیں رکھتے جتنی سرور صاحب کے سے نستعلیق بزرگ رکھتے ہیں۔ کیا آپ شریف عورتوں اور طوائفوں میں تمیز نہیں کر سکتے؟

عجیب تر بات یہ کہ ایک طرف تو آپ معلومات کی فراہمی اور ''تمتّع زہر گوشہ اے'' کی سعی میں یہاں تک سرگرداں ہیں کہ طوائفوں کے معاملے میں بھی سرور صاحب کے سے غیر متوقع ماخذ تک پہنچ جاتے ہیں، دوسری طرف آپ کے ماخذوں کی تعداد پانچ سے زیادہ نہیں بڑھ پاتی اور ابتدا میں جن چند اہم اور آسانی کے ساتھ دکھائی دے جانے والے ماخذوں کا میں نے ذکر کیا ہے، وہ بھی آپ کو نظر نہیں آتے (وہی 'مسٹر ڈالر' والا کمال)

8۔ ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں۔ آپ کے اس مضمون کا موضوع دہلی معاشرہ نہیں تھا لیکن آپ نے اسے بھی لپیٹے میں لے کر لکھنوی معاشرے سے بھی گیا گزرا دکھایا۔ لکھنؤ میں جو 'لذت اندوزی اور عیش کوشی' معاشرے کے نمایندہ طبقے پر چھائی ہوئی تھی (ص۔6) اس کا تذکرہ کرتے کرتے آپ بیان کی ابتذال پر آتے ہیں اور شوق کی 'بہارِ عشق' کے کچھ شعروں کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''ان میں ابتذال ہے، کھلا ہوا ابتذال۔ لیکن ایسے شعروں کی تعداد بہت سے بہت 24 یا 25 ہوگی، اس سے زیادہ نہیں ایسی دوسری مثنویوں کے ایسے ہی اشعار کو اگر یکجا کیا جائے، مثلاً اُردو ہی میں میر اثر اور مومن کی مثنویوں کے ایسے اشعار کو، تو پھر شوق کا نام اس سلسلے میں سرفہرست نہیں لکھا جا سکے گا۔ کئی سطر نیچے لکھا جائے گا۔'' 10

اور اس کے بعد یہ بھی لکھتے ہیں۔

''اسی طرح (یعنی اثر اور مومن کی طرح) شوق کی مثنویوں کو بھی ادب کا حصہ اور شوق کو (اثر اور مومن کی طرح) اپنے معاشرے کا ترجمان مانا جائے گا۔ معاشرہ جیسا تھا ترجمانی بھی ویسی ہی ہوگی اور تصویر بھی ویسی ہی بنے گی۔'' 10

اور یہ معاشرتی تصویر ان مبتذل شعروں کے آئینے میں بنے گی جن کے مصنف شوق لکھنوی کا نام ابتذال یعنی اپنے معاشرے کی سچی تصویر کشی کرنے کے لحاظ سے اثر دہلوی اور مومن دہلوی کے ناموں سے ''کئی سطر نیچے لکھا جائے گا''۔ اور اپنے مبتذل کلام کے ذریعے ایسے دہلوی معاشرے کی تصویر دکھانے والوں میں اثر اور مومن کے نام شوق سے ''کئی سطر اوپر'' لکھے جائیں گے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ لکھنؤ کے معاشرے کو پست اور مبتذل ٹھہرانے کے بعد آپ نے دہلی کے معاشرے کو اس سے بھی بدتر ظاہر کرنا کیوں ضروری سمجھا اور اپنی تہذیبی روایت کی ان دو بڑی (اور دونوں مرحوم) علامتوں کے خلاف کون سی در پردہ نفسیاتی گتھی آپ کو ان کا دشمن بنائے ہوئے ہے۔ کیا ذاتی طور پر آپ کو دہلی اور لکھنؤ میں کچھ تلخ تجربے ہوئے ہیں؟ دہلی اور لکھنؤ کی پُرانی آویزش میں ملوث لکھنوی جماعت آپ کے اس فیصلے سے خوش ہو کر آپ کو دہلوی معاشرے کا نبّاض مان سکتی تھی۔ لیکن میں لکھنؤ کو دہلی کی ضمنی پیداوار مانتا ہوں (یہ تو آپ کے بھی علم میں ہونا چاہیے کہ لکھنؤ کے بیش تر ممتاز گھرانے اصلاً دہلی کے تھے) اور دہلی کا زوال مجھ کو لکھنؤ کی تباہی سے بڑا المیہ معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے اس احساس میں اپنی تہذیبی روایت سے میرے تعلقِ خاطر (آپ کی رائے میں قدامت پسندی) کو دخل ہو۔ بہر حال میں آپ کی اس نتیجہ گیری سے اتفاق نہیں کر سکتا کہ اثر، مومن اور شوق کی مثنویوں پر ''معاشرہ جیسا، ترجمانی بھی ویسی ہی، اور تصویر بھی ویسی ہی'' کا اطلاق ہوتا ہے۔ اور ''ابتذال کھلا ہوا ابتذال'' لکھنؤ سے زیادہ دہلی کے معاشرے کی ترجمانی کرتا ہے۔ دہلی اور لکھنؤ کی بہت سی ادبی بضاعت میں سنجیدہ اخلاقی معاشرہ قدروں کی عکاسی ہوئی ہے۔ لیکن وہ تصویریں آپ کو نظر نہیں آتیں، انہیں ''مسٹر ڈالر'' کی طرح۔

9۔ تضاد تحقیق کے لیے زہر قاتل ہے۔ جو محقق کے حافظے اور قوتِ تمیز سے لے کر اس کی نیت اور دیانت تک کو مشکوک کر سکتا ہے۔ آپ کی تحقیقی تحریروں میں یہ تضاد گاہ گاہ نظر آتا ہے۔ لیکن اس مضمون میں آپ نے تضاد کی صنعت کی حد تک پہنچا دیا ہے۔ کچھ نمونے دیکھیے۔

(الف) لکھنؤ کی تہذیب کے بارے میں آپ لکھتے ہیں ''کم سے کم مدت میں اس کو فروغ حاصل ہوگیا''۔ کم سے کم مدت کا مطلب ہوا تقریباً اچانک (میں آپ کی اس رائے سے متفق ہوں اور سرور پر اپنی کتاب میں ''لکھنوی تہذیب کے یک لخت عروج'' کا ذکر کر چکا ہوں 44) لیکن آپ اسی تقریباً اچانک فروغ پا جانے والی تہذیب کے تشکیلی عناصر کی بحث میں یہ بھی لکھ دیتے ہیں۔

''یہ ایسی بات نہیں تھی جو اچانک واقع ہوئی ہو۔'' 9

(ب) آپ لکھتے ہیں کہ لکھنؤ کی تہذیب اور معاشرے میں ''ظاہر سب کچھ تھا باطن خالی تھا۔''

اپنے مادہ پرستانہ عقائد کے ساتھ آپ کو ظاہر اور باطن کی بحث سے دور رہنا چاہیے تھا۔ اس درخواست پر آپ کان نہیں دھریں گے کہ باطن کے خالی ہونے اور خالی نہ ہونے کی دو ایک مثالیں عنایت کیجیے۔ اس حقیقت پر بھی غور کرنے میں آپ کی طبیعت گھبرائے گی کہ باطن کا خالی ہونا انسان کی حد تک محالات سے ہے۔ اس لیے اس کی فکر چھوڑیے اور اپنے بیان کا تضاد دیکھیے کہ لکھنوی تہذیب میں باطن کو خالی کر دینے کے ڈیڑھ سطر بعد آپ لکھتے ہیں۔

''ہاں ایک چیز ضرور ایسی ہے جس نے دیرپا اثرات پیدا کیے اور وہ ہے مذہبیت کی طاقت ور روایت، جس کا تعلق حقیقی طور پر باطن سے ہوتا ہے۔ مذہب کے اثرات افراد کے

احساس کا جز ہوتے ہیں اور پورے گروہ کی زندگی پر حاوی رہتے ہیں۔ عمل کتنا ہی کم ہو، عقیدہ ذہن کی تہو میں پیوست رہا کرتا ہے۔'' 6

''دیرپا اثرات'' ۔ ''مذہبیت کی طاقت ورروایت''، ''حقیقی طور پر باطن'' سے تعلق ''احساس کا جز''، ''عقیدہ'' جو ذہن کی تہو میں پیوست رہا کرتا ہے'' وغیرہ ہے کہ معنی تو میری سمجھ میں آتے ہیں، لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ سب کے ہوتے ہوئے ''ظاہر سب کچھ تھا، باطن خالی تھا'' کا کیا مطلب ہوا:

''یہ عجیب بات تھی کہ (لکھنؤ میں) ایک طرف تو عیش طلبی اور لذت کوشی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی اور دوسری طرف عزاداری کا عروج تھا، اور اس سے بھی زیادہ دل چسپ بات یہ ہے کہ اس معاشرے کا حسن کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ ان عناصر نے بھی تضاد اور ثنویت، یعنی دہرے پن کو معاشرت کا نہایت حسین چیز بنا دینے میں بہت کامیابی حاصل کی۔'' 7

آپ کے مضمون کے سیاق و سباق میں جتنا جتنا غور کرتا ہوں اتنی اتنی ان جملوں اور مضمون کی معمائیت باری باری بڑھتی جاتی ہے۔ آپ بھی غور کر کے دیکھیے۔ لیکن اس سے قطع نظر، یہاں گفتگو تضاد کی ہے۔ پڑھنے والوں کی سہولت کی خاطر آپ نے ''ثنویت'' کا ترجمہ بھی کر دیا ہے (یعنی دہرے پن کو) لیکن اگلے صفحے پر یہ فیصلہ بھی سنایا ہے:

''معاشرے میں نفاست اور صلابت کے عدم توازن نے یک رُخا پن پیدا کر دیا تھا۔'' 8

کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ منشائے مصنف کیا ہے۔ آپ نے دہرے پن اور ایک رخے پن سے ایک ہی معنی مراد لیے ہیں؟

(د) تضاد کو صنعت بنا دینے کی بات میں نے یوں ہی نہیں کہہ دی تھی۔ آپ لکھتے ہیں:

''غیدری بیگم نے واجد علی شاہ سے جب یہ کہا تھا (کہ کچھ دوسری عورتوں کے بھی مردوں سے ناجائز تعلقات ہیں) تو ایک ایسی حقیقت کا اظہار کیا تھا جس سے بہت سے لوگ باخبر تھے۔ اسی طرح جب نواب مرزا شوق اپنی مثنوی ''فریبِ عشق'' میں یہ کہتے ہیں (کہ بیگموں میں کون ہے جو چھنال نہیں) تو (انھوں نے) معاشرے کی ایک ایسی تلخ حقیقت کو بیان کیا تھا جس سے لوگ بے خبر نہیں تھے۔ لیکن اس کو بیان کرنے کی یا تو جرأت باقی نہیں رہی تھی یا پھر وہ معاشرے کا ایسا حصہ بن چکی تھی کہ اجنبیت اور اعتراض کی گنجایش گویا ختم ہو چکی تھی۔''

آپ کو بیان کا تضاد نظر آیا؟ آپ کا کہنا ہے کہ اس معاشرے میں عورتوں کا غیر مردوں سے تعلقات رکھنا۔

(1) اتنا بڑا عیب سمجھا جاتا تھا کہ لوگ اس کو زبان پر لانے کی جرأت نہیں رکھتے تھے۔ یا

(2) کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا تھا کہ اس کا ذکر یا اس پر اعتراض کیا جائے۔

عام تضاد کے لیے ''یک بام و دو ہوا'' کی ضرب المثل استعمال ہوتی ہے۔ لیکن آپ کا یہ بیان ''دو بام و یک ہوا'' کی عمدہ مثال ہے اور یہ تضاد کو صنعت بنا دینے کی بھی عمدہ مثال ہے۔

(10) مذہب کی گفتگو میں آپ نے کئی جگہ علم و فکر کے دائرے سے باہر قدم رکھا ہے۔ مثلاً آپ لکھنؤ میں ''بہت سی ایسی رسمیں پیدا'' ہو جانے کا ذکر چھیڑتے ہیں جن کا حقیقتاً مذہب سے لازمی تعلق نہیں تھا 7 اور اس کو صرف لکھنؤ سے مخصوص قرار دیتے ہیں۔ مذہب کے حوالے سے ایسی رسموں کا رواج پایا جانا جن کا ''حقیقتاً'' مذہب سے ''لازمی'' تعلق نہ ہو مذہبیاتِ عمرانیات (اور شاید کچھ اور علوم کا بھی) ایسا موضوع ہے جس پر آپ کو اظہارِ خیال نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس عالم گیر مظہر کو لکھنؤ سے مخصوص کر دینا تو ایسی بات ہے کہ معاملے میں آپ اپنی بے علمی کا حلفیہ اعتراف کریں تو بھی اسے آپ کی کسرِ نفسی پر محمول کیا جائے گا۔ کیا آپ کو واقعی زیادہ نہ سہی، صرف ہندوستان کے مختلف خطوں ''فرقوں'' اور مسلکوں کی ان رسموں کا بننا نہیں جن کا ''حقیقتاً'' مذہب سے ''لازمی'' تعلق نہیں ہے یا یہ بھی وہی ''مسٹر ڈالر'' کی معجز نمائی ہے۔

(11) آپ لکھنؤ کی مذہبیت کے تمام مظاہر کو بلا استناد ''خارجی زندگی سے قریب تر 7 بتاتے ہیں۔ اس کیا مراد ہے؟ اور ان مظاہر کے مقابل ''دور تر'' مظاہر کون سے ہوں گے اور ان کی اچھائی برائی کی پہچان اور معیار کیا ہوں گے؟ اس کی وضاحت کی درخواست پر بھی آپ ''باطن خالی'' کی وضاحت کی درخواست کی طرح کان نہیں دھریں گے، لیکن اس پر غور کیجیے کہ لکھنؤ میں مختلف مذہبی مما لک کی دینی تصنیفوں، مذہبی سرگرمیوں، صوفیائے کرام کے افادوں کا صحیح شمار تک ممکن نہیں صوفیوں کو تو خصوصیت کے ساتھ ''اہلِ باطن'' اور ''اہلِ عرفان'' کہا جاتا ہے۔ آپ نے ان سارے مظاہر کے بارے میں فیصلہ کر دیا کہ ''عرفان سے زیادہ اظہار ان کا اہم جز تھا 7 اور اس طرح ان مظاہر کو کھوکھلا، نمائشی اور گویا زبانی جمع خرچ ٹھہرا دیا۔

(12) مخاصمانہ جذبات اور پیش حکمی کے تحت کی جانے والی خواہش زدہ تحقیق کیا کیا کرشمے دکھا سکتی ہے اس کے کچھ نمونے آپ کے سامنے پیش ہوئے۔ لیکن ایک کرشمہ آپ کے مضمون میں ایسا ہے جو بہتوں کی، اور اگر غور کیجیے تو خود آپ کی بھی سخت دل آزاری کا باعث ہو سکتا ہے۔ پُرانے زمانے کے ایک شہر کی عورتوں کو بدکار ثابت کرنے کی خواہش سے مغلوب ہو کر آپ نے اس زمان و مکان تک چلے آئے اور شر کا یہ قولِ فیصل کسی اختلافی نوٹ یا مستثنیات کے امکان کو نظر انداز کرتے ہوئے نقل کر گزرے:

''رہے عورتوں کے اخلاق و عادات، اس بارے میں ہمارا عام دعوا ہے کہ جن لوگوں کو زنا کاری کا شوق ہو، ان کی عورتیں پارسا نہیں ہو سکتیں۔''

اور یہ دعوا کسی مخصوص جگہ اور زمانے کے لیے نہیں بل کہ ''عام'' ہے۔ آپ نے کمال کیا ہے قیدی کے ساتھ اس کو بھی اپنے مضمون کے استناد اور استشہاد میں استعمال کر لیا اور شر کے ساتھ۔ **''اقتدتُ بھٰذا الامام''** والا رویہ یہاں بھی ترک نہیں کیا۔ کاش اس اقتباس کو اپنے مطلب کے لیے استعمال کرنے سے پہلے اس کے غوامض پر غور کر لیتے۔

آپ نے گذشتہ زمانے کے، ایک شہر میں محدود معاشرے سے تجاوز کر کے اور جغرافیائی حدوں کو توڑ کر خود اپنے عہد کے معاشرے تک کو لے ڈالا۔ بھائی، خدا کے لیے مردوں کی مکاریوں کی سزا (یا دفاع؟) میں خانہ دار عورتوں کے دامن کو اس طرح آلودہ نہ کیجیے۔

اب اس کے آگے آپ کے مضمون کی کرشمہ کاریوں کی نشان دہی کیا کروں از راہِ کرم میرے معروضات کا جلد از جلد جواب دے کر میری تشفی کیجیے اور یہ بھی بتائیے کیا یہ مضمون آپ کی مرتبہ مثنویاتِ شوق میں شامل ہوگا؟ اور اسی صورت میں؟

آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ آج کل امریکہ اور دوسرے مغربی ملکوں میں اودھ اور لکھنؤ پر تحقیق کا بازار گرم ہے اور لکھنوی معاشرے کے الگ الگ مظاہر (طوائفوں سے لے کر علمائے مذہب تک) پر انگریزی میں کتابوں کی خاصی تعداد چھپ چکی ہے۔ اس موضوع پر کام کرنے والے اہلِ تحقیق لکھنؤ بھی آتے رہتے ہیں اور ان میں بعض سے میری بھی ملاقات ہو جاتی ہے اور میں ان سے یہ ضرور پوچھتا ہوں

کہ آپ لوگوں کو لکھنؤ کی تہذیب وثقافت اور معاشرے سے اتنی دل چسپی کیوں پیدا ہوگئی ہے؟ قریب قریب سب کا جواب یہی ہوتا ہے کہ یہ دُنیا کی آخری 'COMPACT' تہذیب تھی اور قریب العہد ہونے کی وجہ سے اس کے آثار اور عناصر (جن کو آپ ریت پر بننے والے نقش بتاتے ہیں 6) اب بھی کسی حد تک موجود ہیں اور یہ بھی کہ انگریزوں کے ہندوستانی وفاداروں نے اپنے سفید آقاؤں کو خوش کرنے کی کوشش سے مغلوب ہو کر اپنی ہی تہذیبی، معاشرتی اور تاریخی تصویروں کو جی بھر کر مسخ کیا ہے، درحالے کہ خود انگریزوں نے ان موضوعات پر اپنی تصنیفوں میں قدرے محتاط اور بعض نے تو منصفانہ رویہ رکھا ہے ۔ پھر معافی مانگ کر کبھی کبھی یہ بھی کہہ گزرتے ہیں کہ ایسے 'WRETCH'' (اس لفظ کے معنی نہ پوچھیے) آپ ہی لوگوں میں پائے جاتے ہیں جو انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہونے کے بعد بھی اپنی تہذیبی روایت کو مفروضہ گھناؤنی تصویریں پیش کرتے ہیں، اس لیے ہم مجبور ہوئے کہ اپنے طور پر لکھنؤ کی تہذیبی روایات کا مطالعہ کریں۔

اپنے موضوع سے متعلق مواد تک ان مغربیوں کی حیرت خیز رسائی کا آپ کو علم نہیں، مجھے کچھ اندازہ ہے، اس لیے کہ میری نظر سے کبھی کبھار ان کی انگریزی کتابیں گزر جاتی ہیں، لکھنوی معاشرے پر آپ کے نام ور محقق کا یہ مضمون وہ بڑی اُمیدوں کے ساتھ پڑھیں گے۔ آپ نے کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر یہ سب کیا اور کیوں لکھ دیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ سفید آقا رہے نہیں جن کی خوش نودی آپ کو مطلوب ہو۔ کچھ کالے آقا ضرور خوش ہوں گے۔ لیکن میں آپ کے مزاج سے واقف ہوں اور آپ کی طرف سے دعوا کر سکتا ہوں کہ ان کی خوش نودی حاصل ہو جائے گی۔ لیکن اس سوال کا میرے پاس جواب نہیں ہے کہ اپنی تحقیق کے دامن کو اپنی غیر تحقیقی جذباتیت اور خواہش زدگی کی سزا (یا دفاع؟) میں اس طرح آلودہ کرنے کے پیچھے آپ کا کیا مقصد تھا۔ ظاہر ہے یہ مقصد تو قطعی نہیں تھا کہ اپنے موضوع کا قدرِ وسعت، گہرائی اور دیانت داری سے مطالعہ کیا جائے، جیسا کہ آپ کے کل ماخذوں کی اس فہرست سے ظاہر ہے، جو شروع میں درج کر چکا ہوں اور آپ کے حافظے پر بھروسا نہ کرتے ہوئے آخر میں پھر درج کرتا ہوں؛

1۔ نجم الغنی: تاریخِ اودھ

2۔ شرر: گذشتہ لکھنؤ

3۔ شوق: مثنویاں

4۔ پروفسر آل احمد سرور

5۔ پروفیسر خورشید الاسلام

آپ کا

نیّر مسعود

ادبستان، دین دیال روڈ، لکھنؤ 226003

(ماہ نامہ ایوانِ اُردو، دہلی جولائی 1998، صفحہ 23 تا 29)

OOO

عبدالحق

مثنویاتِ شوق

شعبہ کے سابق رفیق کار اور اُردو کے معروف محقق جناب رشید حسن خاں نے مرزا شوق کی مثنویوں پر مضمون لکھا اور طعنے پڑ رہے ہیں پروفیسر نیّر مسعود پر؟ کیوں کہ دونوں میں دوستی ہے۔ پتا نہیں اس دوستی کی بنیاد ذاتی تھی یا علمی وادبی۔ یہ اگر علمی بنیاد پر قائم ہوتی تو جناب نیّر مسعود اپنے منصب اور مقام سے فروتر لہجہ اختیار نہ کرتے۔ شاید ان پر پڑنے والے طعن وتشنیع خاں صاحب کی طرف لوٹا دیے گئے

ہیں۔ حیرت ہے کہ دوسروں کے کہنے سننے یا لعن طعن کے ردِّ عمل میں یہ مضمون لکھا گیا۔

حریم میرا خودی غیر کی معاذ اللہ

مجھے نہ خاں صاحب سے غرض ہے اور نہ نیّر مسعود صاحب سے کچھ لینا دینا ہے۔ میرے لیے دونوں محترم ہیں اور میں دونوں کی علمی خدمات کا معترف ہوں۔ مگر علمی مباحث میں پُر وقار سنجیدگی اور مہذب لہجے کی توقع کرتا ہوں۔ خاں صاحب محققِ اعظم نہ سہی محقق تو ہیں ہی اور انھیں نیّر مسعود صاحب پر بزرگی میں بھی سبقت اور فضیلت حاصل ہے، پاسِ احترام رکھنا چاہیے۔ شاید انحطاط آمادہ معاشرے میں دانشوروں کے اظہار اور اسالیب کے معیار بھی بدل جاتے ہیں۔ گذشتہ برسوں میں علی گڑھ کے بُزرگ اساتذہ کے درمیان غیر شائستہ مکالمہ زبان و دہن دونوں کے بگڑنے اور بدنمائی کا مظہر بنا رہا۔ زوال زدگی میں قومی ضمیر اور اندازِ فکر کا بدل جانا قرینِ قیاس ہے۔ ثقافت کی مجہول تعبیر اور منفی پہلوؤں پر زور (غیر شعوری طور پر) دانش و بینش کے مسلمات سمجھے جاتے ہیں۔ ان سے عام گم رہی پھیلتی ہے اور تہذیبی اقدار مذموم قرار پاتے ہیں۔ دہلی ہو کہ لکھنؤ یہ سوادِ اعظم کی عظیم اور مقتدر ثقافت ہے۔ اس وراثت کو بدنام کرنے کی شعوری کوشش برطانی عہد سے آج تک جاری ہے۔ تخلیق کاروں نے ابتدا کی مورّخوں نے نقادوں نے عیب جوئی میں سبقت لی۔ فلموں کے علاوہ چند سیریل کے نام لے سکتا ہوں جن میں شراب و شاہد سے اس تہذیب کو مختص کیا گیا ہے۔ مرزا غالبؔ جانِ عالم، کہکشاں زندہ مثالیں ہیں۔ حیرت ہے کہ سردار جعفری جیسے بزرگوں کا قلم بھی اس سیاہی میں آلودہ ہے۔ ڈاکٹر محمد صادق نے اپنی تاریخ میں لکھنؤ دبستان ادب کو عقیدہ اور ناز و نخرہ سے تعبیر کیا ہے۔

مثنویاتِ شوق کے سیاق میں خاں صاحب کا استشہاد جزوی طور پر قابلِ تسلیم ہوسکتا ہے۔ مگر اس کی کلیت کا اعتراف ممکن نہیں۔ دبستانوی تنقید نے ادبی تفہیم میں جو فساد پیدا کیا ہے اس کی مثال یہ مضمون بھی ہے۔ تخلیقی فعالیت کے سرچشمے جداگانہ ہوتے ہیں اور بے حد پُر اسرار۔ تخلیق نہ عصری میلان کے ماتحت ہوتی ہے اور نہ معاشرت کا بے کم و کاست اظہار۔ نتائج کا استخراج کا یہ طریقۂ کار غلط بھی ہے اور گم راہ کُن بھی۔ کیا جوش کی تحریروں کے پس منظر میں پورے معاشرے کو بوالہوس کہنا مناسب ہوگا؟ کیا درد کے صوفیانہ تصورات سے دہلی معاشرت کو سرتاپا تکشف میں مستغرق قرار دیا جاسکتا ہے۔ خواجہ حافظ اور ریاضی کی خمریات سے کیا نتیجہ اُخذ کیا جائے گا؟ اسی طرح مثنویات ہوں یا مرثیے، غزل ہو یا دوسرے اصناف ان کی تخلیق کو مخصوص معاشرے کا زائیدہ کہہ کر ہم انتقادی ذمہ داریوں سے سبک دوش نہیں ہو سکتے۔ طوائفیں معاشرے کے مزاج میں ہمیشہ داخل رہیں، جسے ہمیشہ معیوب سمجھا گیا اور معتوب بھی کیا گیا۔ ہاں رجحان کے بیش و کم پر گفتگو کی جاسکتی ہے۔

جناب نیّر مسعود نے خاں صاحب سے مناسب مطالعہ کیا ہے کہ تہذیبی مطالعہ کے تقاضے ذرا مختلف ہیں مگر جناب نیّر مسعود نے جارحیت میں خاں صاحب کی علمیت کو ابجد سے ناواقفیت قرار دیا ہے۔ ثقافتی مطالعے میں خود نیّر صاحب کی حرف شناسی بھی مشتبہ ہے۔ جب کہ مضمون کے پہلے پیراگراف میں انھوں نے خاں صاحب کو عہدِ حاضر کے سب سے بڑے محققوں میں شمار کیا ہے۔ اب رہا سوال مآخذ اور حوالوں کا جس پر مضمون نگار نے بڑا زورِ قلم صرف کیا ہے۔ ان کے مذکورہ مآخذ بھی شافی و کافی نہیں ہے، جسے آپ خاں صاحب کے منابع سے منحرف نظر آتے ہیں۔ علمی دیانت داری میں ہر قسم کی ادعائیت اور عصبیت ناپسندیدہ ہے۔ اور یہ بحث بھی سعی لاحاصل ہے۔

یہ بات کتنی مضحکہ خیز ہے کہ مصنف کی آرا اور ایما سے مطابقت رکھنے والے منابع ہی مستند ہوں باقی مسترد کیے جانے کے لائق۔ جناب نیّر مسعود نے خاں صاحب کی تائید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ تحقیق کی بنیاد پہلے سے ہی طے شدہ شبہات پر ہوگی تو سچائی تک رسائی مشکل ہوجائے گی۔ تحقیق کی اساس تلاشِ حق اور سچائی تک رسائی ہے۔ جس میں مطابقت نہیں ہوتی۔ آج کی سچائی کل غلط ہوسکتی ہے۔ انسانی تلاش و تجسس کا کارواں رواں دواں رہتا ہے اور یہ ایک بدیہی حقیقت ہے۔ جناب نیّر مسعود نے پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر خورشید الاسلام کی کاوشوں سے استناد کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا ہے کیوں کہ وہ محقق نہیں ہیں صرف نقاد ہیں۔ مگر ہیں دیانت دار۔ یہ بد مذاقی بھی خوب ہے کہ محقق مستند ہوتا ہے مگر دیانت نقاد حوالے کا موجب نہیں بن سکتا۔ حقیقت حال یہ کہ آج ادبی مطالعے میں سرور صاحب یا خورشید الاسلام صاحب جس کثرت سے نقل کیے جاتے ہیں وہ شرف نہ خاں صاحب کو ملا ہے اور نہ ہی نیّر مسعود صاحب کو حاصل ہے۔ ان کے کثرتِ مطالعہ اور وسعتِ نظر میں یہ حضرات پیچھے ہیں۔ نیّر صاحب لکھنوی معاشرت کے پروردہ سہی مگر ان کا ایک بھی مضمون خورشید صاحب کے امراو جان ادا کا حریف نہ بن سکا۔ شبلی کا بہ وجہ ذکر نہیں کرتا۔ پروفیسر محمد مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم کی خدمات کو لیجیے ان کی محققانہ حیثیت جو بھی ہو مگر ''ہماری شاعری'' اور تمثیل ادب پر ان کی تصانیف کو کتابِ حوالہ کا درجہ حاصل ہے جو یقیناً تحقیق محض نہیں ہیں۔ تخصیص یا تعین کوتاہ بینی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ خود نیّر مسعود صاحب افسانہ لکھتے ہیں۔ کیا افسانہ نگار ہونے کی وجہ سے ان کی تحقیقات کو بے اعتبار کہنا مناسب ہوگا؟ رہا مذہبی امور کا معاملہ، ان نازک اور نزاعی مسائل میں دونوں حضرات کو دخل دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان سے دور رہیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ ادب کی مذہبی یا مذہب کی ادبی تعبیر زیادہ مفید نہیں ہوسکتی۔ بل کہ ذہنی اختلاف کا زیادہ احتمال ہوگا۔

خاں صاحب نے شوق کے ساتھ ساتھ میر اثر اور مومن کی مثنویوں کو بھی معاشرت کے آئینہ داری کے لیے تمثال قرار دیا ہے۔ ان مثنوی نگاروں کے ذاتی اور انفرادی تخیلات کو معاشرت پر منطبق کرنے کا رویہ مستحسن نہیں ہے۔ مومن پر گفتگو کرتے وقت ان کی مثنوی جہاد کو بہ سہولت نظر انداز کر دیا جاتا ہے حالاں کہ اُردو میں ایک مقتدر شاعر کی یہ پہلی انقلابی نظم ہے۔ شاید اس باعث وہ ''آبِ حیات'' میں نظر انداز کیے گئے تھے۔ آخری حصے میں مضمون کے محرکات پر کالے اور سفید آقاؤں کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ تو معلوم نہیں کہ خاں صاحب نے کن آقاؤں کی خوش نودی کے لیے یہ مضمون لکھا۔ لیکن جناب نیّر مسعود نے اقرار کیا ہے کہ انھوں نے کچھ اپنے سرپرستوں کی تسکینِ نفس کے لیے ردِّ عمل کا اظہار کیا ہے۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ کم و بیش بہت سی باتوں کا ذکر اس سے پہلے خاں صاحب انتخابِ ناسخ اور انتخابِ مراثی کے مقدموں میں کر چکے ہیں مگر ان پر کسی تاثر کا اظہار نہیں کیا گیا تھا۔ دہلی میں یہ افواہ گرم ہے کہ خاں صاحب کو یوپی اُردو اکیڈمی کا اعزاز پیش کیے جانے پر بعض حلقے رنجیدہ ہیں۔

میرا معروضہ بس اتنا ہے کہ وہم، ثقافت کے روشن اور حیات بخش پہلوؤں کو عزم و ارادہ کا لافانی جذبہ متحرک کرتا ہے یہ دہلی یا لکھنؤ پر موقوف نہیں۔ سوادِ اعظم کا سبھی قریہ عظیم ولازوال تہذیبی آثار سے تاب ناک ہے۔ ان کی بازآفرینی ہمارے اجتماعی مقاصد میں نکتۂ پرکارِ حق کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کے حصول کے لیے قیل و قال کی یہ آویزش ممنوع ہے اور مہلک بھی۔

(ماہ نامہ ایوانِ اُردو، دہلی، ستمبر 1998، ص 14 تا 15)

(تبریک و تبصرے، پروفیسر عبدالحق، اشاعت 2012، صفحہ 150 تا 153)

○○○

لطیف صدیقی

مثنویاتِ شوق: ''لکھنوی معاشرت کے آئینے''

رشید حسن خاں صاحب کا مضمون ''مثنویاتِ شوق لکھنوی معاشرت کے آئینے میں'' (ایوانِ اُردو، اپریل 1998) میں پڑھا تھا اور اب ڈاکٹر نیّر مسعود صاحب کا خط'' بہ نام رشید حسن خاں '' (ایوانِ اُردو، جولائی 1998) نظر نواز ہوا۔

ڈاکٹر نیّر مسعود نے شرر اور نجم الغنی کے شواہد کو منفی قرار دیا ہے۔ یہ انھوں نے کس بنیاد پر کیا ہے اور منفی شواہد قرار دینے کا پیمانہ کیا ہے یہ واضح کرنے میں پروفیسر نیّر قاصر ہیں:

''قدیم لکھنؤ کی آخری بہار'' مرتب مرزا جعفر حسین صاحب کی تصنیف ہے۔ اس کتاب کے مقدمے میں مرزا صاحب نے تحریر کیا ہے ''میں نے بہر حال سماجی قیاسی واقعات پیش کرنے سے اجتناب کیا ہے البتہ بعض پُرانے واقعات ضمناً پیش کر دینا بھی ناگزیر تھا اس لیے ان کو معتبر روایات سے اخذ کر لیا۔ خدا کرے میری یہ کاوش اربابِ ذوق کو آسودگی فراہم کر سکے۔ آمین!''

560 صفحات کی کتاب (قدیم لکھنؤ کی آخری بہار) میں پانچواں باب طوائف بازی پر ہے۔ یہ باب 125 رصفحات پر مشتمل ہے۔ اس باب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں زنانِ خانگی، دوسرے حصے میں زنانِ بازاری اور تیسرے حصے میں ڈیرے دار طوائفوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ فرنگی محل، ندوۃ العلما، خاندان اجتہاد اور سلطان المدارس کو صرف 13 رصفحات میں ہی نپٹا دیا گیا ہے۔ اس سے یہ اندازہ تو کیا جا سکتا ہے کہ قدیم لکھنؤ کی تہذیب میں اہم کیا تھا اور غیر اہم کیا تھا؟ مرزا صاحب کے الفاظ میں:

''زنانِ خانگی کے بارے میں یہ روایت مشہور تھی کہ اس صنف کا کوئی وجود لکھنؤ کے باہر نہیں تھا۔ غدر کی تباہ کاریوں نے خواص اور عوام کے ہزار ہا گھر تباہ اور برباد کر دیے تھے اور بہت سے شرفا ناانِ شبینہ کو محتاج تھے۔ انھیں خانماں برباد لوگوں کے گھروں میں بہت سی عورتوں کو بھوک کی مصیبت سے تنگ ہو کر جسم فروشی پر آمادہ ہونا پڑا تھا۔ بعض شوخ چشم اور تیز مزاج مستورات پردے کے باہر نکل کر چھجّوں اور کوٹھوں پر آ بیٹھیں تھیں۔ لیکن بہت سی ایسی بھی تھیں جو بے نقاب ہونے کی جسارت نہ کر سکیں اور اندرونِ خانہ کسب کر کے اپنے خاندان کو روٹی فراہم کرتی تھیں۔ لیکن یہ کاروبار صیغۂ راز میں نہیں چل سکا۔ رفتہ رفتہ ان زنان خانگی کے ناموں کی شہرت بھی ہونے لگی، طبقاتی نظام کے دور میں ان کو بہت جلد ایک صنف کی حیثیت حاصل ہو گئی اور ان کے لیے ''خانگیوں'' کی اصلاح معرضِ وجود میں آ گئی، لکھنؤ کی معاشرت میں اس وقت ان کا ایک مقام تھا۔'' مرزا صاحب آگے لکھتے ہیں ''.....یہ ٹھکانے صرف ایسے من چلے شریف نوجوانوں کے کام آتے تھے جن کے پاس اپنے نفسیاتی جوش کو ٹھنڈا کرنے کے لیے خود گھروں میں علیحدہ جگہ نہیں ہوتی تھی۔''

زنان بازاری کے سلسلے میں مرزا صاحب یوں رقم طراز ہیں۔

''دوسرے مقامات کے مقابلے میں لکھنؤ کی زنان بازاری کی بہر حال یہ امتیازی شان تھی کہ وہ یہاں کی معاشرت سے متاثر ہو کر شائستگی اور شگفتگی سے آراستہ اور زبان و بیان کی خوبیوں سے پیراستہ ہو گئی تھیں اور جو کسی نہ کسی سبب سے ان طریقوں کو قبول نہ کر سکیں وہ متبذل قرار پا کر شرفا و عوام کی نگاہوں میں ناقابلِ توجہ رہیں اور ان میں پست اور بلند کی تفریق واضح طور پر ہو گئی تھی جس میں حُسن و جمال کے معیار کو بھی کوئی جگہ حاصل نہیں ہوئی۔ بلند درجہ والی رنڈیاں کہلاتی تھیں.....نئی ملاقات میں زیادہ دیر ٹھہرنے اور گفتگو کرنے کا

کوئی محل ہی نہیں ہوتا تھا اس لیے یا تو تعارف حاصل کر کے آنے والا رخصت ہو جاتا یا پھر اگر رغبت میں شدت ہوتی شب باشی کے معاملات پر افہام اور تفہیم کی باری آجاتی تھی۔ معاملہ طے ہو جاتا تو آنے والا وقتی طور سے حقوق ملکیت استعمال کرنے کا مجاز ہو جاتا تھا۔''

ڈیرے دار طوائفوں کے بارے میں مرزا صاحب کی فراہم کردہ معلومات یہ ہیں:

''ڈیرے دار طوائفیں اپنی صلاحیتوں کے سبب سے اور اپنے اطوار اور کردار کی بدولت مرتبت کی مالک تھیں... زینت محفل ہر طوائف تھی۔ آداب و شائستگی اور تہذیب و اخلاق سے ہر ایک مزین تھی۔ رؤسا و عمائدین کے درباروں میں ان کو رسوخ حاصل تھا اور بعض مقتدر ترین طوائفوں کو رؤسا کی محل سراؤں میں داخل ہو کر بیگمات کے حضور حاضر ہونے کی اجازت تھی۔ جنسی تعلقات میں ضرورت سے زیادہ محتاط تھیں۔''

مرزا صاحب کی رائے میں طوائفوں کے گھر تہذیب کی درس گاہ تھیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''رؤسا و شرفا حسن اخلاق کی تعلیم کے لیے اپنے بچوں کو ان طوائفوں کے گھروں میں بھیجا کرتے تھے۔ چودھرائن کا محل شرفا رؤسا کے لڑکوں کے لیے اچھا خاصا مکتب تھا......دوسری طرف انھوں نے اپنی ہنرمندانہ صلاحیتوں اور اپنے فن کارانہ سلیقوں سے نہ صرف اپنے پرستاروں بل کہ معاشرے کے ہر شعبے کو متاثر کیا تھا۔ انھیں طوائفوں کی صحبتوں میں ادیبوں اور شاعروں کو نازک خیالیاں آتی تھیں۔ معدودے چند متقی اور متشرع شاعروں کے..... باقی تمام موزوں طبع حضرات نیز بلند پایہ شعرا کسی نہ کسی ڈیرہ دار طوائف سے دوستانہ روابط رکھتے تھے۔''

حکیم متے خاں آغا فاضل کے حوالے سے مرزا صاحب لکھتے ہیں:

''زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کرنے کے لیے رنڈی بازی سے سلیقہ آتا ہے۔'' مزید ملاحظہ ہو۔ ''رؤسا عمائدین کے ساتھ ہم سابقہ طوائفوں کے بھی شکر گزار ہیں جن کے چھوڑے ہوئے اثرات کی بدولت ہمارے شہر میں فرقہ وارانہ فسادات بھی نہیں ہوئے۔''

مرزا صاحب کے مطابق شہر میں فرقہ وارانہ فسادات نہ ہونا طوائفوں کے اثرات کی وجہ سے ہے لیکن John Premble نے The Raj,The Indian Mutiny And The Kingdom Of Oudh میں لکھا ہے۔

"IN 1828 THERE WAS PARTICULARLY SERIOUS CONFLICT BETWEEN MEMBERS OF NINE WOUNDED,AND AS A RESULT THE RIVAL SECTS.SIX PEOPLE WERE KILLED AND THE KING(NASIRUDDIN HAIDER)ORDERED THE HOUSES OF THE OFFENDING SUNNIS TO BE PLUNDERED AND DE-STROYED."

نیّر صاحب مولانا عبدالحلیم شرر سے کچھ زیادہ ہی ناراض ہیں لیکن اس عاشقِ لکھنؤ کو مرزا جعفر حسین نے عقیدت کا خراج ان لفظوں میں پیش کیا ہے:

''خداوندِ عالم جزائے خیر دے مولانا عبدالحلیم شرر کو جن کی مساعی جمیلہ کی بدولت ان کی گراں قدر تصنیف 'گذشتہ لکھنؤ' میں ہم کو اپنے اسلاف کی معاشرت کے بارے میں بہت کچھ معلومات حاصل ہو جاتے ہیں۔''

مرزا صاحب نے منفی شواہد کی نشان دہی نہیں کی ہے۔ 1975 میں ELEK BOOK LTD. نے گذشتہ لکھنؤ کا انگریزی ترجمہ شائع کیا۔ ترجمہ مسٹر ہارکورٹ اور مسٹر فاخر حسین نے کیا ہے۔ اس کا سستا اڈیشن 1989 میں آکسفورڈ انڈیا نے شائع کیا ہے۔ مسٹر فاخر حسین لکھنوی ہیں۔ مترجمین کی رائے میں:

"THE WORK (LUCKNOW,THE LAST PHASE OF AN ORINETAL CULTURE)HAS BEEN RECOGNISED BY INDO-ISLAMIC SCHOLARS AS A PRIMARY COURCE OF GREAT VALUE,A UNIQUE DOCUMENT,BOTH ALIVE AND AUTHENTIC IN EVERY DETAIL, OF AN IMPORTANT INDIAN CULTURE AT ITS ZENITH."

رشید حسن خاں صاحب نے اس کتاب (گذشتہ لکھنؤ) سے جو حوالے دیے ہیں وہ ڈاکٹر نیّر مسعود کی نظر میں منفی شواہد ہیں۔ لیکن انگریزی زبان کے مترجمین نے اس کتاب میں منفی شواہد کی نشان دہی نہیں کی ہے۔ رشید حسن خاں کے نام ڈاکٹر نیّر مسعود کا خط صالح تحریر نہ ہو کر ان طعنوں کا نتیجہ ہے جو ان پر پڑ رہے تھے۔ غالبًا طعنے دینے والوں میں خود اتنی جرأت نہیں ہے کہ وہ کھل کر سامنے آتے۔ یہ حلقہ تو اس وقت سے خاں صاحب کے خلاف محاذ آرائی کر رہا ہے جب سے ان کو اُردو خدمت کے صلے میں اُتّر پردیش اُردو اکادمی کا بڑا انعام ملا ہے۔

لکھنؤ میں مردوں کے بھی جسم فروشی کے اڈّے تھے۔ ہماری تہذیب کا یہ تاریک پہلو ہے۔ جان پمبل کے مطابق:

"THE EXISTENCE OF MALE BROTHELS IS CONFORMED BY THE LUCKNOW HOSPITAL REPORT FOR 1848-49 WICH NOTICES THE CASES OF VENERAL DISEASE PROCEEDING;AS DR LECKIE DELICATELY PUT IT, FROM OTHER THAN THE IRREGULATIES OF FEMALE PROSTITUION THESE PRACTICES HAD BEEN MADE FASHIONABLE BY THE NAWAB ASAF -UD-DAULA,A NOTORIOUS CATAMITE-"(P.23-THE

RAJ,THE MUTINY AND THE KINGDOM OF OUDH,1801-1859)

22۔ناسخ لین،وکٹوریہ اسٹریٹ،لکھنؤ

(ماہ نامہ ایوانِ اُردو،ستمبر 1998 صفحہ 16 تا 17)

ooo

پروفیسر گیان چند جین

خدائے تدوین کا چوتھا صحیفہ: مثنویاتِ شوق

یہ بلاخوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ رشید حسن خاں اُردو کے خدائے تدوین ہیں۔''فسانۂ عجائب''،''باغ و بہار''،''اور مثنوی ''گلزارِ نسیم'' کے بعد اُن کا چوتھا شاہ کار''مثنویاتِ شوق'' 1998 میں انجمن ترقی اُردو (ہند) نے شائع کیا۔اسے بابائے اُردو مولوی عبدالحق سیریز نمبر 4 کہا گیا ہے۔اس سیریز کی پہلی تین کتابیں کون سی ہیں مجھے معلوم نہیں۔تدوین کے اس کارنامے کو مولوی عبدالحق سیریز کیوں کہا گیا،اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔مولوی صاحب نے بلاشبہ اُردو کی غیر معمولی خدمات کیں۔قدیم ادب کی متعدد کتابوں کو ترتیب دیا لیکن ان میں کوئی بھی کام غیر معمولی نہیں۔رشید حسن خاں کے معیار کی کوئی تدوین ہے تو وہ دیوانِ غالب نسخۂ عرشی ہے۔اس سیریز کو مولانا عرشی سے معنون کیا جاتا تو بہتر ہوتا لیکن حقیقت سے آنکھیں چار کرنے میں تامل کیوں؟اس سیریز کو سیدھا سادہ رشید حسن خاں سیریز کہا جاتا تو ایک حقیقتِ جلی کا اعتراف ہوتا:''مثنویاتِ شوق'' کے مختصر تعارف میں ڈاکٹر خلیق انجم کہتے ہیں:

> ''متنی تنقید پر میری تھوڑی بہت نظر ہے،اس لیے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اُردو میں رشید حسن خاں کے پایے کا کوئی اور متنی نقاد ابھی تک پیدا نہیں ہوا.....وہ متن کا جس طرح تنقیدی اڈیشن تیار کرتے ہیں وہ کوئی اور نہیں کرسکتا۔''

مجھے اس فیصلے سے کامل اتفاق ہے،اتفاق نہیں ہے تو اُن کی اصطلاحوں:متنی تنقید،متنی نقاد اور تنقیدی اڈیشن سے۔آپ چاہیں نہ چاہیں اُردو میں تحقیق اور تنقید میں فرق کیا جاتا ہے۔کیا ضروری ہے کہ انگریزی اصطلاح Textual Criticism کا لفظی ترجمہ متنی تنقید کیا جائے،اسے تدوینِ متن اور یہ کام کرنے والے کو مدونِ متن کہنا چاہیے۔تنقیدی اڈیشن کو تحقیقی اڈیشن کہا جائے تو صحیح تر ہوگا۔میں نے ایک یونی ورسٹی میں امتحان کے ایک پرچے کو موڈریٹ کرتے ہوئے دیکھا کہ ممتحن نے سوال کیا تھا''ذیل کی عبارت کی (یا شاید اشعار کی) متنی تنقید کیجیے''۔یہ نتیجہ ہے غلط اصطلاح ڈھالنے کی۔

رشید حسن خاں کے جملہ تدوینی کام مولانا عرشی کی تدوینات سے بھی بھاری ہیں۔میرا خیال ہے کہ مستقبل میں بہت عرصے تک خاں صاحب کے پایے کا دوسرا مدوّن سامنے نہ آسکے گا۔اسی لیے میں انھیں خدائے تدوین کہتا ہوں،کوئی آزردہ ہوتو ہوا کرے۔

رشید حسن خاں کلاسیکی علوم کے ماہر ہیں۔اُن کے پہلے تین کارناموں کے بعد چوتھے کام کے لیے''مثنویاتِ شوق'' کے انتخاب کی اطلاع پاکر میں سوچتا تھا کہ خاں صاحب نے غلط انتخاب کیا۔ان کے جیسے علم و فضل والے عالم کے لیے شوق کی مثنویاں ہلکی ہیں۔ان میں تدوین کے جوہر دکھانے کا کہاں موقع ہے۔لیکن کہتے ہیں کہ استاد کاریگر کے ہاتھ میں جو بھی خام مادّہ آجائے وہ اپنی چابک دستی سے اُس کو شاہ کار بنادیتا ہے۔''مثنویاتِ شوق'' کی تدوین کو دیکھ کر اس پر ایمان لانا پڑتا ہے۔میرے پاس وہ علم نہیں کہ میں اس تدوین کا تنقیدی تجزیہ کرسکوں۔اس کے محض تعارف پر اکتفا کروں گا۔

انھوں نے تین مثنویوں:'فریبِ عشق'،'بہارِ عشق' اور 'زہرِ عشق' کے متن سے پہلے 156 صفحوں کا عالمانہ مقدمہ لکھا ہے۔متن کے بعد 142 صفحات کے چار ضمیمے اور ایک فرہنگ ہے۔مقدمے میں پندرہ ذیلی عنوانات ہیں۔پہلا عنوان ہے'تمہید' جو مثنویوں کے تہذیبی اور ادبی پس منظر میں مشتمل ہے۔جو لوگ خاں صاحب کو محض محقق سمجھتے ہیں وہ اس تمہید کی گل گشت کریں تو ان کی تنقیدی نظر کے قائل ہو جائیں گے۔محض تیرہ صفحوں میں حق ادا کردیا ہے۔اس کے بعد حالاتِ زندگی ہیں۔چوں کہ شوق کے حالات تفصیل سے نہیں ملتے اور رشید حسن خاں صرف مستند بات ہی کرتے ہیں اس لیے انھوں نے شوق پر لکھنے والوں کے بیانات اور جملہ روایتوں کو چھانا پھٹکا اور سب ضروری باتیں سات آٹھ صفحوں میں لکھ دیں۔

اگلا عنوان''مثنویاتِ شوق کی تعداد'' ہے،جس میں جملہ مثنویات کا جائزہ لے کر الحاقات کو رد کیا ہے۔ان بے بنیاد انتسابات کے راوی ہمارے بعض زعمائے ادب ہیں۔یہ عام طور پر مانا جاتا ہے کہ شوق نے محض تین مثنویاں لکھیں:'فریبِ عشق'،'بہارِ عشق' اور 'زہرِ عشق'۔رشید حسن خاں بھی اس نتیجے پر پہنچتے ہیں۔اس کے بعد مقدمے کا نہایت اہم حصہ آتا ہے''مثنویات کا زمانۂ تصنیف''۔یہاں رشید حسن خاں کے تحقیقی جوہر کھلتے ہیں۔انھوں نے بطورِ خاص تین پیش رو مورخوں کے بیانات کا تجزیہ کیا ہے:

1۔عطاء اللہ پالوی کا 'تذکرۂ شوق'۔

2۔ڈاکٹر شاہ عبدالسلام کی کتاب 'دبستانِ آتش' نیز کلیاتِ شوق۔

3۔ڈاکٹر سید محمود حیدر کا تحقیقی مقالہ 'حیاتِ شوق' (1991)

پالوی صاحب نے لکھا تھا کہ 'فریبِ عشق' شوق کی پہلی مثنوی ہونی چاہیے کیوں کہ اس میں شوق نے اپنے لڑکپن کا ذکر کیا ہے۔خاں صاحب نے دکھایا کہ پالوی صاحب کے مطابق شوق 1197ھ میں پیدا ہوئے اور 'فریبِ عشق' 1263ھ میں لکھی گئی۔اس کے معنی یہ ہی کہ اس وقت شوق کی عمر 66 برس کی تھی جسے لڑکپن نہیں کہا جاسکتا۔اس سلسلے میں انھوں نے مجنوں گورکھپوری کے بارے میں بڑے مزے کی بات

کہی ہے:

''مجنوں صاحب کے رومان زدہ مزاج کو تحقیق کی مشکل پسندی سے دور کی بھی مناسبت نہیں تھی''۔(ص43)

میں نے ''بہارِ عشق'' کی طبعِ اوّل 1266ھ کی ایک نثر خاتمہ کی بنا پر لکھا تھا:

''چوں کہ یہ مثنوی ایک ذی اقتدار نواب کی فرمائش پر لکھی گئی اور شائع کی گئی، کوئی وجہ نہیں کہ تصنیف کے بعد طباعت میں دیر ہوئی ہو، اس لیے اس کی تاریخ 1266ھ تسلیم کی جاسکتی ہے''۔

(اُردو مثنوی شمالی ہند میں، جلد دوم، ص120)

اب دیکھیے کہ تحقیق میں جزم واحتیاط کسے کہتے ہیں۔ خاں صاحب کا موقف ہے:

''جین صاحب کی بات قرینِ قیاس تو ہے، دل کو لگتی ہوئی بھی معلوم بھی ہوتی ہے، مگر اس قیاس کو حتمی حیثیت نہیں دی جاسکتی یعنی قطعیت کے ساتھ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کی تصنیف اور طباعت کا درمیانی وقفہ کتنا تھا''۔(ص45)

ویسے وہ عام طور سے میرے بیانات سے اتفاق کرنے پر مائل ہیں۔'بہارِ عشق' کی تاریخ صفر 1263ھ (جلوسِ واجد علی شاہ) اور شوال کے بیچ طے کی ہے۔ شوق کے مقالہ ڈاکٹر حیدر کے بیانات کی انھوں نے بڑی کھینچائی کی ہے۔ حیدر نے دعوا کیا تھا کہ شوق کی تینوں مثنویاں نصیر الدین حیدر کے عہد کی ہیں۔'بہارِ عشق' میں واجد علی شاہ کی مدح کے اشعار کے لیے انھوں نے مفروضہ پیش کیا:

''بہت ممکن ہے کہ واجد علی شاہ سے متعلق تمام اشعار بعد میں ضرورتاً یا مصلحتاً جوڑ دیے گئے ہیں''

ایسے بیان پر رشید حسن خاں جیسے سخت گیر محقق کے ردِ عمل کا قیاس کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر حیدر کے دلائل کے پرخچے اُڑا دیے ہیں۔ تینوں مثنویوں کی تاریخ تصنیف کے بیانات میں 'زہرِ عشق' کی بحث شاہ کار ہے۔ میں نے اپنی کتاب 'اُردو مثنوی شمالی ہند میں' میں لکھا تھا کہ 'زہرِ عشق' کا مادۂ تاریخ 'غم دل ربا' ہے جسے سب سے پہلے سر راس مسعود نے 'انتخابِ زرّیں' میں درج کیا۔ عشرت رحمانی نے دیباچۂ زہرِ عشق میں ذاکر بدایونی کا پورا قطعہ درج کر دیا جس میں یہ مادّہ نظم کیا گیا ہے۔ میں رشید حسن خاں کی طرح جستجو کہاں کرتا ہوں۔ انھوں نے بتایا کہ راس مسعود اور عشرت رحمانی دونوں نے اپنے ماخذ کو چھپا کر یہ تاثر دیا جیسے یہ ان کی دریافت ہے۔ دراصل یہ سب نظامی بدایونی کے دیباچۂ 'زہرِ عشق'، (1919) سے لیا گیا ہے۔ رشید حسن خاں ایک ایک جملے اور فقرے پر وکیل کی طرح بحث کر کے محتاط ترین نتیجہ نکالتے ہیں۔ انھوں نے اطلاع دی کہ اب تک کی معلومات کے مطابق اس مثنوی کا قدیم ترین اڈیشن مطبع شعلۂ طور، کان پور کا جنوری 1862 کا ہے، 1277ھ مطابق ہے 61-1860 کے۔ وہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ قیاساً کہا جاسکتا ہے کہ اس کا زمانۂ تصنیف 1277ھ ہی ہوگا۔

مثنویات کی تاریخ کے بعد اگلا عنوان ہے ''منعِ اشاعت''۔ پورے مقدمے میں تحقیق کے شاہ کار یہی وہ بیانات ہیں۔ امتناعِ اشاعت کے بارے میں انھوں نے جملہ روایات کا اس عمیق نظر سے جائزہ لیا ہے جیسے کوئی شرلاک ہومز یدچھان بین کرے۔ خاں صاحب کے تجزیے سے یہ بھی درس ملتا ہے کہ کسی سنی سنائی روایات کا کس طرح تجزیہ کرنا چاہیے۔ ص65 تا87 کو محیط اس جائزے میں انھوں نے متعدد ایسی روایتوں اور بیانات کی نشان دہی کی ہے جن سے میں واقف نہ تھا۔ مثلاً سر رضا علی کا 'اعمال نامہ' (دسمبر 1943) امیر احمد علوی کی 'مثنویات' (دسمبر 1943)، نظامی بدایونی کا نسخۂ 'زہرِ عشق' (1919) جس میں انھوں نے 1919 کے ایک گورنمنٹ آرڈر کا حوالہ دیا ہے۔ ڈاکٹر اکبر حیدری کی روایت کہ 'زہرِ عشق' میں میر مونس کی داستان محبت کو بیان کیا ہے۔ (1989) ڈاکٹر اظہر فاروقی کی روایت، ضیا فتح آبادی شاگردِ سیماب کی روایت وغیرہ۔ روایتوں کو پرکھنے کے لیے خاں صاحب کے حسبِ ذیل مشاہدے کو تحقیق کے اصولوں میں جگہ دینی چاہیے:

''میں یہاں ایک بات پر خاص کر زور دینا چاہتا ہوں۔ مثنوی گلزارِ نسیم کی تدوین کے دوران اس سے متعلق زبانی روایتیں میرے سامنے آئیں، مثلاً یہ لکھا گیا کہ میں نے بزرگوں سے سنا ہے، یا کہ فلاں صاحب کے بھائی، شاگرد یا داماد نے خود مجھ سے کہا تھا یا میرے سامنے یہ بیان تھا، جائزہ لینے پر معلوم ہوا کہ ایسی سبھی روایتیں خانہ ساز تھیں۔ ایسی روایتوں کو بیان کرنے والے کون تھے؟ مولانا عبدالحلیم شررؔ اور پنڈت برج نرائن چکبست جیسے لکھنؤ کے محترم حضرات تھے، خصوصاً آخر الذکر۔ تب سے میں زبانی روایتوں کے سلسلے میں پہلے سے زیادہ محتاط ہو گیا ہوں، خاص کر ایسی روایتیں جن پر کسی واقعے کے ہونے یا نہ ہونے کا دارومدار ہو۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ روایت کہ کچھ اصل تو ہے، لیکن نقل روایت کے نتیجے میں اس کا چہرہ مہرہ بدل گیا ہے یا بگڑ گیا ہے''۔(ص77-76)

اگر میری زندگی میں میری کتاب 'تحقیق کا فن' کا نیا اڈیشن نکلا تو میں ان کے مشاہدے کو رہنما اصولوں میں ضم کر کے درج کروں گا۔ ان کا یہ مشاہدہ بھی گرہ میں باندھ رکھنے کے قابل ہے:

''یہ بات ہمارے سامنے رہنا چاہیے کہ ہمارے بہت سے معروف اہلِ قلم تحقیقی مزاج نہیں رکھتے تھے، اس لیے ایسے اقوال پر نہ تو تعجب ہونا چاہیے اور نہ انھیں لازماً قابلِ قبول سمجھنا چاہیے۔ جو حضرات اپنے آپ کو نقاد کہتے ہیں ان میں سے بیش تر کے مزاج کو تحقیق سے دور کی مناسبت بھی نہیں ہوتی، اس لیے وہ دلکھتے چلے جاتے ہیں۔ ایسے حضرات کو یہ معلوم ہوتا ہوگا کہ کیا لکھنا ہے، لیکن عموماً یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کیا نہیں لکھنا ہے''۔(ص86-85)

مقدمے کے امتناعِ اشاعت والے تجزیے کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔

اگلا جزو مطبوعہ نسخے ہے جس میں تینوں مثنویوں کے قدیم ترین اور اہم اڈیشنوں کی تفصیل ہے۔ یہ یاد رہے کہ رشید حسن خاں جس متن کو مرتب کرتے ہیں اس کے تمام اہم مخطوطوں اور مطبوعہ اڈیشنوں کو فراہم کر کے کام کرتے ہیں، ایسے ایسے اڈیشن کہ میں نے انھیں کبھی نہیں دیکھا سنا بھی نہیں ہے۔ رشید حسن خاں نے واضح کیا کہ 'مثنویاتِ شوق' کا کوئی اہم خطی نسخہ نہیں ملتا، تمام مفید نسخے مطبوعہ ہیں۔ انھوں نے ان کی تمام تفصیل دیتے ہوئے بعض اڈیشنوں کے اہم ترقیمے بھی نقل کر دیے ہیں۔ مثلاً 'بہارِ عشق' کا مطبع محمدی لکھنؤ کا 1268ھ کا اڈیشن جو مصنف کی نظرِ ثانی کے بعد چھپا۔ اس کی نثر خاتمہ میں یہ اہم اطلاع دی ہے:

''(مصنف نے) حسبِ استدعائے بعضے داستان لطیف کچھ خیال انجام اندیشی کر دنیائے فانی کو ناچیز سمجھ کر اصل حقیقت کو بیان کیا تا کہ عارفان صافی دل اس کو ملاحظہ کر کے لذتِ

حسنِ حقیقی اٹھادیں۔ لہٰذا دوبارہ بحرِ تفکر میں غواصی کر کے اس درِ شاہوار اور گوہر آبدار کو رشتۂ نظم میں منسلک کیا اور 'بہارِ عشق' صادق نام رکھا۔''

انگریزی کہاوت ہے کہ وطن پرستی ہر بدمعاش (Scoundrel) کی آخری پناہ گاہ ہے۔ ہندوستان میں کہنا چاہیے کہ دین داری ہر اوباش کی پناہ گاہ ہے۔ شوق 'بہارِ عشق' میں بہت کھُل کر کھیلے۔ جب ان پر زمانے کی پھٹکار پڑی تو گھبرا کر عشقِ صادق کے اشعار کا اضافہ کر کے معلم العارفین بن گئے۔ کام کی بات یہ ہے کہ نئے جنم میں انھوں نے مثنوی کا نام 'بہارِ عشق صادق' رکھ دیا۔ حیرت ہے کہ فاضل مرتّب نے اس نکتے پر کوئی توجہ نہیں کی۔ وہ اطلاع دیتے ہیں کہ 1268 اڈیشن مصنف کی نظر سے گزرا آخری اڈیشن ہے۔ اگر اس میں بہارِ عشق کا نام بدل کر 'بہارِ عشق حقیقی' رکھ دیا ہے تو اسی کو مستند نام مان کر مثنوی کا یہی نام زیبِ عنوان کرنا چاہیے۔

گارساں دتاسی نے اپنے اٹھارویں خطبے میں 'زہرِ عشق' کے نسخے کے موصول ہونے کا ذکر کیا ہے۔ معلوم نہیں کیوں عطاء اللہ پالوی نے اپنی طرف سے نسخے کو 1862 کو چھپا ہوا کہہ دیا، شاہ عبدالسلام نے بغیر حوالے کے اسی بیان کو نقل کر دیا۔ خاں صاحب نے اصل خطبے میں دیکھا تو کسی سنہ کا اندراج نہیں (ص 101)۔ خاں صاحب نے 'زہرِ عشق' کے قدیم ترین دستیاب اڈیشن کو حاصل کیا لیکن فرطِ احتیاط سے اسے طبعِ اول کہنے سے پرہیز کیا۔ تینوں مثنویوں کے قدیم اڈیشنوں کی تلاش میں انھوں نے کیا کیا پاپڑ بیلے، کن کن کنوؤں میں بانس ڈالے، ان کی تفصیل دوسرے تحقیق کاروں کے سامنے تلاشِ مواد کا مثالی نمونہ پیش کرتی ہے۔

اگلا جزو ''ذیلی عنوانات'' ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ تینوں مثنویوں میں سے کسی مثنوی کے کسی معتبر نسخے میں کوئی ذیلی عنوان نہیں بجز بہارِ عشق کے 'ترغیبِ عشق حقیقی' کے، اس لیے بعد والوں کے یہ اضافے قابلِ قبول نہیں۔ ہیروئنوں کے نام کے عنوان کے تحت فاضل مرتب نے واضح کیا ہے کہ ان کے جو نام مشہور ہیں در اصل وہ ان کی صفت ہیں، علم کے طور پر نام نہیں۔ دو عنوانات میں اشعار کی کمی بیشی اور تکرار کی نشان دہی کی ہے۔ 'مثنویاتِ شوق کے مآخذ' کے تحت انھوں نے میرے ایک بیان کے پیشِ نظر یہ تو مانا ہے کہ واجد علی شاہ کی مثنوی 'بحرالفت' اور شوق کی 'بہارِ عشق' میں کئی اشعار اس حد تک مماثل ہیں کہ ایک نے دوسرے سے فائدہ اُٹھایا ہے لیکن مرتّب اس امر میں تذبذب ہیں کہ واجد علی شاہ نے یہ مثنوی شوق سے پہلے لکھی تھی کہ بعد میں (ص 127): اس سے آگے انھوں نے دو عنوانات کو ایک ساتھ لیا ہے: الف: کیا یہ مثنویاں شوق کی سرگذشت ہیں۔ ب: وجہِ تصنیف

''انھوں نے یہ درست نتیجہ نکالا ہے کہ یہ شوق کی سرگذشت نہیں۔ انھوں نے 'بہارِ عشق' کے بارے میں یہ نادر نکتہ دریافت کیا کہ 'بہارِ عشق' میں جس خاتون سے انھوں نے زنا بالجبر کیا ، بعد میں اسی سے شادی کی۔ ''نواب مرزا شوق ہوں یا ویسا ہی کوئی دوسرا شخص، اس کا اعلان کرنا کبھی پسند نہیں کرے گا کہ اس کی بیوی وہی ہے جس کے ساتھ زنا بالجبر کیا جا چکا ہے۔'' (ص 135)

واقعی حیرت ہے کہ اس پہلو پر میرا یا کسی دوسرے کا دھیان نہیں گیا۔ انھوں نے نتیجہ نکالا ہے کہ ''شاعر کا اصل مقصد صرف خواتین کی زبان و بیان کی بہار دکھانا تھا۔

اُردو محققوں میں خود رشید حسن خاں زبان و بیان کی جو بہار دکھاتے ہیں ویسا کسی دوسرے سے نہ ہو سکا۔ ایک مثال:

''یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ شوؔق نے یہ مثنویاں لکھنوی معاشرے کی اصلاح کے لیے لکھی تھیں۔ شوؔق اگر زندہ ہوتے اور ان پر یہ الزام لگایا جاتا تو مجھے یقین ہے کہ وہ ازالۂ حیثیت عرفی کا مقدمہ ضرور دائر کر دیتے۔ وہ اس طبقۂ اشرافیہ کے ایک فرد تھے جو ایسے جلسوں کو اور ایسی لطف اندوزیوں کو اور ایسی جنسی کامیابیوں کو تہذیبی زندگی کا جز مانتا تھا..... راہِ نجات لکھنے والے اور فریبِ عشق اور بہارِ عشق لکھنے والے الگ الگ راہوں کے راہی ہوتے ہیں''۔ (ص 146)

ہیروئن کے منہ میں زبان رکھنے کی بات سے کہیں قاری کے منہ میں پانی نہ بھر آئے۔ اس سے قطع نظر انھوں نے زندگی کے فنا پذیر ہونے کے اشعار درج کیے ہیں جو ''ایک الھڑ لڑکی کی زبان نہیں، یہ شوق کی آواز ہے۔''

مقدمے کا آخری عنوان ''طریق کار'' موجودہ متن کے اڈیشن کی پیش کش کے بارے میں ہے۔ انھوں نے یہ بہت اچھا کیا کہ مثنویوں کے اشعار پر مسلسل نمبر شمار ڈال دیے جس سے حوالہ دینے میں بہت آسانی ہو گئی۔ لیکن انھوں نے عرشی صاحب کی طرح مختلف اڈیشنوں کے لیے جو حرفی مخففات طے کیے ہیں، ان سے مجھے وحشت ہوتی ہے۔ اگر وہ اس کے بجائے یک لفظی اشارہ طے کر لیتے تو ذہن کی اس طرف آسانی سے رسائی ہو جاتی یعنی مطبع کے نام کا ابتدائی حرف ف، س، م وغیرہ لکھنے کے بجائے پورا لفظ فیضی، سلطان، محمدی لکھا جاتا تو لفظی تصویر سامنے آ جاتی۔

انھوں نے اس مقدمے میں بہت سے اہم مطالب فٹ نوٹ میں دیے ہیں۔ میرے نزدیک ہر اہم تبصرہ متن میں آنا چاہیے، یہ نہیں کہ کچھ متن میں لکھ دیا اور اسی سے متعلق، اتنی ہی اہم بات حاشیے میں ٹانک دی۔ حاشیے کا استعمال حوالے کے علاوہ کم سے کم کرنا چاہیے۔

آگے متن ہے جو زیادہ سے زیادہ معتبر اور صحیح ہے۔ اس فن پر خاں صاحب کے برابر کس کو دسترس ہو گی؟ متن کے بعد کے ضمیمے معلومات کے ایسے گنجینے ہیں کہ میں ان کی تفصیلات میں نہ جا کر صرف ان کا موضوع درج کرنے پر اکتفا کروں گا۔ پہلا ضمیمہ تشریحات ہے، دوسرا تلفظ، تیسرا اختلافِ نسخ، چوتھا الفاظ اور طریقِ استعمال۔ آخری جز و فرہنگ ہے۔ ان سب کو دیکھ کر مرتب کے غیر معمولی علم و فضل اور ان کی وسعتِ مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ کہیں کہیں ان سے اختلاف کرنا بھی ممکن ہے، مثلاً:

1۔ وہ رشک کے لغت کا نام 'نفس اللغۃ' لکھتے ہیں (ص 309، 310)۔ اس کا نام تاریخی ہے جو 'نفس اللغۃ' ہے۔ اس سے تاریخ تصنیف 1256ھ برآمد ہوتی ہے۔ اگر آخری حرف کو ت لکھا جائے تو 1251ھ تاریخ نکلے گی جو صحیح نہیں۔ ویسے انھوں نے اس لغت کے بارے میں بہت بیش بہا معلومات دی ہیں۔

2۔ 1223 ناک میں دم ہے، اشک باری ہے زندگانی سے جان آری ہے (ص 237)۔ اس کے لفظ 'آری' کا حاشیہ ص 12۔ 311 پر ہے اس میں خبر دیتے ہیں کہ دو اور اشعار میں 'عاری' آیا ہے۔ وہاں سب مستند نسخوں میں 'عاری' ملتا ہے اس لیے وہی لکھا۔ موجودہ شعر میں 'آری' ملتا ہے اس لیے اس املا سے لکھا۔ اس کے بعد وہ امیر مینائی کے خط کا اقتباس دیتے ہیں:

''آری میرے نزدیک ہندی ہے اس لیے کہ 'عاری' زط و تنگ و عاجز کے معنوں میں فارسی عربی میں کہیں نظر سے نہیں گزرا۔ ہندی میں تو عین سے لکھنا خلافِ اصول ہے۔ ہندی میں 'عین' کہاں''۔ (ص 311)

اس لفظ کے سلسلے میں خاں صاحب نے تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے لیکن میں ان سے اور امیر مینائی سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ اُردو میں عربی کے متعدد الفاظ ان معنوں میں استعمال ہوتے ہیں جو عربی کے لیے اجنبی ہوں گے۔ مثلاً عرصہ، عربی میں بہ معنی میدان، اُردو میں مدّت، عربی صلوات عربی میں بہ معنی نماز اُردو میں بہ معنی گالی۔ کیا ہم ان سب کو ہندی کے پلے منڈھ کر 'ارسا'، 'سلوات' لکھیں گے۔ عاجز کے معنی میں 'آری' کوئی ہندی لفظ نہیں، اس املا کے ساتھ ایک مہمل لفظ ہے۔ مختلف لغات، امیر مینائی کے مشاہدے اور نسخوں میں 'آری' لکھا ہونے کے باوجود میں اصرار کروں گا کہ اس شعر میں 'عاری' ہی لکھا جائے۔

ایک تحقیقی کتاب میں اشاریے اور کتابیات کی بھی توقع کی جاتی ہے۔ اگر اشاریہ بنانا بار ہوتا تو کم از کم کتابیات تو ضروری تھی۔

آخر میں یہی کہوں گا کہ رشید حسن خاں کی ان تدوینات کو دیکھ کر یہی خواہش ہوتی ہے کہ وہ صحت کے ساتھ عمر دراز پائیں تا کہ اُردو کا دامن مالا مال کرتے رہیں۔ ان کی طبیعت ماندی رہتی ہے، اس کے باوجود جس تن دہی کے ساتھ کام میں لگے رہتے ہیں وہ قابلِ تعریف و قابلِ تقلید ہے۔

(ماہ نامہ 'کتاب نما' شمارہ، 9 جلد 38، صفحہ 27 تا 24، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ستمبر 1998)

(سہ ماہی ترسیل بمبئی، گوشۂ رشید حسن خاں، مشترک شمارہ 21۔22 جنوری تا جون 1999، صفحہ 29 تا 35)

ooo

شان الحق حقی

(کراچی)

اُردو میں اصولِ تدوین کا مجدّد

ترقی، معیار کی بلندی سے عبارت ہے۔ چناں چہ دنیا میں ہر طرف معیار پر توجہ دی جا رہی ہے۔ اس لحاظ سے اُردو مطبوعات پر نظر کیجیے تو یہ ابھی تک دور دراز کا کیا ذکر اپنے گرد و پیش کے معیارات سے بھی پیچھے ہیں۔ سب سے پہلے تو معیار کی پستی کا احساس پیدا ہونا چاہیے جو ابھی تک نہیں ہوا۔ ہم کچے پکے کام اور کام چلاؤ چیز کو کافی سمجھتے ہیں۔ ایک نئے جریدے کا پہلا پرچہ میرے پاس آیا تو میں نے اسے اول سے آخر سے تک پڑھ کر کوئی ڈیڑھ سو اصلاح طلب مقامات کی نشان دہی کی۔ ان میں ہر طرح کی چھوٹی بڑی فرو گذاشتیں شامل تھیں جن کا ایک ذمہ دار ادارے کو خیال رکھنا چاہیے اور آج کل کی صحافت میں ہرگز برداشت نہیں کی جاتیں۔ مثلاً صفحوں کے نمبر غلط ہوں، فہرست میں کچھ ہو اندر کچھ اور۔ کہیں کی عبارت کہیں چپکا دی جائے، اوقاف یکسر متروک ہوں۔ ادارے نے میرا خط بڑے شکریے کے ساتھ شائع کیا لیکن اس خط میں بھی کتابت کی کئی غلطیاں موجود تھیں۔ میں یہ عمل اور بھی کئی بار دہرا چکا ہوں۔ بعض نے عیب چینی کے طعنے بھی دیے۔ مخالف اور بدخواہ گردانا۔ حالاں کہ یہ دیدہ ریزی ان کی اور اُردو صحافت کی خیر خواہی میں کی گئی تھی۔ وہاں توقع شاید صرف ستایش کی تھی کہ مبارک باد کا خط لکھا جائے اور منہ بھر کر داد دی جائے کہ واہ کیا کارنامہ انجام دیا ہے۔ جو حال رسائل کا ہے وہی کتابوں کا بھی ہے۔ روایت ایک دفعہ جڑ پکڑ لے تو کمپیوٹر کے ''وائرس'' کی طرح یہاں سے وہاں تک پھیل جاتی ہے۔ یہ بات ''گینز بک آف ریکارڈز'' میں جگہ پا سکتی ہے کہ اُردو میں آج تک کوئی کتاب بغیر اغلاط نہیں چھپی۔

ہمارے دور میں اصلاح کی سب سے زیادہ لگن اور معیار پر سب سے زیادہ نظر کسی کی رہی ہے تو وہ رشید حسن خاں ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ''اُردو نامہ'' ان کے پاس جاتا تھا تو وہ اکثر ہمیں کسی نہ کسی بات پر پھٹکار دیا کرتے تھے۔ اس بنا پر ان کی شہرت بھی عیب جواب خردہ گیری کرنے والے کی ہو گئی تھی، حالاں کہ شکر گزاری کی بات ہے۔ انھوں نے املا کی معیار بندی کے لیے پورا اضافہ بنایا، مگر اسے نافذ کون کرے؟ میں نے اپنے ایک مقالے میں (اُردو میں معیار کا مسئلہ) اس پر خاصی تفصیلی بحث کی تھی کہ معیار کیوں کر متعین ہوتا ہے اور اس معاملے میں اُردو کدھر جا رہی ہے اور یہ اونٹ آخر کس کل بیٹھے گا۔ مگر سچ پوچھیے تو اُردو ہی کے مستقبل کا کچھ ٹھیک نہیں۔ کوئی بھی زبان کاروبارِ زندگی سے برطرف ہو کر پنپ نہیں سکتی۔ صرف ادبی زبان بن کر نہیں جی سکتی۔ ایک جدید زبان کا جدید دُنیا کے ساتھ پوری طرح وابستہ اور معاملاتِ زندگی سے دست و گریباں ہونا ضروری ہے۔

اس سطروں کی تحریک رشید حسن خاں صاحب کے مرتب کردہ ''فسانۂ عجائب'' کو دیکھ کر ہوئی تھی۔ رشید حسن خاں کی یہ بے نظیر تالیف اُردو دُنیا کے لیے ایک نمونہ بن کر سامنے آئی ہے اور تکلفاً نہیں، ان کا مزاج ان کا مذاق، ان کی معیار ہی یہ ہے۔ وہ ایک ذمّے دار مصنف ہیں۔ جزویات کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز نہیں کرتے۔ اس ایک تالیف کے ذیل میں کتنے ہی چھوٹے بڑے مسائل کی تحقیق آ گئی ہے۔ الفاظ کے معنی کا تعین، محاورات کی تحقیق و تطبیق، اشعار کا انتساب، اشخاص کے تراجم، کسی مسئلے سے گریز نہیں کیا۔ تلاش و تجسس کا حق ادا کیا ہے۔ رسوم، فنون، عمارات، تاریخی روایات سب پر مفید حواشی ہیں۔ اشاریوں کی ترتیب بظاہر ایک میکانکی عمل ہے۔ انھوں نے اس کو نہ صرف احتیاط سے انجام دیا ہے بل کہ ہر طرح مفید و معتبر بنایا ہے۔ میری نظر سے ایسی کتابیں بھی گزری ہیں جہاں اشاریے میں صفحات کا حوالہ اول سے آخر تک نادرست اور سخت انتشار کا شکار تھا۔ رشید حسن خاں کے مرتب کردہ فسانۂ عجائب میں اس طرح کی فرو گذاشت نکالنا محال ہوگا۔

انھوں نے ایڈٹنگ کی تمام شرطیں پوری کی ہیں جو ایک ذمے دار مرتب پر اصولاً عائد ہوتی ہیں۔ تمام معلوم نسخے جمع کیے جائیں۔ پھر کسی نسخے کو بنیاد بنایا جائے، اختلافات اور عہد بہ عہد ترمیم و اضافہ کی بھی وضاحت کی جائے۔ انھوں نے ایک ایک لفظ پر پوری طرح توجہ کی ہے۔ طلبا کی ضرورت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تلفظ کی وضاحت کے لیے اعراب بھی کثرت سے لگائے ہیں۔ ہر چیز کو آئینہ کر دیا ہے۔ سرور نے اس کتاب میں بار بار تبدیلیاں کی تھیں، جن میں کچھ وقتی مصلحتوں کو بھی دخل تھا۔ رشید حسن خاں نے ان سب اُمور پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ''نثر ہائے خاتمہ کتاب'' پر ایک علاحدہ

ضمیمہ ہے۔اس کے بعد کے ضمیمہ جات میں متن کے سیکڑوں نشان کردہ مقامات پر سیر حاصل حواشی لکھے ہیں جن میں فرہنگ، عربی عبارات: فارسی اشعار و عبارات (مع انتساب) اشخاص مقامات، تلفظ، املا ،محاورات، تلمیحات کسی بات کو تشنہ نہیں چھوڑا۔ مثال کے طور پر دو ایک حواشی سے مرتب کی دقت نظر کا اندازہ ہوگا:

''ص16،ص19:اس عبارت میں چوسر کی اصطلاحیں آئی ہیں۔''منجے'' مجھے کسی لغت میں نہیں ملا، البتہ ک کے حاشیے پر اس کے معنی دانو کا خالی جانا لکھے ہیں۔اس کے تلفظ کا تعین ''پنجے'' کی قیاس پر کیا گیا ہے۔ مفہوم بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ پیر بخارا (لکھنؤ کے ایک محلے کا نام) کے شہدے کی یک رنگی کا یہ عالم ہے کہ وہ (غالباً پنجتن کی رعایت سے) ہمیشہ پنجے پر دانو لگاتا ہے۔(دانو خواہ ایک روپے کا ہو یا سو روپے کا) اس کے سیکڑوں دانو خالی گئے لیکن اس نے دوئے یا کسی اور نمبر پر کبھی دانو نہیں لگایا

۔چوک، چھکا، پنجہ، دوا، اڈھی، ایک، سو کی رعایت ظاہر ہے۔اسی طرح جوا، دانو، منجے، پ۔و کی رعایت بھی نمایاں ہے۔اس کے ایک پہلو یہ بھی ہے کہ دوئے پر تو یوں دانو نہیں لگا سکتا تھا کہ وہ یک رنگی کے خلاف ہوتا اور تین کا عدد پانسے کا کھیل میں بُرا مانا جاتا ہے۔''تین کانے''مشہور ہے۔اس کے علاوہ تین اور چار کے اعداد اس معاشرت میں مذہبی اثر کے لحاظ سے بھی قابل قبول نہیں ہو سکتے تھے۔بس ایک پانچ کا عدد بچتا تھا جو''پنجتن'' کی رعایت سے مبارک ثابت ہو سکتا تھا۔شرؔر نے لکھا ہے:''خلفائے اربعہ کی مخالفت اور پنج تن کی محبت نے لکھنؤ کی درباری معاشرت میں چار عدد کو بُرا اور پانچ کو محبوب بنا دیا تھا۔''(گذشتہ لکھنؤ، مکتبہ جامعہ اڈیشن، ص306)''کہہ دیا پو'' کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ پانسا پھینکتا تھا تو (چوسر اور پچیسی کھیلنے والوں کے معمول کے مطابق) اس یقین کے ساتھ''پو'' کہتا تھا کہ یہ دانو تو ہو ہی جائے گا۔''

میں نے عرض کیا تھا کہ وہ کسی لفظ سے بھی سرسری طور پر گزر جانے کے قائل نہیں۔ ممکن ہے کسی کو یہاں عبارت میں قدرے اختصار کی گنجایش نظر آئے، جیسا کہ عموماً حواشی میں برتا جاتا ہے۔لیکن تعلیقات کو اتنا خشک اور بے مزہ بنانا کیا ضرور، مگر آپ نے دیکھا کہ یہ تالیف تمام علمی تقاضوں کو پورا کرنے کے ساتھ کتنی دل چسپ بن گئی ہے، یہ عبارت متن کی دل چسپی کو بھی دوبالا کرتی ہے۔یعنی جب اس طرح سمجھ کے پڑھا جائے تو اور زیادہ لطف آئے۔تمام ضمیمہ جات معلومات کی کان ہیں اور بے شمار اُمور کی وضاحت کرتے ہیں، جن میں لغوی باریکیاں بھی شامل ہیں، مثلاً:''چھنتا (ص76)۔جلال نے اپنے لُغت سرمایہ زبان اُردو میں لکھا ہے کہ:

''یہ لفظ فصحائے لکھنؤ کی زبان پر بالکسر ہے اور اہلِ دہلی کی زبان پر بالضم۔'' یہی بات صاحب نور اللغات نے لکھی ہے۔ ناسخ کے شاگرد بحر لکھنوی نے بھی اپنے رسالے بحر البیان میں''پوشیدہ شدن'' کے معنی میں چھپنا بکسر اول لکھا ہے اور''چھپنا'' کے معنی لکھے ہیں۔''رخنۂ خرد یا کلاں بند شدن از گل در مکان چوں سوراخ موش یا دیوار شکستہ۔''(بحر البیان، مخطوطہ رضا لائبریری، رام پور) فرہنگ آصفیہ میں''چھپنا'' ہے اور اس سے جلال وغیرہ کے اس قول کی تصدیق تو ہو جاتی ہے کہ دہلی میں یہ بہ ضم اول ہے، لیکن انشا نے جو کچھ لکھا، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں (یا یہ کہ انشا کے نزدیک) یہ لفظ فصحائے دہلی کی زبان پر بہ کسرِ اول تھا۔(ترجمہ دریائے لطافت، ص25) نیز ص222 پر لکھا ہے کہ ''چھپنا اور چھُپنا میں کسرے اور ضمے کی مخالفت ہے۔فصیح بالکسر ہے اور ضمے کے ساتھ اہل مغلپورہ کا لہجہ ہے، اہل اُردو کی زبان نہیں۔'' لیکن غالب نے بے خبر کو ایک خط میں لکھا ہے ''مجموعہ نثر اُردو کا انطباع اگر میرے لکھے ہوئے دیباچے پر موقوف ہے، تو اس مجموعے کا چھپ بالفتح میں نہیں چاہتا، بل کہ چھُپ جانا بالضم چاہتا ہوں۔''(عودِ ہندی، مطبع مجتبائی میرٹھ طبع اول، ص127)۔

ایک اور خط میں انھی کو لکھا ہے:

''اور ہاں حضرت! وہ مجموعہ چھپے گا بالفتح، یا چھُپے گا بالضم (ایضاً125) اس کے برخلاف میر امن کی کتاب''گنج خوبی کا مخطوطہ اُنھی کے قلم کا لکھا ہوا رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن میں محفوظ ہے اور اُس کا عکس میرے سامنے ہے۔اس میں میر امن نے حرف اول پر زور لگایا ہے:''جس درخت کے پیچھے چھِپنے کو جاتے''(ص27)۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی میں یہ لفظ بہ ضم اول اور بہ کسر اول دونوں طرح مستعمل رہا ہے۔ بہ ہر صورت اہل لکھنؤ''چھِپنا'' کہتے ہیں۔ہاں سرور نے اپنی کتاب شگوفہ محبت میں ایک جگہ لکھا ہے''یہ قصہ یوسف جمال...... یا تو چھپا تھا، اب چھپا۔جب یہ زیر، زبر ہوا تب مدنظر ہوا۔''(یہ حوالہ نیّر مسعود صاحب نے بھیجا ہے) اس سے مزید وضاحت ہو جاتی ہے۔''

رشید حسن خاں نے جس عرق ریزی سے کام لیا ہے، ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔سچ یہ ہے کہ اس کا جواب تو دور دور نہیں ملے گا۔ ہمارے ہاں جو سہل نگاری چل رہی ہے اس کا تو ذکر ہی کیا، مگر اس ایک کارنامے نے اُردو کا بھرم رکھ لیا ہے مرحبا!!

میرا تعارف رشید حسن خاں سے اُن کے عتاب ناموں کے ذریعے ہوا جو وہ کبھی ارزانی فرماتے رہے اور بہ ہر صورت موجب آگاہی ہوتے تھے۔بات یہ تھی کہ ترقی اُردو بورڈ (حال اُردو ڈکشنری بورڈ) کی اعزازی معتمدی کے زمانے میں بورڈ کی طرف سے میں ایک جریدہ بھی''اُردو نامہ'' کے نام سے نکال بیٹھا تھا جسے سولہ برس بغیر مالی وسائل کے چلایا۔ پھر جیسے ہی میں نے بورڈ کو خیر باد کہا وہ رسالہ بھی بند ہو گیا۔اس کی بابت فقرہ یہ سُنا گیا کہ یہ حقی صاحب کا ذاتی شوق تھا۔وہ رسالہ زیادہ تر لسانی موضوعات سے تعلق رکھتا تھا۔اس میں لغت کے مرتب اجزا بھی قسط وار چھپتے رہتے تھے۔اور ان پر ارباب نظر کے تبصرے بھی، جن کے طفیل بڑی اصلاحیں ہوئیں۔بہت سے قدر دان آج بھی اُس جریدے کو یاد کرتے ہیں اور رشید حسن خاں بھی ضرور یاد کرتے ہوں گے کہ ان کے تازیانہ عبرت کا ایک ہدف جاتا رہا۔خیر جب تک اُردو اور اس کے ادبی و ناشر سلامت ہیں ان کا تازیانہ بے کار نہیں رہے گا۔

جو لغزشیں ہم سے سرزد ہوتی تھیں ادارت اور طباعت کی (کتابت میں نہیں کہتا کیوں کہ رسالہ ٹائپ میں چھپتا تھا) اُن میں اغلاط لفظی بھی ہوتی تھیں اور معنوی بھی۔اُن کا جواز تو کوئی نہ تھا، عذر کئی ہو سکتے تھے۔اس رسالے کے لیے کوئی علاحدہ گرانٹ نہ تھی۔یہی کہہ کر شروع کیا تھا کہ یہ اگرچہ بورڈ کا آرگن ہوگا، بورڈ پر بار نہ بنے گا، چناں چہ دوسرے کاموں کے ساتھ ساتھ اشتہارات اور ان کے بلوں کی وصولی کے لیے بھی خاصے دُکھ بھرنے پڑتے تھے۔

ہم نے رشید حسن خاں کی ملامتوں کا بُرا نہیں مانا۔آپس میں ایک دوسرے کو بُرا بھلا کہہ لیتے تھے۔ ہر ایک کے پاس عذر موجود تھا۔ پریس والے بھی کاتبوں کی طرح الزام سے بری ہوتے ہیں کہ جو اصلاح آپ چاہیں ان سے کرا سکتے ہیں۔یہ اور بات کہ ان سے بھی چوک ہوتی رہتی ہے۔**الانسان مرکب من الخطاً والنسیان**، اس قول زریں کو بھی بہت لوگوں نے آڑ بنایا ہے مگر کچھ اور عذر

معقول بھی ضرور ہوتے ہوں گے۔

کہنے کو کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ اہلِ علم ان فروگذاشتوں کو عادتاً نظرانداز کرتے ہیں کہ یہ ان کو گمراہ نہیں کرسکتیں۔ عاقلاں پیرو نقطہ نہ شوند۔ دوسروں کو علمی موضوعات سے دل چسپی نہیں ہوتی۔اس لیے وہ بھی ضرر سے محفوظ رہتے ہیں مگر اس پر رشید حسن خاں صاحب یہی کہیں گے کہ عذرِ گناہ بدتر از گناہ۔ آپ سے یہ احتیاطیں نہیں برتی جاسکتیں تو کیوں علمی کاموں کا ٹھیکا لیتے ہیں۔ ادارت کا حق ادا نہیں کر سکتے تو مدیر کیوں بنتے ہیں۔ آخر انھی کی بات ماننی پڑے گی۔

آچاریہ چانکیہ نے اب سے سیکڑوں برس پہلے سنین قبل مسیح میں جو رموز انشا اپنی معرکتہ الآرا تصنیف ''ارتھ شاستر'' میں درج کیے تھے۔ آج بھی ہمارے اہلِ قلم کے لیے غور طلب ہیں۔ یہ کتاب در اصل بادشاہوں کا دستور العمل ہے۔ بہت سے دوسرے سیاسی، انتظامی، عسکری، سماجی، اور اخلاقی موضوعات و مطالب کے ساتھ اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ بادشاہ کی طرف سے اجرا ہونے والے فرامین، مراسلات وغیرہ کس طرح لکھے جائیں۔ تحریریں کس کس نوعیت کی ہوتی ہیں اور ان کے لیے کیا پیرایے اختیار کرنے چاہئیں۔ انشا کے عیوب و محاسن کیا ہیں۔ علیٰ ہذا القاس۔

یہاں ایک مختصر اقتباس شاید برمحل ہو کہ ذکر رشید حسن خاں صاحب کا ہے تو گویا انھیں موضوعات کا جن سے انھیں خاص تعلق خاطر ہے وہ لکھتا ہے:

''مضمون کے نکات کو ان کی اہمیت کے لحاظ سے مناسب ترتیب کے ساتھ لکھنا، یہ حسن ترتیب ہے۔ مندرجات آنے والے حقائق سے متناقض نہ ہوں۔ مسلسل اور آخر تک باہم مربوط ہوں تو اسے مربوط تحریر کہا جائے گا۔ الفاظ ضرورت سے زائد ہوں نہ کم، مضمون کو دلیل و نظیر کے ساتھ موثر طور پر ادا کیا جائے اور جہاں زور دینے کی ضرورت ہو، زور دیا جائے تو اسے تکمیل کہیں گے۔

حسنِ تحریر کے ساتھ بات خوش آیند طریق سے کہی جائے تو یہ شگفتگی ہے عوامی بول چال کے الفاظ سے پرہیز، یہ وقار (اودار یہ) ہے۔

مانوس الفاظ کا استعمال سلاست و وضاحت کی تعریف میں آتا ہے.....لفظ ''اِتی'' عبارت کے ختم پر تکمیل ظاہر کرنے کے لیے درج کیا جائے اور کبھی زبانی پیغام کے اشارے کے لیے بھی جیسے ''واچ کامس یتی'' اس کے ساتھ زبانی پیغام بھی ہے۔

ہتک و ملامت (نندا) تعریف و توصیف، استفسار، بیان واقعہ درخواست، انکار، تنقیص، ممانعت، حکم، مصالحت، وعدۂ اعانت، دھمکی، ترغیب و تحریص یہ تیرہ مقاصد ہیں جن کے لیے شاہی مراسلات جاری ہوتے ہیں۔...

بدی بھونڈی تحریر، بے ربط باتیں، بے جا تکرار، قواعد کی اغلاط اور بے ترتیبی، انشا کے عیوب ہیں۔ میلا بدزیب، ورق، ناہموار پھیکی تحریریں بدنمائی پیدا کرتی ہے۔ پچھلی تحریر سے بعد کا اختلاف تناقض ہے۔ کہی ہوئی بات کو دہرانا تکرار ہے۔ تذکیر و تانیث، واحد و جمع، زمانہ ضمیر، معروف و مجہول کے استعمال میں غلطی کرنا قواعدی اغلاط ہیں۔

عبارت میں بے جگہ وقفہ دینا، غیر معقول قطعے، (پیرے) بنانا اور اس طرح کی دوسری بے اصولی باتیں تحریر کا عیب گنی جاتی ہیں....'' (ارتھ شاستر اُردو باب 2، جزو دہم، ترجمہ راقم 1991)

چانکیہ معلم منشیاں تھا تو رشید حسن خاں مودب الادباء ہیں۔ انھوں نے صرف فہمایش سے کام نہیں لیا جس پر کبھی کبھی سرزنش کا گمان بھی ہوسکتا ہے (گو اس میں ذاتیات کا نہیں ان کی اپنی حساسیت کا دخل ہوتا ہے) بل کہ اپنی طرف سے معیار اور اسلوب کار کے نمونے بھی پیش کیے ہیں جو اپنی جگہ ادب میں پیش قدر اضافے اور اعلا تحقیقی کارنامے ہیں۔ میں ان کے مرتب کردہ ''فسانۂ عجائب'' کے اڈیشن پر اپنی رائے ظاہر کرچکا ہوں۔ وہ صرف نکتہ چینی ہی نہیں، مدد بھی کرتے ہیں۔ بات بھی جو بنائے نہ بنتی ہو بنا دیتے ہیں۔ حوالہ تلاش کرنے میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔ ایک خط میں لکھا:

''اُردو نامہ کے چوبیسویں شمارے میں ایک مکتوب نگار نے اس شعر کے انتساب کے متعلق استفسار کیا ہے:

در بزم وصال تو بہنگام تماشا
نظّارہ زجنبیدن مژگاں گلہ دارد

قاضی عبدالودود نے مجلّہ معاصر کے شمارہ (1) میں ''آوارہ گرد اشعار'' کے سلسلے میں اس سے متعلق جو کچھ لکھا تھا، میری معلومات کے مطابق ابھی تک اس میں کوئی اضافہ نہیں کیا جاسکا ہے۔ ذیل میں قاضی صاحب کی عبارت نقل کی جاتی ہے۔'' اور انھوں نے وہ پوری بحث نقل کردی ہے جو کئی صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہ تھی علمی تعاون کی ایک معمولی سی مثال۔

رشید صاحب سے جو پہلا تعارف مراسلت کے ذریعے ہوا، ادھورا بل کہ ناقص اور گمراہ کُن تھا۔ ہوسکتا ہے اور لوگوں نے بھی ان کے چھبتے ہوئے اعتراضات پر انھیں خوردہ گیر بل کہ سخت گیر نا مہربان استاد سمجھا ہو۔ یوں تو ان کی نکتہ چینی میں بھی ایک لطف کا پہلو ہے کہ مقصد اس کا اصلاح ہے:

نامہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں

لیکن جب سے ملاقات ہوئی تو اور ہی شخصیت نظر آئی۔ اچھے خاصے خوش طبع آدمی نکلے، دوستی کے قابل اور دوستی پر مائل۔ وہ منفی نہیں مثبت قدروں کے آدمی ہیں۔ ان کے مثبت کارنامے ہمارے سامنے ہیں۔ بد مزگی کے مواقع تو لوگ خود ہی مہیا کرتے ہیں۔ وہ اس پر کسی کسی کو ٹوک دیتے ہیں مگر کہاں تک ٹوک سکتے ہیں جب کہ سب طرف ابتری پھیلی ہو۔ دُنیا کے جدید دور میں معیار پر زور ہے۔ معیار کو تھامے بغیر ترقی کے راستے پر قدم نہیں بڑھ سکتے۔ خوب سے خوب تر کا حصول ممکن نہ ہوگا۔ علمی معاملات میں تو چشم پوشی کی کوئی بھی گنجایش نہیں ہوتی۔ دو اور دو چار ہی ہوں گے۔ کم نہ بیش کہ آپ ذرا سی چوک کو رفت گذشت کر کے سمجھوتہ کرلیں کہ چلو 1000ء 4 سہی۔

رشید صاحب کو کام کرنا ہی نہیں کام لینا بھی آتا ہے۔ اس کا مجھے ذاتی تجربہ یوں ہوا کہ ایک دن انھوں نے مجھے پابند کر کے بیسیوں اشعار مجھ سے لکھوا لیے جو میں ویسے کسی کو نقل کر کے نہ دیتا۔ وہ قدح اور مدح دونوں کے اہل ہیں۔ اس دور میں اُردو کے محسن کی حیثیت سے ان کا مقام بہت بڑا ہے۔

(کتاب نمار شید حسن خاں حیات و ادبی خدمات، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، امرتب اطہر فاروقی 2002، صفحہ 58 تا 63)

○○○

نیّر مسعود

مصطلحاتِ ٹھگی

’ٹھگ‘ کا لفظ اُردو میں اپنے اصطلاحی معنی سے مختلف معنوں میں استعمال ہونے لگا ہے۔ اصطلاحی معنی میں ’ٹھگوں کا خواص ہے کہ مسافر کو مارے بغیر اس کا مال اپنے اوپر حرام جانیں‘ لیکن اُردو محاورے میں ٹھگی کے ساتھ قتل وخون کا تصور نہیں ہے بل کہ دھوکا یا لالچ دے کر کسی کا مال یا منافع حاصل کرنا ہے۔ مثلاً نقلی یا کم قیمت مال کو اصلی اور قیمتی بنا کر مہنگا فروخت کر دینا یا زیورات کو دوگنا کر دینے کا دعوا کر کے ہتھیا لینا۔ لیکن اصلی ٹھگ میں شکار کا خون کر دینا ضروری تھا۔ ٹھگوں کے بڑے بڑے گروہ مسافروں کو قتل کر کے ان کا مال لوٹ لیتے تھے۔ ان کی ایک مخصوص تنظیم، رسوم ومعتقدات اور بولی تھی۔ یہ بہت رازدارانہ طریقے سے کام کرتے تھے اس لیے ان کی سرگرمیاں عام طور پر صیغۂ راز رہتی تھیں۔

ٹھگی کے خاتمے کے بعد تک ان لوگوں کے متعلق معلومات عام نہیں تھی، خصوصاً اُردو والوں کو ان کے متعلق بہت کم علم تھا، حالاں کہ اُردو میں ’مصطلحاتِ ٹھگی‘، ’واقعاتِ عجیبہ وغریبہ‘ وغیرہ اُنیسویں صدی میں لکھی جا چکیں تھیں۔ اُردو میں ٹھگی پر فلپ میڈوز ٹیلر کے ناول ’کنفشنس آف اے ٹھگ‘ کے اُردو ترجموں نے عام اُردو دنیا کو ٹھگوں کی تنظیم اور ان کے طریقِ کار سے روشناس کرایا۔ یہ ایک ٹھگ امیر علی کی داستانِ حیات کے طور پر لکھی گئی ہے۔ اس کے کئی ترجمے ہوئے۔ ان میں حسن جعفری کا ترجمہ غالباً سب سے مکمل ہے جو ایک بار پھر 1998 میں چھپا۔ اس پر مترجم کے علاوہ آصف فرخی کا بھی مفید دیباچہ ہے۔

ٹھگوں کا استیصال کرنل ولیم ہنری سلیمن نے کیا۔ اس نے مختلف ٹھگوں سے پوچھ پوچھ کر ان کی تنظیم کے بارے میں معلومات اور ان کی مخصوص بولی کے لفظوں کو جمع کیا۔ اس کی کتاب ’رماسیانا‘ ٹھگوں کے متعلق معلومات کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اس کے کہنے پر علی اکبر الٰہ آبادی نے ٹھگوں کے مصطلحات پر اُردو فارسی میں کتابیں لکھیں۔ رشید حسن خاں نے ان کتابوں سے اپنا متن تیار کیا جو ’مصطلحاتِ ٹھگی‘ کے نام سے ہمارے سامنے ہے۔

ٹھگوں کی ابتدا تاریخ کے دھندلکے میں ہے۔ ان کی روایتوں کے مطابق کالی دیوی نے ایک بھکاری کو ٹھگی کی تعلیم دی تھی، وہیں سے ان کی تعداد بڑھنا شروع ہوئی۔ ٹھگ ہندو ہوں یا مسلمان ،کالی کو اپنی دیوی مانتے تھے، اسی کے ساتھ اپنے ذاتی مذہب پر بھی کاربند رہتے تھے، چناں چہ بہت سے مسلمان ٹھگ روزے نماز کے پابند تھے۔ ابتدا میں ٹھگوں کی سات ذاتیں تھیں، انھیں سے چوراسی فرقے پیدا ہوئے جن میں سے کچھ نام یہ ہیں: اکڑیئے، جمالدی، دکھنی، بنگالی، سوسیا، کویلیا، سندوسی، بڑاڈی، لودھا، تلنگانی مٹھیّا، بنگو، بلوچی، میگھپنا، پنجابی، اجینی، پیچ بھیے، کرناٹکی، شولاپوری، بھور سوٹے، تندل، کورہریا، تین، نامی، ارکاٹی، اگریّہ پوتی، چنگڑے، مٹھوال، ڈھولانی، کاچنی، سینگی، والے، کاٹھر، انتر بیدی۔

مسافروں کو مارنے کا عام طریقہ رومال سے اس کا گلا گھونٹ دینا تھا، لیکن کبھی تلوار، خنجر وغیرہ سے بھی کام لیا جاتا تھا۔ مٹھوال ٹھگ مسافروں کو زہر دے کر مارتے تھے۔ ٹھگ عام مسافروں کے بھیس میں دوسرے مسافروں کے ساتھ شامل ہو جاتے اور مناسب موقع پا کر اپنا کام کر گزرتے تھے۔ بعض ٹھگ بیوپاری، پنڈتوں، ویدوں، ملاحوں کے بھیس میں بھی واردات کرتے تھے۔ ہر کام کے لیے الگ الگ لوگ مقرر تھے، مثلاً مسافروں کا پتا لگانے والے، مارنے والے، لاشوں کو دفن کرنے والے وغیرہ۔ شگون ان کے یہاں ہوتے تھے۔ مختلف پرندوں، جان وروں کی آوازوں کی سمت وغیرہ سے شگون لیا جاتا اور شگون کے بغیر وہ ٹھگی کی کوئی واردات نہیں کرتے تھے۔ کچھ لوگوں کا مارنا ان کے یہاں سخت منع تھا مثلاً عورت، جوگی، تیلی، دھوبی، سنار، فقیر، چمار، کوڑھی، نکٹا، لنگڑا، بولا، اندھا وغیرہ۔ بعد کے ٹھگوں نے لالچ میں آ کر ان ممنوعہ لوگوں کو بھی مارنا شروع کر دیا اور بوڑھے ٹھگوں کا خیال تھا کہ ٹھگی کا زوال دیبی کے احکام کی انھی خلاف ورزیوں کا نتیجہ تھا۔

ان کی مخصوص زبان 'رماسی' تھی جس کی فرہنگ 'مصطلحاتِ ٹھگی' ہے۔ اس میں صرف لفظوں اور اصطلاحوں کے معنی ہی نہیں دیے گئے ہیں بل کہ ان کے ذیل میں ٹھگوں کے مراسم، اعتقادات، شگون ،فرقوں وغیرہ کے متعلق اہم معلومات بھی دی گئی ہیں۔ ان کی زبان میں بعض لفظ مختلف جماعتوں میں مختلف معنی رکھتے تھے۔ مثلاً:

''پھڑ: کرناٹکی و شولاپوری ٹھگوں کی زبان میں اس جمعدار کی سرداری کے حق کو کہتے ہیں جس کے ساتھ گھر سے سفر کو نکلے ہوویں.... ہندوستانی ٹھگ و جمال دی پھڑ فرودگاہ کو کہتے ہیں''۔

اور کبھی ایک ہی مفہوم کے لیے مختلف جماعتوں میں مختلف لفظ تھے، مثلا:

''دنتیرو: دکھنی ٹھگوں کی زبان میں گدھے کی آواز کے شگون کو کہتے ہیں..... اور 'دنتیرو' کو دکھنی ٹھگ 'ڈنڈا' بھی کہتے ہیں اور ہندوستانی ٹھگ 'کانتا' اور 'گھرکا' کہتے ہیں''۔

ان کے اپنے ضرب الامثال بھی تھے، مثلاً:

''سو پنکھیرو، ایک دنتیرو'' (سو پرندوں کے برابر ایک گدھے کا شگون ہے)۔ یا ''راتیں بولے تیتر دن کو بولے سیار، تج چلیے وہ دیس انہیں پڑے اچانک دھار'' (رات کو تیتر یا دن کو سیار بولے تو وہ شہر چھوڑ دیجیے نہیں تو اچانک آفت آ جائے گی)۔

اس میں شک نہیں کہ ٹھگ ہندوستان کی سب سے بھیانک جرائم پیشہ قوم تھی، لیکن شاید اتنی نہیں جتنی سلیمن کی تحریروں سے ظاہر ہوتی ہے۔ ان تحریروں کا ایک مقصد یہ جتانا بھی تھا کہ انگریزوں نے ٹھگی کا خاتمہ کر کے ہندوستان کو ایک بڑی مصیبت سے نجات دلا دی۔ سلیمن نے بہت سے ٹھگوں کو وعدہ معاف گواہ بنا کر ان کے بیانات قلم بند کیے تھے، ان کی بولی کے متعلق بھی معلومات کا ماخذ یہی ٹھگ سچائی تھی اور کس حد تک زیبِ داستان عناصر اور سلیمن نے کس حد تک دیانت داری کے ساتھ ان کو لکھا، اس کا فیصلہ کرنا اب شاید ممکن نہیں ہے (ایک خیال یہ بھی ہے کہ ٹھگ انگریزی اقتدار کے مخالف)۔ ان بیانات کو من وعن تسلیم نہیں کر لینا چاہیے، لیکن بہرحال ٹھگی کے متعلق ہم اپنی معلومات کے لیے سلیمن ہی کے مرہونِ منّت ہیں۔

....

رشید حسن خاں نے اس فرہنگ کو حسبِ معمول بہت سلیقے سے مرتب کیا ہے۔ انھوں نے اس کے دستیاب نسخوں کی مدد سے وہ سب الفاظ بھی اپنی ترتیب میں شامل کر لیے ہیں جو کسی اڈیشن میں تھے، کسی میں نہیں تھے۔ حواشی میں مولوی ظفر الرحمٰن کی 'فرہنگِ اصطلاحاتِ پیشہ وراں' سے بھی کام لیا گیا ہے حالاں کہ اس کا ماخذ بھی 'مصطلحاتِ ٹھگی' ہی ہے اور مرتّب کی صراحتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر الفاظ کے سلسلے میں 'اصطلاحات' کے اندراج غلط ہیں۔ 'مصطلحاتِ ٹھگی' کے بارے میں رشید حسن خاں کا یہ کہنا صحیح ہے:

''ٹھگ پھانسی کا رومال مقتول کے گلے میں کیسے ڈالتے تھے، ٹھگ بننے کے لیے کس طرح کی تربیت ضروری تھی، کن رسموں کی بجا آوری لازمی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ بات کہ ٹھگوں کی زبان کے اصطلاحی الفاظ سے واقفیت حاصل ہو، جو لغت نگاری کے لحاظ سے اور لسانیات کے نقطۂ نظر سے بہت ضروری چیز ہے، یہ کتاب واحد بنیادی ماخذ ہے اس ساری معلومات کے حصول کا۔ اس بنا پر یہ ضروری سمجھا گیا کہ اس کتاب کے متن کو تدوین کے طریقۂ کار کے تحت مرتب کیا جائے۔ سماجیاتی مطالعے، لسانیاتی تجزیے اور لغت نگاری، ان تینوں اہم موضوعات کے لیے یہ کتاب بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے، یوں اس کا مرتّب کیا جانا ایک ضروری کام تھا''۔

کتاب میں فارسی کے اقتباسات کے ساتھ ان کا ترجمہ بھی دے دیا گیا ہے جو ضروری تھا لیکن بعض جگہ ترجمہ نہیں دیا ہے، مثلاً 'سری دِن' کی خاصی طویل تشریح فارسی میں دی گئی ہے، 'دھرائی' کے سلسلے کا اقتباس بھی طویل ہے، اس کا بھی ترجمہ ہونا تھا۔

کتاب کے ماخذ یہ ہیں:

1۔ رماسیانا: سلیمن نے یہ کتاب 1835 میں مرتب کی تھی۔ 1836 میں یہ کلکتے سے شائع ہوئی۔ ٹھگوں سے متعلق اس کی حیثیت انسائیکلوپیڈیا جیسی ہے۔ ایک بڑا کام سلیمن نے یہ کیا ہے کہ عدالت میں ٹھگوں نے مقدمات کے سلسلے میں جو بیانات دیے ہیں ان سب کو یک جا کر دیا ہے..... سلیمن نے ٹھگوں کی زبان کی جو فرہنگ تیار کی تھی وہ بھی اس میں شامل ہے۔ سلیمن نے یہ وضاحت کر دی ہے کہ مختلف 'جینٹل مینوں' کی موجودگی میں وہ گویندوں سے پوچھ پوچھ کر الفاظ جمع کرتا رہا ہے۔ اس نے مزید وضاحت کی ہے کہ اس فرہنگ کا لفظ 'رماسی' (ٹھگوں کی خفیہ زبان) ہے''۔

2۔ 'مصطلحاتِ ٹھگی': پہلی روایت: علی اکبر الہ آبادی جبل پور کی 'کچہری جنرل سپرنٹنڈٹی' میں سر شتے دار تھے۔ انھوں نے سلیمن کے کہنے پر ٹھگوں کی زبان سے متعلق ایک کتاب

مرتب کی۔انھوں نے اس کے مقدمے میں مزید صراحت کی ہے ''بالمقابلے' جناب کرمت انتساب کے (مراد ہے سلیمن) کہ آپ بھی انگریزی میں تحریر کرتے جاتے تھے، تحقیق کر کے ایک رسالہ بہ ترتیب حروفِ تہجی کے سب لغات مجتمعہ سات سو چالیس ہیں، لکھا و نام اس کا 'مصطلحاتِ ٹھگی' رکھا'۔ یہ پہلی روایت 1836 میں مرتب ہوئی۔

3۔ ''مصطلحاتِ ٹھگی کی روایت ثانی، علی اکبر نے روایتِ اوّل میں بہت سے الفاظ کا اضافہ کیا ہے، مقدمہ از سرِ نو لکھا اور اس طرح اس کتاب کی دوسری روایت مکمل ہو گئی جو 1839 میں کلکتے میں چھپی۔''۔

4۔ ''مصطلحاتِ ٹھگاں: سلیمن کے حکم کے مطابق علی اکبر الہ آبادی نے سلیمن کی مرتبہ فرہنگ کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ مترجم کی وضاحت کے مطابق ستمبر 1834 میں یہ ترجمہ کیا گیا...... اس میں الفاظ کی تعداد نسخۂ فرہنگ سلیمن سے کم ہے، مگر بعض ایسے الفاظ کا اضافہ ہے جو نہ تو فرہنگ سلیمن میں سے کم ہے، مگر بعض ایسے الفاظ کا اضافہ ہے جو نہ تو فرہنگ سلیمن میں ہیں اور نہ مصطلحات کی کسی روایت میں.... سلیمن نے 'رماسیانا' کی ترتیب 1835 میں مکمل کی تھی اور اس فارسی ترجمے کی تسوید ستمبر 1834 میں ہوئی''۔

چاروں نسخوں کے الفاظ کی تعداد ہے؟ فرہنگِ سلیمن (مشمولۂ رماسیانا) 668، مصطلحاتِ ٹھگی کی روایتِ اول (مخطوطہ) 740، مصطلحاتِ ٹھگاں (فارسی) 558، مصطلحاتِ ٹھگی کی روایتِ ثانی (مطبوعہ نسخہ) 1585۔

ان تصریحات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ٹھگی کی مصطلحات کی یہ فرہنگ دراصل علی اکبر کا نام ہے اور سلیمن کی حیثیت مترجم یا شریک مرتب کی تھی۔ رشید حسن خاں نے اپنی ترتیب میں ان چاروں نسخوں کے سب الفاظ شامل کر کے کتاب کو زیادہ جامع بنا دیا ہے۔

بہت سے لفظوں خصوصاً جرائم پیشہ لوگوں کے مخصوص لفظوں کی طرح ٹھگوں کے بھی بیش تر لفظوں کو اُردو لغات کے مرتبین نے قابل اعتنا نہیں سمجھا۔ یہ ہمارے لغات کی بڑی کوتاہی ہے۔ کسی زبان میں استعمال ہونے والا ہر لفظ عام اس سے کہ وہ کن لوگوں میں یا کتنا بولا جاتا ہے، لغت میں جگہ جگہ پانے کا مستحق ہے۔ مصطلحاتِ ٹھگی کی دوبارہ اشاعت اور وہ بھی اس قدر عمدہ تدوین کے ساتھ اشاعت کے بعد امید ہے کہ کم از کم ٹھگوں کے مخصوص الفاظ ہمارے لغات میں جگہ پائیں گے۔ یہ محض فرہنگ نہیں ہے قاری اس کے مطالعے سے ٹھگوں کی پُر اسرار دُنیا میں داخل ہو جاتا اور ان عجیب و غریب سفاکوں کے ساتھ بھی وقت گزار لیتا ہے۔ اس طرح اس کا مطالعہ بہت دل چسپ، کہیں کہیں میڈوز ٹیلر کے ناول سے بھی زیادہ دل چسپ ہو جاتا ہے۔

کتاب کا انتساب ''عصرِ حاضر کے ادبی ٹھگوں کے نام' بُرے کرداروں کے نام کتاب کا انتساب اُردو کی عام ادبی روایت نہیں ہے۔ لیکن ٹھگی ایک فن تھا۔ مرتب نے غالباً یہ سوچا کہ اس فن پر کتاب کو زیادہ بڑے فن کاروں کے نام معنون کرنا غلط نہ ہوگا۔

(سہ ماہی اُردو ادب، صفحہ 165 تا 170، اکتوبر، نومبر دسمبر، 2003، انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی)

○○○

سیّد محمد عقیل

'زٹل نامہ' (کلیاتِ جعفر زٹلّی) اور رشید حسن خاں

جعفر زٹلّی نارنولی کا یہ کلیات نظم ونثر جو غالباً میر محمد جعفر کا پہلا کلیاتِ نظم ونثر ہے، جسے اُردو کے سب سے مستند اور محتاط محقق جناب رشید حسن خاں نے ترتیب دیا ہے۔ ترتیبِ متن میں جیسا ملکہ رشید حسن کو حاصل ہے، اُردو میں ابھی تک میرے علم میں کسی کو حاصل نہیں ہو سکا۔ ان کی مرتبہ کتابیں: (1) فسانۂ عجائب (2) باغ و بہار (3) مثنوی گلزارِ نسیم (4) مثنوی سحر البیان (5) مثنویاتِ شوق اور اب 'زٹل نامہ' اس بات کا ثبوت ہیں۔ 'زٹل نامہ' نام خود شاعر جعفر زٹلّی کا رکھا ہوا ہے۔ اس کتاب کی ترتیب اور اس کے حواشی وغیرہ کے لکھنے میں خاں صاحب نے بڑی جاں فشانی کی ہے۔ انھوں نے جعفر کے چودہ نسخوں کی نشان دہی کی ہے جن کی تفصیلات صفحہ 33۔32 پر درج ہیں۔ ان نسخوں میں سب سے قدیم نسخہ خاں صاحب نے نسخۂ کلکتہ (1206ھ/1791) کو مانا ہے اور اس کے اسباب بھی بیان کیے ہیں۔ ان میں سے بقول مرتب چار نسخے مطبوعہ ہیں (تفصیلات کتاب کے ص 32 پر درج ہیں) اس کتاب کی فہرست میں چار حصے ہیں: (1) مقدمۂ مرتب (2) حصۂ نثر (3) حصۂ نظم (4) ضمیمے، جن میں الحاقی کلام پر بحث کی گئی ہے۔ اس طرح ابھی تک جتنی بھی تحریریں جعفر کے کلام کی خاں صاحب کو ملی ہیں انھوں نے سب کو اپنی اس تدوین میں اکٹھا کر دیا ہے۔ جعفر کا ایک خطی نسخہ الہ آباد یونی ورسٹی میں بھی تھا جس سے ڈاکٹر علی

جاوید(دلّی یونی ورسٹی) نے اپنے ایم فل کے مقالے میں مدد لی تھی مگر اب یہ نسخہ الٰہ آباد یونی ورسٹی کی لائبریری میں مجھے نہ ملا ورنہ پتا چلتا کہ یہ کوئی الگ نسخہ ہے یا وہی خاں صاحب کے دریافت شدہ نسخوں میں سے کوئی ہے۔

رشید حسن خاں نے نہ صرف یہ کہ جعفر کی تقریباً تمام تحریر مدون کر دی ہے بل کہ تمام دست یاب تحریروں کی چھان پھٹک بھی کی ہے۔ جعفر کی زبان جسے شمالی ہندوستان میں اُردو شاعری اور نثر کی ابتدائی کوشش سمجھنا چاہیے، اس پر لسانیاتی نقطۂ نظر سے بڑی اچھی اور تحقیقی بحث کی ہے۔ اگر چہ جعفر کی زبان فارسی اور مقامی بولیوں کا ملغوبہ ہے۔ جس میں کہیں کہیں عربی مرکبات میں دیسی الفاظ بھی عجیب و غریب ڈھنگ سے شاعر نے شامل کر دیے ہیں جس کے باعث لطفِ مزاح میں مزید اضافہ ہو گیا ہے مگر رشید حسن خاں نے سب کو سامنے رکھ کر جو نتیجے نکالے ہیں وہ بے حد کارآمد اور مفید ہیں۔ کتاب کے ص 47 پر لکھتے ہیں:

''جعفر، صاحبِ استعداد تھا پختہ مشق اور درست نگار تھا۔ ان سب خوبیوں کے ساتھ اس کی زبان ملواں ہے۔ کہیں وہ عربی کے ٹکڑوں کو ریختہ کے انداز میں شاملِ عبارت کرتا ہے اور کہیں فارسی لفظوں کے ساتھ دیسی لفظوں کی ایسی گروہ بندی کرتا ہے کہ لطفِ بیان میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ مشاقی، قادر، الکلامی اور اس کی اچھی علمی استعداد، کہیں بھی اس کی زبان کو بگڑنے نہیں دیتی..... پیوند کاری ہے مگر لفظوں کا تلفظ بگڑنے نہیں پاتا۔ بس دل چسپ ترکیبیں اپنی بہار دکھاتی ہیں۔''

پھر ایک اور نتیجہ رشید حسن خاں یوں نکالتے ہیں جو اُردو زبان کی تاریخ کے لیے بے حد کارآمد ہے:

''اُردو کی لسانی تاریخ میں شمالی ہند کے حوالے سے کلامِ جعفر کی بنیادی اہمیت ہے۔ اس کے یہاں قدیم لفظیات کا قابلِ لحاظ ذخیرہ محفوظ ہے۔''

یہاں جعفر کی ایسی ملغوبہ زبان کی کچھ مثالیں دیکھتے ہیں:

(1) ''گھس پھُس رائے (اس نام میں بھی شاعر نے غالباً کچھ سیکس کی اشاری معنویت بھی رکھ دی ہے) ہرکارہ بہ عرض رسانید کہ راجہ پرتھپال، ڈولۂ کلچرکھ (کالی چَمرکھ) دختر خود را، بہ نظر مبارک حضرت فرستاد۔ احتمال آنکہ امروز و فردا برسد (احتمال کا طنز اور تنافر بھی محلِ شعر ہے) فرمودند: بھوک گئے بھوجن ملے اور جاڑا گئے قبائے، جوبن گئے تریا ملے، تینو دیو بہائے۔''

(2) فقر خستہ حال وٹڑوں ٹوں، بے زبان، وبختِ زبوں، شکستہ بال و لکڑوں کوں، میر جعفر چڑ رخ چوں... فقیر، از پیر پھیر دورِ اختلاف و کج کجا ہٹ الوقت، پُر گزاف ٹھور وٹھاؤں ہم گاؤں را گذاشتہ، آگے دوڑ پیچھے چھوڑ نمودہ... مثل غول ڈانو ڈول۔''

(3) بہ غرض رسید کہ اندھا دُھند خاں در ملک غنیم لئیم دائرۂ لشکر خود را در کفِ دستِ میدان زدہ، مور چال نہ کردہ۔ اندھے کی جورو کا خدا رکھوالا۔''

یہاں پر یہ بات غور طلب ہے کہ آخری جملہ جو ایک مثل ہے، جو آج تک اُسی طرح چلی آتی ہے، یہ مثل کس نے بنائی ہوگی؟ کیوں کہ یہ خالص کھڑی بولی بل کہ خالص اُردو ہے۔ اسی طرح کی دوسری مثلیں بھی جعفر کی تحریر میں درج ہیں جیسے: 'تجھے پرائی کیا پڑی اپنی نبیر تو' (ص 68)، 'اناڑی کے آگے..... کی خواری' (عام بول چال میں آج بھی یہ لفظ اور کہاوت اسی طرح ہے۔ 'خواری' کو عامی 'کھوداری' کہتا ہے) 'جوں جوں مرغی موٹی ہوئے توں توں...... سکڑتی جائے'، 'اونٹ کے منہ میں زیرہ' (یہ محاورہ آج بھی اسی طرح بولا جاتا ہے)، 'آ بھی میاں مانگتے اور باہر کھڑے درویش' (ص 70)، 'ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا' (ص 70) [یہ محاورہ بھی بعینہٖ آج بھی بولا جاتا ہے] 'عاشق اور خالہ جی ڈر' (ص 73)، 'خارشی کتا اور مخمل کی جھول'، 'چار دن کا چاندنا آخر اندھیرا پاکھ'، 'ناحق چوٹ جولا ہا کھائے / گرگھا چھوڑ تماشے جائے'، 'پاپی کا مال پراپت جائے / باسی رہے نہ کتا کھائے / اوکھلی میں سر دیا تو دھمکوں سے کیا ڈرنا' محلِ غور ہے کہ یہ محاورے جعفر سے پہلے کے بنے ہوں گے جو کہیں کہیں خالص اُردو کے معلوم ہوتے ہیں یا ایسی بول چال کی زبان ہیں جو آج بھی رائج ہے۔ تو جس نے بھی یہ محاورے بنائے اور جب بھی بنائے اس کی زبان کو ابتدائی اُردو کیوں نہ مانا جائے؟ میر جعفر تو محض ناقل ہوا۔ جعفر کا دور عہدِ عالم گیری یعنی وسط سترہویں صدی سے 1713 تک کا ہوا۔ 'زٹل نامہ' کی ترتیب کی تاریخ رشید حسن خاں نے تخمیناً عالم گیر کا انتیسواں سنہ جلوس یعنی 86-1685 بتایا ہے (ص 29-30)۔ ذرا اس اندازے کو اور بڑھایئے تو دس بیس برس اور پیچھے جانا پڑے گا کہ مثلوں کی تخلیق یقیناً اس ترتیبِ 'زٹل نامہ' سے پہلے کی ہوگی یعنی عہد شاہ جہانی کے قریب تک۔

اپنی بحثوں میں رشید حسن خاں نے ایک بڑے پتے اور معرکے کی بات کہی ہے کہ اُردو شاعر اور نثر نگاری میں احتجاج کی پہلی آواز جعفر زٹلی کی ہی کی آواز ہے۔ اُس مطلق العنان حکومتی دور میں امیروں وزیروں اور شہزادگان کے متعلق ایسی باتیں لکھنا بڑے دل گردے کا کام تھا جس بے خوفی سے ملکی سیاست، سماجی ناانصافی اور امرا و شہزادگان کی بے اعتدالیوں اور بد اخلاقیوں پر جعفر نے تنقید کی ہے اور جس بے باکانہ ڈھنگ سے، اس کا آج کے دور میں اندازہ کرنا مشکل ہے اور یہی بے باکانہ پن جعفر کو پھانسی کے پھندے تک لے گیا۔

بہر حال 'زٹل نامہ' یقیناً رشید حسن خاں کا اہم کارنامہ ہے جسے دیکھ اور پڑھ کر ان کی محنت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ انھوں نے جس محنت سے اس دور کی زبان، عبارت اور الفاظ کو ڈی سیفر (Decipher) یعنی حل کیا ہے اسے دیکھ کر مغربی محققین کی یاد تازہ ہو جاتی ہے علی الخصوص رچرڈ آلٹک (R. Altick) کے کارناموں کی یاد جس نے 'اسکالرس ایڈونچر' اور 'آرٹ آف لٹریری ریسرچ' جیسی اصولِ تحقیق پر کتابیں لکھ کر انگریزی ادب میں فنِ تحقیق میں ایک کارنامہ انجام دیا۔

ہاں چند باتیں اس اہم کارنامے میں محلِ نظر بھی ہیں اور تفتیش طلب بھی۔ صفحہ 145 پر ایک فٹ نوٹ پر رشید حسن خاں نے لکھا ہے:

☆۔ ''تیمور لنگ۔ ولادت 18/ اپریل 1336 انتقال 8 فروری 1304 (دائرۂ معارف اسلامیہ جلد ششم.......'') [زٹل نامہ، ص 145، سطر 14]

بھلا یہ کیوں کر ممکن ہے؟ پھر یہی تیمور لنگ 1398 میں ہندوستان پر حملہ بھی کرتا ہے۔ ہندوستان میں یہ محمد تغلق کا دور ہے جو تغلق خان دان کا آخری بادشاہ تھا۔ خاں صاحب سے یہ تسامح کیوں کر ہوا ہوگا؟

☆ ص 149 پر ایک فٹ نوٹ میں محمد معظم بہادر شاہ اوّل کے لیے لکھا ہے: ''زندگی کے آخری چند مہینے لاہور میں گزار کر بالآخر 20/ محرم 1124ھ / 27/ فروری کو اس نے وفات پائی۔''

بھلا یہ بھی کیوں کر؟ 1124ھ کی مطابقت سنہ عیسوی میں 1712 ہوتی ہے۔ غالباً

(ہفت روزہ ہماری زبان، انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، 8 تا 14 جنوری 2004، صفحہ 6 اور 8)

○○○

ڈاکٹر گوہر نوشاہی

'زٹل نامہ' کی ایک اور دریافت

[نیشنل یونی ورسٹی آف لینگویز، اسلام آباد کے جریدے 'دریافت۔4' کے شکریے کے ساتھ] اڈیٹر

رشید حسن خاں ایک ممتاز محقق اور زبان شناس ہونے کے ساتھ ساتھ تدوینِ متن میں بھی بلند مقام رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے ایک مرتبہ کسی مکتوب میں مجھے لکھا تھا کہ رشید حسن خاں تدوین و تصحیح متن کے دوران اپنے کام کو حرفِ آخر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ میرے نزدیک کوشش تو فنِ تحقیق کی پہلی اور بنیادی منزل ہے۔ رشید حسن خاں نے جو متن اب تک متعارف کرائے اور شائع کیے ہیں ان میں تو وہ یقین اور حتم کے مقام پر فائز نظر آتے ہیں۔ زیرِ نظر تحریر میں خاں صاحب کے اسلوبِ تحقیق و تدوین کو زیرِ بحث لانا میرا مقصود نہیں۔ میں تو خاں صاحب کی تحقیقی بصیرت، لگن اور شب و روز محنت کا دل و جان سے قائل ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ اپنی ریاضت اور کنج کاوی میں ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کا شکار ہو جاتے ہیں اور ان کے تحقیقی فیصلوں میں وہ توازن برقرار نہیں رہتا جو فنِ تحقیق و تدوین ان سے تقاضا کرتا ہے۔ بہر حال خاں صاحب کے تحقیقی اور تدوینی کارناموں کی عظمت اب دُنیائے علم و ادب میں ہر طرف پھیل چکی ہے اور ان کے نیاز مندوں اور معتقدین میں خود میں بھی شامل ہوں۔

رشید حسن خاں نے دُنیائے تحقیق کو اب تک جو اہم متون دیے ہیں ان میں 'باغ و بہار'، 'فسانۂ عجائب'، 'گلزارِ نسیم' اور 'مثنویاتِ شوق' کے متون اہلِ تحقیق سے خراجِ تحسین وصول کر چکے ہیں۔ اس وقت ان کا مرتّب کردہ 'زٹل نامہ' میرے سامنے ہے جو خاں صاحب کی اعلا تحقیقی صلاحیت اور زبان و ادب پر غیر معمولی دسترس کا شاہ کار ہے۔ میں اس وقت جناب رشید حسن خاں کے ان تحقیقی و تدوینی اصولوں پر بات نہیں کرنا چاہتا جو انھوں نے اس انتہائی مشکل اور ذمہ دارانہ کام کے سلسلے میں اپنائے ہیں، میں تو اس بات پر ان کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ ان کی جرأت اور پامردی کی بدولت ایک پراگندہ، متنازع اور ادبی لحاظ سے بظاہر غیر اہم متن پوری متانت، سنجیدگی اور علمی دیانت کے ساتھ قارئین کو میسر ہوا ہے۔ 'زٹل نامہ' کا متن رشید حسن خاں کے مرتّب کردہ دوسرے متون سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ اسے خاں صاحب نے سخت محنت اور جاں کاہی کے باوجود نہ تو حرفِ آخر تسلیم کیا اور نہ ہی حرفِ آخر بنانے کی کوشش کی ہے۔ چناں چہ فرہنگوں اور دیگر ضروری اور غیر ضروری تفصیلات کی جو دُنیا 'باغ و بہار'، 'گلزارِ نسیم' اور 'فسانۂ عجائب' سے وابستہ نظر آتی ہے، 'زٹل نامہ' اس سے کافی حد تک محروم ہے۔

جعفر زٹلی اُردو زبان کے اولین معماروں میں تھے جنھوں نے اُردو کے شعری اور نثری ادب کو اظہار و ابلاغ کے وہ سانچے دیے جن سے اس دور کا معاشرہ محروم تھا۔ وہ اُردو میں مزاحمتی ادب کے بانی ہیں اور انھوں نے اس زمانے میں ملوکیت کے استعمار گرانہ رویوں کے خلاف آواز اُٹھائی جب لکھنے والوں کی اس کے تصور سے روح کانپتی تھی۔ انھوں نے سچ بولنے کو معیارِ تخلیق قرار دیا اور حرف و خیال کو سچ بولنے کی ترغیب دی۔ جعفر نے اپنا قلمی نام اس لیے زٹلی رکھا کہ وہ گپ باز اور یاوہ گو کہلا کر اپنے لیے بعض ایسی باتیں کہنے کا جواز پیدا کرنا چاہتے تھے جنھیں اس عہد کا اشرافی اور وضع دار معاشرہ ثقہ اور سنجیدہ شخصیات کے شایان نہیں سمجھتا تھا۔ رشید حسن خاں قابلِ تحسین و ستائش محقق ہیں جنھوں نے ایک مجذوب کی بڑ کو علمی اور ادبی وقار کے ساتھ ان قارئین کو منتقل کیا جو نجس اور ناپاک ہونے کے ڈر سے ایسے ادب کے قریب نہیں جا سکتے تھے۔

محمد جعفر زٹلی 16 محرم 1125ھ مطابق 12 رفروری 1713 کو مغل بادشاہ فرخ سیر کے بارے میں ایک شعر کہنے پر جس میں اسے 'تسمہ کش' یعنی جلاّد کہا گیا تھا، موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جعفر کی وفات کے بعد عرصۂ دراز تک ان کا کلام محض ہنسنے ہنسانے اور تفننِ طبع کی غرض سے سینہ بہ سینہ سفر کرتا رہا اور اس کی نشر و اشاعت یا تحفظ کو سوقیانہ عمل سمجھ کر کوئی خاص اہمیت نہیں دی گئی۔ رشید حسن خاں کی اطلاع کے مطابق جعفر زٹلی کے 'زٹل نامہ' کا سب سے قدیم قلمی نسخہ 1206ھ مطابق 1791 یعنی ان کی وفات سے اسّی اکیاسی برس یعنی پون صدی بعد کا ہے جو ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ باقی تمام قلمی نسخے اس کے بعد ضبطِ تحریر میں آئے۔ رشید حسن خاں کے علم میں 'زٹل نامہ' کے دس قلمی نسخے ہیں جن میں سے آخری نسخہ 1280ھ کا کتابت شدہ ہے۔ خاں صاحب کے مطابق ان دس قلمی نسخوں کی تفصیل یہ ہے:

1۔ خطی نسخہ مخزونہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ، سالِ کتابت 1206ھ (92-1791)

2۔ خطی نسخہ مخزونہ ذخیرہ اشپرنگر، برلن، سالِ کتابت 1210ھ (96-1795)

3۔ خطی نسخہ مخزونہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ سالِ کتابت 1211ھ (1797)

4۔ نسخہ مخزونہ انڈیا آفس لائبریری لندن، سالِ کتابت ذیقعدہ 1218ھ (1804)

5۔نسخہ مخزونہ انڈیا آفس لائبریری لندن، سالِ کتابت 1823

6۔نسخہ مخزونہ رضا لائبریری رام پور، کتابت بہ عہد نواب احمد علی خاں متوفی 1256ھ (1804)

7۔ایضاً 2، ترقیمہ ندارد

8۔نسخہ مخزونہ کتاب خانہ ادارہ ادبیاتِ اُردو حیدرآباد، سالِ کتابت 1275ھ (1858)

9۔نسخہ جناب فیروز بخت (کناڈا) ناقص الآخر

10۔نسخہ خدابخش لائبریری پٹنہ، سالِ کتابت 1280ھ

'زٹل نامہ' کی تدوین کے دوران مرتّب نے ان دس قلمی نسخوں کے علاوہ اس کتاب میں درج ذیل چار مطبوعہ نسخوں سے بھی استفادہ کیا ہے:

1۔مطبوعہ مطبع علوی علی بخش خاں (لکھنؤ) 1271ھ (1855)

2۔مطبوعہ مطبع حیدری بمبئی، سالِ طبع 1284ھ (68-1867)

3۔مطبوعہ مطبع محمدی (دہلی) سالِ طبع 1289ھ (1872)

4۔مرتّبہ ڈاکٹر نعیم احمد (علی گڑھ) سالِ طبع 1979

رشید حسن خاں نے ان تمام قلمی اور مطبوعہ نسخوں کا تعارف بہت تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ 1855 میں کلامِ جعفر کی پہلی اشاعت سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ انیسویں صدی میں معاشرتی و تہذیبی تصادم اور شکست و ریخت نے فارسی زبان کے جبر اور مجبوری سے جہاں اہلِ قلم کو خود مختاری اور بغاوت کا احساس کرایا وہاں نظیرؔ اکبرآبادی کی طرح جعفر زٹلی کے کلام کو بھی ادبی قدر و قیمت کے مطابق پذیرائی حاصل ہوئی ورنہ اس سے پہلے نظیرؔ اور جعفرؔ دونوں کے کلام پر شوقیانہ اور خلافِ وضع شاعری کا ٹھپہ لگا ہوا تھا۔ رشید حسن خاں نے 'زٹل نامہ' کی آخری تدوین کو اطمینان بخش قرار نہیں دیا چناں چہ خاں صاحب، ڈاکٹر نعیم احمد (مرحوم) کے کام پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے 'زٹل نامہ' کے مقدمے میں رقم طراز ہیں:

''یہ کہنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم (ڈاکٹر نعیم احمد) کو تدوین کے طریقۂ کار سے کم واقفیت تھی اور ادبی تحقیق کے تقاضوں سے بڑی حد تک بے خبر تھے۔''

رشید حسن خاں کے مرتّبہ 'زٹل نامہ' پر تفصیلی بحث کا یہ موقع نہیں، اسے کسی دوسری نشست پر موقوف کرتے ہوئے زیرِ نظر تحریر کے مقصد کی طرف آتا ہوں۔

میرے کتب خانے میں ایک قلمی نسخے کا عکس ہے۔ اصل نسخہ کسی زمانے میں اُردو کے ممتاز محقق خلیل الرحمٰن داؤدی مرحوم کی ملکیت تھا جسے انھوں نے اسلام آباد میں کسی نجی کتب خانے کے مالک کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ اس مخطوطے پر داؤدی صاحب کے قلم سے لکھا ہے:

''لطائف مزاقیہ ظرائف جعفر زٹلی''

خلیل الرحمٰن داؤدی کی عادت تھی کہ وہ اپنے ہر ملکیتی مخطوطے کے آغاز میں اضافی اوراق شامل کر کے ان پر مخطوطے کے تفصیلی کوائف لکھا کرتے تھے۔ یہ مخطوطہ چوں کہ آغاز میں مصنف کے اعتبار سے ناشناختہ اور بے تاریخ تھا اس لیے اس پر داؤدی صاحب کی تحریر موجود نہیں۔ مخطوطے کے آغاز میں افیمیوں کے مزاحیہ لطیفے ہیں جن کی اُردو نثر زبان اور اسلوبِ نگارش کے اعتبار سے فورٹ ولیم کے زمانے لیکن اس کے باہر کی نثر کی یاد تازہ کرتی ہے۔ مخطوطے کا خط شکستہ مائل ہے اور انیسویں صدی کے آغاز سے تعلق رکھتا ہے۔ آغاز اس طرح ہے:

''یا فتاح

رب یسّر وتمم بالخیر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حمد و سپاس بے قیاس بے نہایت وثنائے بے غایت اس جناب....

الوہیت کو کہ جس کا ظہور پُر نور ہر جا جلوہ گر ہے.....''

یہ مخطوطہ کل تیرہ اوراق پر مشتمل ہے جن میں سے پہلے گیارہ اورق افیونیوں کے مسجع اور مقفیٰ نثر میں لطیفے ہیں۔ مخطوطے کے تمام اوراق آسیب دیدہ اور دیمک خوردہ تھے جس سے بعض الفاظ ایک برداری میں نہیں آ سکے اور مشکل سے پڑھے جاسکتے ہیں۔ اس مخطوطے کے اوراق 12 یا 13 پر جعفر زٹلی سے منسوب نظم و نثر کے چار متون ہیں جن کے عنوان یہ ہیں:

1۔جوں نامہ

2۔تمسک بے تک میر جعفر زٹلی کا

3۔نظم از میر جعفر زٹلی: رباعی

4۔قطعہ/رباعی

یہ چاروں متون 'زٹل نامہ' مرتّبہ رشید حسن خاں میں موجود ہیں لیکن میرے پیشِ نظر مخطوطے اور رشید حسن خاں کے مرتّبہ متون کی روایت میں کافی اختلاف ہے جس بنا پر میں زیرِ نظر مخطوطے میں شامل متون کو زٹل نامہ کی ایک اور روایت یعنی ایک مزید روایت کا نام دے رہا ہوں۔ ذیل میں ان چاروں متون کو مخطوطے کی روایت کے مطابق نقل کیا جاتا ہے اور ساتھ ہی 'زٹل نامہ' مرتّبہ رشید حسن خاں کے ساتھ مقابلہ کر کے ان کے اختلافات کی نشان دہی کی جاتی ہے:

1۔جوں نامہ

’زٹل نامہ‘ مرتبہ رشید حسن خاں میں یہ نظم صفحہ 183 پر موجود ہے اور اس کا عنوان ’سپاس نامہ‘ ہے۔ حاشیے میں صراحت کی گئی ہے کہ ’زٹل نامہ‘ کے کئی نسخوں میں اس کا عنوان ’جواں نامہ‘ بھی ہے، رشید حسن خاں کے ہاں یہ نظم 16 اشعار پر مشتمل ہے جب کہ ہمارے مخطوطے میں اس کے اشعار کی تعداد صرف سات ہے اور متن درج ذیل ہے:

حضو ر جہاں شاہ گیتی پناہ
ز بیداد جوانوں [1] زٹل داد خواہ
جوئیں پڑ گئیں د ر قبا و ازار
پھروں کھیلتا میں جونوں کے شکار [2]
جوئیں [3] مارتے مارت شب گزشت
ولے ایک جوں ازمیاں [4] کم نہ گشت
ہزاروں [5] جوئیں اور اکیلا منم
دونوں ہاتھ سے تا کجا می زنم
بڑا پہلوان است افراسیاب
مگر جنگ جوؤں کی دارد نہ تا ب [6]
زر ستم ستیز د ہر ایک جوں بزور
ز بر زد بر آرد فغاں جملہ شور [7]
اگر جوں کا حملہ ہو بر ملک روم [8]
تو بولے وہاں رات دن چغد و بوم

’زٹل نامہ‘ مرتبہ رشید حسن خاں سے متنی اختلاف:

1۔ زٹل نامہ: جوآں، جعفر زٹلی نے پنجابی تلفظ استعمال کیا ہے
2۔ زٹل نامہ: بنی آن مشکل بہ دہلی دیار
3۔ زٹل نامہ: جوآں
4۔ زٹل نامہ: ولے یک جوآں ازمیاں
5۔ زٹل میاں: کروڑوں جواں....
6۔ زٹل نامہ: کہ از زور جوآں خورد پیچ وتاب
7۔ زٹل نامہ ندارد

2۔ تمسک بے تک میرِ جعفر زٹلی کا [1]

منکہ شیخ بولانہ دارم چولھا، ساکن چولھا، ساکن قصبہ او جاڑنگر ضلع غیب پورام۔ چوکہ [2] مبلغ بے تعداد کہ نصف آں یک خرمہرہ نمی شود از لہ گوبر گنیش [3] قرض گرفتہ در تحت تصرف خود آوردہ ام [4] لہذا اقرار [5] نمی کنم و نوشت نمی دہم کہ ثانی الحال سند نباشد بوعدہ ادائگی روز، قیامت قرض گرفتم فقط البعد اسمہ، موہوم وتمسکہ، مرقوم۔ فی التاریخ فلاں۔ احمق ولد بیوقوف وخبط الحواس الدسراپا ہنگاس گواہ شد۔

اختلافِ متن:

1۔ زٹل نامہ: عنوان محض تمسک‘ ہے
2۔ زٹل نامہ: چوں
3۔ زٹل نامہ: از لالہ تہمت رام بہ دھینگا مشتی وز ودوکوب وجوتم جا تا ولاٹھم لاٹھا گرفتہ تحت تصرفِ خود
4۔ آوردم
5۔ زٹل نامہ: اقرار کے بعد پوری عبارت مختلف ہے جو یوں ہے: ’’اقرار آں کہ تا قیامت ادا نہ سازم۔ ایں چند کلمہ بہ طریق ٹالم ٹالا نوشتہ دادہ شدہ کہ ثانی الحال سند نباشد و عند الحاجت بکا نیاید۔ تحریر فی التاریخ سنہ جلوسی غلط‘‘۔

3۔ نظم از میرِ جعفر زٹلی (رباعی)

جعفر امن برہِ کوئے تو لٹو شدہ ام
مرکب جان برہت تاختہ ٹٹو شدہ ام

فارغ از ہر دو جہاں ہیچو نکھٹو شدہ ام

یہ رباعی جسے وزن کے اعتبار سے قطعہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا، رشید حسن خاں کے مرتبّہ 'زٹل نامہ' میں موجود نہیں اور جعفر زٹلی کے غیر مطبوعہ اور غیر مدون کلام کا درجہ رکھتا ہے۔

4۔ قطعہ/رباعی

اے در نبرد حسن تو گشتہ پچھاڑ چشم
زیر مژہ نہفتہ صد آہو بہ جھاڑ چشم
جعفر بکوے دوست اگر بھیڑ بھاڑ سے
تو بھی گھسڑ پُسڑ کے وہاں دے گھساڑ چشم

اس قطعے کا دوسرا شعر زٹل نامہ کے صفحہ 311 پر موجود ہے۔ لیکن دوسرے مصرعے میں 'وہاں دے' کی بجائے جلدی ہے جو ساقط الوزن معلوم ہوتا ہے۔ رشید حسن خاں نے اس شعر کو جعفر زٹلی کے مشکوک کلام میں شمار کیا ہے۔ میرا گمان یہ ہے کہ دونوں شعر جعفر کی کسی غزل نما نظم کے ہوں گے جس کا صرف ایک شعر رشید حسن خاں کو زٹل نامے کے تین مطبوعہ نسخوں میں متفقہ طور پر ملا ہے۔

جعفر زٹلی کے مندرجہ بالا دونوں قطعات ان لاتعداد اشعار کی طرح ہیں جو سینہ بہ سینہ سفر کر رہے ہیں اور انھیں ابھی تک تدوین نصیب نہیں ہوئی اس لیے کہ رشید حسن خاں نے کلام جعفر زٹلی کے جو خصائص بیان کیے ہیں ان پر توان سے منسوب یہ اشعار بھی پورے اترتے ہیں۔

اگر ٹنڈاں نہ باشد با ار یڑی
نہ آید آب گر صد بار گیڑی
اگر دریاے میں پانی نہ ہو وے
نہ ہلّد با ہزاراں زور بیڑی
بود آں مرد زندہ در جہنم
کہ دارد در نکاح عورت مریڑی

درحقیقت جس شخص کے کلام کو سراغ ہی اس کی وفات کے اکیاسی برس بعد ملا ہو اس کے اصلی اور جعلی یا الحاقی کلام کے بارے میں حتمی طور پر کیا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ رشید حسن خاں کے کام کی عظمت یہ ہے کہ انھوں نے اخلاقی اقدار سے محروم ایک شخص کے فحش اور غیر مہذب کلام کو جدید فن تدوین کے مطابق مرتّب کیا۔ اس محنت اور پامردی کی داد جس قدر دی جائے کم ہے۔

(رسالہ ''دریافت'' نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجیز، اسلام آباد، شمارہ چار، ستمبر 2005 صفحہ 159 تا 166)

(سہ ماہی 'اُردو ادب' صفحہ 139 تا 144، انجمن ترقی اُردو (ہند)، نئی دہلی، اکتوبر نومبر دسمبر 2005)

نوٹ: رشید حسن خاں کچھ یادیں کچھ جائزے، مرتبین ڈاکٹر محمد آفتاب اشرف، جاوید رحمانی صفحہ 265 تا 271، مکتبہ الحرا، دربھنگہ بہار 2008، میں اس مضمون کو ''زٹل نامہ کی ایک روایت'' کے نام سے شامل کیا گیا ہے۔

OOO

گیان چند جین

خدائے تدوین

رشید حسن خاں کی کتابوں پر لکھنے کے لیے کم از کم ایک سال کی مدت چاہیے تاکہ سوڈیڑھ سو صفحوں کا سیر حاصل مقالہ تسوید کیا جا سکے۔ زندگی مختصر مجھے اتنی مہلت دینے کو تیار نہیں، میں اپنے تصنیفی کام میں مصروف ہوں اس لیے مختصر رشید حسن خاں کی دوشاہ کار تدوینوں کی داد دوں گا لیکن اس سے پہلے ان کی بعض اور کتابوں کے بارے میں دو حروف۔

مکتبہ جامعہ نے معیاری سیریز کا آغاز کیا جس کے تحت قدیم ادب کی کتابیں صحت متن اور ضروری فرہنگ کے ساتھ شائع کیں۔ ان کی قیمت کم رکھنے کے لیے متعلقات متن کو طول نہیں دیا۔ ''کتاب نما'' کی ایک حالیہ فہرست کے مطابق رشید حسن خاں نے اس سلسلے کے لیے ذیل کی کتابیں تیار کیں:

''باغ و بہار، سحر البیان، گلزارِ نسیم، انتخاب ناسخ، موازنہ انیس و دبیر، حیاتِ سعدی، انتخابِ مضامین شبلی، دیوانِ درد، مقدمۂ شعر و شاعری۔''

میرے پاس ان میں سے کچھ کتابیں ہیں، بقیہ نہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان میں سب سے اہم ''باغ و بہار'' اور ''انتخاب ناسخ'' ہیں۔ معیاری سیریز میں ''انتخاب ناسخ'' اس لحاظ سے منفرد ہے کہ

اس میں تقریباً سوا سو صفحوں کا مقدمہ ہے، عام طور سے اس سیریز میں دو چار صفحوں کا ہی مقدمہ ہوتا ہے۔ میں نے اس انتخاب پر تبصرہ کیا تھا جو پہلے ''کتاب نما'' میں شائع ہوا تھا اور پھر میرے مجموعۂ مضامین ''ذکر و فکر'' میں۔ اس مقدمے کے کئی پہلو قابلِ ذکر ہیں جن میں اہم ترین یہ ہے کہ خاں صاحب نے اس غلط فہمی کا ازالہ کیا کہ ناسخ نے اصلاح زبان کے ضابطے بنائے تھے۔ انھوں نے کئی اقتباسات سے ثابت کیا کہ یہ ضابطے ناسخ کے بعد ان کے شاگردوں نے بنائے تھے۔ مقدمے کا اتنا ہی اہم حصہ ناسخ کے رنگ سخن کی تعین ہے۔ اس میں رشید حسن خاں کامیاب نقاد کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔

تلاش و تحقیق کی بنا پر تنقید کرنا ان کا رنگ خاص ہے۔ فیض اور جوش کے متعلق ان کی تنقیدیں مشہور ہیں۔ ان کے تنقیدی مقالات کا مجوعہ ''تلاش و تعبیر'' کے نام سے سامنے آ چکا ہے۔

معیاری ادب سیریز کے تحت باغ و بہار، سحر البیان اور گلزار نسیم میں متن تو معتبر ہے ہی ان میں شامل فرہنگ بھی بہت مفید ہے۔

رشید حسن خاں قاضی عبدالودود کے پیروں ہیں۔ حالیہ دو شاہ کار تدوینوں سے پیش تر ان کی شہرت ایک خوردہ گیر محقق کی تھی۔ اس سلسلے کے ان کے بعض مضامین ان کے مجموعے ''ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ'' (علی گڑھ 1978) میں ملتے ہیں۔ ان میں تین تبصراتی مضامین اہم ترین ہیں۔ دیوان غالب صدی اڈیشن، اُردو شاعری کا انتخاب اور علی گڑھ تاریخ ادب اُردو۔ تینوں تبصرے یک رُخی ہیں یعنی ان میں محض اغلاط دکھائی دیتے ہیں خوبیوں کے بارے میں ایک لفظ نہیں کہا۔

دیوان غالب صدی اڈیشن کے مرتب مالک رام ہیں۔ اس پر خاں صاحب کا تبصرہ پہلے رسالہ ''تحریک'' دہلی غالب نمبر 1969 میں شائع ہوا، بعد میں ''اُردو تحقیق اور مالک رام'' کی کتاب میں اور تیسری باران کے مجموعے ''ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ'' میں۔

خاں صاحب نے یہ تبصرہ بڑی دیدہ ریزی اور عمیق نظر سے لکھا ہے۔ کاش انھوں نے غیر جذباتی رنگ میں لکھا ہوتا اور خامیوں کے بیان کے ساتھ مالک رام کے اکتسابات کا بھی اعتراف کیا ہوتا۔ رشید حسن خاں کے اعتراضات اور تجاویز میں سے بیش تر سے متفق ہوں بعض سے نہیں۔ تفصیل کا موقع نہیں۔ جسے اس سے دل چسپی ہو وہ میرا مضمون ''مالک رام بہ حیثیت ماہر غالبیات'' دیکھ لے جو میرے مجموعے ''ذکر و فکر'' (الہٰ آباد 1980) میں شامل ہے۔

دوسرا اہم تبصرہ ڈاکٹر زور کی مرتبہ ''اُردو شاعری کا انتخاب'' پر ہے۔ انتخاب ساہتیہ اکادمی کی فرمایش پر کیا گیا تھا۔ خاں صاحب نے اس میں تحریف متن کے جو نمونے دیے اور انتخاب میں عدم توازن کی نشان دہی کی اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام ڈاکٹر زور نے خود نہیں کیا بل کہ کسی شاگرد سے کرایا ہے۔ تیسرا شہرت یافتہ تبصرہ علی گڑھ تاریخ ادب اُردو پر ہے۔ رشید حسن خاں نے اس تاریخ کی خامیوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ مشہور ہے کہ رشید حسن خاں کے تبصرے کے بعد کتاب بازار سے واپس لے لی گئی۔

صحتِ زبان کے سلسلے میں ان کا پہلا شاہ کار ان کی ضخیم کتاب ''اُردو املا'' (ترقی اُردو بورڈ، دہلی 1974) اور دوسرا شاہ کار اسی ادارے سے شائع شدہ ان کا مضمون کا مجموعہ ''زبان اور قواعد'' (دہلی 1976) ہے۔ ان کتابوں میں انھوں نے زبان کے مسائل پر جس علم و فضل اور قدیم کتب میں جس گہری نظر کا ثبوت دیا ہے وہ ہمارے زمانے میں تقریباً نایاب ہے۔ ''اُردو املا'' میں انھوں نے متعدد الفاظ کے جس تلفظ اور املا کی سفارش کی ہے ان میں سب سے اتفاق کرنا مشکل ہے لیکن انھوں نے اپنے موقف کی تائید میں جو اسناد پیش کی ہیں انھیں رد کرنا آسان نہیں۔ ''زبان اور قواعد'' کے مضامین میں جن قدیم کتب اور رسالوں سے حوالے اور اقتباسات دیے ہیں ان میں سے بعض کا ہم نام لیا کرتے ہیں، انھیں دیکھتے نہیں۔ دوسری طرف متعدد ایسے ماٰخذ ہیں جن کو ہم نے، کم از کم میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ اُردو کے کلاسیکی دفینے پر ایسی نظر اس دور میں شاید ہی کسی دوسرے شخص کی ہو۔ مجموعے کے آخر میں انھوں نے بحر لکھنوی کا رسالہ ''بحر البیان'' پورے کا پورا شامل کر دیا ہے۔ یہ خوب کیا۔

رشید حسن خاں نے مالک رام کے مرتبہ دیوان غالب پر اعتراض کیا۔ ان سے یہ کہنے کو جی چاہتا تھا کہ حضرت دوسروں کے بخیے تو بہت ادھیڑ چکے کچھ خود بھی کر کے دکھایئے تا کہ معلوم ہو کہ آپ کتنے پانی میں ہیں۔ خاں صاحب نے اس ساکت سوال کا مُسکت جواب دیا اور جواب بھی ایک نہیں دو دو۔ انھوں نے پہلے فسانۂ عجائب کی اور پھر باغ و بہار کی تدوین کی اور اس طرح کی کہ آگے سوچا ہی نہیں جا سکتا۔ میں دونوں کارناموں کا تعارف پیش کرتا ہوں۔

فسانۂ عجائب:

اسے انجمن ترقی اُردو ہند نے شائع کیا۔ سنہ اشاعت 1990 درج ہے لیکن رشید حسن خاں نے مجھے اس کتاب کی جو جلد پیش کی اس پر 26 دسمبر 1989 کی تاریخ درج ہے۔ یہ عام بات ہے کہ کتاب پر جو تاریخ اشاعت درج ہے، وہ بازار میں اس سے بعد میں آئی ہو۔ یہ شاذ ہے کہ جو سنہ اشاعت چھپا ہے، کتاب اس سے پہلے سال میں شائع ہو چکی ہو۔ تدوین کے اعتبار سے فسانۂ عجائب کا انتخاب کرنا ایک ہفت خواں کا سامنا کرنا ہے۔ ایک تو اس کی مشکل زبان، پھر مختلف اڈیشنوں میں مصنف کی ترمیم اور اضافے۔ رشید حسن خاں سے پہلے کئی محققوں نے اس کتاب کی ترتیب کی لیکن جب انھوں نے کی تو معلوم ہوا کہ اس کی تدوین کیسے کی جانی چاہیے تھی چند صفحات میں اس کے محاسن کا احاطہ مشکل ہے۔ بہتر ہے کہ قاری خود اس کی ورق گردانی کر کے گل چینی کرے۔ اس کی ابتدا میں 114 صفحات کا مقدمہ ہے۔ پھر صحیح ترین متن، اس کے بعد تقریباً ڈھائی سو صفحوں پر ضمیمے، فرہنگ اور اشاریہ۔ میں نہیں جانتا کہ مقدمہ، متن اور تعلیقات میں کس حصے کو زیادہ عالمانہ قرار دوں۔ کتاب کا یہ عالم ہے:

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جاں ایں جاست

مقدمے کے ابتدائی حصے میں انھوں نے تدوین کی حدود متعین کی ہیں اور اس سے اتفاق کرنا ہوگا۔ لکھتے ہیں:

''تدوین کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی متن کو ممکن حد تک منشاے مصنف کے مطابق پیش کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس میں بنیادی حیثیت صحتِ متن کی ہوتی ہے۔'' (مقدمہ ص22)

ان کے مطابق مصنف کی مفصل سوانح تشکیل کرنا، داستان کے ماخذ کی نشان دہی اور اس کا تنقیدی جائزہ تدوین متن میں داخل نہیں۔ سوانح یا ماٰخذ کو مختصراً دیا جا سکتا ہے۔ مدون کو محض متعلقات متن پر توجہ مرکوز رکھنی چاہیے۔

اس کے بعد انھوں نے سرور کی ''ولادت''، وطن، وفات اور مدفن'' کا عنوان قائم کیا ہے۔ اس میں انھوں نے یہ اطلاع دی کہ منشی نول کشور نے فسانۂ عجائب کا حقِ اشاعت خرید کر 1283 ہجری میں

پہلا اڈیشن شائع کیا لیکن اس سے پہلے بھی نول کشور اس کتاب کو شائع کر چکے تھے۔1283 ہجری کے اڈیشن کو خاں صاحب نے برسوں کی تلاش کے بعد بہم پہنچایا(ص 27۔26)محمورا کبرآبادی کے مرتبہ رام نرائن لعل اڈیشن(1974)کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ یہ بارِ دوم ہے، پہلی اشاعت 1928 کی ہوگی۔عرض کرتا ہوں کہ میرے پاس یہ اڈیشن زمانۂ طالب علمی سے ہے۔ایم اے کے کلاس میں بھی اسی سے متن خوانی کرتا تھا۔فی الوقت میں نے یہ اڈیشن اپنے بڑے بھائی پرکاش مونس کو بجنور بھیج رکھا ہے۔

سرور کے وطن کے سلسلے میں بھی یہ عام طور سے تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ لکھنؤ کے باشندے تھے لیکن ڈاکٹر حنیف احمد نقوی نے تین قدیم تذکروں میں کچھ اور ہی پایا۔ مبتلا و عشق میرٹھی نے تذکرہ طبقاتِ سخن میں اور خیراتی لال بے جگر نے اپنے تذکرے میں بھی انھیں ساکن کالنہ پور قرار دیا ہے۔یہ بیانات اس وقت کے ہیں جب سرور نے فسانۂ عجائب نہیں لکھی تھی۔حیرت ہے کہ ڈاکٹر نیّر مسعود اور رشید حسن خاں اپنی اپنی کتاب مرتب کرتے وقت ان تینوں کے مآخذ سے ناواقف تھے۔حنیف نقوی کے مطابق سرور کے اہلِ خاندان کا مستقل قیام کان پور میں تھا۔ان سب سے سرور کی لکھنؤ سے وطنی نسبت کے متعلق شبہے کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔لیکن سرور صاحب نے فسانۂ عجائب کی تمہید میں کان پور کی جس شدت کے ساتھ ہجو کی ہے اس کے پیش نظر یہ امکان نہیں رہتا کہ کان پور ان کا وطن مالوف ہوگا۔

قطع کلام کر کے مجھے ایک بات کہنی ہے۔رشید حسن خاں نے اس کتاب میں، نیز باغ و بہار میں فٹ نوٹ میں بہت سے اہم مطالب درج کیے ہیں جن کا متن مقدمہ سے براہ راست تعلق ہے۔انھیں حاشیے میں کیوں جگہ دی گئی، متن میں کیوں نہیں۔مثلاً زیرِ نظر کتاب کے ص 28 کے حاشیے 4 کو جس میں مفتی انتظام اللہ شہابی کے سرور کو اکبرآبادی قرار دینے کا ذکر ہے۔خاں صاحب کے ذہن میں حاشیے کے حصار کی بات صاف نہیں معلوم ہوتی۔فٹ نوٹ میں عام سے مآخذ کا حوالہ دیا جاتا ہے یا ایسے تبصرے جو متن میں دیے جائیں تو کل در معقولات معلوم ہوں۔حتی الامکان تبصراتی حاشیے متن ہی میں شامل کرنے چاہئیں۔حواشی متن پر غالب نہ ہونے پائیں نہ اس کے حریف ہوں۔حواشی کے مطالب کے صحیح حصار کے لیے ملاحظہ ہو میری کتاب ''تحقیق کا فن(لکھنؤ 1990)ص 24-323۔

''نوازش اور اصلاح'' کے عنوان کے تحت فسانۂ عجائب میں سرور کے استاد نوازش کے اشعار کی بحث بڑے عارفانہ انداز میں کی ہے۔فسانۂ عجائب کے صاحب فرمائش کے بارے میں یہ دریافت کہ وہ سرور کا مرد محبوب ہوسکتا ہے دل چسپ اور قابل قبول ہے۔(ص 45)۔

لکھتے ہیں کہ قصے کہانیوں کی کتابوں میں نوطرز مرصع کو چھوڑ کر اور کوئی کتاب مشکل زبان میں نہیں لکھی گئی تھی(ص 55)۔میں عرض کرتا ہوں کہ حکیم مجبور کی گلشن نو بہار کے بھی بعض حصے حسبِ توفیق مرصع اسلوب میں لکھے گئے ہیں مثلاً:

''او پرسخن وران شیریں مقال و نکتہ دانانِ صحیفۂ خیال کے حقیقت اس شکستہ حال، وابستۂ ملال ضیم الاعمال وخیم الخصال، آوارۂ بادیۂ کربت و سرگشتہ صحرائے غربت کے اخفا اور پوشیدہ نہ رہے۔''

(گلشن نو بہار مرتبہ ڈاکٹر سلیمان حسین لکھنؤ 1985 ص 84)

مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ سرور نے اس کتاب کے اسلوب کی تقلید کی۔خاں صاحب نے مقدمہ 61 سے 74 تک سرور زبان و بیان پر بحث کی ہے۔متون کے مرتبین لسانیاتی مطالعے بھی کرتے ہیں لیکن خاں صاحب کا بیان ان کے عام اسلوب نگارش کے مطابق معلوماتی اور دل آویز دونوں ہے۔اکثر اوقات کسی مصنف پر لکھنے والے اس کی مدلل مداحی کو اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔رشید حسن خاں سرور کے طرف دار نہیں، اس کی تخلیق کے حسن و قبح دونوں کو بیان کرتے ہیں مثلاً:

''فسانۂ عجائب کی نثر میں بہت سے مقامات پر کچّا پن محسوس ہوتا ہے اور لفظی رعایتوں کی غیر ضروری پابندی نے بے ڈھنگا پن بھی پیدا کیا ہے۔جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے، اس میں ان کی، کم مشقی، کا دخل زیادہ معلوم ہوتا ہے(ص 65)

''متعدد مقامات پر بیان میں ایسا بھدّا پن ہے کہ اسے بے اختیار 'پھوہڑ پن' کہنے کو جی چاہتا ہے''۔(ص 69)

انھوں نے اس کی جو مثالیں دی ہیں وہ ان جیسا خود اعتماد شخص ہی فراہم کرسکتا تھا۔خاصے کے یہ بیانات ان کی تنقیدی نظر کی دین ہیں۔انھوں نے جو لسانی تجزیہ کیا ہے وہ روایتی تجزیے سے بہت مختلف اور مفید تر ہے۔اس کے بعد انھوں نے قلمی اور مطبوعہ نسخوں کی تفصیل دی ہیں۔لکھتے ہیں:

''اب تک اس کتاب کے کسی ایسے خطی نسخے کا پتا نہیں چل سکا جو مکمل کتاب پر حاوی ہو۔عہد مصنف کا مکتوبہ ہو اور اس سے متن کی صحیح ترتیب میں مدد لی جاسکے۔''(ص 76)

''فسانۂ عجائب'' کی موجودہ ہیئت کا کوئی مخطوطہ نہیں لیکن محمود الٰہی والا بنیادی متن اور نورالحسن ہاشمی کا مملوکہ میر فضل رسول والا نسخہ دونوں مکمل کتاب پر حاوی ہیں۔میں نے ان دونوں کے جزوی اختلاف پر ایک مفصل مضمون لکھ کر رسالہ 'اُردو' کراچی شمارہ 1، شمارہ 1986، نیز ''آج کل'' بابت مئی 1986 میں شائع کرادیا۔بعد میں اسے اپنے مجموعۂ مضامین ''کھوج''(دہلی 1990)میں شامل کر لیا۔اس مضمون میں میں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ محمود الٰہی کا نسخہ ہاشمی کے نسخے سے قدیم تر معلوم ہوتا ہے۔رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

''پھر یہ بات بھی ہے کہ یہ نسخے میرے دائرۂ کار سے قریب کی نسبت بھی نہیں رکھتے۔میرا اصل مقصد تو اس متن کی اس صورت کو پیش کرنا ہے جسے آخری بار مصنف نے پیش کیا تھا اور اس میں ان نسخوں کے مباحث کے شمول کی نہ گنجایش ہے نہ ضرورت۔''(ص 102)

خاں صاحب نے مطبوعہ نسخوں کے مختلف طور پر حرف علامات ح، م، ک وغیرہ کا استعمال کیا ہے۔ان سے مرتب کو سہولت ہوجاتی ہے لیکن قاری کی الجھن کا سامان ہوجاتا ہے۔اسے یاد نہیں رہتا کہ کون سا حرف کس نسخے کی علامت ہے۔اگر ان کی بجائے لفظی مخففات مثلاً حسنی 1 مصطفائی حیدری، حسنی 2۔محمدی۔افضل۔نجم اور نول وغیرہ استعمال کرتے تو ذہن کو بھٹکنا نہ پڑتا۔مقدمے کے آخری حصے میں علامات و رموزِ اوقاف کی تفصیل ہے۔ان کے ذریعے سے انھوں نے صحت متن کی جو کوشش کی ہے وہ بے نظیر ہے مثلاً ذیل کی علامت دیکھیے:

یائے مخلوط کے لیے اس پر آٹھ کے ہندسے کا نشان مثلاً پیار۔واوِ معدولہ کے نیچے خط مثلاً خوِ زادہ۔درمیانِ لفظ واقع نونِ غنہ پر قوس کا الٹا نشان۔جیسے آنت۔

انھوں نے اسمائے معرفہ یعنی علَم کے اوپر خط کھینچا ہے۔میری رائے میں قطعاً غیر ضروری ہے انگریزی میں کتابوں کے نام پر ترچھے حروف Italic میں چھاپے جاتے ہیں۔مصنف اپنے مسودے میں کتابوں کے نام کے نیچے خط کھینچ دیتا ہے جو پریس کے کمپوزیٹر کے لیے اشارہ ہوتا ہے کہ اس لفظ کو ترچھے حروف میں چھاپا جائے۔باقی اعلام کو خط کشیدہ نہیں کیا جاتا۔خاں صاحب اپنی تحریروں میں اشخاص

اور کتب کے ناموں کے اوپر خط کھینچتے ہیں۔ وضاحت کو اس کی ضرورت نہیں، ہاں بدنمائی ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔

انھوں نے اپنے مقدمے میں ایک اور نرالے رمزِ اوقاف بڑے بریکٹ [ ] کا استعمال کیا ہے۔ اُردو اور انگریزی تحریروں میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ انگریزی فقرۂ معترضہ کو دو لمبی لکیروں کے بیچ محصور کر دیا جاتا ہے اور یہ قوسین کا نعم البدل ہیں۔ اُردو میں اگر اُلٹے کاما سے اگر کام نہ چل سکے اور وضاحت کی غیر معمولی کوشش ہو تو چھوٹے بریکٹ یعنی قوسین ( ) کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ترتیبِ متن میں بڑا بریکٹ صرف وہاں استعمال کیا جاتا ہے جہاں دوسرے کی عبارت کے بیچ چھوٹے ہوئے ایک آدھ لفظ کو خلا پُر کرنے کے لیے لکھا جاتا ہے۔ بڑا بریکٹ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس سے محصور الفاظ اصل متن میں موجود نہ تھے، مدوّن نے قیاساً لکھے ہیں۔ اس سے ہٹ کر عام تحریر میں بڑے بریکٹ کا استعمال خواہ مخواہ الجبرائی رنگ پیدا کر دیتا ہے۔ چھوٹے بریکٹ کا استعمال بھی کم سے کم کرنا چاہیے۔

مجھے ان کی زبان کے محض دو الفاظ کے بارے میں عرض کرنا ہے۔ انھوں نے جا بجا مصرع مطبع وغیرہ کو املے کی شکل میں مصرعے، مطبعے لکھا ہے۔ اپنی کتاب اُردو املا میں ص 43۔441 پر ان الفاظ سے بحث کی ہے۔ بحر لکھنوی اور جلال ان الفاظ کوئے بغیر لکھنے کی سفارش کرتے ہیں۔ حرف ماقبل کو کسرے سے ادا کرنا املے کے لیے کافی ہے جب کہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی واحد متحرک کی شکل میں بھی ٔے کا اضافہ پسند کرتے ہیں۔ رشید حسن خاں آخر الذکر کے مقلد ہیں۔ میری رائے میں بحر اور جلال کا موقف قابلِ ترجیح ہے۔

خاں صاحب کئی جگہ ''ہے ہی'' کی جگہ ''ہئی'' کا استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً مقدمۂ فسانۂ عجائب میں ص 52 سطر 6 میں، مقدمہ باغ و بہار میں ص 63 سطر 19 میں۔ خاں صاحب کو میر امن یا آغا حیدر حسن دہلوی بننے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ داستان اور انشائے میں یہ روپ جائز ہو سکتا ہے، علمی تحریر میں نہیں۔ مقدمے کا آخری عنوان ''باعثِ تاخیر'' ہے۔ خاں صاحب نے متن کی ترتیب اور اختلاف نسخ کا کام مکمل کر لیا، متن کی کتابت بھی کر لی کہ معلوم ہوا کہ پٹنے میں مصنف کا نظرِ ثانی کیا ہوا 1280 ہجری کا اڈیشن ہے۔ اسے دیکھا آسان صورت یہ تھی کہ کتابت شدہ متن کو اسی طرح رہنے دیا جاتا اور آخر میں ایک نوٹ شامل کر دیا جاتا کہ اس نسخے کی بازیافت اس منزل پر ہوئی کہ اس سے استفادہ نہیں کیا جا سکتا لیکن خاں صاحب کا ضمیر اس پر تیار نہیں ہوا اور انھوں نے متن کو از سرِ نو مرتب کیا (ص 112)۔ لکھتے ہیں:

''فسانۂ عجائب اور باغ و بہار دونوں میں مقدمے میں صفحات کے شمار کا ایک سلسلہ ہے، اس کے بعد متن میں نئے ص 1 سے دوسرا سلسلہ جو کتاب کے آخر تک چلا جاتا ہے۔ اس طرح فسانۂ عجائب میں ص 1 سے 117 تک اور باغ و بہار میں ص 1 سے 136 تک کے نمبر مقرر ملتے ہیں۔ یہ دوہرا سلسلہ قواعد تدوین بل کہ روایت کتاب بندی کے خلاف ہے۔ اب کبھی ان صفحات کا حوالہ دینا ہو تو لکھنا ہوگا مقدمہ صفحہ فلاں، متن صفحہ فلاں۔ اس دوئی کی وجہ لکھتے ہیں:

''ضمیموں کے اندراجات کے سلسلے میں یہ ضروری تھا کہ متن پر نمبر شمار موجود ہوں (متن میں کتابت پہلے ہوئی تھی) تا کہ صفحات کا حوالہ دیا جا سکے، مقدمہ (حسب روایت اور حسب معمول) ضمیموں کی تکمیل کے بعد لکھا گیا۔ امتیاز کی خاطر ابتدائی حصے کے صفحات پر نمبر شمار (حسبِ معمول) صفحات کے اوپری حصے پر ہیں (مقدمہ ص 112)۔

''باغ و بہار'' میں پوری کتاب میں نمبر شمار یکساں طور سے صفحے کے نچلے حصے ہی میں ہیں۔ میں مرتب اور کاتب کی مشکل کا اندازہ کر سکتا ہوں کہ اگر کتابت کا پورا کام مقدمہ لکھنے کے بعد شروع کیا جاتا تو اس میں جہاں جہاں دوسرے صفحوں کا حوالہ تھا (انگریزی میں اسے ReferenceCross کہتے ہیں) وہاں خلا چھوڑا جاتا، پھر کتابت اور نمبر اندازی کے بعد ان خلاؤں کو پُر کیا جاتا۔ بڑا دردِ سر ہوتا۔ دیوانِ غالب نسخۂ عرشی میں بھی مقدمے اور متن میں صفحوں کے نمبر کی یہی تکرار ہے۔

فسانۂ عجائب کے متن کو اس صحت کے ساتھ پیش کرنا کہ ہر فقرہ اور ترکیب قطعی طور پر منشائے مصنف کے مطابق ادا ہو جائے اس اڈیشن کا سب سے بڑا اکتساب ہے۔ اس کے لیے تو خاں صاحب نے اتنی کھکیڑ اٹھائی ہے۔ جب میں الٰہ آباد یونی ورسٹی کا ایم۔اے کا طالب علم تھا تو میرے اساتذہ پروفیسر ضامن علی اور سید اعجاز حسین کلاس میں کتابوں کے متن کو ہمیشہ کسی طالب علم سے پڑھواتے تھے اور جہاں کچھ بتانا ہوتا تھا وہاں طالب علم کو روک کر تبصرہ کر دیتے تھے۔ ایم۔اے کے دو برسوں میں قسم کھا کر ہر کلاس میں تنہا میں نے متن خوانی کی ہے۔ یہ بڑی ذمہ داری تھی اگر عطف و اضافت غلط آ جاتے تو مجھے نکو بننا پڑتا۔ میرے پاس فسانۂ عجائب کا مخمور اکبرآبادی کا 1928 کے اڈیشن تھا۔ کتاب بہت گنجان چھپی تھی۔ میں کلاس سے قبل ہوسٹل میں بیٹھ کر جملوں کے بیچ فقروں کو الگ کرنے کے لیے ان میں کاما اور ڈیش لگا کر کلاس میں جاتا تھا تا کہ میری جگ ہنسائی نہ ہو۔ رشید حسن خاں کا مرتب کردہ متن میسر ہوتا تو کتنی سہولت ہوتی۔

اگر انھوں نے صحیح ترین متن پیش کیا ہے تو اس کے کاتب ابو جعفر زیدی اُردو کے صحیح ترین خوش نویس ہیں جنھوں نے صحت زبان کی خاطر اپنی جان لڑا دی ہے۔ اس آقائے خطّاطی نے کتابت کو تحقیق کے برابر لا کھڑا کیا ہے۔ ان کی دونوں کتابوں میں سہو کتابت کا سوال ہی نہیں۔

متن کے بعد سات ضمیمے ہیں: پہلا نثر ہائے خاتمہ کتاب، دوسرا تشریحات، تیسرا انتساب اشعار، چوتھا اشخاص، مقامات، عمارتیں، پانچواں تلفظ اور املا۔ چھٹا الفاظ اور طریق استعمال۔ یہ قاضی عبدالودود کے مطالبے کی مناسبت ہے۔ ساتواں ضمیمہ اختلافِ نسخ کا ہے۔ یہ اختلاف صرف دیباچۂ فسانۂ عجائب تک محدود ہیں۔ مدوّن نے 85 صفحوں کا ضمیمہ تیار کیا لیکن پھر یہ معلوم ہوا کہ زیادہ ضخامت کی وجہ سے یہ کتاب نہیں چھپ سکتی۔ ناچار اس ضمیمے کو حذف کرنا پڑا۔ افسوس! کتاب کی تکمیل میں ایک نقصان رہ گیا۔ اب انھیں چاہیے کہ اس اختلاف نسخہ کو کسی رسالے میں یا علاحدہ کتابچے کو طور پر شائع کر دیں۔

ضمیموں کے بعد فرہنگ ہے جس کے دوسرے حصے میں عربی فقروں اور عبارتوں کا اُردو ترجمہ ہے۔ اس کے بعد مختصر اشاریہ ہے جو محض متن داستان پر حاوی ہے۔ سیر حاصل اشاریے کو مقدمۂ مرتب اور ضمیموں کا بھی احاطہ کرنا چاہیے تھا لیکن پھر وہی ضخامت کے اضافے کا سوال ابھرتا۔ میرے لیے یہ ضمیمے اور فرہنگ معلومات کے ایسے ہشت گنج خسرو ہیں جن کے مشاہدے اور استقاضے میں عمر بسر کی جا سکتی ہے۔

باغ و بہار:

تصنیفی اعتبار سے ''باغ و بہار'' ''فسانۂ عجائب'' پر مقدم ہے لیکن رشید حسن خاں نے اس کی تدوین فسانۂ عجائب کے بعد کی۔ انھوں نے 1964 میں مکتبہ جامعہ کے معیاری سیریز کے لیے باغ و بہار مرتب کی تھی۔ تبھی سے ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ اس کتاب کو مکمل طریقے سے مدوّن کیا جائے۔ ان کی انتھک کوششوں کا نتیجہ 1992 میں سامنے آیا۔ خوش قسمتی سے ''باغ و بہار'' کی طبع اوّل (1804) دستیاب ہے گلکرسٹ نے جس صحتِ رموز و اوقاف کے ساتھ چھپوایا تھا وہ اس کی تدوین کا پہلا قدم تھا، خاں صاحب کی کاوش اس سفر کا آخری قدم ہے۔ میں نے یہ اڈیشن دسمبر 1945 میں انجمن

ترقی اُردو دہلی میں سرسری طور پر دیکھا تھا۔ ایک زمانے کے بعد اس کی ایک کاپی انجمن ترقی اُردو بک ڈپو، اُردو بازار دہلی میں برائے فروخت دیکھی۔ میں جموں یونی ورسٹی کے لیے خریدنا چاہتا تھا۔ دکان کے مالک مولانا ناز یادہ قیمت مانگ رہے تھے۔ سودا نہ پٹ سکا۔ اب افسوس کرتا ہوں کہ بڑی کوتاہی کی۔ مجھے اتنا روپیہ دے کر خود اپنے لیے خرید لینا چاہیے تھا۔ معلوم نہیں وہ کاپی کس ذخیرے کا مقسوم ہوئی۔

باغ و بہار کی اشاعت اول سے پہلے اس کے متن کے 102 صفحے ہندی مینول (1802) میں شائع ہو چکے تھے۔ مجھے علم نہ تھا کہ یہ مینول تقریباً نایاب ہے۔ رشید حسن خاں نے برسوں کی جستجو کے بعد اس کا عکس حاصل کیا۔ اس کی دل چسپ روداد مقدمے کے ص 18-16 پر دیکھیے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی کے بارے میں یہ مزے کا تبصرہ ملاحظہ ہو:

"قدوائی صاحب اچھے دوست ہیں، مخلص اور غم گسار ہیں لیکن پُرانے شرفائے کرام کی طرح کاہلی اور بے پروائی میں کبھی بھی کسی سے کم نہیں۔ سونے میں سہاگا یہ کہ انھوں نے لندن میں جن صاحب سے عکس بھیجنے کی فرمائش کی تھی وہ صاحب ان لوازم تہذیب اشرافیہ میں موصوف کے شریک غالب نکلے۔" (ص 17)

معلوم ہوا کہ کاہلی اور بے پروائی اشراف کی تہذیب کا لازمہ ہیں۔ خاں صاحب نے قیاس کیا کہ ہندی مینول میں صرف 102 صفحے چھپے لیکن اس کتاب کی اس روایت کو مکمل صورت میں کہیں تو ہونا ہی چاہیے۔ لکھتے ہیں کہ لندن میں اس روایت اوّل کا مکمل خطی نسخہ دریافت ہو گیا اور اس کا عکس بھی مل گیا (ص 18) لیکن صفحہ 69 پر وہ اس نسخے کی جو تفصیل دیتے ہیں اس کی بنا پر معلوم ہوتا ہے کہ کاتب نسخہ کم سواد تھا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ مخطوطہ ہندی مینول کی پریس کاپی نہیں۔

اس مقدمے میں بھی وہ تدوین کی حدود کا وہی تعین کرتے ہیں جو "فسانۂ عجائب" کے مقدمے میں کیا تھا اور اس سے اتفاق کرنا ہوگا۔ اس میں انھوں نے زور دیا ہے کہ متن کو منشائے مصنف کے مطابق پیش کیا جائے۔ میر امن نے دلی کی بول چال کو روزمرہ لکھا ہے جس میں بار ہا نامانوس روپ آ گئے ہیں۔ بیش تر مرتبین نے انھیں سہو طباعت سمجھ کر بدل دیا لیکن رشید حسن خاں نے میر امن کے سویدائے دل میں اُتر گئے ہیں، ہر لفظ محاورے کو اسی طرح لکھا ہے جو میر امن کا منشا رہا ہوگا۔

وہ میر امن کی سوانح کے غیر مستند بیانات کو رد کر کے مختصر لیکن باوثوق حالات کی بازتشکیل کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں مفتی انتظام اللہ شہابی کی غلط بیانی کے سبب ممتاز حسین اور مرزا حامد بیگ نے جو ٹھوکریں کھائی ہیں ان کی پوری داستان منکشف کرتے ہیں۔ مفتی صاحب جس مرتبے کے راوی تھے، حامد بیگ اسی درجے کے مرید ثابت ہوئے جو آنکھ بند کر کے بیعت کر لیتے ہیں۔

"باغ و بہار۔ آغاز و اختتام" (ص 44) ایک مفید عنوان ہے جس میں یہ معرکے کی دریافت ہے کہ گلکرسٹ نے میر امن سے "چار درویش" کی تالیف کی فرمایش ان کے فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہونے سے پہلے ہی کر دی تھی اور میر امن نے اصلاً اس کا کام بھی شروع کر دیا تھا۔ "کتاب کا نام" کے تحت خاں صاحب لکھتے ہیں کہ میر امن نے اصلاً اس کا نام "چار درویش" رکھا تھا، نظرِ ثانی کے بعد "باغ و بہار" سے موسوم کیا (51)۔

کیا میر شیر علی افسوس نے "باغ و بہار" کی نثر کی درستی میں کچھ مشورے دیے، اس سلسلے میں انھوں نے افسوس کی "آرایش محفل" کے خطی نسخے (مخزونہ کلکتہ) کے دیباچے سے صحیح صورتِ حال معلوم کی۔ مطبوعہ نسخے میں اشارہ ہے کہ تفصیلات خطی میں دی ہیں۔ افسوس کہ فورٹ ولیم کی کتابوں کی زبان کی درستی میں جن اختلافات کا سامنا کرنا پڑا، دیباچے کے بین السطور سے ان کا اندازہ ہوتا ہے۔ خاں صاحب نے حاشیے میں اعتراف کیا ہے کہ انھیں اس خطی نسخے کے وجود کی اطلاع ڈاکٹر عبیدہ بیگم کے تحقیقی مقالے سے ملی۔ مجھے توجہ دلانی ہے کہ خاں صاحب نے ہر جگہ دوسروں سے ممنونیت کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔

"باغ و بہار" کے خطی نسخوں کے سلسلے میں وہ ڈاکٹر ثریا حسین کے مطبوعہ مقالے "گارسیں دتاسی اُردو خدمات، علمی کارنامے" کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ثریا حسین نے مارسیلزم کی میونسپل لائبریری میں "باغ و بہار" کا 1217 ہجری کا مخطوطہ دیکھا (ص 68)۔ جب خاں صاحب نے دُنیا بھر سے قدیم روایتوں کی تلاش کی تو اتنے اہم نسخے سے کیوں صرف نظر کیا۔ کوشش کر کے اس کا عکس حاصل کرنا چاہیے تھا۔ کیا معلوم یہ اس کتاب کی طبع اوّل کی پریس کاپی بخط، ہندی مینول کو اوراق اور "باغ و بہار" طبع اوّل کے اندراجات کا دیدہ ریزی سے تقابلی مطالعہ کیا اور ان کی روشنی میں نسخۂ لندن کا شجرۂ نسب متعین کرنے کی قابل داد کوشش کی۔

نسخوں اور اڈیشنوں کے لیے جو حرفی مخففات مجھے یہاں بھی الجھاتے ہیں مثلاً "باغ و بہار" طبع اوّل کی علامت ک کیوں ہے۔ لفظی مخفف ہو تو اس کی موضوعی علامت سے کوئی ذہنی نسبت ہو سکتی ہے۔ ص 83 پر "اعراب" علامت، رموزِ اوقاف" کا عنوان بیش بہا معلومات رکھتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گل کرسٹ نے املا پر ایک رسالہ لکھا تھا جواب دستیاب نہیں لیکن اس کا نچوڑ کئی کتابوں میں موجود ہے۔ اسے خاں صاحب نے پیش کر دیا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اس زمانے میں گل کرسٹ نے اس معرکے کا کام کیا۔

چار درویش کا قدیم ترین فارسی مخطوطہ حبیب گنج کلکشن مسلم یونی ورسٹی میں بالیقین موجود تھا۔ میں نے نثری داستانیں میں اس کا ترقیمہ نقل کیا ہے۔ میری اطلاع کے بعد کسی نے اسے غائب کر دیا۔ افسوس۔

"باغ و بہار کی نثری اہمیت اور اجزائے ترکیبی" اس عنوان کے تحت ص 107 سے 108 تک باغ و بہار کی زبان و بیان کا تجزیہ کیا ہے۔ کوئی محض لسانیات داں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے لیے رشید حسن خاں جیسے دیدہ ور عارف راز ہی کی ضرورت تھی۔

کتاب کے مستند متن کے بعد تین ضمیمے ہیں: پہلا ضمیمہ "تشریحات، اختلافِ نسخ، انتساب اشعار، افراد، مقامات، عمارتیں" ہے۔ دوسرا ضمیمہ "تلفظ اور املا" ہے۔ یہ دونوں ضمیمے ایسی کانیں ہیں جن میں فاضلانہ معلومات کے سونے کے ڈلے بھرے پڑے ہیں۔ ان سے استفادے کے لیے کئی برس کا عرصہ درکار ہے۔

تیسرا ضمیمہ الفاظ اور طریق استعمال" ہے۔ اس کے بعد فرہنگ ہے۔ باغ و بہار کی فرہنگ کی اہمیت اظہر من الشمس ہے۔ اس کے بعض اڈیشنوں کے شروع یا آخر کے اوراق کا عکس دیا ہے۔ ص 711 پر یہ صحیفۂ زریں مکمل ہو جاتا ہے۔ اس میں مقدمے کے 136 صفحے جوڑیے تو پوری کتاب 847 صفحات بغل میں لیے ہے۔

هدیۂ تحسین و تبرک :

مثالی کام ہیں جن کی نظیر نہ ماضی میں ملتی ہے، نہ عرصے تک مستقبل میں ملنے کی اُمید ہے۔ یہ کتابیں تدوین کا ایسا بیش بہا خزینہ ہیں جن میں لامتناہی دولت چھپی ہوئی ہے۔ میرے نزدیک ایسی کتاب تیار کرنے کے لیے پندرہ بیس سال کا عرصہ درکار ہے۔ ان میں سے ہر کتاب کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے لیے ایک ایک سال کی مدت چاہیے کیوں کہ ان کے ضمیموں میں جو معلومات بھری پڑی ہیں انھیں پرکھنے اور ان کے بارے میں رائے قائم کرنے کے لیے عمرِ عزیز کا ایک موقر حصہ نذر کرنا ہوگا۔ میر کا شعر ہے:

سراپا میں جس جا نظر کیجیے
وہیں عمر اپنی بسر کیجیے

ان کتابوں کا بھی یہی عالم ہے۔ کئی مغربی و مشرقی علما کلاسیکی زبانوں کے متون کو مرتب کر کے شہرت دوام پا چکے ہیں۔ رشید حسن خاں کا کام کسی سے کم معیار کا نہیں۔ اگر وہ کسی یونی ورسٹی میں پروفیسر ہوتے، یورپ و امریکہ کی سیر کیے ہوتے، عظیم الشان جلسوں میں صدر مملکت یا وزیر اعظم سے رسمِ اجرا کراتے تب ان کارناموں کو عظیم الشان قرار دیا جاتا۔ بہ صورتِ موجودہ ایسے شاہ کاروں کا جو غلغلہ ہونا چاہیے نہیں ہوا۔ حضرت امیر حمزہ نے ''طلسم ہوش رُبا'' فتح کیا تھا۔ تدوین کے ہفت خواں میں رشید حسن خاں کی تسخیر اس سے کم نہیں۔ اگر تدوین کوئی ملت ہوتی تو یہ کتابیں اس کے دو مقدس صحیفے قرار پاتے اور ان کا مدوّن ان کا نبی، لیکن میں انھیں پیغمبر تدوین کہنے پر قانع نہیں، انھیں خدائے تدوین کہوں گا گو اس پر کتنے زعما چیں بہ جبیں ہوں۔ مجھے رشید حسن خاں سے محبت نہیں (کذب بھی نہیں)۔ انھوں نے کبھی میرے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں لکھا۔ میں نے اپنی کتاب ''تحقیق کا فن'' انھیں پیش کی تو انھوں نے لکھا کہ میں اس کا ایک ایک لفظ پڑھوں گا۔ اس کے بعد اس کے بارے میں مجھے کچھ بھی نہیں لکھا۔ شاید کتاب کی ورق گردانی کی نہیں لیکن میں کیا کروں، میں تو فسانۂ عجائب اور باغ و بہار کے مرتب کی قدر شناسی کے لیے مجبور ہوں۔ میں کہا کرتا تھا کہ اُردو میں دانش وری کی روایت کمزور ہے۔ رشید حسن خاں کے دونوں کارناموں نیز ان کی کتاب ''زبان اور قواعد'' کے ہوتے یہ داغ رفع ہو جاتا ہے۔

(خصوصی شمارہ، کتاب نما، رشید حسن خاں حیات اور ادبی خدمات، صفحہ 64 تا 74 مرتب اطہر فاروقی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی 2002)

(ماہ نامہ اُردو دُنیا، صفحہ 25 تا 30، قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان، نئی دہلی، اپریل 2006)

○○○

شمیم حنفی

رشید حسن خاں اور گلزارِ نسیم

پچھلے کچھ برسوں میں کلاسیکی ادب کی طرف عام توجہ میں جو تیزی آئی ہے اُسے دراصل ایک تہذیبی نشاۃ ثانیہ یا نئی ذہنی بیداری سمجھنا چاہیے۔ لوگ اپنے ماضی سے غافل ہوتے ہیں تو اپنے حال کے بھی نہیں رہ جاتے۔ تمام مہذب معاشروں کی تخلیقی توانائی اور جمالیاتی وجدان کا انحصار اس بات ہوتا ہے کہ اُس معاشرے کے لوگ اپنی روایت کے بارے میں کیا سوچتے ہیں؟ کس طرح سوچتے ہیں؟ تاریخ کو ایک جامد مظہر کے طور پر دیکھتے ہیں یا اسے اپنے لیے فیضان کا ایک سرچشمہ بناتے ہیں؟ اُن کے اجتماعی حافظے میں ماضی کن سطحوں پر زندہ رہتا ہے؟ اور اُن کے شعور میں گزرے ہوئے، دور افتادہ تجربوں کی حیثیت کیا ہوتی ہے؟

ادب کے نئے طالب علموں کو ادھر نئے سرے سے اپنی کلاسیکی کتابوں اور نظم و نثر کی قدیم صنفوں کے واسطے سے اپنے تہذیبی رویوں کو سمجھنے کا شوق پیدا ہوا ہے۔ 'شعر شور انگیز'، 'باغ و بہار'، 'فسانۂ عجائب'، 'مرثیہ خوانی کا فن'، 'مثنویاتِ شوق' جیسی کتابیں جب نئے زمانے کی حقیقتوں سے دوچار اور نئی حسیّت کے مسائل میں اُلجھے ہوئے اساتذہ اور طلبا کے ساتھ نظر آنے لگیں تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہماری اجتماعی زندگی میں ٹھہراؤ کی کیفیت پیدا نہیں ہوئی ہے اور اندر ہی اندر ہمارے تبدیل ہوتے رہنے کا سلسلہ جاری ہے۔ انتظار حسین نے اپنے ایک مضمون (نیا ادب اور پُرانی کہانیاں) میں تہذیبی ماضی سے بڑھتے ہوئے شغف کو شخصیت کے گم شدہ عناصر کی پناہ گاہ یا بازیافت کے طور پر دیکھا تھا۔ یاد کیجیے، سنہ سینتالیس کے فوراً بعد کا ماحول جس میں سیاسی واردات نے غیر معمولی اُتھل پُتھل پیدا کی تھی، لیکن کس طرح اسی کے ملبے سے ماضی کے ایک نئے احساس کا ظہور ہوا۔ محمد حسن عسکری، سلیم احمد، جیلانی کامران، انتظار حسین، ناصر کاظمی، منیر نیازی سے لے کر محمد سلیم الرحمٰن، سہیل احمد، نیّر مسعود اور شمس الرحمٰن فاروقی تک ہمارے تہذیبی اور ثقافتی رویوں کی ایک لمبی روداد پھیلی ہوئی ہے۔

مجھے بار بار یہ احساس ہو رہا ہے کہ تمہید پھیلتی جا رہی ہے اور اب مجھے اپنے اصل موضوع 'رشید حسن خاں کی مرتبہ 'گلزارِ نسیم' (ناشر انجمن ترقی اُردو) کے بارے میں گفتگو شروع کر دینی چاہیے۔ لیکن میرے لیے پچھلے دس بارہ برسوں کے عرصے پر پھیلی ہوئی، اُن تمام علمی خدمات اور سرگرمیوں کو دیکھنا اور سمجھنا، جن سے رشید حسن خاں کا نام جُڑا ہوا ہے، اسی سطح پر اور اسی پس منظر میں بامعنی بنتا ہے۔ ہم اپنے اجتماعی مذاق، مزاج اور شعور کو ڈی کولونائز کیے بغیر آج کی دُنیا میں اپنے ماضی یا اپنی حسیّت کے گم شدہ سانچوں کی معنویت پر غور نہیں کر سکتے۔ تحقیق کے کاروبار شوق سے ادب کے تربیت یافتہ لیکن عام قارئین کو جو دوری اور ناصبوری کا احساس ہوتا ہے تو اس لیے کہ تحقیق عام قاری کے لیے ایک تجربہ یا واردات نہیں بنتی۔ تجسّس کا ذوق اور انجانی، ان دیکھی حقیقتوں تک جا پہنچنے کا شوق اپنی جگہ پر، مگر ادبی اور تخلیقی دستاویزوں کے ذریعے عام قاری دراصل اپنے آپ کو، اپنی دُنیا کو یا ماضی سے حال تک پھیلے ہوئے اس پورے سلسلے کو سمجھنا چاہتا ہے جس کے بغیر اپنے آپ تک رسائی ممکن نہیں ہوتی۔ زندہ شخصیتیں اور زندہ قومیں اسی تناظر

کے ساتھ اپنی شناخت متعین کرتی ہیں۔ کم سے کم اتنا ہر شخص جانتا ہے کہ سوویت یونین میں انقلاب کے بعد ادب پڑھنے والوں کا جو بے مثال معاشرہ سامنے آیا، اس میں نظریاتی اور سیاسی سخت گیری کے باوجود کلاسیکی ادب کے شہ پاروں سے شغف میں بھی اضافہ ہوا۔ ایک مختلف سطح پر کچھ ایسی ہی صورت حال ہمیں اُردو معاشرے میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ ایک طرف تو ادب پڑھنے والوں کا دائرہ سمٹ رہا ہے، مگر دوسری طرف کلاسیکی سرمائے کی قدر و قیمت کا احساس اور اپنے ماضی کو پھر سے سمجھنے کا شوق بھی بڑھ رہا ہے۔ اس معاملے میں 'خدائے تحقیق یا تدوین' قسم کی مبالغہ آمیز اور تقریباً بے معنی ترکیبوں کے استعمال سے بچ کر بھی دیکھا جائے (تخلیق کاروں کی بات اور ہے مگر تنقید و تحقیق میں اس خوش عقیدگی کی گنجایش نہیں) تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ رشید حسن خاں کے کارنامے بہت وقیع ہیں اور جن حدود کے اندر رہتے ہوئے اُنھوں نے ''باغ و بہار''، ''فسانۂ عجائب''، ''مثنویاتِ شوق''، ''گلزارِ نسیم''، (اور اب تو مثنوی سحر البیان بھی) کے مطالعات اور ان کے بارے میں معلومات مرتّب کیے ہیں، وہاں اُردو تحقیق کے میدان میں ان کا کوئی بدل اس وقت نہیں ہے۔

رشید حسن خاں نے جس وسیع و عریض سطح پر 'گلزارِ نسیم' سے قطع نظر، کلاسیکی ادب کے بعض دوسرے شاہ کاروں کی تدوین اور ترتیب کا کام انجام دیا ہے اور ان شاہ کاروں کی تفہیم کا راستہ ہموار کیا ہے، اُس کی مثالیں (اُن سے پہلے بھی) انگلیوں پر گنی جاسکتی ہیں۔ ڈاکٹر زور (کلیاتِ قلی قطب شاہ)، پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب (دیوانِ فائز)، پروفیسر نورالحسن ہاشمی (کلیاتِ ولی) اور مولانا عرشی (دیوانِ غالب) کی جیسی دقتِ نظر، تفحص اور جاں کاہی، علاوہ بریں، تحقیق و تلاش کے صبر آزما عمل میں بھی خوش مذاقی اور خط آفرینی کی ایک اعلا سطح کو قائم رکھنا، ہمارے زمانے کے معدودے چند علمائے ادب کے حصّے میں آیا ہے۔ کلاسیکی ادب کے شاہ کاروں پر یادگار قسم کے مقدمے تو ایسے اصحاب نے بھی لکھے ہیں جو تحقیق کی دُنیا کے آدمی نہیں تھے۔ مثال کے طور پر محمد حسن عسکری کا مقدمہ 'طلسم ہوش ربا' کے انتخاب پر، یا ممتاز حسین کا مقدمہ 'باغ و بہار' پر یا آتش کے کلام پر خلیل الرحمٰن اعظمی کا مقدمہ یا پھر مولوی عبدالحق کے مقدمے۔ ان میں سے کئی مقدموں کی فکری اور تجزیاتی سطح اُردو کے بیش تر معروف محققین کے مطالعات کی عمومی سطح سے بلند تر ہے اور ان سے ہمارے علم میں نہیں، ہماری بصیرت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ان سے ذہنی مشقّت کے ساتھ ساتھ جمالیاتی ذوق اور وجدان کی سرگرمی کا پتا بھی چلتا ہے۔ خبر کے علاوہ نظر کی گہرائی کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ اور ادب کے عام قاری انھیں جس شوق کے ساتھ پڑھتے ہیں، اس کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ تحریریں کلاسیکی ادب سے دل چسپی میں عام اضافے کا سبب بنی ہیں۔ رشید حسن خاں کی بنیادی حیثیت محقق کی ہے، لیکن ان کی تحقیقات کے یہ نمونے صرف محققوں کے کام اور مطلب کے نہیں ہیں۔ ہمارے محققوں میں ایسے برگزیدہ اصحاب بھی گزرے ہیں جو ایک بھی ایسے لقمے کے روادار نہیں ہوتے تھے جو کام و دہن کو لذّت بخش سکے۔ ان کی تحریروں میں ایک بھولا بھٹکا دل چسپ فقرہ، ایک جملہ ایسا کہ دماغ کو متوّر کرسکے، ایک ایسی بات جو چھان بین کی محنت کے بجائے تفہیم اور تعبیر کی بصیرت سے نمودار ہوئی ہو، نموناً بھی نظر نہیں آتی۔ ہر چند کہ ایلیٹ نے دل چسپ لیکن گم راہ کرنے والی تنقید کے مقابلے میں معمولی سے معمولی تحقیق کو بھی کارآمد بتایا ہے، مگر تحقیق بھی بہ معنی اُسی صورت میں بنتی ہے اور ادب شناسی کے عمل میں موثر رول اُسی وقت ادا کرسکتی ہے جب وہ ہمارے تخلیقی ادراک پر اثر انداز ہوسکے اور اس کے واسطے سے ہم ادبی رویوں یا ترجیحات یا فیصلوں کو بدلنے پر مجبور ہوجائیں۔ ایسی تحقیق اور تنقید جس کے علاقۂ ہدف میں صرف محققین اور ناقدین پائے جائیں ادب کے عام قارئین کی دل چسپی کا مرکز نہیں بنتی۔ رشید حسن خاں کی تحقیق نے اس ممنوعہ اور مخصوص علاقے سے آگے، عام پڑھنے والوں کی طرف جانے کا راستہ دکھایا ہے۔

اس نکتے کی وضاحت اور اس مسئلے کی تفصیل بیان کرنے کے لیے ہمیں 'باغ و بہار'، 'فسانۂ عجائب'، 'مثنویاتِ شوق'، کے پس منظری مواد، توضیحات، اشارات، مقدموں اور فرہنگوں پر ٹھہر ٹھہر کر نظر ڈالنی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام معاملات ایک مختصر مضمون میں سمیٹے نہیں جاسکتے، اس لیے اب میں اپنے آپ کو صرف 'گلزارِ نسیم' تک محدود رکھوں گا۔

یہ محض اتفاق کی بات ہے کہ جس سال 'گلزارِ نسیم' (مرتبہ رشید حسن خاں) کی اشاعت عمل میں آئی (1995) اس سے کچھ عرصہ پہلے مجھے لاہور سے ٹالسٹائی کی 'جنگ اور امن' کی اٹھارہ سو صفحات پر مشتمل، وہ دونوں جلدیں موصول ہوئی تھیں جن کے اُردو ترجمے، مقدمے، تاریخی اور ثقافتی پس منظر، تلمیحات کی وضاحتوں اور نقشوں، فرہنگوں اور اشاروں کو یکجا کرنے کا بوجھ تنِ تنہا ایک شخص (جناب شاہد حمید) نے اُٹھایا ہے۔ (اشاعت 1993)۔ یہ کام اپنی وسعتِ نظر کثیر الجہتی اور معیار کے اعتبار سے اس پائے کا تھا کہ اس کی نظیر یورپ کی ''ترقی یافتہ'' زبانوں میں بھی کم ملتی ہے۔ اسی طرح، اوکسفورڈ یونی ورسٹی پریس، نئی دلّی کی طرف سے شائع ہونے والا (1999) چودھری محمد نعیم کا کیا ہوا 'ذکرِ میر' کا انگریزی ترجمہ، ترجمے کی غیر معمولی سطح اور اوصاف سے قطع نظر، اپنے ضمیموں، حاشیوں، وضاحتوں، متعلقہ اطلاعات کے بیان، تاریخی اور دستاویزی نوعیت کی معلومات، اپنی مرتبہ فرہنگ، مآخذ اور مصادر کی تفصیل اور ذہنی بصیرتوں سے معمور مقدمے کی بنا پر اُردو کے حالیہ علمی اور ادبی سرمائے میں ایک بیش قیمت اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان حقائق کی نشان دہی کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ ایک طرف جہاں اُردو معاشرہ، اُردو ادارے اور اُردو سے متعلق علمی اور ادبی سرگرمیاں ایک مسلسل زوال اور توقیت کے نرغے میں ہیں وہیں ایسے اصحاب بھی موجود ہیں جو اپنی خلوت نشینی کا اعتبار سنبھالے ہوئے ہیں اور ہر طرح کے بازاری پن سے دور اپنے علمی مشاغل میں منہمک ہیں۔ بڑے علمی اور ادبی کارنامے اس استغراق، منصب کے اس شعور، علم کے وقار اور اس کے تقاضوں سے ایسی شدید وابستگی کے بغیر وجود میں نہیں آتے۔ عبرت یہ دیکھ کر ہوتی ہے کہ سنجیدہ اداروں سے بھی اب اس قسم کا مواد آئے دن شائع ہوتا رہتا ہے جس کی نوعیت مذموم، اسباب مبتذل اور شرست غیر سنجیدہ ہوتی ہے۔ رشید حسن خاں مزاجاً راہب نہیں، مگر دلّی کے پُر شور ماحول میں برسوں تک رہتے ہوئے اور اب اپنے خاموش، الگ تھلگ قصباتی مزاج رکھنے والے شہر میں زندگی گزارنے کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے علمی تحقیق و تجسس، مطالعے و جائزے کی جو بلند اور وقیع سطح قائم کی ہے اسے دیکھ کر واقعی حیرت ہوتی ہے۔ دلّی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو سے ان کی وابستگی کا پورا دور حوصلہ شکن حالات اور وسائل کے باوجود جس رکھ رکھاؤ، تمکنت اور علمی و ادبی شوق کے ساتھ گزرا، اس کی تہہ سے نمودار ہونے والی سنہری فصلیں خاص کر پچھلے نو دس برسوں میں جوان ہوئی ہیں۔ ان کے مرتبہ 'باغ و بہار' (1992) کی اشاعت سے جو سلسلہ کلاسیکی متون کی نئی ترتیب و تدوین، تعبیر اور تفہیم کا شروع ہوا تھا وہ ابھی جاری ہے اور اس کا سب سے بڑا فائدہ، اجتماعی لحاظ سے یہ ہوا ہے کہ ہم اپنے خستہ و پرشکستہ ادبی، معاشرے میں اپنے تہذیبی ماضی اور صدیوں پر پھیلی ہوئی روایت کی نشاۃ ثانیہ کے آثار دیکھ رہے ہیں۔

'گلزارِ نسیم' کی اہمیت صرف اس لیے نہیں کہ اُردو کی سب سے معروف اور برتر مثنویوں میں اس کی ایک منفرد جگہ ہے۔ یہ مثنوی مشرقی طرزِ احساس، اسالیب روایات کے باہمی انضمام کی ایک قیمتی دستاویز بھی ہے۔ زیرِ نظر نسخے میں مثنوی کا اصل متن صرف چھیاسی صفحوں پر مشتمل ہے جب کہ اس اشاعت کی مجموعی ضخامت سات سو چوبیس صفحات کی ہے، گویا ایک سو چوبیس صفحات پر پھیلے ہوئے عزت اللہ بنگالی کے فارسی متن کو (جو اس نسخے میں شامل ہے) الگ کر کے بھی دیکھا جائے تو پتا چلتا ہے کہ اس کتاب کے چھے سو سے زائد صفحے رشید حسن خاں کی اپنی چھان بین، پرکھ اور مباحث کا احاطہ کرتے ہیں۔

مقدمے کے ڈیڑھ سو صفحوں میں 'گلزارِ نسیم' کی ادبی اور انصابی اہمیت، قصے سے وابستہ روایات، اس کے اجزا، اس کے تمثیلی پیرائے، پھر دیا شنکر نسیم کے سوانح اور ادبی خدمات؛ اس کے بعد 'گلزارِ

نسیم' کے مختلف نسخوں، قصۂ گل بکاؤلی کی فارسی روایت، اس متن کے نثری اُردو ترجمے، 'مذہبِ عشق' اور منشی نہال چند لاہوری کی نوعیت اور دیگر متعلقات کی نشان دہی کی گئی ہے۔ 'گلزارِ نسیم' کے واسطے سے شرر اور چکبست کے معروف معرکے کے پس منظر پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس معاملے میں رشید حسن خاں نے حزم و احتیاط کا پہلو مستقلاً پیشِ نظر رکھا ہے اور شرر کے ساتھ ساتھ چکبست کے رویے کی تہہ میں جو عناصر کار فرما تھے، ان کا جائزہ مکمل غیر جانب داری کے ساتھ اور براہین و دلائل کی بنیاد پر پیش کیا ہے۔ اس پورے قضیے کی بابت رشید حسن خاں کی مجموعی رائے کیا تھی، اس کا اندازہ ذیل کے چھوٹے سے اقتباس سے ہوتا ہے:

"(مولانا عبدالحلیم شرر) کے تبصرے کو پڑھ کر صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ چکبست کا لکھا ہوا مقدمہ ہمہ وقت اُن کے سامنے رہا ہے۔ شرر نے زبان اور بیان سے متعلق بہت سے اعتراض کیے، اور بھی بہت کچھ لکھا۔ مولانا کے قلم نے بھی احتیاط کے تقاضوں کو پوری طرح ملحوظ نہیں رکھا۔ چکبست نے اُس تبصرے کا مفصل جواب لکھا، جس میں ہر اعتراض کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی۔ پھر جو بحث شروع ہوئی تو دونوں طرف سے ایسی تحریریں بھی لکھی گئیں جن کو پڑھ کر معقولیت کا سر جھک جاتا ہے اور شائستگی آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ اس سلسلے میں 'اودھ پنچ' میں بہت کچھ لکھا گیا، اور بیش تر تحریریں بیان کی شائستگی اور علمی سنجیدگی سے محروم ہیں۔"

رشید حسن خاں نے اس معرکے کے محرکات کی نشان دہی بھی کر دی ہے۔ فروری 1903 کے 'کشمیر درپن' میں چھپنے والے چکبست کے ایک مضمون 'پنڈت دیا شنکر نسیم' کی طرف توجہ دلائی ہے جس میں کہیں براہ راست، کہیں بالواسطہ چکبست نے لکھنؤ کے بعض شاعروں (مثلاً امانت اور شوق قدوائی) کو تضحیک کا نشانہ بنایا تھا۔ چکبست نے اسی پر قناعت نہیں کی تھی، اُن کی زد میں صبا، رند، خلیل یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے ناسخ بھی آ گئے ہیں۔ آتش کے ساتھ اتنی رعایت ضرور ہوئی کہ انھیں نسیم کے برابر کا شاعر کہہ کر چھوڑ دیا۔ دوسری طرف چکبست کے جواب میں جو انداز اختیار کیا گیا اس کی بنیادیں بھی صاف نہیں تھیں اور سخن فہمی پر طرف داری سے زیادہ تعصّب کا رویہ غالب تھا۔

'گلزارِ نسیم' کی قصے کی یہ ایک افسوس ناک کڑی ہے۔ اس اڈیشن کے ضمیمۂ تشریحات میں رشید حسن خاں نے (ص 237 تا 520) جس شرح و بسیط کے ساتھ زبان اور بیان کے نکات پر بحث کی ہے اس سے لغات، لفظیات اور صناعت کے بہت سے باریک پہلو اُبھرتے ہیں۔ موجودہ دور کہ جب تعلیم کے اعلا مراکز، خاص طور پر یونی ورسٹیوں میں لسانی، فنی اور ذوقی تربیت کا رجحان معدوم ہوتا جا رہا ہے، رشید حسن خاں کی یہ دیدہ ریزی اُردو کے طلبا (اور ان سے زیادہ اساتذہ) کے لیے ایک مدرسۃ الاصلاح کی حیثیت رکھتی ہے۔ یوں بھی بنیادی متن پر اعراب کی نشان زدگی، تلفظ و املا کی تفصیلات اور فرہنگ پر مبنی ضمیمے (ص 521 تا 600) کی شمولیت نے اس اڈیشن کو ایک مکمل، قائم بالذات اور نہایت کارآمد نسخے کی حیثیت دے دی ہے۔ لفظوں کے معنی، پھر معنی کے معنی کا مسئلہ تحقیقی زبان کی سطح پر ایک ساتھ کئی جہتیں رکھتا ہے اور کبھی کبھی اس کے مسئلے لغات کی مدد سے حل نہیں ہوتے۔ تکثیرِ معنی کے مضمرات تک رسائی کے کئی راستے جدید علوم اور جدید تنقید نے کھولے ہیں۔ صرف کلاسیکی اصولوں اور ضابطوں کی مدد سے یہاں تک پہنچنا آسان نہیں کیوں کہ تخلیقی تجربے، اظہار اور اسلوب سے وابستہ بہت سے سوال تفہیم و تعبیر کے روایتی طریقوں کی گرفت میں نہیں آتے۔ یہ قدیم شعریات اور جمالیاتی قدروں کی حدِ اختیار سے آگے ہیں۔ رشید حسن خاں نے اس قسم کے سوالات کو اپنے جائزے کے حدود سے بالعموم باہر رکھا ہے۔ اسی طرح مقدمے کے بعض بیانات مزید تفصیل اور تعبیر کا مطالبہ کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ:

(الف) رعایتِ لفظی اور اختصار، ان میں کتنا ہی حسن ہو، یا پیدا کیا جائے؛ مثنوی کی صنف میں اور ان میں ایک طرح کا بَیر ہے۔ اور سب حُسن پیدا ہو جائیں گے؛ مگر جذبات نگاری، واقعہ نگاری اور محاکات، جو مثنوی کے اہم اجزا ہیں، اُن کا رنگ اُڑ جائے گا۔

(ب) اس مثنوی (گلزارِ نسیم) کے اشعار میں چمک ہے، فن کاری کا کمال ہے، دل کشی ہے لیکن تاثیر کی گرمی نہیں۔

(ج) اندر کی بددعا سے "شراب" کا وہ تصور بھی سامنے آ جاتا ہے جس کی کارفرمائی ہندو اساطیری روایت میں بہت ملتی ہے۔ جنس کی تبدیلی کے ایک ذیلی قصے نے ایک قدیم ہندوستانی اساطیری کی نشان دہی کی ہے۔

(د) تمثیل کے انداز میں کسی داستان بیان کے ظاہری اجزا کی باطنی تفسیر کی گئی ہے۔

(ی) (گلزارِ نسیم) کی اہمیت یہ ہے کہ جس چیز کو "لفظی مناسبت" کہتے ہیں اور رعایتِ لفظی سے تعبیر کرتے ہیں، اس کی کرشمہ کاریاں (اس نظم کے واسطے سے) سامنے آ سکیں گی جن کی مدد سے اس عمل کی خوبی کو (اور خامی کو بھی) اچھی طرح سمجھا اور سمجھایا جا سکتا ہے۔

(و) جو لوگ رعایتِ لفظی، مناسبت لفظی اور صنائع لفظی و معنی کے نظام سے ناواقفِ محض ہیں، ایسے سادہ خیال اور کم نظر حضرات اس نثری شاہ کار (باغ و بہار) کے بیش تر جملوں اور عبارتوں کے حقیقی حسن کو نہیں سمجھ پائیں گے۔

(ز) لفظوں میں معنی و مفہوم کے لحاظ سے جو کثیر الجہاتی ہوتی ہے، اُس کے بھی کئی پہلو ہوتے ہیں۔ میں یہاں ایسے صرف دو پہلوؤں کی طرف اشارہ کروں گا۔

(ح) (نسیم) کا خاص انداز پانچ اجزا سے مرکب ہے۔ 1۔ (بیان کا) اختصار۔ 2۔ (لفظی مناسبتوں اور رعایتوں کی مدد سے) مفہوم میں پہلوداری۔ 3۔ (لفظی اور معنوی کے واسطے سے) حسنِ بیان میں اضافہ۔ 4۔ (نئے پن سے معمور) تشبیہیں۔ 5۔ (بیان کا استحکام یعنی) بندش کی چُستی۔

ان میں کئی باتیں بحث طلب ہیں اور اختلاف کی گنجایش رکھتی ہیں۔ مثال کے طور پر یہی کہ بیان کے اختصار سے جذبات نگاری یا واقعہ نگاری کا رنگ اُڑ جائے گا (اقتباس الف)، یا یہ کہ 'گلزارِ نسیم' میں فن کاری کا کمال ہے لیکن تاثیر کی گرمی نہیں (اقتباس ب)، یا یہ کہ لفظی و معنوی رعایت، مناسبت اور صنائع کے نظام سے ناواقف لوگ عبارتوں کے حقیقی حسن کو نہیں سمجھ پائیں گے (اقتباس و)۔ ظاہر ہے کہ بیان کے ایجاز اور اختصار سے جذبہ یا واقعہ نگاری کا حسن بڑھتا ہے، کم نہیں ہوتا۔ اور تاثیر کی گرمی دراصل اعلا درجے کی فن کاری ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح دوسرے اقتباسات (ز، ح، ج، اور ہ) میں جو مفروضے قائم کیے گئے ہیں اُن پر ادب کے جمالیاتی، تہذیبی، عمرانیاتی اور نفسیاتی تناظر میں تفصیلی بحث کے بغیر، اُنھیں کلیّوں اور قوانین کی طرح قبول کر لینا نہ تو ممکن ہے نہ مناسب۔

جیلانی کامران نے ایک مضمون میں 'گلزارِ نسیم' کے تصوراتی اور تہذیبی مضمرات سے متعلق کئی اہم پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی تھی۔ 'گلزارِ نسیم' کی جمالیاتی قدر و قیمت کے بارے میں افتخار جالب نے بھی ایک مضمون میں کچھ ایسے نکات کی نشان دہی کی تھی جو ہمیں اس پیچ دار نظم کے روایتی جائزوں میں نہیں ملتے۔ اصل میں کلاسیکی ادب کے شہ پاروں کی جانب ہمارا عام رویہ یہی رہا ہے کہ اکثر سامنے کی اور سطح

کے اوپر کی حقیقتوں اور بار بار کی دہرائی ہوئی حصولیات سے آگے ہم جدید تر علوم، نظریوں اور فلسفوں کی بخشی ہوئی بصیرت سے کام لینے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ نتیجتاً دل چسپ اور معلومات سے معمور ہونے کے باوجود بہت سے مطالعے انسانی واردات اور تخلیقی تجربے کے مبہم، پیچیدہ اور اسرار آمیز عناصر کو گرفت میں لینے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔ کلاسیکی ادبیات کی تفہیم و تعبیر کا ایک زاویہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انھیں ماضی میں مروّج اور مقبول ضابطوں سے آگے بڑھ کر حالیہ تجربوں اور حقیقتوں اور رویوں کی مدد سے بھی سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ ایلیٹ کے اس بیان کا کہ نئی حسیّت اپنے حال اور مستقبل پر اثر انداز ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی گذشتہ تاریخ اور اپنے ماضی کا مفہوم تبدیل کر دینے کی طاقت بھی رکھتی ہے، ایک مطلب یہ بھی ہے صرف ماضی ہی حال کو متاثر نہیں کرتا، حال کے واسطے سے بھی ماضی کی ایک نئی تصویر مرتّب کی جاسکتی ہے۔

مگر، یہ بات بھی اپنی جگہ طے شدہ ہے کہ تخلیقی ادب کا کوئی بھی جائزہ چاہے جتنا ہشت پہلو اور مفصل ہو، کسی فن پارے کے تمام مضمرات کا احاطہ نہیں کرسکتا۔ چناں چہ رشید حسن خاں نے بھی ایک معیّنہ دائرے کے اندر اس صبر آزما بل کہ ہوش رُبا اور وسیع پیانے پر ہمارے کلاسیکی ادب کے بعض شاہ کاروں کی تدوین، تفہیم اور تحسین کا بیڑا اُٹھایا ہے اور اپنی دیکھی بھالی دُنیا میں اُن کی مہم جوئی بے شک غیر معمولی اور لافانی ہے۔ بڑے اداروں اور اعلا تعلیم کے مراکز میں ان دنوں جو کلچر فروغ پا رہا ہے، خاص کر ہماری اپنی زبان و ادب کے نام پر، اس سے کوئی اُمید بندھتی نہیں، بل کہ رہا سہا حوصلہ بھی ٹوٹتا ہے۔ ادب جب دنیوی مناصب کے حصول کا ذریعہ بن جائے اور ادیب اشتہاری کمپنیوں، مرکنٹائل اداروں اور Show Biz کے نمایندے نظر آنے لگیں تو اس لمحے میں ہمیں ادب کے حشر سے ڈرنا چاہیے۔ اس طوفانِ بے تمیزی میں رشید حسن خاں اور ان کے جیسے گنے چنے افراد کا دم بہت غنیمت ہے۔ ہمیں انجمن ترقی اُردو (ہند) کا بھی شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس نے یکے بعد دیگر خاں صاحب کی کئی ضخیم کتابوں کی اشاعت کا ذمّہ لیا ہے ورنہ تو تجارتی اور کاروباری قسم کے مواد سے ہٹ کر پبلشنگ، وہ بھی اُردو پبلشنگ کے بارے میں کیا کہا جائے اور کس سے کہا جائے؟ اُردو اہلِ اُردو واقعی مشکل میں ہیں!

(دوکانِ شیشہ گراں (کتابیں اور لوگ) شمیم حنفی، صفحہ 19 تا 28، انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی 2008)

نوٹ۔ پروفیسر شمیم حنفی صاحب نے کتاب ''دوکانِ شیشہ گراں کی مشمولات میں اس مضمون کے سامنے سالِ اشاعت 2001 درج کیا ہے۔

☆۔ یہ مضمون عزیزم عادل احسان (ریسرچ اسکالر شعبۂ اُردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی) کی وساطت سے 24 فروری 2017 کو دستیاب ہوا۔

☆۔ یہ مضمون کتاب ''رشید حسن خاں کچھ یادیں کچھ جائزے'' اشاعت 2008 میں صفحہ 205 پر ''گلزارِ نسیم مرتبہ رشید حسن خاں'' کے نام سے شامل کیا گیا ہے۔

○○○

پروفیسر فضیل جعفری

'مثنویاتِ شوق' مرتبۂ رشید حسن خاں

تقسیمِ ملک کے برسوں بعد تک ہندوستان میں اُردو زبان و ادب کے ایسے کئی چند عالم موجود تھے جو تحقیق و تدوین کے میدان کے شہ سوار ہی نہیں اپنی اپنی جگہ یکتائے روزگار بھی تھے۔ ان بزرگوں نے علمی و ادبی معاملات میں غیر معمولی تلاش و جستجو کے ذریعے منطقی نتائج تک پہنچنے کے لیے اپنی ساری توانائیوں کو وقف کر دیا تھا۔ افسوس کہ ہمارے ہم عصروں میں ایسے دشوار اور پیچیدہ مراحل سے گزرنے کا حوصلہ تو کیا، اسلاف کے کارناموں سے استفادہ کرنے کا شوق اور سلیقہ بھی باقی نہیں رہ گیا۔ اسی طرح یہاں یہ بھی عرض کردوں کہ اب سے پچیس تیس سال قبل تک مختلف یونی ورسٹیوں میں ایسے اُردو اساتذہ مل جاتے تھے جنھیں تحقیق و تدوین سے خواہ زیادہ دل چسپی نہ رہی ہو لیکن جن کا علمی و ادبی مرتبہ کافی بلند تھا۔ میں جن اساتذہ کا ذکر کر رہا ہوں ان میں سے بیش تر راہیِ ملکِ عدم اور باقی ملازمت سے سبک دوش ہو چکے ہیں۔ یہی نہیں، بل کہ ان اساتذہ کے ایسے ابتدائی شاگرد بھی جنھوں نے درس و تدریس کا پیشہ اپنایا، یا تو وظیفہ یاب ہو چکے ہیں یا پھر ہونے والے ہیں۔

جہاں تک اُردو اساتذہ کی نسبتاً نئی نسل کا تعلق ہے اس کے زیادہ تر نمایندوں کی ذہنی اور علمی حالت خاصی قابلِ رحم نظر آتی ہے۔ اس صورتِ حال کا سبب بھی واضح ہے۔ ان اساتذہ میں اکثریت ان غریبوں کی ہے جنھیں بی۔ اے میں خراب کارکردگی کی وجہ سے ایم۔ اے کی سطح پر دوسرے مضامین میں داخلہ نہیں مل سکا تھا۔ ایم۔ اے (اُردو) میں انھیں آسانی ہی نہیں فرسٹ ڈیوژن بھی ملنے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ ہول سیل میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی تقسیم کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں اُردو کے شعبے تو ہیں اور شعبوں میں 'ڈاکٹر' خواتین و حضرات کی بھرمار بھی ہے لیکن خالص علمی و ادبی ماحول رخصت ہو چکا ہے۔ یہ سلسلہ برسوں سے جاری ہے اور یہی وجہ ہے کہ گذشتہ کئی دہائیوں میں ہمارے یہاں ایک بھی اہم یا قابل ذکر محقق پیدا نہیں ہوا۔

اس پس منظر میں جب ہم رشید حسن خاں پر نظر ڈالتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، قاضی عبدالودود اور مولانا امتیاز علی عرشی کے سلسلے کی آخری کڑی ہیں۔ موجودہ حالات میں اگر خاں صاحب یہ دعوا کریں کہ:

ہمارے بعد اُجالا نہیں اندھیرا ہے

تو ان کا دعوا یقیناً حق بہ جانب قرار پائے گا۔

یوں تو انھوں نے اچھی خاصی تعداد میں معیاری تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں لیکن ان کا اصل میدان تدوین ہے۔ تحقیق و تدوین لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور چوں کہ اعلا پائے کی تحقیق کے بغیر کوئی مستند تدوینی کام ممکن ہی نہیں، اس لیے بلا تکلف یہ کہا جاسکتا ہے کہ فی زمانہ رشید حسن خاں تحقیق و تدوین میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ 'فسانۂ عجائب'، 'باغ و بہار' اور 'گلزارِ نسیم' کے بعد 'مثنویاتِ شوق' ان کا تازہ ترین تحقیقی اور تدوینی کارنامہ ہے۔

تھا۔ موصوف نے اپنے تعارفی نوٹ میں جہاں خاں صاحب کے بارے میں اور بہت کچھ لکھا ہے وہاں یہ بات بھی بہ اصرار کہی ہے کہ ''اُردو میں رشید حسن خاں کے پائے کا کوئی محقق نقاد ابھی تک پیدا نہیں ہوا''۔ 'گلزارِ نسیم' والے نوٹ میں بھی ان کا یہی موقف تھا۔

ڈاکٹر گیان چند جین نے 'مثنویاتِ شوق' پر تبصرہ کرتے ہوئے (ماہ نامہ 'کتاب نما' دہلی، ستمبر 1998) ڈاکٹر انجم کے خیال سے اختلاف کیا ہے اور لکھا ہے کہ متنی تنقید اور تدوینِ متن دو الگ چیزیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ متنی تنقید کے مغربی تصور کے پیشِ نظر ڈاکٹر جین کا نقطۂ نظر بالکل صحیح ہے۔ متنی نقاد (Textual Critic) تنقید کرتے وقت اپنی ساری توجہ متن یعنی کاغذ پر چھپے ہوئے الفاظ پر مرکوز رکھتا ہے اور انہی سے سارے معانی و مطالب اخذ کرتا ہے۔ اسے سوانح، تاریخ اور عصری حالات وغیرہ سے کوئی دل چسپی نہیں ہوتی۔ اُردو کے بعض جدید نقادوں نے جو متنی تنقید لکھی ہے وہ بھی اسی قسم کی ہے۔ اس اعتبار سے رشید حسن خاں متنی نقاد نہیں ہیں۔ ویسے یہ ان کے لیے کوئی قابلِ فخر بات بھی نہیں ہے۔ ان کے تحقیقی و تدوینی کارنامے اعلا پائے کے تنقیدی کارناموں سے کسی طرح بھی کم نہیں ہیں۔

چوں کہ ڈاکٹر خلیق انجم تنقیدی نظریات، خصوصاً جدید تنقیدی نظریات سے قریب و دور کی کوئی نسبت نہیں رکھتے اس لیے اس معاملے میں انھیں بجا طور پر معصوم و معذور سمجھا جانا چاہیے۔ خاں صاحب نے زیرِ تبصرہ کتاب کے دیباچے میں ایک جگہ لکھا ہے:

''جو حضرات اپنے آپ کو نقاد کہتے ہیں ان میں سے بیش تر کے مزاج کو تحقیق سے دور کی بھی مناسبت نہیں ہوتی۔ ایسے حضرات کو یہ معلوم ہوتا ہوگا کہ کیا لکھنا ہے لیکن عموماً یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کیا نہیں لکھنا ہے۔''

اس مسئلے سے قطع نظر کہ نقاد کے لیے محقق ہونا ضروری ہے یا نہیں، عرض یہ ہے کہ موجودہ سیاق و سباق میں اس جملے کا سب سے زیادہ اطلاق خلیق انجم ہی پر ہوتا ہے۔ ویسے مجھے ان کے اس مفروضے سے اتفاق ہے کہ ''کلاسیکی متون کو مرتب کرنا لوہے کے چنے چبانا ہے۔ رشید حسن خاں ہی کی ہمت ہے کہ وہ ایسی دشوار منزلوں سے انتہائی کامیابی کے ساتھ گزر رہے ہیں''۔

بات یہ ہے کہ خاں صاحب کو دشوار گزار، پیچیدہ، ناہموار اور خاردار راستوں سے گزرنے اور دور دراز منزلوں تک پہنچنے کا چسکا سا لگ گیا ہے۔ برسوں کی تحقیقی محنت اور شدید علمی ریاضت کے نتیجے میں اب وہ اس قابل ہی نہیں رہ گئے ہیں کہ کوئی معمولی کام کر سکیں یا کسی موضوع کو رواداری میں نمٹا دیں۔ ''مثنویاتِ شوق'' اس حقیقت کا تازہ ترین ثبوت ہے۔

نواب مرزا شوق لکھنوی اُردو کے بہت بڑے شاعر نہ سہی، بہت مشہور شاعر ضرور ہیں۔ ان کی ایک مثنوی 'زہرِ عشق' کا شمار بجا طور پر اُردو کے مشہور ترین شعری کارناموں میں ہوتا ہے۔ جن افراد کو اس مثنوی کے مطالعے کا موقع نہیں ملا وہ بھی کم از کم اس کے نام اور کئی اشعار سے ضرور واقف ہیں جو کم و بیش ضرب المثل بن چکے ہیں۔ مثلاً یہ شعر:

گیسو رخ پر ہوا سے ہلتے ہیں
چلیے اب دونوں وقت ملتے ہیں
موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ، کل ہماری باری ہے
ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے
یہی دنیا کا کارخانہ ہے

'زہرِ عشق' کے برخلاف اُردو کا عام قاری، شوق کی دوسری مثنویوں: 'فریبِ عشق' اور 'بہارِ عشق' سے عموماً زیادہ واقفیت نہیں رکھتا۔ خاں صاحب کی کاوشوں کے طفیل عین ممکن ہے کہ یہ صورتِ حال تبدیل ہو جائے۔

جہاں تک زیرِ تبصرہ کتاب کا تعلق ہے یہ حقیقت پہلی ہی نظر میں آشکار ہو جاتی ہے کہ 'مثنویاتِ شوق' کی ترتیب و تدوین کا کام خاصا مشکل اور صبر آزما مرحلہ تھا۔ یوں تو مرزا شوق اپنے زمانے میں بھی کوئی گم نام شاعر نہیں تھے لیکن ان کے معاصرین اور فوراً بعد آنے والوں کے یہاں شوق کے سرسری تذکرے کے علاوہ اور کچھ نہیں ملتا۔ اس حقیقت کا اندازہ یوں ہوتا ہے کہ ان کے بارے میں لکھی گئی پہلی کتاب عطاء اللہ پالوی کی تصنیف 'تذکرۂ شوق' ہے جو 1956 میں شائع ہوئی۔

رشید حسن خاں نے تقریباً ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل اپنے طویل دیباچے میں شوق کے عہد کے معاشرتی، تہذیبی اور ثقافتی حالات سے لے کر ان کی پیدائش، نام، نسب، عرفیت، شکل و صورت، مثنویوں کی تعداد، تاریخ تصنیف و اشاعت، ان کے مآخذات، اشعار میں کمی بیشی اور فحاشی یا کسی اور الزام میں ان پر عائد کی جانے والی مبینہ پابندی وغیرہ تک مختلف مسائل کا احاطہ کیا ہے نیز عطاء اللہ پالوی کے علاوہ مولانا حالی، مولوی عبدالحق، مولانا عبدالماجد دریابادی، رضا علی، شاہ عبدالسلام، عبدالحلیم شرر، نظامی بدایونی، راس مسعود، مجنوں گورکھپوری، عشرت رحمانی، گیان چند جین اور کئی دوسرے اصحاب علم نے شوق کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے بڑی مفصل اور مدلل بحث کی ہے۔ یہ دیباچہ اتنا عالمانہ، مبسوط اور دل چسپ ہے کہ بجائے خود ایک علاحدہ تصنیف کا مرتبہ رکھتا ہے۔ کبھی کبھی تو محسوس ہوتا ہے کہ دیباچے کے سامنے متن محض ایک ضمیمہ بن کر رہ گیا ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہ وضاحت بھی کرتا چلوں کہ رشید حسن خاں تحقیق و تدوین کے معاملے میں مزاجاً کٹر اور بنیاد پرست واقع ہوئے ہیں۔ وہ پہلے ہر چھوٹے بڑے مسئلے پر موجودہ تمام تفاصیل مواد اور حوالوں کو جمع کرتے ہیں، ماخذات، حوالوں اور اطلاعات کا تقابلی موازنہ کرتے ہیں، چھوٹی سے چھوٹی تفصیل کا بھی دقتِ نظر کے ساتھ تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیتے ہیں اور اتنے طویل عمل سے گزرنے کے بعد ہی کسی نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ ثبوت، شواہد اور دلائل کے بغیر وہ کسی بڑے سے بڑے محقق، عالم یا ادیب کی بات قبول نہیں کرتے۔ اسی طرح بہ طورِ اصول وہ کسی کی بھی نہ تو غیر مشروط حمایت کرتے ہیں نہ مخالفت۔ اگر حقائق و شواہد کی روشنی میں انھیں کوئی روایت صحیح معلوم ہوتی ہے تو اسے تسلیم کر لیتے ہیں لیکن اگر وہی راوی سہواً پھر زیبِ داستان کے لیے غلط بیانی سے کام لے تو ایسے مقامات جا بجا بکھرے ہوئے ہیں۔ ردّ و بدل کے اس عمل میں اگر خاں صاحب کہیں انتہا پسندی کا شکار ہو جائیں تو اسے ان کی تحقیقی بنیاد پرستی کا ہی نتیجہ سمجھا جانا چاہیے۔

رشید حسن خاں کے نزدیک شوق کی مثنویاں لسانی اعتبار سے ہی نہیں، تہذیبی اعتبار سے بھی بڑی زبردست اہمیت کی حامل ہیں۔ بقول ان کے:

''یہ مثنویاں اس زمانے کی لکھنوی معاشرت کی بعض جہتوں کی بہترین ترجمان ہیں۔ یہ گویا تمثیل دار آئینے ہیں۔ اس تہذیبی روداد کے پس منظر میں اودھ کی سیاسی تاریخ کے بعض

طاقت و اثرات کا بخوبی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔''

خاں صاحب کے نزدیک مثنویاتِ شوق کی جو تہذیبی اور تاریخی اہمیت ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنے دیباچے کا آغاز ہی مولانا عبدالماجد دریابادی کے ایک مضمون کے اس نسبتاً طویل اقتباس سے کیا ہے جس میں خاصی تفصیل کے ساتھ عہدِ واجد علی شاہ کی تہذیبی اور ثقافتی 'رنگ رلیوں' اور بے اعتدالیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ بعد ازیں فاضل مرتّب نے عبدالحلیم شرر (گذشتہ لکھنؤ) اور نجم الغنی خاں (تاریخِ اودھ) وغیرہ کی تحریروں سے بطور ثبوت متعدد اقتباسات نقل کرنے کے ساتھ ساتھ خود مرزا شوق کے بھی کئی اشعار نقل کیے ہیں۔ پہلے مولانا دریابادی کے منقولہ اقتباس سے چند جملے ملاحظہ ہوں:

> ''لکھنؤ ہے اور واجد علی شاہ جانِ عالم کا لکھنؤ، ہر لب پر گُل کا افسانہ، ہر زبان پر بُلبل کا ترانہ، ہر سر میں عشق کا سودا، ہر سینے میں جوشِ تمنا، ہر روز میلوں ٹھیلوں کا ہجوم، ہر شب گانے بجانے کی دھوم..... ہر طرف رندی و سرمستی کا جوش و خروش، ہر گوشہ بساط، دامانِ باغ بان و کفِ گل فروش۔ بڑے بڑے متین و ثقہ، گویّوں اور سازندوں کی دھاڑیوں کا بہروپ بھرے ہوئے.... بھاری بھاری جبّے اور عمامے پیشوازوں کی گردش پر نثار....''

بعد ازیں خاں صاحب نے عبدالحلیم شرر کی کتاب 'گذشتہ لکھنؤ' سے ایک طویل اقتباس نقل کیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ شجاع الدولہ کا سارا رجحان بازاری عورتوں اور طوائفوں کی طرف تھا اور یہ شوق اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ جب نواب اضلاع کا دورہ کرتے تو ڈیرے دار طوائفوں کے خیمے پورے ٹھاٹ باٹ سے ان کے ساتھ ہوتے۔ ظاہر ہے کہ جب حکمران کا یہ عالم ہو تو امرا و رؤسا کا ہی نہیں، پورے معاشرے کا اسی رنگ میں رنگ جانا ایک فطری بات تھی۔ بقول رشید حسن خاں:

> ''یہیں سے (یعنی شجاع الدولہ کے زمانے سے) عیش طلبی کی اس روایت کا آغاز ہوتا ہے جس نے بعد کے حکمرانوں کے زمانے میں، خاص کر نصیر الدین حیدر کے زمانے میں بہت فروغ پایا اور مزید ترقی پا کر واجد علی شاہ کے عہد میں کسی کو کسی اور کام کا رکھا ہی نہیں تھا''۔

اس سے قطع نظر کہ مولانا دریابادی نے نثر میں شاعری کی ہے، مجھے یہ نہیں معلوم کہ مولانا مرحوم و مغفور اور مولوی شرر وغیرہ کے ماخذات کیا ہیں نیز انھوں نے شجاع الدولہ، نصیر الدین حیدر اور واجد علی شاہ کے بارے میں جو اطلاعات فراہم کی ہیں وہ تحقیقی اور تاریخ کی کسوٹی پر کہاں تک کھری اُتر سکتی ہیں۔ قیاس غالب ہے کہ یہ اکابرین ہگنس (Higgins) اور نائٹن (Knighton) جیسے انگریزوں کی ان تشہیری تحریروں سے متاثر ہو گئے جن کا مقصد نوابینِ اودھ خصوصاً واجد علی شاہ کو بدنام کرنا تھا تا کہ لارڈ ڈلہوزی نے جس طرح جبراً پہلے انھیں معزول کیا اور پھر قید کر کے مٹیا برج بھجوا دیا اس کا جواز مہیا کیا جا سکے۔ ہندوستانی محققین اور ماہرین تاریخ نے تصویر کا جو رُخ پیش کیا وہ کچھ اور ہی کہتا ہے۔

ابھی چند ماہ قبل ہی امریش مصرا کی کتاب Lucknow:Fire of Grance منظر عام پر آئی ہے۔ بقول مصرا شجاع الدولہ کے زمانے میں امرا کا جو نیا طبقہ اُبھرا تھا اس کا بنیادی کردار 'دہی' تھا۔ دوسرے لفظوں میں ملک کی تاریخ میں زراعت پیشہ افراد کو پہلی بار یہ موقع ملا کہ وہ خاندانی نوابوں اور جاگیرداروں کے کاندھے سے کاندھا رگڑ سکیں۔ بقول مصرا شجاع الدولہ کی فوج پیشہ ور جنگجو سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ اسی طرح آصف الدولہ کی اقتصادی پالیسیوں کی بدولت اودھ کی معیشت نے غیر معمولی ترقی کی۔ جگہ جگہ مصنوعات کے چھوٹے بڑے کارخانے کھل گئے۔ بنی بہادر، الماس علی خاں، ٹکیت رائے، تفضل حسین خاں، خواجہ فرید الدین اور ابو طالب وغیرہ نے جن میں سے کچھ بیرونی زبانوں سے بھی واقف تھے، اودھ کی تجارتی حدود کو دور دراز علاقوں تک پھیلا دیا۔ نصیر الدین حیدر یقیناً عورت اور شراب کے رسیا تھے لیکن انھوں نے بھی نواب حکیم مہدی کی توسط سے بہت سی اصلاحات کیں۔ جانب دار مورخین نے واجد علی شاہ کو سب سے زیادہ بدنام کرنے کی کوشش کی ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ دن رات عیش و عشرت اور رقص و سرور میں مست رہتے تھے۔ واضح رہے کہ واجد علی شاہ نے صرف نو سال حکومت کی۔ وہ بیس سال کی عمر میں تخت نشیں ہوئے اور 29 سال کی عمر میں معزول کر دیے گئے۔ اس مختصر سے عرصے میں انھوں نے شاعری اور دیگر فنونِ لطیفہ کی سرپرستی بھی کی اور ریاست کے نظم و نسق کو زیادہ سے زیادہ بہتر بنانے کی کوشش بھی۔ ذکی کاکوروی، مرتّب واجد علی شاہ، مولفہ سیّد محمد تقی احمد نے ڈاکٹر بھٹنا گر کے حوالے سے لکھا ہے کہ انھوں نے شراب کو کبھی منھ نہیں لگایا۔ دراصل جانِ عالم جن کا ایک لقب 'شاہ عادل' بھی تھا، نہایت ہی بیدار مغز اور مزاج قسم کے بادشاہ تھے۔

خاں صاحب نے مرزا شوق کے ایک شعر کو جو انھوں نے بہارِ عشق کی ہیروئن کی زبان سے کہلوایا ہے، مثنوی کے زمانۂ تصنیف سے بحث کرتے ہوئے نقل کیا ہے۔ شعر یہ ہے:

نہ سمجھا زمانہ اور ہے یہ
شاہ واجد علی کا دور ہے یہ

اس شعر میں واجد علی شاہ کی منصف مزاجی اور انصاف پسندی کی طرف واضح اشارہ کیا گیا ہے۔ یہاں صرف ایک مثال کافی ہوگی۔

یکم جنوری 1851 کو بادشاہ کے دربار میں ایک عرض داشت پیش کی گئی جس میں کہا گیا تھا کہ ایک ہندو کلوار کو میر محمد باقر کے حکم سے قتل کر دیا گیا تھا لیکن چوں کہ میر باقر نواب نشاط محل کے قریبی عزیز تھے اس لیے متعلقہ حکام نے ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی تھی۔ ابھی بادشاہ علی نقی خاں (وزیر اعلا) اور داروغۂ شہر سے اس سلسلے میں پوچھ گچھ کر ہی رہے تھے کہ ایک پیامبر نے نواب نشاط محل کا نجی پیغام لا کر دیا جس میں درخواست کی گئی تھی کہ بادشاہ محض ایک ہندو کے قتل کو اتنی اہمیت نہ دیں۔ بادشاہ اس پر سخت برہم ہوئے اور جان کے بدلے جان کی سزا سنائی۔ انھوں نے داروغۂ شہر کو یہ حکم دیا کہ آیندہ کسی بھی شخص کے ساتھ محض اس لیے نرمی نہ دکھائی جائے کہ اس کا ان سے کسی بیگم سے کوئی تعلق ہے۔

اگر چہ مقتول کے وارثوں کو مناسب خوں بہا دینے اور ان سے تحریری اجازت نامہ حاصل کرنے کے بعد میر باقر کی جان تو بچ گئی لیکن بادشاہ نے پھر بھی ان پر کافی جرمانہ عائد کیا۔ یہ بھی یاد رہے کہ واجد علی شاہ نے امورِ سلطنت کو نہ صرف اپنی بیگمات بل کہ دوسرے رشتے داروں کی دسترس سے بھی دور رکھا تھا۔ اگر فوج تہور خاں اور ہادی خاں کی ماتحتی میں تھی تو محکمۂ مال دھیرج بال کرشنا کی زیر نگرانی تھا۔ شاہی خزانے کے انچارج راجا کندن لال تھے۔

بادشاہ اپنے خزانے کا زیادہ تر حصہ فوجوں کی تربیت پر خرچ کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مغل حکومت آخری ہچکیاں لے رہی تھی۔ اودھ کی بڑھتی ہوئی فوجی طاقت سے انگریز خوف زدہ ہو چلے تھے، اسی لیے جنرل اوٹرم اور جنرل سلمن وغیرہ نے بار بار پہلے تو واجد علی شاہ کو سمجھایا کہ وہ فوجوں پر پیسہ نہ خرچ کریں اور پھر گورنر جنرل کے کان بھر کے انھیں معزول کرا دیا۔

اس حقیقت کو تو خود ہم عصر برطانوی مورخین مثلاً L.E.Runtez Rees وغیرہ نے تسلیم کیا ہے کہ 1857 کی جنگ کے دوران انگریز فوجوں کو سب سے زیادہ شدید مزاحمت کا سامنا لکھنؤ میں ہی کرنا پڑا تھا۔لکھنؤ وہ واحد علاقہ تھا جہاں عورتوں تک نے ڈٹ کر انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ برطانوی ریذیڈینسی کا پورے 140 دنوں تک کا محاصرہ تو ہندوستان کی تاریخ کا ایک ناقابلِ فراموش باب ہے۔رشید حسن خاں نے اسی سلسلے میں بحث کرتے ہوئے ایک جگہ بالکل صحیح لکھا ہے کہ:

''سماجی حالات اچانک نہ بنا کرتے ہیں اور نہ اچانک بدلا کرتے ہیں۔''

پھر ان حالات اور مندرجہ بالا پس منظر میں ہم یہ کیسے تسلیم کرلیں کہ واجد علی شاہ کی عیش پرستی نے ''کسی کو کسی کام کا رکھا ہی نہیں تھا''۔

یہ بھی یاد رہے کہ واجد علی شاہ کے عہد میں درگاہ حضرت عباس جیسے مذہبی، تفریحی مراکز کی اہمیت تقریباً ختم ہوگئی تھی اور 'قیصر باغ' لکھنؤ کا نیا ثقافتی مرکز بن گیا تھا جس کی تعریف میں منشی امیر مینائی اور منیر لکھنوی جیسے بہت سے شاعروں نے نظمیں لکھی ہیں۔ان نظموں میں عیش پرستی، بدچلنی اور آوارگی کا ایسا کوئی ذکر نہیں ملتا جیسا کہ شوق کی مثنویوں میں دکھائی دیتا ہے۔مثنوی 'فریبِ عشق' سے یہ پانچ شعر ملاحظہ ہوں:

آئیں نوچندی میں یہ زنہار
گر حقیقت میں ہوئیں عصمت دار
رنڈیاں گو کہ ساری آفت ہیں
بیگمیں اور بھی قیامت ہیں
زہر ان میں بھرا ہے سر تا سر
نہیں کاٹے کا ان کے ہے منتر
کھلتا ہر اک پہ ان کا حال نہیں
کون ان میں ہے جو چھنال نہیں
ڈھونڈتی پھرتی خود حسین ہیں یہ
ہم سے دونی تماش بین ہیں یہ

ان میں سے دوسرا، چوتھا اور پانچواں شعر خاں صاحب نے بھی اسی زمانے کی معاشرت کے ثبوت میں نقل کیا ہے۔بقول خاں صاحب ان اشعار میں شوق نے ''ایک ایسی تلخ حقیقت کو بیان کیا تھا جس سے لوگ بے خبر نہیں لیکن اس کو بیان کرنے کی جرأت باقی نہیں رہ گئی تھی یا یہ کہ وہ معاشرے کا ایسا حصہ بن چکی تھی کہ اجنبیت اور اعتراض کی گنجائش گویا ختم ہوچکی تھی۔'' اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے خاں صاحب لکھتے ہیں:

''شوق کی شاعری جیسی بھی ہے وہ سچی ہے کہ معاشرت کی آئینہ داری کرتی ہے۔جیسا وہ معاشرہ تھا اس کی شاعری کو بھی ویسا ہی ہونا چاہیے تھا اور یہ ویسی ہی ہے.....شوق کی مثنویاں اپنے زمانے کی معاشرت کی آئینہ دار ہیں۔اس زمانے میں لذّت کوشی اور عیش اندوزی معاشرے کا جز بن چکی تھی۔گفتگوئے صاحباتِ محل کے پس منظر میں اس معاشرت کے وہ سارے انداز جھلکتے نظر آتے ہیں جو تہذیب کا چمک دار حصہ تھے اور یہ ان مثنویوں کا بڑا روشن پہلو ہے اور یہ بڑے کمال کی بات ہے کہ شاعر کا اصل مقصد تو صرف خواتین کی زبان و بیان کی بہاریں دکھانا تھا مگر شاعرانہ صداقت کے نتیجے میں سماجی حقیقت نگاری کے مرقعے تیار ہوگئے۔''

میرا مودّبانہ معروضہ ہے کہ ان مثنویوں کو شاعری سمجھ کر پڑھنا اور ان سے محظوظ تو یقیناً ہوا جا سکتا ہے لیکن انھیں سماجی حقیقت نگاری کے مرقعے قرار دینا خود شوق کے ساتھ زیادتی کے مصداق ہے۔یہاں ایک اور نکتے کی طرف بھی توجہ چاہوں گا۔شوق نے اس زمانے کی بیگمات کی بدچلنی اور کھلی آوارگی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے خود ان کی مثنویوں کی ہیروئیں عملی طور پر اس کی نفی کرتی نظر آتی ہیں۔ پہلے فریبِ عشق کی مثال ملاحظہ ہو۔فریبِ عشق کا مرد کردار ابتدا ہی سے اپنی عیش پرستی اور جنسی فتوحات کا بکھان کرتا دکھائی دیتا ہے۔دریں اثنا وہ نوچندی کے میلے میں آنے والی ایک لڑکی پر 'عاشق' ہو جاتا ہے۔وہ لڑکی کے ماما کو بہلا پھسلا کر اس بات پر راضی کرلیتا ہے کہ وہ اپنی بیگم کو کسی بھی طرح اس کے خیمے میں لے آئے۔آخر کار ایسا ہی ہوتا ہے۔مرد سے تعارف کے بعد لڑکی برملا یوں گویا ہوتی ہے:

یہ تو سمجھی کہ خوش بیاں ہیں آپ
رکھتے کیا نام کیا نشاں ہیں آپ
نام جس وقت میں نے بتلایا
قہقہہ مار کر یہ فرمایا
اے لو میں بھی کہوں سبب کیا ہے
ارے تو ہی نواب مرزا ہے
ایکی مرشد ہو تم، قصور معاف
سن چکی ہوں میں آپ کے اوصاف

مجھے خاں صاحب کے اس خیال سے مکمل اتفاق ہے کہ اگرچہ شوق کی عرضیت نواب مرزا تھی لیکن اسے شوق کی داستان حیات نہیں سمجھا جاتا۔ یہ بیان کا محض ایک انداز ہے۔مطلب یہ کہ مثنوی کے راوی خود مرزا

شوق نہیں بل کہ کوئی اور مرد ہے۔ بعدازیں ہیروئن نے بارہ پندرہ اشعار میں عاشق صاحب کو جو'اوصافِ حمیدہ' گنوائے ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ موصوف شہر کے نامی گرامی اوباش ہیں اور ان کا پیشہ ہی نت نئی لڑکیوں کو اپنے جال میں پھنسا کر دادِ عیش دینا ہے۔ پھر موصوف 'رنڈی' بمعنی عورت ذات کی سادہ لوحی اور اپنی شاطرانہ بوالہوسی کا ذکر کرتے ہوئے اطلاع دیتے ہیں:

فرق اتنا تھا اس میں اور ہم میں
رنڈی آخر تھی آ گئی دم میں
نہ رہی درمیاں میں جب تکرار
ہو گیا وصل بعد قول و قرار
کچھ دنوں تک مزے اڑائے خوب
لطف اس شوخ سے اٹھائے خوب
بھر گیا دل جب ان کی صحبت سے
اور معشوق سے دل اُلجھایا

ان اشعار سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ مرد ایک پیشہ ور بوالہواس اور بدخصلت انسان ہے۔ اب ذرا لڑکی کی حالت بھی ملاحظہ فرمائیے:

دی کسی نے جو اس کی ان کو خبر
اپنے جامے سے ہو گئی باہر
رشک سے پیچ و تاب کھانے لگی
دل ہی دل میں الم اٹھانے لگی
نہ کسی سے یہ غم کیا اظہار
صدمۂ رشک سے چڑھ آیا بخار
جی سے اپنے گزر گئی آخر
بعد چندے کے مر گئی آخر

حاصلِ کلام یہ کہ مرد لاکھ بدنام اور اوباش سہی، لڑکی جب ایک بار اسے دل دے بیٹھتی ہے اور منزلِ وصل سے گزر جاتی ہے تو پھر وہ کسی اور مرد کی طرف نہیں دیکھتی۔ مرد کی بے وفائی کے غم میں اندر ہی اندر گھلنا اور پھر لب پر حرفِ شکوہ لائے بغیر چپ چاپ جان دے دینا اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ لڑکی، مرد راوی کی طرح ہرجائی نہیں بل کہ وفادار تھی۔ ظاہر ہے کہ تماش بین اور چھنال عورتیں عادتاً ایک کے بعد دوسرے مرد کو پھنساتی ہیں اور اس طرح اپنی نفسیاتی اور حیوانی خواہشات کی تکمیل کرتی رہتی ہیں۔ آخری بات یہ کہ 'فریبِ عشق' کی لڑکی تو آخر میں حقیقی معنی میں ہیروئن بن جاتی ہے جب کہ مرد صاحب پرلے درجے کے بدمعاش اور ولن ثابت ہوتے ہیں۔

'بہارِ عشق' کا بھی تقریباً یہی حال ہے۔ مثنوی کا مرد راوی لڑکی کو دیکھتے ہی نہ صرف ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے بل کہ قریب المرگ ہو جاتا ہے۔ گھر میں رونا پیٹنا مچ جاتا ہے۔ مثنوی کے آغاز میں عاشق کی اس کیفیت کے تعلق سے اعزہ اور اقربا کے بے حد غم گین ردِّ عمل اور ان کی سراسیمگی کو بڑی تفصیل کے ساتھ اور خاصے موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ آخر میں جب عاشق صاحب ہوش میں آتے ہیں اور اپنے قریبی دوستوں سے سارا ماجرا بیان کرتے ہیں تو وہ لوگ لڑکی سے ہزار منتیں کر کے اسے عاشق کے گھر آنے پر راضی کر لیتے ہیں تا کہ ایک انسانی جان ضائع ہونے سے بچ جائے۔ اگرچہ 'بہارِ عشق' ایک طربیہ مثنوی ہے اور اس کا خاتمہ مرد اور عورت کی شادی پر ہوتا ہے لیکن دونوں کے درمیان ہونے والی پہلی ملاقات بہر حال توجہ کی متقاضی ہے۔

شوق نے تقریباً چالیس اشعار میں اس ملاقات اور پھر وصل کی مختلف کیفیات کا بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ خاں صاحب نے اس کے لیے 'وصل بالجبر' کی ایک نئی اصطلاح وضع کی ہے۔ مولانا حالی سمیت کئی اصحابِ علم نے ان اشعار پر فحش ہونے کا الزام لگایا ہے۔ فاضل محقق اور مرتب نے نہ صرف اخلاقیات کے نام پر واویلا کرنے والوں سے اختلاف کیا ہے بل کہ فارسی اور اُردو کی کئی مثنویوں سے 'بہارِ عشق' کا موازنہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ متعلقہ اشعار فحش نہیں ہیں۔ مجھے اس سلسلے میں ان سے مکمل اتفاق ہے، ویسے فحش نگاری سر دست میرا موضوع نہیں ہے۔

میں نے 'فریبِ عشق' کے پس منظر میں اوپر جو چند معروضے پیش کیے ہیں انھی کو آگے بڑھاتے ہوئے مثنوی کے مرد کردار اور اس کی ہیروئن کے جنسی رویوں کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ مرزا شوق نے 'وصل بالجبر' یعنی سلیس اُردو میں زنا بالجبر کا جو مفصل نقشہ کھینچا ہے اس کا آخری منظر ملاحظہ ہو:

درد سے جب نہ رہ سکی خاموش
ہو گئی چیخ مار کر بے ہوش
ہاتھ اور پاؤں سارے اینٹھ گئے
نہ رہی تاب، دانت بیٹھ گئے
مارے صدمے کے نیم جان ہوئی
سب پلنگڑی لہو لہان ہوئی

ظاہر ہے کہ مرزا شوق سے تہذیبِ عشق کے اس معیار کی توقع نہیں کی جا سکتی جس کا مظاہرہ میر تقی میر کے متعدد اشعار مثلاً:

دور بیٹھا غبارِ میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

میں کیا گیا ہے۔ لیکن 'بہارِ عشق' کا عاشق جولڑکی کے فراق میں نیم جاں بل کہ تقریباً مردہ ہو چکا تھا پہلی ہی ملاقات میں جس طرح اس پر بھوکے گدھ کی طرح ٹوٹ پڑتا ہے اس بدذوقی اور بوالہوسی کی بدترین مثال کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ڈاکٹر گیان چند جین اور دیگر ماہرین کا خیال ہے کہ مثنوی نگاری کے باب میں شوق سب سے زیادہ مومن خاں مومن سے متاثر تھے۔ یقیناً ہوں گے لیکن بیانِ وصل کے تعلق سے شوق جس طرح شوخ نگاری اور بے باکی کی سرحدوں کو پار کر کے بے لگام ہوتے ہیں، مومن اس کا اثبات نہیں کرتے۔ مومن نے مثنوی پنجم میں اپنے موقف کا بڑا واضح اظہار کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

مفتیانِ عشق لکھتے ہیں تمام
بوالہوس شوہر بھی ہو تو ہے حرام

مختصر یہ کہ ایک طرف تو 'بہارِ عشق' کے منقولہ بالا اشعار اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ 'فریبِ عشق' کے مرد کردار کی طرح 'بہارِ عشق' کا عاشق بھی پرلے درجے کا بوالہوس ہے اور دوسری طرف تینوں اشعار خصوصاً:

مارے صدمے کے نیم جان ہوئی
سب پلنگڑی لہو لہان ہوئی

سے واضح ہو جاتا ہے کہ 'فریبِ عشق' کی ہیروئن کی طرح 'بہارِ عشق' کی ہیروئن بھی چھنال اور آوارہ نہیں بل کہ پاکیزہ تھی اور جنسی اختلاط کا اس کا یہ پہلا موقع تھا۔ جہاں تک 'زہرِ عشق' کی ہیروئن کا سوال ہے وہ بے چاری تو محبوب کی جدائی کی تاب نہ لاکر زہر کھا کر جان دے دیتی ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ان تینوں ہیرئنوں کے مدنظر شوق کے اس بیان کو ہرگز قبول نہیں کیا جا سکتا کہ نوچندی کے میلے میں جانے والی سبھی بیگمات یا خواتین عادتاً بدکردار، بدچلن، بے عصمت اور چھنال ہوا کرتی تھیں۔ اس رویے کو زیادہ سے زیادہ مرزا شوق کا جنس پر ورژن کہا جا سکتا ہے۔

یہاں ایک سوال اور اٹھتا ہے۔ کیا ان مثنویوں کے مرکزی مرد کردار خود مرزا شوق ہیں۔ اتفاق سے شوق کے بارے میں بیش تر مباحث کی طرح اس بحث کا آغاز بھی مولانا حالی سے ہی ہوتا ہے۔ مولانا کے الفاظ میں:

''میر حسن کے بعد نواب مرزا شوق لکھنوی کی مثنویاں سب سے زیادہ لحاظ کے قابل ہیں۔ ان میں سے تین مثنویوں میں اس نے اپنی بوالہوسی اور کام جوئی کی سرگذشت بیان کی ہے۔ یا یوں کہو کہ اپنے اوپر افترا باندھا ہے۔''

عطاء اللہ پالوی اور مجنوں گورکھپوری دونوں نے حالی سے طاقت اخذ کی ہے اور مرزا شوق کو ہی 'فریبِ عشق، بہارِ عشق اور زہرِ عشق کا ہیرو قرار دیا ہے۔ رشید حسن خاں نے اس طرزِ فکر سے بجا طور سے اختلاف کرتے ہوئے ایک بڑا بار یک نکتہ پیدا کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ حالی نے یہ لکھ کر کہ 'اپنے اوپر افترا باندھا ہے'۔ اپنے جملے کے پہلے حصے یعنی 'بمعنی مثنویوں میں اس نے اپنی بوالہوسی اور کام جوئی کی سرگذشت بیان کی ہے' کی صراحت کو ختم کر دیا ہے اور یہ کہنے کی واضح کوشش کی ہے کہ مرزا شوق نے بلاوجہ ہی اور اپنی ناسمجھی کی بنا پر خود کو ان مثنویوں کا ہیرو بنا کر پیش کیا ہے۔

خاں صاحب نے قابلِ قبول دلائل کی مدد سے پالوی کے اس دعوے کو بھی رد کر دیا ہے کہ شوق کا بنیادی مقصد ہم عصر معاصرے کی اصلاح تھا اور ''اس لحاظ سے جب شوق نے اپنے شہر کی بد اخلاقیوں کو طشت از بام کرنا چاہا تو سب سے پہلے اپنی ذاتی روداد پیش کی اور باتوں باتوں میں ہی سارا راز کھول کر رکھ دیا۔'' پالوی صاحب نے ''ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ'' کے مصداق جس قیاس آرائی سے کام لیا ہے وہ یوں بھی خاں صاحب کے عمومی طریق کار سے مطابقت نہیں رکھتی۔ وہ بطور اصول قیاسات یا کسی واقعے کی شہرت کو صداقت کی مترادف نہیں سمجھتے۔ پھر اس سلسلے میں تو ان کے سامنے خود شوق کا وہ بیان موجود ہے جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ ان کا حقیقی مقصد ان مثنویوں کے توسط سے:

''صاحبات محل اور نوچندی میں شرکت کرنے والوں کے محاورات یعنی ان کی بول چال اور طرزِ گفتگو کو بیان کرنا تھا۔''

بقول رشید حسن خاں ''یہ نہ آپ بیتی ہے نہ کوئی حقیقی واقعہ۔ یہ محض ایک قصہ ہے جس میں اس زمانے کے ایسے واقعات کا عکس اتر آیا ہے گویا یہ اس زمانے کی جگ بیتی ہے۔''

اس اقتباس کے پہلے جملے سے اختلاف کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے لیکن 'جگ بیتی' ایک وسیع المفہوم دائرے والی اصطلاح ہے جس کا اطلاق زندگی کے تمام شعبوں پر ہوتا ہے اور چھوٹے موٹے انفرادی واقعات کو بھی جگ بیتی کہا جا سکتا ہے تو بھی 'بہارِ عشق' وغیرہ پر جگ بیتی کا لیبل چسپاں کرنا مناسب نظر نہیں آتا۔ جس طرح سے شوق نے کہیں یہ نہیں لکھا کہ ان کا مقصد معاشرے کی اصلاح کرنا تھا بالکل اسی طرح انھوں نے اپنی مثنویوں کے ذریعے لکھنوی معاشرے کی عکاسی کے آئینہ داری کا بھی کوئی دعوا نہیں کیا۔ معاملہ گھوم پھر کر صاحباتِ محل کی زبان اور ان کے محاوروں کو نظم کرنے والے مقصد پر ہی اٹک کر رہ جاتا ہے۔

اس سلسلے میں بھی شوق کے یہاں اچھا خاصا جھول نظر آتا ہے۔ ان مثنویوں کی بیگمات جس زبان میں گفتگو کرتی ہیں بالکل وہی زبان نوکرانیاں استعمال کرتی ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ بسا اوقات مرد بھی اسی انداز اور اسی لہجے میں گفتگو کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ اشعار:

جھوٹے کی جان پر ستم ٹوٹے
شاہ عباس کا علم ٹوٹے
جھٹ ترے غیر کو جو کرتا ہو پیار
ارے اس پر پڑے خدا کی مار

'بہارِ عشق' کے مرد راوی کی زبان سے کہلوائے گئے ہیں۔ خاتون کردار کی زبان کے سلسلے میں بھی شوق ہر جگہ یکساں طور پر کامیاب نہیں ہیں۔ خاں صاحب کی یہ تنقید اکثر مقامات پر شوق بیگمات کے منھ میں خود اپنی زبان رکھ دیتے ہیں، کھری اور سچی بھی ہے اور لسانی نزاکتوں سے ان کی گہری واقفیت کا ثبوت بھی۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے مرزا شوق کی زبان کو کوثر سے دُھلی ہوئی زبان قرار دیا ہے۔ خاں صاحب نے بھی شوق کی زبان کی بڑی تعریف کی ہے لیکن انھوں نے جذباتیت کے بجائے حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے شوق کے یہاں پائے جانے والے لسانی اسقام ونقائص کی طرف اشارہ کرنے میں بھی کوتاہی نہیں برتی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب میں ایک اور تفصیلی نیز دقیق بحث مثنویاتِ شوق کی تعداد کے بارے میں بھی ہے۔ رشید حسن خاں کو ایسے نیم تعلیم یافتہ اور کچا ذہن رکھنے والے تذکرہ نویسوں سے قطعاً کوئی دل چسپی نہیں جنھوں نے سوچے سمجھے بغیر فریبِ عشق، بہارِ عشق اور زہرِ عشق کے ساتھ ساتھ خنجرِ عشق، سوزِ عشق، قہرِ عشق اور لذتِ عشق کو بھی شوق کے خانے میں ڈال دیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ خاں صاحب کا سخت گیر تحقیقی و تنقیدی مزاج مولانا حالی اور مجنوں گورکھپوری جیسے زعمائے ادب کو معاف نہیں کرسکتا جنھوں نے پورے اعتماد کے ساتھ لذّتِ عشق کو شوق کی تصنیف قرار دیا ہے۔ سعادت خاں ناصر، پنڈت کیفی اور سرراس مسعود سے بھی یہی غلطی سرزد ہوئی ہے۔ البتہ عطاء اللہ پالوی اور ڈاکٹر گیان چند جین کافی تحقیق وجستجو کے بعد مثنویاتِ شوق کی صحیح تعداد مقرر کرنے میں یقیناً کامیاب ہوئے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اس غلط فہمی کا سلسلہ کب اور کہاں سے شروع ہوا۔ رشید حسن خاں کی فراہم کردہ تفصیل سے پتا چلتا ہے کہ مثنویاتِ شوق کا ایک مجموعہ مطبع نول کشور لکھنؤ سے 1869 میں شائع ہوا تھا۔ یہ مجموعہ مرزا شوق کی زندگی میں شائع ہوا تھا اور اس میں 'لذتِ عشق' بھی شامل تھی۔ بقول خاں صاحب:

''غالبًا غلط فہمی کا آغاز یہیں سے ہوا۔ نول کشوری مطبوعات سے اہلِ علم بطورِ عموم استفادہ کیا کرتے تھے۔ غالبًا اس مجموعے کی بنیاد پر مولانا حالی نے 'لذتِ عشق' کو بھی بلاتکلف شوق کی مثنوی سمجھ لیا۔''

خاں صاحب کا خیال بالکل صحیح ہے۔ مولانا حالی محقق نہیں تھے۔ 'مقدمۂ شعروشاعری' میں دیگر اصنافِ سخن پر عمومی تبصرہ کرتے وقت انھوں نے اختصار کے ساتھ صنفِ مثنوی پر بھی لکھا ہے اور اسی ضمن میں بھی شوق کا بھی ذکر آگیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کے سامنے مثنویاتِ شوق کا نول کشوری اڈیشن ہی رہا ہوگا۔ اس طرح حالی کا 'لذّتِ عشق' کو شوق کی ہی تصنیف مان لینا کوئی حیرت انگیز بات نہیں۔ ہاں پنڈت کیفی اور مجنوں گورکھپوری جیسے عالموں کا لکیر کا فقیر بنے رہنا ضرور حیرت انگیز واقعہ ہے۔ اب جب کہ یہ حقیقت 'بہ تحقیق' پایۂ ثبوت تک پہنچ چکی ہے کہ 'لذّتِ عشق' مرزا شوق کی نہیں، ان کے بھانجے آغا حسن نظم کی تصنیف ہے، میرے ذہن میں کچھ سوالات آرہے ہیں جو آج بھی تحقیق طلب ہیں۔ میں ایک طالب علم کی حیثیت سے ان سوالات کو خاں صاحب کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ یوں بھی کارِ مغاں کبھی تمام نہیں ہوتا۔

(1) مطبع نول کشور جیسے ذمے دار، باوقار اور مستند ادارے سے اتنی بڑی غلطی کیسے اور کیوں سرزد ہوئی کہ اس نے مرزا شوق کے مجموعے میں ایک جونیر شاعر (نظم لکھنوی) کی مثنوی 'لذّتِ عشق' کو بھی شامل کرلیا؟

(2) یہ مجموعہ شوق کی زندگی ہی میں شائع ہوا تھا۔ کیا مطبع ہذا نے اس کی بھی ضرورت نہیں سمجھی کہ اشاعت سے قبل مسودہ شوق کو دکھایا جاتا؟

(3) اگر مسودہ انھیں دکھایا گیا تھا تو شوق ایسی بد دیانتی کے مرتکب کیسے ہوئے کہ اپنے بھانجے کی تصنیف کو ڈکار لیے بغیر ہضم کر گئے؟

(4) اگر مطبع نول کشور نے اشاعت سے قبل شوق کو مجموعے کا مسودہ دکھانا ضروری نہیں سمجھا تھا تو کیا مرزا صاحب نے شائع شدہ مجموعہ بھی نہیں دیکھا تھا۔ اور اگر دیکھا تو ان کا ردِّ عمل کیا تھا؟

(5) جیسا کہ خاں صاحب نے لکھا ہے مثنوی 'لذّتِ عشق' کا وہ نسخہ جو مطبع فیضی سے شائع ہوا تھا ان کی نظر سے نہیں گزرا۔ دوسرے نقادوں رمحققوں نے بھی اس کے بارے میں زیادہ تفصیل کے ساتھ نہیں لکھا۔ شاید عبدالسلام نے اپنے مرتّب کردہ کلیاتِ شوق میں اور ڈاکٹر حیدر نے اپنے تحقیقی مقالے میں صرف اس کے سرورق کا عکس چھاپ دیا ہے جو یوں ہے:

''تصنیفِ شاعرِ تیز زباں، طوطیِ ہندوستاں، آغا حسن تخلص بہ نظم ہمشیر زادۂ حکیم تصدق حسین خاں صاحب دام اقبالہٗ''۔

اس تحریر میں ایک عجیب بات یہ ہے کہ نظم جیسے 'گم نام شاعر' کو تو 'طوطیِ ہندوستاں' کے لقب سے یاد کیا گیا ہے جب کہ مرزا شوق لکھنوی جیسے مشہور ومعروف شاعر کو محض حکیم تصدق حسین خاں پر ٹال دیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ مرزا شوق لکھنؤ میں حکیم کی حیثیت سے کہیں زیادہ شاعر کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے تھے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ نظم مرزا شوق کے نہیں کسی اور حکیم تصدق حسین خاں کے بھانجے رہے ہوں!

'مثنویاتِ شوق' کی تعداد کی طرح ان کے ماخذ بھی شروع سے ہی اہلِ علم کی توجہ اور بحث کا مرکز رہے ہیں۔ اس سلسلے میں بھی قدیم ترین رائے مولانا حالی ہی کی ہے۔ مولانا نے 'مقدمۂ شعروشاعری' میں لکھا ہے کہ شوق نے خواجہ میر اثر کی مثنوی 'خواب وخیال' کو بنیاد بنا کر اپنی مثنویوں کی عمارت کھڑی کی ہے۔ لیکن رشید حسن خاں نے خود حالی کی تحریر سے ثابت کر دیا ہے کہ مولانا نے خواب وخیال، پڑھی ہی نہیں تھی۔ انھیں پالوی اور ڈاکٹر جین کے اس خیال سے اتفاق ہے کہ شوق نے سب سے زیادہ فائدہ مومن کی مثنویوں سے اٹھایا ہے۔ وہ ڈاکٹر جین کے اس نقطۂ نظر سے بھی متفق ہیں کہ:

''شوق نے اپنی مثنویوں کا موضوع خود ہی اختراع کیا۔ محض وصل کے بیان میں اس نے دوسرے شعرا کے کلام کو پیش نظر رکھا''۔

البتہ حالی کی رائے کی طرح وہ مولوی عبدالحق اور مجنوں گورکھپوری کی بھی اس رائے کو معتبر نہیں سمجھتے کہ شوق کے پیش نظر محض مثنوی 'خواب وخیال' تھی۔ اس سلسلے میں انھوں نے پہلے مجنوں صاحب کا یہ اقتباس نقل کیا ہے:

''یہ تو مسلم ہے کہ مرزا شوق نے 'بہارِ عشق'، 'خواب وخیال' کو پڑھ کر لکھی تھی کیوں کہ دونوں مثنویوں میں سراپا اور اختلاط کے اشعار بے طرح مشابہ ہیں...... میرا خیال ہے کہ مرزا شوق کی ہر مثنوی میں..... 'خواب وخیال' کے کچھ عناصر موجود ہیں''۔

اور پھر اس اقتباس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''بہارِ عشق میں تو سراپا موجود ہی نہیں، ہاں خواب وخیال میں سراپا ہے اور بقول مولوی عبدالحق سراپا میں کوئی عضو نہیں چھوڑا اور اس دُھن میں وہ حد سے آگے نکل گئے ہیں۔''

یہاں سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا واقعی 'بہارِ عشق' میں سرے سے ہی سراپا موجود نہیں ہے؟ خاں صاحب ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ بقول ان کے 'بہارِ عشق' میں ہیروئن کی تعریف میں جو اٹھارہ شعر ہیں وہ عمومی

انداز کے ہیں جب کہ 'سراپا بالکل دوسری چیز ہے جس میں محبوب کے مختلف اعضا و اجزائے بدن کی تعریف میں اشعار لکھے جاتے ہیں۔ ایک ایک عضوِ بدن کی صراحت کے ساتھ'۔ خاں صاحب کا اصرار ہے کہ:

''جب 'بہارِ عشق' میں سراپا موجود ہی نہیں تو یہ کہنا کہ 'خواب وخیال' اور 'بہارِ عشق' کے سراپا کے اشعار بے طرح مشابہ ہیں، کوئی معنی نہیں رکھتا۔''

رشید حسن خاں کے تحقیقی مباحث اور نتائج اتنے مدلل ہوتے ہیں کہ ان سے اختلاف کرنا آسان نہیں ہوتا لیکن مجھے اختلاف کی تھوڑی سی گنجایش نظر آ رہی ہے۔ خاں صاحب نے 'بہارِ عشق' میں محبوب کی عمومی تعریف والے جن اٹھارہ اشعار کا ذکر کیا ہے ان میں پہلا شعر یہ ہے:

بام روشن تھا طور کی صورت
سر سے پا تک تھی نور کی صورت

اس شعر کے دوسرے مصرعے میں 'سر سے پا تک' والا فقرہ اس بات کی چغلی کھا رہا ہے کہ شاعر کا رجحان محبوب کے سراپا کے بیان کی طرف ہے۔ بعد ازیں شوق نے دیگر اشعار میں محبوب کے قد، رخسار، چہرہ، آنکھیں، دہن، دانت، ہونٹ، سینہ (چھاتیاں)، گردن کمر، شانے، ناک اور چوٹی وغیرہ کا بیان کیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے کہیں تلمیح وتشبیہ سے مدد لی ہے تو کہیں بالکل صاف، کھرے اور براہ راست بیانیہ سے کام لیا ہے۔ تلمیح وتشبیہ کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

حسن یوسف بھی اس کے آگے ماند
چہرہ زلفوں میں جیسے ابر میں چاند

اسی کے بعد اب ذرا یہ شعر پڑھیے:

سینے پر دونوں چھاتیاں انمول
اونچی، چکنی، کڑی، کراری، گول

اور سوچیے کہ چھاتیوں کے بیان میں بھلا اس سے زیادہ صراحت اور کیا کی جا سکتی ہے۔ اب اگر سراپا نگاری کے باب میں میر اثر کی طرح مرزا شوق کا قلم انداز، انداز نہانی تک نہیں پہنچ سکا جسے بابائے اُردو نے حد سے آگے نکل جانا قرار دیا ہے تو اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ شوق کو جزئیات نگاری میں وہ ملکہ حاصل نہیں تھا جو اثر کو تھا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ 'بہارِ عشق' کا عاشق محبوبہ کو دیکھتے ہی جسمانی طور پر اس حد تک بد حواس اور مضطرب ہو چکا تھا کہ اسے کچھ اور دیکھنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ اس کے سر پر تو محض 'کرنے' کا جنون سوار تھا۔ جملۂ معترضہ کے طور پر یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ اندام نہانی کے ذکر کو کسی بھی طرح فحش قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ نسوانی جسم کا نہ صرف سب سے زیادہ لذت بخش عضو ہے بل کہ اس کے ساتھ ایک خاص معنی میں تقدس کا تصور بھی وابستہ ہے۔ بقول رفیع لکھنوی:

''یہ وہ محراب ہے جس سے پیمبر جھک کے نکلے ہیں۔''

اسی سلسلے میں یہ بھی یاد رہے کہ سراپا نگاری میں مومن خاں مومنؔ بھی میر اثر سے آگے نہیں جا سکے۔ وہ اپنی ایک مثنوی میں محبوب کا سراپا بیان کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے کہ:

سنبلستاں تر خم گیسو سے ناف
نافۂ مشکیں ہجوم مو سے ناف
آگے جی کہتے ہوئے شرمائے ہے
اپنی باتوں سے خجالت آئے ہے

میر اثر کا کمال یہ بھی ہے کہ ان کی سراپا نگاری پر لذت کوشی کا شائبہ تک نہیں ہوتا جب کہ مومنؔ اور ان سے زیادہ شوق کے یہاں معاملہ لذت کوشی سے گزر کر بوالہوسی تک پہنچ جاتا ہے۔

'مثنویاتِ شوق' سے متعلق ایک اور اہم اور متنازعہ پہلو سے رشید حسن خاں نے تفصیلی بحث کی ہے اور جس پر ہر زاویے سے روشنی ڈالی ہے، وہ ہے مثنویوں پر پابندی عائد کیے جانے کا مسئلہ۔ اس بحث کا آغاز یوں ہوتا ہے:

''شوق کی تینوں مثنویوں (فریبِ عشق، بہارِ عشق اور زہرِ عشق) پر یا ان سے کسی ایک پر حکومت نے کبھی پابندی لگائی تھی، اس سوال کا جواب دینا بہت مشکل ہے۔ مشہور یہی ہے کہ پابندی لگی تھی۔ لیکن تحقیق کی نظر میں شہرت، صداقت کی مترادف نہیں ہوتی۔ اسی طرح مجہول الاحوال راویوں سے منسوب روایتوں پر اور محض قیاس پر مبنی کسی دعوے کو بطورِ واقعہ قابلِ قبول نہیں قرار دیا جا سکتا۔''

دل چسپ بات یہ ہے کہ 'مثنویاتِ شوق' پر پابندی کا مسئلہ ہی متنازعہ نہیں بل کہ پابندی کے اسباب بھی متنازعہ رہے ہیں۔ مولانا حالؔی کے نزدیک پابندی کا سبب ان مثنویوں کا مخربِ اخلاق اور فحش ہونا تھا۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے 'شعر الہند' میں اور پنڈت دتہ تریا کیفی نے 'خم خانۂ جاوید' میں مولانا حالی کے مفروضے کو ہی اپنے الفاظ میں بیان کر کے تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ سر رضا علی نے 'اعمال نامہ' میں یہ اشارہ کیا ہے کہ چوں کہ 'زہرِ عشق' کے سامنے 'سحر البیان' کا چراغ گل ہوتا نظر آ رہا تھا اس لیے اہلِ لکھنؤ مرزا شوق کے دشمن ہو گئے اور انگریز حکومت کے کان بھر کر اس پر پابندی لگوا دی۔ امیر احمد علوی وضاحت اور صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شوق کی مثنویوں کو ایسی مقبولیت عام نصیب ہوئی کہ اگلے سخن وروں کے چراغ ٹمٹمانے لگے اور میر حسن کی 'سحر البیان' فراموش ہو گئی۔ حاسدوں نے ان نظموں کی 'لغزشِ مستانہ' کو پستیِ اخلاق سے تعبیر کیا۔ سفارشیں اٹھوا کر برسوں ممنوع الاشاعت رکھا۔''

خاں صاحب نے اگرچہ اپنے محتاط مزاج کی مناسبت سے اس مسئلے پر کوئی قطعی فیصلہ صادر نہیں کیا لیکن ان کا یہ قیاس بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کہ مقننہ اور عدلیہ سے برسوں تک وابستہ رہنے کے

باوجود سر رضا علی نے دوسرے کئی معاملات کی طرح اس معاملے میں بھی کوئی تحقیق نہیں کی اور علوی کے خیال کو ہی دُہرایا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے منعِ اشاعت کی ایک بالکل نئی وجہ بتائی ہے، جس کا تعلق صرف 'زہرِ عشق' سے ہے۔ مولانا کے مطابق جب لکھنؤ میں 'زہرِ عشق' کو ڈرامے کی شکل میں پیش کیا گیا تو ''تماشا گاہ ایک بزم عزا بن گئی۔ ہچکیوں اور سسکیوں کی آوازیں تو ہر طرف سے آ رہی تھیں، بعضوں کو غش آ گئے اور ایک آدھ نے شاید خودکشی کی بھی ٹھان لی۔ اس پر تماشے دکھانا قانوناً ممنوع قرار دیا گیا اور کتاب کی اشاعت بھی عرصے تک بند رہی۔''

رشید حسن خاں نے اس مسئلے کو ہر زاویے سے دیکھا، پرکھا اور اس سے بحث کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ منعِ اشاعت کے پورے معاملے پر ابہام کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ مولانا حالؔی اور ان کے بعد آنے والے سبھی ناقدین و محققین نے منعِ اشاعت کی بات تو کہی ہے لیکن نہ تو اپنے ماخذ کا حوالہ دیا ہے اور نہ ہی ان کی تحریروں سے یہ پتا چلتا ہے کہ پابندی تینوں مثنویوں پر لگی تھی یا کسی ایک پر۔ مزید یہ کہ پابندی محض کسی ایک شہر یا صوبے تک محدود تھی یا اطلاق پورے ملک پر ہوتا تھا۔

میں نے خاں صاحب کی پوری اور عالمانہ بحث کا مطالعہ کرنے کے بعد جو نتیجہ نکالا ہے وہ یہ ہے کہ 'زہرِ عشق' پر پابندی ضرور عائد ہوئی تھی اور خواہ بقول ان کے اس مثنوی میں کوئی قابلِ اعتراض بات نہ ہو۔ خاں صاحب نے اس سلسلے میں نظامی بدایونی کے اس دیباچے سے ایک اقتباس نقل کیا ہے جو 1919 میں نظامی پریس بدایوں سے شائع ہونے والے 'زہرِ عشق' کے پاکٹ ورزن میں شامل تھا۔ اقتباس یہ ہے:

> ''یہ مثنوی مرزا شوق کی دوسری مثنویوں کی طرح نایاب ہو گئی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ اس کے ممنوع الاشاعت ہونے کی شہرت نے سالہا سال تک صوبہ جات متحدہ آگرہ و اودھ میں کسی صاحب مطبع کو اس کے چھاپنے کی طرف متوجہ نہ ہونے دیا۔ اس کی ممانعت طبع کے مسئلے کو حل کرنے کے بعد ہم نے خاص اہتمام کے ساتھ.... اس کی اشاعت کی جرأت کی ہے۔''

نظامی نے ممانعت اشاعت کو فسخ کرنے والے اس سرکاری آرڈر کا حوالہ بھی دیا ہے جسے 22 جولائی 1919 کو جوڈیشیل (کریمنل) ڈیپارٹمنٹ نے جاری کیا تھا۔ خاں صاحب نے نظامی کے بیان پر کافی سنجیدگی سے غور کرنے کے ساتھ ساتھ خود بھی اس سلسلے میں بڑی چھان بین کی ہے۔ انھوں نے متعلقہ آرڈر کے حصول کے لیے یوپی آرکائیوز سے بھی رابطہ قائم کیا لیکن وہاں سے جواب ملا کہ ان کے پاس ایسی کوئی فائل نہیں ہے۔ ساری بحث کے بعد اس سلسلے میں خاں صاحب جس نتیجے پر پہنچے ہیں اس کا لب لباب یہ ہے:

> ''میں نہیں کہہ سکتا کہ صحیح صورتِ حال کیا ہے۔ کیا اس آرڈر کے نمبر غلط ہیں، نا تمام ہیں، یا ایسا کوئی آرڈر تھا ہی نہیں یا یہ کہ تلاش میں کوتاہی برتی گئی یا ایسی ہی کوئی اور وجہ ہے۔ میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اصل سوال جو بار بار میرے ذہن میں پیدا ہوتا ہے یہ ہے کہ واقعتاً کبھی پابندی لگی تھی۔''

مجھے خاں صاحب کے اس ارشاد سے اتفاق ہے کہ 'زہرِ عشق' میں کوئی ایسی بات نہیں جو قانون کی نظر میں پابندی کی بنیاد بن سکے۔ لیکن یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ قانون اپنی ایک روایتی تعریف کی رو سے اندھا ہوتا ہے۔ پھر اس زمانے میں تو انگریز افسروں کا زبانی حکم بھی قانون کی حیثیت رکھتا تھا۔ عین ممکن ہے کہ کسی بھی جوڈیشیل مجسٹریٹ نے کچھ لوگوں کے کہنے پر پابندی لگا دی ہو۔ یہ لوگ مرزا شوق کے حاسد بھی ہو سکتے تھے اور وہ بھی جو مولانا دریابادی کی نقل کردہ روایت کے مطابق اس مجمع میں شامل تھے جس نے 'زہرِ عشق' پر مبنی ڈرامے کی نمائش کے دوران ہال کو عزا خانہ بنا دیکھا تھا اور ایک نوخیز کلی خودکشی پر آمادہ ہو گئی تھی۔

منعِ اشاعت کے سلسلے میں نظامی بدایونی کا بیان اوپر نقل کیا جا چکا ہے۔ انھوں نے اپنے پیش لفظ میں متعلقہ آرڈر کی منسوخی کی بابت اپنی ذاتی جدوجہد کا بھی ذکر کیا ہے اور پھر پابندی کو ختم کرنے والے آرڈر کا تاریخ اور نمبر کے ساتھ حوالہ بھی دیا ہے۔ 'زہرِ عشق' کی تاریخ تصنیف کے سلسلے میں ذاکر بدایونی کے قطعے والی تفصیلی بحث کے دوران خود خاں صاحب یہ تسلیم کر چکے ہیں کہ نظامی ایک ذمے دار، معتبر اور صاحبِ کردار شخص تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسے شخص سے کسی غلط آرڈر کا حوالہ دینے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ پھر یہ بھی ہے کہ اگر پابندی اشاعت کا آرڈر جاری ہی نہ ہوا ہوتا تو منسوخی کا آرڈر کیسے جاری کیا جا سکتا تھا۔ مزید یہ کہ 1919 میں لکھنؤ میں ایک سے ایک بڑا عالم اور ادیب موجود تھا۔ اگر مثنوی پر پابندی اور پھر منسوخی کے احکام جعلی ہوتے یا نظامی نے غلط بیانی سے کام لیا ہوتا تو یہ لوگ خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔

جہاں تک یوپی آرکائیوز سے رابطہ قائم کرنے اور چھان بین کرنے کا سوال ہے، رشید حسن خاں کی کوششیں یقیناً لائقِ تعریف و ستائش ہیں۔ انھوں نے معاملے کی تہہ تک پہنچنے اور حقیقتِ حال دریافت کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا۔ اب یہ الگ بات ہے کہ آرکائیوز میں متعلقہ فائل کا نہ مل سکنا قطعاً کوئی حیرت انگیز واقعہ نہیں ہے، وہاں اگر فائل مل جاتی تو یقیناً یہ ایک حیرت انگیز واقعہ بل کہ حادثہ ہوتا۔ سرکاری دفتر کا عالم تو یہ ہے کہ کل کا کاغذ آج نہیں ملتا۔ اتنی پُرانی فائل کون ڈھونڈتا اور کیسے ملتی۔ یہاں ایک تکنیکی پہلو کی طرف اشارہ کر دینا بھی مناسب ہوگا۔ اگرچہ یوپی آرکائیوز کے بارے میں کوئی حتمی دعوا نہیں کر سکتا لیکن عام طور سے آرکائیوز میں صرف مستقل اہمیت والی فائلیں ہمیشہ کے لیے یا بہت طویل عرصے تک کے لیے محفوظ رکھی جاتی ہیں۔ دوسری فائلوں کی عمریں مقرر کر دی جاتی ہیں۔ کچھ کو بیس سال بعد، کچھ کو تیس سال بعد اور کچھ کو چالیس سال بعد تلف کر دیا جاتا ہے۔ بہت سی فائلوں کا قلع قمع تو سرکاری بابو ہی کر دیتے ہیں اور متعلقہ دفاتر سے آرکائیوز تک سفر کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ ایسی صورت میں یوپی آرکائیوز کا وہ جواب جو خاں صاحب کے پاس محفوظ ہے اس سے دل برداشتہ ہونے کی ضرورت محسوس نہیں ہونی چاہیے۔

قانون کی نظروں میں مبنی بر قرائن شہادتوں (Circumstantial Evidences) کی بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ ہمارے سامنے 'مثنویاتِ شوق' کے توسط سے جو شہادتیں آئی ہیں یعنی مولانا حالؔی سے لے کر نظامی بدایونی تک نے جو کچھ لکھا ہے اس سے یہی پتا چلتا ہے کہ کم از کم 'زہرِ عشق' پر غلط یا صحیح لیکن پابندی ضرور عائد ہوئی تھی۔

رشید حسن خاں نے آخر میں 'مثنویاتِ شوق' کی مختلف اشاعتوں، زبان و بیان کی نزاکتوں اور اشعار میں کمی بیشی جیسے ذیلی موضوعات سے بحث کی ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ سچ پوچھیے تو انھوں نے تحقیقی تدوین کا حق ادا کر دیا ہے۔ علاوہ ازیں 'گلزارِ نسیم' کی طرح 'مثنویاتِ شوق' کے ساتھ بھی انھوں نے جو تشریحی ضمیمے شامل کیے ہیں ان سے کتاب کی قدر و قیمت میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے، چاروں ضمیمے نہ صرف اساتذہ اور طلبا بل کہ عام قارئین کے لیے بھی معلومات کے بیش بہا خزانوں کا حکم رکھتے ہیں۔ ایسے بے شمار الفاظ، تراکیب، اسما، اصطلاحات اور تلمیحات ہیں جن سے ہم جیسے قاری

روز دو چار ہوتے رہتے ہیں لیکن جن کے حقیقی تلازمات ہماری دسترس سے دور ہی رہتے ہیں۔

مثال کے طور پر ہر اُردو داں جانتا ہے کہ ذوالفقار حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی مخصوص تلوار کا نام تھا لیکن بیش تر لوگ اس کی تاریخی اور عقائدی اہمیت سے واقف نہیں ہیں۔ اس حد تک کہ عموماً لغت نگاروں نے بھی اس کی تشریح پر کوئی توجہ نہیں دی۔ خاں صاحب نے حسبِ عادت اس سلسلے میں بھی کافی تحقیق و جستجو سے کام لیا ہے۔ انھوں نے دائرۂ معارف اسلامیہ (لاہور) کے حوالے سے بتایا ہے کہ ذوالفقار اس ''مشہور تلوار کا نام ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو غزوۂ بدر میں بطور مالِ غنیمت ملی تھی۔'' اس تلوار کا پہلا مالک العاص بن منبہ نامی ایک مشرک تھا جو جنگ میں مارا گیا۔ بعد ازیں سرورِ کائنات نے مولائے کائنات کو وہ تلوار بطور تحفہ عنایت فرمائی۔

لیکن شیعی عقائد کے مطابق ذوالفقار کی اہمیت اور اس کا مرتبہ کچھ اور ہی ہے۔ خاں صاحب نے ڈاکٹر نیّر مسعود کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ تلوار شیرِ خدا کے لیے آسمان سے جبرئیلؑ کے ہم راہ اُتاری گئی تھی۔ اسی طرح عام خیال یہ ہے کہ ذوالفقار دو زبانوں والی تلوار تھی۔ اسی لیے شعرا خصوصاً مرثیہ نگاروں نے اس کے لیے 'شمشیر دو زباں'، 'دوسر' یا 'دو پیکر' جیسی تراکیب استعمال کی ہیں لیکن خاں صاحب کی تحقیق کے مطابق ذوالفقار دو زبانوں والی تلوار نہیں تھی۔

رشید حسن خاں نے ایسے ہی بہت سے دوسرے مسائل سے بڑی ہی دل چسپ اور تفصیلی بحث کی ہے۔ ان سب کا ذکر کرنا ممکن نہیں ہے۔ صرف ایک اور ایسی مثال پر اکتفا کروں گا جو میری طرح بہتیرے قارئین کے لیے بھی انکشاف کا درجہ رکھتی ہے۔ 'زہرِ عشق' کا یہ شعر:

کون	حیدر	کا	مرتبہ	سمجھا
کوئی	بندہ	کوئی	خدا	سمجھا

بظاہر منقبت کا ایک عام سا شعر ہے۔ خاں صاحب نے اس کی تشریح کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ''کوئی خدا سمجھا'' والے ٹکڑے کے پیچھے ایک پوری تاریخ ہے۔ اس ٹکڑے کا اشارہ فرقۂ نعیری کی طرف ہے جو دائرۂ معارف اسلامی کی فراہم کردہ اطلاع کے مطابق شیعوں کا ایک غالی فرقہ ہے اور جس کے پیرو ''حضرت علیؓ کی ربوبیت کے قائل ہیں، جو بادلوں میں سکونت پذیر ہیں۔ ''فرقۂ نعیری کے پیرو بادل کو دیکھ کر حضرت علیؓ پر سلام بھیجتے ہیں...... نعیری شراب کو نور سمجھ کر حلال جانتے ہیں، اس لیے انگور کی بیل کی بڑی تعظیم و تکریم کرتے ہیں.... فرانسیسی انتداب (1920 تا 1945) نے نعیریوں کا نام بدل کر 'علویون' رکھ دیا، ان کو علاحدہ قومیت قرار دیا اور ان کو بہت سی مراعات سے نوازا اور فوج میں ان کو زیادہ تعداد میں بھرتی کیا.... آج کل شام میں جو سوشلسٹ بعث پارٹی برسرِ اقتدار ہے اس کے بیش تر ارکان علوی ہیں......''

اس موقعے پر میرے ذہن میں ایک اور چھوٹا سا سوال اُبھر رہا ہے جس پر رشید حسن خاں ہی روشنی ڈال سکتے ہیں۔ وہ سوال یہ ہے کہ ہم عصر اُردو ادب کے مشہور و معروف علوی حضرات کیا فرقۂ علوی سے ہی تعلق رکھتے ہیں یا پھر وہ کسی اور طرح کے علوی سیّد ہیں۔

آخر میں صرف اتنا اور عرض کرنا ہے کہ رشید حسن خاں کا مرتّب کردہ نسخۂ 'مثنویاتِ شوق' ہر لحاظ سے مکمل نسخہ ہے۔ اس کے سامنے دوسرے تمام نسخے ہیچ نظر آتے ہیں۔

(سہ ماہی ترسیل بمبئی، گوشۂ رشید حسن خاں، مشترکہ شمارہ 21۔22 جنوری تا جون 1999، مدیر یونس اگاسکر، صفحہ 36 تا 53)

ooo

گیان چند

رشید حسن خاں کی کتاب تدوین، تحقیق، روایت

میں اپنے حالیہ دورۂ ہندستان میں نومبر 1999 میں بمبئی گیا تھا۔ کالی داس گپتا رضا سے ملاقات ہوئی۔ بر سبیل تذکرہ انھوں نے کہا کہ اس زمانے میں رشید حسن خاں اُردو کے سب سے بڑے محقق ہیں۔ میں نے ان سے اتفاق کیا۔ رشید حسن خاں نے معرکے کے کئی کام کیے ہیں۔ زبان اور قواعد، اُردو املا، اور چار تاریخ ساز تدوینیں۔ انھوں نے تحقیق یا تدوین کے اصول پر کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی لیکن ان کے مضامین کے مجموعے اس موضوع کے اہم اور بنیادی مسائل کا احاطہ کر لیتے ہیں۔ ایک مجموعہ ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ بہت پہلے آیا تھا اب 1999 میں دوسرا مجموعہ ''تدوین، تحقیق، روایت'' کے نام سے آیا ہے۔ کاش انھوں نے تحقیق یا اس کی شاخ تدوین کے بارے میں ایک باضابطہ جامع کتاب لکھ دی ہوتی کہ متفرق مضامین کتاب کا نعم البدل نہیں ہوتے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ کئی سال پہلے آں جہانی شیام لال کالڑا عابد پیشاوری نے ان کے سامنے میری کتاب ''تحقیق کا فن'' پر ایک مضمون لکھنے کا ارادہ کیا تھا'' بقول عابد رشید حسن خاں نے انھیں رائے دی کہ اس کتاب پر نہ لکھیں۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ اس کتاب سے مطمئن نہ تھے۔ کاش وہ اس موضوع پر ایک مربوط کتاب لکھ دیں تو مجھ جیسے خام کاران تحقیق کی رہنمائی ہو۔

جس طرح خاں صاحب کی تدوینوں کے ضمیموں میں غور و فکر کا لامتناہی سامان ہوتا ہے اسی طرح تحقیق کے موضوع پر ان کے مجموعوں میں قدم قدم پر ایسے مقام آتے ہیں جہاں رُک کر سوچنے اور رہِ مستقیم اختیار کرنے کا درس ملتا ہے۔ فی الوقت مجموعہ 'تدوین، تحقیق، روایت' موضوعِ سخن ہے۔ 250 صفحات پر پھیلے 11 عالمانہ مضامین کا تعارف و تجزیہ جس شرح و بسیط کا طالب ہے، میرے پاس اس کے لیے نہ کافی وقت ہے نہ سکت۔ رسالے کا دامن بھی کم گھیر ہے اور قارئین کا دامنِ صبر بھی لامحدود نہیں۔ میں چند مشاہدات پر اکتفا کروں گا۔

مجموعے میں 11 مضامین ہیں: تین اصولِ تحقیق و تدوین پر، بقیہ آٹھ کم و بیش عملِ تحقیق و تدوین پر۔ نظریاتی مضامین یہ ہیں: (شہرت، روایت اور تحقیق۔ تدوین میں منشائے مصنف کا تعین، تدوین اور اعراب نگاری)

صرف آخری مضمون ''ایک نیا انتخاب'' کے آخر میں اس کا سنہ تحریر 1966 درج ہے، بقیہ 10 مضامین کے زمانے کا کوئی اشارہ نہیں۔ کاش ان کے بھی سنہ تصنیف یا سنہ اشاعت دے دیے ہوتے تو قاری کی رہنمائی ہوتی۔ اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ یہ ظاہر کر دیا جائے کہ یہ اولاً کس رسالے یا مجموعے میں رونما ہوئے تھے۔ مضامین کی عالمانہ سطح کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اگر ہم یہ انتخاب کرنا چاہیں کہ ان میں بیت الغزل کون سا ہے تو ہم دُبدھا میں پڑ جائیں گے کہ صدرِ مجلس میں کسے بیٹھایا جائے۔ نظریاتی مضامین اپنی اوّلیت کا مطالبہ کرتے ہیں تو عملی تحقیق کے بعض مضامین اپنے دعوے لے کر سامنے آ جاتے ہیں۔ میں 'تدوین میں منشائے مصنف کا تعین'' کو یہ تاج عطا کرنا چاہتا ہوں گو بعض دوسرے مضامین مثلاً کلامِ اقبال کی تدوین کے پچاس سال مجھ سے بخشنے کے درپے ہیں۔

پہلے مضمون کا عنوان ''شہرت، روایت اور تحقیق'' ہے۔ فاضل مضمون نگار دعوا کرتے ہیں کہ کسی روایت کی شہرت اس کی صحت کی ضامن نہیں ہو سکتی۔ وہ اس کی دلیل کے طور پر جو مثالیں پیش کرتے ہیں ان سے ان کی تحقیق اور اس کے لائحہ عمل کے جوہر کھلتے ہیں۔ میر امن نے باغ و بہار کی ابتدا میں لکھا ہے کہ جو کوئی اس قصے کو سنے گا وہ ہمیشہ تندرست رہے گا۔ مجھ جیسے بے عقیدہ تو اس روایت کو بے بنیاد خانہ ساز کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں کیوں کہ میں نے بار ہا قصہ پڑھا ہے اور بار ہا بیمار ہوا ہوں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں نے قصہ پڑھا ہے، سُنا نہیں۔ خاں صاحب نے پوری تحقیق کی کہ اس کا پہلا راوی کون ہے؟ معلوم ہوا کہ یہ نہ نوطرزِ مرصع میں ہے، نہ فارسی مخطوطوں میں ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ میر امن اس کے واحد راوی ہیں۔ اسی طرح خواجہ معین الدین چشتیؒ کے فارسی دیوان کا بھی شہرہ ہے اور اس سے بھی زیادہ ان سے منسوب اس رباعی کا مصرع شاہ است حسینؓ و بادشاہ است حسینؓ، خاں صاحب نے محمود شیرانی کی تحقیق سے آگاہ کرایا کہ یہ دیوان ایک معروف واعظ مولانا معین الدین صاحب معارج النبوۃ کا مطبوعہ کلام ہے۔ خواجہ چشتی شاعر ہی نہ تھے (ص15)

غلط روایت کی ایک شکل یہ ہے کہ اصل ماخذ کی جگہ ثانوی ماخذ کو عطا کر دی جاتی ہے مثلاً مجھ ناواقف سمیت کئی اہلِ قلم نے لکھا ہے کہ مثنوی زہرِ عشق کی تاریخ تصنیف ''غم دلربا' (1277) کی دریافت سب سے پہلے سر راس مسعود نے انتخاب زریں میں پیش کی۔ خاں صاحب نے اس روایت کے ہر پہلو کی مختلف منزلوں کی کماحقہ تفتیش کی اور بتایا کہ اسے سب سے پہلے نظامی بدایونی نے اپنی مرتبہ مثنوی زہرِ عشق کے دیباچے میں لکھا تھا۔ راس مسعود نے بغیر حوالے دیے اپنے انتخاب میں درج کر دیا جس سے کتنوں کو غلط فہمی ہوئی کہ یہ انھی کی تحقیق ہے۔ شہرت اور حقیقت کے تضاد کی دو مثالیں میں اپنے زمانے سے پیش کرتا ہوں۔ کتنا مشہور ہے کہ مہاتما گاندھی نے 1935 میں ساہتیہ پریشد ناگپور کے جلسے میں مولوی عبدالحق سے کہا کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے، قرآن کے حرفوں میں لکھی جاتی ہے، مسلمان چاہیں تو اسے برقرار رکھیں۔ ڈاکٹر جعفر حسن (حیدرآباد) اور حیات اللہ انصاری اور ان کی بیگم نے خود مہاتما گاندھی سے دریافت کیا تو مہاتما جی نے کہا کہ انھوں نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔ حیات اللہ انصاری نے اس حکایت کے مصنف ڈاکٹر اختر رائے پوری کا نام بھی دریافت کر لیا۔ کراچی میں ان سے اس کی حقیقت پوچھی تو ڈاکٹر اختر خاموش رہے، ٹال گئے۔ دوسری روایت اس سے بھی زیادہ حیران کُن ہے۔ مشہور ہے کہ ہندستان کی مجلسِ دستور ساز میں قومی زبان کے سوال پر اُردو اور ہندی کو برابر ووٹ ملے جس پر مجلس کے صدر ڈاکٹر راجیندر پرشاد کے سٹنگ ووٹ سے ہندی کو سرکاری زبان بنایا گیا۔ یہ بے پر کی افواہ کہاں کہاں تک پرواز کر گئی ہے۔ ایک جرمن اسکالر بحرن ڈیمر نے دریافت کیا کہ یہ بے بنیاد ہے۔ میں نے دستور ساز اسمبلی کی رپورٹ میں دیکھا تو اس افواہ کا کہیں ذکر نہیں۔ ہندی کو بغیر ووٹ لیے ممبروں کی اثباتی پکار کی بنا پر سرکاری زبان بنا لیا گیا۔

میں رشید حسن خاں کی دریافتوں کے بیچ اپنی ذات کم صفات کو لے کر کود پڑا۔ آمد برسرِ مطلب۔ اپنے مضمون کے آخر میں خاں صاحب کہتے ہیں:

''میرے بعض احباب کی مجھ سے شکایت رہی ہے کہ قبولِ روایت کے سلسلے میں بے جا سخت گیری سے کام لیتا ہوں۔ میری مشکل یہ ہے کہ جو روایتیں سامنے آتی ہیں، ان میں بہت سی روایتیں محض غیر معتبر ہوتی ہیں۔'' (ص23)

قاضی عبدالودود اور رشید حسن خاں روایتوں کے لیے جس حزم و احتیاط پر اصرار کرتے ہیں اصولاً وہ کندن کی طرح کھرا ہے لیکن ہماری مشکل یہ ہے کہ قدیم سیاسی تاریخ کی طرح قدیم ادبی تاریخ کو اگر حدیثوں کے پرکھنے کے پیمانوں سے ناپیں تو ادب کے متعدد بہ قدیم سرمائے سے ہاتھ دھو لینا پڑے گا۔ مثلاً ہومر کے رزمیوں، قدیم یونانی ڈراموں، کالی داس وغیرہ کے شاہکار سنسکرت ناٹکوں، اُردو کی قدیم ترین مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کو ان اصولوں سے آنکیں تو ٹھوس ثبوت کے فقدان میں سب کو غیر مصدقہ قرار دیا جائے گا۔ ہم کیا کریں؟

چلیے دوسرے دل چسپ مضمون ''کلام حافظ سے فال نکالنے کی روایت اور اس کی حقیقت'' پر ایک نظر ڈالتے چلیں۔ ایسا انوکھا موضوع خاں صاحب ہی سوچ سکتے تھے اور اس پر ایسی گہری عارفانہ تحقیق وہی کر سکتے تھے۔ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں دیوانِ حافظ کا ایک بیش بہا مخطوطہ ہے، جس سے جہاں گیر نے بہت سی فالیں نکال کر یادداشتیں درج کی ہیں۔ خاں صاحب نے ان میں سے کچھ پر بحث کی ہے کہ حافظ کے اشعار میں استعارے کی وسعت کے بل پر ہر سائل اپنے سوال کا جواب نکال لیتا ہے۔ حافظ کی غزل میں حقیقت اور مجازی دونوں کا پیرایہ بیان ملتا ہے۔ جس کی وجہ سے لوگ عاشقانہ اور رندانہ فالیں بھی نکال سکتے ہیں۔ خاں صاحب نے اپنے مضمون میں فال نکالنے کے متعدد طریقے درج کیے اور پھر دیوان حافظ میں الحاق کا مسئلہ اٹھایا کہ لوگ بعض الحاقی اشعار مثلاً چہ دلاور است دزدے کہ بہ کف چراغ دارد، کو اپنا مفید مطلب بنا لیتے ہیں تو حافظ کی عظمت کیا ہوئی۔ انھوں نے کئی معتبر اور غیر معتبر روایتیں درج کیں۔ آخر میں وہ اس تمنا کا اظہار کرتے ہیں کہ کوئی مستعد طالب علم دیوانِ حافظ سے منسوب فالوں کا گوشوارہ تیار کر کے ان کا تجزیہ کرے۔ تب صحیح صورتِ حال سامنے آئے گی۔ اس مضمون سے خاں صاحب کی فارسی ادبیات سے واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ آخر میں وہ ادبِ لطیف کے انداز کے ایک شگفتہ پیرے کا خاتمہ جمیل مظہری کے اس مصرع پر کرتے ہیں: ع

اگر نہ ہو یہ فریب پیہم، تو دم نکل جائے آدمی کا

نومبر 1999 میں بمبئی میں کالی داس گپتا نے جب رشید حسن خاں کو اُردو کا سب سے بڑا محقق ٹھہرایا تو یہ بھی اضافہ کیا کہ تحقیق کو بعض اعتبار سے خاں صاحب نے قاضی صاحب سے بھی زیادہ متاثر کیا ہے۔ مجھے اس پر جزوی اتفاق ہے کہ مجموعی طور پر تو قاضی صاحب ہی کی کارگزاری زیادہ ہے لیکن بعض پہلوؤں میں خاں صاحب کی دین قاضی صاحب سے آگے ہے۔ اس راہ نمونی کا بہترین نمونہ اس مجموعے کا شاہ کار نظریاتی مضمون ''تحقیق میں منشائے مصنف کا تعین'' ہے۔ اس مضمون کی فلک بوسی کا اندازہ میرے مختصر تعارف سے نہیں ہو سکتا۔ یہ لوح تمت تک لفظ بہ لفظ مطالعے کا طالب ہے۔ وہ تمہید میں کہتے ہیں کہ یہ تحریر تین حصوں پر مشتمل ہے:

1۔ تحقیق کے نقطۂ نظر سے متن مصنف کی ملکیت ہوتا ہے کہ قاری کی؟

2۔ تدوین میں منشائے مصنف کی بازیافت کے لیے الفاظ کا تعین اور ترتیب

3۔ متن کی تفہیم کے لیے خارج متن اضافوں کی تفصیل

پہلے حصے کے ذیل میں وہ کہتے ہیں کہ کسی قاری کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ شارح کے درجے سے آگے بڑھ کر تخلیق کار کا درجہ حاصل کر لے۔ خاں صاحب کے فکر و نظر کا کمال، اصول قائم کرنے میں ہے۔ یہاں تحقیق و تنقید شیر و شکر ہو جاتی ہیں۔ وہ مثال کے اشعار کے متن، زمانۂ تصنیف، زمانۂ شرح وغیرہ سب کا محققانہ بیان کرتے ہیں مثلاً دیوان غالب نظامی اڈیشن کے مقدمہ نگار آغا ڈاکٹر سید محمود کی غلط فہمیاں، دیوانِ جان صاحب نظامی اڈیشن کے مقدمہ نگار آغا حیدر حسن دہلوی کا ریختی کے اشعار میں شاعر کی سیاسی بصیرت تلاش کرنا جس پر مولوی عبدالحق نے کہا تھا کہ یہ ذوقِ سلیم کا خون کرنا ہی نہیں، بل کہ پڑھنے والوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنی ہے۔ وہ کسی اہم شاعر مثلاً غالب کے بارے میں کہتے ہیں:

''بار ہا اس کا تجربہ ہوا کہ کسی معروف یا کم معروف شعر کا کوئی لفظ ذہن سے نکل گیا۔ کسی ہم وزن اور ہم معنی لفظ کو اس کی جگہ رکھ کر شعر تو اس وقت پڑھ دیا، لیکن یہ خلش برابر رہی کہ بات بنی نہیں۔ اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ یہ نیا لفظ ان پرانی نسبتوں کو محفوظ نہیں رکھ سکا۔'' (ص 54)

ایسی مثالیں دے کر طے کرتے ہیں کہ متن، اس کے الفاظ اور ان کا مفہوم مصنف کی ملکیت ہوتے ہیں، قاری کی نہیں، خاتمہ سخن کے طور پر کہتے ہیں کہ نظریہ ادب کا ہو یا معاشیات یا دوسرے علوم کا، اس میں سائنس کی سی قطعیت نہیں ہوتی۔ اس سلسلے میں وہ مارکس کی مثال دیتے ہیں:

''یہ فرض کر لیا گیا کہ انسانی ذہن اب اس کے آگے کوئی دوسری بات سوچ ہی نہیں سکتا، کیا حشر ہوا اس کلیت کیشی کا۔ ایسا بکھراؤ ہوا کہ اب اس کے ٹکڑے چننا بھی مشکل ہے.... کیا ہم دریدا کو بھی مارکس کا درجہ دینا چاہتے ہیں اور جس طرح آیت مارکسزم کے شیدائیوں نے اسے مذہب بنا دیا تھا، اسی طرح دریدا کے فرمودات کو بھی آیت و حدیث بنانا چاہتے ہیں۔'' (ص 75)

دوسری فصل کے چار حصے کرتے ہیں:

(1) مرتب کو صحیح املا قطعیت کے ساتھ معلوم ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں وہ کتنا مہین کاتتے ہیں یہ ذیل کے بیان سے معلوم ہوگا۔ ''ایک لفظ ہے 'صمبا' اسے 'صبا' لکھا جائے گا تو کہا جائے گا کہ یہ غلط املا ہے، کیوں کہ صاد کا جوڑ، درست نہیں، صاد کے بعد ایک شوشہ بھی ہونا چاہیے تھا جو اس کا جز ہے۔'' پہلی نظر میں مجھے ان کا مقررہ املا بہ ہنگم معلوم ہوا کہ صبا کیوں درست نہیں لیکن میں نے غور کیا کہ صادق لکھنے میں ہم 'صاد' کا ایک دندانہ بناتے ہیں تو صبا لکھنے میں ب کا مزید شوشہ کیوں نہ ہو۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ کون سا کاتب، کمپیوٹر والا یا ناشر ان موشگافیوں کی پابندی کرے گا۔

(2) بعض الفاظ زمانے کے ساتھ تبدیلیوں سے دوچار ہوتے ہیں مثلاً میر امن کے زمانے میں گنبد کو گنبذ لکھا جاتا تھا۔ مرتب کو یہ معلوم ہونا چاہیے۔

(3) جس عہد کا متن ہے اس میں مجموعی طور پر املا کا احوال کیا تھا۔

(4) بعض اہم مصنفین کے کچھ شخصی مختارات ہوتے ہیں مثلاً داغ پھنسنا کے بجائے 'پھسنا بغیر نون غُنّہ' کے صحیح قرار دیتے تھے۔ میر امن نے اپنے قلم سے کاسہ کو کانسہ، غالبؔ نے سونچنا، جلالؔ نے گھانس لکھا ہے۔ ان کی تحریروں میں انھیں کے املا کی پابندی کی جائے۔

اس کے بعد وہ قیاسی تصحیح، منشائے مصنف کی توشیق کرنے والی، املا کی تبدیلیوں اور علامات و تفقیق نگاری پر اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ تشدید کی علامت اور اضافت کا زیر پابندی سے لگائے جائیں۔ خاں صاحب کے اس اصول کی صحت و صلابت سے کون کافر انکار کرے گا۔ مسئلہ یہ ہے کہ مرتب تو اپنے مسودے میں ان التزامات کی پابندی کر لے گا، وہ اہل مطبع کو ان موشگافیوں کی پابندی کے لیے کیوں کر مجبور کرے گا۔ ہر مرتب خاں صاحب کی طرح بارسوخ نہیں ہوتا۔ اسے تو کوئی ناشر مل جائے تو غنیمت ہے۔

مضمون کے تیسرے جزو میں وہ متن کی تفہیم کے لیے کچھ ضروری اضافوں کو لیتے ہیں۔ ان کی مراد مقدمے اور ضمیموں سے ہے۔ مقدمے کے لیے لکھتے ہیں کہ مدون کا نقاد ہونا ضروری نہیں۔ مثال کے طور پر وہ کلیاتِ قلی قطب شاہ مرتبہ ڈاکٹر زور اور دوسرے اڈیشن کے مرتب کا نام لیے بغیر (ڈاکٹر سیدہ جعفر) کہتے ہیں:

''ان دونوں اڈیشنوں کو بہ آسانی اس سلسلے میں بہ طور مثال پیش کیا جا سکتا ہے کہ مقدمۂ مرتب کو کیا نہیں چاہیے۔'' (ص 71)

وہ تحقیق اور تنقید کے خلطِ مبحث کے لیے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالوں کو ذمے دار ٹھہراتے ہیں جہاں تحقیقی بیانات سے زیادہ سماجی پس منظر پر زور دیا جاتا ہے۔ مقدمۂ مرتب میں کچھ حواشی بھی ہوتے ہیں۔ ان کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

''ایسی کون سی عبارت کو حاشیے میں آنا چاہیے اور کس عبارت کو مقدمے کی اصل عبارت کے ساتھ ہی آنا چاہیے، اس کا فیصلہ مرتب کی صواب دید سے متعلق ہوگا۔ اس کے لیے کسی قاعدے قانون کا بنانا مشکل ہے اور اس کی کچھ ایسی ضرورت بھی نہیں۔'' (ص 72)

میں نے دیکھا ہے کہ اُردو کے بڑے بڑے محققوں کے یہاں متن اور حاشیے کے امتیاز کے بارے میں نزاع کا عالم ہے۔ وہ ایک بات متن میں لکھتے ہیں اور اسی کے برابر اہمیت کی یا اسی سے متعلق بات کو حاشیے میں ڈال دیتے ہیں۔ تبصراتی حواشی کو حتی الامکان متن ہی میں سمونے کی کوشش کرنی چاہیے۔ انگریزی میں اصولِ تحقیق پر لکھنے والوں نے ان کے لیے قاعدہ رہنما اصول بنائے ہیں۔ اس سلسلے میں

ملاحظہ ہو میری کتاب تحقیق کا فن (لکھنؤ 1990) ص 323 یا (اسلام آباد 1994) میں 304 یا 306۔

ضمیموں کے سلسلے میں وہ حواشی، ضمیمہ، تشریحات اور تخریج وغیرہ کو لیتے ہیں لیکن میں تفصیل میں نہ جاؤں گا۔ صرف یہ کہنے پر اکتفا کروں گا کہ اس مضمون کا عنوان ''تدوین میں منشائے مصنف کا تعین'' اس کے پورے ابعاد کا احاطہ نہیں کرتا۔ دراصل یہ طریق تدوین پر ایک اچھا خاصا مقالہ ہے جسے گاگر میں ساگر سمجھنا چاہیے۔

اگلا مضمون ''تدوین اور اعراب نگاری'' بہت کچھ پیش نظر مضمون کے دوسرے حصے سے مشابہ ہے۔ کہتے ہیں ''اصولاً اعراب نگاری تدوین کا جز نہیں، یہ اضافہ ہے۔ اس اضافے کا مقصد ہوتا ہے متن کی قرآت کو تلفظ کے لحاظ سے آسان بنانا'' (ص 77)۔ وہ کلاسکی متون اور نصابی متون کے لیے اسے ضروری قرار دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''جان گلکرسٹ پہلا شخص ہے جس نے اُردو املا کے موضوع پر سب سے پہلے ایک رسالہ لکھا تھا اور کالج کی مطبوعات کے لیے نظامِ املا مرتب کیا تھا، جس میں اعراب اور علامتوں پر بہت زور دیا گیا تھا۔'' (ص 78)

اس کے بعد خاں صاحب نے پورے مضمون میں جو مثالیں دی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے گویا دبستان کھل گیا۔ تکبر برطرف، میں اعتراف کرتا ہوں کہ مثالوں میں سموئی ہوئی بحثوں سے مجھے کتنی زیادہ روشنی ملی، معلومات میں کتنی تصحیح ہوئی۔ چھِنا اور چُھپنا (زیر بہ مقابل پیش) کے بارے میں تو کچھ معلوم تھا (میں اور میرے وطن ضلع بجنور میں چھپنا کسرے کے ساتھ بولتے ہیں) لیکن یہ نہ جانتا تھا کہ نغمے کے معنی میں سرود بہ ضمِ اوّل ہے یا الحمدُ للہ میں دوسرا لام شوشے کی صورت میں ہے۔ صاحب فراش اور صاحبِ فراش کی وضاحتوں سے تو چودہ طبق روشن ہو گئے۔ میں اس مرکب کے دوسرے جز کو فراش (ف مفتوح، رے مشدد بمعنی فرش بچھانے والا) پڑھا کرتا تھا اور حیران تھا کہ نقاہت سے بستر پر پڑ جانے والے کے لیے یہ کیسی ترکیب بنائی گئی۔ خاں صاحب نے اشعار کی جو مثالیں دی ہیں اور نثری صراحت کی ہے اس سے معلوم ہوا کہ یہ لفظ کسرۂ اوّل سے بغیر تشدید ہے۔ حیران ہو کر لغت میں فِراش کے معنی دیکھے۔ معلوم ہوا کہ اس لفظ کے معنی رات کو پہننے کے کپڑے یعنی جامۂ خواب ہیں۔ اب بات صاف ہو گئی۔

خاں صاحب نے دیوانِ نوازش نسخۂ خدا بخش پٹنہ کے لیے لکھا ہے کہ ان کے علم کے مطابق یہ دیوان کا واحد نسخہ ہے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ ڈاکٹر اکبر حیدری نے مجھے اپنے خط مورخہ 14 جولائی 1997 کو لکھا تھا کہ راجا صاحب محمود آباد کے کتب خانے میں دیوان نوازش کا نسخہ بخطِ مصنف ہے اور وہ اس پر مضمون مکمل کر چکے ہیں۔

اپنے مضمون کے آخر میں خاں صاحب لکھتے ہیں کہ اعراب اور الفاظ مرتب کی بے طرح آزمایش کرتے ہیں:

''یہ اس آزمایش کا نتیجہ ہے کہ سہل پسند لوگ ایسے التزامات سے گھبراتے ہیں۔ ایسے حضرات کو تدوین کے بجائے کسی ایسے دھندے میں لگنا چاہیے جس میں عافیت آشوبی اور علم اور صلاحیت کی آزمایش کے امکانات نہ ہوں یا کم سے کم ہوں۔'' (ص 88)

اس مجموعے میں عملی یا اطلاق تدوین سے متعلق پہلا مضمون ''کلام اقبال کی تدوین'' ہے۔ اس مضمون کو پڑھنے سے پہلے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اقبال جو بیسویں صدی کے شاعر ہیں، جن کا کلام (باستثنائے ارمغانِ حجاز) ان کی زندگی میں، ان کی دیکھ ریکھ میں شائع ہوا تھا، ان کی کلیات مرتب کرنے میں بھی کچھ مسائل پیش آ سکتے تھے۔ رشید حسن خاں ہی ان رموز و غوامض کا شعور رکھتے تھے اور صرف وہی ایسا نکتہ سنجی کا مقالہ لکھ سکتے تھے۔ وہ جائزہ لے رہے ہیں کلیاتِ اقبال مرتبۂ جاوید اقبال (1972) کا اور اقبال اکادمی لاہور کی کلیات کے دو اڈیشنوں (1990 و 1994) کا، اکادمی اڈیشن کی دیدہ زیبی کی داد انھوں نے مقدمے میں بھی دی ہے اور اس مضمون میں بھی۔ یہاں مداحی و قداحی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''اس کے صفحات کے حواشی ایسی گل کاری اور رنگ آمیزی سے مزین ہیں کہ کچھ دیر کے لیے تو محسوس ہوتا ہے جیسے آنکھوں کی روشنی بڑھ گئی ہو لیکن جیسے ہی سیمائی سی نمود ختم ہوتی ہے تو خیال ہوتا ہے کہ تحقیق اور تدوین کی روایت شاید اُردو میں موجود ہی نہیں۔'' (ص 90-89)

وہ کتنی دور رس بات کہتے ہیں کہ اقبال کی زندگی میں چھپے سب مجموعوں کو یکجا کر کے چھاپ دیا جائے تو اسے تحقیقی کلیات نہیں کہیں گے۔ ''تحقیقی اڈیشن مرتب کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ایسے مجموعے کا مکمل خاکہ بنایا جائے جس میں تنقیدی مباحث نہ ہوں اور خراجِ عقیدت قسم کی فضولیات بھی نہ ہوں۔'' (ص 91)

آخری فقرہ داد سے بالاتر ہے، وجد آور ہے۔ ایسے مشاہدے کی جسارت خاں صاحب جیسا چوٹی کا مستند محقق ہی کر سکتا تھا۔

اس تبصراتی مضمون میں قابل قدر تحقیقی مشاہدات کی وہ بھرمار ہے کہ مجھے ان پر سرسری لکھنے کی بھی ہمت نہیں۔ میں اپنی ہار مانتا ہوں۔ جس قاری کو دلچسپی ہو، اسے پورا مضمون پڑھنا چاہیے، صرف یہاں وہاں سے ورق گردانی سے کام نہیں چلے گا۔ یہ مقالہ خاں صاحب کے انھیں تاریخ ساز تبصروں کا ہم پلہ ہے جن کے سبب خاں صاحب کا مرتبہ عرشِ معلیٰ تک پہنچ گیا یعنی مالک رام کے دیوانِ غالب، علی گڑھ تاریخ ادب اُردو اور ساہتیہ اکیڈمی کے لیے ڈاکٹر زور کے ''اُردو شاعری کا انتخاب'' پر تبصرے۔ خاں صاحب کی نظر جس کتاب کو لگ گئی، اسے بھسم کر کے ہی رکھ دیا۔ میں زیرِ نظر تبصرے سے متعلق صرف چار مشاہدات کی طرف توجہ دلاؤں گا۔

1۔ جاوید اقبال صاحب نے اپنی مرتبہ کلیات کے مقدمے میں لکھا ہے، کلام اقبال کے اب تک جتنے اڈیشن شائع ہوئے، وہ سب کے سب انھیں پلیٹوں سے طبع ہوتے رہے جنھیں حضرت علامہ مرحوم نے خود اپنی نگرانی میں تیار کروایا تھا۔'' (ص 110)

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے تحقیق کی کہ ''اقبال کی زندگی میں شائع شدہ ان کے کسی اُردو مجموعے کے کسی اڈیشن کی پلیٹس محفوظ نہ رہ سکیں، اس لیے ان وامعدوم ''متبرک پلیٹوں'' کی عزت و حرمت کی بات محض مبالغہ ہے۔'' (ص 111)

اس پر خاں صاحب کہتے ہیں کہ ''اس کا صاف طور پر یہ مطلب ہوا کہ جاوید اقبال نے غلط بیانی سے کام لیا۔''

2۔ ان کا مشاہدہ ہے:

''کلیات اقبال کے مرتبین نے ساری بحثوں اور جھگڑوں سے بچنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ نہ تو حواشی لکھے جائیں اور نہ مفصل مقدمہ لکھا جائے۔ خیر، جاوید اقبال تو تحقیق اور تدوین کے آدمی ہی نہیں، ان سے کیا کہا جائے۔ پھر یہ بھی ہے کہ ان کے کلیات کو دیکھ کر واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ محض تجارتی اغراض کے تحت اسے شائع کیا گیا ہے۔ غضب تو یہ

ہے کہ اقبال اکادمی کے کلیات کو تبھی ان سب ضروری اور لازمی اجزا سے محفوظ رکھا گیا ہے۔ بے شمار روپیہ خرچ ہوا۔۔۔اس میں دو صفحے کا مقدمۂ مرتب بھی شامل نہیں۔ جہاں مفصل تحقیقی انداز کے مقدمے کو ہونا چاہیے تھا، وہاں خراجِ عقیدت، کے عنوان سے اقبال کی شاعری سے متعلق سات صفحوں میں مختلف افراد کے اقوال نقل کر دیے گئے ہیں اور بس۔حواشی نام کا ایک صفحہ در کنار، ایک سطر بھی نہیں۔'' (ص 114- 113)

3۔ اقبال اکادمی نے اپنے اڈیشن کے لیے ایک مجلس مشاورت بھی بنائی تھی۔ اس میں سرِ فہرست نام رشید حسن خاں کا ہے۔ لطیفہ یہ ہے کہ انھیں اس کی اطلاع بھی نہیں دی گئی۔ لکھتے ہیں:

''مجلس مشاورت میں میرا نام بھی ہے، اس کا علم تو مجھے اس وقت ہوا جب اقبال اکادمی نے چھپا ہوا نسخہ کلیات ڈاک سے بھیجا۔ کسی جلسے میں شریک ہونے کا سوال ہی نہ تھا۔'' (فٹ نوٹ ص 123)

تدوین کے مبصر کی حیثیت سے ان کا وہ دبدبہ تھا کہ اکادمی نے انھیں اپنی کلیات سے وابستہ کرنے کو اپنی مقبولیت اور عافیت کا ضامن سمجھا۔

آخری مشاہدہ ان کے الفاظ میں ڈاکٹر گیان چند جین نے ''ابتدائی کلامِ اقبال بہ ترتیب ماہ و سال'' کے نام سے ایک کتاب مرتب کی ہے (سالِ طبع 1988) بہت محنت کی ہے، لیکن مقدمہ، کتاب میں یہ بھی لکھا ہے:

''میں اعتراف کرتا ہوں کہ اصل مآخذ کم دیکھ پایا ہوں۔۔۔ مجھے متعدد نظموں کی تاریخ اشاعت نہ مل سکی۔ ان کے رنگ کو دیکھ کر، تاثراتی طریقے پر ان کے زمانے کا اندازہ کیا ہے۔ علامہ کے مسودات تک رسائی ہوتی تو صحیح تر فیصلہ کر پاتا۔'' (ص 14)

یہ کتاب محنت اور لگن کے ساتھ لکھی گئی ہے، مگر اس کے مندرجات کی تصدیق ضروری ہے۔ اس کے بغیر ان کو بہ طور ماخذ استعمال کرنا قطعی طور پر غیر مناسب ہوگا اور اصولِ تحقیق کے خلاف۔ (ص 105)

میرا ارادہ اقبال کے پورے کلام کو تاریخی ترتیب سے مرتب کرنے کا تھا لیکن ترقی اُردو بیورو، دہلی سے تاریخِ ادب اُردو، جلد اول 1700 تک، لکھنے کی ذمے داری ملنے پر میں نے اقبال کے کام کو 1908 یعنی اقبال کی یورپ سے واپسی پر ختم کر دیا۔ اقبال ہمارے دور کے شاعر ہیں۔ ان کے متداول کلام کے لیے بانگِ درا پر تکیہ کیا۔ منسوخ اشعار کے لیے تین مآخذ سے کام لیا:

1۔ وہ اخبار اور رسالے جن میں یہ نظمیں اور غزلیں پہلی بار (یا اس کے آس پاس) چھپی تھیں۔ ظاہر ہے شاعر ہی نے انھیں بھیجا ہوگا۔

2۔ کلامِ اقبال کے دو قلمی مجموعے جن کا تقریباً تمام سرمایہ بانگِ درا سے پہلے کا ہے۔ یہ رسالوں اور اخباروں وغیرہ سے لیا گیا تھا۔

3۔ منسوخ کلامِ اقبال یعنی باقیاتِ اقبال کے معتبر مجموعے۔

میرا خیال ہے کہ متداول کلام ہی نہیں، منسوخ اشعار کے بارے میں میرا متن شاید ہی کہیں دھوکا دے۔ ہاں تاریخی ترتیب کے لیے بعض ان نظموں اور غزلوں کے بارے میں احتمال رہا ہو جو پوری کی پوری منسوخ ہوئیں۔ ان کے لیے علامہ کے مسودات کو دیکھ سکتا تو بات یقینی ہو جاتی، بہ شرط یہ کہ ان تخلیقات کے مسودے بہ قلم شاعر محفوظ ہوں۔

4۔ خاں صاحب کے فاضلانہ مقالے کے بعد ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے استدراک کے عنوان سے خاں صاحب کے مشاہدوں کی تائید میں رسالے سیارہ لاہور میں ایک مضمون چھپوایا۔ خاں صاحب نے اپنے مجموعے میں یہ مضمون بھی شامل کر لیا ہے اور اچھا کیا کہ اس سے مجھے یہ چونکانے والی اطلاع ملی کہ اقبال نے اسرارِ خودی کا ابتدائی نام مثنوی پیامِ سروش رکھا تھا۔ تدوین اور اقبال سے دل چسپی رکھنے والے تمام قارئین سے میری سفارش ہے کہ ان دونوں مضامین کو ضرور پڑھیں۔

تدوین کی عملی تحقیق کا اگلا مضمون ''تدوینِ کلامِ غالب کے مسائل (املا کے لحاظ سے)'' ہے۔ خاں صاحب ہمارے زندہ علما میں صفِ اول کے ماہرینِ غالبیات میں ہیں۔ املا کے وہ ماہر ہیں ہی، عرشی صاحب کے بعد املائے غالب کے دوسرے سب سے بڑے عارف۔ اس مضمون میں کہیں کہیں وہ عرشی صاحب کی تسامح کی بھی گرفت کرتے ہیں مثلاً غالب نے صریحاً لکھا ہے کہ طرز بدن اور اس کے مشتقات میں ط لکھنا جائز نہیں ہے، مولانا عرشی نے نسخۂ عرشی میں ایک جگہ ''ساماں تراز'' لکھا لیکن اس میں کئی دوسری جگہ اور اپنے مرتبہ انتخاب غالب میں طراز ہی لکھ گئے۔

دوسرا لفظ ٹھہرنا (ٹھہرنا ٹھیرنا) ہے۔ میں ٹھیرنا بولتا ہوں لیکن ٹھہرنا کو صحیح تر جانتا تھا۔ اب معلوم ہوا کہ لغات میں عموماً ٹھیرنا کو ٹھہرنا پر ترجیح ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ میرا من اور غالب ٹھہرنا استعمال کرتے تھے۔ میں نے یہ عجیب تلفظ کبھی نہیں سنا۔ غالب نے تلامذہ کے کلام ٹھہرنا اور ٹھیرنا کو اصلاح دے کر ٹھہرنا بنا دیا۔ عرشی صاحب غالب کے تلفظ میں ٹہرنا ماننے کے باوجود مکاتیبِ غالب اور دیوانِ غالب نسخۂ عرشی میں ٹھہرنا ہی لکھ جاتے ہیں۔ گویا طباعت کی منزل میں عرشی صاحب تک رشید حسن خاں کی سی چوکسی نہ برت سکے۔ اگلا جوڑا وھاں یھاں (واں، یاں) ہے۔ غالب یہاں، وہاں کی جگہ صرف یھاں، وھاں بروزن یاں، واں کو فصیح سمجھتے تھے چناں چہ تلامذہ کو انھیں کے استعمال کا درس دیتے رہے۔ ضمناً عرض کروں کہ ضلع بجنور میں، جو دہلی کی لسانی قلم رو میں ہے، آج بھی وھاں، یھاں بولا جاتا ہے۔ روزانہ کی بات چیت میں بھی یہی بولتا ہوں۔ اس طرح کی کئی معلومات اس مضمون میں سمائی ہوئی ہیں۔

خاں صاحب عرشی صاحب کے مرتبہ انتخاب غالب کے متن کو بہت سقیم قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے عرشی صاحب کے مرتبہ دیوانِ غالب اور انتخابِ غالب کا مقابلہ کر کے 16 مثالیں درج کی ہیں جہاں ایک ہی لفظ کے بارے میں دونوں کتابوں میں فرق ہے۔ وہ دیوان کو انتخاب پر ترجیح دیتے ہیں۔ ایسی مثالیں بڑی تعداد میں ملتی ہیں۔ جب خاں صاحب کے معیارِ املا پر عرشی صاحب بھی پورا نہیں اترتے تو دوسرے مرتبین کس قطار میں ہیں۔ مضمون کے دوسرے حصے میں خاں صاحب نے املائے غالب کی اور دوسری صورتوں اور مسائل پر 11 صفحوں میں بحث کی ہے۔ ہر جگہ زیرِ بحث لفظ کے بارے میں وہ جس طرح دوسرے ماہرین صحت الفاظ کی رائیں درج کرتے ہیں ان سے آنکھوں کے نہیں، ذہن کی روشنی بڑھتی ہے۔

''ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں''۔ خاں صاحب کا تنوع بیسویں صدی کے شاعر اقبال کے کلام کی تدوین میں مسائل ڈھونڈنے پر بس نہیں کرتا، وہ ایک الٹی جست لگا کر دکنی کو بھی کھنگالنے لگتے ہیں۔ مضمون کا عنوان ہے ''دکنی ادب کی تدوین (شمالی ہند کے ایک طالب علم کا نقطۂ نظر سے)''۔ لکھتے ہیں کہ یہ مضمون عمومی سطح پر نصابی ضروریات کا ایک حصہ ہے۔ آندھرا پردیش، کرناٹک اور مہاراشٹر کے طلبا کو دکنی زبان کا مطالعہ کرنا آسان ہو سکتا ہے لیکن شمالی ہند کے طلبا کی مشکلیں زیادہ ہیں۔ دکنی متن کی تدوین میں سبھی غیر مانوس یا کم مانوس الفاظ کا وضاحتی تجزیہ کرنا چاہیے۔ شمالی ہند میں ایسے اساتذہ نہ ہونے کے برابر ہیں جو دکنی سے اچھی طرح واقف ہوں۔ ''ہم اپنی مجبوریوں، کوتاہیوں اور نارسائیوں کا کھلے دل سے اعتراف کر لیں، اور اس کے بعد دکنی ادبیات کے نہایت مختصر نصابات تیار کرائیں، جو اس صورت حال

کو نظر میں رکھ کر مرتب کیے گئے ہوں اور جن میں ممکن حد تک وضاحت سے کام لیا گیا ہو۔'' (ص 158)

خاں صاحب نے ابنِ نشاطی کی پھول بن مرتبۂ شیخ چاند (ثانی) اور نظامی کی کدم راؤ پدم راؤ کو سامنے رکھ کر دکنی کی اصول اور قواعد کی طرف توجہ دلائی ہے۔ مثلاً ماضی مطلق میں آخری الف سے پہلے کی 'ی' بیش تر مخلوط ہوتی ہے، بعض اوقات ملفوظ ہوتی ہے، پھر دوسرے صیغوں میں اکثر 'ی' کا اندراج نہیں ملتا، کیوں؟ عربی فارسی الفاظ میں بہت سے ساکن حروف کو متحرک اور متحرک کو ساکن کر لیا جاتا ہے۔ صحیح قرآت کے لیے چار باتوں کا التزام ضروری ہے۔ 1، تشدید کی علامت۔ بعض اوقات وزن پورا کرنے کے لیے بعض حروف کو مشدد کرنا ہوتا ہے۔ 2، درمیانی نون غنہ کا مسئلہ۔ دکنی میں انبر اور چندر جیسے الفاظ کے نون کو غنہ کر کے باندھ لیا جاتا ہے۔ 3، معروف و مجہول آوازوں کے تعین کے لیے اعراب کا استعمال۔ 4، مخلوط آوازوں کے لیے علامتوں کا استعمال۔

دکنی نصاب کے لیے متن ان سب وضاحتوں کے ساتھ مرتب ہونا چاہیے۔ دکنی الفاظ کی مفصل فرہنگ تیار کرنی چاہیے۔ ایک یہ طریقہ بھی وبا کی طرح پھیل گیا ہے کہ فرہنگ میں مختلف الفاظ کے سامنے لکھ دیا جاتا ہے کہ ایک طرح کا زیور،'' ایک طرح کا کپڑا، ایک طرح کا پھول... میں یہ مانتا ہوں کہ کچھ لفظوں کی مکمل تشریح معلوم نہیں ہو پاتی... میرا یہ تجربہ ہے کہ مرتب اگر محنت کرے، وقت صرف کرے، مختلف دروازوں پر دستک دے، تو ایسے بہت لفظوں سے متعلق کچھ نہ کچھ تفصیلات ضرور معلوم ہو سکتی ہیں۔ ابھی سارے ذرائع مکمل طور پر ختم نہیں ہو پائے ہیں... میری درخواست ہے کہ دکنی مثنویوں کی فرہنگ تفصیل اور وضاحت کے ساتھ تیار کی جائے، جس میں سارے مشکل لفظوں کے معانی لکھنے کا امکان بھر التزام کیا جائے... مثلاً رسم و رواج، تلمیحات، میلے ٹھیلے، زیور، کپڑے، کھانے، برتن اور ایسی ہی دوسری چیزیں۔ ان سب سے متعلق ضروری اور مناسب تفصیلات لکھی جائیں۔'' (ص 70-169)

خاں صاحب کی دل سوزی اور نیک نیتی قابلِ داد ہے لیکن میں ان کی خوش فہمیوں کو دور کر دینا چاہتا ہوں کیوں کہ میں نے شمالی ہند، وسطی ہند اور جنوبی ہند سب کی درس گاہوں میں پڑھایا ہے اور وہاں کے طلبا اور اساتذہ سے واقف ہوں۔ دکنی زبان و ادب کی فہم میں دکن کے طلبا شمالی ہند کے طلبا سے برائے نام ہی آگے ہوں گے، صرف اُنیس بیس کا فرق ہے۔ حیدرآباد میں ایم۔ فل اور پی ایچ ڈی کے اسکالر بہت ساذ ہی دکنی موضوع پر کام کرنے کو تیار ہوتے ہیں۔ جہاں تک دکنی متون کو اعراب اور علامتوں کے ساتھ صحیح صحیح مرتب کرنے کا سوال ہے، مجھے دکنی ہند میں بھی کوئی ایسا استاد یا غیر تدریسی محقق دکھائی نہیں دیتا جو رشید حسن خاں کے طریقِ کار سے تحقیقی متن تیار کر سکے۔ دکن کے ماضی اور حال میں ڈاکٹر زور دکنی زبان و ادب میں جان ڈالنے اور فروغ دینے کا جو شدید جذبہ رکھتے تھے اس طرح کا کوئی عالم یا سالار آج دکھائی نہیں دیتا۔ خاں صاحب کی ان کے بارے میں یہ رائے ہے:

''ادبی تحقیق سے ان کو دور کی نسبت تھی اور تدوین سے ان کا ذہنی رابطہ اس سے بھی کم تھا۔'' (ص 186) ڈاکٹر سیدہ جعفر کی کلیات قلی قطب شاہ کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

> ''کتاب کو پڑھ کر واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مرتب (یا مرتبہ) کو تحقیق اور تدوین دونوں موضوعات سے دور کا تعلق ہے اور وہ تدوین کے طریق کار سے بہت کم واقفیت رکھتی ہیں۔'' (ص 186)

سیدہ جعفر نے کئی دکنی متون کی ترتیب کی ہے۔ زندہ اشخاص میں بزرگوں میں ڈاکٹر غلام عمر خاں، ڈاکٹر نسیم الدین فریس ہیں جنھیں دکنی تحقیق سے دل چسپی ہے۔ میں دوسروں سے واقف نہیں۔ رشید حسن خاں کے مطالبوں کے لگ بھگ ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر جمیل جالبی ہی اچھی تدوین کر سکتے تھے۔ نومبر 1999 کے آخر میں علی گڑھ میں مسعود حسین خاں سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ اب ان کی صحت کا یہ حال ہے کہ وہ کوئی دماغی کام نہیں کر سکتے۔ ڈاکٹر جالبی اپنی تاریخ ادب کی تکمیل میں گرفتار ہیں۔ کم از کم مجھ میں یہ اہلیت نہیں کہ میں کوئی دکنی متن مرتب کر سکوں۔ دکن کے اساتذہ میں ایسے کئی ہیں جو کئی ادب پر تحقیق کر سکتے ہیں، ایسا کوئی نہیں جو دکنی کی تحقیقی تدوین کر سکے۔ آں جہانی ڈاکٹر عابد پیشاوری ابھی تک کی سب رس کی تدوینوں سے انجان تھے اور اپنے آخری زمانے میں سب رس کو مرتب کرنا چاہتے تھے۔ پتا نہیں انھوں نے کام شروع کیا بھی تھا کہ نہیں۔

میرا مشاہدہ ہے کہ بعد کے مشاہیر شعرا کی مثنویوں اور غزلوں کو چھوڑ کر دکنی شاعروں کی تخلیقات میں جا بجا غیر موزوں مصرعے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ زبان کی طرح عروض کے معاملے میں بھی آزادی برت جاتے ہیں۔ رشید حسن خاں کا خیال ہے کہ ان کے اشعار ہمیشہ کتابی عروض کے پابند ہوتے تھے جس کے لیے لفظوں میں شکست و ریخت سے گریز نہ کرنا چاہیے۔ کدم راؤ سے ان کی دی ہوئی مثالیں:

محمد براراوتِ جگ تھا

کہ شبراچرن رائے جگ مگ تھا (ص 163)

چلے جگ اس تھیں ایسے دیہہ دھیر (ص 166)

پہلے شعر کے قوافی جگ اور مگ محو کے گاف کے مشدد پڑھنا ہوگا، دوسری مثال کے مصرع میں جگ کو مشدد اور 'ایسے' کو اسے (بروزن بسے) بولنا ہوگا۔ ہم کیسے فرض کر لیں کہ شاعر نے یہ خلافِ معمول تلفظ استعمال کیے ہوں گے۔ سیدھا سادہ یہ کون نہ مان لیں کہ اس نے عروض کے کساو کی پروا نہیں کی اور جگ مگ کے گاف کو اکہرا اور ایسے کے جز و اول کو طویل مصوتے کے ساتھ باندھا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ مرتب اعراب کے ذریعے ک اور واؤ کی معروف و مجہول (لین بھی کیوں نہیں؟) آوازوں کا تعین کرے (ص 166) ان کے اقتباس میں سے دو مصرعے:

ع کھڑک گاڑ دو کھا تہایا تہار

ع کسی آتشی دے کسی لوج دے

وہ دوکھا اور لوج کے واؤ کی صحیح آواز کا اعراب چاہتے ہیں لیکن مرتب کو کیوں کر معلوم ہو کہ ان مغلق اور اجنبی الفاظ کا کیا تلفظ ہے۔ یہی کیفیت فرہنگ کی ہے۔ متعدد دکنی الفاظ کے معنی معلوم نہیں۔ سیاق و سباق کو دیکھ کر اٹکل سے لال بجھکڑ کی طرح بوجھنا مثالی نہیں۔ میری رائے میں ہمارے معاصرین میں کوئی ایسا جان کار نہیں جو دکنی کے تمام اجنبی الفاظ یا معاشرتی اصطلاحوں پر عبور رکھتا ہو۔ میں جب 1965 میں جموں گیا تو اس وقت تک جموں کشمیر کی یونی ورسٹی ایک ہی تھی جس کے سری نگر اور جموں میں دو کیمپس تھے۔ سروری صاحب نے نصاب کے ایک پرچے میں دکنی کی اتنی کتابیں بھر دی تھیں کہ حیدرآباد میں بھی نہ ہوں گی۔ پہلے سال ایم اے پریولس میں صرف ایک طالب علم تھا۔ ایک دن میں اپنے کمرے میں کلاس لے رہا تھا۔ سروری صاحب صوفے پر بیٹھے تھے۔ میں نے قصداً دو ایک مبہم شعر پڑھے اور کہا کہ مفہوم سمجھ میں

نہیں آتا۔ سروری صاحب سے مدد چاہی، وہ بھی قطعاً نہ بتا سکتے۔ دکنی متن میں ایسے شعر اور مصرعے عام ہیں کہ ہر لفظ کے معنی معلوم ہیں لیکن شعر یا مصرع کا مفہوم سمجھ میں نہیں آتا۔

دکنی کا نہایت مختصر انتخاب ممکن العمل نہیں۔ انتخاب بی اے تک پڑھائے جاتے ہیں، ایم اے میں پوری کتاب کورس میں ہوتی ہے، انتخاب نہیں۔ اگر پانچ سات شاعروں کی تخلیقات پر مشتمل انتخاب ایم اے میں نافذ کرنے کی جدت کی جائے تو اسے درجے میں قاعدہ ہوتا ہے کہ جس مصنف کی ایک چھوٹی سی چھوٹی تخلیق بھی کورس میں ہو، امتحان میں اس کی جملہ تخلیقات سے متعلق کچھ بھی پوچھا جا سکتا ہے۔

خاں صاحب کے معیار کے مطابق دکنی متون کون مرتب کرے گا۔ یہ دکان بے رونق ہے جس کے مال کا دکن میں بھی کوئی خریدار نہیں، کلاس روم کے علاوہ کوئی پوچھ نہیں۔ کون سر پھرا اس کارِ فضول میں اپنا وقت اور قوت کھپائے گا۔ ایسے تحقیقی متن کو کون ناشر چھاپے گا اور کون سے قارئین پڑھیں گے۔ دکنی کے چند مصنف ہی ہیں جو نصاب میں پڑھائے جاتے ہیں بقیہ سب تاریخ ادب کے لکھنے پڑھنے والوں کے لیے ہیں اور بس۔ خاں صاحب کو مثالیت کے علاوہ اعلا سے اُتر کر حقیقت کی دھرتی پر پاؤں دھرنا چاہیے۔

اگلا مضمون ''اُردو میں تدوین کے پچاس سال'' مطالعہ ادب کی ایک صنف کی عالمانہ تاریخ ہے جس کے شروع میں تدوین کا دائرہ کار متعین کیا ہے اور بعد میں تدوین کے اچھے اور ساقط المعیار کاموں کا تیزی سے جائزہ لیا ہے۔ دوسرے مضامین کی طرح یہ بھی نہایت مفید مقالہ ہے لیکن اس کے چند بیانات سے مجھے اختلاف ہے۔

خاں صاحب اصرار کے ساتھ تحقیق اور تدوین کو دو مختلف دائرے قرار دیتے ہیں، میں تدوین کو تحقیق کا ایک ذیلی شعبہ کہتا ہوں۔ خاں صاحب کے چند بیانات:

الف۔ اس عمل کا نام تدوین ہے۔ یہ تحقیق سے مختلف عمل ہے، متضاد نہیں (ص 171)

یہ اصولاً دو مختلف دائرے ہیں (ص 172)

تدوین تحقیق سے آگے کی منزل ہے (ص 174، ص 176)

ب۔ جو شخص تحقیق کا رمز شناس نہیں، وہ تدوین کا کام بھی صحیح طور پر نہیں کر سکتا (ص 172)

جو شخص تحقیق نہیں کر سکتا وہ تدوین کا کام بھی نہیں کر سکتا (ص 176)

اگر جو شخص تحقیق نہیں کر سکتا وہ تدوین بھی نہیں کر سکتا تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ مختلف دائرے نہیں۔ اگر بغور محقق تدوین نہیں کر سکتے تو واضح ہو جاتا ہے کہ تحقیق کل ہے اور تدوین جزو۔ دو مماثل بیانات ملاحظہ ہوں:

''جو تحقیق نہیں کر سکتا وہ تدوین بھی نہیں کر سکتا۔ جو اسلام کا پیرو نہیں وہ کربلا مرثیے لکھنے کے باوجود شیعہ نہیں۔

لیکن ہر تحقیق کرنے والے کے لیے لازم نہیں کہ وہ تدوین کر سکے، لیکن ہر پیرو اسلام شیعہ نہیں ہوتا

ان دلائل میں تحقیق کل ہے تدوین جزو، پیروی اسلام کل ہے، شیعہ ہونا جزو۔ تحقیق کے بھی بہت سے دائرے یا شعبے ہیں مثلاً:

ایک صنف ادب پر مقالہ لکھنا، ایک ادیب پر مقالہ لکھنا، تاریخ ادب لکھنا، حوالے کی کتابیں مثلاً وضاحتی فہرست کتب تیار کرنا، کسی ادیب کی ببلیو گرافی یا فرہنگ بنانا، بین العلوم تحقیق کرنا یعنی جس میں ادب کے علاوہ ایک دوسرے علم کی معلومات بھی درکار ہوں مثلاً اُردو میں فن موسیقی، اُردو زبان و ادب میں طب یونانی، اُردو ادب اور 1857 کا غدر۔ تدوینِ متن۔

مالک رام نے غالب کی سبد چیں مرتب کرنے کا ارادہ کیا، اس کا مقصد طول پکڑ گیا تو اسے ذکرِ غالب کے نام سے شائع کر دیا۔ ڈاکٹر زور کی کلیات قلی قطب شاہ کا مقدمہ علاحدہ سے کتاب ''حیات سلطان محمد قلی قطب شاہ'' کے نام سے آیا۔ شیرانی مولانا عرشی، کالی داس گپتا رضا اور خود رشید حسن خاں کی تدوینات کے مقدمے، مختلف نسخوں کی تفصیل چھوڑ کر، کتاب کے طور پر شائع کر دیے جائیں تو کیا وہ اچھی خاصی تحقیقی کتاب نہیں ہو جائیں گی۔ اسی طرح خاں صاحب کی فسانۂ عجائب یا باغ و بہار کی فرہنگ کو علاحدہ سے چھاپ دیں تو وہ تحقیق کی مستقل کتاب تصور کی جائے گی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تحقیق و تدوین میں کتنا اشتراک ہے۔

نہ صرف تمام مدون اہم محقق ہیں بل کہ تمام اہم محققوں نے تدوین کے کچھ نہ کچھ کام کیے ہیں مثلاً مولوی عبدالحق، محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، مسعود حسن رضوی، مولانا عرشی، مالک رام، مسعود حسین خاں، نورالحسن ہاشمی، جمیل جالبی، مشفق خواجہ، کالی داس گپتا، نثار احمد فاروقی، (میر کی آپ بیتی اور بیاض غالب) خلیق انجم، حنیف نقوی (آثر غالب) وغیرہ تدوینات ان جملہ کاموں کا ایک جزو ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ تدوین تحقیق کے اندر آتی ہے۔

خاں صاحب مزاجی مناسبت کی بات کرتے ہیں تو کس علم اور کس فن میں مزاجی مناسبت لازم نہیں آتی وہ گانا سیکھنا ہو یا بجلی کا مستری بننا ہو یا کراٹے (karate) کی تربیت ہو۔ ادبی تاریخ لکھنا، ریڈیو ڈرامے کی تاریخ لکھنا، وضاحتی فہرست کتب تیار کرنا سب کے لیے مزاجی مناسبت اور رجحان درکار ہے لیکن یہ سب کام کرنے والے ایک بڑے دائرے ادبی تحقیق کے افراد ہیں۔ میں تدوین کو تحقیق کا ایک ذیلی شعبہ مانتا ہوں، خاں صاحب مدون کے لیے ماہر تحقیق ہونا ضروری قرار دیتے ہیں صرف لفظوں کا پھیر ہے، کوئی بنیادی فرق نہیں۔

اس کے آگے خاں صاحب مدونین کا جائزہ لیتے ہیں۔ وہ محمود شیرانی کے تذکرے مجموعۂ نغز اور خالق باری کو اچھے کام قرار دیتے ہیں، ان کے مقدمے کو سراہتے ہیں لیکن چوں کہ ان کے ساتھ تعلقات نہیں اس لیے تدوین کے لحاظ سے کم رتبہ ٹھہراتے ہیں۔ یہ بات بڑی حد تک درست ہے، پورا سچ نہیں۔ میرے نزدیک تدوین کا بنیادی اور مرکزی کام صحیح متن بہم پہنچانا ہے۔ اگر مدون نے ایسا کر دیا تو اس نے 60 فی صد خدمت تو انجام دے دی، دوسرے محققوں اور قارئین کے لیے ضروری مواد فراہم کر دیا۔ اس لحاظ سے محمود شیرانی کے کاموں کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ انجمن ترقی اُردو (ہند) نے خاں صاحب کے تدوینی کاموں کو مولوی عبدالحق سیریز کا نام دیا ہے۔ وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ مولوی صاحب جس کثرت سے اُردو کے قدیم متون کو منظر عام پر لائے، دوسرا کوئی ان کا عشر عشیر بھی نہیں لایا۔ یہ مسلم کہ ان کے کام تحقیقی تدوین نہیں کہے جا سکتے لیکن ان کا زمانہ تو دیکھیے، بیسویں صدی کا تیسرا اور چوتھا عشرہ، اگر وہ بیسویں صدی کے ربع چہارم کے معیار سے کام کرتے تو محض چار پانچ متن ہی پیش کر پاتے۔ ان کی باغ و بہار اور رانی کیتکی کی کہانی کا متن بہت خوب ہے۔ دوسرے متون بھی اپنے دور کے لحاظ سے غنیمت ہیں اس لیے ترتیب متن کی تاریخ میں ان کی خدمات اور افادیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

خاں صاحب نے تدوین کے باب میں عرشی صاحب کے کاموں کی جو داد دی ہے، میں ان کا پوری طرح ہم نوا ہوں بل کہ یہ اضافہ بھی کر دوں گا کہ ان کی ''تدوین'' دیوان غالب نسخۂ عرشی نے اُردو کے محققوں اور عام پڑھنے والوں کو جو فیض پہنچایا ہے، اتنا کسی کی ایک تدوین نے نہیں کیا۔ پروفیسر مسعود حسین رضوی کی ناسخ سے متعلق دو تدوینوں کی داد دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تحقیق اور تدوین دونوں میں مدت کا تعین کوئی معنی نہیں رکھتا۔ مدت کا تعین کر کے کام کیا جائے گا، تو بہ طورِ عموم وہ اچھا کام نہیں ہوگا۔'' (ص 181)

مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ انسان کی زندگی محدود ہے اس لیے مدتِ تکمیل تو نظر میں رکھنی ہی ہوگی۔ مسعود حسن رضوی مرحوم مرثیے کی تاریخ لکھنا چاہتے تھے۔ مجھ سے کہا کہ یادداشتوں (notes) کے پلندے تیار ہو گئے ہیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ انھیں کس طرح ترتیب دیں، اور اب ہماری عمر بھی تو زیادہ باقی نہیں۔ قاضی عبدالودود مصحفی پر کتاب لکھنا چاہتے تھے، لیکن مدت کا تعین نہ ہونے کی وجہ سے دونوں بزرگ کام نامکمل چھوڑ گئے۔ پی. ایچ. ڈی کی تحقیق، ہندوستان میں یو. جی. سی کی طرف سے وظیفہ یافتہ اساتذہ کے تحقیقی پروجیکٹ، ساہتیہ اکادمی، قومی کونسل برائے فروغ اُردو اور ریاستی اکادمیوں سے محققین کے سپرد کیے گئے کام سب میں ایک مدت مقرر کی جاتی ہے۔ اگر وقت کی پابندی نہ ہو تو کوئی بھی منصوبہ مکمل نہ ہو سکے۔ یہ بھی ماننا ہوگا کہ مطعون زمانہ پی ایچ ڈی کے مقالوں میں تعین وقت کے باوجود، متعدد اچھے کام ہوئے ہیں۔ مالک رام کے لیے خاں صاحب کا قولِ فیصل ہے:

''مرحوم کو تدوین کے کام سے طبعی مناسبت کم تھی... انھوں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا جسے تدوین کی روایت میں اضافہ کے طور پر یا تدوین کے معیاری نمونے کے طور پر پیش کیا جائے۔ (ص 182)

خاں صاحب نے شبلی کے سلسلے میں تحقیق کے ''غیر جذباتی انداز'' کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے ''جذباتیت'' منطق کی اور انشا پردازی، حقیقت بیانی کی دشمن ہے۔'' (ص 195)

خاں صاحب مالک رام کے دو شدید مخالفوں: قاضی عبدالودود اور گوپال متل سے نزدیک رہے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ صحبت کے غیر شعوری اثر کی وجہ سے مالک رام کا نام آتے ہی ان کی قدر پیمائی جذباتیت کا شکار ہو جاتی ہے۔ مالک رام اُردو دنیا میں سبد چیں کے مدون کے طور پر داخل ہوئے۔ انھوں نے متداول دیوانِ غالب کا قابل اعتماد متن نسخۂ عرشی سے بھی پہلے 1957 میں پیش کیا۔ وہ خاں صاحب کے باریک معیار پر پورا نہیں اترتا، اس کو میں مانتا ہوں لیکن اگر خاں صاحب مالک رام کی مرتبہ گل رعنا اور غبارِ خاطر (24 صفحوں کا دیباچہ اور 127 صفحات کے حواشی) کو بھی خاطر میں نہ لائیں تو انھیں اور مجھے اختلاف رائے کا جمہوری حق ہے۔ مالک رام کے مرتبہ خطبات آزاد اور تذکرہ (ابوالکلام آزاد) بھی اچھے کام ہیں۔ اگر مالک رام کو تدوین سے مناسبت نہ ہوتی تو متعدد نسخوں سے تیار کی ہوئی کلیاتِ نظم غالب (فارسی) کیسے مرتب کرتے۔ جنھوں نے اسے دیکھا ہے، اس کی ستایش کرتے ہیں۔ اس کے 40 صفحے (یا اوراق) قاضی عبدالودود نے تلف کر دیے اور مالک رام گم شدہ کو سابق معیار سے دوبارہ مدون کرنے کی ہمت نہ کر سکے اور اس لیے کام نامکمل چھوڑ گئے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا تدوین کا مذاق کس معیار کا تھا۔ خاں صاحب ان کی اور مختار الدین احمد کی مشترکہ تدوین کربل کتھا کی داد دیتے ہیں۔ مجھے ڈاکٹر مختار الدین احمد نے ایک خط میں لکھا تھا:

''اگر مالک رام مساعدت نہ کرتے اور ان کا لطف و کرم شامل حال نہ ہوتا تو شاید ہی یہ کتاب اتنے اچھے طریقے سے شائع ہو سکتی۔ انھوں نے مصروفیت کے باوجود ایک معتد بہ حصے کی اصل مخطوطے سے نقل تیار کی... جو کچھ میں نے کیا اس پر آخری نظر مالک رام صاحب نے ڈالی ہے۔ اس کتاب پر ان کا بھی نام رہے اس کے لیے مالک رام صاحب کسی طرح تیار نہ تھے۔''

میں غبارِ خاطر اور گل رعنا کے مرتب کو تدوین میں نا اہل ماننے کو تیار نہیں۔ یہاں ایک بات صاف کر دوں کہ بعض حضرات یہ سوچ سکتے ہیں کہ میں قاضی عبدالودود اور مالک رام، نیز رشید حسن خاں اور مالک رام کے معاملات میں مالک رام کا دفاع اس لیے کرتا ہوں کہ وہ ہندو ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اقلیم عقائد میں قاضی عبدالودود، رشید حسن خاں اور میں دریا کے ایک کنارے پر ہیں اور مالک رام دوسرے کنارے پر۔ میرے عمل قدر پیمائی کو کسی کا مذہب و مسلک متاثر نہیں کرتا۔

خاں صاحب نے کلیاتِ مکاتیب اقبال مرتبہ سید مظفر حسین برنی اور خطوط غالب مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم کو، ایک ایک معترضانہ تبصرے کے علی الرغم، پسند کیا ہے۔ میں اس سے متفق ہوں۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے قصہ مہر افروز و دلبر اور بکٹ کہانی۔ بہ اشتراک نور الحسن ہاشمی نیز دیوانِ غالب کامل مرتبہ کالی داس گپتا رضا کی بجا طور پر ستایش کی ہے۔ وہ ڈاکٹر ہاشمی کی مرتبہ نوطرز مرصع کے مقدمے کو سراہتے ہیں لیکن متن کی پیش کش سے مطمئن نہیں۔ تدوین پر مشتمل پی ایچ ڈی کے دو مقالوں کی تعریف کرتے ہیں، بنارس کے ڈاکٹر نسیم احمد کا غیر مطبوعہ مقالہ اور ڈاکٹر ہاجرہ ولی الحق انصاری کا شائع شدہ مقالہ جو دونوں غزلیاتِ سودا کو پیش کرتے ہیں۔ اپنی چاروں تدوینات کا ایک پیراگراف میں ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر زور اور ڈاکٹر سیدہ جعفر کے کلیاتِ قلی قطب شاہ کے اڈیشنوں نیز ڈاکٹر محمود حسن کی مرتبہ کلیاتِ سودا کی برائے سخت الفاظ میں تنقید کی ہے۔ ایک آقائے تدوین ہی ایسا بے لاگ تبصرہ کر سکتا تھا۔ آخر میں معیاری تدوین کی دعوت دیتے ہوئے اس رطب اللسانی پر مضمون ختم کرتے ہیں:

''یہ عرض کر دوں کہ کم سہی مگر ابھی تک ہمارے پاس ایسے اہل نظر موجود ہیں جو اس کام کو انجام دے سکتے ہیں۔ یہ پچھلے موسم کی بہار کی آخری فصل ہے اگر اب بھی یہ کام نہ ہو سکا تو نہیں کہا جا سکتا کہ مستقبل میں کبھی ہو سکے گا یا نہیں ہو سکے گا۔ (ص 191)

اس جائزے میں پاکستان کی کسی تدوین کا ذکر نہیں کیا گیا۔ برِ صغیر کی تقسیم ہوئی لیکن اُردو ادب کی نہیں۔ خاں صاحب نے کہیں یہ عذر بھی پیش نہیں کیا کہ پاکستان کے کاموں تک ان کی رسائی نہیں ہو سکی۔ قرآت اور تعین متن کا سب سے شان دار کام ڈاکٹر جمیل جالبی کی مرتبہ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ ہے۔ اس کے مسودے کا سوادِ خط مخطوطہ شناس کے لیے سب سے زیادہ کھٹن چیلنج ہے۔ اس کتاب کے علاوہ مشفق خواجہ کی مرتبہ اقبال کا ذکر بھی کیا جا سکتا تھا جس میں انھوں نے مولوی احمد دین کی اقبال کے دو اڈیشنوں کو ایک ہی تدوین میں سمو دیا ہے۔ اس کے علاوہ دیوانِ غالب بہ خطِ غالب کی اکبر علی خاں عرشی زادہ اور نثار احمد فاروقی کی تدوینات بھی قابلِ داد ہیں۔ نثار احمد فاروقی کی میر کی آپ بیتی بھی اہم کام ہے جس کے دوسرے اڈیشن میں ذکرِ میر کا فارسی متن بھی مرتب کر دیا ہے معلوم نہیں خاں صاحب کا مضمون فاروقی کی طبع دوم کے بعد آیا کہ پہلے؟

اس مجموعے کے دو مضامین دو محققوں کے بارے میں ہیں۔ پہلے کا عنوان ہے ''حافظ محمود شیرانی کی تاریخ اہمیت'' اس کی تمہید میں کہتے ہیں:

''ہندوستان میں اُردو اور فارسی کی نسبت سے شیرانی صاحب کو میں تحقیق کا معلم اول مانتا ہوں... روایت کی توسیع اور روایت کی تشکیل میں جو فرق ہے، اسے ملحوظ رکھا جائے۔'' (ص

آگے چل کر پھر کہتے ہیں:

انھوں نے ادبی تحقیق کے طریق کار کی نشونما کے لیے زمین ہم وار کی اور حد درجہ ناموافق حالات میں کام کا آغاز کیا...آندھی میں چراغ جلانا اور اسے روشن رکھنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں، ہاں چراغ سے چراغ جلانا آسان ہے۔''(ص200)

خاں صاحب نے روایت کی توسیع کرنے والوں کے مقابلے میں روایت کے مبداء کو اہم تر ٹھہرایا ہے۔اس لحاظ سے دیکھا جائے تو مولوی عبدالحق کو کیوں نہ دستارِ فضیلیت پیش کی جائے۔انھوں نے شبلی کے مرتبہ تذکرہ گلشن ہند پر جو طویل مقدمہ لکھا ہے وہ قاضی عبدالودود کی تنقید کے باوجود اُردو کا پہلا سیر حاصل تحقیقی مقالہ ہے۔اس کا سنہ تصنیف 1906۔دیکھیے جب شیرانی ہوں کہ قاضی عبدالودود اپنی ادبی تحقیق کے نام سے بھی آشنا تھے۔معلوم نہیں، خاں صاحب شیرانی کی تحقیق کے دورِ آغاز کو حد وو درجہ ناموافق کیوں کہتے ہیں۔مولوی صاحب نے 1921 میں رسالہ اُردو جاری کیا جس میں روز اول ہی سے تحقیقی مضامین شائع ہونے لگے۔انھوں نے 1922 میں دوسروں سے تذکرے مرتب کرا کے شائع کیے، دکنی ادب کو منظر عام پر لا کر اُردو ادب کی عمر میں صدیوں کا اضافہ کیا۔اس طرح وہ روایت کے نہ صرف بانی تھے بل کہ اس کی نشو ونما میں بھی فعال تھے۔معلم اسے کہتے ہیں جو اپنے ساتھ کارکنوں (شاگردوں) کی ایک ٹیم تیار کر دے۔خاں صاحب حافظ محمود شیرانی کے لیے کہتے ہیں:

''ان کی زندگی میں ان کے اثرات ہمہ گیر نہیں ہوسکے۔روایت بنی لیکن پھیل نہیں سکی۔اثرات پڑے لیکن دائرہ چھوٹا رہا۔''(ص197)

لیکن مولوی صاحب کا دائرہ وسیع تھا۔انھوں نے تحقیق کے گوناگوں کاموں کی بنیاد رکھی اور دوسروں کو ان میں شریک کار بنایا۔انھوں نے شیخ چاند سے پی ایچ ڈی کے انداز کا پہلا مقالہ ''سودا''لکھوایا۔مولوی صاحب کو تحقیق کا بانی اور معلم اول کیوں نہ کہا جائے۔مجھے یہ تسلیم ہے کہ تحقیق کے طریق کار میں حافظ محمود شیرانی مولوی صاحب سے آگے ہیں لیکن مولوی صاحب کا دامن بھی قابل قدر تحقیق سے خالی نہیں۔ان کی تحقیقی کتابیں ''اُردو کی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا حصہ'' نیز نصرتی باغ تحقیق کے میوۂ رسیدہ ہیں۔مجموعے ''قدیم اُردو'' میں شامل ان کے مضامین بھی داد طلب ہیں۔

ہمیں شیرانی کے فارسی ادبیات کے کارناموں سے سروکار نہیں۔ان کے تحقیقی مضامین اعلا درجے کے ہیں جن میں بت النزل قصہ چار درویش (رسالہ کارواں لاہور 1933) ہے لیکن ان کی کتابیں اتنی پختہ نہیں۔''پنجاب میں اُردو'' لسانیات اور ادبی تحقیق دونوں کے لحاظ سے ایک کمزور کام ہے۔خالق باری کا متن انھوں نے قابلِ اعتماد تشکیل دیا۔مقدمے میں امیر خسرو کو اس سے بے دخل کرنے کی جو دلیلیں دی ہیں وہ بادی النظر میں مضبوط معلوم ہوتی ہیں لیکن اس کے برخلاف جو دلائل ہو سکتے تھے انھیں گول کر گئے۔انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی نیز نجیب اشرف ندوی کے پاس خالق باری کے دو مخطوطے تھے۔جن کے آخر میں ایک قطعۂ تاریخ تھا کہ جب خسرو کی تصنیف ایک طرز نوی سے لکھی گئی تو 736ھ کی تاریخ تھی۔واضح ہو کہ خسرو کا انتقال 725ھ میں ہوا، شیرانی کی نظر سے نجیب اشرف ندوی کا نسخہ گزر چکا تھا۔انھوں نے اس کی شافی تاویل نہیں کی۔مسعود حسین رضوی نے رسالہ ہندستانی الہ آباد کی 1931 کی جلد میں تجلی کی کتاب اللہ خدائی 1060ھ کا تعارف کرایا جس کے دو اشعار میں خسرو اور ان کے پیر خواجہ نظام الدین اولیا کا ذکر نصابی کتاب کے تعلق سے تھا۔

پرتھوی راج راسا پر ان کی تحقیق کے بارے میں اپنی رائے محفوظ رکھوں گا۔میرے بڑے بھائی ڈاکٹر پرکاش مونس، جو ہندی زبان وادب میں بھی نظر رکھتے تھے، شیرانی کی کتاب کے بارے میں مجھ سے کہتے تھے کہ معلوم ہوتا ہے شیرانی نے راسا پڑھا ہی نہیں۔افسوس کہ میں نے ان سے تفصیلات نہیں پوچھیں۔جب تک میں قدیم ہندی کے کسی عالم کی رائے نہ جان لوں، ان کی تحقیق کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

خاں صاحب نے اپنے مضمون میں عہد شیرانی کا جو چار صفحوں کا سیاسی اور سماجی پس منظر پیش کیا ہے وہ ایک نمونہ ہے کہ پس منظر کو کس طرح لکھا جائے، صرف متعلقہ واقعات کا بیان کیا جائے اور انھیں موضوع سے مربوط کر کے نتائج اخذ کیے جائیں۔انھوں نے شیرانی کے تہذیبی پہلو پر زور دیا۔لکھتے ہیں:

''آج کل جس آسانی سے ہم شخص سے مرعوب نہیں ہونے، انکار کرنے، قبول کرنے یا رد کرنے میں ہمیں قابلِ قبول نہیں سمجھتے، منشورِ تحقیق کے یہ سبق پہلی بار شیرانی صاحب ہی نے ہمیں پڑھائے تھے۔''(ص200)

مندرجہ بالا بیان کے زیر اثر میں تسلیم کرتا ہوں کہ اگر شیرانی صرف چار درویش والا مضمون اور ''تنقید برأت حیات'' کا طویل سلسلہ ہی لکھ کر چھوڑ جاتے تو بھی اُردو کے بڑے محقق تسلیم کیے جاتے۔اپنے مضمون کے آخر میں خاں صاحب نے تین باتوں کی طرف توجہ دلائی ہے اور یہ تینوں شیرانی کے خلاف پڑتی ہیں۔خاں صاحب نے کہا ہے کہ میں شیرانی صاحب ہی کے پڑھائے ہوئے سبق کو دہرا رہا ہوں۔

اسی نوعیت کا دوسرا مضمون ''تحقیق کا معلمِ ثانی'' ہے۔غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی نے فروری 1986 میں قاضی عبدالودود سمینار کیا۔اس میں رشید حسن خاں نے شاید اس مضمون کا دوسرا حصہ ہی پڑھا کیوں کہ رسالہ غالب نامہ، قاضی عبدالودود نمبر بابت جنوری 1987 میں اس کا دوسرا حصہ ہی ہے۔زیر تبصرہ کتاب میں پورا مضمون ہے جس کی ابتدا یوں ہوتی ہے:

''قاضی عبدالودود کو اُردو میں تحقیق کا معلم ثانی کہنا چاہیے۔میرا خیال ہے کہ نئی نسل، تحقیق کے آداب اور انداز سے قاضی صاحب کے توسط سے آشنا ہوئی ہے پچھلے پچیس تیس برسوں میں...مضبوط دلیلوں کے بغیر دعووں کو قبول نہ کرنے کا انداز جس طرح فروغ پذیر ہوا ہے؛ اس میں قاضی صاحب کی تحریر کا بڑا حصہ ہے۔''(ص 202)

مضمون میں قاضی صاحب کی تحریوں کے خصائص، بالخصوص محاسن، نیز قاضی صاحب کی خدمات کو بڑے مدلل طریقے سے شرح کیا ہے۔چوں کہ میرا یہ مضمون بہت طویل ہو گیا ہے اس لیے میں خاں صاحب کے ایک بیان ہی کی طرف توجہ مبذول کراؤں گا:

''اسی طرح یار لوگوں نے مثبت اور منفی یا تعمیری و تخریبی کی اصطلاحیں بھی استعمال کرنا شروع کی تھیں۔اعتراضات کو یہ کہہ کر مسترد کرنے کی کوشش کی جاتی تھی کہ یہ تو تخریبی انداز ہے۔''(ص208)

خاں صاحب نے مضمون کی آخری محفل میں پھر اس موضوع کو شرح وبسط سے لیا ہے:

''پچھلے بیس پچیس برسوں میں ہمارے بعض بزرگوں نے مثبت تحقیق اور منفی تحقیق کی اصطلاحوں کو رواج دیا ہے....اس سلسلے میں زیادہ سوجھ بوجھ سے کام لیتے ہوئے ''تعمیری محقق'' کی اصطلاح بھی وضع کی گئی۔ مزید احتیاط یہ کی گئی کہ اس کے مقابلے میں ''تخریبی تحقیق'' کو نہیں لایا گیا، کیوں کہ یہ بات معلوم تھی کہ جب تعمیری تحقیق کہا جائے گا تو اس کا متضاد اپنے آپ سامنے آجائے گا۔ یہ وہی انداز ہے جس کو مولانا محمد حسین آزاد سے نسبتِ خاص حاصل رہی ہے''۔(ص 213)

''اپنے بزرگوں سے تو مجھے کچھ نہیں کہنا ہے، کیوں کہ ان حضرات نے سب کچھ جاننے کے باوجود، ایک خاص جذبے کے تحت ایک خیال باطل کو پھیلایا ہے(ص 215)

اس احترام کے ساتھ کن بزرگوں کی طرف انگلی اٹھائی جارہی ہے؟ پروفیسر نیّر مسعود حسن رضوی نے جن کا نام لیتے ہی میرا سر عقیدت واحترام کے جذباتِ بے پایاں سے جھک جاتا ہے، اپنی کتاب ''اسلافِ میرانیس'' کا انتساب ''تعمیری تحقیق کے قدر شناسوں کے نام'' کیا ہے۔ لیکن تعمیر و تخریب کی اصطلاح کو سب سے پہلے مسعود رضوی صاحب نے نہیں، خاں صاحب کے معلم اول شیرانی صاحب نے استعمال کیا۔ تنقید شعرالعجم میں کہتے ہیں:

''تنقید کے دوران میں نے نہ صرف تخریبی پہلو پر نظر رکھی ہے بل کہ حسبِ اجازت وقت تعمیری کام بھی کیا ہے۔'' نثار احمد فاروقی اپنے مضمون ''اُردو میں تحقیق کی روایت اور قاضی عبدالودود'' میں لکھتے ہیں:

''قاضی صاحب جب کسی کی نفی کرنے پر آجائیں تو ان کا قلم خوب چلتا ہے اور مطالعے کے آفاق بھی وسیع تر ہو جاتے ہیں لیکن مثبت تحریروں میں چند جملوں سے آگے نہیں جا سکتے۔''(غالب نامہ جنوری 1987ص 119)

ڈاکٹر مسعود حسین خاں اپنے مضمون ''قاضی عبدالودود کا تحقیقاتی اسلوب'' میں لکھتے ہیں:

''قاضی عبدالودود بنیادی طور پر نکتہ چیں محقق ہیں۔ ان کے اس تحقیقی رویے کو کسی نے بے باک تنقید کہا ہے (عرشی) اور کسی نے منفی تنقید (مسعود حسن رضوی) (قاضی عبدالودود سمینار کے مالے، بہار اُردو اکادمی پٹنہ 1996 ص 1)

اُردو میں چار اہلِ قلم ایسے ہیں جنھوں نے اعتراضات کو اپنا میدانِ اختصاص بنایا حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، رشید حسن خاں، شیام لال کالڑا عابد پیشاوری۔ ان میں پانچویں سوار عطا کاکوی ہیں جنھوں نے اپنے اس رنگ کے مضامین کا مجموعہ غلط ہائے مضامین کے نام سے شائع کیا، لیکن یہ ان کا خاص رنگ نہیں۔ ان کے مثبت کام کہیں زیادہ ہیں۔ مندرجہ بالا چار علما میں سرِ فہرست قاضی صاحب اور خاں صاحب ہیں کہ ادبی دنیا میں ان کی شہرت کردہ گیری ہی کی رہینِ منت ہے۔ خاں صاحب نے دکھایا کہ قاضی صاحب کے تبصروں میں اعتراضات ہی نہیں کیے گئے بل کہ ان کے بعد تصحیح کر کے ضروری معلومات کو بھی مہیا کیا گیا اور اس کی تائید میں پیش کیا ہے۔ قاضی صاحب کے تبصرہ دیوانِ فائز مرتبہ مسعود حسن رضوی کو جس کے بارے میں قاضی صاحب نے تین بیش بہا معلومات کا اضافہ کیا۔

اعتراضات کے ساتھ ہر معترض صحیح جواب تو فراہم کرتا ہی ہے، اس لیے میں اس روشِ تحقیق کو صحیح کہنے کے حق میں ہوں۔ اس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن جو اس کو اپنا پیشہ بنالے اس سے توقع کی جاتی ہے کہ کچھ اپنی مثبت تحقیق بھی پیش کرے تا کہ دوسرے بھی اسے پرکھ سکیں۔ خاں صاحب جب تک محض معترضانہ تحقیق میں ڈوبے رہے، میں ان سے بدظن رہا۔ جیسے ہی انھوں نے اپنی بے نظیر تدوینیں پیش کیں، میں ان کا سب سے بڑا معتقد ہو گیا۔ قاضی صاحب سے شکایت ہے تو ان کے لہجے پر جیسا کہ خاں صاحب نے کہا ہے تحقیق میں جذباتیت کا کوئی مقام نہیں۔ قاضی صاحب جب جو مولوی عبدالحق، مالک رام، ابوالکلام آزاد اور خواجہ احمد فاروقی پر لکھتے ہیں تو عناد پر خاش سے بے قابو ہو کر طنز و تعریض کے تیر برساتے ہیں، نشتر سے کچوکے لگاتے ہیں۔ بہر حال خاں صاحب نے قاضی صاحب کے علم و فضل اور ان کی تحریروں کی افادیت کو بہ احسن الوجوہ نمایاں کیا ہے، میں اپنی زیرِ تصنیف کتاب میں ان خوبیوں کو مدلل تفصیلات کے ساتھ اجاگر کروں گا لیکن ساتھ ہی چند کمزوریوں کو بھی افشا کروں گا۔

آخری مضمون کا عنوان ہے ''ایک نیا انتخاب (رباعیاں) ہندستانی بک ٹرسٹ بمبئی نے ''جدید اُردو ادب'' کے نام سے 12 جلدوں میں ایک انتخاب مرتب کرنے کا فیصلہ کیا۔ پہلی جلد ''رباعیاں'' کے نام سے آئی۔ مجلسِ ادارت میں تین نام ہیں: فراق، خدیجہ عظیم، مغنی عباس۔ آخر الذکر دونوں اشخاص میرے لیے غیر معروف ہیں۔ مجموعے پر سنہ اشاعت درج نہیں لیکن سردار جعفری کے مقدمے پر جولائی 1965 مندرج ہے۔ خاں صاحب کا تبصرہ 1966 میں شائع ہوا۔ سردار جعفری نے اپنے مقدمے میں لکھا ہے کہ جدید اُردو ادب سے مراد اس عہد کا ادب ہے جو اقبال اور پریم چند کے بعد شروع ہوتا ہے۔ مجموعے میں آسی غازی پوری، جگت موہن لال رواں، محروم، یگانہ، فانی، فراق اور جوش کی رباعیاں ہیں۔ اس مجموعے کے جائزے میں خاں صاحب نے یہ مشاہدات وانکشافات کیے۔

1۔ مرتبین نے 1903 کے بعد کے زمانے کو ترقی پسند تحریک کا عہد قرار دے کر تخلیق کے لحاظ سے زریں عہد کہا ہے لیکن اس سے پیش تر وہ اقبال (م 1938) اور پریم چند کے بعد کے عہد کا ذکر کر چکے ہیں۔ آسی اور رواں بہت پہلے مرحوم ہو چکے تھے۔ یگانہ، فانی اور محروم ترقی پسند نہ تھے۔ جوش کی رباعیوں کا مجموعہ 1937 میں شائع ہو گیا تھا۔ اس دور کی رباعیوں کو ترقی پسند ادب کے کھاتے میں نہیں ڈالا جا سکتا۔ امجد حیدر آبادی کو نہیں لیا جو کم از کم آسی غازی پوری سے بہتر رباعی گو تھے۔

2۔ فراق کی 187 رباعیاں شامل کی گئی ہیں جب کہ رواں اور یگانہ کی صرف 40-40۔ فراق کی رباعیوں میں بیش تر ایسی ہیں جنھیں کسی اوسط درجے کے انتخاب میں بھی کسی قیمت پر جگہ نہیں دی جا سکتی۔

3۔ یہ صراحت نہیں کی گئی کہ رباعیاں شاعر کے کس انتخاب سے لی گئی ہیں۔ بعض اوقات شاعر کے دو مجموعے کے دو اڈیشنوں میں متن کا اختلاف ہوتا ہے۔ انتخاب میں کئی موقعوں پر بعد کا متن نہیں لیا۔

4۔ متعدد صورتوں میں انتخاب میں درج رباعیوں کا متن، شاعر کے مجموعے میں دیے متن سے مختلف ہے۔ بے احتیاطی کے سبب بہت سے مصرعے غیر موزوں ہو گئے ہیں۔

خاں صاحب نے اس تبصرے کے لیے بہت محنت کی۔ شعرا کے سنین وفات اور ان کے مجموعوں کے مختلف اڈیشنوں کے سنین تلاش کیے اور متعدد شعروں اور مصرعوں کے متن کا انتخاب کے متن سے تقابلی مطالعہ کیا۔ یہ کمزور انتخاب خاں صاحب کے اس قدر وقت اور مشقت کے شایان نہ تھا۔ مضامین کا جائزہ ختم ہوا۔ اب مجموعی طور پر کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ پہلا معروضہ ان کی زبان و بیان سے متعلق ہے۔ وہ بلا شبہ ہمارے دور میں صحتِ زبان و املا کے سب سے بڑے رمز شناس ہیں۔ مجھے ان کے چند الفاظ پر تامل ہے۔

گڑھنا (ص 23 و37) میں نے بہتوں کو یہ لفظ استعمال کرتے دیکھا ہے۔ میرے نزدیک گھڑنا صحیح ہے۔ فرہنگ آصفیہ اور پلاٹس میں گھڑنا ہی دیا ہے۔ پلاٹس نے اس کا پراکرت مادہ بھی دیا ہے۔ گڑھنا کا کوئی مادہ نہیں مل سکتا۔ اُردو والوں نے کسی غلط فہمی کے تحت گڑھنا کو زیادہ فصیح اور عالمانہ طرزِ اظہار سمجھ لیا۔

ٹاٹ باہر (ص 52) جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے نثار احمد فاروقی نے مجھ سے کہا تھا کہ یہ پنجابی محاورہ ہے، ثقافتِ اُردو اسے استعمال نہیں کرتے۔ میں غور کرتا ہوں کہ یہاں ٹاٹ کے کیا معنی

ہیں؟ کیا زمین پر بچھا ہوا ٹاٹ کا فرش یا مسلمان عوام کے باہری دروازے پر پڑا ٹاٹ کا پردہ؟ بہر حال مجھے اس محاورے یا کنائے کے استعمال میں تامل ہے۔

قرائت (ص56، 67، 87 وغیرہ) اس کتاب میں خاں صاحب نے جگہ جگہ اس لفظ کو قرأت کی جگہ قرائت (بروزن ہدایت) لکھا ہے۔ حد یہ ہے کہ ص56 پر ڈاکٹر وزیر آغا کے رسالہ اوراق جولائی اگست 1996 کے اداریے کو نقل کرتے ہوئے بھی دو جگہ قرائت لکھا ہے۔ مجھے اس میں شبہہ ہے کہ وزیر آغا اتنے عربی زدہ ہوں گے اور انھوں نے یہ غیر مروج املا لکھا ہوگا۔ فرہنگ آصفیہ میں اسے قرأت لکھا ہے۔ خاں صاحب نے اپنی فاضلانہ کتاب ''اُردو املا (1974) میں لکھا ہے:

''ایک لفظ میں یہ اختلاف نگارش کیوں رہے کہ کوئی شخص عربی کے لحاظ سے جرأت لکھے اور کوئی شخص ایسے اور الفاظ پر قیاس کر کے ''جرات'' لکھے۔ اس لفظ کو بھی اُردو املا کے مطابق جرات لکھنا چاہیے۔'' (ص360)

انھوں نے الف پر کوئی اعراب نہیں دیا جس کی عدم موجودگی میں اس لفظ کو الف ساکن کے ساتھ بروزن برات پڑھا جاسکتا ہے۔ اسی صفحے پر انھوں نے ذوق کا مصرع نقل کیا ہے ع کبھی میں قاری قرآن بہ علم قرئت۔ اسی سلسلے میں آگے لکھتے ہیں:

''ایک لفظ ہے قراءت بروزن ہدایت.... اس کی ایک اور صورت جو رائج ہوگئی ہے ''قرأت'' یا ''قرءت'' یا ''قرأت'' ہے۔ (ص360)

مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کے کتابچے ''املا اور رموز اوقاف'' میں جرأت۔ قرأت (الف کے اوپر ہمزہ) لکھے ہیں۔ (طبع اول جون 1986) ص23

دہلی کے املا نامہ طبع دوم میں سفارش ہے ''اگر عربی املا کی تقلید کرتے ہوئے ایسے الفاظ پر ہمزہ لکھا جائے (جیسے جرأت...) تو اسے اُردو میں غلط نہ سمجھا جائے لیکن ہماری سفارش یہ ہے کہ یہ الفاظ اُردو میں چوں کہ بیش تر ہمزہ کے بغیر لکھے جاتے ہیں انھیں ہمزہ کے بغیر لکھنا بھی صحیح سمجھا جائے۔ (ص82)

میں نے اُردو میں کسی تحریر میں قرئت (بروزنِ ہدایت) نہیں دیکھا۔ سب قرأت (بروزن فرصت) اور بولتے ہیں۔ میری رائے میں اُردو چلن کے اعتبار سے یہی تلفظ صحیح اور قرائت بروزن ہدایت غلط ہے۔ میں اس کے یا مماثل الفاظ کے املا میں الف کو مفتوح دکھانے کے لیے ہمزہ نہیں فتحہ لکھنے کو ترجیح دوں گا۔

منشی نول کشور کے مطبع میں (ص109) میری رائے میں مطبع، مصرع جیسے الفاظ کی تصریف میں امالے کے اظہار کے لیے آخری یائے مجہول کا اضافہ نہ کیا جائے بل کہ آخری عین سے پہلے حرف کے فتح کو کسرے سے بدل لینا کافی سمجھا جائے۔ اس طرح جمع کے صیغے سے امتیاز بھی رہے گا جسے ہم مطبع، مصرعے لکھیں گے۔

کھوکھل (ص92، آخری پیراگراف کے شروع میں) معلوم نہیں خاں صاحب اس تلفظ کو صحیح سمجھتے ہیں یا یہ سہو کتابت ہے۔ غالباً سہو ہی ہے۔ صحیح کھوکھلی ہے۔ زبان کے بعد لیجیے بیان کو۔ خاں صاحب قاضی عبدالودود کی ستائش میں کہتے ہیں:

''قاضی صاحب کی تحریروں سے تحقیق کو جو طاقت ورعناصر ملے ہیں ان میں ظاہری سطح پر شاید سب سے نمایاں چیز تحقیق کی زبان ہے اور اسلوب جو معنویت سے معمور اور رنگینی سے محفوظ ہے۔ سادہ، ہم وار اور ایک حد تک کھردرے پن سے آراستہ.... مجازی معنی کی پرچھائیاں بھی نہ پڑنے پائیں کیوں کہ اس طرح حقیقت کے خط و خال مسخ ہونے لگتے ہیں۔'' (ص206)

میں اس سے متفق نہیں کہ تحقیق کی زبان میں شگفتگی نہ آنے پائے اور وہ مجازی معنی سے مکمل ترک سوالات رکھے۔ ادبی تحقیق ادب ہی کا ایک شعبہ ہے، شگفتگی اس کا عیب نہیں ہوسکتی، خواجہ احمد فاروقی اپنی تحقیقی تحریروں میں بہت شگفتہ بیانی کرتے تھے لیکن وہ تحریریں تحقیقی مواد کے لحاظ سے زیادہ معتبر نہیں ہوتی تھیں۔ معتبر محققین میں سب سے زیادہ شگفتہ و دل کش زبان لکھنے والے کوئی اور نہیں، رشید حسن خاں ہی ہیں۔ ان کے بعض جملے ادب لطیف کو چھونے لگتے ہیں لیکن وہ اس رنگ کو حاوی نہیں ہونے دیتے، میں اس کتاب سے ان کی گل کاری کے چند نمونے پیش کرتا ہوں:

1۔ امیر خسرو کا جشنِ یادگار منایا لیا گیا اور اس دھوم سے جیسے عاشق کا جنازہ نکلا ہو۔ (حرفِ آغاز ص8)

2۔ اقبال اکیڈمی نے کلیات اقبال کو دوبارہ چھاپا، اس قدر حسین اور دیدہ زیب کہ اسے دیکھ کر آنکھوں کی روشنی بڑھ جائے.... واضح طور پر معلوم ہوتا تھا کہ مرکز توجہ تھے نقش و نگار پردہ در۔ (ایضاً)

3۔ ایک آزاد خیال، روشن خیال اور شیوۂ رندانِ بے پرواخرام کی روایت کے ماننے والے ادیب (احمد ندیم قاسمی) (ص10)

4۔ سید صاحب کا مقدمہ ایسی خیال بافیوں اور حاشیہ آرائیوں سے بھرا پڑا ہے۔ (ص52)

5۔ کیا حشر ہوا اس کلیت کشی کا۔ ایسا بکھراو ہوا کہ اب اس کے بغیر چلنا بھی مشکل ہے۔ اس سے نقصان ہوا کتنا بڑا کہ ذہانت پر مہریں لگ گئی تھیں اور قوتِ تخیل کے پرکاٹ دیے گئے تھے۔ توسیع کے بجائے ایک ہی خیال کی تکرار وظیفہ قرار پائی تھی۔ (ص55)

6۔ ''یہ مان لینا کہ یہ تنقید کا آخری نظریہ ہے اور اس پر ایمان لے آنا فرض ہے، اس کے بعد اب انسانی ذہن کے افق سے کوئی دوسری روشنی کی کرن نہیں پھوٹے گی۔ اور یہ بھی کہ اب تک کے جس قدر نقطہ ہائے نظریں.... وہ سب منسوخ صحیفوں کی طرح گل دستہ طاق نسیاں بنا دیے جانے کے لائق ہیں، ایسی انتہا پسندی کو کوئی آزاد ذہن فکر رکھنے والا قبول نہیں کرسکتا۔'' (ص56)

اب سطور میں ذکر تھا دریدا کا۔ مجھے امریکہ میں انگریزی کے پروفیسر ڈاکٹر ستیہ پال آنند نے بتایا کہ اب دریدا نے اعلان کر دیا ہے کہ ''احمقو! میرے پاس کوئی نظریہ نہیں۔ میں اتنے دن تم سب کو بے وقوف بناتا رہا۔'' اب دریدا کے سب عقیدت مند نکو بن گئے۔ واللہ علم۔

7۔ محقق ہو یا مدون اور ناقد، یہ الگ الگ راہوں کے راہی ہوتے ہیں۔ (ص70)

8۔ زمانے کی گردش نے اب اس خاص معاملے میں اہل زبان اور غیر اہل زبان، استاد اور شاگرد سب کو قریب تر کر دیا ہے اور دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں فاصلہ شاید کچھ زیادہ نہیں رہا ہے۔ (ص79)

9۔ اس کے صفحات کے حواشی ایسی گل کاری اور رنگ آمیزی سے مزین ہیں کہ کچھ دیر کے لیے تو محسوس ہوتا ہے کہ جیسے آنکھوں کی روشنی بڑھ گئی ہو۔ لیکن جیسے ہی یہ سیمیا کی سی نمود ختم ہوتی ہے تو خیال ہوتا ہے کہ

تحقیق اور تدوین کی روایت شاید اُردو میں موجود ہی نہیں۔(ص89)

10۔اب تو زندہ لوگوں کو موضوعِ تحقیق بنا کر یاروں نے سارے جھگڑے ختم کر دیے ہیں اور تحقیق کو بے حرمت کرنے کا پورا انتظام کر لیا ہے۔(ص174)

11۔ابھی تک ہمارے پاس ایسے اہلِ نظر موجود ہیں جو اس کام کو انجام دے سکتے ہیں۔یہ پچھلے موسمِ بہار کی آخری فصل ہے۔(ص191)

12۔یا پھر آزاد کی نثر،جس میں افسانہ وافسوس کی طلسمی اثر تھا۔قصے کہانیوں سے متاثر ذہنوں کو اور شعریت کے مارے ہوئے مزاجوں کو اس کی شادابی سب سے زیادہ فرحت افزا محسوس ہوتی تھی۔(ص194)

13۔شبلی کا بے کراں اور بے اماں جذباتی مزاج(ص195)

14۔شرر کے تاریخی ناول ماضی کی دل کش کہانیاں سنا کر ذہنوں کو کچھ دیر کے لیے یا بہت دیر کے لیے پر سکوں گھنے سایوں کی طرف کھینچ لے جایا کرتے تھے جہاں حقیقی زندگی کے بے رحم اور تعاقب کرنے والی سچائیوں کا گزر نہیں ہو پاتا تھا۔یہ داستانیں ٹوٹے ہوئے دلوں اور بکھرے ہوئے ذہنوں کو عافیت دشمن کڑوی سچائیوں کی بے رحمی سے کچھ دیر کے لیے نجات بخش دیا کرتی تھیں۔(ص196-195)

15۔آندھی میں چراغ جلانا اور اسے روشن رکھنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں،ہاں چراغ سے چراغ جلانا آسان ہے۔(ص200)

16۔مرصع کاری اور انشا پردازی کو ہمارے ادب میں شروع ہی سے بہت اہمیت حاصل رہی ہے۔یہ ایسا نغمہ ہے جسے کوئی ترشی نہیں اتار پائی۔(ص204)

17۔جہاں استعاروں کی جگمگاہٹ اور شعری ٹکڑوں کی مرصع کاری مغالطہ آفرینی کا کام انجام دیتی ہے۔(ص206)

کیا فرماتے ہیں خاں صاحب اب قاضی صاحب کے اس فرمان کے بارے میں جس کی ستائش ان اقتباسات کے عنوان میں کی گئی ہے۔میں غالب کے شعر میں خفیف سی ترمیم کے ساتھ عرض کرتا ہوں

اتنی	تو	ہو	بیاں	میں	محقق	شگفتگی
ہم	قارئین		قلقل	مینا	کہیں	جسے

اور رشید حسن خاں کے بیان میں جا بجا یہ قلقل مینا سنائی دیتی ہے۔کاش میں بھی یہ گل پاشی کر سکتا۔

حرفِ آخر...مولانا عرشی تدوین کے معلم اول تھے۔انھوں نے اصول و طریق تدوین کے بارے میں کوئی درس نہیں دیا،اپنے عملی شاہ کاروں کی زبان ساکت سے سب کچھ کہہ دیا۔رشید حسن خاں بلاشبہ تدوین کے معلم ثانی ہیں۔انھوں نے درس بھی دیا اور کئی عملی نمونے بھی پیش کیے۔ان کے اصول و ضوابط ایسے پختہ اور مکمل ہیں جن پر انگلی اٹھانا شریعت تحقیق میں گناہ و کفر کے مساوی ہوگا۔انھوں نے اپنی دقیق سوچ سے کیسی کیسی جزئیات کی طرف توجہ دلائی ہے۔متن کو تیار کرتے وقت شوشوں کی صحت کا خیال رکھا جائے مثلاً صبا نہیں صبا(ص58)یا جس عہد کا متن ہے اس زمانے میں املا کا احوال معلوم کیا جائے(ص59)؛قدیم اساتذہ تحریر کے شخصی مختارات کا علم ہونا چاہیے(ص59)؛ہر صورت میں اصل مآخذ سے اشعار وغیرہ کے متن کا مقابلہ کیا جائے(ص75)جن لفظوں میں تلفظ کے تغیرات رونما ہوئے ہیں،ان کے متعلق کہیں نہ کہیں معلومات مل سکتی ہیں(ص83)فرہنگ تیار کرتے وقت اگر مرتب مختلف دروازوں پر دستک دے تو ہر تہذیبی اصطلاح کے مفہوم کی تفصیلات ضرور معلوم ہو سکتی ہیں(ص170)وغیرہ۔

اس طریق پر کام کیا جائے تبھی تحقیقی متن تیار ہو سکتا ہے۔میں ان میں سے ہر تجویز کے حق میں ہاتھ اٹھاتا ہوں لیکن میرے سامنے مشکل یہ ہے کہ اس مکمل ضابطہ تدوین پر عمل کیا جائے تو صرف ایک مدون ہی یہ فریضہ انجام دے سکتا ہے۔اس کا نام ہے رشید حسن خاں۔مجھے اس بار کو اٹھانے والا کوئی دوسرا مظلوم و مجہول دکھائی نہیں دیتا۔خاں صاحب مثالیت کے علاوہ،اعلا پر ہوتے ہیں یا زمین پر ہیں تو ہاتھی دانت کے مینار میں بسیرا جمائے ہوئے ہیں،وہ عملی دنیا سے غافل ہیں۔مجھے اس کی توقع کم ہے کہ اعلا درس گاہوں سے غیر متعلق کوئی شخص تدوین کا کام کرے گا الا ماشاءاللہ اور درس گاہوں میں ایسا عالم فاضل دکھائی نہیں دیتا جو اس کارِ بے فیض میں ہاتھ ڈالے۔بالغرض کوئی اس صلاحیت و اہلیت والا مردِ کامل مل بھی جائے تو وہ ایسے شوشوں اور اعراب و علامات والی ایک تدوین دس سال سے کیا کم میں سرانجام دے سکے گا۔

ہندستان میں اُردو کی جو حالت ہے اسے دیکھتے ہوئے کون اسکالر اور کون پختہ کار محقق ایسی پتے ماری کرے گا۔اقلیم ادب میں ایک دو تاج محل بنانے سے زیادہ مفید ہوگا کہ متوسط طبقے والوں کے لائق بہت سے مکان بنا دیے جائیں۔مکمل تحقیقی متن کو برصغیر میں کتنے لوگ گہرائی سے پڑھیں گے۔ضرورت یہ ہے کہ طلبا اور عام قارئین کے لیے تخلیقی ادب کی ایسی کتابیں تیار کر دی جائیں جن کا متن بڑی حد تک قابلِ اعتماد ہو خواہ اس میں مفصل مقدمہ،اختلاف نسخ اور ہر طرح کے ضمیمے نہ ہوں۔اختلاف نسخ کو پڑھتا کون ہے؟خاں صاحب نے فسانۂ عجائب کے جو مفصل اختلافات نسخ تیار کیے ان کا کیا حشر ہوا؟کوئی چھاپنے والا نہ ملا۔

ترقی اُردو بورڈ نے خاں صاحب سے کلیات میر مرتب کرنے کی فرمائش کی۔خاں صاحب نے 30 نسخوں کی فہرست بنا کر بھیج دی کہ ان کے عکس منگوا کر بھیج دیے جائیں۔(ص190)نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی۔اگر وہ آٹھ دس بہترین مآخذ پر قناعت کرتے تو شاید کوئی ادارہ انتظام کر دیتا۔خاں صاحب کے مکمل تحقیقی معیار کا نتیجہ یہ ہوا کہ کام ہو ہی نہ سکا۔یا کھائے گھی سے،یا جائے جی سے،میں کہتا ہوں،خاں صاحب اپنے اصولوں میں ذرا لچک پیدا کیجیے،عملی دنیا سے آنکھیں چار کیجیے اور قدرے کم معیار کو بھی برداشت کیجیے تا کہ کام آگے بڑھ سکے۔میں تو اپنے دور کی کم از کم دو درجن تدوینوں سے مطمئن ہوں کہ ان سے اہلِ تحقیق کا کام تو چل رہا ہے۔ہاں کوئی عالم اور ادارہ چند مثالی تحقیقی متون تیار کرا سکے تو مجھ سے زیادہ کوئی خوش نہ ہوگا۔

میری تجویز پر خاں صاحب کو تکلیف ہوگی۔میں چوں کہ ان کا مداح ہوں اس لیے ان کے عتاب کا ہلاہل پینے کے لیے تیار ہوں۔

(ماہ نامہ کتاب نما،مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،نئی دہلی،جلد 40،شمارہ 3،مارچ 2000،صفحہ 7 تا 18 تک اس مضمون کی پہلی قسط شائع ہوئی۔دوسری قسط کتاب نما کے جلد 40،شمارہ 5 مئی 2000،صفحہ 9 تا 30 پر شائع ہوئی۔)

☆۔اس مضمون کو پروفیسر گیان چند جین نے 'گیان چند' کے نام سے اور (USA)23-Nevada Irvine-CA-92606 کے پتے سے 'کتاب نما' کے لیے ارسال کیا۔

OOO

ظفر احمد صدیقی

فسانۂ عجائب مرتبہ رشید حسن خاں

ہر دور میں تدوینِ متن کے معیاری و مثالی نمونے اُنگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ عمل غیر معمولی محنت و مشقت اور جاں کاہی وجگر کاوی کا طالب ہے۔ بقول غالب ع عشق نبرد پیشہ طلب گار مرد۔ دوسرے اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے بعض مخصوص صلاحیتیں درکار ہیں: ذکاوت وذہانت، وسعتِ معلومات، اسالیب زبان و بیان سے گہری واقفیت وغیرہ۔ اور ظاہر ہے کہ قیام ازل نے ان علمیات وموہبات کو کبھی عام نہیں فرمایا۔ تیسرے شہرت ونا موری اور صلہ وستایش کے امکانات بھی اس قسم کے خاموش علمی مشاغل میں کم ہیں۔ گویا یہ سودا نفع بخش بھی نہیں، تاہم تحقیق وتدوین کا دشتِ پُر خار فرزانہ دیوانوں سے بالکل خالی بھی نہیں رہا ہے۔ چناں چہ دیوانِ غالب مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی، غبار خاطر مرتبہ مالک رام اور کربل کتھا مرتبہ مالک رام ومختار الدین احمد کا شمار تدوینِ متن کی قابلِ قدر اور لائقِ تحسین کوششوں میں کیا جاسکتا ہے۔ ادھر اس سلسلے کا تازہ ترین کارنامہ جناب رشید حسن خاں نے فسانۂ عجائب کی ترتیب وتدوین کے ذریعے انجام دیا ہے۔ بل کہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ ان کا یہ کام بعض حیثیتوں سے منفرد اور عدیم النظیر ہے۔

فسانۂ عجائب مرتبہ رشید حسن خاں کی اشاعت انجمن ترقی اُردو ہند، نئی دہلی کی جانب سے عمل میں آئی ہے۔ یہ اعتبارِ ضخامت 719 صفحات پر مشتمل ہے۔ ابتدا میں ڈاکٹر قمر رئیس کے پیش لفظ اور جناب خلیق انجم کے حرفِ آغاز کے بعد صفحہ 15 سے 114 تک مرتب کتاب کا وقیع مقدمہ ہے، جسے کمیت وکیفیت ہر دو لحاظ سے ایک مستقل تصنیف کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔ اس میں ترتیب وتدوین متن کے اصول وآداب بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ رجب علی بیگ سرور کے ضروری سوانح، فسانۂ عجائب کی وجہ تصنیف وزمانۂ تصنیف، بیان لکھنؤ کے اختلافات، میرامن اور باغ و بہار کا قضیہ، ضمنی داستانیں اور زبان وبیان جیسے عنوانات پر بھی مختصر لیکن جامع گفتگو کی گئی ہے۔ لیکن یہ تمام مباحث بہ قول مرتب ضمنی ہیں! مقدمۂ کتاب میں انھوں نے جس موضوع پر کھل کر بحث کی ہے، وہ اس کتاب کے مطبوعہ نسخوں کا مفصل ومبسوط تعارف اور ان کی حیثیت کا تعین، اس کے مطالعے سے بے تکلف یہ نتیجہ برآمد کیا جاسکتا ہے کہ مرتب کتاب اپنے موضوع پر پوری طرح حاوی اور اپنے راستے کے نشیب وفراز سے کماحقہٗ آگاہ ہے۔

مقدمۂ کتاب کے بعد فسانۂ عجائب کا متن سامنے آتا ہے۔ اس کے لیے صفحات کی از سرِ نو ترتیب قائم کی گئی ہے۔ پاکیزہ جلی خط میں 19 سطری مسطر پر یہ 346 صفحات کو محیط ہے۔ اس متن کی بنیاد مطبع افصل المطابع لکھنؤ کے 1280ھ کے اڈیشن پر رکھی گئی ہے۔ کیوں کہ یہ سرور کا آخری بار نظرِ ثانی کیا ہوا متن ہے اور اس میں یہ سابقہ متون کے مقابلے میں اضافے بھی ہیں اور لفظی تبدیلیاں بھی۔

کسی متن کو بنیاد بنانے کا مطلب عام طور پر یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ اس کے جملہ اغلاطِ کتابت وطباعت اور تصنیفات وتحریفات کو متنِ کتاب میں داخل کرلیا جائے اور دوسرے نسخوں کے اختلافات حواشی کتاب میں درج کردیے جائیں۔ رہا یہ سوال کہ ان میں صحیح ترین متن کون سا ہے؟ تو اس کے تعین کی ذمے داری قاری پر ڈال دی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کسی متن کو مرتب کرنا فعلِ عبث اور طویلِ لاطائل ہے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ جناب رشید حسن خاں نے ایک نسخے کو بنیاد بنانے کے باوجود تصحیح متن کی ذمے داری خود اپنے سر لی ہے۔ میں یہاں ایک مثال پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ ابتدائے کتاب ہی کی عبارت ہے:

''سزااور حمد وثنا، خالقِ ارض وسما، جل وعلا، صانع بے چوں چرا ہے۔''

مصنف کے بنیادی متن میں ''جل وعلا'' کے بجائے ''جل وعلیٰ'' تحریر ہے۔ مزید برآں مطبع حسنی طبع اول 1255ھ مطبع حیدری لکھنؤ 1262ھ مطبع حسنی لکھنؤ، طبع دوم 1263ھ مطبع افضل المطابع محمدی کان پور 1276ھ اور مطبع نول کشور لکھنؤ 1283ھ میں بھی اسی طرح مرقوم ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس جگہ ''علا'' بامعنی اور برمحل ہے اور ''علیٰ'' لغو وبے معنی ہے۔ لہٰذا ''اعلا'' کو متن میں جگہ دی گئی اور ''علیٰ'' کو اختلاف نسخ کے ذیل میں درج کیا گیا۔

تصحیح متن کے علاوہ متن کی ترتیب میں اس کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے کہ ہائے ملفوظ اور ہائے مخلوط نیز یائے معروف اور یائے مجہول کی کتاب میں تفریق برتی جائے۔ اسی طرح مشدد حروف پر تشدید کا اور کسرۂ اضافت وتوصیف کے مواقع پر زیر کی کتابت کا التزام کیا جائے۔ پیراگراف قائم کیے جائیں۔ ضروری مقامات پر اعراب لگائے جائیں۔ نیز رموز واوقاف اور علامات کی پابندی بھی کی جائے۔

متنِ کتابت کے بعد ضمیموں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ یہ تعداد میں سات ہیں اور بڑے کام کے ہیں۔ بل کہ سچ تو یہ ہے کہ طلبا سے زیادہ اساتذہ کے لیے لائقِ استفادہ ہیں۔ پہلے ضمیمے کا عنوان ہے ''نثر ہائے خاتمۂ کتاب۔ مرزا رجب علی بیگ سرور کی عادت تھی کہ وہ جب بھی اشاعت جدیدہ کے لیے کتاب پر نظرِ ثانی کرتے تو اصل کتاب میں حذف و اضافہ سے قطع نظر خاتمۂ کتاب کی نثر بھی لکھتے۔ جناب رشید حسن خاں نے پیشِ نظر ضمیمے میں ایسی پانچ نثروں کو جمع کر دیا ہے۔ چوں کہ خاتمۂ کتاب کی یہ پانچوں نثر میں سروؔر کے قلم کا ثمرہ ہیں اور فسانۂ عجائب ہی کے تعلق سے وجود میں آئی ہیں لہٰذا انھیں یکجا کر دینا معقول و مناسب بھی تھا اور مفید بھی۔

دوسرے ضمیمے کے لیے ''تشریحات'' کا عنوان اختیار کیا گیا ہے۔ اس ضمیمے میں مرتب کے متن کی تدوین و ترتیب کے سلسلے میں اپنی ترجیحات کے وجوہ سے بحث کی ہے۔ اس کے علاوہ موقع بہ موقع بعض دوسری اطلاعات بھی فراہم کی ہیں۔ درحقیقت اصل متن سے زیادہ اس ضمیمۂ تشریحات سے ہی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مرتب نے کتاب کے ایک ایک فقرے بل کہ ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف پر کس قدر توجہ صرف کی ہے اور صحیح متن تک پہنچنے کے لیے کیسے کیسے ہفت خواں طے کیے ہیں۔ یہ ضمیمہ باریک خط اور 25 سطری مسطر کے 31 صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے لیے اس کے بعض اقتباسات کا نقل کرنا ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔

(الف) ''اے مرغ خوش خو و طائر زمرد لباس سرخ رو'' اس ٹکڑے کو دو طرح پڑھا جاسکتا ہے اور دونوں قرأتیں بجائے خود درست ہوں گی: (طائرِ از مرد لباس، سرخ رو (2) طائر زمرد لباسِ سرخ رو۔ دوسری صورت کو محض اس لیے ترجیح دی گئی کہ اس مکمل جملے کے آہنگ کا تقاضا یہی معلوم ہوتا ہے (اے مرغ خوش خو و طائر زمرد لباسِ سرخ رو، بذلہ سنجِ بے رنج)

اس کی تائید اس طرح بھی ہوتی ہے کہ ک (یہ مطبع محمدی کان پور 1267ھ) میں یہ ٹکڑا اس طرح ملتا ہے:

''اے مرغِ خوش خو و طائرِ سرخ رو'' اور یہاں ''طائرِ سرخ رو'' اسی قرأت کی تائید کرتا ہے، جس کو مرجح سمجھا گیا۔''

(ب) (اس دید کی خراش سے دل پاش پاش) یہاں ''دید کی خراش سے'' اور ''دید'' کے خراش سے'' دونوں طرح پڑھا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ لفظ ''خراش'' بہ لحاظ تذکیرہ و تانیث مختلف فیہ ہے (نور اللغات، رشحات صفیر، لیکن آتشا نے دریائے لطافت میں اسے صرف مونث لکھا ہے (ترجمہ دریائے لطافت ص 250) اور آصفیہ میں بھی مونث ہے۔ شوق نیموی نے رسالہ اصلاح میں لکھا ہے کہ پہلے یہ مذکر بھی آتا تھا ''مگر اکثر فصحائے حال مونث کے قائل ہیں'' (ص 21) اور اس کی تصدیق یوں ہوتی ہے کہ جلالؔ نے مفید الشعرا میں اسے مونث ہی لکھا ہے۔ ان ہی وجوہ سے یہاں اسے بہ تانیث مرجح مانا گیا ہے۔

(ج) (پلکیں دیدۂ حق بیں کا اسرار چھپانے کو، دیدۂ حاسد کی گزند بچانے کو موچھوں سے ملیں) اس جملے میں ''چشمِ حاسد کے گزند'' بھی پڑھا جاسکتا ہے اور ''چشمِ حاسد کی گزند'' بھی پڑھ سکتے ہیں۔ کیوں کہ لفظ ''گزند'' بہ لحاظِ تذکیر و تانیث مختلف فیہ ہے (نور اللغات) یہاں تانیث کو مرجح قرار دیا گیا ہے۔ اس بنا پر کہ (1) اسی کتاب میں ''برادرانِ توام'' کے قصے میں ایک جگہ واضح طور پر بہ تانیث آیا ہے۔ ''الا رسنِ حیات مضبوط تھی۔ نہ گزند پہنچے کی پہنچی، نہ چوٹ چپیٹ گرنے کی لگی۔ (2) سروؔر کی ایک اور کتاب شبستانِ سرور میں بھی یہ لفظ اسی طرح آیا ہے: ''دیر تک صدائے مبارک باد بلند رہی، لیکن سب کے دلوں میں گزند رہی'' (جلد سوم ص 32) ایک اور جملہ ہے: ''ملک سے بھی آمد بند ہوئی، ہر طرح کی گزند ہوئی'' (ایضاً ص 16)

ان اقتباسات سے ضمیمہ تشریحات کی اہمیت و افادیت نیز مرتب کی کد و کاوش کا بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

تیسرا ضمیمہ ''انتسابِ اشعار'' سے متعلق ہے۔ سروؔر نے فسانۂ عجائب میں خود اپنے اور فارسی و اُردو کے دوسرے شعرا کے اشعار بھی بہ موقع نقل کیے ہیں۔ اس ضمیمے میں ان کے انتساب سے بحث کی گئی ہے۔ جن اہل علم حضرات کو اس طرح کے کاموں کا تجربہ ہے، صرف وہی سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کیسا دشوار گزار مرحلہ تھا، جس سے جناب رشید حسن خاں کامیاب گزر گئے ہیں۔

چوتھا ضمیمہ ''اشخاص، مقامات اور عمارات'' سے متعلق وضاحتوں پر مشتمل ہے۔ یہ پوری کتاب کو محیط نہیں، بل کہ صرف دیباچۂ کتاب سے متعلق ہے اس تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ سروؔر نے دیباچۂ کتاب میں معاصر لکھنؤ کے بہت سے اشخاص نیز مقامات و عمارات کا ذکر کیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ ضمیمہ بھی خاصہ اہم اور مفید ہے۔

پانچویں ضمیمے کا عنوان ہے ''تلفظ اور املا'' اس کے تحت مرتب نے الفاظ کے املا یا اعراب کے سلسلے میں اپنی ترجیحات کے وجوہ پر روشنی ڈالی ہے۔ ذیل میں اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

ٹکٹکی: اس لفظ کے تلفظ میں اختلاف ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں ''ٹِکٹِکی'' (بہ کسرِ اول و سوم) ہے۔ اس کے برخلاف نور اللغات میں اسے ''بالفتح و فتح سوم و کسرِ چہارم'' (ٹَکٹَکی) لکھا گیا ہے۔ اثرؔ لکھنوی مرحوم نے فرہنگِ اثر میں نور اللغات کے اس اندراج پر تبصرہ کرتے ہوئے اس سے اختلاف کیا ہے اور لکھا ہے کہ ''لکھنؤ میں بہ کسرِ اول و سوم'' ہے۔ لیکن واحد الدین بلگرامی کے معروف لغت نفائس اللغات میں (جو انیسویں صدی کے ربع ثانی کی تالیف ہے) اسے (نور اللغات کے مطابق) ''بہ فتح اول و سکونِ دوم و فتح تائے ہندی و کسرِ کاف تازی و سکونِ تحتانی معروف'' لکھا گیا ہے۔

نفائس اللغات اور پھر نور اللغات کے اندراج سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اودھ کے علاقے میں یہ لفظ بہ فتح اول و سوم مستعمل تھا۔ بعد کو بہ کسرِ اول و سوم کی جانب رجحان بڑھتا گیا۔ اثرؔ مرحوم کا اختلاف اسی بدلتے ہوئے رجحان کی نشان دہی کرتا ہے۔ دہلی کے اطراف میں غالباً شروع ہی سے یہ لفظ بہ کسرِ اول و سوم مستعمل رہا ہے۔

نفائس اللغات کے اندراج کی بنیاد پر اس کتاب یعنی فسانۂ عجائب، جس کا زمانہ تصنیف اسی عہد سے تعلق رکھتا ہے، اس لفظ کو بہ فتح اول و سوم مرجح سمجھا گیا ہے۔ نور اللغات کا اندراج اس کی توثیق کرتا ہے۔

چھٹا ضمیمہ ہے ''الفاظ اور طرقِ استعمال'' اس ضمیمے کا مقصد خاص طور پر ایسے الفاظ اور عبارتوں کی نشان دہی کرنا ہے جن کے استعمال کو سروؔر یا ان کے عہد کے ساتھ خاص سمجھنا چاہیے۔ مثلاً:

''تیر دعا بدفِ اجابت سے لبِ معشوق ہوا۔''

''نشۂ شباب سے چکنا چور ہے۔''

''سیکڑوں داؤں منجے گئے۔''

''چرچا مچا۔''

''گردش میں دورِ شراب ناب آیا۔''

''سانحہ'' (بہ معنی منظر)
''جہل خانہ'' (بہ معنی جیل خانہ)
''گوشت کے چچے۔''
یہ ضمیموں کی زبان پر کام کرنے والوں کے لیے نہایت مفید ہے۔

ساتواں ضمیمہ ''اختلافِ نسخ'' کا ہے۔ اصلتاً یہ 87 صفحات پر مشتمل تھا اور پوری کتاب کے اختلاف نسخ کی نشان دہی کرتا ہے۔ لیکن کتاب کی ضخامت سے گھبرا کر اسے مختصر کر دیا گیا۔ چناں چہ پیش نظر ضمیمے میں صرف دیباچۂ کتاب کے اختلافات درج کیے گئے ہیں۔ ہماری نظر میں یہ حذف و اختصار مناسب نہ تھا۔ دراصل یہاں ضرورت مصلحت پر غالب آ گئی ہے۔ حالاں کہ ہونا برعکس چاہیے تھا۔

ان معرکہ آرا ضمیموں کے بعد بھی خاں صاحب کا اشہب قلم نہ تھکا نہ رُکا۔ لہٰذا انھوں نے قارئین کے شوقِ ہل من مزید کی تسکین کے لیے فرہنگِ الفاظ بھی شاملِ کتاب کر دی ہے۔ یہ الف، ب، ج، تین حصوں میں منقسم ہے۔ (الف) میں متنِ کتاب کے قابلِ تشریح مفردات و مرکبات کے معانی بیان کیے گئے ہیں۔ (ب) میں عربی فقروں اور عبارتوں کے ترجمے تحریر کیے گئے ہیں۔ (ج) فارسی اشعار اور فقروں کے ترجمے پر مشتمل ہے۔ آخر میں متنِ کتاب کے اشخاص و اماکن کا اشاریہ بھی تیار کر دیا گیا ہے۔

بعض مقامات پر مرتب کی رویوں سے اختلاف بھی ممکن ہے مثلاً:

''سزاوارِ حمد و ثنا، خالق ارض و سما... صانع بے چون و چرا ہے'' (ص 1) ''صانع'' پر کسرۂ اضافت لگایا گیا ہے، لیکن اس کی ضرورت نہیں ہے۔ کیوں کہ (بے چوں و چرا کا صانع) بے معنی ہے۔ اسے بدونِ اضافت ''سانع بے چون و چرا ہے'' پڑھنا چاہیے۔ نحوی ترکیب کے لحاظ سے یہ خبر واقع ہو رہا ہے۔

''اسی شہر میں ایک شخص تھا مجستٹن نام
نہایت اہلِ دَوَل، مرفہ حال'' (ص 159) اس جملے میں ''دَوَل'' بہ فتح اول لکھا گیا ہے۔ اسے ''دُوَل'' بہ ضم اول لکھنا چاہیے۔

فرہنگ میں ''بِنَاتِ نعش'' بہ کسر اول لکھا گیا ہے۔ اسے بہ فتح اول لکھنا چاہیے۔ بعض الفاظ شاملِ فرہنگ ہونے سے رہ گئے ہیں۔ مثلاً:

''مرغ کی زیر بریانی تر تراتی کبھی ایسی نہ کھائی تھی'' (ص 277) ''زیر بریانی'' وضاحت ضروری تھی، لیکن یہ فرہنگ میں شامل نہیں ہے۔ (''لکھنؤ کا دسترخوان'' از مرزا جعفر حسین طبع اول 1980 میں ص 121 پر اس سے متعلق تفصیلات درج ہیں)

بہر حال یہ معمولی اور جزوی باتیں ہیں۔ درحقیقت جناب رشید حسن خاں ایسے مہتم بالشان اور عہد آفریں کارنامے کے لیے مبارک باد اور شکریے کے مستحق ہیں۔

(ماہ نامہ کتاب نما، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، مارچ 1991، صفحہ 45 تا 49)

○○○

<u>ڈاکٹر فوزیہ بانو</u>

رشید حسن خاں کا شمار اس دور کے قدآور محققوں میں ہوتا ہے۔ ان کی معلومات بہت وسیع تھیں اور وہ ہر دور کے اُردو ادب اور اس کی جزئیات پر عبور رکھتے تھے۔ انھیں تحقیق میں شہرت ان کے تبصروں سے ملی۔ جب مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ تاریخ ادب اُردو کی پہلی جلد شائع کی تو رشید حسن خاں نے اس پر بے لاگ تبصرہ کیا اور کتاب کی صدہا ایسی خامیاں سامنے لاکر رکھ دیں جن سے کتاب کی آبرو جاتی رہی اور یونی ورسٹی نے اس کتاب کو سرد خانے میں ڈال دیا۔ یہ کتاب دراصل مختلف اساتذہ کے مضامین کا مجموعہ تھی اور اساتذہ میں باہمی ربط نہیں تھا کہ متعلقہ موضوعات پر تبادلۂ خیال کر لیتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنین کی بے انتہا غلطیاں راہ پا گئیں اور جہاں تک تعین زمانہ کا سوال ہے تو وہ موشگافیوں کا شکار ہو گیا۔

تحقیق وہ فن ہے جس میں محقق صرف اسی کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ بہ قول قاضی عبدالودود ''وہ شخص سوائے کھانے اور تحقیق کرنے کے دوسرا کام نہ ہو وہی تحقیق کر سکتا ہے۔'' (خود قاضی صاحب اپنے اس قول کی مثال ہیں) اور قاضی صاحب کا یہ قول رشید حسن خاں صاحب پر من وعن صادق آتا ہے۔ ان کے کارنامے اُردو تحقیق کی دُنیا میں قابلِ قدر ہیں۔ یہ فہرست سازی کا موقع نہیں لیکن انھوں نے جس کتاب پر بھی تحقیقی نظر ڈالی اس کی اہمیت دو چند بڑھ گئی۔ اُردو داستانوں کی بات کریں تو فسانۂ عجائب اور باغ و بہار ان دونوں داستانوں کے ذکر کے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ دونوں کی اپنی الگ الگ ادبی لسانی اور تاریخی اہمیت ہے۔ لیکن ایک پہلو مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ ان دونوں کو ''منشائے مصنف'' کی طرح پیش کرنے کا شرف ایک ہی شخصیت کو حاصل ہے اور وہ ہیں رشید حسن خاں۔ ان داستانوں کی تدوین کا حق انھوں نے کیوں کر ادا کیا، مندرجہ ذیل اقتباس میں اس کا جواب ملتا ہے:

''باغ و بہار کی طرح کتاب بھی اعلا نصابی ادب کا حصہ رہی ہے اور رہنا چاہیے تاکہ طالب علم اس کی نثری روایتوں کو صحیح طور پر سمجھ سکیں۔ یہ بات خاص کر ہمارے ذہن میں رہنا چاہیے کہ یہ صرف ایک قصہ یا مختصر داستان نہیں، یہ ایک روایت کا نقطۂ آغاز ہے اور یہ دہلی لکھنؤ کے لسانی جھگڑے کا پہلا باب ہے۔ ''باغ و بہار'' اور ''فسانۂ عجائب'' صرف دو کتابیں نہیں، یہ دو مختلف اور مستقل اسلوب ہیں اور تقابلی مطالعے کے بغیر ان دو اہم اسالیب کو اور ان کے پس منظر کو سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ اسی اہمیت کے پیشِ نظر اس کتاب کا انتخاب کیا گیا ہے۔'' [1]

سرور کی پہلی تصنیف فسانۂ عجائب کے متعدد اڈیشن شائع ہوئے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ ایک مقبول داستان تھی۔ جسے لکھنؤ کی نمایندہ تصنیف کہا جا سکتا ہے جس کی تاریخی و ادبی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ پہلی بار سرور کے قلم سے دلّی کی بالادستی پر ضرب لگایا اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے۔ غرض انھوں نے دلّی کی لسانی بالادستی اور لسانی یکتائی کو ماننے سے انکار کر دیا۔ احتشام حسین نے ان الفاظ میں اس کی اہمیت کو پیش کیا ہے:

''سرور کی اس حیثیت سے نئے لکھنوی ادب کا پہلا اہم نمایندہ کہا جا سکتا ہے، جس نے صرف ایک مخصوص اسلوب پیش کر کے اس تفریق اور خود مختاری پر مہر لگا دی، بل کہ واضح طور پر دہلی کے ادبی انداز کی سخن گسترانہ چشمک کا موضوع بھی بنایا۔ اس حیثیت سے بھی سرور کا مطالعہ بڑی تنقیدی اہمیت رکھتا ہے۔'' [2]

متن کی تحقیق طلب بھی ہے اور اس میں کافی وقت بھی صرف ہوتا ہے۔ رشید حسن خاں سے بہتر اس پہلو کو کون جانتا ہوگا۔ فسانۂ عجائب پر جب وہ کام مکمل کر چکے تھے اور تکمیل کے مرحلے پر پہنچے ایک اور نسخہ ملا۔ جس کا انھوں نے از سر نو مطالعہ کیا اور پھر فسانۂ عجائب کی تدوین کا کام مکمل کیا۔ فسانۂ عجائب کے متعدد اڈیشن خود سرور کی زندگی میں شائع ہو چکے تھے۔ سرور نے بار بار اس کے متن میں تبدیلی کی۔ اس قدر تبدیلی کی کہ نیا نسخہ بن گیا اور ایسے میں متن کی ترتیب کو اس طرح پیش کرنا کہ اس کا حق ادا ہو جائے، آسان کام نہ تھا۔ رشید حسن خاں نے اس پر کام شروع کیا تو اصول متن کے مختلف پہلوؤں کو ذہن میں نقش کر لیا تھا:

''تدوین کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی متن کو ممکن حد تک منشائے مصنف کے مطابق پیش کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس میں بنیادی حیثیت صحتِ متن کی ہوتی ہے۔ مصنف نے آخری عبارت کس طرح لکھی تھی۔ یہ سب سے اہم مسئلہ ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بنیادی بات ضرور ذہن میں رہنا چاہیے کہ عبارت ہو یا ایک جملے کا ایک ٹکڑا یہ سب الفاظ کا ایک مجموعہ ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے ہر لفظ کا تعین مرتب کی ذمہ داری ہے۔ لفظ مجموعہ ہوتا ہے حرفوں کا، اور یوں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر حرف کا تعین اس ذمہ داری میں شامل ہے۔ اس لحاظ سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ الفاظ تعین اور ان کی صورت نگاری کی صحتِ متن میں اصل حیثیت ہوتی ہے۔ [3]

رشید حسن خاں نے جب اس مشکل کام کو شروع کیا تو نہ صرف یہ کیا کہ اس کے متن کو ترتیب دیا بل کہ ایک طویل مقدمہ بھی پیش کیا اور پھر اصل متن کو پیش کرنے کے بعد سات ضمیمے شامل کیے ساتھ ہی فرہنگ اور اشاریہ بھی پیش کیا۔ رشید حسن خاں کا ایک اپنا الگ انداز ہے کہ جہاں انھیں مصنف کے قول سے اتفاق نہیں اس کو بے باکی سے ظاہر کرتے ہیں۔ سرور کا یہ کہنا ہے کہ اس داستان کی تخلیق کا سہرا ان کے دوست کے سر ہے جس کی فرمائش پر انھوں نے اپنے خیالات کو الفاظ کا جامہ پہنایا۔ لیکن رشید حسن خاں اس سے پوری طرح متفق نہیں۔

''دونوں باتیں ممکن ہیں۔ صاحب فرمائش نے کوئی معمولی سا جملہ کہا ہو اور سرور نے اسے اپنے انداز میں ڈھال کر چپکا دیا ہو (اور بات کا بتنگڑ بنا دیا) یا پھر ان کے افسانہ تراش اور داستان سرا ذہن نے بات کہنے کے لیے اچھا پیرایہ تراشا ہے۔ ذاتی طور پر مجھے آخری بات کچھ زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔ [4]

فسانۂ عجائب کے ایک ایک پہلو پر انھوں نے محنت کی۔ دیباچہ کا مطالعہ کرنے کے بعد اس بات کو بڑے واضح انداز میں پیش کر دیا کہ یہ دیباچہ کتنے مرحلوں میں لکھا گیا ہے اور اپنی عرق ریزی سے یہ ثابت کر دیا کہ دیباچہ مربوط نہیں ہے۔ فسانۂ عجائب کا نام آتے ہی جو بات سب سے پہلے ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ ایک مشکل داستان ہے۔ رشید حسن خاں نے بہت سلیقے سے اس غلط فہمی کا ازالہ کیا اور اس امر پر روشنی ڈالی کہ یہ بات حقیقت سے بہت دور ہے۔ ان کا وسیع مطالعہ کہتا ہے کہ سرور نے جس اسلوب کو اختیار کیا وہ تو اس دور کا خاص انداز تھا، ساتھ ہی ان کا نظریہ بھی یہی ہے:

''یہ داستان لکھنؤ کو اس معاشرے کے لیے لکھی گئی تھی جہاں داستان سرائی کی روایت کو پسندیدگی کی سند حاصل ہو رہی تھی اور جہاں مرصع سازی کو کمال فن سمجھا جانے لگا تھا۔'' [5]

وہ بڑے وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ اس میں ہر حال میں ہنر کا پلّہ بھاری رہے گا اور شاید اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ زبان و بیان کے ہر پہلو سے بہرہ ور تھے۔ تحقیق کی کسوٹی پر کھرا اترنے کے لیے جو خوبیاں ہونی چاہئیں وہ ان میں بدرجہ اتم موجود تھیں [illegible] فسانۂ عجائب کی زبان و بیان کے حصے میں انھوں نے بار بار اس بات پر زور دیا کہ کلاسکی ادب سے شناسائی اور تربیت یافتہ ذوق کی ضرورت

ہے ورنہ سرؔور کا انداز بے جان لفظوں کا کھیل نظر آئے گا:

''اس کی اصل وجہ یہ ہے ہمارے دور کی عمومی کم استعدادی فارسی زبان سے ناواقفیت اور کلاسیکی اسالیب سے کم آشنائی، مصنف جس معاشرے کا فرد تھا، اس معاشرے کے لوگوں کے لیے جو لکھنے پڑھنے سے تعلق خاطر رکھتے تھے، یہ طرز ادا غیر معمولی نہیں تھا۔ مصنف نے اپنے زمانے کو پیش نظر رکھ کر یہ کتاب لکھی تھی، اس بات کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ 6

غرض فسانۂ عجائب کی زبان مشکل ہے یہ الزام انھیں قطعی برداشت نہیں، غور سے مطالعہ کیا جائے تو اس کے کچھ حصے سادگی سے پُر ہیں لیکن دوسرے حصے کے متعلق وہ اپنی بے لاگ رائے دیتے ہیں:

''دوسرا انداز وہ ہے جہاں علمیت کا رنگ ذرا گہرا دکھائی دیتا ہے۔ 7

متن کی تدوین میں لسانی پہلو کا ذکر کرنا ناگزیر ہے، یا یوں کہہ لیں اس کی خاص اہمیت ہے شاید اسی لیے وہ زبان اور انداز کے پہلو پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے چلے جاتے ہیں۔ قافیہ بندی کا پہلو تو سرؔور کا ہنر ہے۔ کہیں کہیں اسی سے زبان کا لطف جاتا رہا۔ انھوں نے اس کی خامیوں کا ذکر کیا۔ انھیں اس میں کچا پن اور پھوہڑ پن نظر آتا ہے۔ لیکن اس کی وجہ بھی بیان کر دیتے ہیں کہ یہ ان کی ناتجربہ کاری یا کم مشقی کی وجہ سے ہے، لیکن پھر بھی فسانۂ عجائب کے اسلوب کے ضمن میں ان کا قلم اس بات کو اہمیت دیتا ہے کہ زبان ایک خاص دور کی نمایندگی کرتی ہے:

''زبان کے لحاظ سے بھی اس سے جھول تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ اکھڑے اکھڑے سے جُملے تو اچھی خاصی تعداد میں مل جائیں گے، حسن بیان کا رنگ بھی کئی جگہ اُڑا ہوا دکھائی دے گا۔ لفظ کا بے محل صرف بھی ملے گا اور ایسا پیرایۂ بیان بھی ملے گا۔ جس کو بے کمالی کی نشانی کہا جا سکتا ہے۔ یہ سب مسلم اور برحق، مگر بات وہی ہے کہ یہ کتاب محض ایک داستان نہیں، صرف زبان کا نگار خانہ نہیں، یہ دراصل ایک اسلوب کا دوسرا نام ہے اور اصل حیثیت اُس اسلوب کی تھی اور ہے آج ہم اپنے زمانے اور ذہن کے لحاظ سے جو بھی کہیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ لکھنؤ کا وہ معاشرہ اسی انداز کا پرستار اور اسی اسلوب کا دل دادہ تھا۔'' 8

رشید حسن خاں کی متن پر بڑی گہری نظر ہے کوئی جملہ اُن کی تحقیقی نظر سے بچ کر نکل نہیں سکتا، وہ ایک لفظ پر گھنٹوں بل کہ ہفتوں غور کرتے اور پھر جا کر کوئی نتیجہ برآمد کرتے ہیں۔ دراصل وہ بتانا چاہتے ہیں کہ تحقیق کرنے والوں کو تحقیق کی مبادیات سے واقف ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر عقیل رضوی رشید حسن خاں پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''ادبی تحقیق میں رشید حسن خاں معتبر حوالوں، فارسی مآخذ کی صحیح نشان دہی اور اہمیت، تدوین و تحقیق کا رابطہ اور صحت متن وغیرہ پر خاصہ زور دیتے ہیں۔ رشید حسن خاں اپنے اصولوں میں خاصے سخت اور خاصے محتاط ہیں۔ تحقیق میں کسی طرح کی بے اصولی کو برداشت نہیں کر سکتے اور احتساب کے قائل ہیں۔ یہاں تک کہ خوردہ گری کی منزل تک چلے جانے میں انھیں کسی طرح کا تکلف نہیں ہوتا۔ ان کا خیال ہے کہ تحقیق میں کسی تساہلی یا نامعقولیت کو برداشت کر لینا، گویا آنے والی نسلوں کو گمراہ کرنا ہے۔'' 9

فسانۂ عجائب کے متن کی تدوین کے سلسلے میں انھوں نے اپنا طریقۂ کار، بہت واضح انداز میں پیش کر دیا۔ انھوں نے آٹھ نسخوں پر غور و خوض کیا پھر کسی نتیجے پر پہنچے۔ محقق کے اوصاف کے سلسلے میں پروفیسر گیان چند جین کی یہ رائے رشید حسن خاں کے متعلق بہت درست معلوم ہوتی ہے:

''وہ ایسا مبصر ہے کہ چمک دار کندن کو بھی کسوٹی پر رگڑے بغیر کبھی ایمان نہیں لاتا۔ وہ ایسا مصنف ہے جو عینی شاہدوں کو بھی جرح اور تجزیے کے بغیر قبول نہیں کرتا'' 10

رشید حسن خاں کی نظر میں 1259ھ میں میر حسن رضوی کے مطبع حسنی سے شائع اڈیشن ہے اس کو ثابت کرنے کے لیے وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ 1263ھ میں جب یہ اڈیشن اس مطبع سے دوبارہ شائع ہوا تو اس پر ''بار دوم'' لکھا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ ایک اور نسخہ عنایت (ل میں شامل عنایت حسین کے قطعے سے بھی) اس دلیل کو تقویت ملتی ہے۔ اس نسخے کے املا کے پہلوؤں کا بھی انھوں نے باریک بینی سے جائزہ لیا ہے۔ دوسرا مطبوعہ نسخہ جس کا ذکر وہ ''م'' سے کرتے ہیں مصطفےٰ خاں کے مطبع میں شائع ہوا تھا۔ اس نسخہ کے متن پر نظر کرتے وقت انھیں بارہا اس بات کا احساس ہوا کہ پہلے مطبوعہ اڈیشن (1259ھ) نسخہ ''ح'' سے اس کا متن مختلف ہے۔ جس کی انھوں نے نشان دہی کی اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ناشر کے پاس نسخہ ''ح'' کے علاوہ بھی کوئی نسخہ ضرور موجود تھا۔ تیسرے نسخے یعنی مطبع حیدری لکھنؤ کے سلسلے میں بار باران کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ سرؔور کا مرتب اور تصحیح کیا ہوا نسخہ نہیں ہے اور سرؔور نے اس کو طبع کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا لیکن بعد میں تجارتی نقطۂ نظر سے شائع کیا گیا:

''مسودہ پریس میں رہ گیا یوں دو تین سال کے بعد مطبعے نے اپنی تجارتی اغراض کے بہ طور خود اس کو چھاپ لیا۔ یہ محض قیاس ہے لیکن بعید از امکان نہیں اور اس نسخے کو غیر مشکوک ماننے کے لیے ایسے ہی امکان کو ماننا لازم ہے۔'' 11

سرؔور کے باضابطہ نظر ثانی کرنے کے بعد جو نسخہ طبع ہوا وہ مطبع رضوی ہی کا چھپا ہوا ہے جس کے متعلق وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس مطبع میں اس کتاب کا کوئی ایسا نسخہ بھی موجود تھا جو ان مذکورہ نسخوں سے مختلف تھا۔ ایک کامیاب محقق کی پہچان یہ ہے کہ وہ اپنی بات کو دلیلوں کے ساتھ ثابت کرے۔ اس نسخے کے سال طبع کو لے کر جو دو تاریخیں ہیں اس پر وہ ''باغ و بہار'' کا حوالہ دیتے ہیں جس کے سرورق پر 1803 درج ہے جب کہ آخری صفحہ پر 1804 درج ہے۔ ایسا کاتب کی غلطی یا طباعت ختم ہونے کی تاریخ دونوں میں سے کچھ بھی ممکن ہے۔ انھوں نے متن کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور وہ نسخہ جو کان پور کے مطبع محمدی سے شائع ہوا اور اس کے سلسلے میں وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ سرؔور نے اس پر اس قدر نظر ثانی کی کہ یہ ایک نیا نسخہ بن گیا۔ اس کے علاوہ نسخہ ''ف'' بھی ان کی نظر میں سرؔور کا نظر ثانی کیا ہوا نسخہ ہے لیکن ساتھ ہی نسخہ ''ن''، جو منشی نول کشور کے یہاں 1867 میں چھپا ہے سرؔور کا نظر ثانی کیا ہوا نسخہ نہیں ہے۔ سرؔور کے جس نسخہ کا متن انھوں نے شائع کیا اس کا تعارف وہ نسخہ ''ل'' کی صورت میں کراتے ہیں جو انھیں خدا بخش لائبریری سے قاضی عبدالودود کے توسط حاصل ہوا تھا۔

رشید حسن خاں نے صرف ان نسخوں کے متن پر تحقیقی نظر ڈالی بل کہ ساتھ ہی ان کے صفحات، سطریں، روشنائی ان سب کے متعلق بھی مواد فراہم کیا۔ تحقیق بے پایاں ریاضت اور محنت کا نام ہے۔ رشید حسن خاں کے یہاں یہ صفات بہ درجہ اتم موجود ہیں۔ تب ہی تو انھوں نے ان نسخوں پر بھی اپنا قیمتی وقت صرف کیا جن کی تدوین کے نقطۂ نظر سے کچھ اہمیت نہیں مگر قدامت کے لحاظ سے یا ایسی ہی کسی وجہ سے ان کا نام لیا جا سکتا ہے۔ فسانۂ عجائب کی تدوین میں ان کے انہماک کا اندازہ ان جعلی اڈیشنوں سے بھی ہوتا ہے جو رشید حسن خاں کی نظر سے گزرے۔ گہرائی سے نظر ڈالنے کے بعد انھوں نے وثوق کے ساتھ اس کے جعلی ہونے کے ثبوت پیش کیے۔ یہی نہیں رشید حسن خاں فسانۂ عجائب سے متعلق ہر پہلو کو ذہن میں نقش کرنا چاہتے تھے، اسی لیے انھوں نے اپنے زمانے میں شائع اڈیشن کا بہ غور مطالعہ کیا تاکہ وہ کسی مثبت نتیجے پر پہنچ سکیں اور تحقیق کا حق ادا کر سکیں۔ فسانۂ عجائب کی تدوین میں انھوں نے اپنا خون پسینہ ایک کیا۔ اس کے ضمیمے پر نظر ڈالی جائے اور وہ بھی اختلاف نسخ کا حصّہ تو اس بات پر یقین کرنا پڑتا ہے

کہ محقق کو:

''متعدد گرد آلود کتابوں اور رسالوں میں دیدہ ریزی کرنی پڑتی ہے تب بھی گوہر مقصود کبھی ملتا ہے کبھی نہیں۔'' 12

لیکن رشید حسن خاں کی خوش قسمتی ہے کہ صداقت کی تلاش میں انھیں کامیابی ہوئی۔ انھوں نے اس میں سات ضمیمے شامل کیے ہیں۔ ہر ضمیمے کے ذریعہ انھوں نے مصنف اور تصنیف دونوں کی گہرائیوں تک پہنچنے کی کوشش کی۔ پہلا ضمیمہ جس کا عنوان انھوں نے ''نثر ہائے خاتمہ'' دیا ہے۔ اس میں انھوں نے اس نثر کو جگہ دی ہے جو سرور نے کتاب کے آخر میں لکھی۔ جس سے نظر ثانی شدہ نسخے کے بارے میں معلومات حاصل ہو جائیں۔ ساتھ ہی اشاعت اوّل کے آخر میں شرف الدولہ کی مدح پر مشتمل طویل نثر ہے، وہ نثر بھی اس ضمیمہ میں شامل ہے۔ دوسرے ضمیمے میں تشریحات کا ذکر ہے جن سے فسانۂ عجائب کو سمجھنے اور سمجھانے میں آسانی ہوگی۔ تلفظ، قواعد صفت، ریت، رواج اور رسم وغیرہ کی تفصیل پیش کی ہے ساتھ ہی مستند حوالے اور دلیلیں بھی درج کی ہیں:

''ص 9 س 9: ح کے علاوہ سب نسخوں میں ''تبدیل ذائقہ'' ہے۔ ح میں ''تبدیل ذائقہ'' ہے قواعد کے لحاظ سے تو ''تبدیل ذائقہ'' ہی مرجّح ہے کیوں کہ ''ذائقہ'' ''ذائقہ'' کی مہند صورت ہے اور ایسی صورتوں میں (اب) عربی یا فارسی ترکیب کو جائز نہیں سمجھا جاتا یہ بھی واقعہ ہے کہ ایسی ترکیبوں کی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً ذوق کا یہ شعر۔

کوسوں کیا تنگیِ زمانے کو
کہ نہیں جائے سر اٹھانے کو

خود سرور کے یہاں اس کی مثالیں مل سکتی ہیں۔ اس کتاب میں ص 71 پر اُن کی غزل ہے جس کا مطلع ہے۔

توڑ کر خم اور پٹک کر آج پیمانے کو ہم
سوے مسجد جاتے ہیں زاہد کے بہکانے کو ہم

اس غزل میں یہ شعر بھی ہے۔

پر تلک تھا جس مکاں پر شمع رویوں کا ہجوم
چھانتے ہیں اب وہاں پر خاکِ پروانے کو

اور اس ''خاکِ پروانے'' کی وہی حیثیت ہے جو ''تبدیل ذائقہ'' کی ہے۔ ایک تو یوں کہ ایک کے علاوہ اور سب نسخوں میں ''تبدیل ذائقہ'' ہے اور دوسرے یوں کہ حُسن عبارت کا بھی بہ ظاہر یہاں تقاضا یہی معلوم ہوتا ہے اور یہ بھی کہ ایسی ترکیبوں کی مثالیں بہ ہر حال موجود ہیں۔ اس خاص مقام پر اسی قاعدہ صورت کو مرجّح سمجھا گیا ہے۔ اس صورتِ حال کو مستثنیات کے ذیل میں رکھا جانا چاہیے۔'' 13

ایک دوسری مثال۔

''ص 11۔ س 9 فرح بخش اور دل کُشا، یہ دونوں کوٹھیوں کے نام بھی ہیں۔ لیکن اس عبارت میں یہ لفظ بہ طور صفت آئے ہیں، اس لیے ان پر اسم خاص کی علامت کے طور پر خط نہیں کھینچا گیا۔ 14

فسانۂ عجائب میں اشعار کی کثرت ہے یہ اشعار کس شاعر سے منسوب ہیں ان کا صحیح طرز کیا ہے یا یہ کس نسخہ میں موجود ہیں۔ انتسابِ اشعار کے ضمیمہ میں انھوں نے ان سب پہلوؤں کی نشان دہی کی۔ مثلاً سرور کے استاد نوازش کے اشعار کا حوالہ دیتے وقت انھوں نے یہ بات پیش کی کہ کس طرح صرف اور صرف اس کتاب کے لیے لکھے گئے یا متن میں فسانۂ عجائب کے حسبِ ضرورت ردّ و بدل کیا گیا۔ رشید حسن خاں کی شخصیت کا خاصہ جو یہ تھا کہ وہ عجلت اور آسان پسندی کے قائل نہیں تھے۔ یہ مثال کافی ہے۔

''رستم رہا زمن پہ نہ شام رہ گیا
مردوں کا آسماں کے تلے نام رہ گیا

جس غزل کا یہ شعر ہے، وہ غزل کلیات سودا کے نول کشوری نسخے اور دیوان میر سوز، دونوں میں موجود ہے لیکن بہ قول قاضی عبدالودود صاحب ''اس غزل کا انتساب میر سوز سے مرجّح ہے (مقالہ قاضی ''سویرا'' لاہور، شمارہ 39)''۔ دیوان سوز میں پہلا مصرعہ یوں ہے:

نے رستم اب اس جہاں میں سام رہ گیا

''ل'' میں پہلے مصرعے میں ''نہ سام رہ گیا'' ہے۔'' 15

میں پہلے عرض کر چکی ہوں کے فسانۂ عجائب کے ایک ایک پہلو پر انھوں محنت کی ہے۔ دیباچہ کا مطالعہ کرنے کے بعد وہ اس بات کو بڑے واضح انداز میں پیش کر دیتے ہیں کہ یہ دیباچہ کتنے مرحلوں میں لکھا گیا اور یہ پیش کر دیا کہ دیباچہ مربوط نہیں۔ ضمیمہ میں فسانۂ عجائب کے دیباچے میں مختلف مقامات، عمارتوں، شخصیتوں کا تعارف اور معلومات فراہم کیں اور تحقیق کا نمونہ پیش کیا۔ نذیر احمد نے محقق کے اوصاف کو بیان کیا ہے:

''ایک کامیاب محقق ایک جامع صفات انسان ہوتا ہے اس کے لیے سائنس داں کا دماغ، انشا پرداز کا قلم، نقاد کی فکر و نظر، مورخ کا ذہن اور عالم زبان کی بصیرت درکار ہے اور اس کا مطالعہ وسیع ہونا چاہیے۔ اس کی قوتِ تمیز مقررہ بھی بہت زیادہ ہونی چاہیے۔'' 16

ضمیمہ تلفظ اور املا کی صرف دو مثالیں اس ضمن میں پیش ہیں:

''سڈول'' (ص 305) سب نسخوں میں اس کا املا ''سُو ڈول'' ہے۔ لیکن صحیح لفظ واو کے بغیر ''سڈول'' ہے (اس میں پہلا جز سنسکرت کا ''سُ'' ہے، جس کے معنی ہیں: اچھا (ہندی

سبد ساگر) غالباً اظہار ضمیمہ کے پُرانے انداز تحریر کے مطابق یہاں بھی پیش کے اظہار کے لیے واو لکھا گیا ہے۔ (جیسے اُس'' کو'' اوس'' یا'' دُکان'' کو'' دوکان'' لکھا جاتا تھا) اُردو لغات میں بھی'' سڈول'' ہے۔ (فرہنگِ آصفیہ، نور اللغات، سرمایۂ زبان اُردو، فیلن کا لغت) اسی بنا پر اسے واو کے بغیر لکھا گیا ہے۔''17

'' عبیر۔ ابیر (ص 7) سب نسخوں میں'' عبیر'' ہے اس لیے اسی کو برقرار رکھا گیا ہے۔ لیکن یہ وضاحت ضروری ہے کہ معنوی مناسبت کی بنا پر یہاں'' ابیر'' ہونا چاہیے یہاں مصنف کی مراد رنگ سے ہے، نہ کہ خوشبودار مرکب کا نام ہے اور'' گُلال'' کی طرح یہ بھی ہندی الاصل ہے۔ یہ'' ابیر'' جو بہ طور رنگ ہولی میں عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے، عربی والے'' عبیر'' یعنی خوش بودار مرکب سے مختلف چیز ہے۔ جلالؔ نے اپنے لغت سرمایۂ زبان اُردو میں'' ابیر'' کے ذیل میں وضاحت کی ہے کہ: اور اس لفظ کو بجائے الف عینِ مہملہ سے لکھنا، مولّف کے عندیے میں غلط ہے، اس لیے کہ یہ لغت ہندی ہے۔''

حافظ محمود شیرانی نے آئین اکبری کے حوالے سے'' عبیر'' کا نسخہ یہ لکھا ہے: تین یا دو صندل'' چھتیس تولے عدد (اگر) دو تولے اور آٹھ ماشے مشک۔ سب کو پیش کر سائے میں خشک کر لیں اور استعمال میں لائیں۔

(مقالاتِ شیرانی، جلد ہفتم، ص139) 18

حواشی

1۔ فسانۂ عجائب، رجب علی بیگ سرور مرتب رشید حسن خاں، ص22

2۔ ایضاً، ص21-20

3۔ ایضاً، ص31-22

4۔ ایضاً، ص57

5۔ ایضاً، ص64

6۔ ایضاً، ص62

7۔ ایضاً، ص62

8۔ ایضاً، ص17-16

9۔ مختصر تاریخ ادب اُردو، ترمیم شدہ سید محمد عقیل رضوی، ص536

10۔ تحریریں، گیان چند جین، ص11

11۔ فسانۂ عجائب رجب علی بیگ سرور مرتب رشید حسن خاں، ص86

12۔ تحریریں گیان چند جین، ص11

13۔ فسانۂ عجائب رجب علی بیگ سرور مرتب رشید حسن خاں، ص367

14۔ فسانۂ عجائب رجب علی بیگ سرور مرتب رشید حسن خاں، ص369

15۔ فسانۂ عجائب رجب علی بیگ سرور مرتب رشید حسن خاں، ص409

16۔ تحقیق و تدوین، سید محمد ہاشم، ص69

17۔ فسانۂ عجائب رجب علی بیگ سرور مرتب رشید حسن خاں، ص481

18۔ فسانۂ عجائب رجب علی بیگ سرور مرتب رشید حسن خاں ص490

(ماہ نامہ نیا دور لکھنؤ، گوشۂ رشید حسن خاں، جلد62 نمبر9، دسمبر 2007 صفحہ 39 تا44)

OOO

ڈاکٹر عادل احسان

''تلاش و تعبیر'' اور ''تفہیم'' کا اجمالی جائزہ

رشید حسن خاں نے دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریوں، بربادیوں اور ہولناکیوں کے پرآشوب دور کے بعد اپنی علمی زندگی کا آغاز کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جس میں ادب سے متعلق بہت زیادہ تلاش وجستجو نہیں ہوئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ادب کا سنہری دور تھا مگر کچھ محقق و نقاد اس راہ میں اپنی خدمات انجام دے رہے تھے۔ لیکن جس ادب کی ضرورت عوام کو تھی وہ انھیں نہیں مل پا رہا تھا۔ اسی تلاش وجستجو کو ذہن میں رکھ کر رشید حسن خاں نے تحقیق و تدوین کے میدان میں قدم رکھا۔ اور اپنے مشاہدے سے یہ بات ثابت کر دی کہ بغیر تحقیق و تنقید کے کوئی بھی ادب اپنے اصلی روپ میں وجود میں نہیں آ سکتا۔ جس کی وقت کے ساتھ لوگوں کو بے حد ضرورت ہوتی ہے۔ ان ہی سب باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انھوں نے ادب کی صحیح اصطلاح کے ساتھ اس کے قواعد کو منظّم کرنے پر زور دیا۔ جس سے ادب کو ایک بلند مقام حاصل ہو جائے۔ یہ کام تبھی اپنے پایۂ تکمیل تک پہنچ سکتا ہے جب تک اس میں نئی نئی تجاویز پیش نہ کی جائیں۔ ان سب کے باوجود رشید حسن خاں کی تحریروں میں بعض جگہ مولانا محمد حسین آزاد، علامہ شبلی، نیاز فتح پوری اور حالی کا نظریہ صاف طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ انھوں نے ان کی تحریروں سے فائدہ اٹھا کر اپنی تحریروں میں جان پیدا کی۔ اس طرح انھوں نے اپنی تحقیق و تنقید کے ذریعہ ادب کو وہ معیار اور اعتبار دینے کی کوشش کی۔ لیکن یہ کام اسی وقت اپنے عروج پر نظر آ سکتا ہے جب تک اسے اس کے اصل روپ میں عوام کے سامنے نہ لایا جائے۔ رشید حسن خاں اپنے علمی تحقیق سے حقائق کے بعض معروضی جانچ پرکھ، منطقی استدلال اور سائنسی تجربے کی روشنی سے ادب میں ایک نیا انقلاب برپا کر دینا چاہتے ہیں۔ جس سے مشرق و مغرب کے مابین پیدا ہونے والے اصول وضوابط اور اصول تحقیق سے ادبی دنیا میں ایک نیا جنون وجود میں آ جائے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ان کے تحقیقی حقائق کی جستجو اور آ سانیوں نے لوگوں کے دلوں میں علم کے چراغ روشن کیے جس سے خاص و عام کو یہ فہم عطا ہوئی کہ کس طرح تحقیق کے فن اور تنقیدی سرمایہ ایک نئے انداز سے قارئین کے اذہان کو متاثر کر سکتا ہے۔ اسلم پرویز رشید حسن خاں کی تحقیقی و تنقیدی لیاقت اور صلاحیت کی وضاحت کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ''تحقیق اور متنی تنقید رشید حسن خاں کے دو خاص میدان ہیں۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ اعلا پائے کی تحقیق اور تنقید کے نمونے ہمارے سامنے پیش کیے بل کہ تحقیق اور متنی تنقید کے اصول وضوابط پر کتابیں بھی تالیف کی ہیں۔ اس طرح وہ تحقیق اور عملی تحقیق دونوں کے مردِ میدان ہیں۔ ان کے تحقیقی قول و عمل میں تضاد ڈھونڈ نکالنا مشکل ہے اور یہی دراصل کسی شعبۂ علم میں خصوصی مہارت کے صحیح معنی ہیں۔ اکثر ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض لوگ تھیوری کے تو بڑے ماہر ہوتے ہیں لیکن عملی طور پر جب وہ خود کچھ کرنے بیٹھتے ہیں تو کوئی مثالی کام انجام نہیں دے پاتے۔ دوسری طرح کے لوگ وہ ہیں جو خداداد صلاحیت کے بل پر اچھا کام تو سر انجام دے لیتے ہیں لیکن نئے کام کرنے والوں کی تربیت کی صلاحیت ان میں نہیں ہوتی۔ رشید حسن خاں کا امتیاز یہی ہے کہ دونوں محاذوں پر چاق و چوبند ہیں'' 1

علم و ادب کی دنیا میں رشید حسن خاں کئی اعتبار سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ یہ ماہر لسانیات کے ساتھ قواعد اور املا پر اپنی گہری نظر رکھے ہوئے ہیں۔ گرچہ یہ شاعر نہیں لیکن ان کی شعر فہمی قابلِ ذکر ہے۔ جس سے ان کی تحریروں میں بلا کا بانکپن دیکھا جا سکتا ہے۔ بیسویں صدی کے نصف آخری دہائی میں تحقیق و تنقید کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو ان میں رشید حسن خاں کا نام ممتاز ہوگا۔ یہ تنقید و تحقیق کے درمیان حائل ہونے والے ان تحریری فرق کو واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جن میں تنقیدی صداقت، تنقیدی تعبیرات کے ذریعہ کچھ نئے جواز تلاش کرنے کی جدوجہد کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تنقید کے میدان میں ایک ہی مسئلہ کو دو نقاد دو طرح سے پیش کرتے ہیں لیکن وہیں تحقیق کے نقطۂ نظر سے بات کی جائے تو اس میں نقاد نہیں ملتے۔ کیوں کہ تحقیق ایک مسلسل عمل کا نام ہے۔ جس میں ہر طرح کی تحقیق کی گنجایش ہوتی ہے اور اس سے ان میں نئی نئی دریافتیں بھی سامنے آتی ہیں۔ ایسی صورت میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کون سی حقیقت کتنے پردوں میں چھپی ہوئی ہے اور ان کا آپس میں تعلق اتفاق اور اختلاف سے بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس اگر رشید حسن خاں کے رجحان کو ترقی پسند تحریک کے حوالے سے دیکھا جائے تو اس میں تضاد پایا جاتا ہے۔ کچھ ماہرین یہ مانتے ہیں کہ ان کا شروعاتی دور اس تحریک سے جڑا ہوا تھا۔ مگر بعد میں اس سے الگ ہو گیے۔ اس سے الگ ہونے کی وجہ وہ یہ بیان کرتے تھے کہ اس تحریک کا عوامی سطح پر زیادہ زور نہیں تھا۔ اس کے بڑے بڑے رہنما اپنی ذہنی اور عملی زندگی میں مکمل طور پر سرمایہ دارانہ گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ جس کی وجہ سے وہ ترقی پسند تحریک سے بعد میں علاحدہ ہو گئے۔

''تلاش و تعبیر''، رشید حسن خاں کے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ ہے جو 1988 میں شائع ہوا۔ اس میں کل سترہ مضامین شامل ہیں۔ جس کا پہلا مضمون 'دوہرا کردار' ہے۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر بہت زیادہ تضاد ہے۔ اس تضاد کی وجہ یہ ہے کہ دہلی یونیورسٹی میں فرقہ وارانہ موضوع پر ایک سمینار منعقد ہوا۔ جس کا مقصد یہ تھا فرقہ وارانہ فسادات سے عوام و خاص کو بچایا جائے اور انھیں یہ تاکید کی گئی کہ ایسی باتوں سے پرہیز کریں جن سے سماج میں بگاڑ پیدا نہ ہو۔ اس کام کے لیے ایسے اساتذہ، شاعروں اور ادیبوں کا انتخاب کیا گیا، جو اس کام کو صحیح طریقے سے انجام دے سکیں۔ مگر افسوس کہ یہ اپنے فرض سے ایک دم پیچھے ہٹ گئے۔ جب کہ عوام کو سب سے زیادہ اعتبار انھیں لوگوں پر تھا۔ مگر یہ اپنے کام کو بخوبی انجام نہیں دے پائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں دوریاں بڑھنی شروع ہو گئیں اور آج یہ ایک دوسرے کے سب سے بڑے دشمن بن بیٹھے ہیں۔ اگر یہ استاد، شاعر اور ادیب اپنے فرائض کو اچھی طرح سے نبھا پاتے اور اپنے ضمیر کو نہیں بیچتے تو شاید ہندوستان کی تصویر کچھ اور ہوتی۔ بعض مقام پر یہی تینوں عوام کو یہ سبق پڑھاتے ہیں کہ سبھی کے ساتھ برابر کا سلوک کرو۔ اگر کسی پر ظلم وستم ہو تو اس کے خلاف مشترکہ طور پر اپنی آواز بلند کریں۔ مگر وہی سب بعد میں کچھ پیسوں کے لالچ میں آ کر اپنے ضمیر تک کو نیلام کر دیتے ہیں۔ اگر ہندوستانی سماج میں استاد کے حوالے سے بات کی جائے تو انہیں سب سے اعلا سمجھا جاتا ہے۔ یہ استاد اپنے سبھی طالب علموں کو نصیحت کرتے ہیں کہ ہمارا قلم ضمیر کی آواز کے نقش و نگار کو صحیح ڈھنگ سے نبھاتا ہے۔ جو دولت اقتدار اور گروہ بندی کے فائدہ اٹھانے کے لیے کچھ نئی تجویز تلاش کرنے کی طرف مائل کرتے ہیں۔ سبھی استاد اپنے طالب علموں کو سچ بات بولنے کی تاکید کرتے ہیں اور یہ کہتے پھرتے ہیں کہ سچ بولنے والوں کو دنیا ہمیشہ سزا دیتی ہے۔ یہ مضمون دراصل ان لوگوں کے کردار پر روشنی ڈالتا ہے۔ جو انتہائی معمولی قیمت پر اپنا قلم اور اپنا ذہن بیچنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ رشید حسن خاں نے یہ بات بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں کہی تھی۔ ٹھیک ایسا ہی نظارہ آج کل ہندوستان میں بھی دیکھنے کو مل رہا ہے۔ جس میں ہر کوئی تھوڑے سے فائدے کی خاطر اپنے کردار کو نیلام کر دینا چاہتا ہے۔ دہرے کردار کی

ایک خوبی یہ بھی دیکھی جاتی ہے کہ وہ اپنے اظہار کے وسیلے کو بے حد پرفریب انداز میں بیان کرتا ہے۔ جس سے اس کے مزاج کی منافقت برقرار رہے۔ اور قاری کچھ سوچنے پر مجبور ہو جائے۔

اس مجموعہ کا دوسرا مقالہ 'محمد علی جوہر: ایک جذباتی رہنما' ہے۔ رشید حسن خاں نے اس مضمون میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ محمد علی جوہر ایک ایماندار، اخلاص پرست، جاں نثاری، سچائی اور سرفروشی کے علمبردار انسان تھے۔ یہ ہندوستانی سیاست اور مسلم قوم دونوں کے لیے فخر کی بات ہے کہ انھوں نے اپنی تقریروں کے ذریعہ قوم میں ایک جذباتی روپیدا کر دی تھی۔ جس سے یہ بکھری ہوئی قوم ایک پلیٹ فارم پر آ جائے۔ ہندوستان کے مسلم معاشرے میں جذباتیت کا جو عمل و دخل پایا جاتا ہے۔ اس کی کہیں نہ کہیں جھلک ان کے یہاں دیکھنے کو مل جاتی ہے۔ رشید حسن خاں نے اس مضمون میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جس طرح مغلیہ سلطنت اپنے زوال کی طرف بڑھ رہی تھی، کچھ ویسا ہی نظارہ آج کل ہندوستانی سیاست میں مسلم رہنماؤں کا دیکھا جا رہا ہے۔ ان کی اس میدان میں کم رہنمائی اس بات کی علامت ہے کہ یہ معاشرہ رفتہ رفتہ اپنے حاشیہ پر آ کھڑا ہو جائے گا۔ جس کا ہندوستانی سماج میں کوئی نام لینے والا بھی نہیں بچے گا۔ اس کے برعکس خلافت تحریک کے تحت مولانا محمد علی جوہر نے جس تحریک کا آغاز کیا تھا۔ اس سے آہستہ آہستہ لوگ جڑنا شروع ہو گئے تھے۔ ابتدا میں اس تحریک کا جو رول تھا اس پر یہ صحیح چل رہے تھے۔ لیکن بعد میں کہیں کہیں مولانا کی تقریر جذباتی ہو جانے کی وجہ سے عوام کو اس کا خمیازہ بھی اٹھانا پڑا۔ ان کے عہد سے شروع ہوئی سیاست دھیرے دھیرے خرابی کی شکل اختیار کرنے لگی۔ مغلیہ سلطنت کے خاتمہ کے تقریباً ڈھائی سو سال پہلے شروع ہوئی یہ خرابی، آج دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے۔

'جوش کی شاعری میں لفظ اور معنی کا تناسب' کے عنوان کو رشید حسن خاں نے اپنی کتاب میں شامل کیا اور ساتھ ہی ساتھ ان کی شاعری پر طنز بھی کیا۔ ان کا ماننا ہے کہ جوش نے بعض جگہ ایسے لفظوں، استعاروں اور تشبیہوں کا ذکر کیا۔ جس سے ان کی شاعری میں وہ چاشنی پیدا نہیں ہو پائی جس کے وہ مستحق تھے۔ پھر بھی جوش اپنے کلام میں لفظی اسقام کا استعمال کثرت سے کرتے تھے۔ جس سے ان کے اشعار کی شکل وصورت اور معنویت دونوں بری طرح مجروح ہو جاتی تھی۔ بعض جگہ لفظوں کو اکٹھا کرنے کی دھن میں وہ یہ بھی بھول جاتے تھے کہ ایک شاعر کے لیے صحیح وغلط، مناسب اور غیر مناسب پر نظر رکھنا ضروری ہے یا نہیں۔ ان سب نظریات سے پرے جوش کے کلام کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید یہ شروع میں میر انیس اور نظیر اکبرآبادی سے متاثر رہے ہوں گے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے نظیر کے کلام سے لفظوں کی کثرت اور انیس کے یہاں سے تشبیہوں اور استعاروں کی جگمگاہٹ لے کر اپنی تحریروں میں منظر نگاری پیدا کی۔ جس سے ان کی شاعری میں بعض جگہ ایک نیا آہنگ پیدا ہو گیا۔ علاوہ ازیں جوش کے ساتھ ایک بڑی مشکل یہ بھی تھی کہ انھوں نے باقاعدہ علم حاصل نہیں کیا تھا، بل کہ ایسی طبیعت پائی تھی جو کم ہی لوگوں کو میسر ہوتی ہے۔ اس وجہ سے ان کے اندر سنجیدگی کم اور سوچ وفکر دور کی نسبت زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ قدرت نے انھیں شعر گوئی کی صلاحیت سے مالا مال کیا۔ ان کی فطرت میں وہ صلاحیت اور قوت تخیل بھی شامل تھا۔ جن کی وجہ سے وہ ہر مناظر اور مظاہر کے ذیل میں پیدا ہونے والی جزئیات نگاری کو بڑی آسانی سے پہچان لیتے تھے۔

رشید حسن خاں نے 'فیض کی شاعری کے چند پہلو' مضمون میں فیض کی شاعری کے بعض پہلو میں جو کمیاں اور خوبیوں دیکھیں ان کی تصدیق پورے وثوق کے ساتھ بیان کر دیں۔ جس سے ان کے تغزل کا رنگ و آہنگ آہستہ آہستہ عوام کے دلوں میں بیٹھ جائے اور قاری اسی رنگ وروپ میں ڈھل کر اپنے لیے کچھ نئے راستے تلاش کر سکے۔ فیض کا یہی طرز بیان اور خوبی انھیں دوسرے شاعروں سے امتیازی وصف عطا کرتی ہے۔ جس سے ان کی شاعری میں تعبیرات کی ندرت اور تشبیہوں کی جدت کو خاص مقام حاصل ہو جاتا ہے۔ رشید حسن خاں نے فیض کی رومانیت اور اشتراکیت سے دل چسپی کو ان کی ذہنی اپج بتایا ہے۔ جس کا نمونہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری کا سفر رومانیت سے شروع کیا اور دھیرے دھیرے اشتراکیت کے ہنگاموں سے قریب ہوتے چلے گئے۔ ان کے مزاج میں انقلاب پسندی کا جو رجحان غالب تھا۔ اس سے یہ اپنی بلندی پر جا پہنچے۔ فیض کی شاعری میں جو کمزور ترین پہلو تھے۔ رشید حسن خاں نے اس کی نشان دہی بھی کی جن میں زبان وبیان کے ساتھ ان کے کمزور پہلو کا احاطہ بھی کیا۔ وہیں دوسری طرف انھوں نے ان کی شاعری کی خامیاں بھی گنائیں۔ جس میں تشبیہوں اور استعاروں کا استعمال، زبان کی نکات سے ناآشنا اور بیان کے اسرار نے ان کے کلام کو دوبالا کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ فیض کے کلام کو پڑھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی شاعری کا دائرہ بہت تنگ ہے۔ ان کی نگاہ میں یہ دنیا صرف قید خانہ اور انسانی تصور ماتم اور آزادی تک محدود نہیں۔ بل کہ یہ انسانوں کو اپنی سچی بات کہنے کا پورا حق بھی دیتی ہے۔ دوسری طرف اگر فیض کے مجموعوں کی بات کی جائے تو اس کی ایک الگ ہی پہچان ہے۔ جیسے 'نقش فریادی' میں جو غزلیں ہیں۔ ان میں ہر سطح پر کچاپن پایا جاتا ہے۔ اسی طرح 'دست صبا' کی غزلوں میں کچھ ٹھہراؤ سا ہے تو 'زنداں نامہ' کی غزلیں سیاسی اشاریت میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوتی ہیں، وہیں 'دست تہہ سنگ' کی غزلوں میں مشکل پسندی، دقت طلبی، خشونت اور بے رنگی کے اثرات نمایاں طور پر دکھائی پڑتے ہیں۔ ان سب مجموعوں کا احاطہ کرنے پر اندازہ ہوتا ہے کہ کہیں نہ کہیں فیض کی شاعری میں مختلف زمانوں کی پرچھائیاں اپنا عکس چھوڑ گئی ہیں۔

'فانی۔ شہید احساس' میں رشید حسن خاں نے فانی کی شاعری کے حوالے سے بات کی ہے۔ انھوں نے ان کی شاعری کو غم آہنگ سے تعبیر کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فانی کے یہاں جہاں ناامیدی اور مایوسی کی کارگزاری دیکھنے کو ملتی ہے۔ وہیں دوسری طرف ان کی شاعری زندگی کے دائرے ابتدا سے الگ راہ پر چلتی ہوئی دیکھائی دیتی ہے۔ جس سے ان کی شاعری میں بعض جگہ دو طرح کے پہلو ابھر کر سامنے آ جاتے ہیں۔ ان میں ایک کا رشتہ جہاں غم والی شاعری سے ہے تو وہیں دوسرے کا تعلق ناامیدی ونامحرومی سے ہے۔ رشید حسن خاں کے خیال کے مطابق فانی اپنی شاعری میں جس قدر دنیا سے بیزار نظر آتے ہیں۔ اس طرح کی بیزاری ان کی نظموں میں کہیں دیکھنے کو نہیں ملتی۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی نظموں کے مقابلے شاعری کو زیادہ ترجیح دی۔ علاوہ ازیں بعض محققوں کا خیال ہے کہ فانی اپنی زندگی میں حسن کے جلوؤں اور اس کی لذتوں سے کبھی محروم نہیں رہے۔ جس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ انھوں نے اضطراب اور فطرت کے جز سے ہمیشہ اپنی طبیعت کو آراستہ کیا۔ رشید حسن خاں کی تحقیق کے مطابق فانی کی زندگی میں کبھی کوئی غم نہیں آیا جو انھیں پریشانی میں مبتلا کر سکے۔ اور اگر کبھی آیا تو وہ کچھ پل کے لیے ہی ان سے جڑا رہا۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ فانی کی شاعری میں فطرت کی دور بینی، حیرت اور حسرت کے جو عناصر پائے جاتے ہیں۔ ان میں کہیں نہ کہیں ان کے مزاج کا بہت بڑا رول رہا ہے۔

رشید حسن خاں نے اپنے مضمون 'چکبست بہ حیثیت نثر نگار اور بہ حیثیت نقاد' میں چکبست کی شاعری اور ان کے بعض تنقیدی پہلو کی وضاحت کو بڑے خوب صورت انداز میں پیش کیا۔ جس کی روشنی میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ انھوں نے ان کی سخن فہم نثر نگاری اور اعلا تنقیدی شعور کو نہایت ہی عمدگی کے ساتھ صفحہ قرطاس پر بکھیر دیا ہے۔ رشید حسن خاں کی تحقیق کے مطابق یہ بات ہر خاص وعام جانتا ہے کہ چکبست ایک اچھے نثر نگار ہونے کے ساتھ ساتھ شاعری کے میدان میں اپنی ایک الگ شناخت رکھتے تھے۔ ان کی شاعری میں ایک طرف جہاں میر انیس کی شاعری کا عکس جھلکتا ہے تو وہیں دوسری طرف محمد حسین آزاد کی نثر کا نمایاں انداز بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ان کے یہاں ان دونوں کی خصوصیات صاف طور پر اپنا اثر دکھا رہی ہیں۔ اس کے برعکس چکبست کی اصل پہچان 'مثنوی گلزار نسیم' والے معرکہ سے مانی جاتی ہے۔ معرکہ گلزار نسیم میں چکبست نے اپنے حریفوں کے مقابلے اپنی علمی سنجیدگی اور ادبی معیار کو خوب پھیلایا۔ انھوں نے اس مثنوی کے متعلق اپنی علمی بحث کم لیکن تمسخر اور تضحیک کی پھلجھڑیاں کچھ

زیادہ ہی چھوڑی ہیں۔ جس کی وجہ سے ادب میں ان کو وہ مقام نہیں مل سکا جن کے وہ مستحق تھے۔ پھر بھی دوسری صنف میں ان کے کارناموں کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

سیماب اکبرآبادی کی حیثیت ایک باکمال استاد کے ساتھ ساتھ ایک قادرالکلام شاعر کی ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ خاص وعام میں خوب جگہ بنائی۔ جن کی وجہ سے ان کے بہت شاگرد پیدا ہوگیے۔ ان کے ان شاگردوں نے ان کی شاعری کو خوب پھیلایا۔ جس کی وجہ سے ان کا کلام عام لوگوں کے ساتھ ساتھ ادبا تک آسانی سے جا پہنچا۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ سیماب اکبرآبادی زبان و بیان کے لحاظ سے ادب میں اپنا ایک الگ مقام رکھتے تھے۔ ادب میں جس طرح دبستانِ دہلی، دبستانِ لکھنؤ کا بازار گرم تھا۔ اسی طرح انھوں نے بھی دبستانِ آگرہ کی بنیاد ڈالی۔ جن میں اس مفروضے کے مصنف اور مبلغ بھی شامل تھے۔ اس مفروضہ دبستان میں شعرا کی کچھ امتیازی خصوصیات تھیں۔ جو اپنی شعری روایت کو خاکہ کی شکل میں تیار کرتے تھے۔ رشید حسن خاں نے اپنے مقالہ ’سیماب اکبرآبادی بہ حیثیت غزل گو‘ کے حوالے سے سیماب کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ان کی کمیوں کی بھی نشان دہی کی۔ ان دونوں نظریات کی روشنی میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ان کی شاعری میں قوت فکر اور شاعرانہ صلاحیت کی جو خوبیاں ہیں۔ اس سے ان کی بلند آہنگی کا پتا چلتا ہے۔ علاوہ ازیں جذبۂ شاعری ان کی طبیعت میں رچا بسا تھا۔ جس سے انھوں نے اصلاحی، اخلاقی اور افادی شاعری کا نعرہ بلند کیا۔

’جوہر کی شاعری‘ پر رشید حسن خاں نے اپنے تنقیدی نظریات پیش کیے ہیں۔ ان کی شاعری کا سرمایہ وہ غزلیں ہیں۔ جن میں حب الوطنی اور قوم پرستی کی بلند آہنگی پائی جاتی ہے۔ یہ جوش بیان سے معمور اپنے اسلوب سے شاعری کے دائرہ میں ایک نئی وسعت پیدا کر دیتے ہیں۔ جس سے زبان کی چستی و پرکاری میں ایک نیا آہنگ ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔ مولانا محمد علی جوہر کے یہاں جذبے کی شدت اور صداقت دونوں موجود ہے۔ اس لیے ان کے بعض شعروں میں شعلوں کی حرارت اور انسانی جذبہ کی روانی پائی جاتی ہے۔ جو خاص وعام دونوں کے اندر جوش وخروش پیدا کرنے کی لیے کافی ہے۔ ان کے بعض اشعار جس زمانے میں کہے گئے۔ اس دور میں حالات کی ہنگامہ آفرینی اور کہنے والے کی صداقت بیانی صاف طور پر قاری کو متاثر کرتی رہی ہوگی۔ رشید حسن خاں کا ماننا ہے کہ ان کے لب ولہجے میں جو جھنکار و آہنگ پایا جاتا ہے۔ وہ محض انداز بیان کا کرشمہ نہیں بل کہ لفظوں کا کھیل ہے۔ جو لوگوں کے دلوں پر راج کرنے لگتا ہے۔ یہ اپنے انقلابی شعروں سے عوام کو ایک پلیٹ فارم پر لا کر ان میں اپنے حق کی آواز بلند کر دینا چاہتے تھے۔ ان کی نگاہ میں سب سے بڑا انسانی فریضہ یہ تھا کہ کس طرح اپنے ملک وقوم کو ان ظالم حکمرانوں سے آزاد کرایا جائے۔ جو رات دن ان کے اوپر ظلم کرتے ہیں۔ ان کا اپنے قوم کے لوگوں سے یہ مطالبہ تھا کہ اے سوئے ہوئے وطن کے باشندوں اب اٹھ جاؤ نہیں تو یہ حکمراں تمہیں کہیں کا نہیں چھوڑیں گے۔

جعفر زٹلی کے متعلق بعض تنقید نگاروں کے یہاں غلط رائے قائم تھی۔ اس لیے رشید صاحب نے اپنے مضمون ’جعفر زٹلی‘ میں دوسروں کی رائے کو درکنار کرتے ہوئے اپنے دلائل پیش کیے۔ جعفر زٹلی کے دیوان کے متعلق جو افواہیں غالب تھیں کہ اس میں صرف فحش کلامی کی گئی ہے۔ اس وجہ سے بعض تذکرہ نگاروں اور تنقید نگاروں نے بھی ان کی شاعری ونثر کو غلط سمجھ کر ان سے دوری بنائی، اور کسی نے ان کے فحش کلام پر غور وفکر تک نہیں کیا کہ کیا یہ واقعی دشنام اور پھکڑ کلام پیش کرتے تھے۔ لیکن وہیں رشید حسن خاں نے جب ان کے دیوان کی تحقیق کی تو زیادہ تر باتیں جھوٹی اور بے بنیاد معلوم ہوئیں۔ اس طرح انھوں نے ان کے کلام کے اہم پہلوؤں کی نشان دہی کی۔ جن میں سماجی حقیقت نگاری، ہجو، طنز، ظرافت، تمسخر اور سنجیدگی سب کچھ دیکھنے کو مل جاتا ہے۔ ان سب پہلوؤں کے علاوہ جعفر زٹلی نے اپنے کلام میں کہیں کہیں ہندی اور غیر ہندی زبانوں کے لفظوں کا استعمال بڑی کثرت سے کیا۔ جن میں اُردو کے قدیم الفاظ ومحاورات اور ضرب الامثال کا استعمال بڑی خوبی سے کیا۔ جس کی وجہ سے ان کی تحریریں میں بعض مقامات پر ان دونوں کا میل دیکھنے کو مل جاتا ہے۔ اس کے برعکس یہ لفاظی کے معاملہ میں نظیرا کبرآبادی سے کسی قدر کم نہیں معلوم ہوتے، تو وہیں دوسری طرف سماجی حقائق پر طنز کرنے اور معاشرے کی بدحالی کا نقشہ کھینچنے میں سودا کے زیادہ قریب تر نظر آتے ہیں۔ شہرآشوب نگاری میں جعفر زٹلی کی اپنی ایک الگ پہچان تھی۔ انھوں نے شہرآشوب کی تعریف میں کئی نظمیں بھی کہیں۔ جن کی روشنی میں رشید حسن خاں کا خیال ہے کہ انھیں پہلا شہرآشوب نگار شاعر تسلیم کیا جانا چاہیے۔

’مومن کی پیچیدہ بیانی‘ میں رشید حسن خاں نے مومن کی غزل گوئی کے حوالے سے بات کی ہے۔ ان کے خیال کے مطابق مومن کے کلام میں بعض جگہ ناسخ کا رنگ سخن اور تاثرات صاف طور پر دیکھے جا سکتے ہے۔ جس سے مومن کی شاعری ایک نئے وصف کے ساتھ آگے بڑھتی ہوئی دیکھائی دیتی ہے۔ ان کی شاعری جہاں ایک نئے شخصیت کی تہہ داری، نظر کی بلندی اور ذہانت کا پتا دے جاتی ہے۔ وہ چیز دوسرے شاعروں کے یہاں دیکھنے کو نہیں مل پاتی۔ رشید حسن خاں کے مطابق مومن کے یہاں جو معنی آفرینی کا انداز پایا جاتا ہے۔ اس میں بڑی حد تک ناسخ کا ہاتھ رہا۔ انھوں نے ناسخ کے کلام سے فائدہ اٹھا کر اپنے کلام میں بیش بہا اضافہ کیا۔ ناسخ کی اس خصوصیات کو مدنظر رکھتے ہوئے انھوں نے اپنی رعایت لفظی اور بے جا صنعت گری سے اپنے کلام کو پاک کیا۔ اگر بعض شواہد کی روشنی میں دیکھا جائے تو مومن کا مقام ادب میں ناسخ کے بعد آتا ہے۔ لیکن مومن کی شاعری کے حوالے سے بات کی جائے تو یہ ناسخ سے دو قدم آگے دیکھائی دیتے ہیں۔ مگر وہیں دوسری طرف غالب کے انداز بیان کی بات کی جائے تو ان کے یہاں بہت زیادہ پیچیدگی پائی جاتی ہے۔ اس وجہ سے بعض شعرا غالب کے کلام سے فیضیاب ہونا چاہتے تھے۔ اگر اسی طرح کی پیچیدہ بیانی مومن کے یہاں بھی ہوتی تو شاید یہ غالب سے بڑے شاعر ہوتے۔ جہاں تک مومن کے کلام کی بات ہے۔ ان کے یہاں پیچیدہ بیانی صرف لفظی ہے حقیقی نہیں۔ اس طرح دیکھا جائے تو ان کے کلام میں انداز بیان کی وہ چاشنی نہیں ملتی جیسی ہونی چاہیے۔ پھر بھی انھوں نے اپنے کلام میں ایسی ناہمواری پیدا کی۔ جن میں زبان کی فصاحت اور بیان کی لطافت نئی خوبیوں کے ساتھ اپنا رنگ بکھیرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔

رشید صاحب نے ’دیوان حالی‘ کی اشاعت کے دوران جو مقدمہ لکھا۔ اسی کو بعد میں اپنی کتاب تلاش وتعبیر میں مضامین کی شکل میں شامل کر دیا۔ ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ کسی طرح حالی کی شاعری اور نثر کو اس انداز سے پیش کیا جائے۔ جس سے دوسرے فائدہ اٹھا سکیں۔ علاوہ ازیں انھوں نے حالی کی شاعری کو تنقیدی تناظر میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ قلم بند کیا۔ تاکہ ان کی شاعری ایک نئے روپ میں منظر عام پر آجائے۔ رشید صاحب دیوان حالی کا محاکمہ کرتے ہوئے اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ حالی نے اس میں قدیم وجدید کی جو غزلیں بیان کی ہیں۔ اس کی ادب میں اپنی ایک ضمنی حیثیت ہے۔ ان کے دیوان میں جو نظمیں ملتی ہیں۔ وہ حبِ وطن کا جذبہ اور اصلاحِ قوم کا خیال رکھتی ہوئی آگے بڑھتی نظر آرہی ہیں۔ ان سب باتوں کے علاوہ انھوں نے اپنے دیوان میں مرثیوں، قطعوں اور رباعیوں سے وہی حسن پیدا کیا۔ جس میں انسانی زندگی اپنی ایک الگ پہچان رکھتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ کسی طرح مسلم معاشرہ اپنی اصلاح پر گامزن ہو جائے اور ترقی کر کے خود کو دوسرے سماج کے برابر کھڑا کر سکے۔ رشید صاحب کے خیال کے مطابق حالی نے مومن کا انداز بیان اور مصطفے خاں شیفتہ کے اثرات کو بڑی دلکشی کے ساتھ اپنے کلام میں پیوست کیا۔ ان دونوں نظریات کے باوجود انھوں نے اپنے استاد مرزا غالب کا طرز ادا لے کر اپنے دیوان کو ایک نئی بلندی عطا کی۔

’کچھ دیا شنکر نسیم کے متعلق‘ مضمون میں رشید حسن خاں نے دیا شنکر نسیم کی حالاتِ زندگی سے وابستہ بعض غلطیوں کی نشاندہی کی۔ جنھیں چکبست نے تاریخ پیدائش، سال وفات، بعض غلطیوں اور

واقعات کے ساتھ پیش کر دیا۔ جس کی وجہ سے ادب میں ایک نیا چلن پیدا ہو گیا۔ اس لیے رشید صاحب نے ان غلط واقعات کی تصدیق کر کے انھیں درست کیا۔ اور ان بے جا غلط فہمیوں کو دور کر کے اس کی صحیح اصلاح بھی کر دی۔ اس طرح انھوں نے مثنوی 'گلزار نسیم' پر ایک زبردست تحقیقی و تنقیدی مقدمہ لکھا اور اس کی تدوین کے ساتھ اس کی اصلی صورت میں شائع بھی کروا دیا۔ جو پنڈت دیا شنکر نسیم کی زندگی اور گلزار نسیم کا صحیح طور پر احاطہ کرتی ہے۔ بعض تحقیقی روشنی میں ہم سب دیکھتے ہیں کہ رشید حسن خاں نے مثنوی گلزار نسیم کی تدوین کر کے اس کو ایک نئی بلندی عطا کی۔ ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ ہر خاص و عام کو اس کے صحیح الفاظ کے ساتھ اس کے تلفظ کی صحیح جان کاری مل جائے۔ اس مثنوی کو لے کر لوگوں میں جو طرح طرح کے وہم پیدا ہو رہے تھے اسے دور کیا۔ اس طرح یہ مثنوی ہر اعتبار سے لوگوں میں بہت مقبول و معروف ہوئی۔ لیکن چکبست نے اس کی غلط اصلاح کر کے عوام کو پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ جس کی وجہ سے رشید حسن خاں کو اس کے صحیح اصلاح کی ضرورت محسوس ہوئی۔

'معراج نامہ ناسخ' میں رشید حسن خاں نے ناسخ کے والدین کے مسلک کے ساتھ ساتھ ان کی مثنوی پر اپنی نگاہ ڈالی ہے۔ انھوں نے اپنی تحقیق کے مطابق ان نشانیوں کی تصدیق کی ہے۔ جس میں ان کے والدین کی قبروں کو لے کر یہ بحث جاری و ساری تھی کہ وہ شیعہ مسلک سے تھے یا سنی مسلک سے۔ وہی کچھ محققوں کا خیال تھا کہ ناسخ کے والدین سنی مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ اس وجہ سے ان کا شروعاتی رجحان اس طرف تھا۔ لیکن بعد میں ناسخ نے شیعہ مذہب کی طرف اپنا رکھ کر لیا اور زندگی کے آخری لمحہ تک اسی مسلک سے منسلک رہے۔ دوسری طرف رشید حسن خاں اس بات کا اشارہ کرتے ہیں کہ مثنوی 'معراج نامہ ناسخ' کا ذکر قلیات ناسخ میں موجود نہیں۔ اس میں صرف دو مثنویوں کا ذکر ملتا ہے۔ ان میں پہلی مثنوی کا تعلق حضرت علیؓ سے ہے تو دوسری مثنوی 'سراج نظم' ہے۔ چوں کہ ناسخ کا رجحان زیادہ تر اپنی غزلوں اور نظموں کی طرف تھا۔ جس کی وجہ سے ان کی مثنوی میں وہ جان پیدا نہیں ہو پائی جن کی انھیں امید تھی۔ پھر بھی ان کی مثنوی معراج نامہ ناسخ دوسری مثنویوں کے مقابلے زیادہ اہم سمجھی جاتی ہے۔

'نقوش سلیمانی' سید سلیمان ندوی کے مقالات کا مجموعہ ہے۔ رشید حسن خاں نے اس کتاب کو آسانی کی خاطر چار حصوں میں تقسیم کر دیا۔ یہ سارے مضامین اپنے لحاظ سے ادب کی زینت ہیں۔ اس مقالات کے بعض مضامین میں اُردو کے متعلق بحثیں کی گئی ہیں۔ اور یہ بتلایا گیا ہے کہ کس طرح یہ زبان رفتہ رفتہ اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی ہے۔ رشید حسن خاں نے اس مضمون میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ سید سلیمان ندوی نے 'نقوش سلیمانی' کے شروعاتی حصہ میں لسانیات کے موضوع پر بحث کی ہے۔ جو آہستہ آہستہ اپنی منزل کی طرف راغب ہو رہی ہے۔ وہی دوسرے حصہ میں انھوں نے اُردو اور ہندی زبان کے لفظوں کو لے کر تاریخی بحثیں کی ہیں۔ ان کا ماننا تھا کہ کس طرح یہ ادب ایک دوسرے کے اوپر حاوی ہونے کے لیے نئے نئے پینترے بدلتا ہوا دکھائی پڑ رہا ہے۔ اس مجموعے کے تیسرے حصے میں ان مضامین کو شامل کیا گیا ہے۔ جس میں ادبی موضوعات اور بعض کتابوں کے مقدمات اپنی شگفتہ نگاری اور سخن فہمی کے باعث اپنا ایک الگ مقام رکھتے ہیں۔ اس کتاب کے چوتھے حصہ میں تلفظ کی تبدیلیوں اور ان میں دخل پانے والے دوسرے تغیرات خصوصاً عربی اور فارسی زبان کے لغت اور قواعد پر لکھی ہوئی کتابوں کی خاص نظر ثانی کی گئی ہے۔ ان سب وجوہات کی روشنی میں سید سلیمان ندوی نے یہ صاف کر دیا تھا کہ اُردو ایک زندہ اور خود مختار زبان ہے۔ جسے کبھی بھی ختم نہیں کیا جا سکتا۔

'زبان و بیان کے بعض پہلو' میں رشید حسن خاں نے شاعری کے حوالے سے بات کی ہے۔ اس میں انھوں نے لفظوں کے رکھ رکھاؤ، مناسبات کے التزام اور انداز بیان کے پیچ و خم کو شاعری کے لیے ضروری قرار دیا۔ ان کی نظر میں الفاظ کی بندش اور محض مرصع سازی بعض موقعوں پر مقصود ہے۔ جو ادب میں اپنا ایک معیار رکھتی ہے۔ مگر وہیں دوسری جانب انھوں نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان دونوں صنعت گری سے شاعری کو جتنا نقصان اٹھانا پڑا۔ شاید ہی کسی اور صنف کو ہوا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ادب میں بہت سے شعرا انتخاب الفاظ کو صحیح سلیقے سے پیش نہیں کر پاتے۔ جس سے اچھی خاصی نظمیں بے اثری کا شکار ہو کر رہ جاتی ہیں۔ انھیں اسباب کو مدنظر رکھتے ہوئے رشید حسن خاں نے شاعری میں تشبیہ، استعارہ اور صفتِ منتقلہ کے مناسب استعمال کی کچھ مثالیں پیش کی ہیں۔ اور شاعری میں ان غیر مانوس انداز بیان کو کس طرح درست کرنا ہے اس کی وضاحت بھی بیان کر دی ہے۔ بہر کیف! انھوں نے ان چند صحتِ بیان اور حسن بیان سے نقطۂ نظر کی خامیوں کی نشان دہی کی۔ جن کی وجہ سے شاعری کو زیادہ نقصان اٹھانا پڑا۔ وہ مندرجہ ذیل ہیں (۱) مناسب صفاتی الفاظ کا نہ ہونا (۲) غلط استعارے کا کثرت سے استعمال (۳) مرادف الفاظ میں سے صحیح لفظ کا انتخاب نہ کرنا (۴) فصاحت کلام کے لحاظ سے غیر مناسب الفاظ کا منتخب کرنا۔ یہ سب وہ اجزا ہیں جس کے بغیر اُردو شاعری ادھوری مانی جاتی ہے۔

'ادب اور صحافت' میں رشید حسن خاں نے اس بات کی طرف زور دیا ہے کہ یہ دونوں آپس میں تضاد رکھتے ہیں۔ اگر کوئی شخص روزانہ اخبار کا پہلا صفحہ پڑھتا ہے تو اس کو اندازہ ہوتا ہوگا کہ اخباری خبروں اور ادبی تحریروں کے مابین کیسا فرق ہوتا ہے۔ اخبار کا اڈیٹوریل اس لحاظ سے سب سے اہم مانا جاتا ہے۔ کیوں کہ یہ پورے اخبار کی جان ہوتا ہے۔ مگر دوسری جانب خبریں اس سے بالکل مختلف معلوم ہوتی ہیں۔ رشید حسن خاں کا ماننا ہے کہ اگر کسی اخبار میں فساد سے متعلق کوئی خبر چھپتی ہے، تو اڈیٹر اسی خبر کو ایک نئے موضوع کے ساتھ اڈیٹوریل کی شکل میں شائع کروا دیتا ہے۔ پھر یہی موضوع نئے نام کے ساتھ افسانہ کی شکل میں عوام کے سامنے آ جاتا ہے۔ جو ایک عرصے تک قاری کے دل و دماغ پر طاری رہتا ہے۔ لیکن وہی فساد کے موضوع پر کوئی نظم یا غزل لکھی جاتی ہے، تو وہ عوام کے عقل و خرد پر زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ پاتی۔ جس کی وجہ سے لوگ نظموں کے مقابلے افسانوں کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ اس طرح افسانہ ادب کا حصہ بن جاتا ہے۔ اور یہ دونوں تحریریں اخباری زینت بن کے رہ جاتی ہیں۔ آخر میں رشید حسن خاں اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس میں خاص و عام کو 'ادبی صحافت' اور صحافیانہ ادب کے فرق کو صحیح ڈھنگ سے سمجھنے کی وکالت کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر کوئی انسان اس کو اچھی طرح سے سمجھ نہیں پاتا، تو وہ ایسی الجھن میں مبتلا ہو جائے گا جس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔

'نصابی کتابوں کی ترتیب میں املا، رموز اوقات اور علامات کا مسئلہ' میں رشید حسن خاں نے ان سب حوالوں سے گفتگو کی ہے۔ جس میں تعلیمی نظام کے ساتھ اس کی صحیح اصلاح کا خیال رکھا گیا ہے۔ انھوں نے اس مضمون میں اس بات پر زور دیا ہے کہ بچہ اپنے تعلیمی سفر کے دوران جن صورتوں کو بار بار دیکھتا ہے اس سے ان کا ذہن، یادداشت ان سادہ اور صاف ورق کو اسی طرح اپنے دل و دماغ میں محفوظ کرنے کی کوشش میں لگ جاتا ہے۔ یہ اپنے ان ہی تعلیمی نظام کو ذہن میں رکھ کر ایک نئی سوچ پیدا کرتا۔ جن کی مدد سے وہ تعلیمی میدان میں اپنے قدموں کو جمانے کی کوشش میں لگ جاتا ہے۔ جس سے کہ ہمیں صحیح درس و تدریس حاصل کرنے کا موقع میسر ہو جائے۔ اسی کڑی میں ہم سب آگے دیکھتے ہیں کہ بعض درسی کتابوں میں جو لفظ جس ڈھنگ سے لکھا ہوتا ہے بچے اس لفظ کو اسی طرح لکھنا اور پڑھنا سیکھ جاتے ہیں۔ لیکن یہ لفظوں کے ہجے کو صحیح شکل و صورت کو اچھی طرح سے سمجھ نہیں پاتے۔ جس سے ان کا املا درست نہیں ہو پاتا۔ رشید حسن خاں نے نثر و نظم کتابوں کا حوالہ دیتے ہوئے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ بعض درسی کتابوں میں ایک لفظ کو دو طرح سے پیش کیا جاتا ہے۔ اس وجہ سے انھیں اس کی حقیقت اچھی طرح سے سمجھ میں نہیں آ پاتی۔ ان درسی کتابوں میں مختلف لفظوں کو دو طرح سے لکھا گیا ہے۔ جیسے ایک جگہ 'گذرنا' اور دوسری جگہ 'گزرنا' لکھا ہے۔ ٹھیک ایک دوسری جگہ 'ہرج' اور 'حرج' اس طرح لکھا ہے۔ رشید حسن خاں کا ماننا ہے کہ ان کتابوں کی غلطیوں کا ذمہ دار مصنف نہیں ہوتا ہے بل کہ کاتب ہوتا

ہے۔کاتب کو جس طرح پڑھایا جاتا ہے یہ لفظوں کو اسی طرح لکھتا ہے۔جس کی وجہ سے بچوں کے ساتھ بڑوں کو بھی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اس کی دوسری وجوہات یہ بھی ہیں کہ انھیں حرفوں اور لفظوں کے ساتھ صورت شناسی کے عمل سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے۔ان سب باتوں سے پرے انھیں متعدد جگہ سوالیہ نشان، ندائیہ نشان، کاما اور بیانیہ علامت وغیرہ سے بھی ناآشنا ہونا پڑتا ہے۔جس کی وجہ سے یہ بعض جملوں کو صحیح ڈھنگ سے لکھ نہیں پاتے۔علاوہ ازیں رشید حسن خاں نے بچوں کے نصاب میں صحت املا اور رموز اوقاف کے مختلف علامات کو لازمی طور پر شامل کرنے کی پرزور وکالت کی ہے۔جس سے یہ بچے 'واؤ اور 'ی' کے معروف اور مجہول آوازوں کے فرق کو اچھی طرح سے پہچان سکیں۔

رشید حسن خاں کی دوسری اہم تنقیدی کتاب ''تفہیم'' ہے جو 1993 میں منظر عام پر آئی۔اس میں ان کے وہ مضامین شامل ہیں۔جو حسب موقع کسی رسائل وجرائد اور سمیناروں کے لیے لکھے گئے تھے۔انھوں نے اس کتاب میں ایسے مصنفوں کو جگہ دی جس پر دانشور اور نقاد اپنا قلم اٹھانے سے پہلے کچھ دیر تک سوچتے ہیں۔یہ دانشور اپنی کم علم فہمی اور مشرقی شعریات بالخصوص عربی وفارسی سے لاعلمی کی وجہ سے اس سے دوری بنائے ہوتے ہیں۔اس کمی کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ آج کل زیادہ تر تخلیق کار مغربی تنقید کے زیر اثر اپنی تنقید کو پروان چڑھاتے ہیں۔جس کی وجہ سے ان کی تحریروں میں عربی وفارسی کا رجحان زیادہ دیر تک اپنا اثر نہیں دکھا پاتا۔اور پھر یہ مغربی تنقید کی طرف اپنا رخ کر لیتے ہیں۔رشید حسن خاں نے اس کتاب میں کل گیارہ مضامین شامل کیا ہے۔جو بیک وقت اپنی الگ ہی پہچان رکھے ہوئے ہے۔انھوں نے جن مصنفوں کو اس کتاب میں جگہ دی۔وہ دیگر صنف کے بڑے بڑے نقاد، شاعر اور محقق ہیں۔یہ سب اپنے میدان کے سلجھے ہوئے کھلاڑی ہیں۔جو ہر موضوع پر اپنا قلم اٹھاتے ہوئے ادب کی خدمت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ان کی انہیں خوبیوں سے متاثر ہو کر رشید حسن خاں نے بھی اپنا قلم اٹھایا۔جس میں اس دور کے شاعروں اور مصنفوں نے اصلاح کی خاطر عوام کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کی پرزور حمایت کی۔ان کی یہ کوشش بڑی حد تک کامیاب بھی رہی۔جس نے لوگوں کے دلوں میں ایک نیا جوش اور ایک نئی امنگ بھر دی۔اس طرح ان مصنفوں، شاعروں اور نقادوں نے اپنی تحریروں میں زبان و بیان کی لطافت، صاف گوئی اور شگفتگی سے عوام کو آراستہ کرایا۔ڈاکٹر محمد وسیم رضا رشید حسن خاں کے تنقیدی تحریروں میں زبان کی لطافت اور مشرقی تنقید کے رشتہ کی وضاحت کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

> ''رشید حسن خاں کی تنقیدوں کو پھر بھی اگر ہم کسی دبستان سے منسوب کرنا چاہیں تو اسے اُردو کی کلاسیکی تنقید سے منسوب کر سکتے ہیں۔کلاسیکی تنقید کا اپنا ایک منفرد اور ممتاز مقام ہے۔یہ ایک ایسا تنقیدی نظام ہے جو فن پارے کے لسانی، فنی اور عروضی پہلو سے بحث کرتا ہے۔یہ ہر تخلیق کو ایک لسانی حقیقت کی شکل میں دیکھنے پر اصرار کرتی ہے۔اس کا سفر لفظ سے معنی کی طرف یا بہ الفاظ دیگر ظاہر سے باطن کی طرف ہوتا ہے۔اُردو کے کلاسیکی تنقید کا انحصار عربی وفارسی شعریات (اصلاح کی زبان میں مشرقی شعریات) پر ہے اور عربی و فارسی شعریات یعنی مشرقی شعریات کا دائرۂ علم بدیع و بیان اور معانی کے ساتھ علم وعروض وقوافی اور قواعد پر محیط ہے۔'' 2

رشید حسن خاں نے تفہیم کے پہلے مضامین میں 'مولانا آزاد کا اسلوب' کے موضوع پر بحث کی ہے۔انھوں نے اس مضمون کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔پہلے حصے میں آزاد کے اسلوب کی خاصیت کو بیان کیا ہے تو دوسرے حصہ میں پیرائے اظہار کے خلاف جو اختلاف ہے اس کی وضاحت کی۔یہ مولانا ابوالکلام آزاد کو صاحب طرز نثر نگار مانتے تھے۔اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ ان کی نثری تحریروں کو بڑی آسانی سے پہچان جاتے تھے۔ان دونوں خوبیوں کے باوجود مولانا آزاد اپنی عبارتوں میں مترادف لفظوں کی کثرت، ہم مفہوم جملوں کی تکرار کو جس طرح استعمال کرتے تھے اس سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی جلسے میں پرجوش انداز میں تقریر کر رہے ہوں۔اگر مولانا آزاد کے ابتدائی نثر کی بات کی جائے تو یہ شروع میں عربی وفارسی کے لفظوں کو اپنی تحریروں میں بڑی کاوش کے ساتھ پیوند کرتے دکھائی دیتے ہیں۔مگر دوسری جانب یہ اپنی تحریروں میں عربی کے ساتھ ساتھ فارسی اور اُردو لفظوں کو بڑی خوبی کے ساتھ اپنی تالیف میں پیوست کر دیتے ہیں۔علاوہ ازیں یہ ایسے ایسے نفیس اور پرمعنی ترکیبیں استعمال کرتے تھے کہ ذہن اور ذوقِ احساس پسندیدگی سے جگمگا اٹھتے تھے۔ان پرکیف اور نفیس ترکیبوں کی مثال مولانا آزاد نے کچھ اس طرح بیان کی ہیں جو چھ سطروں کے اقتباس میں مرکبات کی کارفرمائی کرتی ہوئی نظر آرہی ہے۔اس میں انھوں نے اُردو اور فارسی دونوں زبانوں کے تراکیب کو شامل کیا ہے۔ان میں فارسی کے بارہ اور اُردو کی پانچ ترکیبوں کو جگہ دی گئی ہے۔مثلاً ''عہد شاب، خارستان ہستی، صبح فریب، شہرستان امید، نگارخانۂ نظر فریب، جنون شباب، صنم آباد الفت و پرستش'' یہ سات اضافی ترکیبیں ہیں۔'سوز وتپش، ناامیدی وناکامی، دیدہ ودل، غفلت ومدہوشی، سرمستی وسرگردانی! یہ پانچ عطفی ترکیبیں ہیں۔اس کے علاوہ اُردو کی پانچ ترکیبیں بھی اس میں شامل ہیں۔''عہد شباب کی صبح، خواہشوں اور ولولوں کی شبنم، خارستان ہستی کا ایک ایک کانٹا، سوز وتپش کی دوپہر، ناامیدی وناکامی کی شام'' ہے۔انھوں نے بعد میں ان عربی وفارسی لفظوں کی بہتات کو اپنی عبارت سے نکال دیا۔جس سے ان کی تحریر عوام میں پسند کی جانے لگی۔اس تبدیلی کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ مولانا آزاد نے لفظ آرائی کی جگہ حقیقت پسندی کو اپنی نثر میں فوقیت دی۔اس طرح ان کی تحریروں نے انھیں تقریر سے قریب تر اور بیان کو خطابت سے معمور کر دیا۔

'مشرقی شعریات اور نیاز فتح پوری' میں رشید حسن خاں نے مشرقی شعریات کی روشنی میں نیاز فتح پوری کی علمی سمجھ کو جس خوبی سے جانچا ہے۔اس کی بصارت میں یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ نیاز فتح پوری نے اُردو شاعری ونظم کا جس طرح سے احاطہ کیا ان کی مثال کم ہی ادیبوں اور نقادوں کے یہاں دیکھنے کو مل پائے گی۔اگر مشرقی شعریات کے حوالے سے بات کی جائے تو مولانا شبلی نے سب سے پہلے اس طرف اپنا رخ کیا اور عوام الناس میں اپنی ایک الگ پہچان بنائی۔وہیں دوسری طرف نیاز فتح پوری نے شبلی کے بعد اس وراثت کو زندہ رکھا۔رشید حسن خاں نے اس مضمون میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ جہاں نیاز فتح پوری نے جوش ملیح آبادی اور سیماب اکبرآبادی کے شاعری کی تعریف کی وہیں دوسری جانب اصغر گونڈوی اور جگر مرادآبادی کی شاعری کو جم کر تنقید کا نشانہ بنایا۔ان دونوں شاعروں پر ان کی تنقید اس حد تک تھی کہ گویا یہ ان کے سب سے بڑے دشمن ہوں۔اس کے برعکس جوش اور سیماب پر ان کی جو تنقیدی رائے دیکھنے کو ملتی ہے۔وہ ایک دم الگ معلوم ہوتی ہے۔ان دونوں نظریات سے پرے جہاں نیاز فتح پوری کی تحریروں میں بلاغت کی نکات زیادہ وسعت اور تنوع کے ساتھ معرضِ بحث میں دیکھنے کو ملتی ہے۔اسی طرح ان کے زبان وبیان کی باریکیاں بھی ادب میں نئے نظریے کے تحت دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔

رشید حسن خاں نے 'ذاتی خطوں سے متعلق چند معروضات' میں خطوط سے متعلق چند خصوصیات بیان کی ہیں۔ان کا ماننا ہے کہ خط میں ذاتی رائے کے علاوہ بے ساختہ پن کا اظہار بڑی خوبی کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے۔اس میں گفتنی وناگفتنی دونوں طرح کی باتیں کہی جاتی ہیں۔لیکن بعض موقعوں پر اس میں تامل اور تکلف کے بغیر کوئی بات پوری نہیں ہوتی۔اس طرح دیکھا جائے تو ذاتی خطوط میں کوئی دوست اپنے یار سے جب ہم کلام ہونا چاہتا ہے تو اس کو خط لکھنے بیٹھ جاتا ہے، دل میں جو بات یاد آتی ہے اسے کاغذ پر اتار دیتا ہے۔یہی دوست کبھی کبھی اپنے جذبات کو اس طرح بیان کر جاتا ہے جس سے اس کی دلی حسرت پوری ہو جاتی ہے۔بعض دفعہ ایسا دیکھنے کو ملتا ہے کہ کوئی دوست ایسے لفظ یا جملے اپنی قلم سے ادا کر جاتا ہے جس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا، پھر بھی وہ دوست ان ذاتی خطوط کی قدر کرنا نہیں بھولتا

۔رشید حسن خاں کا خیال ہے کہ خط انسانی آواز کا کبھی ترجمان نہیں بن پایا۔اس کے مفہوم کبھی لفظوں سے خالی نہیں رہے۔مگر یہ جذبے کی حرارت اور بناوٹی پن سے ہمیشہ خالی رہے۔لیکن جب کوئی مکتوب نگار شناسا انداز میں خط لکھتا ہے تو وہ خط اس کی آنکھوں کو مانوس لگتا ہے۔اس کے دل میں ایک امید پیدا ہوتی ہے کہ کوئی مجھ سے باتیں کر رہا ہے۔اس کے برعکس کبھی کبھی کچھ اجنبی لوگ اپنے باہمی معاملات کی وجہ سے دوسروں کے جذبے کی تمازت کو جان لیتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اب ذاتی خط بھی ٹائپ کی شکل میں آنے لگے ہیں۔جس سے یہ خط ذاتی نہ ہو کر غیر ذاتی ہو گئے ہیں یعنی اب ذاتی خطوط دستاویزی کی حیثیت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔

'یادوں کی برات' (جوش بحیثیت انشا پرداز) کو رشید حسن خاں نے خودنوشت سوانح عمری کے زمرے سے نکال کر انشا پردازی کے اعتبار سے اہم کتاب مانا ہے۔ان کا خیال ہے کہ جوش نے اس کتاب میں بے جا مرادفات، تکرار لفظی اور زبان و بیان کی بہت زیادہ غلطیاں کی ہیں۔جو ایک تخلیق کار کے لیے صحیح نہیں ہے۔مگر اس کے برعکس انھوں نے اپنی تحریروں میں تشبیہوں اور استعاروں کا استعمال اس مناسبت سے کیا ہے کہ اس کا حسن دوبالا ہو جائے۔رشید حسن خاں کے مطابق جوش نے اپنی خودنوشت یادوں کی برات میں اپنے خاندان کے افراد کے ساتھ جاگیردارانہ تہذیب و تمدن کا ختم ہوتا ہوا تصور بھی بیان کر دیا ہے۔جن میں انسانی زندگی نئی راہیں تلاش کرتی ہوئی دکھائی دے رہی ہے۔اس طرح دیکھا جائے تو جوش نے اس دور کے حسین و جمیل مناظر کا بیان جس شگفتہ نگاری، عام انداز بیان، جملہ تراشی کے نمونوں اور لفظوں کے برمحل استعمال سے ادا کیا۔اس کی مثال دوسری جگہ ملنا مشکل ہے۔اگر پیرایہ اظہار کے حوالے سے بات کی جائے تو اس خودنوشت سوانح عمری میں مرقع نگاری نے جوش کے اندر بسنے والی روشنی کو نئی تفصیلات کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔جو نئے لفظوں اور معنوں میں اس طرح پیروئی گئی ہے کہ یہ اپنے آپ میں ایک مثال ہے۔ان کے اس طرح کے نظریات سے جہاں ادب میں نئے نئے خیال ابھر کر سامنے آنے لگے۔اسی طرح کے خیال سے خاص و عام میں نئی نئی جان کاری بھی مہیا ہونے لگی۔اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ جوش نے اپنی خودنوشت سوانح عمری یادوں کی برات میں لفظوں کا ایک ایسا جال بنا جس کی وجہ سے یہ انشا پردازی کے زمرے میں آ گئی۔

رشید حسن خاں نے 'پہیلیوں سے متعلق چند باتیں' مضمون میں پہیلی کو عوامی ادب کا حصہ مانا ہے۔ان کا خیال ہے کہ ادب میں 'لوک ادب' کو 'فوک لٹریچر' کے مرادف کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔لیکن ادب میں پہیلی کا کوئی دوسرا لفظ ابھی تک رائج نہیں ہوا۔جس سے اس کا صحیح معنی لکھا جا سکے۔اس کے برعکس دوسری زبانوں میں اس کے نئے نئے لفظ منظر عام پر آ چکے ہیں۔جن میں اس کی وضاحت بھی بیان کر دی گئی ہے۔ان بیانوں کی روشنی میں ایک بات سامنے آتی ہے کہ ادب میں 'معیار' کی طرح 'پہیلی' کو علم و بدیع کا ایک جز مانیں، اور اس کے صنائع لفظوں کو کام میں لا کر ادب کا حصہ بنائیں۔اس طرح کی کوشش سے پہیلیوں کے اوصاف و خصائص کی حقیقت منظر عام پر آ جائے گی اور خاص و عام مستفیض ہو سکیں گے۔اسی کڑی میں بعض محققوں کو چاہیے کہ وہ پہیلیوں میں اس کا پتا بیان کر کے اس کی خوبیوں کو اچھی طرح پیش کر دیں۔جس سے اس کی لفظی صنعت کے ساتھ اس کی معنوی حقیقت بھی منظر عام پر آ جائے۔جدید دور میں نئی پہیلیوں کے حوالے سے بات کی جائے تو ان میں شائستگی اور بناوٹ کا انداز زیادہ پایا جاتا ہے۔جس سے اس کی حقیقی اور شگفتگی رعنائی بہتر طریقے سے عوام کے دلوں میں بس جائے۔ان دونوں نظریات کی روشنی میں اگر پرانی پہیلیوں کی بات کی جائے تو اس میں بے شائستگی اور روانی پائی جاتی ہے۔جن سے نئی پہیلیاں خالی ہیں۔اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ کامیاب پہیلیاں وہی ہیں جو پہلے سے زبانوں میں رائج ہیں۔جن کا ادب میں اپنا ایک مقام ہے۔

'نیاز فتح پوری اور آزادیٔ فکر' میں رشید صاحب نے نیاز فتح پوری کی تحریروں کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔زیر بحث پہلے حصہ میں ان کے مذہبی تحریروں کا اثر جس طرح نئے ذہنوں پر اثر پذیر ہوا۔اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی تحریروں میں وہ جوش ہے جس نے خاص و عام سبھی کو ایک نئے پلیٹ فارم پر لا کھڑا کیا۔ان کی مذہبی تحریروں کا اثر نئی نسل پر ایسا ہوا کہ یہ جدید تعلیم کی طرف مائل ہونے لگے۔نیاز فتح پوری کی آزادیٔ فکر میں مذہبیت کا جو رنگ غالب نظر آ رہا ہے اس کی وجہ سے تعلیم یافتہ لوگ، جدید تعلیم پانے والے نوجوان آہستہ آہستہ اس کے رنگ میں رنگنے لگے۔اسی طرح نئی نسل نئے شعور کی تربیت میں اس قدر مائل ہو گئی کہ یہ اس کے حصہ بن گئے۔زیر بحث دوسرے حصہ میں ان کی آزادیٔ فکر کو نئے پہلو سے پیش کیا گیا ہے جس کا تعلق ادبی ماحول سے ہے۔انھوں نے اس حصہ میں شخصیت پرستی کو معاشرے کے لیے کارآمد بتایا ہے۔ان کا ماننا تھا کہ غیر علمی اور غیر حقیقت پسندانہ خیال نے اُردو تحقیق کو ایک زمانے تک فروغ سے دور رکھا۔جس کی وجہ سے تنقید ایک مدت تک صاف گوئی کے قریب نہیں آ پائی۔اس طرح تحقیقی ادب اپنا اصل وقار برقرار نہیں رکھ پائی جیسا اسے ہونا چاہیے۔اسی طرح تیسرے حصہ میں نیاز فتح پوری نے مذہبی اور ادبی تحریروں کے حوالے سے جو بحث کی ہے اس سے یہی نتیجہ نکل کر سامنے آتا ہے کہ انھوں نے جس طرح نئے انداز نظر اور حقیقت پسندانہ طرز فکر پر زور دیا وہ دوسرے لوگ ادا نہیں کر سکتے۔ان سب سے پرے ان کی تحریروں میں پرانی تعبیروں، تشریحوں اور تفسیروں کی جو خاص نفی دیکھنے کو ملتی ہے وہ قابل تعریف ہے۔نیاز فتح پوری نے اپنی تحریروں میں استدلال، منطقی انداز اور علمیت کی جو شان پیدا کی ہے۔وہ حقائق کو سمجھنے کے لیے کافی ہے۔

رشید حسن خاں نے اپنے مضمون 'اختر انصاری' میں ان کے سوانحی کوائف اور ان کی شاعری کو نئے پیرائے میں جانچا ہے۔اختر انصاری کی شاعری میں رومانیت کا امتزاج اور طبیعت کا جو ہر شروع سے آخر تک ایک ساتھ دکھائی دیتا ہے۔جس کی وجہ سے ان کی رومانوی شاعری کا ابال اپنے عروج پر ایک نئے درخشاں کی مانند دکھائی پڑتا ہے۔ان کی شاعری میں ایک طرف جہاں نوجوانوں کی سرشاری کارفرما نظر آتی ہے۔وہی دوسری طرف ان کی شاعری میں گہرائی کم لیکن گیرائی زیادہ دیکھائی دیتی ہے۔رشید حسن خاں کا خیال ہے کہ ان کی شاعری میں جہاں رومانیت کا دخل نہیں وہ حصہ بے کار ہے۔ان کی وہ نظمیں غزلوں کے مقابلے کم درجہ کی معلوم پڑتی ہیں۔مگر اس کے باوجود ان کے مجموعوں میں کہیں کہیں غیر عشقیہ اشعار دیکھنے کو ملتے ہیں۔جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں بھی وہ جنونیت پائی جاتی ہے۔جن کا تعلق کہیں نا کہیں انقلابیت سے جڑا ہوا معلوم ہوتا ہے۔اختر انصاری کا رجحان ایک طرف جہاں شاعری سے ہے تو دوسری جانب ان کا جھکاؤ اشتراکیت سے ملتا جلتا دکھائی دیتا ہے۔یہ بیک وقت مارکسی خیالات سے بہت زیادہ متاثر تھے۔اس لیے ان کی شاعری میں اشتراکیت کا میلان بڑی حد تک کارفرما نظر آتا ہے۔جن کی روشنی میں یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ ان کی نگاہ میں تنقید تو ذہن کا کاروبار ہے۔جسے مارکسی بھی کہہ سکتے ہیں اور غیر مارکسی بھی۔رشید حسن خاں کے مطابق اختر انصاری اس دنیا میں ایک عاشق کا دل لے کر آئے تھے اور اپنے دل کی بات عوام تک پہونچانے کی پرزور کوشش کی۔

'ڈاکٹر محی الدین قادری زور' کے بارے میں رشید حسن خاں لکھتے ہیں کہ یہ بیک وقت ماہر لسانیات محقق، مدون، شاعر اور افسانہ نگار تھے۔انھوں نے اپنی تدوین کے ذریعہ قلی قطب شاہ کے کلیات کو مرتب کر کے شائع کروایا۔جس سے کہ شمال کے لوگ دکنی ادب سے واقف ہو جائیں۔اس طرح انھوں نے شمال اور دکن کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کی کوشش کی۔جس سے دونوں جگہوں کی تہذیب و تمدن اور ثقافت سے خاص و عام روبرو ہو سکیں۔زورؔ صاحب نے اس کلیات میں لفظوں کی شکل و صورت اور تلفظ کے استعمال کو صحیح طریقے سے پیش نہیں کیا۔جس کی وجہ سے بعض مقامات پر دوسرے محققوں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔علاوہ ازیں انھوں نے اپنی نظموں اور غزلوں میں دو لفظوں کو دو شکلوں میں پیش کیا اور یہ نہیں بتایا کہ یہ کس طرح ادب میں شامل ہو گیے۔رشید حسن خاں نے اس بات کی طرف زور دیا ہے کہ شاید

عجلت پسندی نے زورؔ صاحب کے متن کو کافی نقصان پہنچایا۔ جس سے ان کی تحقیق و تدوین کو وہ مقام نہیں مل سکا جس کی انھیں امید تھی۔ پھر بھی ان کے کام کو عوام نے بہت سراہا ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو زور صاحب نے ادب کے ہر میدان میں اپنے قلم کے جوہر دیکھائے۔

رشید حسن خاں نے 'مولوی سید احمد دہلوی' کے علمی کارناموں کو منظر عام پر لایا۔ جس میں ان کا شاہ کار 'فرہنگ آصفیہ' ہے۔ یہ لغت کئی جلدوں پر مشتمل ہے۔ مولوی صاحب نے اُردو زبان و لغت کو یکجا کرنے میں جو خدمات انجام دیں اس کی مثالیں کم یاب ہیں۔ انھوں نے اس لغت کو تیار کرنے میں بہت دشواریوں اور پریشانیوں کا سامنا کیا، کتنے ہی دروازوں پر مالی امداد کے لیے دستک دی، پھر کہیں جا کر یہ کام انجام تک پہنچا۔ رشید حسن خاں کے مطابق اس لغت میں بعض مقامات پر کہیں کہیں خامیاں اور غلطیاں بھی نظر آتی ہیں۔ لیکن یہ لغت بعض اعتبار سے بے حد کامیاب بھی ہے۔ اس لغت کے کامیاب ہونے کی ضمانت یہ ہے کہ جدید دور میں جو لغت وجود میں آ رہی ہیں ان میں وہ الفاظ اور تشریحات معیار پر پوری نہیں اتر تی جیسی اسے ہونی چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ صحیح لغت کی حقیقت عوام کو اس وقت تسلیم ہوگی جب کوئی نیا لغت منظر عام پر آئے گا۔ فرہنگ آصفیہ کے کچھ وقت بعد 'اُردو لغت بورڈ کراچی' وجود میں آئی جس میں بہت ساری غلطیاں تھیں۔ اگر ان دونوں لغات کا موازنہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ ایک کا تعلق اجالے سے ہے تو دوسرے کا تعلق اندھرے سے۔ ان میں اگر لفظوں اور محاوروں کے حوالے سے بات کی جائے تو اس میں بہت ساری ایسی تفصیلات دیکھنے کو مل جائیں گی جس کا کم ہی لوگوں کو علم ہوگا۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ مولوی صاحب کی لغت کئی اعتبار سے اہم ہے۔ اس کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ انھوں نے اس میں اُردو زبان کا خاص خیال رکھا، اور ساتھ ہی دہلی کی اُردو زبان کو پوری ایمانداری سے استعمال کیا۔

'ہندوستانی فارسی میں تلفظ اور املا کے بعض مسائل (تدوین کے نقطۂ نظر سے)' میں رشید صاحب نے ہندوستانی اور ایرانی لہجہ کو اپنا موضوع بنایا۔ ان کا ماننا ہے کہ ان دونوں ملکوں میں یائے مجہول اور واو مجہول کی آوازوں کو لے کر تکرار ہے۔ مگر لسانیات کے حوالے سے بات کی جائے تو یہ دونوں آوازیں فارسی نظام صوتیات کا حصہ ہیں۔ لیکن فارسی کی مختلف کتابوں میں علم قافیہ اور صرف و نحو سے متعلق جو صراحت ملتی ہے۔ اس میں نون غنہ کی آوازوں کے ساتھ قواعد و عروض کے بعض موضوع پر تکرار پائی جاتی ہے۔ اسی طرح ان دونوں کے یہاں لغت میں قواعد سے متعلق جوڑ کر ملتا ہے۔ اس کی اپنی ایک الگ پہچان ہے۔ ان سب باتوں کے علاوہ ان دونوں زبانوں میں تین باتوں کا فرق پایا جاتا ہے، جن میں سب سے پہلے اضافت کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ اس میں جب کوئی اضافی مرکبات زبان سے ادا ہوتے ہیں تو حقیقی مجہول آواز کی صورت میں سامنے آجاتے ہیں۔ جیسے شامِ تنہائی، دلِ عاشق کا تلفظ عام متعارف انداز میں فارسی سے اُردو میں منتقل ہوا ہے۔ اسی طرح دوسرے حصہ یعنی یائے ماقبل مفتوح میں یائے تنہائی سے پہلے والے حروف پر زبر لگا کر استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے مَے، طَے، درپَے، نَے وغیرہ ہیں۔ اس کی دوسری صورت رشید حسن خاں نے اس طرح بیان کی ہے۔ جیسے دَیر، سَیر، مَیل، قَید، خَیر وغیرہ۔ ان دونوں صورتوں میں اس کی آواز 'ی' سے واضح اور متعین ہوتی ہے۔ اسی طرح تیسرے حصہ کا تعلق امالہ سے ہے۔ جن لفظوں میں امالہ ہوتا ہے۔ ان میں یائے مجہول کی جگہ 'الف' استعمال میں لائے جاتے ہیں۔ جیسے 'عتاب' امالے کے بعد عتیب بن جاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح کتاب کی امالہ صورت 'کتیب' (ک تِ ے ب) کو 'کتیب' (ک ت ی ب) اور حجاب سے حجیب بن جاتا ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس کو دونوں طرح سے پڑھا جا سکتا ہے۔ وہیں امالہ میں ایسے لفظوں کے ساتھ قافیہ کا استعمال نہیں ہوتا جن میں یائے معروف ہو۔ ایسے لفظ بعد میں یائے مجہول کی صورت اختیار کر جاتے ہیں۔ جیسے عتیب کو فریب کا ہم قافیہ تو بنایا جا سکتا ہے۔ مگر حبیب یا نصیب کو ہم قافیہ نہیں بنایا جا سکتا۔ اسی طرح یائے مجہول میں خطاطی کے اثر سے آخر لفظ میں 'ی' یا 'ے' کی کتابت کو لازمی طور پر ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ علاوہ ازیں تلفظ میں اس امتیاز کو لازماً ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ جن میں لفظ کے آخر میں یائے مجہول آیا ہو۔ جیسے ایک شخص یا کوئی شخص کے معنی میں 'شخصے' لکھا اور شخصی پڑھا جاتا ہے۔ یہی حال یائے معروف کا بھی ہے۔ اس میں اگر 'امیری' کو خطاط 'امیرے' لکھ دے تو پڑھنے میں 'امیری' ہی پڑھا جائے گا۔ رشید حسن خاں کا خیال ہے کہ اس طرح کی باتیں ہمارے ذہن نشیں رہنی چاہیے کہ ایرانی اہل نظر بھی ہندوستان میں مروج تلفظ اور کتابت کے ان مسائل سے ناآشنا نہیں۔ بل کہ وہ یہ مانتے ہیں کہ ہندوستان میں نظام اصوات اور طریقِ نگارش کے تحت، معروف و مجہول اور نون غنہ کی آوازوں کا جو فرق ہے۔ وہ تلفظ اور کتابت دونوں کے لیے کارآمد ہے۔

رشید حسن خاں نے 'ترقی اُردو بورڈ کا لغت' کو اغلاط کا پشتارہ کہا ہے۔ ان کے مطابق لغت کو اعتبار اور استناد کا اہم ترین وسیلہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس یہ لغت اس کی صحیح شکل و صورت بیان نہیں کرتی۔ جس کی وجہ سے اس لغت میں اکثر مقامات پر غلط فہمیاں پائی گئی۔ جن سے خاص و عام فائدہ اٹھانے سے بچ رہے ہیں۔ رشید حسن خاں کا ماننا ہے کہ بعض تخلیق کار ان غلط فہمیوں کی وجہ سے اپنی تحریروں کو ان لفظوں سے دور رکھ رہے ہیں جن کو عوام صحیح مان کر اس سے استفادہ نہ حاصل کرنے لگے۔ ان کا قیاس ہے کہ اس لغت میں غلط اندیشی اور غلط نویسی اس حد تک بیان کی گئی ہے کہ کوئی صفحات اس سے خالی نہیں۔ انھوں نے غلط نویسی کی نشان دہی اس طرح پیش کی جو حسب ذیل ہیں: (۱) اس میں جو اسناد فراہم کی گئی ہیں ان پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا (۲) اس میں معتبر مطبوعہ یا خطی نسخوں سے کارڈ تیار نہیں کیے گیے (۳) دوسرے لغات سے جو اسناد نقل کی گئیں۔ اس کا اصل متن سے مقابل نہیں کیا گیا (۴) بعض معروف کلاسکی کتابوں کے سب الفاظ شامل لغت استعمال نہیں ہو سکے (۵) امیر اللغات، فرہنگ آصفیہ، سرمایۂ زبان اُردو، نفائس اللغات اور نور اللغات کے اندراجات سے اگر اس لغت کے اندراجات کا مقابلہ کیا جائے تو اس میں نام و نشان صحیح نہیں پائے جاتے (۶) اس میں غیر حقیقی صورتوں کو حقیقی بنا کر شامل کیا گیا (۷) اس لغت میں صحت املا کا التزام ملحوظ نہیں رکھا گیا جس کی وجہ سے یہ سب غلطیاں سامنے آئیں۔

رشید حسن خاں کی نگاہ میں یہ وہ سب باتیں یا نشانیاں ہیں جس کی وجہ سے اس لغت کو نقصان ہوا۔ اس لغت میں بعض جگہ ایسی صورتوں کا استعمال ہوا ہے۔ جس سے قاری کو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ان سب باتوں سے پرے اس میں اُردو املا کی ساری معیار بندی ایک گلدستہ طاق نسیاں میں بند ہو کر رہ گئیں۔ اگر لغت میں ان املائے الفاظ کو صحیح مان بھی لیا جائے تو اس سے اُردو املا کا تصور ہی ختم ہو جائے گا اور اس سے استفادہ کرنے والا قاری گمراہی اور غلط فہمی کی دنیا میں خود کو مبتلا پائے گا۔ علاوہ ازیں اگر زبان و بیان کے لحاظ سے اس لغت کی اہمیت کو دیکھا جائے تو اس میں بے شمار غلطیاں سامنے آجائیں گی۔ جن میں صحت زبان، حسن زبان، صحت املا اور یکسانیِ املا کا انبار ملے گا۔ دوسری طرف اگر ماخذ کے حوالے سے بات کی جائے تو اس میں مستند اور غیر مستند کا فرق بھی سامنے آجائے گا۔ اسی طرح اصل ماخذ اور ثانوی ماخذ کی حقیقی تصویر بھی سامنے نہیں آپائے گی۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ یہ لغت ہر اعتبار سے عوام کے لیے بے سود ثابت ہوئی۔

رشید حسن خاں کی پہچان تحقیق و تدوین، تنقید، لغت، قواعد اور املا کے حوالے سے کی جاتی ہے۔ انھوں نے اپنے تنقیدی کارناموں سے ہر خاص و عام کے دل میں منفرد مقام بنایا۔ جس کی وجہ سے بعض مصنف اور شاعر ان کی تحقیق و تنقید کو پڑھ کر اپنے لیے نئے راستے تلاش کرتے ہیں۔ ان مصنفوں کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی ہے کہ کس طرح اپنے مضامین میں صحیح املا اور روانی پیدا ہو سکے جس سے اپنی تحریروں

میں وہ خوب صورتپیدا ہو جائے جیسی بعض محققوں کے یہاں موجود ہے۔اس کے برعکس رشید حسن خاں نے کلاسیکی لسانیات پر خاص طور سے اپنی نگاہ ڈالی۔لفظوں کے استعمال اوران کی قدر و قیمت پر اپنی خاص توجہ صرف کی۔جن میں تنقیدی نگارشات ایک نئے انداز میں ان کی تحریروں میں دیکھنے کو مل جاتا ہے۔اس طرح بعض قاری ان سارے مضامین کو پڑھ کر اپنے اندر ایک نئی سوچ پیدا کرے،تا کہ ان سارے مضامین سے اپنے اندر بھی ایک نئی فکر کو بروئے کار لایا جائے اور اپنی تحریر وتحقیق کو نئی بلندی عطا کی جائے۔رشید حسن خاں کی ہمیشہ یہ جستجو رہی کہ کسی طرح اپنے اندر بھی ادب کی نئی فکر کو پروان چڑھایا جائے۔جس سے اپنے اندر ابھرنے والے تلاطم کو عوام کے سامنے پیش کیا جا سکے۔اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ رشید حسن خاں اسم با مسمیٰ تھے۔انھوں نے اُردو زبان وادب میں رشد و ہدایت کی ذمہ داری کو بڑی خوبی سے نبھایا۔ان کی اس کوشش سے املا،انشا اور عبارت میں نئی جان پیدا ہو گئی اور تحقیق وتنقید کے اصول وضوابط سے خاص وعام بھی واقف ہو گئے۔تلاش وتعبیر اور تفہیم کی روشنی میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ رشید حسن خاں نے ان دونوں کتابوں کے ذریعہ قاری کو تنقید کے حقیقی روپ سے واقف کرایا۔جس کی وقت کے ساتھ عوام کو از حد ضرورت تھی۔

حواشی

1۔صفحہ 94،95،رشید حسن خاں کچھ یادیں کچھ جائزے،مرتبین،ڈاکٹر محمد آفتاب اشرف،جاوید رحمانی،مکتبہ الحرا،دربھنگہ، 2008

2۔صفحہ 130،رشید حسن خاں ایک عبقری شخصیت،ڈاکٹر محمد وسیم رضا،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی، 2013

کتابیات

1۔تلاش وتعبیر،رشید حسن خاں،مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،جامعہ نگر،نئی دہلی، 1988

2۔تفہیم،رشید حسن خاں،مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،جامعہ نگر،نئی دہلی، 1993

○○○

ڈاکٹر ظفر عالم

(مؤآئمہ،الٰہ آباد)

رشید حسن خاں
(تحقیق،تنقید وتدوین کے حوالے سے)

اُردو تحقیق کے گیسو سنوارنے میں جن قدآور شخصیتوں کے اسماسرفہرست ہیں اُن میں سرسید احمد خاں،مولوی عبدالحق،حافظ محمود شیرانی،قدرت اللہ قاسم،قاضی عبدالودود،امتیاز علی خاں عرشی،مالک رام،مسعود حسن رضوی وغیرہ ہیں۔مگران محققوں کی کہکشاں میں ایک اہم اور نمایاں نام رشید حسن کا بھی ہے۔جنھوں نے اُردو تحقیق میں ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے جو اپنی مثال آپ ہیں۔ان کارہائے نمایاں کی وجہ سے ان کا شمار اُردو ادب کے صفِ اول کے محققین میں ہوتا ہے۔

رشید حسن خاں کی ولادت تعلیمی اسناد کے مطابق 1930 ہے۔لیکن رشید حسن خاں نے اپنی تاریخ ولادت دسمبر 1925 بتائی ہے۔وہ یوپی کے مردم خیز اور ادبی گہوارے شاہ جہاں پور کے ایسے گھرانے کے چشم چراغ تھے جہاں پر مشرقیت کا مکمل غلبہ تھا۔ان کے والد امیر حسن پولس محکمہ میں سب انسپکٹر کے عہدے پر فائز تھے مگر عدم تعاون کی تحریک نے ان پر اس قدر اثر ڈالا کہ سرکاری ملازمت سے ہی برطرفی اختیار کر لی۔مشرقیت ان پر اس قدر حاوی تھی کہ انگریزی تعلیم کو بھی مذہب کی نظروں سے دیکھتے تھے،جس کی وجہ سے رشید حسن خاں کی تعلیمی سلسلے کی ابتدا شاہ جہاں پور کے مدرسہ بحرالعلوم سے ہوئی۔جہاں وہ 1939 تک زیر تعلیم رہے لیکن درس نظامی کی تکمیل نہ کر سکے۔گھر کی معاشی حالت بہتر نہ ہونے کی وجہ سے رشید حسن نے شاہ جہاں پور کی آرڈیننس کلودنگ فیکٹری میں ملازمت اختیار کر لی۔
33 دنوں تک چلنے والی ہڑتال کے سبب جب فیکٹری میں ملازموں کی موقوفی کی فہرست سامنے آئی تو اس میں رشید حسن خاں کا نام بھی شامل تھا۔لہٰذا وہ شہر کے عربی مدرسہ فیض عام میں عربی کے استاذ کی حیثیت سے تدریسی فریضہ انجام دینے لگے لیکن یہاں کے طلبا نے ان سے پڑھنے سے انکار کر دیا کیوں کہ وہ باریش نہیں تھے۔تاہم انھیں چھوٹے بچوں کو پڑھانے کے لیے دوسری جماعت میں بھیج دیا گیا۔اسی دوران اسلامیہ سیکنڈری اسکول میں فارسی اُردو کے استاذ کی جگہ خالی ہونے کے سبب انھیں وہاں ملازمت مل گئی۔1952 سے 1959 تک اسی اسکول سے وابستہ رہے۔اگست 1959 میں دہلی یونی ورسٹی کے شعبہ اُردو میں ریسرچ اسسٹنٹ کی حیثیت سے وابستہ ہو گئے دسمبر 1989 میں ریسرچ ایسوسی ایٹ کے عہدے پر رہتے ہوئے ریٹائر ہوئے۔زندگی کے آخری ایام انھوں نے شاہ جہاں پور میں گزارے اور یہیں اپنے آبائی قبرستان میں 26 فروری 2006 کو سپرد خاک ہوئے۔

رشید حسن خاں تحقیق میں حافظ محمود شیرانی،قاضی عبدالودود،ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی کو اپنا معنوی استاذ مانتے تھے۔ابتدا میں علامہ نیاز فتح پوری کی تحریروں سے حد درجہ متاثر

مطابق ان کے ادبی سفر کا آغاز ''شبلی کا فارسی تغزل'' کے عنوان سے شائع ہونے والے مضمون سے ہوتا ہے جو رسالہ نگار لکھنؤ کے 1950 کے شمارے میں شائع ہوتھا۔ اس مضمون سے قبل بھی ان کے کئی ادبی مضامین شاعر، نقوش وغیرہ رسائل کی زینت بن چکے تھے۔ لیکن ان کی تحقیق نے اس وقت ادبی حلقے میں زیادہ ہل چل پیدا کی جب فیض کے مجموعہ کلام دست صبا پر ان کا چونکا دینے والا مضمون ''دست صبا پر ایک نظر'' کے عنوان سے منظر عام پر آیا۔ ایک بہترین اور اعلا پائے کے ناقد کی طرح فیض کی شاعری کے ان تمام محاسن اور معائب کا تنقیدی جائزہ مدلل انداز سے پیش کیا۔ فیض احمد فیض پر ان دوسرا مضمون ''فیض اور اس کی شاعری'' 1977 میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں انھوں نے فیض کی شاعری کا کماحقہٗ جائزہ لیا۔ فیض کی مقبولیت کا سبب وہ کچھ اس طرح سے بیان کرتے ہیں:

''ان کو یہ ہمہ گیر شہرت ملی ہے 1951 کے بعد یعنی اس واقعہ اسیری کے بعد جس سے بہت سے لوگ واقف ہوں گے اس سے پہلے وہ شاعر تھے اور ایک محدود لیکن باذوق حلقے میں ان کی بعض نظموں کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا لیکن اس کے بعد وہ ''مجاہد شاعر'' بن گئے اور اسی زمانے سے سیاسی حلقوں نے (ملک کے اندر اور ملک کے باہر ہر جگہ) مختلف سطحوں پر اپنے اپنے انداز سے ان کی ''مجاہدانہ شہرت'' کے لیے راہیں ہموار کیں۔ ان کے کلام کو ان ہی اثرات کی روشنی میں دیکھا گیا اور اسی کی فرمائش کی گئی۔ اس کے نتیجے میں یہ ہونا تھا کہ شاعری کی بحث میں اضافی خوبیوں کا ضرورت سے زیادہ دخل رہے۔ شاعر اگر مجاہد کی حیثیت سے دیکھا جائے تو پھر اس کی ہر تحریر کے متعلق یہ کہا جا ہے گا کہ: ''لگادی ہے خون دل کی کشید'' چوں کہ ان کو مجاہد کا منصب بخش دیا گیا اس لیے ان کی ہر بات آیت وحدث ہو کر رہ گئی۔۔ ان کی کمزور سے کمزور نظم کو اُردو کی اعلا تخلیق بتایا گیا اور اس آوزہ گری میں معقول اور غیر معقول سبھی لوگ ہم آواز ہو گئے۔ اگر کبھی کسی زبان و بیان کے کسی پہلو کی طرف توجہ دلائی تو اس کو لفظ پرست، روایت پرست اور رجعت پرست کہا گیا۔ یہ فرض کر لیا گیا کہ اگر کوئی شخص فیض (یا کسی اور ترقی پسند شاعر پر کوئی اعتراض کرتا ہے) تو وہ ترقی پسندی کا مخالف ہے۔ مخالف ہے تو رجعت پرست ہوا اور رجعت پرستوں کی بات کیوں سنی جائے اس صورت حال کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ زبان و بیان پر گفتگو کرنا گھٹیا درجے کا کام قرار پایا۔ اس غلط اندیشی کا خمیازہ بھگتنا پڑا ان شاعروں کو جن کو ضرورت تھی صحیح مشوروں کی۔ اس محرومی نے غلط گوئی کو بڑھاوا دیا اور شاعری معائب سے بوجھل ہو کر اپنے ظاہری حسن کو کھو بیٹھی۔'' 1

مذکورہ مضامین کے ساتھ ساتھ خاں صاحب نے کئی دوسرے مضامین رقم کیے ہیں جن میں انھوں نے ترقی پسند ادبی نظریہ کی بھرپور تنقید کی ہے۔ ''تنقید جانب داری کے اسباب اور اثرات''، ''زبان و بیان کے بعض پہلو'' غزل اور ترقی پسندی'' جیسے مضامین کے ذریعے انھوں نے ترقی پسند تحریک کی خامیوں کی واضح نشان دہی کی ہے۔ رشید حسن خاں تحقیق و تنقید کے ضمن میں اس بات کے خواہش مند ہیں کہ جس سے کسی فن پارے کا صحیح تعین حقائق پر مبنی ہو وہ خوشہ چینی کے قائل نہیں۔ اپنے افتادِ مزاج اور اپنے نقطۂ نظر کی طرف واضح اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں اس تنقید اور تدوین کا قطعاً قائل نہیں جس میں انشائیہ نگاری کا انداز ہو اور وہ اسلوب ہو جو منافق کی سخن آرائی کا ہوتا ہے۔ اسی طرح میں اس تحقیق کو فکر شاعرانہ کا بدل سمجھتا ہوں جس میں صاف گوئی کے بجائے پسینے پوتنے کا انداز ہو کیوں کہ حالات نے اب بیش تر افراد کو دنیا داری کے پھیر میں مبتلا کر رکھا ہے اس لیے تحقیق کا یہ سادہ اور صاف انداز ان کو پسند نہیں آتا اور اس کے لیے ان حضرات نے ''منفی انداز نظر'' کی ایک اصطلاح وضع کی ہے۔ مطلب یہ کہ جو لوگ جھوٹ کو جھوٹ کہیں اور دوٹوک انداز میں رائے ظاہر کریں وہ تو منفی انداز والے ہوئے۔ آپ چور کو چور کہیں تو وہ بہت واویلا مچائے گا۔ یہی حال ان تاجران ادب کا ہے۔ میں سادہ واضح اور دوٹوک انداز میں بات کہنا چاہتا ہوں اور اس سے مجھے مطلق دل چسپی نہیں کہ لوگ اسے مثبت سمجھیں گے یا منفی۔ ایسی فضول اصطلاحوں سے میں بہت دور رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے سچ کی تلاش ہے مجھے شخص سے دل چسپی نہیں اس نے جو کچھ کہا یا لکھا ہے اس سے دل چسپی ہے۔ جھوٹ کوئی بھی بولے وہ جھوٹ ہے میں صلح سمجھوتے کا قائل نہیں۔'' 2

اپنے زمانے کی مستند ترین کتابوں میں شامل ہونے والی کتابوں کا بڑی انتہائی عرق ریزی سے مطالعہ کرنے کے بعد کسی کو ملحوظ خاطر رکھے بنا بہت ہی بے باکی کے ساتھ ان غلطیوں کی نشان دہی کی جن کی مثالیں درج ذیل کتابوں پر شائع ہونے والے مضامین میں جا بجا دیکھی جاسکتی ہیں۔ مثلاً ''دیوان غالب صدی اڈیشن'' مرتب مالک رام'' تاریخ ادب اُردو'' جمیل جالبی'' اُردو شاعری کا انتخاب'' محی الدین زور''، علی گڑھ تاریخ ادب اُردو'' آل احمد سرور، مجنوں گورکھپوری' 'لغت ترقی اُردو بورڈ کراچی جیسی نادر کتابوں پر ان کی تحقیقی و تنقیدی کاوشوں کے ذریعہ یہ واضح ہوتا ہے کہ حقائق کی بیانی میں وہ کسی بڑی سے بڑی شخصیت سے مرعوب نہیں ہوتے۔

''دیوان غالب (صدی اڈیشن)'' جو بطور غالب صدی کے موقع پر شائع کیا گیا جس کے مرتب مشہور مصنف ماہر غالبیات مالک رام ہیں۔ اُردو ادب میں ان کی حیثیت مستند ادیب کی ہے۔ موصوف نے غالب سے متعلق کئی اہم گوشے دریافت کیے ہیں۔ اسی سلسلے کی کڑی مذکورہ کتاب ہے۔ انھوں نے تدوین غالب کے لیے نسخۂ آصفیہ کو ترجیح دی۔ جس کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ غالب نے اس میں تصحیح کی تھی۔ رشید حسن خاں نے دلائل کے ساتھ یہ بات ثابت کر دیا ہے کہ مصنف نے دیوان غالب کی تدوین میں احتیاط ضرور برتا ہے لیکن اصول تدوین کی کوئی پاس داری نہیں کی۔ اور ساتھ ہی اس بات کی نشان دہی کہ آصفیہ لائبریری میں کو ایسا نسخہ نہیں ہے جس کی تصحیح غالب نے فی نفسہ کی ہے۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی مرتب کردہ کتاب ''اُردو شاعری کا انتخاب'' جو ساہتیہ اکادمی دہلی سے 1960 میں شائع ہوئی۔ مصنف نے اس کتاب کی خصوصیات گوش گزار کیا کہ 1450 سے لے کر اس زمانے کے موجودہ 150 شعرا کا منتخب بہترین کلام شامل کیا گیا ہے۔ لیکن رشید حسن خاں نے اس کتاب پر اپنی تحقیق و تنقیدی نگاہ ڈالی تو یہ بات سامنے آئی کہ مرتب کردہ مصنف کی تساہل پسندی سے کئی ایسی بڑی غلطیاں راہ پا گئی ہیں جو تحقیق کے قطعی خلاف ہیں۔ مثلاً کسی دوسرے کے اشعار کو کسی اور شاعر کی طرف منسوب کر دینا۔ شعرا کے حالات زندگی میں سنین کی صحیح سند کا خیال نہ رکھنا اور شاعروں کے اصل ناموں کی طرف توجہ نہ دینا۔ رشید حسن خاں نے محی الدین زور کی گرفت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''مرتب کا شمار بھی معروف لوگوں میں ہوتا ہے اس لیے خیال یہ تھا کہ یہ انتخاب اعلا معیار پر پورا اترے گا بل کہ اچھے انتخاب کی صحت مند روایت کی تشکیل کرے گا مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ انتخاب ہر طرح کی خامیوں سے بھرا ہوا ہے۔ مرتب نے تحقیق اور تدوین کے آداب کی پابندی کو قطعاً غیر ضروری سمجھا ہے، صحت متن کے وہ قائل نہیں معلوم ہوتے، ماخذ کی نشان دہی ضروری نہیں سمجھتے اور واقعات اور سنین کی درستی کو اہمیت نہیں دیتے۔ یہی نہیں، انھوں نے غضب یہ کیا ہے کہ اشعار کے متن میں من مانی تبدیلیاں کی ہیں دوسروں کی نظموں اور غزلوں پر اپنی طرف سے عنوان چسپاں کیے ہیں اور نظموں کی ہیئت کو بھی تبدیل کرنے سے گریز نہیں کیا ہے۔'' 3

آل احمد سرور اور مجنوں گورکھپوری کے زیرِ نگرانی ''علی گڑھ تاریخ ادب اُردو''، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ سے طبع ہوئی۔ اس کتاب کی اشاعت کا اُردو قارئین کو بہت بے صبری سے انتظار تھا۔ لیکن جب یہ کتاب منظرِ عام پر آئی تو اس پر رشید حسن خاں کا تبصرہ شائع ہوا۔ جو کہ اس کتاب کی پزیرائی کے بجائے رسوائی کا سبب بنا۔ دراصل کتاب میں شامل مضامین غلطیوں کا انبار تھا۔ ایک ہی شاعر اور ادیب کے حوالے سے کتاب میں شامل مصنفوں کی مختلف آرا تھیں۔ کسی مقالہ نگار نے کسی ادیب کی پیدائش کی جو تاریخ لکھی تو دوسرے مقالہ نگار نے اسی سن کو سال وفات لکھا۔ اس طرح سے اس کتاب میں مرتب سے دوسری بہت سی غلطیاں بھی سرزد ہوئیں تھیں۔ رشید حسن خاں نے اس کتاب سے متعلق تبصرے میں لکھا ہے:

''ہمارے یہاں ناموں سے مرعوب کرنے کا اچھا خاصا رواج ہے کچھ مشہور افراد کے نام لکھ کر یہ فرض کرلیا جاتا ہے کہ ترتیب و تدوین کے تقاضے بھی پورے ہوگئے اور ہر قسم کی بے احتیاطیوں کے جواز کا منشور بھی ہاتھ آ گیا۔ یہ کتاب اس کی بہت اچھی مثال ہے۔ دو معروف نقاد پروفیسر آل احمد سرور اور جناب مجنوں گورکھپوری بالترتیب اس کے ڈائریکٹر اور اسٹنٹ ڈ ڈائریکٹر ہیں۔ تنقید میں دونوں حضرات کی جو بھی حیثیت ہو لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ پہلی جلد سراسر تاریخی و تحقیقی خشک بیانیوں کا مجموعہ ہے۔ تحقیق میں نہ پسی ہوئی بجلیاں ہوتی ہیں نہ دھلی دھلائی چاندنی۔ نہ اس میں اتنی لچک ہوتی ہے کہ حضرت موسیٰ کا ذکر ہو یا بیدل کی شاعری کا ہر موضوع کو فرضی صاحبزادی کو سمجھایا جاسکے۔ یہ نہایت خشک، نسبتاً غیر دلچسپ اور اس سے بھی زیادہ صبر آزما کاروبار ہے۔ آدمی اسی کا ہو رہے تب کچھ کرسکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس میں ہر قسم کی اتنی غلطیاں راہ پاگئیں کہ اب آب حیات کی غلطیاں راہ پا گئیں کہ اب آب حیات کی غلطیوں کو شمار کرنا اس کے ساتھ بھی ناانصافی ہے اور اس کتاب کے ساتھ بھی۔''4

''تاریخ ادب اُردو'' اُردو کے نامور محقق جمیل جالبی کی کتاب ہے۔ جو اُردو ادب میں انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔ بطور خاص طلبا و طالبات اس کتاب سے زیادہ سے زیادہ استفادہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ موجودہ دور میں بھی اس کتاب کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ لیکن اس کتاب میں بھی رشید حسن خاں نے کئی غلطیوں کی نشان دہی کی ہے۔ جیسے کئی مقامات پر جمیل جالبی نے حوالہ ہی نہیں دیا ہے اور ان حوالوں کو اولیت دی ہے جو ثانوی زمرے میں شامل کئے جانے کے لائق ہیں۔ سنین کے حوالے سے چشم پوشی اختیار کی ہے۔ بیش تر مقامات پر یہ نہیں معلوم ہو پاتا کی مصنف نے کتاب کے کس اڈیشن سے استفادہ کیا ہے۔ جس کتاب یا اڈیشن سے مدد لی گئی ہے کیا وہ اعتبار کے قابل ہے کتاب میں کہیں اُردو کے رشتۂ تولد کو پنجاب سے تو کہیں صوبہ سندھ اور کہیں سرحد کوہستان سے قرار دیا ہے۔ مزید یہ بھی اُردو کی نشو و نما بلوچستان سے وابستہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ مجموعی طور سے وہ یہ ثابت کرنے پر آمادہ نظر آتے ہیں کہ اُردو کی ابتدا پاکستانی خطے سے ہوئی ہے۔ جب کہ کسی بھی ماہر لسانیات نے اُردو کا رشتہ اس طرح سے نہیں ثابت کیا کہ اُردو کی پیدائش پاکستان کے کسی خطے سے ہوئی ہے۔ ان ساری غلطیوں کی نشان دہی کے ساتھ رشید حسن خاں نے مصنف کے کام کو سراہا بھی ہے:

''جمیل جالبی صاحب کی مرتب کی ہوئی یہ تاریخ فرد واحد کی کوشش کا نتیجہ ہے اور یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ یہ انفرادی کوشش اس پنچایتی پیوندکاری'' سے اس لحاظ سے بہتر ہے کہ یہ مختلف مضامین کا مجموعہ نہیں معلوم ہوتی (اگر اس کتاب کے آخر میں شامل ضمیموں سے قطع نظر کو روا رکھا جائے)۔ کتاب پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ مولف نے محنت کی ہے۔ ان کے نقطۂ نظر اور طریقہ کار سے اختلاف کیا جاسکتا ہے، مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انھوں نے تعلق خاطر کے ساتھ یہ کام کیا ہے۔''5

رشید حسن خاں تحقیق میں عجلت پسندی کے قائل نہیں ہیں۔ تدوین فسانۂ عجائب پر اپنا ایک دہائی سے زیادہ عرصہ صرف کرنے کے بعد جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ ایک نسخہ اور ہے تو انھوں نے از سرِ نو کتاب کی تدوین شروع کی۔ ان کی اس دیدہ وری کی اگر داد نہ دی جائے تو بڑی ناسپاسی ہوگی۔ کیوں کہ تحقیق سے وابستہ ہر فرد اس بات کا بخوبی علم رکھتا ہے کہ اپنے کام کو چند دن نہیں بل کہ آٹھ سے دس سال صرف کرنے کے بعد نئے سرے سے آغاز کرنا پڑے تو قوت حاسہ جواب دے جائیں گے۔ اس قسم کا جوہر رشید حسن خاں کی شخصیت کا ہی خاصہ ہوسکتا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق جو بھی محقق کسی سہو یا غلط بیانی کو گرفت نہیں کرتا تو یہی آگے چل کر مستند زمروں میں شامل کی جانے لگتی ہیں۔ مذکورہ کتاب کے علاوہ ''باغ و بہار، مثنوی گلزار نسیم، مثنویات شوق، مثنوی سحر البیان، مصطلحات ٹھگی اور زٹل نامہ جیسی کلاسکی کتابوں کی تدوین کا کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا۔

رشید حسن خاں نے اہم ادبی کارناموں کے علاوہ اُردو املا، الفاظ کی درستگی، زبان و قواعد کی تصحیح، وغیرہ پر بہت غور و فکر کرنے کے بعد کچھ اصول وضع کیے جو اُردو ادب کے لیے انتہائی کارآمد ثابت ہوئے۔ اس ضمن میں ان کی تحریر کردہ کتابوں میں ''اُردو املا، زبان و قواعد، عبارت کیسے لکھیں، اُردو کیسے لکھیں، انشا اور تلفظ وغیرہ ہیں ساتھ ہی اس سے متعلق انھوں نے کئی مضامین بھی رقم کیے ہیں۔ حالاں کہ اس سے قبل مولانا احسن مارہروی اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے اس طرف توجہ مرکوز کی تھی۔ ان بزرگوں کی کوششوں سے یہ ضرور ہوا کہ صحت الفاظ سے متعلق کچھ اصول ضرور سامنے آئے لیکن مرتب اصول نہ ہونے کی وجہ سے پوری طرح سے انتشار دور نہیں کیا جاسکا۔ ایسے وقت میں رشید حسن خاں نے اپنی ان تھک کاوشوں کے ذریعے اُردو زبان میں راہ پانے والی غلطیوں کو حتی الامکان دور کرنے کی سعی کی۔

مجموعی طور سے دیکھا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رشید حسن خاں نے اپنے زندگی کا بیش تر حصہ اُردو زبان و ادب کی خدمت میں گزار دیا۔ انھوں نے اُردو تحقیق میں رائج تن آسانی اور سہل پسندی کی گرفت کی اور اپنے تنقیدی مضامین سے یہ ثابت کر دیا کہ زمانے کا کتنا ہی معتبر اور معزز ادیب کیوں نہ ہو اگر اس کے فن میں خامی ہے، تو اس کی وضاحت ضروری ہے۔ یہ بات پورے اعتماد سے کہی جا سکتی ہے کہ رشید حسن خاں کے ادبی کارناموں کی حیثیت قدر اول کی ہے۔ ان کی کاوشوں کو کسی طرح سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

حواشی

1۔ نیا دور لکھنؤ دسمبر 2007، ص 13۔14

2۔ رشید حسن خاں شخصیت اور ادبی خدمات، ص 13۔14 مرتبہ، اطہر فاروقی ماہنامہ کتاب نما۔ جامعہ نگر نئی دہلی۔ صفحہ 25، 2002

3۔ ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ، رشید حسن خاں، ص 215 اتر پردیش اُردو اکادمی لکھنؤ، 1990

4۔ ایضاً، ص 255

5۔ ایضاً، ص 285

(سہ ماہی فروغ اُردو ادب، بھوبنیشور، جولائی تا ستمبر 2018، صفحہ 19 تا 22)

○○○

ڈاکٹر شمیم طارق

استاد، شعبۂ اُردو، انٹرنیشنل اسلامک یونی ورسٹی، اسلام آباد

رشید حسن خاں: بہ حیثیت محقق و مدوّن

محققین و تدوین میں سب سے اہم مسئلہ مزاجی مناسبت کا ہے۔ اس کے بغیر نہ تو تحقیق کا حق ادا ہوتا ہے اور نہ ہی تدوین کو ٹھوس بنیادیں فراہم ہوتی ہیں۔ ترتیب و تصحیح متن کے لیے موزوں ترین شخص وہ ہے جو آدائے تحقیق سے پوری طرح باخبر ہو اور اسے تحقیق سے مزاجی مناسبت ہو۔ گویا تحقیق کا ہونا لازمی ہے تاہم اس کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے اولین حیثیت مزاجی مناسبت ہی کو حاصل ہے۔

تحقیق و تدوین کے میدان میں رشید حسن خاں کا نام کسی تحسین وستایش کا محتاج نہیں۔ ان کا شمار اُردو کے جدید محققین میں ایک اہم اور معتبر نام کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ انھوں نے قدیم متون کی ترتیب و تحقیق ہی کا کام نہیں کیا بل کہ جدید تحقیق کے آداب واصول اور معیار کو بھی متعین کرنے کی کوشش کی۔ ان کے نزدیک تحقیق ایک مشکل اور ضبط و تحمل کا کام ہے جس میں جذبات و تاثرات، ذاتی پسند و ناپسند کی قطعاً کوئی گنجایش نہیں ہوتی۔ یہ ایک ایسا فن ہے جو گہرے مطالعے اور علمی بصیرت کا متقاضی ہے۔ اس میں محقق کو صبر سے کام لینا پڑتا ہے کیوں کہ عجلت میں غلطی کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔

رشید حسن خاں نے اپنے بعض مضامین میں تحقیق کے اصولوں سے بحث کی ہے اور محققین میں معروضیت کی اہمیت کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح وہ ان ابتدائی محققین میں ہیں جنھوں نے تحقیقی کو سائنٹفک بنیاد فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ ادبی تحقیق کے ضمن میں ان کا موقف یہ ہے:

> ''تحقیق ایک مسلسل عمل ہے۔ نئے واقعات کا علم ہوتا رہے گا، کیوں کہ ذرائع معلومات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کون سی حقیقت کتنے پردوں میں چھپی ہے۔ اکثر صورتوں میں یہ ہوتا ہے کہ حجابات بالتدریج اُٹھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تحقیق میں اصلیت کا تعین اس وقت تک حاصل شدہ معلومات پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ واضح ہونا چاہیے کہ اس سے نئی معلومات کے امکانات کی نفی نہیں ہو سکتی لیکن یہ بات بھی اس قدر وضاحت کے ساتھ سمجھ لینا چاہیے کہ محض آیندہ کے امکانات کی بنا پر ان باتوں کو بطور واقعہ نہیں مانا جا سکتا جو اس وقت محض قیاس آرائی کا کرشمہ ہوں۔''(1)

گویا تحقیق ''معلوم'' اور ''موجود'' مواد کی روشنی میں اپنا سفر جاری رکھتی ہے۔ اسی لیے ادبی تحقیق میں نئی معلومات اور نئے انکشافات سے نئی باتیں بہ امتدادِ زمان سامنے آتی رہتی ہیں جس سے قائم شدہ صورتِ حال میں اضافہ اور تبدیلی دونوں کے امکانات موجود رہتے ہیں۔

تحقیق کا دارومدار حوالے واسناد پر ہوتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ جو مواد حاصل ہوا سے خوب پرکھا جائے۔ رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

> ''تحقیق میں دعوے سند کے بغیر قابلِ قبول نہیں ہوتے اور سند کے لیے ضروری ہے کہ قابلِ اعتماد ہو... بظاہر حالات، حوالہ، مشکوک نہ معلوم ہوتا ہو اور دلیل منطق کے خلاف نہ ہو۔''(2)

اس ضمن میں ان کا مضمون ''غیر معتبر حوالے'' اہمیت کا حامل ہے جس میں انھوں نے حوالوں کی قبولیت کی چند شرائط بیان کی ہیں، مثلاً:

> ''روایت اور واقعے کے درمیان طویل زمانی فعل حائل نہ ہو۔ راوی غیر معتبر نہ ہو۔ روایت پر غلط فہمی، جانب داری یا اس نوع کے دوسرے اثرات کا عمل دخل نہ ہو۔ راوی کا زمانہ اگر موخر روایت کی بنیاد اولین ماخذ ہو۔''

رشید حسن خاں کے نزدیک مشکوک حوالوں پر بھروسا کرنے سے تحقیقی عمل کی صداقت مشکوک ہو جاتی ہے۔ لہٰذا محقق کے لیے اصل ماخذ تک رسائی بے حد ضروری ہے ورنہ تحقیق میں غلطی کا اندیشہ رہے گا۔ رشید حسن خاں نے حافظ محمود خاں شیرانی کے یہاں بعض تسامحات کا ذکر کیا ہے۔ محمود شیرانی نے اپنے تحقیقی کام میں بیاضوں کو بہ طور سند قبول کیا ہے جو رشید حسن خاں کے نزدیک مشکوک ہیں، لکھتے ہیں:

> ''بعض اور لوگوں کی طرح شیرانی مرحوم نے بھی اپنی کتاب ''پنجاب میں اُردو'' میں بیاضوں کے حوالے دیے ہیں، ان کی تحریروں کو پڑھ کر ہم لوگوں نے تحقیق کے آداب سیکھے ہیں اور اس لحاظ سے ان کو استاد بل کہ استاذ الاساتذہ کہنا چاہیے مگر مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ کسی وجہ سے انھوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ پنجاب کو اُردو کا مولد ثابت کرنا ہے اور پھر اس طے شدہ نقطۂ نظر کے تحت انھوں نے ہر طرح کے حوالوں کو بلا تکلف قبول کر لیا۔''(3)

رشید حسن خاں تحقیق کے معاملے میں کسی مروت یا رعایت کے ہرگز قائل نہ تھے۔ وہ حافظ محمود شیرانی کو استاذ الاساتذہ کا درجہ دیتے تھے اس کے باوجود ان کے یہاں اغلاط کی نشان دہی میں کوئی رعایت نہیں کی۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اکثر ناقابلِ اعتماد حوالوں پر اعتماد کر لینے سے بہت سی غلطیاں راہ پا جانے کا قوی اندیشہ ہوتا ہے کیوں کہ بعد میں محققین اصل ماخذ کی طرف کم ہی رجوع کرتے ہیں اور ان محققین کے حوالوں کو بغیر تصدیق کے درست مان لیتے ہیں۔ اس طرح تحقیقی کام میں اغلاط کا سلسلہ جاری رہنے کا امکان ہوتا ہے اور یہی اغلاط آیندہ کے تحقیقی کام میں سند کے طور پر نقل ہوتی رہتی ہیں۔ اس لیے رشید حسن خاں اسناد و حوالے کو اچھی طرح چھان پھٹک کے بعد قبول کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔

رشید حسن خاں تحقیق و تدوین میں جن شخصیات سے متاثر ہیں ان میں حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی شامل ہیں۔ تدوینِ متن کے سلسلے وہ امتیاز علی خاں عرشی کے بے حد

مداح ہیں اور انھیں اپنا استادِ معنوی مانتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''میں نے تحقیق کے اصول وآداب سیکھے حافظ محمود خاں شیرانی سے۔ اس کے بعد قاضی عبدالودود اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی سے استفادہ کیا اور سب سے آخر میں مولانا عرشی مرحوم سے فیض پایا، لیکن سب سے پہلے تحقیق کی طرف متوجہ کیا نیاز فتح پوری کی تحریروں نے۔ ان تحریروں نے تحقیق کی ضرورت کا احساس دلایا اور اس کی اہمیت سے آشنا کیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس ذہنی کشمکش سے دوچار کیا جو مکمل تسکین اور کامل یقین کا مطالبہ کرتی ہے اور تشکیک سے ذہن کو آشنا کیا جو تحقیق کی بنیاد بنتی ہے۔''(4)

مذکورہ بالا محققین سے استفادے اور مداہی کے باوجود ان محققین کی تسامحات سے صرفِ نظر نہیں کرتے بل کہ ان کی بھی گرفت کرتے ہیں۔ دیوانِ غالب نسخۂ عرشی میں ان غزلوں کی شمولیت کے ضمن میں، جو مولانا عرشی کو کسی بیاض میں ملی تھیں، رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

''ان غزلوں کو محض ان مجہول بیاضوں میں اندراج کی بنا پر شاملِ دیوان ہونا ہی نہیں چاہیے تھا۔''(5)

رشید حسن خاں نے اولین ماخذ تک رسائی کی تحقیق میں ناگزیر تصور کیا ہے وہ خود بھی جب تک سارے شواہد جمع نہ کر لیں قلم نہیں اُٹھاتے اور دیگر محققین کو بھی یہی انداز اپنانے کا مشورہ دیتے ہیں۔ وہ تحقیق کو ایک Scientific Process گردانتے ہیں، جس میں ذرا سی غلطی یا کوتاہی اصل نتائج سے دور لے جا سکتی ہے۔ انھوں نے اخذ نتائج میں تنقیدی تعبیر کی مخالفت کی اور ایسی تحقیق پر سوالیہ نشان لگایا جس میں کسی امر کو اسناد اور حوالوں کی روشنی میں پرکھے بغیر قبول کر لیا گیا ہو۔

رشید حسن خاں تحقیق کو ایک جاری رہنے والا مسلسل عمل سمجھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ نئے نئے انکشافات کے لیے تحقیق ہر وقت اپنے در وا رکھتی ہے۔ وہ تحقیق میں عجلت کو انتہائی مہلک تصور کرتے ہیں۔ انھیں آج کی تحقیق پر یہ اعتراض بھی ہے کہ ہر کام تحقیقی اصولوں کو نظر انداز کر کے عجلت میں کیا جاتا ہے، لکھتے ہیں:

''حالات کے تقاضے کم معیاری کے اسباب تو ہو سکتے ہیں لیکن کم معیاری کے لیے وجہ جواز نہیں بن سکتے۔''(6)

رشید حسن خاں کے نزدیک تحقیق کی زبان صاف اور واضح ہونی چاہیے۔ اس میں ابہام کی بالکل گنجایش نہیں۔ لکھتے ہیں:

''تحقیق کی زبان کو امکان کی حد تک آرایش اور مبالغے سے پاک ہونا چاہیے۔ اور صفاتی الفاظ کے استعمال میں بہت زیادہ احتیاط کرنا چاہیے، اُردو میں تنقید جس طرح انشا پردازی کا آرایش کدہ بن کر رہ گئی ہے وہ عبرت حاصل کرنے کے لیے کافی ہے اور تحقیق کو اس حادثے کا نشانہ نہیں بننے دینا چاہیے۔''(7)

رشید حسن خاں تحقیق اور تنقید کو بنیادی طور پر دو مختلف موضوع مانتے ہیں۔ اس طرح تحقیق اور تدوین بھی ان کے نزدیک الگ الگ فنون ہیں۔ ہر چند تحقیق و تدوین کی حدود کہیں کہیں مل ضرور جاتی ہیں اور عام لوگ تدوین کو تحقیق کا جز سمجھتے ہیں، جو درست نہیں ہے۔ صورتِ حال اس سے بالکل مختلف ہے، یعنی تدوین کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ آدابِ تحقیق سے گہری واقفیت رکھتا ہو۔ تحقیق کا آدمی متن کی معیاری تدوین بھی کر سکے، یہ ضروری نہیں۔(8)

تحقیق و تدوین کے اسی امتیاز پر ڈاکٹر اسلم پرویز رشید حسن خاں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''تحقیق اور متنی تنقید رشید حسن خاں کے دو خاص میدان ہیں۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ اعلا پایے کی تحقیق اور تنقید کے نمونے ہمارے سامنے پیش کیے ہیں بل کہ تحقیق اور متنی تنقید کے اصول وضوابط پر کتابیں بھی تالیف کی ہیں۔ اس طرح وہ تحقیق اور عملی تنقید دونوں کے مردِ میدان ہیں۔ ان کے تحقیقی عمل میں تضاد ڈھونڈ نکالنا بہت مشکل ہے اور یہی دراصل کسی شعبہ علم میں خصوصی مہارت کے صحیح معنی ہیں۔ اکثر ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض لوگ تھیوری کے تو بڑے ماہر ہوتے ہیں لیکن عملی طور پر جب وہ خود کچھ کرنے بیٹھتے ہیں تو کوئی مثالی کام انجام نہیں دے پاتے۔ دوسری طرح کے لوگ وہ ہیں جو خداداد صلاحیت کے بل پر اچھا کام تو سرانجام دے لیتے ہیں لیکن نئے کام کرنے والوں کی تربیت کی صلاحیت ان میں نہیں ہوتی۔ رشید حسن خاں کا امتیاز یہی ہے کہ وہ دونوں محاذوں پر چاق و چوبند ہیں۔''(9)

رشید حسن خاں نے جن کلاسکی متون کی تصحیح و تدوین کی وہ ان کے تحقیقی ذوق اور تنقیدی شعور کا بیّن ثبوت ہے۔ تنقید و تحقیق جیسی نعمتوں کا بیک وقت کسی ایک شخصیت میں یک جا ہونا مدوم ہے۔ لیکن قدرت نے یہ دونوں نعمتیں خاں صاحب کو ودیعت کی۔

رشید حسن خاں کی بیش تر کتابیں مکتبہ جامعہ نئی دہلی اور انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی سے شائع ہوئیں۔ خاں صاحب کے مرتب کردہ نسخوں کی فہرست باب اول میں دی گئی ہے تاہم اس ضمن میں ان کے تین ناقابلِ فراموش کارنامے ''فسانۂ عجائب''، ''باغ و بہار'' اور ''زٹل نامہ'' پر تفصیلی بحث کی جائے گی۔ رشید حسن خاں نے تدوین کی بھی حدود متعین کی ہیں، لکھتے ہیں:

''تدوین کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی متن کو ممکن حد تک منشائے مصنف کے مطابق پیش کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس میں بنیادی حیثیت صحتِ متن کی ہوتی ہے۔''(10)

اختلافِ نسخ بھی ادبی تحقیق کے اہم مسائل میں سے ہے کیوں کہ کبھی کوئی شعر یا عبارت کسی نسخے میں کسی اور طرح درج ہوتی ہے اور دوسرے نسخے میں کسی اور طرح۔ اختلافِ نسخ کی کچھ وجوہ ہو سکتی ہیں۔ ممکن ہے شاعر یا مصنف نے دانستہ یہ تبدیلی کی ہو یا کاتب کی لاپرواہی سے یہ سب ہوا ہو۔ سبب کچھ بھی ہو مدون کے لیے یہ فیصلہ کرنا کہ کون سا متن حسب منشائے مصنف ہے، بے حد مشکل کام ہوتا ہے۔ اس میں کسی ایک نسخے کی بنیاد پر یا عجلت میں کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ تمام ممکن الحصول چیزوں سے استفادہ نہ کر لیا جائے۔ بہ صورتِ دیگر تدوین غیر معیاری اور اغلاط کی حامل ہوگی۔

قدیم متون، جو آپ رسیدگی یا کم خوردگی کی وجہ سے جگہ جگہ سے ضائع ہو جاتے ہیں ان کی تدوین میں رشید حسن خاں قیاسی تصحیح کو جائز سمجھتے ہیں لیکن اس تصحیح کا دائرہ اتنا وسیع نہ ہو جائے کہ اصل متن مرتب کے تابع مہمل معلوم ہونے لگے۔(11)

قدیم متون کی تدوین کے وقت انھیں جدید املا میں لکھنے کی رشید حسن خاں نے سخت مخالفت کی ہے۔ ان کے نزدیک جس عہد میں جو املا رائج ہوتا ہے وہ اس عہد کی شناخت ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کی تبدیلی سے آج اور سو سال پرانی تحریر میں کوئی فرق نہیں رہ جائے گا۔ رشید حسن خاں کے نزدیک یہ تحریف ہے جس کا مرتب کو کوئی حق نہیں ہے۔ اس ضمن میں ان کا کہنا ہے:

''قدیم متن اور مخطوطے مصنفین کے ہاتھوں سے لکھے تو بہت ہی کم یاب ہیں اور زیادہ تر کاتبوں ہی کی روش میں لکھے ملتے ہیں اس لیے متن میں مصنف کی منشا کو سمجھنا چاہیے۔ لیکن اگر

ہمیں کسی قابلِ اعتبار ذریعے، کسی مصنف کے کسی خاص املا کو اختیار کرنے کا علم ہوجاتا ہے، جیسے مثلاً غالب کے خطوط کے ذریعے سے کچھ الفاظ کے مخصوص اِملا کا علم ہوتا ہے؛ تو ایسی صورت میں معاملہ مختلف ہوجاتا ہے۔ ایسی صورت میں تقلید مصنف کے مختارات ہی کی کرنی چاہیے۔ لیکن جن مصنفین کی خطی تحریریں ناپید ہیں یا جن کے مختارات سے ہم لوگ لاعلم ہیں ان کے متون مرتب کرتے وقت ان کے املا نے کے باقی لکھنے والوں کی روش برقرار رکھنی چاہیے۔(12)

رشید حسن خاں کی اس بات سے کامل اتفاق کیا جاسکتا ہے کیوں کہ انگریزی اور دوسری زبانوں میں بھی تو یہی طریقہ رائج ہے، چاسر اور شیکسپیئر کی تحریروں کو ان کے زمانے کے املا کی صورت میں درج کیا گیا ہے لیکن ہمارے یہاں اکثر دکنی متون کی تدوین یا کلاسیکی شعرا کے الفاظ اور ان کا املا تبدیل کر دیا گیا ہے جو ''تحریف'' کے زمرے میں آتی ہے۔

تدوین کے سلسلے میں ''فسانۂ عجائب'' اور ''باغ و بہار'' خاں صاحب کے دو ایسے ناقابلِ فراموش کارنامے ہیں جن کی شہرت اپنے مقدمات کی بدولت بھی ہے۔ ان کے مرتب کردہ نسخوں میں اہم کلاسیکی متون متعلق عام مباحث کو پیش کیا گیا ہے اور یوں بہت سے اہم تدوینی مسائل کی وضاحت سے بھی بہت سے نکات روشن ہوئے ہیں۔ ان متون کی تیاری میں رشید حسن خاں کی محنتِ شاقہ، دیدہ ریزی، عمیق نظر اور تدوینی اصولوں کی پابندی کی داد دینا پڑے گی۔ ان متون میں تدوینی اصولوں کی مکمل پابندی سے متعلق عین الحق حقی لکھتے ہیں:

''انھوں نے ایڈیٹنگ کی تمام شرائط پوری کی ہیں جو ایک ذمہ دار مرتب پر اصولاً عائد ہوتی ہیں۔ تمام معلوم نسخے جمع کیے جائیں، پھر کسی نسخے کو بنیاد بنایا جائے، اختلافات اور عہد بہ عہد ترمیم و اضافہ کی بھی وضاحت کی جائے۔ انھوں نے ایک ایک لفظ پر پوری توجہ کی ہے۔ طلبا کی ضرورت کو مدِنظر رکھتے ہوئے تلفظ کی وضاحت کے لیے اعراب بھی کثرت سے لگائے ہیں۔ ہر چیز کو آئینہ کر دیا ہے۔''(13)

رشید حسن خاں کی شہرۂ آفاق تدوین کو انجمن ترقی اُردو ہند نے 1990 میں شائع کیا۔ تدوین بہ ذاتِ خود ایک جوکھم بھرا کام ہے، پھر فسانۂ عجائب جس کی ادق زبان اور مختلف اڈیشنوں میں مصنف رجب علی بیگ سرور کی ترامیم اور اضافے، محققین کے لیے چیلنج سے کم نہ تھے لیکن خاں صاحب نے اسے منشائے مصنف کے مطابق پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنی توجہ صحتِ متن پر مرکوز کی۔

''فسانۂ عجائب'' مرتبہ رشید حسن خاں کے ابتدائی 114 صفحات کا مقدمہ ان کے عالمانہ وقار میں مزید اضافہ کرتا ہے۔ مقدمے میں خاں صاحب نے تدوین اور اس کے لوازمات کو بہ خوبی بیان کیا ہے، اجمالاً ذیل میں بھی درج کیے جاتے ہیں:

1۔ تدوین کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی متن کو ممکن حد تک منشائے مصنف کے مطابق پیش کرنے کی کوشش کی جائے۔

2۔ مصنف نے آخری عبارت کس طرح لکھی تھی، یہ سب سے اہم مسئلہ ہوتا ہے۔

3۔ الفاظ کے تعین اور ان کی صورت نگاری کی صحتِ متن اصل اہمیت ہوتی ہے۔

4۔ کسی کتاب کے مختلف نسخوں کو (اگر موجود ہوں) سامنے رکھنا ضروری بل کہ لازمی ہے۔

5۔ مدون کے لیے لازمی ہے کہ منتخب الفاظ پر اعراب ضرور لگائے۔ اضافت کے لیے زیر اور تشدید اور علامات کا استعمال بھی ضروری ہے۔

6۔ مرتب یا مدون کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ہر مصنف کے مختارات اور اس کے عہد کے چلن سے خوب واقف ہو اور ان کی وضاحت کے لیے حواشی میں ضروری تفصیلات درج کرے۔

7۔ مرتب کا اصل کام یہ ہے کہ وہ متن کو صحیح طور پر پیش کرے اور متن سے متعلق بحث کو مناسب تفصیل سے لکھے۔

8۔ مصنف کے حالاتِ زندگی کے بجائے کتاب کے اُن نسخوں کا تعارف زیادہ ضروری ہے جن سے متن کی تصحیح میں مدد لی گئی ہے۔ کیوں کہ خاں صاحب کے مطابق مصنف کی فصل سوانح تشکیل کرنا، داستان کے ماخذ کی نشان دہی اور اس کا تنقیدی جائزہ تدوینِ متن میں داخل نہیں، سوانح یا ماخذ کو مختصراً دیا جاسکتا ہے۔ مدون کو محض متعلقاتِ متن پر توجہ مرکوز رکھنی چاہیے۔

9۔ مقدمے کے آخر میں باعثِ تاخیر کے عنوان سے رشید حسن خاں نے بیان کیا کہ متن کی ترتیب اور اختلافِ نسخ کا سارا کام مکمل ہو گیا تھا کہ انھیں پتا چلا کہ پٹنہ میں مصنف کا نظرِ ثانی شدہ 1280ھ کا اڈیشن ہے۔ اسے دیکھ کر آسانی کی صورت یہ تھی کہ کتابت شدہ متن کو اسی طرح رہنے دیا جاتا اور آخر میں ایک نوٹ زمال کر دیا جاتا لیکن رشید حسن خاں نے اس نسخے کی دریافت پر متن کو از سرِ نو مرتب کیا۔

''فسانۂ عجائب'' میں تدوین کے جو اصول وضع کیے گئے خاں صاحب نے اس پر پوری طرح عمل بھی کیا ہے۔ ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی کا یہ اقتباس اس ضمن میں بڑی اہمیت کا حامل ہے:

''مقدمہ ابنِ خلدون کی شہرت چہار دانگ عالم میں ہے لیکن کہا جاتا ہے کہ ابنِ خلدون نے تاریخ نویسی کے جو اصول مقدمے میں قائم کیے ہیں، وہ انھیں خود اپنی تاریخ میں نبھا نہیں سکے ہیں۔ چناں چہ تاریخ ابنِ خلدون میں تاریخ نویسی کے وہ سارے عیوب موجود ہیں جن پر ابنِ خلدون نے اپنے مقدمے میں سخت نکیر کی ہے لیکن رشید حسن خاں پر اس قسم کا کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا کہ انھوں نے تدوینِ متن کے سلسلے میں خود اپنے قائم کردہ فلاں فلاں اصولوں کی خلاف ورزی کی ہے بل کہ ان کی مرتبہ کتابوں کے مطالعے کے بعد یہی تاثر قائم ہوتا ہے کہ موصوف نے اپنی تمام تر وہبی و اکتسابی صلاحیتیں یہاں صرف کر دی ہیں اور ساری عمر کے مطالعے کے اور معلومات کا عطر ان کتابوں کے حواشی میں کشید کر کے رکھ دیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کی مرتبہ کتابیں تدوینِ متن کا معیاری اور مثالی نمونہ ہیں۔''(14)

رشید حسن خاں نے سرور کی ولادت، وطن، وفات اور مدفن کا اجمالاً ذکر کیا ہے۔ تاہم انھوں نے یہاں ایک اہم اطلاع یہ دی کہ 1283ھ میں منشی نول کشور نے فسانۂ عجائب کا حقِ اشاعت خرید کر اس کا پہلا اڈیشن شائع کیا لیکن اس سے پہلے نول کشور اس کتاب کو شائع کر چکے تھے۔ سرور کے حالاتِ زندگی کے ضمن میں رشید حسن خاں نے بعض اہم ماخذ سے استفادہ نہیں کیا جس کا ذکر ڈاکٹر گیان چند جین نے کیا ہے۔ گیان چند جین لکھتے ہیں:

''سرور کے وطن کے سلسلے میں بھی یہ عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ لکھنؤ کے باشندے تھے لیکن ڈاکٹر حنیف احمد نقوی نے تین قدیم تذکروں میں کچھ اور ہی پایا۔ مبتلا و عشق میرٹھی نے تذکرہ طبقاتِ سخن میں اور خیراتی لال بےجگر نے اپنے تذکرے میں انھیں خوش باش شہر کالنہ پور لکھا ہے۔ خوب چند ذکا نے بھی معیار الشعرا میں انھیں ساکن کالنہ پور قرار دیا ہے۔ یہ بیانات اس وقت کے ہیں جب سرور نے فسانۂ عجائب نہیں لکھی تھی۔ حیرت ہے کہ ڈاکٹر نیر مسعود اور رشید حسن خاں اپنی اپنی کتاب مرتب کرتے وقت ان تینوں کے ماخذ

سے ناواقف تھے۔''(15)

ڈاکٹر گیان چند جین نے بعض اہم مطالب کو حاشیے میں درج کرنے پر رشید حسن خاں پر اعتراض کیا ہے۔ ان کے نزدیک ان اہم مطالب کو متن میں جگہ دی جانی چاہیے نہ کہ حاشیے میں، لکھتے ہیں:

''رشید حسن خاں نے اس کتاب میں، نیز باغ و بہار میں فٹ نوٹ میں بہت سے اہم مطالب درج کیے ہیں جن کا متن مقدمہ سے براہِ راست تعلق ہے۔ انھیں حاشیے میں کیوں جگہ دی گئی، متن میں کیوں نہیں...خاں صاحب کے ذہن میں حاشیے کی حصار کی بات صاف نہیں معلوم ہوتی۔ فٹ نوٹ میں عام سے ماخذ کا حوالہ دیا جاتا ہے یا ایسے تبصرے جو متن میں دیے جائیں تو دخل در معقولات معلوم ہوں۔ حتی الامکان تبصراتی حاشیے متن ہی میں شامل کرنے چاہئیں۔ حواشی متن پر غالب نہ ہونے پائیں نہ اس کے حریف ہوں۔''(16)

ڈاکٹر گیان چند جین کی اس بات سے اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ فٹ نوٹ میں صرف عام ماخذ کا حوالہ دیا جائے اور اہم مطالب کو متن میں درج بریکٹ ڈال کر درج کیا جائے۔

گیان چند جین نے رشید حسن خاں کے اس دعوے کی بھی تردید کی ہے کہ نوطرزِ مرصع کے علاوہ قصہ کہانیوں کی کوئی کتاب ادق زبان میں نہیں لکھی گئی۔ اس ضمن میں گیان چند نے حکیم مہجور کی ''گلشنِ نوبہار'' کو بہ طور مثال پیش کیا ہے اور اس سلسلے میں فسانۂ عجائب کو مذکورہ کتاب کے اسلوب کی تقلید قرار دیتے ہیں۔(17)

''فسانۂ عجائب'' کی زبان و بیان پر عالمانہ گفتگو بھی مقدمہ میں ص 61 سے 74 تک کی گئی ہے۔ اس بحث میں خاں صاحب سرور کی زبان کی جہاں تعریف کی وہاں بھدّے پن اور بے کیفی کو بھی معرضِ بحث میں لائے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''فسانۂ عجائب کی نثر میں بہت سے مقامات پر کچا پن محسوس ہوتا ہے اور لفظی رعایتوں کی غیر ضروری پابندی نے بے ڈھنگا پن بھی پیدا کیا ہے...متعدد مقامات پر بیان میں ایسا بھدّا پن ہے کہ اسے بے اختیار پھوہڑ پن کہنے کو جی چاہتا ہے۔''(18)

رشید حسن خاں نے اس ضمن میں جو مثالیں دی ہیں ان سے جہاں سرور کے یہاں بھدّے پن اور بے کیفی کی نشان دہی ہوتی ہے وہاں خاں صاحب کی خود اعتمادی اور تنقیدی نظر کی بھی داد دینی پڑتی ہے۔ انھوں نے متن کا جو لسانی تجزیہ کیا ہے وہ بھی ان کی تنقید کی بصیرت تبحر علمی پر دال ہے۔ وہ صرف ایک محقق، مدون اور نقاد ہی نہیں بل کہ ایک ماہرِ املا و قواعد کے طور پر بھی اپنا تشخص بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

رشید حسن خاں نے مقدمہ میں قلمی اور مطبوعہ نسخوں کی تفصیل بھی دی ہے اور یہ بھی بیان کیا ہے کہ فسانۂ عجائب کا انھیں کوئی ایسا نسخہ نہیں ملا جو عہدِ مصنف کا مکتوبہ ہو اور اس سے متن کی تصحیح و ترتیب میں مدد لی جا سکے۔ انھوں نے بعض دستیاب نسخوں کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''پھر یہ بات بھی ہے کہ یہ نسخے میرے دائرۂ کار سے قریب کی نسبت بھی نہیں رکھتے۔ میرا اصل مقصد تو اس متن کی اس صورت کو پیش کرنا ہے جسے آخری بار مصنف نے پیش کیا تھا اور اس میں ان نسخوں کے مباحث کے شمول کی نہ گنجایش ہے نہ ضرورت۔''(19)

رشید حسن خاں نے فسانۂ عجائب کی تدوین میں پانچ نسخوں کو منتخب کیا۔ ان مطبوعہ نسخوں کے مخفف کے طور پر حرفی علامات ح، ک وغیرہ کو استعمال کیا ہے۔ ہر چند اس سے شاید مرتب کے لیے سہولت کا سامان ہو لیکن قاری کا اُلجھن میں مبتلا ہو جانا فطری ہے۔ اس سے بہتر تھا کہ خاں صاحب لفظی مخففات پر اکتفا کرتے تا کہ قاری کے ذہن کو بھٹکنا نہ پڑتا۔ تدوین کے لیے منتخب کردہ مطبوعہ نسخوں میں اشاعتِ اول بھی شامل ہے جسے ''ح'' مخفف سے ظاہر کیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہ میر حسن رضوی کے مطبع حسنی سے پہلی بار 1259ھ میں چھپی اور اسی مناسبت سے اس کا مخفف ''ح'' درج کیا گیا۔ اسی مطبع سے ''فسانۂ عجائب'' کی دوسری اشاعت 1263ھ میں ہوئی۔ خاں صاحب نے دوسرے نسخے کے لیے ''ض'' مخفف درج کیا جس میں بہ ظاہر کوئی مناسبت نظر نہیں آتی۔ ''نسخۂ ض'' کا اختصاص یہ ہے کہ یہ رجب علی بیگ سرور کا نظرِ ثانی اڈیشن ہے اور اس کے بعد کے اکثر اڈیشن اسی نسخے پر مبنی ہیں۔

تیسرا ''نسخۂ ک'' ہے جو مطبع محمدی کان پور سے 1267ھ میں شائع ہوا۔ اس ضمن میں ''ک'' کا تلازمہ کان پور کے لیے قرینِ فہم ہے۔ اس نسخے میں سرور نے بہت سی ترامیم کیں لیکن اس نسخے کو قبولِ عام نہ ملا۔

''فسانۂ عجائب'' کا چوتھا نسخہ 1276ھ میں مولوی محمد یعقوب کی فرمایش پر انھی کے مطبع سے شائع ہوا۔ اسے خاں صاحب نے ''نسخۂ ف'' کا نام دیا ہے۔ اس نسخے کی خصوصیت یہ ہے کہ مولوی یعقوب کی فرمایش پر اس پر سرور نے مکمل نظرِ ثانی کی۔

''نسخۂ ل'' مولوی یعقوب ہی کے مطبع سے 1280ھ میں شائع ہوا، اور یہ سرور کا آخری بار نظرِ ثانی کیا ہوا نسخہ ہے۔ ''فسانۂ عجائب'' کے حقوقِ اشاعت خریدنے کے بعد منشی نول کشور نے 1283ھ میں ''فسانۂ عجائب'' کو بڑے اہتمام سے شائع کیا اور اس نسخے کو بھی خاں صاحب نے مدِ نظر رکھا اور اسے ''نسخۂ ن'' کا نام دیا۔

رشید حسن خاں نے بنیادی نسخے کے طور پر ''نسخۂ ل'' کو منتخب کیا کیوں کہ وہ مصنف کا نظرِ ثانی کیا ہوا آخری نسخہ ہے۔ ''نسخۂ ل'' میں:

1۔ ہائے مخلوط اور ملفوظ میں صورت کا امتیاز نہیں رکھا گیا۔

2۔ یائے معروف و مجہول کی کتابت میں فرق کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔

3۔ تشدید کا التزام نہیں ملتا، کہیں ہے اور کہیں نہیں ہے۔

4۔ پیراگراف کا اہتمام نہیں کیا گیا۔

5۔ ضمہ کو ظاہر کرنے کے لیے بعض الفاظ میں الف کے بعد واو کو لکھا گیا ہے جیسے اوس (اُس)، اوستاد (اُستاد)۔

رشید حسن خاں نے ''نسخۂ ل'' میں درج ذیل باتوں کا خیال رکھا:

1۔ ہائے مخلوط اور ملفوظ میں کتابت کے امتیاز کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

2۔یاے معروف اور مجہول کی کتابت میں تفریق کو بھی ملحوظ رکھا گیا اور یاے مخلوط کے لیے اس پر آٹھ کے ہندسے کا نشان دیا گیا۔
3۔مشدد حروف پر تشدید لگانے کی پابندی کی گئی۔
4۔پیرا گراف بنائے گئے۔
5۔واوِ معدولہ کے نیچے خط لگایا گیا۔
6۔لفظ کے درمیان واقع نونِ غنہ پر قوس کا اُلٹا نشان لگایا گیا۔
7۔حروف پر اعراب لگائے گئے اور واو کو نکال کر اس کی جگہ الف پر ضمہ لگایا گیا جیسے، اُس، اُستاد وغیرہ۔
8۔علامات، نشانات، اعراب اور رموزِ اوقاف کو شاملِ عبارت کیا گیا۔

ڈاکٹر گیان چند نے متن میں درج بالا علامات و رموز اوقاف کے ذریعے صحتِ متن کی اس کوشش کو بے نظیر قرار دیا ہے تاہم اسما معرفہ کے اوپر خط کھینچنے کو قطعی غیر ضروری قرار دیا ہے۔

مقدمے کا آخری عنوان ''باعثِ تاخیر'' ہے۔اس ضمن میں خاں صاحب نے اس امر کی صراحت کی ہے کہ متن کی ترتیب اور اختلافِ نسخ کا کام مکمل کر لیا، متن کی کتابت بھی ہو گئی تھی معلوم ہوا کہ پٹنے میں مصنف کا نظرِ ثانی کیا ہوا 1280ھ کا اڈیشن موجود ہے۔اس پر رشید حسن خاں نے از سرِ نو مرتب کیا حالاں کہ ایک صورت یہ بھی تھی کہ کتابت شدہ متن کے آخر میں نوٹ دے دیا جاتا کہ اس نسخے کی باز یافت اس مرحلے پر ہوئی کہ استفادہ ممکن نہیں تھا لیکن خاں صاحب نے ایسا نہ کیا بل کہ اپنے ضمیر کے اطمینان کی خاطر پورے متن کو از سرِ نو مرتب کیا۔

''فسانۂ عجائب'' میں مقدمہ صفحہ (1) سے شروع ہو کر 117 تک جاتا ہے اور متن کو بھی خاں صاحب نے نمبر (1) شروع کر دیا۔نمبروں کی یہ مکرر ترتیب تدوین کے اصولوں کے منافی ہے لیکن رشید حسن خاں اس کی توجیہہ یوں بیان کرتے ہیں:

''ضمیموں کے اندراجات کے سلسلے میں یہ ضروری تھا کہ متن پر نمبر شمار موجود ہوں (متن میں کتابت پہلے ہوئی تھی) تا کہ صفحات کا حوالہ دیا جا سکے۔مقدمہ (حسبِ روایت اور حسبِ معمول) ضمیموں کی تکمیل کے بعد لکھا گیا۔امتیاز کی خاطر ابتدائی حصے میں صفحات پر نمبر شمار صفحات کے نچلے حصے میں لکھے گئے ہیں جب کہ باقی کتاب میں صفحات کے نمبر شمار (حسبِ معمول) صفحات کے اوپری حصے پر ہیں۔''(20)

''فسانۂ عجائب'' کے متن کو حسبِ منشاے مصنف پیش کرنا خاں صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔شان الحق حقی ''فسانۂ عجائب'' کی تدوین پر ان الفاظ میں تبصرہ کرتے ہیں:

''رشید حسن خاں کی یہ بے نظیر تالیف اُردو دنیا کے لیے ایک نمونہ بن کر سامنے آئی ہے اور تکلفاً نہیں، ان کا مزاج، ان کا مذاق، ان کا معیار ہی یہ ہے۔وہ ایک ذمے دار مصنف ہیں۔جزویات کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز نہیں کرتے۔اس ایک تالیف کے ذیل میں کتنے ہی چھوٹے بڑے مسائل کی تحقیق آ گئی ہے۔الفاظ کے معنی کا تعین، محاورات کی تحقیق و تطبیق ، اشعار کا انتساب، اشخاص کے تراجم، کسی مسئلے سے گریز نہیں کیا۔تلاش و تجسس کا حق ادا کیا ہے۔رسوم و فنون، عمارات، تاریخی روایات سب پر مفید حواشی ہے۔اشاریوں کی ترتیب بظاہر ایک میکانکی عمل ہے انھوں نے اس کو نہ صرف احتیاط سے انجام دیا ہے بل کہ ہر طرح مفید و معتبر بنایا ہے۔''(21)

متن کے بعد رشید حسن خاں نے سات ضمیمے دیے ہیں جو متن کی وضاحت کے ضمن میں شامل کیے گئے ہیں۔

پہلا ضمیمہ نثر ہائے خاتمہ کتاب ہے۔جو ان نثر پاروں پر مشتمل ہے جو سرور نے مختلف اشاعتوں کے آخر میں لکھی تھیں۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کون کون سے نسخے مصنف کے نظرِ ثانی شدہ ہیں۔

دوسرا ضمیمہ بعض وضاحت طلب امور کی تشریحات پر مشتمل ہے۔اس میں رشید حسن خاں نے وضاحت طلب الفاظ اور تراکیب کو مختلف نسخوں کے تقابل سے بیان کیا ہے اور منشاے مصنف اور اُس دور کی املا کے مطابق الفاظ کی تشریح کی ہے۔وضاحت کا طریق کار یہ ہے کہ صفحہ نمبر دے کر وضاحت کی گئی ہے۔مثلاً صفحہ 5 سطر 8 کے تحت لفظ ''متوطنِ خطۂ بے نظیر'' کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

''ص 5 س 8:ن کی اشاعتِ اول میں اسی طرح ہے، مگر اشاعتِ ثانی میں اس جملے میں لفظ حال بھی شامل ہے ''متوطنِ حال خطۂ بے نظیر'' لفظِ حال کسی اور نسخے میں موجود نہیں یہ ظاہر یہی خیال کیا جاتا ہے کہ یہ صاحبانِ مطبع کی کارگزاری ہے۔غالباً اسی کارگزاری کے نتیجے میں جناب مخمور اکبر آبادی نے یہ فرض کر لیا کہ وہ لازماً اکبر آباد کے رہنے والے ہوں گے...''(22)

تیسرا ضمیمہ انتسابِ اشعار کا ہے۔متن میں جو اشعار شامل ہیں ان اشعار پر گول دائروں کے اندر انگریزی ہندسے لکھے گئے ہیں۔اس ضمیمے میں صفحہ نمبر اور حوالہ درج کرنے کے بعد اس شعر کے بارے میں ضروری معلومات دی گئی ہیں۔قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اگر ایک صفحے پر ایک شعر ہے اور اس پر حوالہ نمبر درج ہے تو اس سے اگلے صفحے پر بھی اگر کوئی شعر ہے تو حوالہ نمبر ''ا'' درج ہے تو اس سے اگلے صفحے پر بھی اگر کوئی شعر ہے تو حوالہ نمبر ''ا'' ہی استعمال کیا گیا ہے۔یوں ان اشعار کے حوالے صفحات کے نمبر سے تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ص 5 پر ایک شعر درج ہے:

سناء رضواں بھی جس کا خوشہ چیں ہے
وہ بیشک لکھنؤ کی سر زمیں ہے

اس کی وضاحت یوں کی گئی ہے:

''ص 15 ک میں اس شعر پر ''مولف'' لکھا ہوا ہے، لیکن باقی نسخوں میں یہ لفظ نہیں ملتا۔یہ خارج از امکان نہیں کہ یہ شعر مولف ہی کا ہو۔''(23)

اسی طرح ص 24 پر ایک مصرع لکھا ہوا ہے۔شعر نمبر ''ا'' جب کہ مصرع پر جو حوالہ 2 درج ہے۔شعر یہ ہے:

اور رقیبوں کا، ہے چلتا نہیں بس تو ولے
سوز کے نام کو لکھ لکھ جلا دیتے ہیں

جب کہ مصرع یوں ہے:

قبولِ خاطر و لطفِ سخن، خدا داد است

اس کی وضاحت رشید حسن خاں نے اس طرح کی ہے:

''ص 24۔1، دیوانِ سوز ص 257۔2۔ مصرع حافظ کا ہے۔ مکمل شعر یوں ہے:

حسد چی می بری اے ست نظم بر حافظ

قبولِ خاطر و لطفِ سخن کدا داد است

(دیوانِ حافظ ،مرتبہ قاسم و قزوینی ،ص 27)(24 2)

اس ضمیمے کی مدد سے ہم متن میں موجود اشعار اور مصرعوں کے بارے میں جان سکتے ہیں کہ جو شعر درج کیا گیا ہے وہ کس کا ہے اور اگر مصرع ہے تو رشید حسن خاں نے اسے مکمل کر کے اس کا حوالہ بھی درج کر دیا ہے کہ وہ شعر دیوان کے کس صفحے پر ہے اور اگر اس کی صورت مختلف ہے تو اس اختلاف کو بھی انھوں نے اسی ضمیمے میں بیان کر دیا ہے۔ یہ بات رشید حسن خاں کی دیدہ ریزی، مطالعے اور ذوقِ شعر کا پتا دیتی ہے۔

دیباچۂ کتاب میں جن افراد، مقامات اور عمارات وغیرہ کے نام آئے ہیں ان کی تفصیل چوتھے ضمیمے میں درج کی گئی ہے۔ اس ضمیمے کی ایک خامی یہ ہے کہ محض اشخاص و مقامات کے نام درج کیے گئے ہیں۔ متن کا صفحہ نمبر درج نہیں کیا گیا۔ اس کا ازالہ آخر میں اشاریہ میں کر دیا گیا ہے مثلاً ضمیمہ 4 میں آتش کے حوالے سے تو معلومات ملتی ہیں لیکن متن میں آتش کا حوالہ کس کس صفحے پر آیا ہے اس کا علم اشاریہ سے ہوتا ہے کہ ص 13 اور 15 پر آتش کا حوالہ متن میں آتا ہے۔

پانچوں ضمیمہ تلفظ اور املا سے متعلق ہے۔ جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ خاص خاص الفاظ پر جو اعراب لگائے گئے ہیں یا جو املا اختیار کیا گیا ہے اس کی وجہ اور بنیاد کیا ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے رشید حان خاں نے نہ صرف فسانۂ عجائب کے نسخوں کا اختلاف بتایا ہے بل کہ فرہنگوں اور لغات کے حوالے بھی دیے ہیں۔ املا اور تلفظ رشید حسن خاں کی دل چسپی کا مرکز ہیں۔ متون کی تدوین میں ان کی یہ دل چسپی اس صورت میں سامنے آتی ہے۔ مثلاً ''آزر'' کی وضاحت و املا کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''آزر اور 'آزر' دو مختلف الفاظ ہیں۔ 'ذ' کے کئی معنی ہیں: آگ۔ ایک فرشتے کا نام جو 'موکلِ آفتاب' ہے (وغیرہ) تفصیل کے لیے دیکھیے برہانِ قاطع (طبع تہران) ان سب معنوں اس لفظ میں ذال ہے لیکن حضرت ابراہیم کے والد یا چچا کا نام ''آزر'' ہے (بہ رائے معجمہ) اور یہاں یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے اس لیے اس کو 'ز' سے لکھا گیا ہے۔''(25)

چھٹا ضمیمہ الفاظ اور استعمال پر مشتمل ہے۔ اس ضمیمے کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ علم ہو جائے کہ سرور کے عہد میں الفاظ کا طریق استعمال کیا تھا۔ اس ضمیمے میں وہ خاص الفاظ شامل ہیں جن میں سے کچھ تو پہلے کی طرح سے بولے جاتے ہیں لیکن کچھ اس طرح سے مثلاً معرکہ اٹھا تھا ص 114، تنبیہ غافلوں کو ص 229 وہ تو بہ درجہ حسین تھی ص 231، منعقد کرو، ص 131۔

ساتواں ضمیمہ اختلافِ نسخ کا ہے۔ یہ صرف دیباچہ سے متعلق ہے۔ مثلاً دیباچے کے پہلے ضمیمے پر ہے کہ 'عاشقِ باوفا و معشوقِ پردغا کو...' اس کا اختلاف یوں درج ہے: ک میں ''و'' موجود نہیں۔

ضمیموں کے بعد آٹھواں حصہ فرہنگ کا ہے۔ بالعموم الفاظ کے وہی معنی لکھے گئے ہیں جن معنوں میں وہ متن میں استعمال ہوئے ہیں۔ یہ فرہنگ اس لحاظ سے بہت مفید ہے کہ اس سے متن کے مفہوم کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ بہت سے الفاظ جو نامانوس ہیں ان کا مطلب قدرے وضاحت سے درج کیا گیا ہے مثلاً:

ارجل: وہ گھوڑا جس کا پچھلا دایاں یا بایاں پیر گھٹنے تک سفید ہو اور باقی جسم کسی اور رنگ کا ہو۔ ایسا گھوڑا بہت منحوس سمجھا جاتا ہے۔

چھوچھو: دایہ کھلائی وہ عورت جو بچوں کی خدمت کے لیے رکھی جاتی ہے۔

باغ و بہار

''باغ و بہار کو تصنیفی اعتبار سے ''فسانۂ عجائب'' پر زمانی تقدم حاصل ہے تاہم رشید حسن خاں نے تدوین کے ضمن میں ''فسانۂ عجائب'' کو مقدم رکھا۔ رشید حسن خاں نے مکتبہ جامعہ کے لیے ''باغ و بہار'' کو معیاری سیریز کے تحت 1964 میں مرتب کیا۔ بہ قول گیان چند:

''...تبھی سے ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اس کتاب کو مکمل طریقے سے مدون کیا جائے۔ ان کی انتھک کوششوں کا نتیجہ 1992 میں سامنے آیا۔(26)

'باغ و بہار' کی طبع اول سے ہی میرامن کے حالاتِ زندگی، باغ و بہار کا ماخذ، باغ و بہار کی اہمیت اس کے کردار، زبان و بیان کی خوبیوں کے حوالے سے بیش تر مرتبین نے بحث کی۔ صحتِ متن کی جانب کسی نے توجہ مبذول نہ کرائی۔ اس ضمن میں پہل اور اہم ترین کام رشید حسن خاں نے کیا:

''باغ و بہار'' کی اشاعتِ اول سے پہلے اس کے متن کے 102 صفحات 1802 میں ہندی مینول میں شائع ہو کر منظرِ عام پر آ چکے تھے۔ 1804 کے اڈیشن کو گل کرسٹ نے جس صحت رموزِ اوقاف کے ساتھ چھپوایا تھا وہ باغ و بہار کی تدوین کا پہلا مستحسن قدم تھا اور رشید حسن خاں کی تدوینی کاوش اس سفر کا آخری قدم ہے۔''(27)

مواد کی فراہمی خاں صاحب کی برسوں کی جستجو کا نتیجہ ہے۔ اس ضمن میں مقدمے میں ذکر کیا گیا ہے۔ ہندی مینول کے حصوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''قدوائی صاحب اچھے دوست ہیں، مخلص اور غم گسار ہیں لیکن پرانے شرفا کرام کی طرح کاہلی اور بے پروائی میں بھی کسی سے کم نہیں۔ سونے پہ سہاگا یہ کہ انھوں نے لندن میں حق صاحب سے عکس بھیجنے کی فرمایش کی تھی وہ صاحب ان لوازمِ تہذیب اشرافیہ میں موصوف کے شریکِ غالب نکلے۔''(28)

1964 سے 1984، 20 سال میں خاں صاحب نے تمام معلوم حوالوں کو یکجا کرنے میں صرف کیے۔ حوالوں کی تکمیل کے بعد تدوین کا آغاز کیا:

''باغ و بہار'' ان کے عالمانہ مقدمے کے ساتھ 1992 میں چھپ کر منظرِ عام پر آئی۔ اس کتاب کے مقدمے میں بھی تدوین کے انھی اصولوں کو بیان کیا گیا ہے جو اس سے قبل ''فسانۂ

عجائب'' میں بیان کیے گئے تھے۔ یہاں بھی خاں صاحب نے متن کو منشائے مصنف کے مطابق ہی پیش کرنے کو اہمیت دی ہے۔

میرامن نے ''باغ و بہار'' میں دِلّی کی بول چال کا روزمرہ لکھا۔ بیش تر کے مصنفین کی بدولت بار ہا نامانوس روپ اس لیے در آئے کہ انھوں نے اسے سہوِ طباعت سمجھ کر تبدیل کیا۔ لیکن رشید حسن خاں نے میرامن کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ''گنجِ خوبی'' کے علاوہ ''ہندی مینول'' اور گل کرسٹ کے نظامِ اوقات کی مدد سے ہر لفظ اور محاورے کو اسی طرح لکھا جو میرامن کا منشا رہا ہوگا۔''(29)

''باغ و بہار'' کے طویل مقدمے میں رشید حسن خاں نے اُن امور کی جانب بھی توجہ مبذول کرائی ہے جن کا براہ راست تعلق میرامن کی سوانح کے غیر مستند بیانات سے تھا۔ اس ضمن میں مفتی انتظام اللہ شہابی کی غلط بیانی کے سبب ممتاز حسین اور مرزا حامد بیگ نے جو تحقیقی ٹھوکریں کھائی ہیں اس کا انکشاف بھی کرتے ہیں۔ رشید حسن خاں نے یہ بھی بتایا ہے کہ گلکرسٹ نے میرامن سے چار درویش کی تالیف کی فرمایش ان کے فورٹ ولیم کالج میں ملازمت سے قبل کر دی تھی اور میرامن نے اس کا نام ''چار درویش'' رکھا لیکن نظرِ ثانی کے بعد 'باغ و بہار' سے موسوم کیا۔''(30)

باغ و بہار کے مقدمے میں رشید حسن خاں نے درج ذیل چند باتوں کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے:

1۔ ممتاز حسین کا مرتبہ نسخہ جو 1985 میں کراچی سے شائع ہوا تھا۔ اس میں ممتاز حسین نے مفتی صاحب انتظام اللہ شہابی کی اطلاع پر میرامن کا سال وفات متعین کیا۔ خاں صاحب نے بہ تحقیق یہ ثابت کیا کہ ممتاز حسین نے مفتی صاحب کے جس حوالے پر اپنی بات کی بنیاد رکھی اس کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں اس طرح ممتاز حسین اور حامد بیگ نے میرامن کی سوانح کو ایک غیر معتبر حوالے پر اپنی تحقیق کی بنیاد رکھی۔

2۔ رسالہ نقوش (لاہور) کے خاص نمبر (دسمبر 1987) میں مرزا حامد بیگ نے ''میرامن دِلّی والے'' کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے وہ محض قیاسات پر مبنی ہے۔

3۔ 'باغ و بہار'' اور'' گنجِ خوبی'' دونوں کتابوں کے دیباچے میں میرامن نے اپنا نام میرامن لکھا ہے۔ اس لیے یہ بات کہ ان کا نام میرامان اور تخلص امن ہے، درست نہیں ہے۔

4۔ میرامن کے تخلص، وطن، جاگیردار و منصب، مذہب، اولاد اور ملازمت کے حوالے سے رشید حسن خاں نے مستند معلومات فراہم کی ہیں۔

5۔ باغ و بہار کی تیاری گل کرسٹ کی عمومی ہدایات کے تحت کی گئی اس ضمن میں میر شیر علی افسوس نے ''باغ و بہار'' کی نثر کی درستی میں کچھ مفید مشورے بھی دیے۔ اس درستی کو خاں صاحب شخصی و ذاتی رائے تسلیم کرتے ہیں اور اصلاح نہیں مانتے۔

رشید حسن خاں نے مقدمے کے حاشیے میں ایک خطی نسخے کی اطلاع پر ڈاکٹر عبیدہ بیگم سے ممنونیت کا اعتراف بھی کیا ہے۔ ''باغ و بہار'' کی تدوین میں خاں صاحب نے اپنے تئیں تمام حوالے جمع کیے تاہم بہ قول ڈاکٹر گیان چند:

''رشید حسن خاں کو مارسیلز کی میونسپل لائبریری میں باغ و بہار کا 1217ھ کا مخطوطہ بھی دیکھنا چاہیے تھا''۔(31)

باغ و بہار کی تدوین کے لیے چار نسخے رشید حسن خاں کے پیشِ نظر رہے۔ پہلا نسخہ وہ ہے جو 1804 میں پہلی بار کلکتہ کے ہندوستانی چھاپہ خانہ سے شائع ہوا تھا۔ اس نسخے میں گل کرسٹ کے طریقِ کار کے مطابق الفاظ پر اعراب لگائے گئے؛ رموز و اوقاف اور علامات کا التزام بھی کیا گیا۔ اس نسخے میں الفاظ پر اعراب و علامات نیز 3 عبارت میں رموزِ اوقاف کا خاص اہتمام ملتا ہے۔ جان گل کرسٹ نے املا کا جامع نظام مرتب کیا تھا۔ یہ نظام اس نسخے کے متن میں نظر آتا ہے۔ اس نظام کے تحت ی کو چار اقسام میں بانٹا گیا تھا۔

1۔ یائے معروف کی صورت میں یہ طے کیا گیا تھا کہ اسے متعارف صورت ی میں لکھا جائے گا۔ اس کا نام یائے دامنی رکھا گیا اور یہ طے کیا گیا کہ اس کے نیچے نقطے نہیں ہوں گے۔

2۔ یائے مجہول کی صورت میں اسے دراز لکھا جائے گا۔ دے، گے سے۔ اس میں بھی نقطے نہیں ہوں گے۔

3۔ اگر درمیان میں ہو تو اس کو یائے مشموم پکارا گیا اس کی پہچان کہ اس کے نقطے اوپر نیچے لکھے جائیں گے۔

4۔ یائے شوشہ دار میں معروف و مجہول کے امتیاز کے لیے یہ طے کیا گیا کہ یائے مجہول کے اوپر چھوٹا سا دائرہ بنایا جائے گا۔ کھیل، دیر میں، جیل وغیرہ اسے جزم مدورہ کہا گیا۔ یائے شوشہ دار سے پہلے حرف پر زبر ہونے کی صورت میں اس پر آٹھ کے عربی ہندسے جیسا نشان بنایا گیا۔ اس علامت کا نام جزم غیر مدورہ رکھا گیا۔ فَیض، طفَیل۔

ی کی طرح واو کی بھی چار قسمیں کی گئیں۔ باغ و بہار کے پہلے مطبوعہ نسخے میں درج ذیل قاعدوں کی پابندی کی گئی ہے۔

1۔ اضافے کے زیر نہایت پابندی کے ساتھ لگائے گئے ہیں۔

2۔ مشدد حرفوں پر تشدید ضرور لگائی گئی ہے۔

3۔ جملہ معترضہ کو قوسین میں لکھا گیا ہے۔

4۔ پیراگراف بنائے گئے ہیں۔

5۔ کاما اور فل اسٹاپ لگائے گئے ہیں۔ فل اسٹاپ کے لیے چھوٹا سا کھڑا خط ملتا ہے۔

6۔ کاما کے لیے چھوٹا سا ڈیش (۔) استعمال کیا گیا ہے۔

7۔ ندائیہ اور سوالیہ علامت بھی استعمال کی گئی ہے۔ اس نسخے کی علامت ''ک'' ہے۔

پہلی اشاعت سے پہلے زمانی ترتیب کے مطابق ہندی مینول کا نام اس میں آتا ہے۔ اس میں باغ و بہار کے 102 صفحات شامل ہیں۔ اس نسخے میں شامل متن کی ایک اہمیت یہ ہے کہ اس کی مدد سے طبع اول کی بعض اغلاطِ طباعت کو دور کیا جا سکتا ہے۔ اس نسخے کی علامت 'م'' ہے۔

ڈنکن فاربس نے بھی باغ و بہار کو مرتب کیا۔ یہ پہلی بار لندن سے 1846 میں، دوسرا اڈیشن 1849 میں، تیسرا 1851 میں اور چوتھا 1860 میں لندن ہی سے شائع ہوئے۔ رشید حسن خاں نے فاربس کے مرتبہ اڈیشن کو سامنے رکھا ہے اور اس کے لیے''ف'' کا مخفف استعمال کیا ہے۔

اس نسخہ ف میں 260 صفحات پر متن محیط ہے۔ اس کے بعد نہایت مفصل فرہنگ ہے۔ الفاظ کو پہلے اُردو رسم الخط میں اور پھر رومن رسم خط میں لکھا گیا ہے۔ الفاظ کے معنی انگریزی میں لکھے گئے

ہیں۔ فاربس نے گل کرسٹ کے نظامِ املا کی مکمل طور پر پیروی نہیں کی۔ کاما کے لیے تو چھوٹا سا ڈیش ہی استعمال کیا گیا ہے لیکن فل اسٹاپ کے لیے ☆ کا نشان استعمال کیا ہے۔ جزم کو بھی کثرت استعمال کیا ہے۔ ڑ، ڈ اور ٹ کے لیے چار نقطے بطور علامت لگائے گئے ہیں۔ الفاظ پر اعراب بھی لگائے گئے ہیں۔

مولوی عبدالحق نے جب باغ و بہار کو مرتب کیا تو انھوں نے ڈنکن فاربس کے نسخے پر متن کی بنیاد رکھی۔ مولوی عبدالحق نے اس مقدمے میں یہ ثابت کیا کہ میر امن نے نوطرز مرصع کو سامنے رکھا۔ انھوں نے باغ و بہار کی اہمیت اور نثر کی خوبیوں اور محاسن کی نشان دہی کی۔

متن کی وضاحت کے لیے تین ضمیمے متن کے آخر میں شامل کیے گئے ہیں۔

ضمیمہ ایک میں اختلافِ نسخ، تشریح طلب مقامات کی وضاحت، اشخاص، مقامات اور عمارتوں سے متعلق ضروری معلومات اور انتساب اشعار شامل ہیں۔

دوسرا ضمیمہ تلفظ اور املا کے مباحث سے متعلق ہے۔

تیسرا ضمیمہ افعال، الفاظ اور طریقۂ استعمال پر مبنی ہے۔

مفصل فرہنگ کو شاملِ کتاب کیا گیا ہے۔ آخر میں اشاریہ ہے۔

اس کے آخر میں آٹھ صفحات کا عکس بھی شامل ہے۔ پانچ صفحات باغ و بہار اشاعت اول (نسخہ ک) سے ہیں۔ دو صفحے ہندی مینول سے ہیں اور ایک صفحہ گنج خوبی بہ خط میر امن کے مخطوطے کے عکس پر مشتمل ہے۔

شان الحق حقی نے رشید حسن خاں کو ''اُردو میں اصولِ تدوین کا مجدد'' اور گیان چند جین نے ''خدائے تدوین'' کہا ہے۔ گیان چند جین فسانۂ عجائب اور باغ و بہار کی تدوین کے حوالے سے لکھتے ہیں :

''یہ کتابیں تدوین کا ایسا بیش بہا خزینہ ہیں جن میں لامتناہی دولت چھپی ہوئی ہے،، میرے نزدیک ایسی کتاب تیار کرنے کے لیے پندرہ بیس سال کا عرصہ درکار ہے۔ ان میں سے ہر کتاب کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے لیے ایک سال کی مدت چاہیے کیوں کہ ان کے ضمیموں میں جو معلومات بھری پڑی ہیں انھیں پرکھنے اور ان کے بارے میں رائے قائم کرنے کے لیے عمرِ عزیز کا ایک موقر حصہ نذر کرنا ہوگا۔'' (32)

خاں صاحب کی مرتبہ کتابوں کی مکمل فہرست فصلِ اول میں درج کی گئی ہے۔ ان کتابوں کی تدوین میں بھی رشید حسن خاں نے انھی اصولوں پر عمل کیا جو ''فسانۂ عجائب'' اور ''باغ و بہار'' کے لیے اپنائے، یہی اصول خاں صاحب کی ادبی ریاضت اور علمی صداقت کا بین ثبوت ہیں۔

حوالہ جات

1۔ رشید حسن خاں، ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ، ص9

2۔ ایضاً، ص10

3۔ ایضاً، ص21

4۔ تفہیم، ص108

5۔ ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ، ص24

6۔ تفہیم ص127

7۔ ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ، ص14

8۔ حافظ صفوان محمد چوہان: رشید حسن خاں صاحب عصری دانش کی مشارکت، مشمولہ مخزن، لاہور، شمارہ مسلسل 11، 2006 جلد 6، شمارہ 1 ص48

9۔ کتاب نما، ص36

10۔ فسانۂ عجائب، مقدمہ، ص22

11۔ مخزن، ص49

12۔ ایضاً

13۔ اُردو میں اصول تدوین کا مجدد، کتاب نما، ص59

14۔ ظفر احمد صدیقی، کتاب نما، ص116

15۔ گیان چند، ایضاً، ص67

16۔ ایضاً

17۔ ایضاً

18۔ فسانۂ عجائب، مقدمہ، ص69-65

19۔مقدمہ،ص102
20۔گیان چندجین،ص(ندارد)
21۔شان الحق حقی،کتاب نما،ص59
22۔حوالہ ندارد
23۔حوالہ ندارد
24۔حوالہ ندارد
25۔حوالہ ندارد
26۔گیان چند،کتاب نما،ص17
27۔ایضاً
28۔مقدمہ باغ و بہار،ص17
29۔گیان چند،ص72
30۔مقدمہ باغ و بہار،ص51
31۔گیان چند،ص72
32۔گیان چند،کتاب نما،ص73
(تخلیقی ادب،شمارہ8،نیشنل یونی ورسٹی آف موڈرن لینگویجز،اسلام آباد،مدیر،بریگیڈئر(ر)ڈاکٹرعزیزاحمدخان،جون2011،صفحہ256تا272)

ooo

ناصحہ عثمانی

ایسوسی ایٹ پروفیسر،شعبۂ اُردو،

حمیدیہ گرلس ڈگری کالج،الہ آباد

باغ و بہار کے نسخۂ رشید حسن خاں کی تحقیقی اہمیت

زبان وادب میں تخلیق وتنقید سے زیادہ دشوارگزار مرحلہ تحقیق وتدوین کا ہے۔فن کار اظہار فن کے لیے نقاد اپنے نکات نظر کے لیے آزاد ہے لیکن مدون ومحقق کو ہر قدم پر جواب دہی کا خواب لاحق رہتا ہے۔اعتراف ونقائص اس کے رویہ کو محتاط ترین کر دیتا ہے اور اگر کلاسیکی ادب کی تدوین کا معاملہ ہو تو مرحلہ اور بھی دشوار گزار ہو جاتا ہے۔تمام مقبول شعرا کے کلام میں اکثر مختلف نسخوں میں کلام میں اختلاف پایا جاتا ہے۔غالبؔ،میرؔ،سوداؔ،ذوقؔ،دردؔوغیرہ اکثر شعرا کے یہاں اسی بنا پر اشعار کی تصحیح کا مسئلہ پیش آتا ہے۔کبھی کبھی الفاظ کے ایسے اختلاف بھی ہوتے ہیں جو معنی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔یہی صورت حال نثری ادب میں بھی پیش آتی ہے۔کبھی کبھی ایک ہی متن کے عنوانات الگ ہوتے ہیں ایسے میں ایسے مستند ثبوت درکار ہوتے ہیں جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ یہ تبدیلی اگلی اشاعت میں مصنف نے خود کی ہے یا نصابی کتابوں میں چھپتے چھپتے متن کو وقت نے بدل دیا ہے کیوں کہ یہ مسئلہ ان کتابوں کے ساتھ زیادہ پیش آتا ہے جو یونی ورسٹیز کے نصاب میں شامل ہیں اور لاتعداد اڈیشن اس میں اغلاط کی بھرمار کر دیتے ہیں۔اسی لیے رشید حسن خاں کا ماننا ہے کہ ''تدوین تحقیق سے جدا فن نہیں ہے۔'' چناں چہ مدون میں محقق کی باریک بینی بھی درکار ہوتی ہے۔

اس سلسلے میں میرامن کی داستان باغ و بہار خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔یہ داستان بہت قدیم بھی ہے اور ہندوستان کی تقریباً سبھی یونی ورسٹیوں کے اُردو کے نصاب میں شامل ہے اس لیے الگ الگ شہروں اور مطبعوں سے ابتدا سے اب تک اس کے متعدد اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔1801 میں میرامن نے باغ و بہار کو عطاء اللہ خاں تحسین کی ''نوطرز مرصع'' کو سامنے رکھ کر تحریر کیا اور تب سے اب تک اس کے معلوم کتنے اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔لیکن رشید حسن خاں کے شائع کردہ نسخۂ باغ و بہار کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

رشید حسن خان نے جب یہ نسخہ مرتب کیا تب ان کی تحقیق کے کئی بڑے کارنامے منظر عام پر آچکے تھے۔مکتبہ جامعہ کے ''معیاری ادب'' کے عنوان سے چل رہے طباعتی سلسلہ میں خود رشید حسن خاں باغ و بہار کی اشاعت بھی کروا چکے تھے لیکن اس متن سے وہ مکمل طور پر مطمئن نہیں تھے کیوں کہ انھیں 1804 میں گل کرسٹ کی سرپرستی میں چھپے نسخہ کا عکس تو حاصل ہو گیا تھا لیکن اس نسخہ کی مذکورہ روایات کی رو سے فورٹ ولیم کالج سے 1802 میں شائع ہندی مینول کا 102 صفحات کا وہ نسخہ نہیں ملا تھا جو سلسلہ وار شائع ہوا تھا۔چناں چہ تلاش جاری تھی اور سالوں کی تگ ودو کے بعد لندن کی لائبریری سے اس نسخہ کا

عکس انھیں حاصل ہوگیا تھا۔ ساتھ ہی ایک قلمی نسخہ کا عکس بھی مل گیا۔ نتیجتاً اس تدوین میں تحقیق کے گوہر پارے نظر آتے ہیں۔ مخطوطہ اور مطبوعہ تدوین کے جداگانہ اصول ہوتے ہیں۔ مخطوطوں ہی میں تحریر متن کو صحیح پڑھ کر شائع کرانا ایک امتحان ہوتا ہے۔ کئی خطی نسخوں کی پہلی اشاعت میں املوں کی غلطیوں کی ماہرین نشان دہی کر چکے ہیں لیکن مطبوعہ نسخوں کی تدوین میں جب تک سارے نسخوں تک رسائی نہ ہو اور ان کے تقابل سے صحیح متن تک رسائی نہ ہو محقق اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔ ان معنوں میں باغ و بہار کا مذکورہ نسخہ سبھی مطبوعہ نسخوں میں فوقیت رکھتا ہے۔ کیوں کہ نصابی ضرورتوں سے شائع نسخوں میں تحقیق کی کارفرمائی نہیں ہوتی بل کہ جو نسخہ مل جاتا ہے اسی سے عموماً متن لے لیا جاتا ہے۔

رشید حسن خاں نے کتاب کی ابتدا میں ہی طویل تنقیدی و تحقیقی دیباچہ لکھ کر تفصیل کے ساتھ تمام مقبول نسخوں پر بحث کرتے ہوئے حقائق کی بازیافت کی منزل کو کامیابی سے طے کیا ہے اور شروع میں ہی اپنے مرتب کردہ اولین نسخے کے ناقص ہونے کا اعتراف کیا ہے یہ ایک محقق کی دیانت داری ہے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا کہ ان کی رسائی ہندی مینول میں چھپے 102 صفحات کے پہلے نسخہ تک نہیں ہو سکی۔ غور طلب ہے کہ جس محقق کے سامنے 1804 کا وہ نسخہ رہا ہو جسے میر امن نے گل کرسٹ کے تحریر کے ساتھ چھپوایا تھا۔ اس نے برسوں کی محنت ہندی مینول کا نسخہ حاصل کر کے ابتدائی دونوں 1802 اور 1804 کے وہ نسخے کو فوقیت دیتے ہوئے یہ نسخہ ترتیب دیا۔ چناں چہ یہ نسخہ تا حال سب سے اہم مانا جاتا ہے۔ اس کی تدوین میں املا اور تلفظ کے نقطۂ نظر سے ابتدائی نسخہ کے اعراب و اوقاف و اشعار کو بھی ملحوظ رکھا گیا۔ اپنے بسیط دیباچہ میں فاضل محقق نے مختلف نسخوں کی زبان و بیان کے تقابلی مطالعہ کے بعد صحیح متن تک رسائی کی دشواریوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ میر امن کے نام اور تخلص کے سلسلہ میں مدلل بحثیں اٹھا کر نتیجہ خیز نتائج بھی اخذ کیے ہیں اور باغ و بہار سے جڑی امیر خسرو اور خواجہ نظام الدین اولیا کی روایت (جس کا ذکر خود میر امن نے کیا تھا) کو بھی اپنی تحقیقی دلیلوں سے غلط ثابت کیا۔ داستان نویسوں اور داستان گویوں کا قاعدہ تھا کہ وہ اپنے فن کو مقبول عام کی سند دینے کے لیے کسی مقبول دینی یا دنیاوی شخص سے جوڑ دیتے تھے۔ اس کی مثالیں تمام داستانوں میں ملیں گی۔ داستان امیر حمزہ کا عنوان ہی ایسا ہے کہ جس کے حمزہ کا ذکر تو لشکر اسلام کے سپہ سالار حمزہ کا ہے لیکن اس میں کوئی تاریخی نکات نہیں ہیں۔

اس نسخہ کا آخری حصہ ضمیموں کی شمولیت اور عکسی صفحات کی طباعت کی بنا پر بے حد اہم ہو جاتا ہے جو کچھ اس طرح ہے:

ضمیمہ 1۔ تشریحات و اختلاف نسخ: اس ضمیمے میں صفحہ نمبر کے ساتھ مختلف نسخوں کا تقابل کر کے الفاظ و بیانات کی تصحیح و تشریح کی ہے اور صحیح متن کی نشان دہی کی ہے۔ انتساب و اشعار کے اندراج بھی صفحہ کے ساتھ موجود ہیں۔

ضمیمہ 2۔ اس میں تلفظ اور املا کی ترتیب و تصحیح مختلف نسخوں کی تفصیل اور صفحہ نمبر کے ساتھ درج ہیں۔

ضمیمہ 3۔ الفاظ اور طریق استعمال سے متعلق ہے۔ پھر بھی مختلف نسخوں کی تفصیل اور صفحہ نمبر کے ساتھ صحیح رہنمائی کرتا ہے۔

یہ ضمیمے صرف باغ و بہار کی تشریح و توضیح نہیں بل کہ اس دور کی زبان و بیان کی باریکیاں اور لسانی تحقیق کے نقطۂ نظر سے بھی خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ فرہنگ اور اشاریات جو کہ ہر نسخہ کا حصہ ہوتے ہیں وہ اس دور کے مروجہ الفاظ و روایات کے سمجھنے اور ترتیب لغت کے وقت خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

باغ و بہار کے مذکورہ نسخہ کے آخر چند صفحات تحقیقی دنیا میں ایک اہم سند رکھتے ہیں جو کئی عکسی صفحات پر مشتمل ہیں۔

پہلا عکس: گل کرسٹ کا لکھا انگریزی میں preface ہے جو طبع اول 1804 میں چھپا۔

دوسرا عکس: باغ و بہار طبع اول کے آخری ورق کا اندرونی صفحہ ہے اس پر بھی جان گل کرسٹ کی انگریزی عبارت ہے جو انھوں نے Captain Jame Mouat کے نام معنون کی ہے۔

تیسرا عکس: انگریزی میں باغ و بہار طبع اول کا آخری صفحہ یعنی انگریزی Title Page ہے جس پر کالج کا نام اور طباعت کا سن 1804 بھی درج ہے۔

چوتھا عکس: ہندی مینول کا پہلا صفحہ (اُردو میں) ہے جس میں فورٹ ولیم کالج کے مذکورہ مینول میں 1802 میں شائع شدہ کتابوں اور ان کے مصنفین کے نام درج ہیں۔

پانچواں عکس: ہندی مینول کا آخری صفحہ ہے یہ درج بالا عکس کا انگریزی ترجمہ ہے اور اس میں بھی مشمولہ کتابوں اور مصنفین کی فہرست ہے۔

چھٹا عکس: عرض میر امن دلّی والے کی ہے جو طبع اول میں چھپی تھی۔

ساتواں عکس: میر امن کی تحریر کا عکس ہے جو ان کی تصنیف گنج خوبی سے لیا گیا ہے۔

لیکن ایک بات نہایت تعجب خیز ہے کہ رشید حسن خاں نے 1804 کے نسخے کے سبھی خصوصی صفحات کا عکس دے دیا ہے جو ان کے پیش نظر تھا۔ انگریزی کا Back Title Page کا عکس بھی دے دیا لیکن اُردو کی جانب کے Title Page کی کمی کھٹکتی ہے۔ ممکن ہے کہ پہلا صفحہ ضائع ہوگیا ہو۔ لیکن یہ امر ہنوز تحقیق طلب ہے کہ طبع اول کا اُردو کا کور پیج کیسا تھا اور اس پر کیا تحریر تھا۔

(تنقیدات و ترجیحات، ناصحہ عثمانی، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، 2019، صفحہ 235 تا 239)

○○○

محمد شہزاد اختر بیگ
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو پوسٹ گریجویٹ کالج چیشتاں
ڈاکٹر محمد رمضان
الجنت ولاز، 13/G روڈ، چیشتاں

رشید حسن خاں بہ حیثیت مدوّن

حقائق کی بازیافت تحقیق کا مقصد ہے۔ پچھلی ربع صدی کے دوران ادبی تحقیق انتقادیات کے سلسلے میں چند اہم نام اُبھر کر سامنے آئے ہیں۔ ان میں رشید حسن خاں کا نام بہ وجوہ بہت نمایاں اور ممتاز ہے۔ دنیا کا ہر شخص کسی نہ کسی روایت کی کوکھ سے جنم لیتا ہے، لیکن روایت کے ساتھ ہر شخص کا تعلق ایک سا نہیں ہوتا۔ بے شمار لوگ تو وہ ہیں جو اپنی روایت سے بے خبر اور بے گانے رہتے ہیں۔ وہ لوگ روایت کے ساتھ رشتہ برقرار رکھتے ہیں، جن کی شخصیت میں روایت کا امتزاج عقلی اور جذباتی، دونوں سطحوں پر ہوتا ہے۔ گویا اُن کے ہاں روایت کا عرفان اور احترام بھی ہوتا ہے اور اس کی توسیع اور بقا کا جذبہ بھی۔ جب تذکرہ رشید حسن خاں کا ہو تو اس معاملے میں یہ کہنا بجا ہو گا کہ رشید حسن خاں کا شمار اُن لوگوں میں ہے جو ہماری قدیم ادبی روایات کے امین ہیں۔ روایت کی یہ امانت ان تک اور ان کے ساتھ ان کے کئی دوسرے ہم عصروں تک حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے سلسلے سے پہنچی ہے۔

تحقیق و تدوین کے میدان میں رشید حسن خاں کا نام کسی تحسین وستایش کا محتاج نہیں ہے۔ ان کا شمار اُردو کے جدید مدوّنین میں ایک اہم اور معتبر نام کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ انھوں نے قدیم متون کی ترتیب و تحقیق ہی کا کام نہیں کیا بل کہ جدید تحقیق و تدوین کے آداب واصول اور معیار کو بھی متعین کرنے کی کوشش کی۔ ہندوستان میں اُردو ادب کی تدوین کا باقاعدہ آغاز بیسویں صدی کے شروع میں ہوا۔ مولوی عبدالحق، حافظ محمود شیرانی، پروفیسر نصیر الدین ہاشمی، پروفیسر محی الدین زور اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی جیسے اصحاب نے اس شاندار تدوینی روایت کی بنیاد ڈالی۔ رشید حسن خاں بھی مذکورہ بالا محققین و مدونین سے متاثر تھے اور انھی کی روایت سے وابستہ تھے اور امین تھے۔ اس حوالے سے ان کا ایک اقتباس پیشِ خدمت ہے:

> ''میں نے تحقیق کے اصول اور آداب سیکھے حافظ محمود خاں شیرانی کی تحریروں سے۔ اس کے بعد قاضی عبدالودود اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی سے استفادہ کیا اور سب سے آخر میں مولانا عرشی مرحوم سے فیض پایا لیکن سب سے پہلے تحقیق کی طرف متوجہ کیا نیاز فتح پوری کی تحریروں نے۔ ان تحریروں نے تحقیق کی ضرورت کا احساس دلایا اور اس کی اہمیت سے آشنا کیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس ذہنی کش مکش سے دوچار کیا جو مکمل تسکین اور کامل یقین کا مطالبہ کرتی ہے اور اس تشکیک سے ذہن کو آشنا کیا جو تحقیق کی بنیاد بنی ہے۔''(1)

مذکورہ بالا محققین سے استفادے اور مداحی کے باوجود خاں صاحب ان محققین کے تسامحات سے صرفِ نظر نہیں کرتے بل کہ ان کی گرفت بھی کرتے ہیں۔ دیوانِ غالب نسخۂ عرشی میں ان غزلوں کی شمولیت کے ضمن میں، جو عرشی کو کسی بیاض سے ملی تھیں، رشید حسن خاں کی رائے ہے:

> ''ان غزلوں کو محض ان مجہول بیاضوں میں اندراج کی بنا پر شاملِ دیوان ہونا ہی نہیں چاہیے تھا۔''(2)

اس سے واضح ہے کہ رشید حسن خاں نے تدوین کی روایت سے بھرپور استفادہ ہی نہیں کیا بل کہ اپنی تحقیقی اور تنقیدی بصیرت سے اس روایت کے کھرے کھوٹے عناصر کی نشان دہی بھی کی اور صحت مند عناصر کو اپناتے ہوئے اس روایت کو اپنے امتیازات کے ساتھ آگے بڑھایا۔ رشید حسن خاں نے تدوین کو دو حصوں میں تقسیم کیا، یعنی تحقیق اور تدوین، پھر انھیں پر توجہ مرکوز رکھی۔ اسلم پرویز کے نام ایک مکتوب میں رقم طراز ہیں:

> ''تدوین میں متن کے نفسِ مضمون، متن کے مصنف اور اُس کے عہد سے متعلق اہم تاریخی نکات بروئے کار لانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ میرے بھائی! یہ تحقیق کا عمل ہے، تدوین کا نہیں۔ تدوین تو صرف متن کے متعلقات کی نشان دہی ہے، ہاں چوں کہ یوں واقعتاً کا تعین، تحقیق کے اصولوں کے تحت کیا جائے گا۔ اسی لیے اچھی تدوین کے دو حصے ہوتے ہیں۔ تحقیقی حصہ جو چھوٹا ہوتا ہے۔ تصحیح متن، جو اصل مقصود تدوین ہے اور جو مقصود بالذات ہوتا ہے۔''(3)

مذکورہ بالا سے واضح ہے کہ رشید حسن خاں کے نزدیک تحقیق اور تدوین الگ الگ فنون ہیں۔ وہ تحقیق اور تنقید کو بھی بنیادی طور پر دو مختلف موضوع مانتے ہیں۔ ہر چند تحقیق و تدوین کی حدود کہیں کہیں ضرور مل جاتی ہیں اور عام لوگ تحقیق کو تدوین کا جز سمجھتے ہیں، جو درست نہیں۔ صورت حال اس سے بالکل مختلف ہے۔ یعنی تدوین کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ آدابِ تحقیق سے گہری واقفیت رکھتا ہو۔ تحقیق کا آدمی، متن کی معیاری تدوین بھی کر سکے، یہ ضروری نہیں۔ تحقیق و تدوین کے اسی امتیاز پر ڈاکٹر اسلم پرویز، رشید حسن خاں کے بارے میں رائے دیتے ہیں:

> ''تحقیق اور متنی تنقید، رشید حسن کے دو میدان ہیں۔ انھوں نے نہ صرف اعلا پایے کی تحقیق اور تنقید کے نمونے، ہمارے سامنے پیش کیے ہیں بل کہ تحقیق اور متنی تنقید کے اصول وضوابط پر کتابیں بھی تالیف کی ہیں۔ اس طرح وہ تحقیق اور عملی تنقید دونوں کے مردِ میدان ہیں۔ ان کے تحقیقی عمل میں تضاد ڈھونڈنا بہت مشکل ہے اور یہی دراصل کسی شعبۂ علم میں خصوصی مہارت کے صحیح معنی ہیں۔''(4)

رشید حسن خاں کے مدون متون کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

1۔ متعلقاتِ متن کی تحقیق (مقدمہ) 2۔ ترتیب و تصحیح متن 3۔ توضیحِ متن

یہاں یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ متعلقاتِ متن کی تحقیق میں رشید حسن خاں نے قاضی عبدالودود کی پیروی کی اور قطعی رویہ اختیار کیا۔ مکتبہ جامعہ، دہلی نے معیاری سیریز شروع کی۔ جس کے تحت قدیم ادب کی کتب، صحت متن اور ضروری فرہنگ کے ساتھ شائع کیں۔ ان کی قیمت کم رکھنے کے لیے متعلقاتِ متن (مقدمات) کو طول نہیں دیا۔ رشید حسن خاں نے اس سلسلے میں ذیل کی کتابیں کی کتابیں مدون کیں:

1۔ باغ و بہار 2۔ سحر البیان 3۔ گلزارِ نسیم 4۔ انتخابِ ناسخ 5۔ موازنہ انیس و دبیر 6۔ حیاتِ سعدی 7۔ انتخاب مضامینِ شبلی 8۔ دیوانِ درد 9۔ مقدمہ شعر و شاعری

ان کتابوں میں انتخابِ ناسخ اور باغ و بہار اہم ہیں۔ معیاری سیریز میں انتخابِ ناسخ اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس میں تقریباً سوا سو صفحات کا مقدمہ ہے۔ عام طور سے اس سیریز میں دو چار صفحات کا مقدمہ ہی ہوتا ہے۔ اس مقدمے کے حوالے سے گیان چند تبصرہ کرتے ہیں:

> ''اس مقدمے کے کئی پہلو قابلِ ذکر ہیں۔ جن میں اہم ترین یہ ہے کہ خاں صاحب نے اس غلط فہمی کا ازالہ کیا کہ ناسخ نے اصلاح زبان کے ضابطے بنائے۔ انھوں نے کئی اقتباسات سے ثابت کیا کہ یہ ضابطے ناسخ کے بعد اُن کے شاگردوں نے بنائے تھے۔ مقدمے کا اتنا ہی حصہ ناسخ کے رنگِ سخن کا تعین ہے۔ اس میں رشید حسن خاں، ایک کامیاب نقاد کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔'' (5)

فسانۂ عجائب کی تدوین کرتے ہوئے بھی رشید حسن خاں نے 114 صفحات کا مقدمہ تحریر کیا ہے۔ ان کے مطابق مصنف کی مفصل سوانح کی تشکیل، داستان کے ماخذ کی نشان دہی اور اس کا تنقیدی جائزہ، تدوین متن میں داخل نہیں۔ سوانح یا ماخذ کو مختصر اًدیا جا سکتا ہے۔ مدون کو محض متعلقاتِ متن پر توجہ مرکوز رکھنی چاہیے۔ تصنیفی اعتبار سے باغ و بہار، فسانۂ عجائب پر مقدم ہے۔ رشید حسن خاں نے 1964 میں مکتبہ جامعہ کی معیاری سیریز کے لیے باغ و بہار کو بھی مرتب کیا۔ تب ہی سے ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اس کتاب کو مکمل طریقے سے مدون کیا جائے۔ باغ و بہار کے طویل مقدمے میں بھی رشید حسن خاں تدوین ہی کی حدود کا تعین کرتے ہیں جس طرح فسانۂ عجائب کے مقدمے میں کیا تھا اور اس سے اتفاق کرنا ہوگا۔ اس میں انھوں نے زور دیا ہے کہ متن کو منشائے مصنف کے مطابق پیش کیا جائے۔ میر امن نے دلّی کی بول چال کا روزمرہ لکھا ہے۔ جس میں بارہا، نامانوس روپ آ گئے۔ بیش تر مرتبین نے انھیں سہوِ طباعت سمجھ کر بدل دیا لیکن رشید حسن خاں نے میر امن کے ہاتھ کی لکھی گنج خوبی دیکھی۔ ہندی مینوئیل کے مطبوعہ اوراق، بقیہ حصے پر مشتمل مخطوطہ، گل کرسٹ کا نظام اوقاف، ان سب کی مدد سے وہ میر امن کے سویدائے دل میں اُتر گئے ہیں۔ اس مقدمے میں وہ میر امن کی سوانح کے غیر مستند بیانات کو رد کر کے مختصر لیکن باوثوق حالات کی بازیافت کرتے ہیں۔ فسانۂ عجائب میں تدوین کے لیے جو اصول وضع کیے گئے، خاں صاحب نے ان پر پوری طرح عمل بھی کیا ہے۔ انھوں نے اپنے قائم کردہ اصولوں کی خلاف ورزی کبھی نہیں کی بل کہ موصوف نے اپنی تمام تر توہبی اور اکتسابی صلاحیتیں یہاں صرف کر دی ہیں اور ساری عمر کے مطالعے اور معلومات کا عطر، ان کتابوں کے حواشی میں کشید کر کے رکھ دیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں، خاں صاحب کے سلجھے ہوئے تحقیقی مزاج نے ان کی تدوینات کو ترتیب، توازن اور سلیقہ عطا کیا۔ ان امتیازی خصوصیات کی بنا پر خاں صاحب معاصر مدونین میں ممتاز رہے۔ ان کی تدوینات بے حد وسیع مطالعے، محنت، مزاجی مناسبت، فنی بصیرت اور تدوینی سلیقے کی ترجمان ہیں۔

مقدمات کے بعد، ترتیب و تصحیح متن کے مرحلے پر بھی رشید حسن خاں نے کمال طریقے سے، اس خشک موضوع کو معلوماتی تنوع سے دل چسپ بنانے اور عملی نمونوں سے اس کی گہرائی و گیرائی سے، قدر و قیمت کا تعین کر کے اسے تحقیق و تنقید کی بنیاد ثابت کیا۔ متن کی معیاری پیش کش کے لیے انھوں نے درج ذیل امور کا خاص خیال رکھا۔

1۔ بنیادی اور مستند ماخذات کا حصول:

خاں صاحب اپنی تمام تر تدوینات کے لیے سہل الحصول نسخوں کے بجائے قدیم، معتبر، اہم خطی اور مطبوعہ نسخوں سے کام لیا، غیر اہم نسخوں کو اہمیت نہیں دی۔ فسانۂ عجائب کے مقدمے میں رشید حسن خاں رقم طراز ہیں:

> ''اب تک اس کتاب کے کسی ایسے خطی نسخے کا پتا نہیں چل سکا جو مکمل کتاب پر حاوی ہو، عہدِ مصنف کو مکتوبہ ہو اور اس سے متن کی صحیح ترتیب میں مدد لی جا سکے۔'' (6)

رشید حسن خاں نے مقدمے میں قلمی اور مطبوعہ نسخوں کی تفصیل دی ہے۔ انھوں نے بعض دستیاب نسخوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

> ''پھر یہ بات بھی ہے کہ یہ نسخے میرے دائرۂ کار سے قریب کی نسبت بھی نہیں رکھتے۔ میرا اصل مقصد تو اس متن کو، اس صورت میں پیش کرنا ہے، جسے آخری بار مصنف نے پیش کیا تھا اور اس میں ان نسخوں کے مباحث کو شمول کی گنجایش ہے، نہ ضرورت۔'' (7)

ثانوی مآخذات:

رشید حسن خاں نے بنیادی مآخذات کی طرح جملہ اہم اور قدیم ترین ثانوی مآخذات، بیانات کو بھی آدابِ تحقیق کے طور پر قبول کر کے پیش کیا۔ ڈاکٹر گیان چند جین کے مطابق:

> ''زبان اور قواعد کے مضامین میں جن قدیم کتب اور رسالوں کے حوالے اور اقتباسات دیے ہیں، ان میں سے بعض کا ہم نام لیا کرتے ہیں، انھیں دیکھتے نہیں، دوسری طرف متعدد ایسے مآخذات ہیں، جن کو ہم نے، کم از کم میں نے دیکھا۔ اُردو کے کلاسیکی دفینے پر ایسی نظر، اس دور میں شاید ہی کسی دوسرے شخص کی ہو'' (8)

بلاشبہ رشید حسن خاں نے قدیم اور مستند مآخذات کا استعمال کیا۔ مدعا ثابت کرنے کے لیے داخلی و خارجی شہادتیں پیش کیں اور مختلف تاریخی غلطیوں کی داخلی و خارجی شہادتوں سے نشان دہی کی۔ ادھوری معلومات کی صورت میں قطعی رائے سے گریز کیا اور موجود ممکنہ معلومات کی فراہمی کو یقینی بنایا۔ روایت میں ہونے والی معمولی سے معمولی تبدیلیوں کی مکمل نشان دہی کی، حوالے کی ضرورت اور صحت کا خاص طور پر التزام کیا۔

تحقیق و تاریخ متن:

تحقیق و تاریخ متن، تدوین کا اہم جزو ہے۔ اس کے تحت متن اور متعلقاتِ متن سے متعلق جملہ مباحث کا تاریخی و تحقیقی جائزہ شامل ہوتا ہے۔ رشید حسن خاں نے اپنی تدوینات میں متن کی ہیئت، حدود کا تعین، عنوانات، حذف، اضافہ، الحاق، سرقہ، روایاتِ متن، متن کے مآخذات جیسے امور کا خاص طور پر خیال رکھا۔

تصحیح وترتیبِ متن:

تصحیح وترتیبِ متن کے لیے املا اور تلفظ پر عبور ضروری ہے۔ان موضوعات پر خاں صاحب کو غیر معمولی دسترس تھی۔زبان کے تاریخی ارتقا اور اس کی عہد بہ عہد تبدیلیوں پر ان کی گہری نظر تھی۔بقول جاوید رحمانی:

''رشید حسن خاں کو اُردو املا سے خاص شغف تھا۔ہمارے زمانے میں جن لوگوں نے املا کے مسائل پر مسلسل لکھا ہے،ان میں رشید حسن خاں کا نام سرِ فہرست ہے۔ان کی کتابیں ''اُردو املا''،''زبان وقواعد''اور''اُردو کیسے لکھیں''وغیرہ اُردو املا کی معیار بندی میں بے حد اہم کردار ادا کرتی ہیں۔''(9)

یہی وجہ ہے رشید حسن خاں نے ہر عہد کے روشِ املا اور مروج تلفظ کو پیشِ نظر رکھنا نیز مصنف کے اختیارات کا تعین،جس دیدہ ریزی اور فنی بصیرت سے کیا،اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ان تمام امور کو منشائے مصنف کے مطابق کرنے کے لیے رشید حسن خاں نے تقابلی نسخوں سے کام لیا اور کسی ایک نسخے کے متن پر اکتفا کرنے کی بجائے موزوں ترین صورت کا انتخاب کیا۔رشید حسن خاں نے منتخب نسخوں کے تقابل سے تصحیح وترتیب متن کے بعد جملہ اختلافات اور ترجیح متن کے قرینوں کو ضمیمہ،تشریحات میں پیش کیا۔اس طرح نہ صرف متن کی مرجع اور غیر مرجع دونوں صورتیں سامنے آ گئیں بل کہ مدون کی خصوصی مہارت،درست متن کے تعین میں رہنمائی بھی کرتی ہیں۔

متن کی پیش کش:

متن کو منشائے مصنف کے مطابق ڈھالنے کے لیے کمال عرق ریزی سے کام لیا۔ایک ایک لفظ کی حرکات کے تعین میں کمال تحقیق کا مظاہرہ کیا۔انھوں نے جس طرح اہم زبان کی اسناد کے ساتھ محلِ استعمال کی مطابقت سے حرکات کا تعین کیا،اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔فسانۂ عجائب کے بارے میں ڈاکٹر ٹی.آر.رینا کی صائب رائے ملاحظہ ہو:

''فسانۂ عجائب کے بارے میں عام رائے یہ ہے کہ اس کی زبان دقیق اور الفاظ ثقیل ہیں لیکن جو ایک بار اسے (مرتبہ رشید حسن خاں) اچھی طرح پڑھ لیتا ہے اس کے لیے ادب کی کوئی بھی کتاب پڑھنا مشکل نہیں رہ جاتی۔(10)

یہ تو صرف ایک مدونہ نثر کی مثال ہے۔تمام تدوینات،رشید حسن خاں کی محنت شاقہ کی مظہر ہیں۔تدوین کے ہر مرحلے پر انھوں نے بے حد وسیع مطالعے،محنت اور دیدہ ریزی کا ثبوت دیا۔اُردو تدوین کی روایت میں یہ کارنامے،معیاری نمونہ ہیں اور ان کی یادگار ہیں۔ان کی تدوینی خدمات کے حوالے سے چند مشاہیر ادب کی آرا ملاحظہ ہوں:

1۔ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی:

''رشید حسن خاں ایک بے بدل عالم اور محقق تھے۔ان کی علمیت،ژرف نگاہی اور اجتہادی بصیرت،برسوں کی محنت،ریاضت،یکسوئی،علمی انہماک اور شغف کا نتیجہ تھا۔تدوین میں انھوں نے حافظ شیرانی کو''معلم اول''قرار دیا اور تدوین میں خود کو عرشی صاحب کا''تلمذ معنوی''سمجھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ؎

طبعِ حسرت نے اُٹھایا ہے ہر اُستاد سے فیض(11)

2۔ڈاکٹر خلیق انجم:

''متنی تنقید پر میری تھوڑی بہت نظر ہے۔اس لیے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اُردو میں رشید حسن خاں کے پایے کا کوئی اور متنی نقاد ابھی پیدا نہیں ہوا۔خاں صاحب کو متنی تنقید کے سائنٹفک طریقوں پر قدرت حاصل ہے۔وہ املا اور تلفظ کے ماہر ہیں۔اسی لیے وہ متن کا جس طرح تنقیدی اڈیشن تیار کرتے ہیں،وہ کوئی اور نہیں کر سکتا۔''(12)

3۔ڈاکٹر گیان چند جین:

''رشید حسن خاں کا کام کسی سے کم معیار کا نہیں۔اگر وہ کسی یونی ورسٹی میں پروفیسر ہوتے،یورپ،امریکہ کی سیر کیے ہوتے۔عظیم الشان جلسوں میں صدر یا وزیر اعظم سے رسم اجرا کراتے،تب ان کے کارناموں کو عظیم الشان قرار دیا جاتا۔حضرت امیر حمزہ نے''طلسم ہوش ربا''فتح کیا تھا،تدوین کے ہفت خواں میں رشید حسن خاں کی تسخیر اس سے کم نہیں۔اگر تدوین کوئی ملّت ہوتی تو یہ کتابیں (فسانۂ عجائب اور باغ و بہار) اس کے دو مقدس صحیفے قرار پاتے اور ان کا مدون ان کا نبی،لیکن میں انھیں پیغمبرِ تدوین کہنے پر قانع نہیں،انھیں خدائے تدوین کہوں گا،گو اس پر کتنے زعماچیں بہ چیں ہوں۔''(13)

حوالہ جات

1۔رشید حسن خاں،ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ،لاہور،الفیصل پبلشرز 1989،ص108

2۔ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ،ص64

3۔ٹی.آر.رینا،رشید حسن خاں کے خطوط،دہلی،اُردو بک ریویو،2011،مرتبہ،ص181

4۔شمیم طارق،رشید حسن بحیثیت محقق ومدون،مشمولہ تخلیقی ادب،اسلام آباد،نمل یونی ورسٹی جون 2011 شمارہ نمبر 8 ص259

5۔گیان چند جین،خدائے تدوین،مشمولہ اُردو دنیا،نئی دہلی،قومی کونسل برائے فروغ اُردو،،اپریل 2006 ص25

6۔رشید حسن خاں،فسانۂ عجائب،دہلی،انجمن ترقی اُردو ہند،2002 مرتبہ،ص76

7۔فسانۂ عجائب،ص67

8۔رشید حسن خاں کے خطوط،ص72

9۔جاوید رحمانی،رشید حسن خاں کچھ یادیں کچھ جائزے،مشمولہ اخبارِ اُردو،اسلام آباد،مقتدرہ قومی زبان،جولائی 2008،ص40

10۔رشید حسن خاں کے خطوط،ص75

11۔ رفیع الدین ہاشمی، رشید حسن خاں: جہانِ تحقیق کا آفتاب، مشمولہ: اخبارِ اُردو اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، اپریل 2010، ص 81
12۔ خلیق انجم، پیش لفظ: مثنویاتِ شوق، کراچی: انجمن ترقی اُردو 1999، مرتبہ رشید حسن خاں، ص ب
13۔ خدائے تدوین: مشمولہ اُردو دنیا، ص 30
(جرنل آف اُردو ریسرچ (اُردو) شمارہ 35، جون 2019، شعبۂ اُردو فیکلٹی آف لینگویجز اینڈ اسلامک اسٹڈیز بہاءالدین زکریا یونی ورسٹی، ملتان (پاکستان) صفحہ 51 تا 58

OOO

شازیہ پروین
ایم۔ فل اسکالر، شعبۂ اُردو،
گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی، فیصل آباد

مقدماتِ باغ و بہار کا تقابلی جائزہ

(رشید حسن خاں اور سہیل عباس کے خصوصی حوالے سے)

فورٹ ولیم کالج کی داستانیں اُردو ادب کے صحیفے ہیں۔ ان داستانوں میں میر امن کی ''باغ و بہار'' کو سب سے زیادہ شہرت نصیب ہوئی۔ اگر چہ اس کی تالیف کو دو صدیوں سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے لیکن آج بھی اس کی مقبولیت کم نہیں ہوئی۔ ان دو صدیوں میں اُردو زبان و ادب نے کئی روپ بدلے ہیں اور زبان کے ساتھ ساتھ طرزِ املا میں بھی کئی تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں لیکن میر امن کی زبان آج بھی تازگی اور لطافت کا اعلا نمونہ سمجھی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ داستان آج بھی ہمارے نصابات کا ایک لازمی حصہ قرار دی جاتی ہے۔ باغ و بہار نہ صرف قصے کی دل چسپی کے باعث بل کہ زبان کی صفائی کے اعتبار سے بھی ایک اعلا پائے کی کتاب ہے۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

> ''میر امن کا قصہ چہار درویش، فی الحقیقت باغ و بہار ہے۔ یہ اُردو نثر کی ان چند کتابوں میں سے ہے جو ہمیشہ زندہ رہنے والی ہیں۔ اس کی مقبولیت کا بہت بڑا راز اس کی فصاحت اور سلاست میں ہے۔''(1)

سید احتشام حسین نے بھی ''باغ و بہار'' کی تعریف کی ہے:

> ''میر امن کی باغ و بہار ان تصنیفات میں سے ہے جو ایک بار پیدا ہو کے پھر نہیں مرتیں۔''(2)

کلاسیکی داستانوں میں یہ شرف بھی باغ و بہار ہی کو حاصل ہے کہ اس کتاب پر سب سے زیادہ تحقیقی و تنقیدی کام ہوا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ باغ و بہار مقبول داستان ہے اس کے ماخذ اور مصنف کے بارے میں اسی قدر کم معلومات ملتی ہیں۔ مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ باغ و بہار کے بہت سے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نسخے منظر عام پر آتے رہے اور کثرتِ تعبیر سے یہ خواب اور پریشان ہو گیا۔ چہار درویش کے ماخذ و مراجع اور تراجم سے متعلق تمام تر تحقیق و تنقید کے باوجود ''باغ و بہار'' کے ایک معتبر متن کی تدوین اور مفصل مطالعے کی ضرورت تھی۔ اس ضرورت کو مشہور محقق اور مدون جناب رشید حسن خاں نے پورا کیا اور ان کی عرق ریزی اور محنت شاقہ کی بدولت باغ و بہار کا ایک معتبر اور مستند متن زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکا ہے۔ اس کتاب کو بلاشبہ اُردو تدوین کا بہترین نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ تحقیق و تدوین کے علاوہ تنقید و تحسین کے اعتبار سے بھی یہ کتاب لائقِ مطالعہ ہے۔ جناب رشید حسن خاں نے باغ و بہار کی نثر کی اہمیت اور اجزائے ترکیبی پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ رشید حسن خاں نے باغ و بہار کے جن محاسن اور معائب کی طرف اجمالی اشارے کیے ہیں ان کی تفصیل ڈاکٹر سہیل عباس کی مرتبہ ''باغ و بہار'' میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

اس مقالے میں باغ و بہار کی نثر کے اجزائے ترکیبی کے دونوں تنقیدی مطالعات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ رشید حسن خاں نے باغ و بہار کی تدوین کا ایک اعلا معیار قائم کیا ہے تو سہیل عباس نے بھی باغ و بہار کی زندہ نثر کے لسانی تجزیے کا حق ادا کیا ہے۔ یہاں صرف رشید حسن خاں اور سہیل کے مشترکات کا موازنہ مقصود ہے۔ ڈاکٹر انوار احمد، سہیل عباس کو داستانوں کا ایک مثالی کردار قرار دیتے ہیں:

> ''کہانی کے بارے میں مجھے ہمیشہ خیال رہا ہے کہ ان کا وصف اس میں ثانوی حیثیت رکھتا ہے، کیوں کہ ایک وقت کی مقبول زبان اور اس کے روزمرے اور محاورے کی لذتیں ضروری نہیں کہ ایک مخصوص زبان و مکان کے بعد مسحور کرنے پر قادر ہیں، بل کہ زیادہ امکان ہے کہ وہ خوب صورتی کے عبرت ناک عجائب خانے میں داخل ہو جائیں۔ میر امن کی 'باغ و بہار' کی زبان اور اسلوب کی بہت تعریف کی گئی ہے اور عام طور پر یہی خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ تحسین، زریں اور میر امن کے قصوں میں مابہ الامتیاز وصف زبان کا ہے، اس امر پر کم ہی ناقدین نے توجہ کی کہ کس کو قصہ گوئی سے طبعی مناسبت ہے اور حسب ضرورت ایجاز و اطنات بیان کے سلیقے سے کس نے کام لیا ہے۔ بہر طور سہیل عباس نے اپنے بے مثل کام سے مجھے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے، اس کا بہ ظاہر متروک [نا مقبول، کم مقبول] شعبۂ ہائے مضامین میں انہماک، کتابوں سے رغبت، مشکلات کو سہولتوں میں تبدیل کرنے والا

تخلیقی ذہن اسے داستان کا موارائی نہیں تو مثالی کردار ضرور بنا تا ہے۔ رشید حسن خاں کے مقدمۂ باغ و بہار کے بعد بہت کم امید تھی کہ کوئی دیوانہ اس دشت کی بادیہ پیائی پر دیوانگی کے باوجود آمادہ ہو جائے گا مگر مجھے خوشی ہے کہ ملتان کے ایک اسکالر اُردو زبان وادب کے استاذ نے اس کی زبان کے نظام کا جائزہ قواعد کے علم سے آگاہ ہونے کے ساتھ ساتھ اجتہادی استعداد کے ساتھ لیا ہے۔ سہیل عباس نے قواعدِ زبان جیسے خشک اور بے برگ و بار موضوع کو جو تازگی اور زندگی دی ہے وہ اس کے تخلیقی ذہن اور جودتِ طبع کو ظاہر کرتی ہے، دوسری طرف اس نے اسلوبیاتی اور ساختیاتی دبستان کے مباحث کے لیے بھی مضامین نو کا انبار لگا دیا ہے۔''(3)

میرامن کی 'باغ و بہار' کی نثر کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ رشید حسن خاں نے نہ صرف ''باغ و بہار کا معتبر اور مستند متن تیار کیا ہے بل کہ تشریحات، اختلافِ نسخ، انتساب اشعار تلفظ اور املا جیسے اہم مباحث کو بہ طور ضمیمہ جات شامل کر کے کتاب کی قدر و قیمت کو بڑھا رہا ہے۔ اگر چہ 'باغ و بہار' کی نثر کی تعریف اور تجزیے کی روایت بہت پرانی ہے لیکن جس باریک بینی اور تنقیدی بصیرت کا ثبوت رشید حسن خاں نے دیا ہے اس کی مثال پہلے نہ تھی۔

رشید حان خاں نے باغ و بہار کی نثر کے اجزائے ترکیبی میں سب سے پہلے محاورہ اور روزمرہ کا ذکر کیا ہے۔ میرامن سے پہلے تحسین ''نوطرز مرصع'' کے نام سے یہی داستان اُردو میں لکھ چکے تھے۔ میرامن نے تحسین ہی کے قصے کی پیروی کی ہے، اصل فرق زبان کا ہے۔ نوطرز مرصع میں ہر کردار تحسین کی زبان میں باتیں کر رہا ہے۔ باغ و بہار میں ہر کردار اپنی زبان میں باتیں کرتا ہے۔ میرامن کی بامحاورہ اور روزمرہ سے آراستہ نثر کا ایک بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُردو نثر کا یہ نیا اسلوب، فارسی کی اس طاقت ور نثری روایت کے دباؤ سے ذہنوں کو آزاد کرانے کا نقطۂ آغاز بنا، جس نے ہندوستان کے اہلِ علم کو بے طرح اپنا گرویدہ، بل کہ یوں کہیے کہ اسیر بنا رکھا تھا۔

رشید حسن خاں کا خیال ہے کہ میرامن کی اصل حیثیت ایک ایسے صاحبِ طرز نثر نگار کی ہے جس نے اُردو میں سادہ و پرکار پیرایۂ اظہار کا نقش درست کیا، روزمرہ اور محاورۂ اہلِ زبان کی اہمیت کو صحیح معنی میں پہلی بار روشن کیا اور جس چیز کو چلن کہتے ہیں، لغت اور قواعد کے مقابلے میں اس کی افضلیت اور برتری کا اظہار اور اعلان کیا۔ سہیل عباس نے باغ و بہار میں روزمرہ اور محاورہ کی تحسین کے بجائے بیسوں مثالیں تلاش کی ہیں:

''تم نے سانپ آستین میں پالے ہیں کس برتے پر تتّا پانی دن پہاڑ سا چھاتی پر سے ٹلا، جب تجہیز و تکفین سے فراغت ہوئی اور پھول اٹھ چکے، وہ پھول سا بدن سوکھ کر کانٹا ہو گیا اور وہ رنگ جو کندن سا دمکتا تھا، ہلدی سا بن گیا۔''

رشید حسن خاں نے میرامن کی منظر نگاری کی بہ طور خاص تعریف کی ہے، جب کہ سہیل عباس نے اس وصف کا ذکر نہیں کیا۔ رشید حسن خاں کے بہ قول:

''جن عناصر نے باغ و بہار کی نثر کو حسن بخشا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اسے بول چال کی زبان سے قریب تر کر دیا ہے۔ ان میں سے تکرارِ الفاظ ان کے اندازِ بیان کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ اس خصوصیت نے کئی شکلوں میں اپنے آپ کو نمایاں کیا ہے۔ کبھی تو تابع مہمل کی پیوندکاری کرتے ہیں؟ اور اس سے اُردو پن اور بول چال، دونوں کا رنگ چمک اٹھتا ہے، مثلاً:

کچھ پیس پاس رہے تھے... لوگ طعنہ مہنا دیتے ہیں... کپڑے وپڑے پھینک پھانک دیے۔''(4)

☆۔ اسی انداز کی ایک دوسری شکل یہ ہے کہ کبھی مرادف اور کبھی قریب المفہوم لفظوں کو ایک ساتھ لاتے ہیں۔ اس سے بھی گفتگو کا انداز نمایاں ہوتا ہے، مثلاً: سپاہ گری کا کسب و فن... تلاش میں ناؤ نواڑے کی... راہی، مسافر جنگل میدان میں سونا اچھالتے جاتے۔

☆۔ کبھی وہ جملے میں ایک لفظ کو ملا کر لاتے ہیں اور اس تکرار سے بھی وہی فائدہ حاصل ہوتا ہے، جیسے: جنس ملک ملک کی گھر میں موجود تھی... ہزار ہزار شکر بجا لایا۔

☆۔ اسی انداز کی ایک شکل وہ ہے جس میں وہ متضاد لفظ ایک ساتھ لاتے ہیں۔ جیسے: تمام آدمی چھوٹے بڑے، لڑکے بوڑھے، غریب غنی شہر کے باہر چلے... جتنے آدمی وہاں کے ہزاری اور بازاری نظر پڑے...

☆۔ جب وہ طویل جملوں میں ایسے متعدد لفظ یکجا کر دیتے ہیں، جن میں سے بعض میں دو دو مرادف یا قریب المفہوم لفظوں کے ٹکڑے ہوتے ہیں، مثلاً: سب دولتِ دنیا، گھر بار، آل اولاد آشنا دوست، نوکر چاکر، ہاتھ گھوڑے چھوڑ کر اکیلے پڑے ہیں... اور قبر کے اندر کا احوال معلوم نہیں کہ کیڑے مکوڑے چیونٹے سانپ ان کو کھا گئے۔

☆۔ میرامن موقعے کی مناسبت سے ایسے کئی لفظ ایک ساتھ لاتے ہیں جو اصل میں ایک ہی مفہوم کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس طرح بیان کا حسن تو پیدا ہوتا ہے، لفظیات کے ذخیرے پر لکھنے والے کی نظر کس قدر محیط ہے، اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ایسے مقامات پر عبارت میں داستان سرائی کا سا انداز پیدا ہو جاتا ہے اور یہ داستانی انداز پڑھنے والے کی نظر میں دل چسپی کی چمک پیدا کر دیتا ہے اور توجہ کو پوری طرح اپنی طرف کھینچ لیتا ہے، مثلاً ویسے ہی آدمی غنڈے، پھانکڑے، مفت پر کھانے والے، جھوٹے، خوشامدی آ کر آشنا ہوئے... ایک ایک طرف آتش بازی، پھل جھری، انار، داؤدی، جھنیچا، مردار ید، مہتابی، سوائی، چرخی، ہتھ پھول، جاہی جوہی، پٹاخے، ستارے چھٹنے تھے۔

الغرض! رشید حسن خاں نے باغ و بہار میں صنعتِ تکرار کے مختلف پہلوؤں کا بغور تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے اور تحسین میں بخل سے کام نہیں لیا جب کہ سہیل عباس نے محض مثالوں پر اکتفا کیا ہے اور داد، نقد کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ رشید حسن خاں نے باغ و بہار سے امالہ کی چند مثالیں دی ہیں، جیسے:

دل میرا دپدھے میں... اس ماجرے کی حقیقت پوچھتا تھا... آہستے سے کہا۔ سہیل عباس نے امالہ کا ذکر نہیں کیا۔

رشید حسن خاں نے میر امن کی عبارت میں ''بہ'' کے مرکبات کے متعلق لکھا ہے کہ بعض مقامات پر ان مرکبات کے استعمال سے اجنبی پن پیدا ہو جاتا ہے لیکن اکثر مقامات پر بات چیت کا انداز نکھر جاتا ہے۔مثال کے طور پر:

رنگ بہ رنگ کی شکلیں...رنگ بہ رنگ کے جانور...پیڑھی بہ پیڑھی...لہو میں تر بہ تر...خوشی بہ خوشی...بہ خوشی اجازت دی...تر اکیب اور مرکبات کے ضمن میں سہیل عباس نے زیادہ عرق ریزی اور تفصیل پسندی کا مطالعہ کر لیا ہے۔انھوں نے باغ و بہار سے مختلف قسم کی نشان دہی کی ہے۔

رشید حسن خاں نے میر امن کی عبارت میں قافیہ بندی کی تعریف کی ہے اور بجا لکھا ہے کہ ایسے مقامات پر ذہن یہ محسوس نہیں کرنے پاتا کہ لکھنے والا قافیہ بندی کا ہنر دکھانا چاہتا ہے۔

چند مثالیں:

اور زمین پانی کا بتاشا؛لیکن یہ تماشا ہے...شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں۔سارے غریب وغربا دعا دیتے ہیں اور جیتے ہیں...

رشید حسن خاں نے میر امن کی نثر میں مناسباتِ لفظی کا جائزہ لیا ہے۔انھوں نے مراعات النظیر ،تضاد اور تجنیس جیسی صنعتوں کی متعدد مثالیں دی ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

''صنعتیں اور لفظی رعایتیں،سچ تو یہ ہے کہ زبان کا جز رہی ہیں۔جہاں تناسب بگڑ جاتا ہے،بس وہاں نظر رکتی ہے اور میر امن کے یہاں ایسے مقامات کم سے کم ہیں جہاں تناسب بگڑا ہو۔یہی وجہ ہے کہ [جب تک خاص طور پر متوجہ نہ کیا جائے]عام طور پر یہ خیال بھی ذہن میں نہیں آتا کہ باغ و بہار کی نثر میں قافیہ بندی کا اہتمام بھی ہے اور لفظی رعایتوں کی صنعت گری بھی ہے۔یہ بات لکھنے والے کے کمالِ فن پر دلالت کرتی ہے۔''(5)

صنعتوں کے ضمن میں سہیل عباس نے جس دقت نظری کا ثبوت دیا ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔انھوں نے باغ و بہار میں مستعمل لگ بھگ 36 صنائع کا ذکر کیا ہے اور مثالیں دی ہیں۔طوالت سے بچنے کے لیے چند صنعتوں کا نام دینے پر اکتفا کر رہا ہوں:

مراعات النظیر ،تضاد،تجنیس،مبادلہ،تکرار معما،تلمیح،تنسیق الصفات،عاطفہ،منقوط یا مہملہ،معجمہ ،تحت النقاط،فوق النقاط،خیفا،رقطا،الشتقاق،شبہ اشتقاق،ذو قافتین ،واصل الشفتین ،لف ونشر،حسن تعلیل،ترصیع، تذبیح،میلان خط،ساقیۃ الاعداد۔

نوٹ:رسالے میں حوالے ندارد ہیں۔

(رسالہ الحمد۔3،شعبہ اُردو الحمد یونی ورسٹی،اسلام آباد،جنوری تا جون 2015،صفحہ 7 تا 11)

○○○